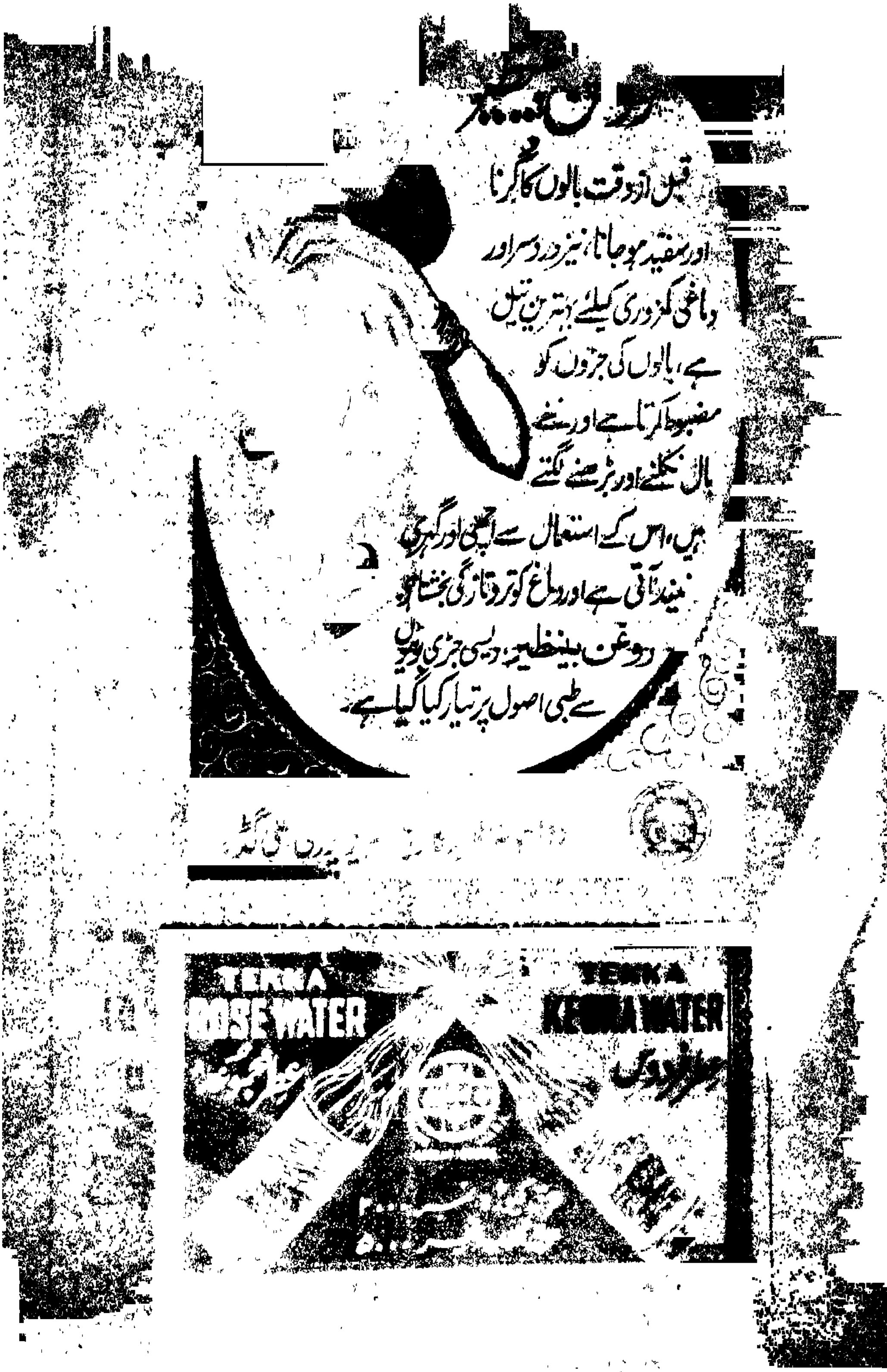
سہیل



Kalimuddin Shams

★ ★ ★



قبل از وقت بالوں کا گرنا
اور سفید ہو جانا، نیز درد سر اور
دماغی کمزوری کیلئے بہترین تیل
ہے، بالوں کی جڑوں کو
مضبوط کرتا ہے اور نئے
بال نکلنے اور بڑھنے لگتے
ہیں، اس کے استعمال سے اچھی اور گہری
نیند آتی ہے اور دماغ کو تر و تازگی بخشتا ہے
روغن بینظیر، دیسی جڑی بوٹیوں
سے طبی اصول پر تیار کیا گیا ہے۔
TEKKA
WATER
TEKKA
WATER

۲۲، ۲۳، ۲۴ر فروری ۸۵ء

کو

اصلاح پسند داؤدی بوہروں کی

احمد آباد میں

پانچویں عالمی داودی بوہرہ کانفرنس

کی کامیابی کے لئے

نیک خواہشات

اور

سینٹرل بورڈ آف داؤدی بوہرہ کمیونٹی بمبئی

کو کانفرنس منعقد کرنے کے لئے

مبارکباد

جمیل منظر سنہاروی (مدیر ماہنامہ سہیل گیا)

بانی :۔ مولوی حافظ محمد عبدالرحمٰن صاحب بسمل سنہاروی

بیادگار :۔ مولوی محمد زین العابدین احمد سنہاروی

ترقی پسند ادب کا ترجمان

ماہنامہ سُہیل گیا

جنوری ۱۹۸۵ء

شمارہ ۱ ✱ جلد ۴۷

مدیر موسس
ادریس سنہاروی

چیف ایڈیٹر :۔ مسعود منظر سنہاروی

ایڈیٹر :۔ جمیل منظر سنہاروی

بدل اشتراک

فی شمارہ :۔ دو روپے
سالانہ :۔ ۲۴ روپے
لائف ممبری :۔ ۲۵۱ روپے

خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ

ماہنامہ سُہیل ریور سائیڈ روڈ گیا فون نمبر ۱۵۷۳

فہرست

نمود

پانچویں عالمی داؤدی بوہرہ کانفرنس

۲۲، ۲۳، ۲۴ فروری ۸۵ء کو دو سالوں کے وقفے کے بعد پانچویں عالمی داؤدی بوہرہ کانفرنس احمد آباد میں ہونے جا رہی ہے۔ ان کانفرنسوں کا انعقاد سنٹرل بورڈ آف داؤدی بوہرہ کمیونٹی بمبئی کی جانب سے کیا جاتا ہے اس سے قبل ۱۱، ۱۲، ۱۳ فروری ۸۳ء کو پونہ میں چوتھی عالمی داؤدی بوہرہ کانفرنس منعقد ہوئی تھی۔ گذشتہ چند سالوں سے بوہرہ فرقے میں بوہرہ داعی کی ڈکٹیٹرشپ اور ان کی انتظامیہ میں کرپشن کے خلاف ایک اصلاحی تحریک چل رہی ہے۔ شدید مشکلات اور بوہرہ داعی کی طرف سے کچلنے کی ہر ممکن کوششوں کے باوجود نہ صرف یہ تحریک جاری ہے بلکہ دن بدن مقبول ہوتی جا رہی ہے۔

پونہ میں منعقد چوتھی عالمی داؤدی بوہرہ کانفرنس کو روکنے اور بدنام کرنے کے لئے کئی ذلیل حرکتیں بھی کی گئیں۔ ہندوؤں کے مقدس دیوتا گنپتی کے چہرے پر سیدنا کا چہرہ چسپاں کرکے فرقہ وارانہ فسادات کروانے کی کوشش بھی کی گئی۔ "اسلام خطرے میں ہے" کے بڑے بڑے بینرز لگا کر مسلمانوں کے جذبات کو مشتعل کرنے کی کوشش کی گئی اس کے بعد بھی انہیں کامیابی نہیں ملی تو "چلو پونہ چلو" کے عنوان سے بغیر پریس لائین کے رنگین پوسٹر چھپوا کر پونہ، بمبئی اور دیگر کئی شہروں میں چسپاں کئے گئے۔ ان پوسٹروں میں ہندوؤں کے ناموں کی ایک جھوٹی لسٹ دے کر یہ لکھا گیا کہ اصلاح پسندوں کی اس کانفرنس میں یہ ہندو مسلمانوں کے دینی مسائل، مسلم پرسنل لا، مشترکہ سیول کوڈ، وغیرہ پر غور و خوض کریں گے۔ اور حکومت ہند اور حکومت مہاراشٹر کو اپنی تجاویز بھیجیں گے یہ حرکتیں ظاہر ہے اصلاح پسندوں اور اس کانفرنس کے اغراض و مقاصد کے متعلق مسلمانوں میں غلط فہمی پیدا کرنے اور انہیں اصلاح پسندوں کے خلاف اکسانے کے لئے کی گئی تھیں حالانکہ اصلاح پسندوں کی جانب سے "ظلم کے خلاف تحریک کا نیا موڑ" کے عنوان سے پریس لائین کے ساتھ جو پوسٹر لگے تھے ان میں صرف ناتھوانی کمیشن کی سفارشات پر عمل کرنے کی بات کی گئی تھی جو بوہرہ داعی کے علاوہ ایسی ذلیل حرکتیں کر سکتا ہے وہ معصوم بوہروں

پر کیسے کیسے مظالم ڈھاتا ہوگا؟

سہیل نے شروع سے مبنی بر انصاف اصلاح پسند بوہروں کے مقصد کی حمایت کی ہے ہم اصلاح پسند کے کاز کو بالکل حق بجانب سمجھتے ہیں۔ اور وجوہات میں سے اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ اسلام میں مذہبی پیشوائیت جیسی کسی گنجائش نہیں ہے تو مذہبی ڈکٹیٹرشپ کا بھلا کہاں جواز ہو سکتا ہے لیکن بوہرہ برادری بدقسمتی سے اسی ڈکٹیٹرشپ کا شکار رہی ہے۔ اور اصلاح پسند بوہرے اس لعنت سے نجات دلانے کے لئے کوشاں ہیں۔

ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ مسلم علما اور سیاسی لیڈروں کو اصلاح پسندوں کا کھل کر ساتھ دینا چاہئے تھا۔ کم از کم اسلامی اسپرٹ کا تو یہی تقاضہ ہے اگر اسلام فطری مذہب ہے تو کوئی بھی مسلمان، کوئی بھی مُلا کیسے غیر فطری تقاضوں کے لئے مکلف کر سکتا ہے۔ اور پھر ڈکٹیٹرشپ اور شہنشاہیت کا اسلام سے کیا جوڑ؟ لیکن برا ہو موقع پرستی اور ذاتی مصلحتوں کا کہ مسلم لیڈروں اور علماء نے یا تو کھلم کھلا بوہرہ داعی کا ساتھ دیا یا مکمل خاموشی اختیار کی۔ آج بھی ہم ان لیڈروں اور علماء سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ مفاد پرستوں سے اپنا رشتہ جوڑنے کی بجائے عام مسلمانوں کا ساتھ دیں۔ جو کمزور ہیں اور انصاف چاہتے ہیں۔ اگر وہ یہ نہیں کر سکتے تو اسلام کو رسوا کرتے ہیں۔

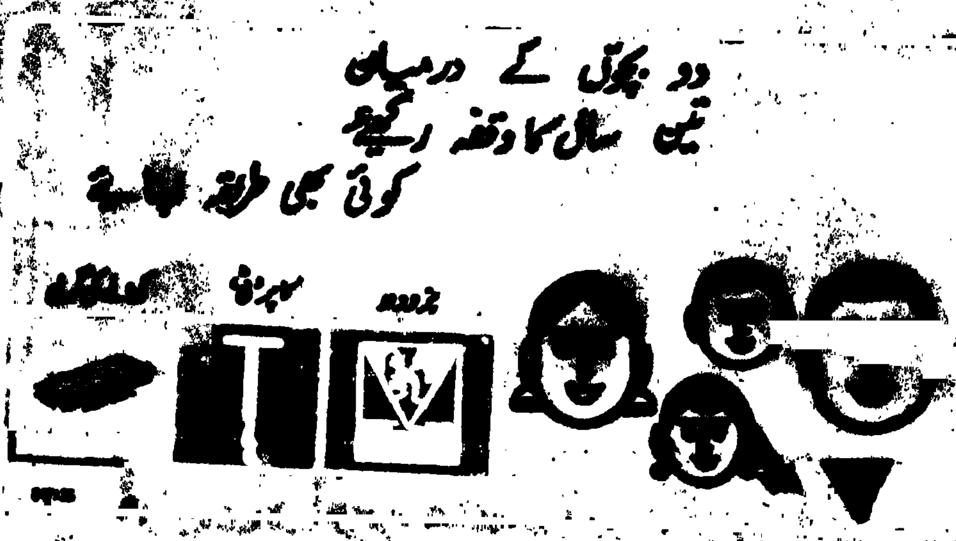
سیدنا صاحب کی ہر بات اسلام کے خلاف جاتی ہے۔ وہ شاہی ٹھاٹھ سے رہتے ہیں۔ اپنے آپ کو الٰہ الارض قرار دے کر بوہروں کو اپنے سامنے سجدہ کرنے پر مجبور کرتے ہیں جبراً پیسہ وصول کرتے ہیں۔ اور بیت المال کو اپنی ذاتی ملکیت قرار دے کر اس کا حساب دینے سے انکار کرتے ہیں۔ اور اپنے ان غیر اسلامی رویوں کے خلاف احتجاج کرنے والوں کو طرح طرح سے رونگٹے کھڑے کر دینے والے مظالم کا نشانہ بناتے ہیں۔ کوئی انسان دوست اور اسلام پرست ان کا ساتھ نہیں دے سکتا۔

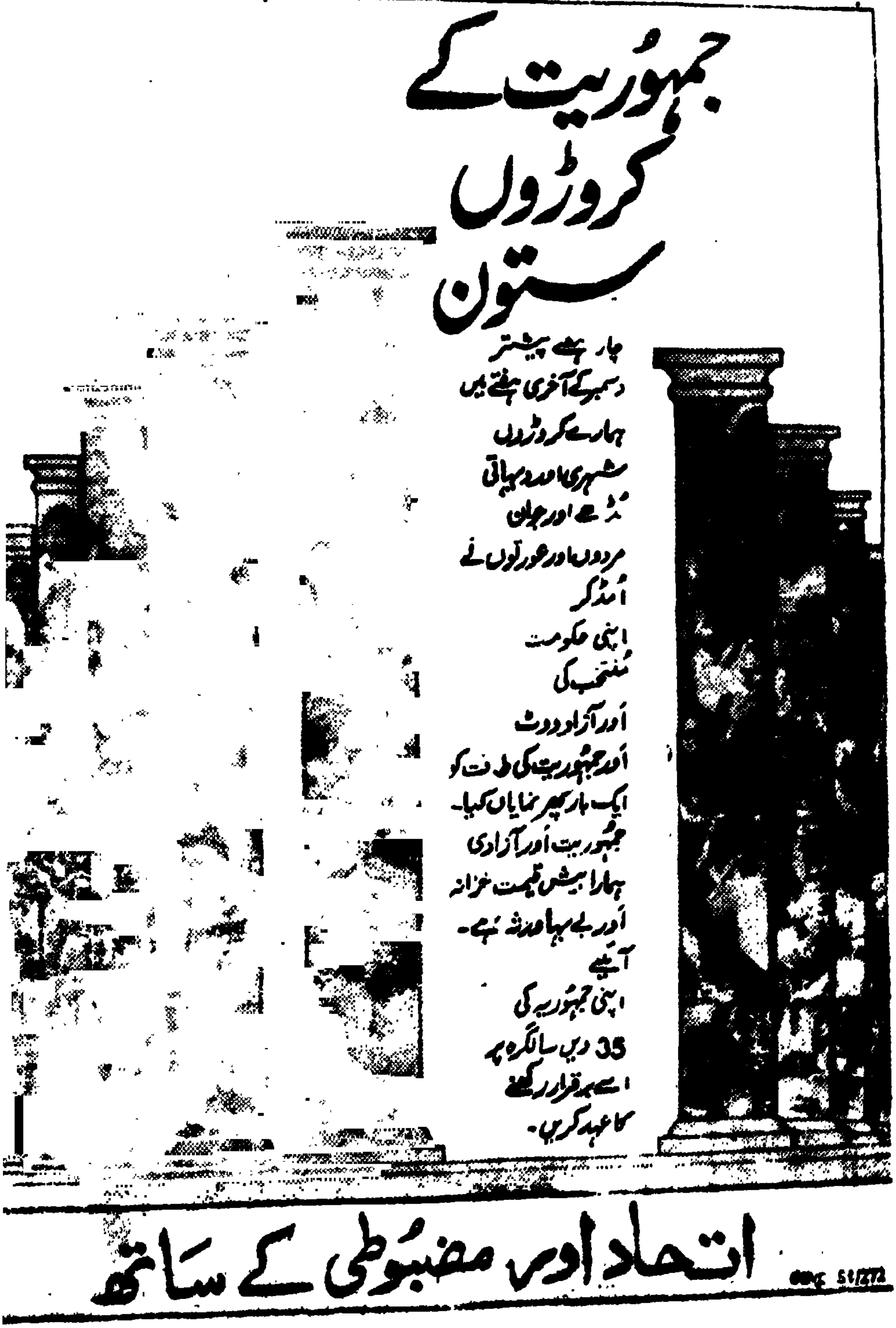
اس سلسلے میں سیدنا صاحب کے غیر اسلامی اور خدائی دعوے ان کی ڈکٹیٹرشپ ہونے والے انسانیت سوز مظالم اور ایک منظم مشینری کے تحت دولت کی لوٹ کھسوٹ کی چونکا دینے والی داستان کو ناتھوالی کمیشن نے پورے ثبوت کے ساتھ ثابت کر دیا ہے۔ اور اسی سے یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے کہ اس تحقیقاتی کمیشن کو روکنے اور ناکام بنانے کے لئے سیدنا صاحب نے کیسے ایڑی چوٹی کا زور لگایا تھا۔ اور اصلاح پسندوں کے کاز کو مسلم پرسنل لا میں مداخلت کا فریب دیکر کیسے مسلمانوں کو گمراہ کرنے کی کوشش کی تھی جبکہ واضح طور سے اصلاح پسند تحریک ظلم و ناانصافی کے خلاف ایک تحریک ہے۔ بوہرہ پیشوا کی منافقت آج کھل کر منظر عام پر آ چکی ہے۔ اپنے ظلم و ناانصافی کو ڈھکنے کا یہی معاملہ بتاتا اور ان کی

کے خلاف تحریک کو اسلام دشمن قرار دینا، خود سودی کاروبار کرنا اور اسلام میں سود حرام ہے کا بہانہ کرکے مسلمانوں کو اقتصادی طور پر تباہ کرنے کی سازش کرنا۔ مسلمانوں میں اتحاد کا نعرہ لگانا اور خود اپنے فرقے کے افراد میں نفرتوں کا زہر پھیلانا ایسی حرکتوں سے ان کا منافقانہ رویہ ظاہر ہو چکا ہے۔ دنیا کے ۸۰ کروڑ مسلمان بوہرہ پیشوا کو اپنا داعی مطلق نہیں مانتے۔ پھر سیدنا کا یہ شیطانی دعویٰ کہ جو مسلمان انہیں داعی مطلق نہیں مانتے وہ جہنمی ہیں، ان کا کلمہ طیبہ ان کے منہ پر مارا جائے گا۔ اور اگر وہ تیس مرتبہ ننگے پیر خانہ کعبہ کی طواف لگائیں تو بھی خدا انہیں معاف نہیں کرے گا کیا معنی رکھتا ہے؟ دراصل اصلاح پسند داؤدی بوہرے سیدنا صاحب کے انہی رویے کی اصلاح چاہتے ہیں۔

اصلاح پسند بوہروں کے کاز کا یہ تو ایک پہلو ہوا۔ اس کا دوسرا پہلو بھی بہت اہم ہے۔ اصلاح پسند بوہرے آج مسلمانوں سے میل جول بڑھا رہے ہیں [illegible] کو فخر کے ساتھ اسلامی دھارے [illegible] کرتے ہیں۔ اور اپنا اسلامی تشخص بتاتے [illegible] ان کے برخلاف سیدنا آئیڈنٹیٹی پر اصرار کرتے ہیں۔ بوہروں کو اپنے فرقے [illegible] دیواروں میں محبوس رکھنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ اسی میں ان کا مفاد مضمر ہے۔ اس نقطہ نظر سے بھی مسلمانوں کا فرض ہو جاتا ہے کہ وہ اصلاح پسندوں کا ہر طرح سے ان کی جدوجہد میں ساتھ دیں۔

جمیل منظر سنساروی




جمہوریت کے
کروڑوں
ستون
چار ہفتے پیشتر
دسمبر کے آخری ہفتے میں
ہمارے کروڑوں
شہری اور دیہاتی
بڈھے اور جوان
مردوں اور عورتوں نے
اُمڈ کر
اپنی حکومت
مُنتخب کی
اور آزادو ووٹ
اور جمہوریت کی طاقت کو
ایک بار پھر نمایاں کیا۔
جمہوریت اور آزادی
ہمارا بیش قیمت خزانہ
اور بے بہا ورثہ ہے۔
آئیے
اپنی جمہوریہ کی
35 ویں سالگرہ پر
اسے برقرار رکھنے
کا عہد کریں۔
اتحاد اور مضبوطی کے ساتھ
davp 85/372

کلیم الدین شمس

انٹرویو :- امان اللہ محمد

مسلمانوں کیلئے ملازمتوں میں ریزرویشن لازمی ہے

مغربی بنگال اسمبلی کے ڈپٹی اسپیکر جناب
کلیم الدین شمس نہ صرف آل انڈیا فارورڈ بلاک کے ایک
مشہور لیڈر ہیں بلکہ ان کا شمار ملک کے ممتاز ترین
مسلم رہنماؤں میں بھی کیا جاتا ہے ایک حالیہ انٹرویو
کے دوران انہوں نے جمہوریت اور مسلمانوں کے مسائل
پر اپنے جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

سوال :- کیا ہندوستان میں پارلیمانی جمہوریت کے ختم ہو جانے کا خطرہ ہے ؟

جواب : پارلیمانی جمہوریت کی بنیاد انگلستان میں ڈالی گئی۔ وہاں اس کی جڑیں مضبوط ہیں۔ وہاں کے جمہوری نظام کو مجھے قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ گرچہ ہندوستان میں گذشتہ ۴۳ سال سے پارلیمانی جمہوریت قائم ہے۔ پھر بھی یہ تیسری دنیا کا واحد ملک ہے جہاں پارلیمانی جمہوریت سب سے زیادہ کامیاب ہے اور عمدگی سے کام کر رہی ہے۔ ہندوستان چونکہ کثیر قومی ملک ہے حکومت میں تمام طبقوں کی معقول نمائندگی کے لئے یہی ایک ایسا سسٹم ہے جو سبھوں کی نمائندگی کر سکتا۔ یہاں دوسرا کوئی نظام کامیاب نہیں ہو سکتا۔ البتہ ہم اس کی کوشش کامیاب ہو گا

ملک میں پارلیمانی نظام حکومت کے علاوہ دوسرے کسی نظام حکومت کے لئے فضا سازگار نہیں ہے۔

سوال: کیا ملک میں صدارتی نظام حکومت قائم کیا جا سکتا ہے؟ کیا آپ اس کی حمایت کریں گے؟

جواب: صدارتی نظام حکومت اکثریت کی حکومت ہوگی۔ اقلیت کو نظر انداز اور محروم کر دیا جاتا ہے۔ میں چونکہ اقلیتی فرقہ سے تعلق رکھتا ہوں اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ اقلیت ہی سب سے زیادہ پریشان ہوگی لہٰذا اس کی حمایت کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔

سوال: کیا ہندوستان میں کسی ایک خاندان کا راج ممکن ہے؟

جواب: اس ملک میں کسی ایک خاندان کا راج ممکن نہیں۔ لیکن اگر ایسا ہوا تو وہ دن بڑا تاریک ہوگا اور سب کے لئے بڑا بھیانک ہوگا۔ ملک کو متحد رکھنا بھی بڑا مشکل ہو جائے گا۔

> سب سے پہلے ڈاکٹر فاروق عبداللہ نے وزیر اعظم مسز گاندھی کو خبر دی تھی کہ لداخ میں پاکستانی حملہ ہونے والا ہے۔ وہ پاکستانی دلال ہوتے تو خبر کیوں دیتے؟

سوال: کیا آپ سمجھتے ہیں کہ مسز گاندھی ملک کے موجودہ نظام کو بدل دینگی؟

جواب: وہ صدارتی نظام حکومت لانا چاہتی ہیں لیکن ان کے پاس ذرائع نہیں ہیں۔ اگر وہ ایسا کریں گے تو ان کے اپنے لوگ ان کا ساتھ نہیں دیں گے۔ اور نہ ہی وہ اس کے لئے تیار ہیں۔

سوال: جموں و کشمیر کے سابق وزیر اعلیٰ ڈاکٹر فاروق عبداللہ کی حکومت کی برطرفی کیا قانونی تھی؟

جواب: ڈاکٹر فاروق کی جمہوری حکومت کی برطرفی مکمل غیر قانونی تھی ملک کے دستور کی دفعہ ۳۷۰ کے تحت موجودہ ہندوستان میں گورنروں کو جو اختیارات حاصل ہیں وہ کشمیر کے گورنر کو حاصل نہیں ہیں۔ سید میر قاسم جب کشمیر کے وزیر اعلیٰ تھے اور معاہدہ کے تحت شیخ عبداللہ (مرحوم) کو سید میر قاسم کو ہٹاکر وہاں کا وزیر اعلیٰ بنایا گیا اس وقت ان کی پارٹی میں صرف دو اراکین تھے یعنی مرزا افضل بیگ اور بذات خود، تین ماہ کے بعد مرحوم شیخ عبداللہ گورنر کے پاس گئے اور اسمبلی تحلیل کرنے کی درخواست کی۔ دستور کی دفعہ ۳۷۰ کے تحت اسمبلی توڑ دی گئی۔ اور الیکشن کرایا گیا۔ ڈاکٹر فاروق عبداللہ کی حکومت کو اکثریت حاصل تھی۔ گورنر جگموہن سے انھوں نے اسمبلی توڑ کر الیکشن کرانے کی درخواست کی لیکن الیکشن نہیں کرایا گیا بلکہ ان کی حکومت کو برطرف کر دیا گیا۔ یہ بالکل غیر قانونی حرکت تھی۔ گورنر جگموہن نے دستور کی خلاف ورزی کی ہے۔

سوال: کیا ڈاکٹر فاروق مسز گاندھی کے لئے ایک خطرہ تھے؟

جواب : مسز گاندھی اپنے سایہ پر بھی اعتماد نہیں کرتی ہیں ۔ ڈاکٹر فاروق کی برطرفی سے پندرہ دن قبل کشمیر کے لداخ کی سرحد پر پاکستان اور ہندوستان کی فوجوں میں تصادم ہوا ۔ تصادم سے دس روز قبل ڈاکٹر فاروق نے مسز گاندھی کو مطلع کیا تھا کہ حملہ ہو سکتا ہے ۔ اس وقت تک مرکز کی خفیہ ایجنسی کو اس امر کی اطلاع نہیں ملی تھی صرف ڈاکٹر فاروق کو اس کی خبر تھی ۔ ڈاکٹر فاروق کو پاکستان سے اگر ذرہ برابر بھی محبت ہوتی یا لگاؤ ہوتا تو وہ مسز گاندھی کو خبر نہ دیتے ۔ ممکن ہے ایسی صورت میں لداخ میں بڑی جھڑپ ہو جاتی اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ ملک کے لئے خطرہ نہیں ہیں ۔ اور نہ ہی وہ پاکستان نواز ہیں ۔ بلکہ وہ کٹر ہندوستانی ہیں ۔

سوال : ڈاکٹر فاروق کو اگر عوام کی حمایت حاصل تھی تو وہاں تحریک کیوں نہیں چلی ۔ ؟

جواب : وہاں تحریک چل سکتی تھی لیکن ڈاکٹر فاروق عبداللہ نے محسوس کیا کہ ان کی برطرفی کے بعد حکومت نے وہاں کے ہر چار آدمی پر ایک فوج متعین کر دیا ہے اس سے ناجائز فائدہ اٹھا کر بے گناہ لوگوں کا خون بہا دیا جائے گا ۔ اس وجہ سے اب تک انہوں نے کوئی زوردار تحریک نہیں چلائی ۔ یہ درست ہے کہ کشمیری عوام ان کے ساتھ ہیں ۔

سوال : کیا ڈاکٹر فاروق ملک کے مسلمانوں کے لیڈر بننا چاہتے تھے ۔ ؟

جواب : یہ درست نہیں ہے کہ وہ ہندوستان بھر کے مسلمانوں کے لیڈر بننا چاہتے تھے ۔ ان کے ذہن میں ایک بات ضرور ہے کہ آنے والے وقت میں ملک میں جو انقلاب آئے گا وہ اس وقت تک مکمل اور کامیاب نہیں ہو گا جب تک مسلمان اس انقلاب کا ساتھ نہیں دیں گے ۔ ملک میں آنے والے اس انقلاب کو کامیاب بنانے کے لئے وہ اپنا حصہ ادا کرنا چاہتے ہیں ۔

سوال : کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ملک کے مسلمان میں قیادت کا فقدان ہے ؟

جواب : یہ حقیقت ہے کہ ملک کے مسلمانوں میں قیادت کی کمی ہے ۔ مسلمانوں کے چند پرانے لیڈر رہا ہے وہ مذہبی ، سماجی یا سیاسی لیڈر ہوں ملک کی سیاست پر چھائے ہوئے ہیں ۔ اور انہوں نے ایسا گھیرا ڈال رکھا ہے کہ نئے مسلم نوجوان لیڈروں کو ابھرنے نہیں دیتے ۔ جب تک یہ پرانے لیڈر ختم نہیں ہو جاتے اس وقت تک نوجوان مسلم لیڈر نہیں ابھریں گے اور اس طرح قیادت کا فقدان رہے گا ۔ مسلم متحدہ محاذ کو آندھرا پردیش کے حالیہ واقعہ سے بڑا دھکا پہونچا ہے ۔ مجلس اتحاد المسلمین نے مسٹر راماراؤ مخالف کیمپ میں شامل ہو کر خود کو ملک کے عوامی دھارے سے الگ کر لیا ۔ عملی طور پر مسلم متحدہ محاذ کا جنازہ نکل گیا ۔ مسلم قیادت ملکی سطح پر نہیں بلکہ صوبائی سطح پر ابھاری جائے صوبائی سطح کی قیادت بدلے ملکی سطح پر غور و فکر کرے مسلم قیادت کی شکل ذاتی نہیں بلکہ اجتماعی ہونا چاہئے ۔

سوال : کیا مسلمان کسی تنظیم کے تحت ایک پلیٹ فارم پر آسکتے ہیں ؟

جواب : مسلمانوں کو ایک سیاسی پلیٹ فارم پر لانا ایک خودکشی ہوگی ۔ چونکہ اس ملک میں پارلیمانی جمہوریت ہے اخبارات کو بھی پوری آزادی ہے ۔ اگر مسلمان کسی ایک تنظیم میں رہیں گے تو اس پر بڑی آسانی سے کڑی نظر رکھی جائیں گی ۔ اس طرح وہ آسانی سے گرفت میں آجائیں گے ۔ مسلمانوں کو کسی ایک تنظیم میں نہیں بلکہ ہر پارٹی میں رہنا چاہیے ۔ اور وہاں رہ کر اپنے مطالبات کے لئے ہر پارٹی پر دباؤ ڈالنا چاہیے ۔

سوال : کیا آر ایس ایس میں بھی مسلمانوں کو شامل ہونا چاہیے ۔؟

جواب : اگر آر ایس ایس کا دروازہ مسلمانوں کے لئے کھول دیا جائے تو مسلمان صلح حدیبیہ کو مشعل راہ بنا کر اگر اس میں شامل ہو جائیں تو وہاں بھی وہ انقلاب برپا کر سکتے ہیں ۔

سوال : کیا مسلمانوں کو صرف مسلم امیدواروں کو ووٹ دینا چاہیے ؟

جواب : نہیں یہ بالکل غلط فلسفہ ہے مسلمانوں کو صرف بایاں بازو اور جمہوری پارٹیوں کے امیدواروں کو ووٹ دینا چاہیے ۔ فرقہ پرست پارٹیوں کو نہیں ۔

> ملک کے دستور کو اگر قرآن پاک کے سانچے میں ڈھال دیا جائے تو پھر ملک میں نہ فرقہ پرستی، نہ علاقہ پرستی اور نہ ہی چھوت چھات کا کوئی مسئلہ رہے گا۔

سوال : کیا ہندوستان میں مسلمانوں کی ایک متحدہ پارٹی کا قیام ممکن ہے ؟

جواب : ممکن نہیں ۔ اگر ایسا کیا گیا تو یہ کامیاب نہیں ہوگی ۔

سوال : ہندوستان میں فرقہ وارانہ فسادات کا حل کیا ہے ۔؟ اس پر کیسے قابو پایا جا سکتا ہے ؟

جواب : فرقہ وارانہ فسادات کو روکنے کے دو حل ہیں ۔ کم مدتی، اور طویل مدتی ۔ کم مدتی حل میں فرقہ وارانہ فسادات کے خلاف ایک منظم فورس پورے اختیارات کے ساتھ قائم کی جائے جس میں پچاس فیصد اقلیتی کے لوگ شامل کئے جائیں ۔ اور پچاس فیصد دیگر طبقہ کے لوگ ہوں ۔ فسادات کا تحفظ کرنے والی انشورنس اسکیم نافذ کئے جائیں ۔ فسادات میں جو لوگ مارے جائیں انہیں کم سے کم ایک لاکھ روپے کا معاوضہ دیا جائے جہاں فسادات ہوں وہاں کے انتظامیہ کے تمام ذمہ دار افسران کو فوراً معطل کر کے ان کے خلاف سخت ترین تادیبی کارروائی کی جائے طویل مدتی حل کے تحت جائیداد کے حق کو منسوخ کر دینا چاہیے ۔

سوال : کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ملک میں فرقہ وارانہ فسادات کی وجہ سے مسلمانوں کا اعتماد اٹھ گیا ہے ؟

جواب : مسلمانوں کا اعتماد درحقیقت ملک پر سے نہیں بلکہ یہاں کی انتظامیہ پر سے اٹھتا جا رہا ہے ۔ انتظام

اس وقت تک درست نہیں ہو سکتی جب تک اس میں مسلمانوں کے دل و دماغ کو شامل نہ کیا جائے۔ اور انہیں مناسب نمائندگی نہ دی جائے۔

سوال: ملک کے مسلمانوں کے بارے میں آپ کی پارٹی نارورڈ بلاک کی کیا پالیسی ہے؟

جواب: ہماری پارٹی محسوس کرتی ہے کہ موجودہ ڈھانچے میں مسلمانوں کے ساتھ سوتیلے پن کا سلوک کیا جارہا ہے۔ اور ان کے جائز حقوق سے انہیں محروم رکھنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ موجودہ ڈھانچہ میں صحیح معنوں میں مسلمانوں کو ان کا حق مل سکتا ہے صرف دستور میں ترمیم کی ضرورت ہے۔

سوال: کیا آپ ملک میں مسلمانوں کے لئے جاب ریزرویشن کی حمایت کرتے ہیں؟

جواب: مسلمانوں کے لئے جاب ریزرویشن انتہائی ضروری ہے۔ اس کی دو شکلیں ہیں یا تو مکمل طور پر پورے ملک میں آبادی کے لحاظ سے مسلمانوں کے لئے ملازمت کا کوٹا مقرر کیا جائے اس میں اگر دشواری ہو تو ریاستی سطح پر کیا جائے۔ جب تک ایسا نہیں ہوتا مسلمان یہ محسوس کرتے رہیں گے کہ ملک میں ان کے ساتھ سوتیلے پن کا سلوک ہو رہا ہے۔

سوال: کیا مسلم پرسنل لا میں تبدیلی کی ضرورت ہے؟

جواب: بالکل نہیں۔ میرا ایمان ہے کہ قرآن پاک کسی مخصوص وقت کے لئے نازل نہیں کیا گیا۔ بلکہ قیامت تک کے لئے ہے۔ اس کی یہ خصوصیت ہے کہ جس زمانہ میں بھی اس کی رہنمائی حاصل کی جائے وہ اس دور کے لئے درست اور موزوں ثابت ہوگا۔ چاہے وہ کوئی بھی دور ہو مسلم پرسنل لا ہی نہیں بلکہ ملک کے دستور کو بھی اگر قرآن پاک کے سانچے میں ڈھال دیا جائے تو پھر ملک میں نہ تو فرقہ پرستی، نہ علاقہ پرستی اور نہ ہی چھوت چھات کا کوئی مسئلہ رہے گا۔

سوال: کیا آپ سمجھتے ہیں کہ بایاں محاذ مغربی بنگال میں مسلمانوں کے لئے کوئی بھلائی کا کام کیا ہے؟

جواب: بایاں محاذ کی حکومت نے یہاں کے مسلمانوں کے لئے اگر کچھ کیا ہے تو ایک کام ضرور کیا ہے کہ اسے مسلمانوں کا اعتماد حاصل ہے۔ مسلمان یہ سمجھتے ہیں کہ بایاں محاذ اگر انہیں کچھ نہیں دے سکتا ہے تو کم سے کم اس بات کی گارنٹی ضرور دیتا ہے کہ وہ رات کو چین کی نیند سوتے ہیں۔

سوال: کیا گارڈن ریچ کے حالیہ واقعہ سے مسلمان بایاں محاذ کے خلاف ہو گئے؟

جواب: یہ بات بالکل غلط ہے کہ اس واقعہ سے مسلمان محاذی حکومت کے خلاف ہو گئے تھے

مسلمانوں کے لئے جاب ریزرویشن لازمی ہے وہ محسوس کرتے ہیں کہ ان کے ساتھ سوتیلے پن کا سلوک ہو رہا ہے

سوال: کیا گارڈن ریچ کے واقعہ کے پیچھے جماعت اسلامی، کانگریس یا کسی فرقہ پرست جماعت کا ہاتھ تھا؟
جواب: جماعت اسلامی، آر ایس ایس، کانگریس اور خاص کر کچھ اخبارات جن میں دو اردو اخبار بھی شامل ہیں گارڈن ریچ کے واقعہ سے پیدا ہونے والے حالات سے فائدہ اٹھانے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔
سوال: کیا کلکتہ میں بنگلہ دیش کے بہاری مسلمانوں کا کوئی مسئلہ ہے۔ جیسا کہ الزام لگایا جاتا ہے؟ کیا وہ یہاں مقیم ہیں؟
جواب: بنگلہ دیش سے بہاری مسلمانوں کا یہاں آنے کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔ وہ آئیں گے تو پھر بہار، یوپی وغیرہ جائیں گے۔ بنگال میں کیوں رہیں گے۔ ہندو فرقہ پرست لوگوں نے یہاں بہاری مسلمانوں کا ہوا کھڑا کیا ہے۔ یہ ایک سوچی سمجھی اسکیم ہے۔ بہاری مسلمان آج بھی بنگلہ دیش کے کیمپوں میں موجود ہیں اور وہ ہندوستان کے مسلمانوں سے بہتر زندگی گزار رہے ہیں۔
سوال: کیا شہر میں ہاکروں کا مسئلہ ہے اور ان سے ٹریفک کا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ محاذی حکومت نے اسے کہاں تک حل کیا؟
جواب: یہ مسئلہ شہر میں خود ہی پیدا کیا گیا ہے۔ اسے بڑی آسانی سے حل کیا جا سکتا ہے۔ حکومت نے اس پر کبھی سنجیدگی سے غور نہیں کیا۔ اسپلینڈ میں ٹرام گمٹی پر چھت بنا دی جائے اور نیچے دکانیں نکال دی جائیں۔ میدان تک اس طرح اوپر یا نیچے چھتیں بنا کر ہاکروں کو بسایا جا سکتا ہے۔ ہاکروں کا مسئلہ بھی حل ہو سکتا ہے اور ٹریفک کے مسئلہ پر بھی قابو پایا جا سکتا ہے۔ ٹریفک کا مسئلہ ہاکروں سے نہیں ہے۔ غلائی اوور (ہوڑہ سے برابورن روڈ تک) کے نیچے اگر دکانیں بنا دی جائیں تو ہوڑہ سے نیشنل لائبریری تک دکانیں بنا کر ہاکروں کو آباد کیا جا سکتا ہے۔
سوال: کیا مغربی بنگال میں اردو کے ساتھ بایاں محاذ کی حکومت ناانصافی کر رہی ہے؟
جواب: اردو کو ترقی دینے کے سلسلے میں حکومت جو کام کرنا چاہتی ہے وہ بدقسمتی سے کچھ لوگوں کے غلط شور سے نہیں کر پا رہی ہے۔ زیادہ افسوس ناک بات یہ ہے کہ اردو کے مسئلہ پر حکومت کچھ قدم اٹھانا چاہتی ہے تو مسلمانوں کے ہی ایک طبقہ کی وجہ سے نہیں کر پاتی۔ کیونکہ وہ طبقہ حکومت کو یہ سمجھانا چاہتا ہے کہ اردو کو اگر زیادہ سہولتیں دی جائیں گی تو غیر مسلم، بنگالی مسلمان ناراض ہو جائیں گے جس کی وجہ سے حکومت مجبور ہو جاتی ہے۔ اردو اور بنگلہ کے درمیان خلیج کو پُر کرنے کی ضرورت ہے۔ ایک ایسی تحریک چلانے کی سخت ضرورت ہے جس میں بنگلہ مسلمانوں کو بھی شامل کیا جائے۔ مرحوم فضل حق نے بھی اس سلسلے میں پہل کی تھی۔ مغربی بنگال میں بنگالی اور غیر بنگالی کا مسئلہ نہیں۔ لیکن کچھ سالوں سے یہ سازش کی جا رہی ہے کہ اردو اور بنگلہ کے نام پر تنازعہ پیدا کیا جائے۔ اردو طبقہ کو آگے بڑھ کر حکومت پر

دباؤ ڈالنا چاہئے کہ جس طرح اردو اکیڈمی بنائی گئی ہے اسی طرح عربی اکیڈمی بھی بنائی جائے۔ عربی زیادہ دنیا میں بولی جاتی ہے۔ اقوام متحدہ میں بھی منظور شدہ سرکاری زبان ہے۔ عربی اکیڈمی کے ذریعہ مذہبی مسلم عوام سے رابطہ قائم ہو سکے گا۔

سوال: آئندہ پارلیمانی الیکشن میں کیا مخلوط حکومت کا امکان ہے؟

جواب: گذشتہ چند دنوں میں جو سیاست میں تبدیلی آئی ہے اس سے مسز گاندھی کی حالت خراب ہو گئی ہے چرن سنگھ اندرا کے لئے ایک چیلنج ہیں۔ چرن سنگھ کی دلت مزدور کسان پارٹی کے پیچھے صرف چرن سنگھ ہی نہیں، بلکہ بہوگنا، فاروق عبداللہ، میر قاسم، کرونانیدھی، این۔ ٹی آر۔ وغیرہ بھی ہیں۔ ہندوستان کے عوام بی جے پی کو پسند نہیں کرتے۔ موجودہ حالات میں مسز گاندھی کے لئے ۵۰ فیصد سیٹیں حاصل کرنا دشوار ہوگا۔ ایسی صورت میں مرکز میں ایک مخلوط حکومت کے قیام کو خارج از امکان نہیں کہا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر شعیب راہی

ظہیر صدیقی کی نظموں میں سماجی حقیقت نگاری

لینن نے سماجی حقیقت نگاری کی تعریف ان الفاظ میں بیان کی ہے:۔

"IT IS DECID BY ESSEUTIAL TO PUT CREATIVE ART AT THE SERVICE OF THE PROLETARIAN REVOLULECTION IN THE STRUG-GLE AGAINST FACISM. AGAINST CAPITALISOM IN THE STRUGGLE FOR THE MOBILIZATION AND REVOLUTIONARY UPBRING OF THE MASSES"

(LENIN ON ART AND LITRATURE. P. 183)

ماؤزے تنگ نے سماجی حقیقت نگاری کو ان الفاظ میں لکھا ہے:

"LARGE NUMBER OF PEOPLES EDUCATORS TEACHER, SCIENTISTS, ENGENEERS, TECHNICI-ANS, PHYSICIONS, JOURNALIST, WRITERS, ARTIST AND OTHER CULTURAL WORKS ARE NEEDED TO SWEEP AWAY IMPERIALISM AND BEUDAL APERALIOUS AND BUILD A NEW DEM-OCRATIC CHINA."

(MAO ON ART AND LITRATURE. P. 112)

ماہیا ہے ، رہا ہے

مشہور سوویت ناقد روزن تال نے لکھا ہے کہ کامریڈ اسٹالین نے سماجی حقیقت نگاری کو اشتراکی حقیقت نگاری سے تعبیر کیا ہے اور لکھا ہے :

"اشتراکی حقیقت نگاری کا فن اپنی آئیڈولاژی کے بہترین پہلو سوویت یونین کی سماجی زندگی سے حاصل کرتا ہے ۔ سوویت سماج سوویت عوام کی زندگی دنیا کی سب سے زیادہ ترقی یافتہ آئیڈولاژی سے مالامال ہے .... اشتراکی حقیقت نگاری سوویت ادب اور ادبی تنقید کا بنیادی طریقہ ہے "

(سوویت جمالیات ، علم و دانش صفحہ ۳۹)

ان بیانات کی روشنی میں یہ حقیقت واضح ہے کہ سماجی حقیقت نگاری کوئی سانچہ نہیں جس میں ادبی تخلیق کو ڈھال لیا جائے ۔ بلکہ یہ ایک اصول اور نقطۂ نظر ہے ادب میں سماجی حقیقت نگاری کے ذریعہ ایک طرف تو ہم قاری کو اس کی سماجی حالتوں سے آگاہ کرتے ہیں دوسری طرف ادبی تخلیق کے ذریعہ سماج کو پہچانتے ہیں ۔

ہندی کے مشہور کہانی کار بھیشم ساہنی نے اپنے ایک روسی دوست کا واقعہ بیان کیا ہے جنہوں نے گئودان کا مطالعہ کیا تھا ۔ جب ان کے روسی دوست ہندوستان آئے اور کسی دیہات میں کسان کو دیکھا تو اچانک بول اٹھے ، یہ ہوری ہے ۔

دراصل ادبی تخلیقات پر یہی سماجی حقیقت نگاری ہے کہ ہم ان میں پیش کئے گئے واقعات ، کردار ، منظر اور احساس کو پہچان لیں ۔ اور اس کے توسط سے اپنے سماجی افراد اور حالات سے روشناس ہو جائیں ۔ ادبی تخلیق سماج اور قاری تینوں کے درمیان ایک ربط ہے ۔ ادیب ، ادب اور سماج کے درمیان ایک کڑی کی حیثیت رکھتا ہے ۔ اس ربط کو زیادہ گہرا اور پائیدار بنانے کے لیے ضروری ہے کہ ادب میں سماج کی حقیقت نگاری کو زیادہ واضح اور پائیدار بنایا جائے ۔ یہ اس وقت ممکن ہے جب ادیب سماج سے گہرا رشتہ رکھے ۔ ادیب کی ذات ، سماج اور قاری کے درمیان ایک ایسا وسیلہ ہے جو ایک طرف قاری کو سماج سے روشناس کراتا ہے دوسری طرف ادب کو سماج کے بالکل قریب لے آتا ہے ۔ اور یہیں سے ادب کے اندر سماج کی حقیقت نگاری شروع ہو جاتی ہے ۔ ادب کی ارفع و اعلیٰ قدر یہی ہے ۔

ادب میں سماجی حقیقت نگاری سماجی شعور سے پیدا ہوتی ہے ۔ سماج میں غربت ، بے روزگاری ، بھوک مری ، ناداری غرض کہ ہر طرف بڑی تباہی ہے ۔ ہم سر چھپاتے ہیں تو پیر کھل جاتا ہے ۔ پیر ڈھانکتے ہیں تو سر کھل جاتا ہے ۔ بہت سے ادیب اور شاعر اس حقیقت سے چشم پوشی کرتے ہیں ۔ وہ دانستہ طور پر

اس کی آگہی سے بچتے ہیں۔ وہ نہیں چاہتے کہ سماج کی یہ حقیقت ادب میں پیش کی جائے۔ وہ ادھر ادھر کی باتیں پیش کر کے اپنے ادبی فرائض سے سبکدوش ہو جانے کی کوشش کرتے ہیں۔ یا پھر ایسے ایسے فلسفیانہ نکتے اور موشگافیاں بیان کرتے ہیں جن کا عوامی زندگی اور سماجی مسائل سے کوئی تعلق نہیں۔ وہ دراصل اپنے قاری سے سماجی حقیقت کو پوشیدہ رکھنا چاہتے ہیں اس طرح وہ اس طبقے کی خدمت گزاری کا فرض انجام دیتے ہیں۔ جو سماج میں غربت و افلاس، جہالت، ناداری اور فلاکت کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔ مزدوروں کی قدر زائد (SURPLUS VALUE) اور کسانوں کے ہل پر جیتا ہے۔

لیکن ظہیر صدیقی کی نظمیں پڑھنے کے بعد میں نے ایسا محسوس کیا ہے کہ ان کے یہاں انقلابات پر قوت تصور پہلے ہی بہت کمزور صورت میں ہو سماجی ناانصافی اور کلفت اور غم نصیبی ہر جگہ جھلکتی ہے۔ اور کہیں کہیں شدت کے ساتھ جھلکتی ہے ؎

"وہ بچہ
جس سے ماں کی گود
شفقت باپ کی، طفلی میں چھن جائے
وہ شوہر
جس کی بیوی، ایک کرایہ کے مکان میں قید ہو
وہ باپ
جو بچوں کی فرمائش پہ بغلیں جھانکتا ہو
وہ ملازم
جو ذرا تاخیر لگ جانے کے ڈر سے
پاؤں سر پہ رکھ کے دفتر بھاگتا ہو
ایک معمولی سا لاغر آدمی ہے
داد، یا تضحیک کا وہ مستحق ہرگز نہیں ہے"

دفتروں میں کام کرنے والے لوگوں، خصوصیت سے متوسط طبقے کے افراد کی حقیقی فکر اور جذبے کی بھرپور عکاسی ان کی نظم "تیرہ گھنٹوں کا دیوتا" میں ملتی ہے ؎

ضرورتوں کا اک پجاری
جو اپنے سارے لہو کے بدلے
مسافت آفتاب کے

دس سے
پانچ تک
قبیح عمروں کے دیوتا کے قدم پہ
قربان کر رہا ہے "

اس قربانی کے باوجود ضرورت کے دیوتا نے شاعر کی تشنگی کو کجلا دیا اور اس کے ڈگری کے لفظوں کو ننگا کر دیا۔ اسی سماجی شعور نے ظہیر کو بلندی زمین کا معترف بنا دیا وہ تو آسمان سے زیادہ ذہین اور عظمت کے قائل ہیں

اڑان جتنی ہوا دیجی کبوتری آخر
غذا کے واسطے سطح زمیں پہ آئیگی

عظمت زمین کا یہی اعتراف احساس اور شعور ان کے یہاں سماجی حقیقت نگاری ہے۔ ان کی نظم میں خود ان کی اور ان کے ہم پیشہ افراد کی سرگزشت کا حقیقی عکس ہے۔ ان کے شعور نے ان کو بہت سے عام موضوعات کو نظم کرنے کی طرف متوجہ کیا ہے ؎

لوگ اکڑی بیٹھ رے کر دفتروں سے چل پڑے
میز کرسی کو ملا آرام گویا صبح تک

قتیل نور ظلمت ایک خوب صورت نظم ہے جو سماج میں ہونے والے ظلم و ستم کی داستان سناتی ہے

"ہاں ! ہاں ! سُنا ہے
مگر اپنی آنکھوں سے آرائش گلستاں کے
گہربار منظر میں دیکھوں تو کیسے
سلگتے ہوئے دن کے کرنوں کی برچھی
مرے شب گزیدہ ارادوں کے دل میں
ترازو ہوئی ہے "

ظہیر کے یہاں سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ اپنے طبقے کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ان کا تعلق نچلے متوسط طبقے سے ہے۔ ان کی نظموں میں ان کے طبقے کا کرب، بے کلی، اضطراب، حالات سے کترا کر گزر جانے کی کیفیت اور صبر و قناعت، اور خواہش و ہوس کا میابی کی تمنا، اور کامرانی کا احساس۔ غرض کہ نچلے متوسط طبقے کے افراد و خاندان میں جو احساس اور شعور پائے جاتے ہیں ان کی بڑی عمدہ ترجمانی جگہ جگہ ملتی ہے ؎

یہ چند لمحوں کی نغمگی
کاش اپنی صدیوں میں پھیل جائے

کہ مرتعش انگلیوں میں
پیالی کی تھرتھراہٹ
خرامِ آہو کی دھیمی آہٹ کا یہ سفر
ختم ہی نہیں ہو"
(گلی سے آتی ہوئی صداؤں کو کوئی روکے)

لیکن خوشی اور مسرت کی صرف آرزو ہی نچلے متوسط طبقے کا نصیب ہے۔ اس کی تمنا منتشر اور بے بس سماج میں کبھی پوری نہیں ہوتی ہیں۔ اور نہ ہو سکتی ہیں۔ کیونکہ طبقاتی سماج میں اس طبقے کے افراد مظلوم ہیں یہ تک کہ وہ ظالم کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اس طبقے کے افراد صرف تاؤ کھاتے اور غصے میں اپنا ہی لہو پیتے ہیں۔ نچلے متوسط طبقے کی یہ تصویر نگاری ظہیر کی نظموں میں جگہ جگہ ملتی ہے۔

لیکن میں تو
سوکھے بازو
ابھری پسلی
پچکے گال اور خالی جیبیں دیکھ کے اپنی
چپ رہتا ہوں
اور میرے اور پر والے نوکیلے دانت بھر جاتے ہیں
ہونٹوں سے باہر آ جاتے ہیں
نچلے ہونٹ سے بھینچ جاتے ہیں
میرا سارا غصہ
نچلے ہونٹ کے خون میں تھراتا ہے"
(لپپائی)

یہ نچلے متوسط طبقے کی مظلومیت اور بے بسی کی حقیقی تصویر ہے جو گذشتہ بیس تیس سالوں سے تبدیلی حالات کی امید لگائے بیٹھا ہے۔

"عمر کے یہ تیس سال
تشنہ امید و ارماں
کرب و غم، درد و الم کی ......۳۰ سال"

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ امید و بیم لا متناہی سلسلہ ہو۔ اور یہ سلسلہ اس لئے جاری ہے کہ طبقہ

طبقے میں جرأت انقلاب کی کمی ہے۔

پھر وہی آغوش موجوں کی کھلی
پھر وہی میں اور میری بے کلی (اعراف)

اور پھر متوسط طبقے کا ستم رسیدہ انسان جو حالات سے کترا کر گزرتا ہے مقابلہ کرنا نہیں جانتا

میرے پیچھے آنے والو، اور اندھیرا لانے والو
میں بھی کترا کر نکلا ہوں راہ پتھر جوں کا توں ہے

لیکن ظہیر اس طبقاتی کشمکش میں مزدور طبقے کے ساتھ ہیں۔ کیونکہ مزدور ہی انقلاب کا ہراول دستہ ہے ان کے دل میں مزدوروں کے لئے عظمت اور احترام کا جذبہ پایا جاتا ہے۔

وہ موتی
تو دل کے صدف سے
تنی چھاتیوں
اور محنت فزا بازوں پر جھلکتے ہیں
ہونٹوں کی عذاب سے جھانکتے ہیں۔
(اندر کا المیہ)

وہ ساحل پر کھڑے ہو کر تماشہ دیکھنا نہیں چاہتے۔ بلکہ اپنے طبقے کی متزلزل اور مشکوک نفسیات۔ الگ ہو کر وہ حالات سے مقابلہ کرنے کی خواہش رکھتے ہیں اس لئے ایسے لوگ جو صرف ساحل پر کھڑے ہو کر تماشہ دیکھتے ہیں۔ ان پر طنز کرتے ہیں یہ طنز اکبر الہ آبادی کا نہیں جنھوں نے طنز کم اور چٹکلے زیادہ پیش کئے بلکہ سودا کی طرح ہے جو پورے سماجی تانے بانے کو گھیر لیتا ہے۔

بے کراں بحر کی پہنائی نگل نہ لے انہیں
موجۂ آب کی تلوار انہیں کاٹ نہ دے
ان کی ہستی حزیں
سیل امواج بلاخیز کی زد میں
نہ کہیں آ جائے (سبک ساران ساحل)

ظہیر کے یہاں سماجی حقیقت نگاری کی تصویر صرف عصر حاضر کی علامتوں میں ظاہر نہیں ہوتا۔ وہ ماضی کی کیفیتوں سے بھی کام لیتے ہیں۔ ان کے مواد اخذ کر کے سماجی بہتری کی خاص تصویر پیش کرتے ہیں آج کی سماجی ہئیت میں انھیں مثالی کردار بنا کر پیش کرتے ہیں۔ نظموں میں کچھار سازی اور ریشہ گری نا

ایک موقف ہے۔ وہ انسانی کردار میں ایک خاص بلندی کے متلاشی ہیں۔ اور اس بلندی کے اظہار کے لئے تاریخ اسلام کی روشن اور تابناک تلمیحوں کا استعمال کرتے ہیں۔ ان تلمیحوں کو واقعات کے ذریعہ ابھارتے ہیں صرف الفاظ یا تاریخی ناموں کا مصرف نہیں لیتے۔ وہ رسول کریم صلعم کی ذات بابرکات کی سیرت نگاری کے شاعرانہ انا پر کرتے ہیں۔ قابل دید ہے۔

وہ جس کی انگلی سے چاند شق ہو
وہ جس کے زخمی ذہن سے
دشمن کی فوج میں
رحمتوں کی ٹھنڈی پھوار برسے
وہ جس کی مٹھی میں
دو جہاں کی تمام دولت
تمام ثروت سمٹ گئی ہو
وہ اپنے حال شکم میں
پتھر کا بوجھ باندھے
کہاں ہیں اس کے غلام۔؟
آخر کہاں ہیں ــــ؟

(حصول گل اور ایک منظر)

اور پھر اسی لزم کی کردار نگاری اور سیرت گری کی ایک اور مثال دیکھئے۔

وہ ایک منظر
غلام ناقہ نشیں ہو
اور
نکیل آقا کے ہاتھ میں ہو
کہاں سے آئے۔ (حصول گل اور ایک منظر)

ظہیر ماضی کی طرف لوٹنا چاہتے ہیں مگر اس ماضی کی طرف نہیں جس نے شہنشاہیت کو جنم دیا بلکہ اس ماضی کی طرف جہاں غلام ناقہ نشیں ہے آقا کے ہاتھ نکیل ہے۔

اپنے منقار ہوس
ٹوٹے پروں میں ڈال کر کیا سوچتے ہیں

سر اٹھاؤ، آنکھ کھولو
سبز گنبد کے دریچے
بند پہلے بھی نہیں تھے
اب بھی وا ہیں
لوٹ سکتے ہو تو جاؤ" (مراجعت۔۳)

ظہیر ایک ایسا سماج چاہتے ہیں جہاں استحصال نہ ہو، غلام اور آقا کا فرق مٹ جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک غیر طبقاتی سماج کے متمنی ہیں:

"تو ایسا ہی ہوگا
کہ چیخوں کے عفریت
معصوم پرچھائیوں کو نگل جائیں گے
اور گنبد کے باہر کھڑی منتظر
وہ مہذب صدائیں بھی
تھک کر کہیں لوٹ جائیں گی
واپس نہ آئیں گے شاید"

(مہذب صدائیں، مقفل دریچے)

انہیں یقین ہے کہ انہیں ان کا ماضی مل جائے گا موجودہ سماجی نظام پرچھائیں ہے۔ جسے کچلے ہوئے عوام عفریت بن کر نگل جائیں گے۔

اصل روشنی انسان کی اپنی خود اعتمادی کی روشنی ہے جو پر اعتماد شخص کی آنکھوں سے نکل کر گرد و پیش کو منور کرتی ہے۔ ورنہ چراغ یا مشعل تو خارجی روشنی ہے۔ جو قابل اعتماد نہیں۔ ظہیر کی نظموں میں جا بجا انسان کے نورِ باطن پہ زور دیا گیا ہے۔ ان کے نزدیک انسان کا اصل اندر ہے وہ روح کے قائل ہیں۔ خصوصاً روشن پرنور اور پاکیزہ روح کے؛

ٹھوکریں کھاتا سنبھلتا
آج بھی وہ سوچتا ہے
روشنی تو خارجی شے ہے
دیا ہے، یا پھر کوئی مشعل ہے
آخرش یہ روشنی

ان اجنبی لوگوں کی آنکھوں سے اتر کر
ان کے قدموں سے لپٹ کر
چلنے والی روشنی کیسی ہے ؟
کیسی روشنی ہے ؟ (تاریک جنگل کا سفر)

داخلیت کی یہی روشنی ایسی انسانی ستیر کی تعمیر کرتی ہے وہ اپنے علام کو ناقہ کشین کرتی ہے۔ ظہیر عصر حاضر کی سماجی زندگی میں، بھی یہی روشنی پھیلانا چاہتے ہیں۔ وہ نہ مانگے ہوئے اجالے کے قائل ہیں۔ اور نہ جذبہ و احساس کی گدائی کے :

"اور وہ معصوم سادہ لوح
جو اپنی سماعت کی پنجی دولت گنوا کر
بھیک مانگے واسطوں سے
جذبہ و احساس کے گنجان جنگل سے
گزرنا چاہتے ہیں" (طفلانہ تقاضے)

بیداری ضمیر انسان کو بشریت عطا کرتی ہے لیکن یہ روشن ضمیری جب تک پیدا نہ ہوگی ہم میں خود اپنے سماج کی تعمیر اس کو سنوارنے اور بہتر بنانے کا احساس پیدا نہ ہوگا ظہیر کی نظموں میں عظمت بشریت کا یہ احساس ہر جگہ نمایاں ہے۔ وہ سچائی، نیکی، رحم دلی، مروت اور اعلیٰ غیر طبقاتی انسانی قدروں کے شاعر ہیں۔

بقیہ: نئی کتابوں کا تعارف

ابہام اور ترسیل کی ناکامی کا شکار ہو جاتا ہے۔

ویسے عرفان عارف کہانی کہنے کے فن سے واقف ہیں۔ موضوعات کا تنوع بھی ان کے یہاں ہے۔ بدلتے ہوئے حالات کے گہرے شعور کے ساتھ ساتھ شدید احساسات و جذبات بھی افسانہ نگار کے یہاں بیدار نظر آتا ہے۔ کتاب کی کتابت، طباعت خوب صورت اور سرورق معنی خیز ہے۔

کرفیو

(چار نظمیں)

(۱)

اور بند ہو گئے پنجرے کے سب دروازے
پنکھوں کی پھڑپھڑاہٹ تیز ہو گئی
شکاری نے جال بچھایا تھا
پنکھ تو کٹنے ہی تھے
پنجرے کے دروازے مضبوط کر دیئے گئے ہیں
جو بھی کرنا ہوں پنجرے کے اندر ہی کرنا ہے
سونی ہو گئی درخت کی شاخ
نیلا کھلا آکاش ——
گھروں کے کونے
اور چھت کی منڈیر
جاری ہے پولس کی گشت
دوڑتی ہے گاڑیاں
تنی ہے بندوقیں .....
بس نشانہ پر آنے کی دیر ہے۔
انگلی ٹریگر پر دب جائے گی
شہر میں کرفیو ہے

(۲)

دیکھو —— !
ایک سناٹا
بھیانک سناٹا چھایا ہے چاروں سمت
ایسے میں کہیں کچھ ہے تو
بوٹوں کی چرمراہٹ
پولس گاڑیوں کا دوڑنا
اور سونے شہر کا اپنا درد
شک میں ڈوبی ہر نظر
تلاش کرتی ہے دوسری آنکھوں میں
خوشبو اپنے پن کی
اور اپنا پن گم ہے کہیں
پتہ نہیں شاید انہیں کہ
شہر میں کرفیو ہے
سورج دھرتی پر اتر آیا ہے
لیکن ——
اندھیرا اور بڑھ گیا ہے۔

(۳)

دھواں دھواں ہو اٹھی ہیں سڑکیں
اور وقت کے قاتل ہاتھ
منڈلا رہے ہیں شہر میں
پتہ نہیں کب، کہاں
سناٹے کو چیر کر
ایک دھماکہ، ایک چیخ ابھر
اور پھر سب کچھ شانت ہو جائے
کہیں کچھ نہیں زندہ سی لگتی۔
بچوں کی معصوم مسکراہٹیں دم توڑ چکی ہیں

سہمی سہمی سی ماں بیٹے کو تھپکیاں دے رہی ہے
کہیں بچہ جاگ نہ جائے۔
اور باپ کے چہرے پر اُگی
چنتا کی جھرّیاں
کہہ رہی ہیں
باہر مت جاؤ
گھر میں ہی چور سپاہی کا کھیل کھیلو
سڑک پر بھیڑیوں کا گشت ہے

(۴)

بند بھی کرو اب
یہ لوٹ مار قتل آگ زنی کی باتیں
بور مت کرو یار
کرفیو کرفیو کہہ کر
کرفیو ہے تو کیا ہوا ـــــ ؟
رات تو اترنے دو ابھی
پھر دیکھنا
صبح پچھلے محلے سے اٹھائی گئی لڑکی کو
پولس گاڑی یہاں چھوڑ جائے گی
اور تب ـــــ؟
چلو تب تک جشن مناتے ہیں
کرفیو کا مزہ لیتے ہیں
آؤ ـــــ!
بیٹھ کر بیئر پیتے ہیں۔

ـــــ فضل امام ملک

"لیل و نہار"

دلداروں کی دلہن ہے "لیل و نہار" پیارے
لیلیٰ انجمن ہے "لیل و نہار" پیارے
پدما میں غوطہ زن ہے "لیل و نہار" پیارے
قزاق در فن ہے "لیل و نہار" پیارے
با اعتبار صورت بہ لحاظ معنویت
محبوبۂ زمن ہے "لیل و نہار" پیارے
تخلیق چھاپنے سے پہلے جواب دے دو
کیا واقف سخن ہے "لیل و نہار" پیارے
ڈنکے کی چوٹ پر میں اعلان کر رہا ہوں
گاؤں کی گھن ہے "لیل و نہار" پیارے
گر تم بُرا نہ مانو تو بات یہ بھی کہہ دوں
تحصیل زر کا فن ہے "لیل و نہار" پیارے
بانگ جرس نہیں ہے اے کاروان اردو
ناقوس اہرمن ہے "لیل و نہار" پیارے
بزم اعتنا سجائے آؤ کہ آج کے دن
مرگ عروس فن ہے "لیل و نہار" پیارے
بیدار راستے کا بیدار مغز شاعر
کہتا ہے راہزن ہے "لیل و نہار" پیارے

یاور آمان ـــــ بنگلہ دیش

غزلیں

فضا ابن فیضی

○

پنے ہی وجود سے مجھے نبرد سا
ک شگوفہ شاخِ ہوا دیہ زرد سا

اچلی کہ ہوئے خاک خاک سب
آئینہ وہی چہرے کی گرد سا

یہ عذاب یہ جذبوں کی شعلگی
میں کیوں لہو کا سمندر ہی سرد سا

یک جزو وقت کے منظر کدے کا میں
ہ نفس ہے مگر فرد فرد سا

بر کب اہلِ معانی کو ہو سکی
سے ہوں لفظ کے پہلو میں درد سا

یوں ہی سرِ دشت سرِ حرف
قلم ہی دستِ گریباں نورد سا

بھی سے فضا کبھی ہے بد حواس
نے راز شہر میں آوارہ گرد سا

○

یوں بھی آشوبِ مسلسل کا سفر ہے جاری
اک سیہ رات میں جنگل کا سفر ہے جاری

اور کیا چاہتی ہیں خشک زمینیں مجھ سے
میں سفر میں ہوں تو بادل کا سفر ہے جاری

راہ کی گرد ہوئیں سینکڑوں صدیاں لیکن
آج تک لمحۂ اول کا سفر ہے جاری

اپنے ماحول کا راکب ہوں ہزیمت کیسی
پاؤں زخمی ہی پیدل کا سفر ہی جاری

روکتی کیا مجھے حالاتِ وسائل کی گرفت
زندگی ہے تو یہ دلدل کا سفر ہے جاری

اسکو کہتی رہی بدلتی ہوئی دنیا کا شعور
آج کے حاشیے پر کل کا سفر ہے جاری

شاعری ہر کہ لپکتے ہوئے شعلوں پہ فضا
روحِ پیشینۂ و صندل کا سفر ہے جاری

آسی رام نگری

○

خورشید نکلنے سے رہا خود جو افق پر
خورشید اچھالیں کوئی ہم خود ہی افق پر

کجلایا سا یہ رنگ شفق کا کہ رنگ شفق ہے!
ہم رنگ چڑھائیں کوئی خود رنگ شفق پر

اس طرح اگانے سے رہے وہ مہ و خورشید
ہیں لوگ جمائے ہوئے نظریں جو افق پر

ویسے تو کئی نام ہیں دل پر مرے لیکن
اب تک ہے لکھا اک نام مرے دل کے ورق پر

دیکھے تو ذرا رنگ مجاہد کے لہو کا
ہے ناز اُفق کو جو بہت رنگ شفق پر

○

عجیب درد اکٹھا لائے داغ کے بدلے
نیا چراغ پرانے چراغ کے بدلے

پتہ نہیں یہ امیری ہے یا غریبی ہے
اسے نصیب ہے سب کچھ فراغ کے بدلے

نہیں یہ علم ہے کس حرف کو کہاں برتیں
دماغ رکھ انہیں دیتے ایاغ کے بدلے

یہ مانا ہوگا پہاڑوں کے اس طرف سب کچھ
بُرا ہی کیا ہے یہ گھر سبز باغ کے بدلے

ہر ایک بات مدلل ہوا نہیں کرتی
کبھی تو دل کی بھی سُن لو دماغ کے بدلے

وہ رات کٹ گئی اسکو تو خیر کٹنا تھا
اب آفتاب سنبھالو چراغ کے بدلے

○

اُٹھ گئے ہیں بتیس کی ترائی سے
دوستی کو دیا سلائی سے

کیسا پربت بنا ہے رائی سے
لیجئے پھر ٹھن گئی ہے بھائی سے

خوش گمانی سے ہم نے کام لیا
اس نے دھوکا دیا صفائی سے

ہم مہاجر نہ تم کوئی انصار
بات کرلو ذرا بھلائی سے

خیر اپنی منا رہا ہے غنیم
میں جو الجھا ہوا ہوں بھائی سے

بے وفا خیر ہم بھی تھے لیکن
دکھ ہوا اس کی بے وفائی سے

رؤف خیر

زباں کھل نہ سکی ان کے روبرو اکثر
تڑپ تڑپ کے رہی دل کی آرزو اکثر

تری نظر کی نوازش ہے یا کسک دل کی
نظر ملی تو ہوئی درد میں نمو اکثر

دلوں کی بات لبوں کی نہیں ہے کچھ پابند
نظر جھکا کے بھی ہوتی ہے گفتگو اکثر

جنوں کی خیر ہو، یہ جب بھی بڑھ گیا حد سے
بڑھی ہے شہرت صحرا بھی چار سو اکثر

ترے لبوں کی چٹک کی خبر نہیں تجھ کو
ذرا سی بات بھی ہوتی ہے کو بہ کو اکثر

گلوں کا حال دلوں سے نہ پوچھئے صاحب
کیا گلوں نے جگر کا لہو لہو اکثر

ترے گلاب تبسم کی خیر ہو یارب
اڑے ہیں لالہ و گل کے بھی رنگ و بو اکثر

ترا وجود بہاروں سے کم نہیں لگتا
مہکتا پھول لگے تری گفتگو اکثر

شکست کو نہ کبھی جانیئے شکست ادیب
بنی ہے زینہ ہی ناکام جستجو اکثر

عبدالقادر ادیب

غزلیں

زشن پرویز

دل لہو لہو سا ہے اور آنکھ پیاسی ہے
زندگی بھی کیا اپنی کوئی دیوداسی ہے

عشق کے مقدر میں حسن کی اداسی ہے
زخم ہے تر و تازہ اور پھول باسی ہے

آپ کے تغافل سے ہم تو لٹ گئے لیکن
لینے والے کہتے ہیں بات یہ ذرا سی ہے

جب کلی کلی میں ہے خون دل کی آمیزش
پھر بھی گلستاں میں کس لیے اداسی ہے

کیا یہی محبت ہے جس کا شور برپا تھا
لو ہکن کا کیا کہنا جوئے شیر پیاسی ہے

اب نظام نو میں بھی لوگ کیوں پریشاں ہیں
آج ہر قدم پر کیوں اس قدر اداسی ہے

رند بھی ہیں زاہد بھی صرف مئے نہیں پرویز
آج بادہ خانے میں کیسی بدحواسی ہے

ڈاکٹر ساقی مچھلی شہری

جب بھی ہمارے درد میں قدرت لگی ہوئی
اٹھی ہے تب افق سے ہوا جھومتی ہوئی

پھولوں سا جسم روح لطافت بھری ہوئی
بس اک ذرا ذرا سی بات جگر چیرتی ہوئی

چہرہ بتا رہا تھا حقیقت نہیں ہے یہ
لب کہہ رہے تھے "آپ سے مل کر خوشی ہوئی"

تھی راستے میں دھول ہی اتنی تو کیا کریں
چادر تو ہم بھی لے کے چلے تھے دھلی ہوئی

ہاتھوں میں لیکے دیپ کھڑے ہیں بہت سے لوگ
آنکھیں ہیں آفتاب کی جانب اٹھی ہوئی

جس کے مکیں کے جلنے کا مجمع کو رنج تھا
باہر ہے اس مکاں کی بھی کنڈی چڑھی ہوئی

ساقی اسے اصول بہت ہی عزیز تھا
جس کی ملی ہے لاش سڑک پر پڑی ہوئی

ماہ جبیں

(فیض احمد فیض کی موت پر)

زخم کوئی تاج جب تیار ہو!
ہاتھ کا رکھنا بھی اس پر بار ہو!
اس کو نرمی سے بھی سہلائے کوئی
درد کی تکلیف کچھ بڑھ جائے گی
زخم دل کی بات جب ہو درمیاں
درد کی شدت کا کیا ہو پھر بیاں
فیض کے مرنے کا جب میں نے سُنا
مجھکو میرے دوست کچھ ایسا لگا
جیسے بے رحمی سے ایکا یک مرے
زخم دل پر کوئی گھونسا مار دے

دشتِ ہنر

لقمان شوق

ہم اس جگہ کے ہیں رہنے والے
جہاں کی سوندھی سی مٹیوں نے
بہت سے پھولوں کی پرورش کی
بہت سی کلیاں نکھار دی ہیں
ہمارے دریا سے کتنے لوگوں
نے کھیتیاں اپنی سینچ لی ہیں
مگر یہ زرخیز سی زمیں اب
کسی بھی صحرا سے کم نہیں ہے!
یہاں نہ کوئی ہے پھول ہی اب
نہ کوئی غنچہ نہ کوئی خوشبو
کہ ایسے میں جو شجر یہاں سے
اکھڑ گیا کل کی آندھیوں میں
نہ تھا غنیمت تو اور کیا تھا

نذرِ فیض

ایم۔ کے۔ اثر

قبائے جاں پہ اتا پھر رفم طراز ہوئی
ہوا نے موڑ دیا مجھکو میری جانب یوں
صبا نے ستائی ہے نظروں سے چشم خانی کی
ہر اک نگاہ سے واضح ہے زخم سرگوشی
شگاف بن ہی گیا باعث ثبات تو کیا
متاع لوح و قلم کے لہو کی بارشں سے
جدام وقت متا تار ہا شناخت ، مگر

زباں ملی تو نئی وجہ ساز باز ہوئی
کہ قتل گہہ کی فضا اور دلنواز ہوئی
حیات ہے کہ ادھر خود سے بے نیاز ہوئی
بنام زیست روش تشکل امتیاز ہوئی
صدائے زخم کہاں اپنی بے گداز ہوئی
بنائے عقدہ کشائی بھی سرفراز ہوئی
اساس فکر میری النیام ناز ہوئی

ہمارے بیچ تھا وہ نقطۂ سلوک ادب
صدائے فیض اثر مخرب مجاز ہوئی

شروَن کمار ورما

مزاحیہ

اوکھلا

اوکھلی کبھی ہر گھر میں ہوا کرتی تھی۔ اکثر عقلمند سا سیں اس سے بہوؤں کو سدھانے کا کام لیا کرتی تھیں اب مٹی کے تیل سے جلنے والے اسٹوو استعمال کرتی ہیں۔ سر کو موسلوں سے بچانے کی غرض سے کچھ سیانوں نے بانس ہی کاٹ دیا تاکہ بانسری نہ بجے یعنی گھر کا نقشہ ہی سرے سے ختم کر دیا۔ مرزا غالب نے انہیں لوگوں کے لئے کہا تھا — "بے در و دیوار سا اک گھر بنایا چاہیئے"۔ گھر یہ تو باہر ہی ہوتا ہے اور اگر یہ دونوں جائیں، یعنی گھر بار ہو جائے تو بار دوش ہو جاتا ہے۔ بیوی گھر بار کے حق میں تو ہوتی ہے گھر میں بار' بنانے کے حق میں نہیں ہوتی — بات اوکھلی کی ہو رہی تھی' خراب سر دیا ہے موسلوں سے کیا ڈرنا — آگے بڑھئے۔

اوکھلا' کا کوئی رشتہ جائز و ناجائز' اوکھلی سے نہیں ہے۔ بادی النظر میں لگتا ہے۔ جیسے گھڑی گھڑے سے۔ کیا گھڑی تھی وہ جب سوہنی کچے گھڑے کے سہارے طوفانی چناب کو پار کر گئی تھی۔ یہ گھڑی اور گھڑا نہ ہوتے تو وہ ایک دوسرے سے محروم رہ جاتے اور ہم قصۂ سوہنی مہیوال سے۔

اوکھلی میں قابل دید کچھ نہیں ہوتا۔ اوکھلے میں ہوتا ہے۔ کہتے ہیں بیوی دوسرے کی اور مقامات تواریخی شہر کے ہمیشہ قابل دید ہوا کرتے ہیں۔ بشرطیکہ کھنڈر نہ ہو چکے ہوں۔ اس صورت میں یہ صرف ماہر آثار قدیمہ کے لئے باعث دلچسپی ہوتے ہیں۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ ہر وہ شہر تواریخی ہو جاتا ہے جہاں یا تو وہ کوئی ہوئی ہو یا کوئی تاریخ داں ہوا ہو — دلی تو مشہور تھی ان دونوں کی وجہ سے ہے۔

اوکھلا دلی والوں کی بجائے باہر والوں کے لئے زیادہ کشش رکھتا ہے۔ آپ تاریخ کی کوئی کتاب اٹھا کر دیکھ لیں یہ ضرور لکھا ملے گا کہ دلی ہمیشہ باہر والوں کے لئے باعث کشش رہی ہے۔ بابر نے تو "تزک بابری" کے اضافہ شدہ ایڈیشن میں یہ لکھا ہے کہ وہ دلی نہیں آنا چاہتا تھا۔ یہاں کی دوب نے اس کے گھوڑوں کا رخ اپنی طرف پھیر لیا اور سرزمین ہند گھوڑوں کی ٹاپوں کے لئے نہایت سازگار ثابت ہوئی اور اسے بے زبان گھوڑوں کے لئے وطن عزیز سے دور غربت میں رہنا پڑا، گویا دلی وطن دور تک پھیلانے آئی تھی۔ اس سبزے کا ذکر بہت بعد میں مرزا غالب نے بھی شوق سے کیا ہے۔ انہی کے وقت میں تو یہ سبزہ جو بعد میں ہو گئے تھا اور گھوڑوں کے علاوہ شاعروں کو بھی پسند آنے لگا تھا۔

اوکھلا میں زیادہ تعداد ایسے لوگوں کی ہوتی ہے جنہیں یہ نہیں معلوم ہوتا کہ وہ وہاں کیوں آئے

ہیں۔ پانی دیکھ کر کچھ کھاتے پیتے ہیں اور کھا پی کر پھر پانی دیکھتے ہیں۔ دری بچھا کر تاش کھیلتے ہیں۔ دوسروں کی عورتیں دیکھتے ہیں۔ بچوں تک کو کھیلنے کودنے کی اجازت دے دیتے ہیں اور اس سارے عمل کو پک نک کہتے ہیں۔ لوگ تو اپنے عیبوں تک کو خدا کی مرضی کہہ کر سرخ رو ہو جاتے ہیں۔ کچھ کو گھر لوٹ کر اس مشہور عالم سوال کا جواب دینا ہوتا ہے ـــــ " دلی میں کیا دیکھا ـــ ؟" پہلے تو لوگ بلا خوف تردید کہہ دیا کرتے تھے ـــ دلّی دیکھی، دلی والے دیکھے ـــ اب وہ دن لد چکے ہیں ـــ اب دلی والے کہاں ـــ اور دلّی بھی کہاں رہی۔ بس ہے تو نام اللہ کا ـــ سب کچھ بدل چکا ہے اور وہ بھی ایسے جیسے کوئی عورت گھونگھٹ اٹھا، بال ترشوا کر، سگریٹ پھونکتی، سر بازار آ کھڑی ہو ـــ قسم اللہ پاک کی اب تو اس پر فاختہ کا دھوکا ہونے لگا ہے۔ استاد ذوق کے زمانے میں دلّی کی گلیوں میں کچھ تو ضرور ہو گا اب تو غلاظت کے ڈھیر ہیں۔ نئی دلی کو دیکھ کر نائٹ کلب میں ناچنے والی اس حسینہ کا خیال آتا ہے جو ایک ایک کر کے تمام کپڑے اتار رہی ہو اور شریفوں کو شرمندہ کر رہی ہو، ویسے اب دلّی میں شرمندہ ہونے والے کم ہی رہ گئے ہیں۔

دلّی گئی دلّی والے گئے۔ البتہ دلی خان کے سالے رہ گئے ہیں۔ جو دھوم دھڑکے سے گھومتے ہیں۔ کہیں لوٹا، کہیں مارا ـــ سالے چیزیں ایسی ہوتے ہیں۔ ساری خدائی ایک طرف ـــ پتہ نہیں عورت اور داغ کی دلّی میں یہ سالے کیا کرتے تھے۔ اب لباس بدلتے ہیں ـــ موسم کے لحاظ سے نہیں۔ الیکشن کو مدنظر رکھ کر ـــ ہر وقت اور ہر جگہ تقریریں کرتے ہیں۔ جلسہ ہو، جنازہ ہو کوئی درس گاہ ہو ـــ اوکھلے کا کوئی تعلق تقریروں سے ہو یا نہیں ہماری زندگی سے ضرور ہے۔ دو چیزیں عام ہو گئی ہیں تقریریں اور آہ و زاری کبھی کبھی تو ان میں تمیز کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ یوں بھی تمیز سے نہیں دور کا بھی واسطہ نہیں رہا۔ اوکھلا کی پک نک کے شوق، کچھ کارپوریشن کے ذوق نظر کا نتیجہ ہے۔ دریائے جمنا۔ بہت اسے بند تو وہاں پہلے سے ہی تھے، آدمی بھی جانے لگے۔ ایسے لوگ جنہیں کہیں نہیں جانا ہوتا۔ اوکھلے، لال قلعہ قطب مینار یا چڑیا گھر چلے جاتے ہیں ان عمارات وغیرہ کے بنانے والوں کے پیش نظر تو کوئی مقصد رہا ہو گا، اب ان کی زیارت کرنے والے بے مقصد ہی آ نکلتے ہیں۔ کچھ لوگوں کو مرنے کا شوق ادھر کھینچ لاتا ہے۔ لال قلعہ اور چڑیا گھر اس کام کے لئے بالکل موزوں نہیں۔ قطب مینار تھا، حکومت نے جالیاں لگوا کر لوگوں سے یہ سہولت بھی چھین لی ہے۔ رہ گیا اوکھلا تو یہ اس کام آتا رہتا ہے۔ پہلے لوگ عشق میں مرتے تھے۔ اب یار لوگ اس کو باعث شرم سمجھتے ہیں۔ ضرورت ایجاد کی ماں ہے (باپ کے بارے میں تحقیق جاری ہے) جب سے مرزا غالب کا مشہور عالم شعر ـــ " ہوئے مر کے ہم جو رسوا " ـــــ سمجھ میں آنے لگا ہے۔ لوگ اطمینان سے غرق دریا ہونے لگے ہیں۔ اوکھلے جا کر مرنے والوں کی تعداد کو مدنظر رکھتے ہوئے حکام نے لاش نکالنے کا خاطر خواہ انتظام کر دیا ہے۔ وارثوں اور لواحقین کو اس کے لئے زیادہ پریشان نہیں ہونا پڑتا۔ زندہ لوگوں کو نکالنے کا انتظام اس لئے نہیں کیا گیا کہ بقول علامہ اقبال ـــ " کہ جن کو ڈوبنا ہو ڈوب جاتے ہیں سفینوں میں " ہمارے آئین کے تحت ہر شخص کو، دوسرے کو نقصان پہنچائے بغیر ہر کام کرنے کی آزادی ہے۔ جمہوریت کی

اس کی بہتر مثال کیا ہوگی۔ پچھلے دنوں ایک بھائی نے رائے دی تھی کہ شراب کی طرح اس مرنے پر بھی پابندی عائد کر دی جائے یا تمام ندی نالے، تالاب "ڈرائی" کر دیئے جائیں۔ کسی نے سمجھایا اس طرح لوگ مرنے کے ناجائز طریقے ڈھونڈ لیں گے۔

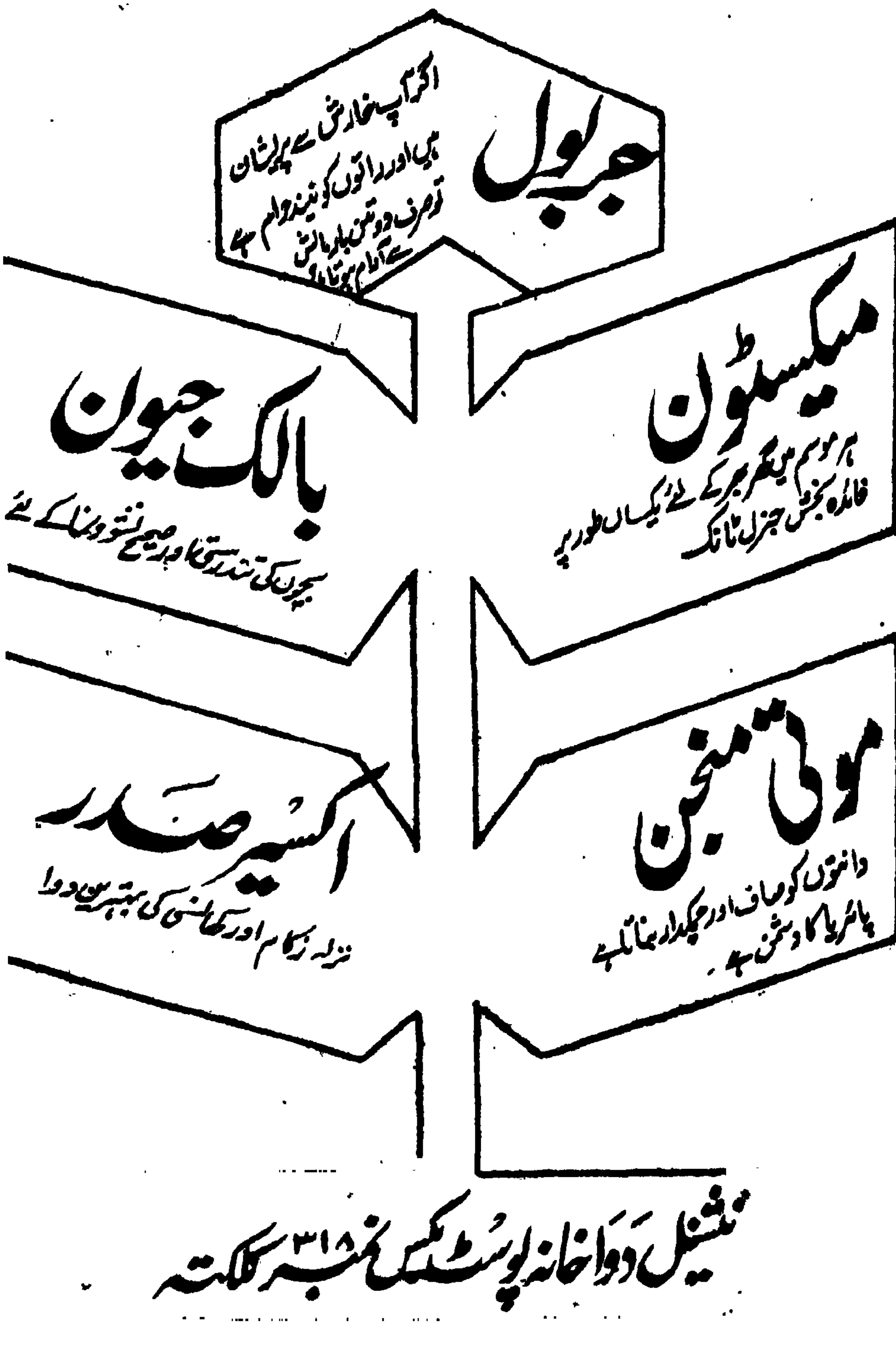
پہلے زمانے میں اس طرح مرنے یا قانون کی نگاہ میں خودکشی کرنے والوں کی موت کی کڑیاں عشق سے جوڑ دی جاتی تھیں۔ اب مہنگائی سے جوڑ دیتے ہیں۔ کچھ لوگ اوکھلے صرف محبت کرنے جاتے ہیں۔ ان کا خیال ہوتا ہے کہ محبت کرنے کے لئے پانی، درخت، سائے وغیرہ ہونے چاہئیں۔ اول تو اپنے ہاں محبت پنپتی نہیں اور اگر یہ سخت جان پودا بدقسمتی سے جڑ پکڑ لے تو اس کا ردعمل دیکھنے کے لئے فریقین کو دنیا سے دور، افق کے پار، بادلوں سے پرے، جہاں کوئی نہ ہو، جانا پڑتا ہے۔ دلی میں لوگ اوکھلے چلے جاتے ہیں۔ اور قسمت کا رونا روتے ہیں۔ کیا کیا جائے، ہمارے ہاں اس رونے دھونے کا نام ہی محبت ہے۔ اس قسم کے رونے دھونے کے لئے بھی پیسے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لئے غریب بے چارے شادی پر اکتفا کر لیتے ہیں اور بعد میں روتے دھوتے ہیں۔

اوکھلے میں چونکہ مختلف صوبوں اور علاقوں کے لوگ آتے ہیں اس لئے خودکشی میں بھی قومی یکجہتی دیکھنے میں آتی ہے۔ کچھ تصویریں وہاں مرنے سے پہلے اور کچھ مرنے کے بعد اتاری جاتی ہیں تاکہ سند رہے۔ گھر سے باہر دیکھنے کی چیز تو صنف نازک ہوتی ہے۔ باہر نکل کر در اصل یہ دیکھتی کم، دکھاتی زیادہ ہیں۔ اس لئے سب کو اچھی لگتی ہیں۔ اس موقع پر نوجوان تو الگ، بوڑھوں کو عشقیہ گیت یاد آنے لگتے ہیں۔ صنف نازک کیوں کہ ہر موسم میں قابل دید ہوتی ہے۔ اس لئے یہاں بارہ مہینے رونق رہتی ہے۔

پہلے اوکھلا دلی سے دور تھا۔ اب دلی پھیلتے پھیلتے اس سے جا ملی۔ ذہین آدمی خود کی تھوڑی ملانے اوکھلا کی گلیوں پر جانے میں یقین رکھتے ہیں اس لئے امید ہے کہ لوگ اوکھلا آگے لے جائیں گے۔ یا دوسرا اوکھلا بنا لیں گے۔ اسی کو ارتقاء کہتے ہیں۔

بقیہ:- افسانہ شرط

ہے اور قیدی کا کوئی پتہ نہیں ہے
صنعت کار نے باہر آ کر خود سے اس کوٹھری کی جانچ کی اور سپر قیدی کے خط کو سیف میں بند کر دیا تاکہ اسے پریشان کن افواہوں کا سامنا کرنا پڑے ●


جبرول
اگر آپ خارش سے پریشان ہیں اور راتوں کو نیند حرام ہے تو صرف دو تین بار مالش سے آرام ہوتا ہے
میکسٹون
ہر موسم میں عمر بھر کے لئے یکساں طور پر فائدہ بخش جنرل ٹانک
بالک جیون
بچوں کی تندرستی اور صحیح نشوونما کے لئے
موتی منجن
دانتوں کو صاف اور چمکدار بناتا ہے پائریا کا دشمن ہے
اکسیر صدر
نزلہ زکام اور کھانسی کی بہترین دوا
نیشنل دواخانہ پوسٹ بکس نمبر ۳۱۸ کلکتہ

(روسی کہانی)

چیخوف

ترجمہ: مشتاق احمد ازاری

ڈسٹرکٹ پبلک ریلشنز آفیسر۔ پورنیہ (بہار)

شرط

اپنے اسٹڈی روم میں چکر کاٹتے ہوئے صنعت کار کو پندرہ سال قبل کی اس پارٹی کی یاد آ رہی تھی' جب ساری بحث عمر قید پر مرکوز ہو گئی تھی۔ کچھ مہمان عمر قید کے حق میں تھے اور کچھ اس کے ...... جس نے کہا تھا

" عمر قید اور سزائے موت دونوں ہی غیر اخلاقی ہیں لیکن اگر مجھ سے دریافت کیا جائے تو میں مرنے کی بجائے عمر قید میں رہنا زیادہ پسند کروں گا۔

صنعت کار کو کافی طیش آ گیا تھا اور اس نے میز پر مکا مارتے ہوئے کہا تھا:

" یہ بکواس ہے۔ میں بیس لاکھ کی شرط لگانے کو تیار ہوں۔ میرا دعوا ہے کہ تم پانچ سال بھی قید خانے میں زندہ نہیں رہ سکو گے۔"

" اگر آپ واقعی سنجیدہ ہیں تو مجھے آپ کی یہ شرط منظور ہے۔ پانچ سال کیا، میں پندرہ سال قید خانے میں زندہ رہنے کو تیار ہوں۔"

" پندرہ سال ——— ! منظور ہے ۔ آج کی پارٹی کے سارے مہمان اس بات کے گواہ ہیں کہ اگر تم نے قید خانے میں پندرہ سال گزار دیئے تو میں بیس لاکھ روپے دوں گا۔"

" مجھے بھی منظور ہے جناب ۔ آپ نے داؤ پر رقم لگائی ہے اور میں نے اپنی آزادی۔"

اور آج پندرہ سال بعد صنعت کار اس واقعہ کو یاد کرتا ہوا اپنے اسٹڈی روم میں تیزی سے چکر لگاتا ہوا سوچ رہا ہے ———

" وہ شرط میں نے کیوں لگائی تھی ۔ ؟ فائدہ کیا ہوا؟ جب میں نے یہ شرط لگائی تھی' تب بیس لاکھ کی میرے نزدیک کوئی اہمیت نہیں تھی آج ——.. آج تو میں تباہ ہو جاؤں گا۔"

اس شرط کی تفصیل کچھ دلچسپ تھی ۔ یہ طے ہوا تھا کہ نوجوان اس کے بنگلے کی ایک کوٹھری میں پندرہ سالوں تک نظر بند رہے گا۔ یہ بھی طے ہوا تھا کہ اس عرصہ میں اسے کمرے کی دہلیز لانگنے، لوگوں سے ملاقات کرنے، ان کی آواز سننے، خط یا اخبار پڑھنے کی اجازت نہیں ہوگی۔ لیکن وہ خط لکھ سکے گا کوئی ایک موسیقی کا سامان رکھ سکے گا، کتابوں کے پڑھنے کی بھی اجازت ہوگی' سگریٹ اور شراب کی سہولت بھی میسر ہوگی۔ باہری دنیا کے لوگوں کو وہ کمرے کی اکلوتی کھڑکی سے دیکھ تو سکے گا لیکن ان

گفتگو کرنے کی اجازت نہیں ہوگی۔

کل آدھی رات کو پندرہ سال پورے ہو جائیں گے۔ شرط نامے کے آخری شرط کے مطابق قیدی نے رات کے بارہ بجے کے دو منٹ قبل بھی اگر جیل سے بھاگنے کی کوشش کی تو صنعت کار کو بیس لاکھ نہیں دینے ہوں گے۔

پہلے سال نوجوان نے جو خط لکھے تھے ان میں وہ بے انتہا تنہائی کا احساس کر رہا تھا۔ دن بھر وہ پیانو بجاتا رہتا تھا۔ اس نے تمباکو کی مانگ کی تھی اور نہ ہی شراب کی۔

دوسرے سال اس نے بہترین تخلیق کی مانگ کی اور اچھی اچھی کتابیں اسے مہیا کر دی گئیں۔

پانچویں سال پھر پیانو بجانے لگا اور اس نے پہلی بار شراب کی مانگ کی۔ وہ سارے دن پڑا سوتا رہتا تھا۔ کبھی کبھی رات بھر کچھ لکھتا تھا اور صبح ہوتے ہی اسے پھاڑ دیتا تھا۔

چھٹے سال میں قیدی نے فلاسفی، تاریخ اور ادب سے متعلق کتابوں کی مانگ کی۔ آئندہ چار سال اس نے ان سبجکٹ پر چھ سو سے زیادہ کتابیں پڑھ ڈالیں۔ دسویں سال کے آخر میں اس نے صنعت کار کو ایک خط چھ زبانوں میں لکھا اور کہا کہ اگر خط میں ایک بھی غلطی نہ ہو تو باغ میں ایک توپ چھوڑے۔

گیارہویں سال قیدی نے صرف بائیبل کا مطالعہ کیا اور بارہویں سال کو اس نے دیگر مذاہب کی کتابوں کے مطالعہ میں گذارا۔ اپنی قید کے آخری دو سالوں میں اس نے سائنس کی کتابوں کے علاوہ شکسپئر اور بیکن کی تخلیق کا مطالعہ کیا۔

صنعت کار نے سیف سے قیدی کی کوٹھری کی چابی نکالی جس کا استعمال گذشتہ پندرہ سالوں میں نہیں ہوا تھا۔ چوکیدار غائب تھا۔ اس نے سوچا کہ اگر میں نے ہمت کر کے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا تو شک چوکیدار پر ہی جائے گا۔

کوٹھری کا سیل بند دروازہ کھول کر وہ اندر پہنچا۔ قیدی کا ہڈی کا ڈھانچہ نما بدن دیکھ کر یہ محسوس نہیں ہوتا تھا کہ وہ چالیس سال کا ہے۔ اس آدھ مرے آدمی کا گلہ گھونٹنے میں آدھے منٹ سے زیادہ نہیں لگے گا۔ کسی کو ذرا بھی شک نہیں ہوگا کہ یہ کام میں نے کیا ہے۔ وہ میز پر پڑا ایک خط اٹھا کر پڑھنے لگا۔

"۔۔۔ کل رات بارہ بجے مجھے اس قید سے نجات مل جائے گی لیکن اس کوٹھری کو چھوڑنے سے قبل میں آپ سے کہنا چاہتا ہوں کہ مجھے ان ساری چیزوں سے نفرت ہے جنہیں تمہاری کتاب آرام و آسائش کے لئے ضروری تصور کرتی ہیں۔ جیسے آزادی، زندگی، تندرستی وغیرہ ۔۔۔ سب بیکار ہیں، بھرم ہے، طمع ہے اور صرف لمحاتی لذت ہے۔ جھوٹ کو سچ اور بدصورتی کو خوبصورتی سمجھنے والو۔ تم پاگل ہو گئے ہو اور غلط راستوں پر گامزن ہو۔ میں نے یہ تصور کیا تھا کہ بیس لاکھ مل جانے کے بعد میری زندگی جنت بن جائے گی لیکن اب میں ان پر لات مارتا ہوں۔"

خط پڑھ کر صنعت کار پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اسے اپنے تئیں کبھی اتنی نفرت محسوس نہیں ہوئی تھی جتنی آج ہوئی تھی۔ اگلے دن صبح اس کے چوکیدار نے اسے خبر دی کہ رات سے کوٹھری خالی

(بقیہ ص ۳۹)

نسیم بن آسی

طنزیہ

مولانا ستمگر

مولانا ستمگر عاشق مزاج تو تھے ہی شاعر مزاج بھی تھے۔ جہاں کہیں خدا کے نیک بندے جمع ہوتے، مولانا اپنی ناکامیٔ عشق کی داستان سنانے لگتے۔ اور یہ شعر پڑھتے: ــــ

ستم ہی کرنا، جفا ہی کرنا، نگاہِ الفت کبھی نہ کرنا
تمہیں قسم ہے ہمارے سر کی، ہمارے حق میں کمی نہ کرنا

مولانا کو ایسے اشعار بہت پسند تھے، جس میں لفظ ستم اور ستمگر آئے۔ لفظ ستمگر سے ان کا قلبی لگاؤ تھا۔ راہِ محبت میں انہیں جس چیز کی تلاش تھی، وہ تو نہ ملی۔ لفظ ستم اور ستمگر ملے، جنہیں وہ اپنے دل سے لگائے ماضی کی یاد تازہ کرتے۔ جب وہ مولانا حسرت موہانی کے شعر کا پہلا مصرعہ پڑھتے ــــ

"اس ستمگر کو ستمگر نہیں کہتے بنتی"

تو ان کی حالت قابلِ رحم ہو جاتی۔ مولانا اس مصرعہ کو اتنے سوز و گداز سے ادا کرتے کہ سامعین متاثر ہوئے بغیر نہ رہتے ــــ

ایک دن انھوں نے یہ شعر پڑھا ــــ

اُن سے اور مجھ سے یہی شرط وفا ٹھہری ہے
وہ ستم ڈھائیں مگر ان کو ستمگر نہ کہوں

اس شعر کے پڑھنے کے بعد مولانا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ اس کے بعد انھوں نے آنسو پر بھی ایک شعر پڑھا ــــ

دل شکستہ ہوں، نکل آتے ہیں اکثر آنسو
مے ٹپک پڑتی ہے ٹوٹے ہوئے پیمانے سے

یہ شعر سن کر سامعین جھوم اٹھے جیسے یہ مولانا کی آپ بیتی نہ ہو۔ اُن کی آپ بیتی ہو ــــ

اُس دن جیسے ہی مولانا تقریر کرنے کے لئے کھڑے ہوئے، میں دھیرے سے اُٹھ کر چلا آیا۔ مجھے ان کے شعروں سے جتنی دلچسپی تھی، اُن کی تقریر سے اتنی ہی نفرت۔ کچھ لوگ تھے، جو ان کی تقریر سننے کے لئے بیٹھے تھے۔ مولانا عالم دین تھے۔ اُن کا دعوہ تھا، وہ علم دین کے علاوہ ادب اور دوسرے علوم و فنون میں بھی کافی علمیت رکھتے ہیں۔ اس لئے لوگوں پر اُن کی علمیت کا بھی بڑا رعب تھا۔

میں نے مسجد سے باہر آ کر اطمینان کی سانس لی۔ پھر بھی اُن کی تقریر کی آواز مسجد کے باہر میرا تعاقب کر رہی تھی۔ میں پاس ہی کے ہوٹل میں چلا گیا۔ چائے پی کر کچھ دیر بعد ہوٹل سے باہر آیا۔ مولانا کی تقریر ختم ہو چکی

تھی۔ مولانا مسجد کے دروازے کے سامنے دوا کی ایک دکان کے پاس اسٹول پر بیٹھے تھے۔ میں نے کہا۔

السلام علیکم

وعلیکم سلام، مولانا نے تپاک سے کہا۔

"مولانا کوئی شعر سنائیے۔"

مولانا کی طبع نازک پھڑک اٹھی۔ فرمایا۔" غالب کا شعر سنئے ———

نوید امن ہے' بیداد دوست' جاں کے لئے
رہی نہ طرز ستم کوئی آسماں کے لئے

" بہت خوب! بہت خوب! مولانا آپ شاعر تو ہیں ہی لیکن لوگوں کا خیال ہے، آپ دوسروں کا لکھا پڑھتے ہیں۔"

مولانا بہت برہم ہوئے۔ فرمایا ——— " آپ جانتے ہیں' غالب سے بڑا اردو کا کوئی شاعر آج تک نہ ہوا ــــ دیوان غالب کا ذرا مطالعہ کیجئے۔ جن شعروں میں اسد تخلص ہے وہ مرزا غالب کے شعر نہیں ہیں۔ غالب کے ہوتے تو غالب تخلص ہوتا۔ اسد ایک دوسرے شاعر تھے جو مرزا غالب کو غزلیں لکھ کر دیتے تھے۔ بعد میں مرزا نے اُن غزلوں کو اپنے دیوان میں شامل کرلیا۔"

مولانا کے اس انکشاف کی جی میں نے بہت داد دی۔ اور کہا ——— " خیر اسے جانے دیجئے۔ لوگ کچھ بھی کہیں۔ یہ تو دنیا ہے۔ آپ برا نہ مانیں تو ایک بات پوچھوں ـــ ؟"

" پوچھئے۔ شوق سے پوچھئے۔" مولانا نے کہا۔

" آپ دوسروں کو جو دینی نصیحت کرتے ہیں' اُس پر خود عمل کیوں نہیں کرتے ؟"

مولانا اپنی چھڑی لے کر کھڑے ہوگئے۔ اُنہیں یہ بات بہت گراں گزری۔ میں اُن سے دو گز دور ہٹ کر کھڑا ہوگیا۔ اُن کے چہرے پر غصہ تھا۔ وہ چلنے کے موڈ میں تھے۔ اُن کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ لیکن میں انہیں ناراض بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے اُن کی طبیعت کا رنگ بدلنے کے لئے کہا ــ " مولانا! لوگ آپ کو شاعر نہیں مانتے۔ میں تو آپ کو عالم دین اور شاعر تسلیم کرتا ہوں۔ یہ بتائیے آپ کے اشعار کا جائے نزول کیا ہے ؟"

مولانا کی طبع نازک پھر رنگ پر آئی۔ فرمایا ـــ

" میرے اور مرزا غالب کے شعروں کا جائے نزول ایک ہی ہے۔ جب وہ میراثن سے عشق فرماتے تھے' اُسی وقت اُن کے شعروں کا نزول ہوتا تھا۔"

آپ کا بہت بہت شکریہ! اِس ضمن میں ایک سوال اور کروں گا ———

" کیجئے!" مولانا نے فراخ دلی سے کہا۔

" آپ کے خیال میں اچھے شعر کی تعریف ؟"

" میرے یا مرزا غالب کے اشعار پڑھ لیجئے۔ آپ کو خود ہی معلوم ہو جائے گا کہ

رہیل گیا ———

اچھا شعر کیسے کہتے ہیں؟"

"بہت خوب! اب آپ کوئی اپنا تازہ شعر سنائیں ——— " مولانا نے فرمایا۔

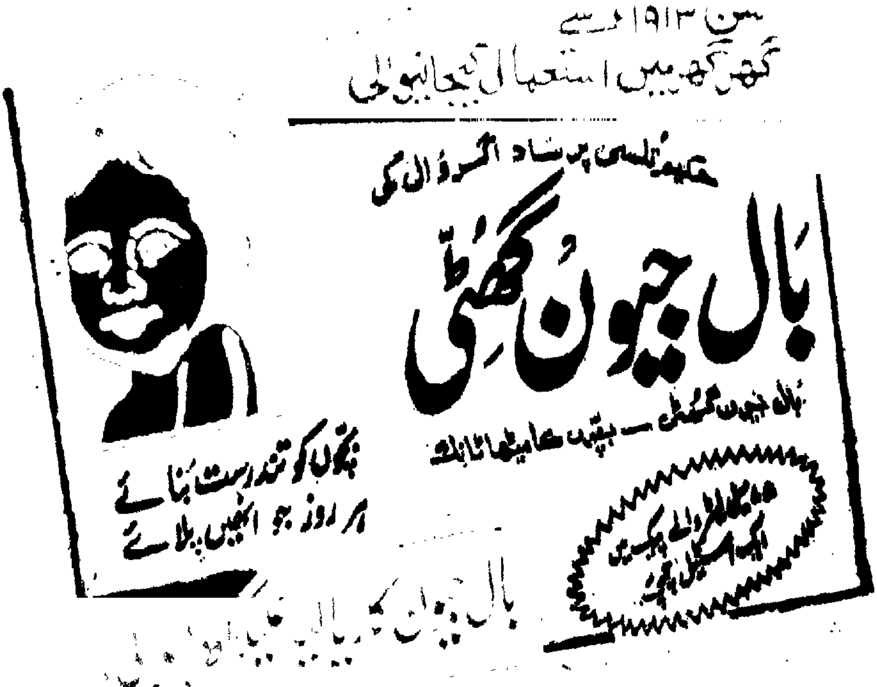
دوست کرتے ہیں ملامت غیر کرتے ہیں گلہ
کیا قیامت ہے مجھی کو سب برا کہنے کو ہیں

"لیکن مولانا! یہ شعر تو مومن کا ہے۔"

مولانا پھر برہم ہوئے۔ اور کہا ——— یہ شعر کسی حالت میں مومن کا نہیں ہو سکتا۔ آپ کا مطالعہ نہایت ناقص ہے۔ آپ ابھی طفل مکتب ہیں۔ آپ ....

مولانا مجھے کچھ اور ارشاد فرماتے ——— میں نے جلدی سے معذرت کرلی۔ بقول میر۔

یہی جانا کہ کچھ نہ جانا ہائے
سو بھی اک عمر میں ہوا معلوم



مترجم : نازنین سعید

بہت دیر بعد

چاروں طرف غیر آشنا ہماتوں سے گھرا وہ اپنے کو بڑا اجنبی سا محسوس کر رہا تھا۔ دل کی حالت بھی ایسی نہ تھی کہ وہ اپنی طرف سے خواہش دکھا کر لوگوں سے ملے جلے ...... ان کی باتوں میں دلچسپی لے یا کہانی سنائے بجلی کے بلبوں کی رنگ برنگی قطاریں اور لاؤڈ اسپیکر پر بجتے گانوں کے باوجود وہ وہ کرسنسان اندھیروں میں بھٹک جاتا تھا ...... خود اپنے سے بھی بہت دور شاید اس حالت کا اُسے پہلے ہی سے علم تھا۔ کئی بار اس نے کہا تھا کہ وہ ایسے موقع پر نہ ہی آئے تو اچھا ہو .... لیکن پونم کو نہ جانے کیا سوجھا تھا کہ وہ اڑ ہی گئی تم آنا ...... میرے لئے ...... میری ضد ہی سہی"۔

پونم کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے تھے یہ کہتے کہتے اس نے اُس کی آنکھوں میں آنسوؤں کا بہت کچھ پیچھے جذبات کا امنڈتا ہوا ایک طوفان بھی چھپا تھا جسے دیکھ کر خود اس کا دل بھاری ہو آیا۔

پونم کو اتنی بڑی ذمہ داری سونپ کر وہ خود کو دکھانے کی حالت میں نہیں تھا۔ اس نے پرس اپنے لئے سکون بنائے رکھا۔ چلو یہ بھی سہی ...... اسے کو کچھ اس طرح سمجھاتے ہوئے اُس نے پونم کے نرم ہاتھ اپنی مٹھی میں بھینچ کر اس کی آنکھوں کو چھوتے ہوئے کہا تھا "اچھا پونم .... ویسا ہی ہوگا"۔

اسے لگا تھا کہ اس کی آواز کچھ زیادہ ہی بھیگ گئی ہے۔ کہیں پونم ان سب کا دوسرا مطلب نہ نکال بیٹھے لیکن دوسرا مطلب ...... ؟ اب بھلا دوسرا مطلب کیا ہوگا ؟

وہ نہ چاہتے ہوئے بھی ان ملائم ہاتھوں کو چھوڑ کر چلنے کے لئے مڑ گیا۔ مڑنے کے بعد کے ان لمحات میں جو اس نے محسوس کیا وہ اسے صحیح معنوں ناقابل برداشت لگا تھا ...... ان دیکھے بندھن کا کھچاؤ .... جسے وہ پہلے کئی موقعوں پر پڑھ چکا تھا۔ سن چکا تھا۔ بار بار پڑھی سنی حالت آپ بیتی بن کر اتنی بھاری کیسے ہو جاتی ہے یہ بات اس نے بعد میں کئی بار سوچی تھی۔ اس وقت تو لگا تھا کہ پیر آگے نہیں بڑھیں گے۔ لیکن پھر نہیں کب اور کیسے وہ وہاں سے لوٹ آیا۔ لوٹنے سے پہلے اس نے ایک بار پیچھے مڑ کر دیکھا ــــ پونم وہاں ٹھہری ہی تھی ...... جمی ہوئی .... اسی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اسے لگا تھا کہ پونم کی آنکھیں بہت کچھ کہہ رہی ہیں ......

بارات دروازے پر آ گئی تھی۔ باجوں کی تیز آواز اور گھر میں بجنے والی کھلبلی نے اسے حال میں لوٹ آنے پر مجبور کر دیا۔ وہ پنڈال میں تقریباً تنہا رہ گیا تھا۔ نقارے کی آواز پر اچھل کود بھرا ہنگامہ اچھا ہو رہا تھا۔ چاروں طرف گھیرے ہوئے مہمان ایک ایک کر درمیان کی طرف جھانکنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ہر طرف ...... ناچنے والوں میں ہی نہیں دیکھنے والوں میں بھی۔ اور سب کے پیچھے ...... دور سے ہی اس نے بھیڑ کے پیچھے والے گھوڑے پر سوار اس تصویر کو دیکھ ...

پڑ رہ دیکھے ہیں۔ وہ جان سکتا تھا کہ وہی پونم کا شوہر ہے ..... پونم کا ہونے والا شریک حیات، ایسی جگہ پر ہم بھرنے لئے اس نے خود کی اپنی کلپنا کی۔ ہاں .... اس جگہ پر خود بھی تو ہو سکتا تھا ...... اگر درمیان میں اتنا سب نہ ہو گیا ہوتا۔ لیکن کیسے .... کیسے نہ ہو گیا ہوتا؟ اس نے اپنے کو فکرمند ہونے سے بچانے کے لئے اپنی نظر ادھر سے ہٹالی۔ ایک سگریٹ سلگا کر وہ پنڈال میں پیچھے کی طرف جا کر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ ایک گہرا کش کھینچنے کے بعد دھوئیں کی بنتی بگڑتی تصویروں پر اپنی نظر گڑا دیں۔

"رہنے بھی دو ......" بینو اکثر کہا کرتی تھی، ایک میں ہی تھی جو تمہارے چکر میں آگئی۔ اور کوئی بدھو نہیں ہو گا۔"

"تو مان گئیں کہ تم بدھو ہو"؟ وہ بس اتنا کہہ کر رہ جاتا تھا کئی بار اس نے چاہا کہ بینو کو پونم کے بارے میں صاف صاف بتا دے ...... نہیں، بینو کو اپنی خوبصورت شخصیت کا ثبوت دینے کے لئے نہیں، بس خود اپنے دل کو ہلکا کرنے کے لئے۔ لیکن سچ کہنے کی ہمت نہیں کر پایا تھا۔ کئی بار یہ بات اس کے ہونٹوں پر آ کر رہ گئی۔ پر کیسے شروع کرے وہ سمجھ نہیں پایا .... الفاظ ڈھونڈے سے نہیں ملے۔ سچ بڑا آسان ہوتا ہے اس نے کئی بار سنا تھا۔ لیکن یہاں وہ ایک سچ کہنے کے لئے بے چینی سے تڑپ اٹھتا تھا ......

اور کیا بینو اس سچ کو برداشت کر پائے گی ....؟



وہ کلپنا کر سکتا تھا کہ بینو پاگل ہو جائے گی اگر اس کے اعتماد کو دھوکا دیا گیا تو عورت کی نفسیات سے بھلے ہی ناآشنا ہو لیکن اتنا تو سب ہی جانتے ہیں کہ کوئی بھی عورت اپنے مرد کی محبوبہ کو نہیں برداشت کر سکتی... اپنے مرد پر پورا پورا حق چاہتی ہے۔

آہستہ آہستہ ایک خاموش سمجھوتے نے جانے کب، کس طرح، اسے دوہری زندگی پر ڈھکیل دیا یہ وہ سمجھ ہی نہیں پایا۔ اور وہ دوہری زندگی والا راستہ اسے کبھی راس نہیں آیا۔ دل میں ایک بوجھ سا تھا جو اسے رہ رہ کر بے چین کئے رہتا۔ ایک گناہ کا بوجھ جس نے اس کی ہر سانس کو بھاری بنا دیا تھا۔ پھر بھی، بہت ڈھونڈ کر بھی، ان سب سے بچنے کی کوئی راہ اسے دکھائی نہیں دیتی تھی۔

پہلی بار دیکھنے کے بعد سے ہی پونم اسے اچھی لگی تھی ..... خوبصورت ...... ملائم سی اور اس پر

اس کا انداز گفتگو۔ نہیں ...... وہ پہلی نظر کا پیار نہیں تھا، شاید ہو بھی سکتا تھا۔ اگر وہ پہلے ہی بینو کے بندھن میں نہ بندھا ہوتا۔ پھر وہ اس کی رومانی عمر بھی تو نہیں رہی تھی۔

وہ جانتا تھا کہ پونم خوبصورت ہے تو صرف اسی کو نہیں بہت سارے لوگوں کو خوبصورت لگی ہوگی...... کیا پتہ خود اس کی طرح پونم بھی کسی سے پیار کرتی ہو....

بینو کو پاکر ایک سکھی اور پرسکون گھر کی کلپناؤں، ہر دن ضرورت کا احاطہ کیے لگی تھی۔ لیکن اس خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کے لئے کہیں کام ملنا اور بھی ضروری تھا۔ کمپیٹیشن میں بیٹھنا اور جگہ جگہ درخواستیں بھیجنا، بس کی عادت بن گیا تھا۔ ناکامیوں کے درمیان بینو نے اسے متحرک کیا تھا اور اس کے لئے انتظار کرتے رہنے کا وعدہ بھی دیا تھا۔ جی جان سے امتحانوں کی تیاری کے لئے مصروف ہو جانے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ وہ حتی الامکان محنت کرتا ...... مگر دوسری طرف بینو سے متعلق شبہے اب اسے پریشان کرتے رہتے تھے۔ دو سال بیت گئے... ...... اسے لگنے لگا تھا کہ وہ کچھ نہیں کر پائے گا......

تب ہی اچانک کامیابی نے اس کا دروازہ کھٹکھٹا دیا۔

اسے اس لمحہ کی یاد سے ہی وہ خوش ہونے لگا۔ بینو کو خبر سنانے کی بے چینی سی تھی۔ بابا۔ بھیا۔ بھابی ...... کسی سے بات نہیں کر پایا تھا۔ راستہ بھر سوچتا رہا کہ کس طرح بتائے گا بینو کو ......؟ سوچا تھا کہ پہلے اداس بن کر جھوٹ موٹ کہے گا کہ اسے کامیابی نہیں ملی۔ پھر جب بینو اداس ہو جائے گی ...... اسے سمجھانے لگے گی یا صبر بندھانے لگے گی تب سچ بات بتا دے گا لیکن..... جوش میں وہ کچھ بھی چھپا نہیں پایا۔ گھر پہ بولا پڑا تھا...... اپنے تمہارے بیرس بینو...... میں سلیکٹ ہو گیا۔

برسوں کی گھٹن کے بعد وہ تازہ جھونکا ...... سوچتے ہی سوچتے وہ مسکرانے لگا تھا۔ ... اچانک

اس نے دیکھا کہ کوئی اسے لگاتار دیکھے جا رہا ہے.. ..... اکیلے بیٹھے مسکراتے ہوئے۔ اس نے بہتر بننے کی کوشش کی۔

چھوٹی سی ٹریننگ کے بعد اسے پہلی پوسٹ کے لئے یہاں بھیج دیا گیا تھا ...... ریڈیو اسٹیشن پروگرام ایکزیکیوٹو بنا کر۔ شعبہ ڈرامہ کا چارج دیا گیا تھا۔ پونم ...... پونم وہاں سے پہلے ہی دن اس سے متعارف ہوا تھا۔ پونم وہاں اسٹاف آرٹسٹ تھی اور ڈراموں میں بھی کام کرتی تھی۔

"ارے واہ چیز ہے پیارے......" پونم کے جاتے ہی اس کے ساتھی گپتا نے دھیرے سے کہا تھا بائیں آنکھ آہستہ سے دباتے ہوئے۔

پہلے ہی تعارف میں اتنی بے تکلفی ...... اسے کچھ عجیب سا لگا تھا۔ جواب میں وہ آہستہ سے مسکرا دیا۔

انجانے ہی دل کے کسی کونے میں اس نے بینو کا پونم سے مقابلہ کر ڈالا۔ ایک طرف بینو کی جان لیوا مسکراہٹ اور ...... دوسری طرف پونم کی پوسٹ سے پہلے متعارفی سلام و دعا کی دولت۔ بینو آسانی سے جیت گئی ...... پھر بھی ہار کے باوجود... خوبصورتی اس کے وجود پر سر تانے کھڑی تھی۔ بعد میں کئی سوچنے وہ اس نتیجہ پر پہونچا تھا کہ پہلے دن والا مقابلہ انصاف پر مبنی نہ تھا۔ بینو کی فتح کے پس پشت انصاف اور کامرانی کے سرسری تعارف کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔

پونم کو روزانہ ہی دیکھنے کا موقع ملتا تھا۔ ہر زاویہ سے دیکھنے کا۔ ہنستے ہوئے، مسکراتے ہوئے، سوچتے ہوئے، ڈائیلاگ بولتے ہوئے، ڈرامہ کی بابت گفتگو کرتے ہوئے یا ویسے ہی کبھی چائے پیتے ہوئے۔ آہستہ آہستہ پونم سے روشناسی بڑھنے کے ساتھ ہی کبھی کبھی اسے لگتا تھا کہ اسے پوری طرح جانے بغیر بینو کے مقابلے میں ہرا کر اس نے ظلم کیا تھا...

بینو، بینو، بینو ...... میری بینو......
تمہیں کیسے بتاؤں کہ تمہارے بغیر کیسے دن کاٹ رہا ہوں میں، پنکھ نہیں ہیں میرے، نہیں تو اڑ کر چلا آتا۔ ایسے ہی نہ جانے کتنے خط لکھے تھے اس نے۔ روز نہیں تو دوسرے یا تیسرے دن وہ خط لکھتا ہی تھا، پندرہ بیس دن میں ایک بار چھٹی لے کر گھر بھی جاتا تھا لیکن گھر والوں سے زیادہ بینو کے لئے ...... یہ بات بینو بھی جانتی تھی اور پھولی نہ سماتی تھی۔ شادی طے ہو جانے کی بات اس نے دفتر میں کسی کو بھی نہیں بتائی اس کے پیچھے ایک سادے سے شرمیلے پن کے علاوہ کچھ بھی نہیں تھا۔ پھر بھی کبھی کبھی اسے لگتا تھا کہ جانے کیوں وہ اپنے اندر جھانکنے کی ہمت نہیں کر پاتا ہے۔

ایک بار پونم کے سامنے وہ صاف جھوٹ بول گیا۔ بعد میں اس نے اپنے دل کو کئی بار ٹٹولا بھی۔ ویسے بات چھوٹی سی تھی۔ اور پونم کو سب کچھ سچ سچ بتا دینے کے لئے وہ آزاد بھی تو نہیں تھا۔

"میں کل نہیں آؤں گا ......" پونم کو کچھ کام سونپتے ہوئے اس نے کہا تھا اس کے بعد لگاتار تین چھٹیاں پڑ رہی تھیں۔ "کیوں ......؟ پھر کہیں جا رہے ہیں؟" وہ بیچ میں ہی پوچھ بیٹھی تھی۔

"کہیں کیا گھر جانا ہے ...... بہت دن ہو گئے۔"

"ہاں ......" وہ مچلتی ہوئی سی بولی تھی، جب دیکھو تب گھر۔ بہت گھر جاتے ہیں آپ"

"ارے! بہت کہاں ......؟ میں تو ......"

"سمجھ نہیں پایا تھا کہ کیا کہے۔

پونم اچانک لہجہ بدل کر چہکتی ہوئی سی بولی تھی "جانتے ہیں گپتا جی کیا کہہ رہے تھے ......؟ کہتے تھے وہاں کوئی ہوگی ...... اسی سے دوڑا دوڑا ملنے جاتا ہے۔"

"کون؟" ...... یہ پوچھنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ پونم کی آنکھوں میں شرارت بھری تھی، جو اس "کون" کا جواب دے رہی تھی

"ارے ہمارا کون ہوگا ...... ہم تو جانے کیسے ہی رہ گئے اس سب سے ہمیں تو ممی پاپا کے جانا پڑتا ہے۔ نہیں تو دونوں ناراض ہو جاتے

اس حادثہ کے بعد اسے لگا تھا کہ پونم پاس آ گئی ہے۔ بینو سے ملا ...... ہر طرح کی تھی ...... لیکن پونم کے بارے میں کہیں کوئی ذکر کیا اس نے ......" نہیں ...... تمہاری کمی وہاں" کہتے کہتے اسے کہیں اپنی آواز بڑی کھوکھلی لگی۔ لوٹ کر اس نے کسی کو بھی نہیں بتایا کہ آج اس کی شادی طے کر دی گئی تھی، اگلے مہینے میں ہونی تھی ...... اس نے خود اپنے سے ہی کہا "چھپا کہاں رہا ہوں ...... لیکن یہ بھی کیا کہ بات ڈھنڈورا پیٹا جائے کہ میری شادی طے ہو گئی۔ کارڈ آ جائے گا تو بتا ہی دوں گا۔"

لیکن ایک بات کا جواب وہ خود کو دے پایا تھا۔ وہ یہ کہ بینو کو اس نے پونم کے بارے میں کیوں نہیں بتایا ...... یا گھر جانے سے پہلے پونم نے اسے گپتا جی کے بہانے چھیڑا تھا تو وہ مکر کیوں گیا ......؟ اپنے ان سوالوں کو وہ پی جاتا تھا۔

کافی پیکر اسے کچھ سکون سا ملا۔ اچھا ہی ہوا بینو اس کے ساتھ نہیں آئی۔ اس نے سوچا اچھا ہوا کہ اس کے بہت سے ساتھی دس پانچ یہاں ٹھہر کر ماتھر صاحب کی پارٹی میں چلے گئے ان سب کے سامنے اس کیفیت کو برداشت ناممکن ہی ہو جاتا اس کے لئے بس کے گھر کی چھوڑ کر ایک وہی تھا جو بارات کی اس بھیڑ میں رہ گیا تھا ...... بس پونم کے لہو میں بہتے کے اس نے سوچا تھا کہ ماتھر صاحب کے یہاں

سے ہی سہمی کپ ایک طرف رکھ کر وہ پنڈال سے باہر نکلا۔ .... وہاں جہاں جہ مال کے لئے سجائے گئے تخت کے چاروں طرف لوگ بھیڑ کی شکل میں جمع تھے۔ ان سب کے پیچھے کی طرف ایک پیڑ سے کمر لگا کر کھڑا ہو گیا .... دولہے کو پیچھے کی طرف سے وہ دیکھ سکتا تھا۔ سامنے جاکر دیکھنے کی ضرورت اسے نہیں محسوس ہوئی۔ دیکھ کر کرتا بھی کیا تھا؟ اسے کہیں یہ بھی فکر تھا کہ وہ اس میں خود اپنے ہی کو نہ دیکھنے لگے لیکن پونم ......؟ کیا پونم اپنے شوہر میں اسے ڈھونڈتے بغیر رہ پائے گی ......؟ کیسے رہ پائے گی ....؟

اچھا یا برا، فیصلہ خود اس کا تھا پونم کو اور خود اپنے کو آزاد کرنے کے لئے دن رات کی پریشانی سے بچنے کے لئے غیر اخلاقی مثلث کو آسان خطوط کی شکل دینے کے لئے، بس ...... یہی راستہ دکھائی دیا تھا اسے ....

اسے اکثر لگا تھا کہ پونم اس کے پاس آتی جا رہی ہے لیکن اس دن تو کوئی شک ہی نہیں رہا .... کمرے میں ان دونوں کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔ اس کے سگریٹ جلاتے ہی وہ بول اٹھی تھی "آپ سگریٹ کیوں پیتے ہیں.........؟"

"دل چاہتا ہے اس لئے ......" ایک لمبا کش لیکر دھواں چھوڑتے ہوئے اس نے کہا۔

"ایسا کیا ہے اس کڑوے دھوئیں میں جو پینے کا دل کرے؟"

اس نے پھر ایک کش لیکر سگریٹ ایش ٹرے میں رکھتے ہوئے کہا، "کبھی پی کر تو دیکھو تو پتہ لگے...." اور وہ میز پر بکھرے ہوئے کاغذوں پر جھک گیا۔

"لائیے دیکھوں......" کہتے ہوئے پونم نے ایش ٹرے سے سگریٹ اٹھا کر لمحہ بھر ادھر ادھر دیکھنے کے بعد منہ میں لگا لی۔ وہ کچھ کہے، اس سے پہلے پونم بری طرح کھانسنا شروع کر چکی تھی۔

"یہ کیا کیا تم نے ......؟" تیزی سے اٹھ کر کی دوسری طرف پہونچ کر اس نے پونم کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرنا چاہا، "ٹھیرو میں تمہارے لئے پانی لاتا" پونم نے سگریٹ ایش ٹرے میں واپس رکھتے گلاس اس کے ہاتھ سے لیکر پانی پی لیا۔ کچھ کہنے کو تھم رہ گیا تھا پھر بھی وہ اٹکتا ہوا سا بولا "یہ کیا نے تو غضب ......؟" پونم تب تک کچھ بہتر ہو چکی تھی اور رومال سے اپنی نم ہوئی آنکھیں پونچھ رہی تھی مسکراتے ہوئے بولی "تو کیا ہو گیا ......؟ کیا ہوا کچھ بھی نہیں مرا ......" وہ جیسے کہ گہرے سوچ میں کڑوا سا دل ہی دل میں کچھ گیا کہ بارہ دن ہی تو بچے تھے اس کی شادی میں۔

آدھا گلاس ہی تو تھا...... میں پورا بھر کر دیتی ہوں۔ آپ دکھی نہ ہوئیے، پونم کی مسکراتی ہوئی آنکھوں میں ایک میٹھی سی شرارت تھی۔

وہ گلاس لیکر اٹھنے لگی تو جانے کیسے پونم دوسرا ہاتھ اس کے ہاتھوں میں آ گیا تھا۔ اس کی شیانوں رگوں میں ایک میٹھی سی دھن مختلف آوازوں کی شکل میں بج اٹھی .... لیکن .... درمیان میں کسی بے میل ٹھک ٹھک کی طرح اس کی دھڑکن بھی زور زور سے بج رہی تھی۔ بارہ دن ...... بارہ دن...... بارہ دن.........

باہر کسی کے قدموں کی آہٹ سنکر پونم دستے سے اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے گلاس لئے ہوئے باہر چلی گئی اس کے لوٹنے سے پہلے ہی ہنیو کے لئے ذمہ داریوں کا احساس پیدا ہو چکا تھا واپس اپنی کرسی پر جاکر اس نے کام میں دھیان لگانے کی کوشش کی .... دل میں ایک فیصلہ سا کر لیا تھا کہ جلد سے جلد کوئی موقع نکال کر پونم کو اپنی شادی کے بارے میں بتا دے گا۔

اس دن رات بھر وہ سو نہیں سکا ... پونم؟

بتا دے ......؟ کیا بتائے......؟ کیسے بتائے......؟ اسی الجھن کے پیچھے وہ اپنے دل میں ابھرا جاگر ہوتی ہوئی اس کرن کو بھی دیکھ رہا تھا --- --- جس سے نکلی ہوئی روشنی میں اس نے کبھی پونم کا خواب دیکھا تھا۔

پانچ دن اور بیت گئے۔ دعوت نامہ کا پیکٹ گھر سے چھپ کر آ چکا تھا۔ اس درمیان وہ پونم سے کچھ بھی کہنے کا وقت نہیں نکال پایا تھا۔ یا ...... کہہ نہیں پایا تھا۔ شادی کے سات دن باقی رہ گئے تھے۔ اس دن شام کی گاڑی سے گھر جانے کے لئے وہ ریزرویشن بھی کرا چکا تھا......

دن بھر کی الجھن کے بعد چار بجے خاموشی سے اسٹیشن ڈائرکٹر کے کمرے میں جا کر اس نے اپنی شادی کی خبر سنائی۔ ڈائرکٹر صاحب جیسے اچھل پڑے .... کچھ تعجب میں اور کچھ خوشی میں۔

جلدی ہی طے ہو گیا سب کچھ ــــ اس نے صفائی دینی چاہی۔ پندرہ دن کی چھٹی بھی مانگی۔

ڈائرکٹر صاحب کے کمرے سے نکل کر کسی سے کچھ کہے بغیر وہ سیدھا اپنے گھر پہونچا۔ دعوت نامہ اس نے ڈاک سے بھیجنا ہی ٹھیک سمجھا۔ پھر بھی اس کی غیر موجودگی میں بات پھیل ہی گئی۔ دفتر کے کئی لوگ اسٹیشن پر گاڑی چھوٹنے کے وقت اس سے ملنے اور مبارک باد دینے کے لئے آئے تھے۔

"تم تو چھپے رستم نکلے ......"

"مبارک باد جناب..... آپ نے تو کچھ پتا بھی نہیں لگنے دیا۔"

"اس میں چھپانے کی کیا بات تھی ......؟"

گاڑی چھوٹنے تک کچھ شرمایا سا، کچھ مسکراتا سا، وہ خاموشی سے سب کی باتیں سنتا رہا تھا۔ ساتھ ہی اس کی نگاہ نہ چاہتے ہوئے بھی بھیڑ سے پونم کو تلاش کرنے کے لئے مچل اٹھتی تھی۔ نہ جانے کیوں...

شادی کے بعد لوٹنا بھی جانے کی طرح اچانک ہی ہوا۔ وہ اکیلا ہی آیا تھا۔ بینو کو مہینہ بھر ماں کے پاس رہنا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کے پہونچنے کی خبر دفتر بھر میں پھیل گئی۔ اس کے کمرے میں ملنے والوں کا تانتا سا لگ گیا...... مبارکباد...... قہقہے، ہنسی مذاق۔ بس پونم ہی تھی جو بڑی دیر تک نہیں دکھائی دی۔

ماحول بدلتے ہی وہ خود باہر نکلا...... پونم کو دیکھنے کے لئے، کسی اور سے پونم کے بارے میں پوچھنے کا اسے ہمت نہیں تھی۔ پتہ نہیں پونم نے اس کی غیر موجودگی میں کیا کیا...... ؟ اسے ڈر تھا کہ اس کی شادی کی خبر نے پونم کو پریشان نہ کیا ہو..... اور ایسا ہوا تو پونم نے اس حالت کو کیسے برداشت کیا ہو۔ پونم کے چہرے نے کسی دوسرے کو شک کرنے پر مجبور نہ کیا ہو...... اسے جاننے کی بے چینی تھی ...... کم سے کم حقیقت جاننے کی

پونم ٹیلیکس کی لائبریری میں بیٹھی ملی...... مشغول سی کچھ لکھتے ہوئے۔ وہ دھیرے سے اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

"ہلو، پونم!"

"آپ کب آئے سر......؟" دھیرے سے گردن اٹھاتے ہوئے وہ پوچھ گئی۔ وہ جانتا تھا سوال فضول ہے۔ اس کے آنے کی اطلاع پونم کو مل گئی ہوگی۔ اس کی آواز میں انجانے ہی ایک ایسی تیزی آ گئی تھی جسے سن کر وہ لمحہ بھر کو سٹپٹا گیا۔

تب ہی شاید پونم نے سبھی حالات کو سمجھتے ہوئے پھر کہا، "اچھا، کیسے ہیں؟ اوہ مبارک ہو....... میں تو آپ کو مبارک باد دینا بھول گئی......"

پونم کی آنکھوں میں لوٹتی ہوئی مسکان دیکھ کر بھی وہ بہتر نہیں ہو پایا تھا...... وہ پونم کی آنکھوں میں سیدھے دیکھ رہا تھا...... بہتر اور ...

آنکھوں میں مسکراہٹ نہیں مسکراہٹ کی نقل تھی۔
"آپ کیسے ہیں ......؟" سب ٹھیک ہے
......؟" وہ پھر بولی جیسے ماحول کو پوری طرح
ہلکا کرنے کے لئے۔

"تم کو کیسا لگ رہا ہوں ......؟" اس نے
مسکراتے ہوئے کہا "بس ذرا ......" بغیر سوچے
وہ بول گیا۔

"ذرا کیا ......؟" پونم کی آنکھوں میں اچانک
…ن کا بادل تیر آیا تھا۔

"ذرا یہی ......" اس نے بات بنانی چاہی
…کہ یہاں کام جیسے ہو رہا ہوگا۔ کبھی یہ سوچتے تھکتا
… اسے ڈر لگنے لگا کہ اچانک ہی امنڈ کر سنہری
…پ کو ڈھانک دینے والا بادل کہیں برس نہ
......

"ارے ہاں ...... وہاں ایک بڑی خوبصورت
…ڑکی دکھائی دی تھی ...... بالکل تمہارے
......" اس نے پھر بات بنانے کے لئے
…ہنا شروع کیا تھا۔

"آپ نے تو دوسری طرف منہ موڑ لیا ہوگا۔
…ماں سے" ہی اس کی بات کاٹتے ہوئے پونم بول
…تی۔

اس کے سنبھلنے سے پہلے ہی وہ گردن جھکائے
… کا قد سمٹی ہوئی بیٹھی گئی تھی۔ پونم کے اس
…و نے اسے دور ...... اندر تک ہلا دیا۔

دوسرے دن ایک ریکارڈنگ کے وقت
…لی تھی۔ سب کے درمیان ہنستی بولتی ......
… کے اسے لگا تھا کہ جیسے سب کچھ پہلے کی طرح
…چار ہا ہے۔ لیکن کچھ ہی دیر تعریف میں سامنے
…کہ جو اس سے نظریں چرا سی سر جھکائے
… اس نے صاف دیکھا تھا کہ اس پونم کی
… دوسری ہی کا گئی تھی ......

اس وقت وہ کمرے میں تنہا تھا۔ فون کر کے اس
نے پونم کو بلایا۔ وہ بڑے سلیقے انداز سے آکر کھڑی
ہوگئی تھی "جی ......" میز پر بکھرے کاغذوں پر اس
کی نظر ٹکی تھی۔

"بیٹھو تو ......" وہ آہستہ سے بولا تھا۔ اس
نے پہلے ہی سوچ رکھا تھا کہ اسے کیا کہنا ہے کیا کرنا ہے
"بیٹھو نہ ......" اس نے کچھ زور دے کر کہا
پونم بیٹھ گئی تو ...... کاغذوں سے نظر ہٹائے
بغیر۔ وہ اس کی آنکھوں میں دیکھنا چاہتا تھا ......
شاید وہی امنڈتا ہوا کالا بادل وہاں دکھنے کے لئے
خاموشی لمبی ہوتی جا رہی تھی۔ اچانک جیبیں
ٹٹولتے ہوئے اس نے سگریٹ نکال کر منہ میں لگائی۔

"میں سگریٹ پی سکتا ہوں ......؟"
جواب میں پونم کی آنکھیں اس کے چہرے پر جم گئیں،
وہی کالے بادل کا امنڈتا ہوا ٹکڑا ...... "آپ مجھ سے پوچھ کر
پیتے رہے ہیں؟" جیسے الفاظ میں سنائی دئیے تھے
"میرا مطلب ......" وہ الفاظ ڈھونڈنے
لگا تھا۔

"میں منع کرنے والی کون ہوتی ہوں ......؟"
وہ پھر بولی۔

اچانک اسے لگا تھا کہ سلسلہ کا چھوٹتا ہوا
سرا پھر اس کے ہاتھ آگیا ہے۔ بڑے سلجھے ڈھنگ
سے اس نے کہا تھا "وہی پونم ...... وہی ......
جس نے بڑے ادھیکار سے ایک دن میرے منہ سے
سگریٹ نکال لی تھی ...... اور ......"

"وہ پونم ...... کہاں ہے وہ ......؟" اسے
لگا تھا کہ بادل برس پڑے گا۔

"کیا بات ہے ......؟ تم کچھ چھپا رہی ہو ......؟
کوئی دکھ ہے تمہیں ......؟" وہ سب جانتا تھا۔
جانتے بوجھتے بھی کچھ پوچھ رہا تھا۔ وہ سننا چاہتا تھا وجہ
… کسی الجھن کو سلجھانے کے لئے ...... اچانک

مقصد کو پورا کرنے کے لئے۔

"چھوڑیئے بھی .... ہاں، آپ نے کس کام کے لئے بلایا ہے؟" پونم نے کچھ سنبھلتے ہوئے کہا تھا۔

"پہلے بتاؤ ......" اس نے چھوٹتے ہوئے کنارے کو پھر پکڑنے کی کوشش کی تھی۔

"بس یہی پوچھنا تھا ....؟" کہتے ہوئے پونم نے اٹھنا چاہا تو تیزی سے میز کی دوسری طرف آکر اس نے پونم کے دونوں کاندھے پکڑ لئے۔

"چھوڑیئے بھی ...... کیا کر رہے ہیں .... دیکھئے کوئی آجائے گا ......" ہر لفظ کے ساتھ پونم کا لہجہ دھیما ہوتا گیا اور ساتھ ہی چھوٹ پانے کی کوشش بھی ...... اور اچانک وہ اس کے سینے پر سر رکھ کر بلک پڑی تھی "یہ کیا کیا آپ نے ...... مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا ...... میں آپ کے بغیر کیسے رہ پاؤں گی ......"

"چپ ہو جاؤ پونم ...... سنو تو ....." اس کی کمر تھپکتا ہوا وہ اسے تسلی دے رہا تھا۔ بڑے پیار انداز میں۔ اس کے دل میں کہیں ایک فتح کی لہر کروٹیں بدلنے لگی۔

ان سب کے درمیان اس کا دل زوروں سے دھڑک رہا تھا۔ اسے یہ بھی دھیان آیا تھا کہ دو ہفتے کے بعد ہی بینو اس کے پاس آجائے گی۔

اپنے آپ کو دو حصوں میں بانٹ کر زندہ رہنے کا فیصلہ بڑا مشکل ہے ...... یہ بات جلد ہی اس کی سمجھ میں آگئی تھی خاص طور سے اس کے لئے جو بینو اور پونم، دونوں کے حق میں ایماندار رہنا چاہتا تھا۔

راز کھل جانے کا ڈر، اخلاقی قدروں کی پامالی، مستقبل بکھرنے کا ڈر اور نہ جانے کیا تھا جو ہر وقت ہی جھیلنا پڑتا تھا اسے۔ بینو سے ملتے وقت اسے احساس ہوتا تھا وہ اسے دکھ پہنچانے کی کوئی بات نہیں سوچ سکتا تھا۔ اور پونم ...... پونم اسے اچھی لگتی تھی وہ اسے دکھ پہنچانے کی بھی بات نہیں سوچ سکتا تھا۔ اور پونم ...... پونم اسے اچھی لگتی تھی۔ پونم نے آنکھیں بند کر کے اپنے کو اس کے ہاتھوں میں سونپ دیا تھا، محبت کا بہترین سلیقہ اسے پونم نے ہی دیا تھا۔

بینو کے ساتھ خوش و خرم خانگی زندگی اور پونم کے لئے چرائے ہوئے محبت کے لمحات اور ایک انجانے خوف کے احساس کے درمیان کبھی کبھی وہ ایک سلجھن کے لئے بے چین ہو اٹھتا تھا ...... کیسے بھی ...... کسی بھی طرح ...... لیکن، بغیر پونم کو چھوڑے اور بغیر بینو کو دکھ پہنچائے۔

پونم کے ساتھ گزارے لمحات میں وہ کبھی اپنے کو محفوظ محسوس نہیں کر پایا ...... بغیر کسی لالچ کے جو پیار دے سکتا ہے، وہ دور دور تک نہیں دکھائی دیتا تھا۔ ایک غلطی، ایک گناہ ہر لمحہ اسے گھیرے رہتا ....

اور بینو کے ساتھ رہنے پر ایک الجھن اسے جکڑے رہتی تھی۔ شادی بندھن کے دھندلے لمحات میں اسے اکثر ڈر لگتا تھا کہ کہیں وہ بینو کی جگہ پونم کی کلپنا نہ کر بیٹھے ......

الجھن میں گزرے دن دو سال پورے کر چکے ہیں یہ بات اسے اچانک اس دن سمجھ میں آئی جب اس نے سنا کہ اس کے تبادلے (ٹرانسفر) کی بات چلنے لگی ہے ان دنوں پونم پر بھی شادی کے لئے زور ڈالا جا رہا تھا "کون مجھے مجبور کر سکتا ہے، بچی کر سکتا ہے۔ میں کوئی بچی تو ہوں نہیں، کماتی ہوں اور وقت آیا تو اکیلی بھی رہ سکتی ہوں۔ اور تم جو ہو میرے ساتھ ......" پھر بھی اس نے کبھی کبھی اس کی آنکھوں میں ڈر کی ایک صاف جھلک دیکھی تھی۔

تبادلے کی بات سن کر وہ بھی کانپ سی اٹھی تھی اس تصور کے بارے میں دونوں میں سے کسی نے بھی کبھی نہ سوچا تھا۔ دفتر میں یا دوستوں کے سامنے ایک عام آشنائی کا چہرہ لئے [illegible] چرائے ہوئے

لمحوں میں سارے پہرے اتار کر ایک دوسرے میں ڈوب جاتا...... بس اسی کیفیت وسرور کے بیچ ڈر اور شک کے درمیان بھی جینے کا فیصلہ کر لیا تھا دونوں نے۔

خلاف امید ان نئے حادثات نے انہیں گھیرا تو اسے حقائق کی سطحوں پر اتار کر ایک پھر کوئی راستہ تلاش کرنے کے لئے اسے قید ہونا پڑا۔ کئی دن کئی رات کی الجھن کے بعد اس نے ایک فیصلہ لے ہی لیا۔ ان الجھنوں کی گھڑی کے درمیان اس کی ضد کو مانتے ہوئے پونم نے بھی اسی راستے پر چلنا قبول کر لیا۔ کسی دوسرے شہر میں پونم کی شادی...... ایک دوسرے کو بھولنے کی کوشش...... شادی کے بعد نہ ملنے کا ارادہ بھی تو تھی وہ ہی راہ۔

بے مالا کا وقت ہو گیا تھا۔ اس کی آنکھیں پونم کے ہاتھوں میں جھولتی ہوئی پھولوں کی مالا پر ٹکیں...... وہ مالا جو کسی اور کے لئے تھی۔

پونم کی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں اور اس کا چہرہ ملا سپاٹ سا لگ رہا تھا۔ رہ رہ کر کیمروں کے فلیش اس کی کراہیت کو اور بھی اجاگر کر دیتے تھے۔

اچانک وہاں اسے اپنی موجودگی بڑی بے معنی سی لگی۔ کیوں آیا تھا وہ......؟ اور آیا بھی تھا تو اور سب کے ساتھ ساتھ اختر صاحب کی پارٹی میں کیوں نہیں چلا گیا؟ کیوں دور سے کر رہا تھا پونم نے...... اس نے تو ایک بار اس کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا......

نظر اٹھائی بھی ہوتی تو کیا وہ اسے دیکھ پاتی...... ؟ اس نے اپنے آپ کو سمجھانا چاہا کہاں روشنی میں گھری کھڑی پونم...... اور کہاں دور...... پیچھے پیڑ کے تنے کی آڑ اندھیرے میں کھڑا ہوا وہ......؟

لیکن اب......؟ کیا ہوگا اور رک کر؟ سب کچھ تو ہو گیا۔ پونم کی ضد بھی پوری ہو گئی......

وہ پیچھے سے مڑ کر جہاں پلٹا مڑتے ہی اس کے گھر کے پیچھے تالیوں کی گڑگڑاہٹ سی ہوئی اس نے ٹھہر کر اندازہ لگایا کہ دونوں نے ایک دوسرے کو مالائیں پہنا دی ہوں گی۔

پھر گھر آتے ہی اس نے گھڑی دیکھی...... نو بجنے میں دس منٹ۔ اس نے ارادہ کر ڈالا کہ وہ آج کی پارٹی میں نہیں جائے گا۔ کل چاہے کوئی بھی بہانہ کیوں نہ کرنا پڑے...... اس وقت وہ کہیں جانے کی حالت میں نہ تھا۔

رہ رہ کر اس کا دل بے چین ہو اٹھتا تھا پھر وہ اپنے کو سمجھاتا رہا۔ اب وہ خوف سے آزاد ہو سکے گا...... شک سے دور۔ اقرار اب اسے نہیں ستائے گا اور بینو کے حق میں پوری طور سے اپنا ہو کر وہ سکھ سے جی سکے گا۔

گھنٹی بجانے کے بعد دروازہ کھلنے میں دیر ہوئی۔ دروازہ کھلنے پر جو کچھ اس نے دیکھا اس پر یقین نہیں کر پایا۔

"یہ سب کیا ہے......؟" وہ اندر قدم رکھتے رکھتے کانپ رہا تھا۔ بینو چپ کھڑی تھی اور اس کے پاس سے ہوتا ہوا ایک شخص دروازے سے باہر نکل گیا۔

"کون تھا یہ......؟" وہ تقریباً چیخا۔

"میرا دوست تھا......" بینو نے ٹھہرتے ہوئے کہا۔ "اس میں چیخنے کی کیا بات ہے؟" بچنے کوئی راہ نہ پا کر بینو کھل کر حالات کا سامنا کرنے کا ارادہ کر چکی تھی۔

"کیسا دوست......؟"

"اور ہوتا کیا......" بینو سمجھاتے ہوئے بولی "اتنے دقیانوسی مت بنو۔ تم سمجھا کسی لڑکی سے دوستی کرو...... [illegible]......"

اب...... اس کا دل ہوا کہ وقت کو ٹھہرا کر پیچھے دھکیل دے۔ احساس جرم کی وجہ تو ٹوٹ گیا تھا

بہار

نئی رفتار ـــ نئی سمتیں!

وزیر اعظم شری راجیو گاندھی کے مضبوط لائق، اور اہل قیادت وزیر اعلیٰ شری چندر شیکھر سنگھ کی اہل میاب رہنمائی میں ریاست کے سبھی کلاس کے لئے چاہے وہ کسان ہوں یا کھیتی ہر مزدور، ٹیچر ہوں یا متعلم، مزدور ہوں یا تاجر، وکیل ہوں یا صحافی، ضعیف ہوں یا معذور، سبھی کے ترقی اور فلاح و بہبود کے لئے پروگرام بنائے گئے ہیں اور ایک نئی امنگ اور لگن کے ساتھ انہیں نافذ کیا جا رہا ہے۔ تاکہ مقررہ وقت کے اندر ہی اس کا پھل لوگوں کو ملنے لگے ہریجن، آدیباسی، اقلیتیں اور پسماندہ ذاتوں کے لوگوں کی فلاح و بہبود کی اسکیموں کو اولیت دی گئی ہے۔ ریاست میں فنڈ کئے جا رہے مندرجہ ذیل پروگرام خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

دیہی ترقی

(الف) مقررہ مدت کی دیہی پروگرام :- اس اسکیم کے ذریعہ ان خاندانوں کی معاشی ترقی کا پروگرام بنایا گیا ہے جو غریبی کے نشان کے نیچے ہیں۔ موجودہ مالی سال دسمبر ۱۹۸۵ء تک ۴۴ر۳ لاکھ خاندانوں کو مالی مدد دی گئی۔ اس میں شیڈول کاسٹ کے ۹۹ ہزار خاندان، شیڈول ٹرائب کے ۴۰،۸۶۱ خاندان شامل ہیں۔

(ب) قومی روزگار پروگرام :- اس مالی سال کے دسمبر ۱۹۸۵ء تک ۳۰ر۱۲ کروڑ مین ڈیز کو روزگار فراہم کرانے کی اسکیم کو سینکشن دی گئی ہے۔ اس پر کل ۶۰ر۳۴ کروڑ روپے کا خرچ ہوا ہے۔ ہر ایک پنچایت کو دس ہزار روپے کی رقم چھوٹی اسکیموں کو نافذ کرنے کے لئے دی گئی ہے۔

(ج) دیہی بے زمین لوگوں کو روزگار کی گارنٹی کا پروگرام :- اس پروگرام کے تحت ۱۱۳ کروڑ لاگت کی مختلف اسکیمیں نافذ کی جا رہی ہیں جن میں ۳۴۰۰ کیلو میٹر سڑک کی تعمیر، دو ہزار پرائمری اسکولوں، اور ۴۰ گرلس مڈل اسکولوں کی عمارتوں کی تعمیرات بھی شامل ہیں۔

زراعت

اس ریاست کے مختلف حصوں میں سلسلہ بارش اور سیلاب کی وجہ سے فصلوں کو نقصان ہوا تھا۔ لیکن اس کے باوجود اس سال ۵۰ر۱۲۴ لاکھ میٹرک ٹن اناج پیدا ہونے کی امید کی جا رہی ہے جبکہ نشانہ ۵۰ر۱۲۱ لاکھ

آب پاشی:- اس بجٹ ۰۰۰ر۹۷ ہیکٹر زمین میں فاضل آب پاشی کے پروگرام کی منظوری کا نشانہ ہے۔
بجلی:- ۱۹۸۳ء سے دسمبر ۱۹۸۴ء تک کی مدت میں کل ۹۶۴۴ لاکھ یونٹ بجلی پیدا کی گئی۔
صنعت ۸۵-۱۹۸۴ء میں ۱۰۰۰ نئے دیہی اور اسمال انڈسٹریز قائم کرنے کا نشانہ رکھا گیا جس کے خلاف دسمبر ۱۹۸۴ء تک ۱۶۷۹ اکائیاں قائم کی جا چکی ہیں۔ لارج اور میڈیم شعبہ میں سات اکائیاں اس مدت میں قائم کی گئی ہیں۔
سلف ایمپلائمنٹ پروگرام کے تحت نومبر ۱۹۸۴ء تک کل ۸۹۹۷ تعلیم یافتہ بے روزگاروں کو بینک سے مالی مدد دی گئی ہے۔ ہریجنوں کی فلاح و بہبود کے لیے ان کی ٹریننگ انہیں مالی مدد دلانے کے جدید اور بہتر قسم کے اوزار فراہم کرانے کے پروگرام کے تحت اب تک شیڈول کاسٹ ۸۵۰۳ خاندانوں کو فائدہ پہنچایا گیا ہے۔
دیہی پانی رسائی پروگرام:- اس مالی سال میں دسمبر ۱۹۸۴ء تک ۲۰ نکاتی پروگرام کے تحت ۱۱۷ دور افتادہ گاؤں کو پینے کے پانی کی سہولت فراہم کی گئی جبکہ نشانہ ۳۰۰۰ گاؤں کو فراہم کرنا تھا۔
اصلاح اراضی اس مالی سال میں ۱۵ دسمبر ۸۴ء تک ۱۲۰ء۲۰۱ ایکڑ فاضل کے حصول اور ۹۴۵ ایکڑ تقسیم ہوئی۔
تعلیم ۶ سے ۱۴ برس کے ۹۸ر۹۰ لاکھ طالب علموں و طالبات کا داخلہ دسمبر ۱۹۸۴ء تک ہوا ہے۔ جس میں ۹ر۱۱ لاکھ ہریجن اور ۳۴ر۷ لاکھ آدی باسی طالب علم و طالبات شامل ہیں۔ تعلیم بالغان پروگرام کے تحت ۲۵۰۱۰ مراکز دسمبر ۱۹۸۴ء تک قائم کیے گئے جس سے ۱۰ر۳ لاکھ بالغان مستفید ہوئے۔
ہریجن اور آدیباسی کی فلاح و بہبود:- ۲۰ نکاتی پروگرام کے تحت اس برس دسمبر ۱۹۸۴ء تک ۹۷ر۵۵ شیڈول کاسٹ اور ۹۵ر۰ لاکھ شیڈول ٹرائب کے خاندانوں کو غریبی کے نشان سے اوپر اٹھانے میں مدد دی گئی۔ ۸۵-۱۹۸۴ء میں شیڈول کاسٹ اور شیڈول ٹرائب کے طالب علموں کو دیے جانے والے وظائف کی رقم ۶۵ر۸ روپے سے بڑھا کر ۱۲ کروڑ روپے کر دی گئی۔ جن سے قریب ۵۳ر۲ لاکھ شیڈول کاسٹ اور ۵۷ر۲ لاکھ شیڈول ٹرائب کے طالب علم مستفید ہوں گے۔
جنگلات کی ترقی:- اس برس ۸۴ء تک ۵۳ر۱۲ کروڑ درخت لگائے گئے جبکہ اس سال کا نشانہ ۵۰ر۱۲ کروڑ
دیہی سڑک اس برس کم سے کم پروگرام کے تحت ۵۰۰ گاؤں کو پکی سڑک سے جوڑ دیے جائیں۔
اقلیتوں کی فلاح و بہبود:- بہار اسٹیٹ اقلیتی مالیاتی کارپوریشن کا قیام جو مذہبی اقلیتوں کے افراد کو ۱۰،۰۰۰ روپے کاروبار وغیرہ کے لیے صرف ۵ فیصد کی شرح سود پر دے گا۔ بدعنوانی کے خلاف جہاد بول دیا گیا ہے اس سلسلے میں ریاستی حکومت نے اعلیٰ افسروں تک کو معطل کر دیا ہے اور ان کی خلاف قانونی کارروائی کی گئی ہے۔
مذکورہ بالا ترقیاتی پروگراموں کے نفاذ کو بہتر اور تیز رفتار بنانے اور نئے تیور سے عام جنتا کو یہ تاثر اور احساس ہو گیا ہے کہ پھل اب انہیں وقت پر مل پائے گا۔ کہ سرکار جو کہتی ہے کرتی بھی ہے۔

सू० ज० वि० वि० 373 दि० (पृ० 328) 84-85

گیا ضلع ترقی کے راستے پر

اس سال بھی راشٹریہ گرامین نیوجن کاریہ کرم کے تحت اس ضلع میں کافی تعداد میں اسکول بھون، پنچائت بھون، کلورٹ، گرامین سڑک، آہر، پائین وغیرہ کی تعمیر کے کام کئے گئے ہیں۔ متعدد ترقیاتی کام میں کرشی پروگرام، آر، ال ای، جی، پی، نیز آئی، آر، ڈی، پی کے تحت کام کئے گئے ہیں۔ جس سے سلسلہ جنبک سمپتی کی سنرچنا اور سینچائی کی صلاحیت میں زیادتی ہوئی ہے۔

اس سال اس ضلع میں دو بڑی سینچائی یوجناؤں نیز فتح پور بلاک میں تلیا ڈھادھر یوجنا اور موہن پور بلاک میں موہن سینچائی یوجنا کے کام شروع کر دئے گئے ہیں۔ ان یوجناؤں کے مکمل ہو جانے پر لاکھوں ہکیٹر علاقہ کو مستقل سینچائی مہیا ہو جائے گی۔ اور اس کے بن جانے سے پھلگو ندی کے سیلاب سے متاثر ہونے والے مسائل کا مستقل طور پر حل ہو جائے گا۔ اس کے علاوہ بورنگ

نیز پمپنگ سیٹ کے ذریعہ سینچائی کی صلاحیت میں اضافہ کیا گیا ہے۔

اس ضلع میں ہر یجنوں کے مکان کا کھپڑاکرن کی مزید یوجنا چلائی گئی ہے۔ جس کے تحت تقریباً چھ ہزار مکانوں کو کھپڑاکرن کیا گیا ہے

اس سال ہتھیا نچھتر میں کم بارش ہونے کے باوجود بھی سرکاری انتظامیہ کی کوششوں سے خریف کی اچھی فصل ہوئی۔ اور ربیع فصل اچھی تعداد میں لگائی گئی ہے کسانوں کو کھاد اور بیج مہیا کیا گیا ہے۔ ضلع کی ایک اور اہم کامیابی میں دوردرشن پر سارن سیوا کیندر کا قیام بھی ہے۔ جس سے کافی لوگوں کو تفریح ہو رہی ہے۔ اس سال بھی ہتھریکچھ میلہ میں کافی تیرتھ یاتریوں کی آمد ہوئی جنہیں قیام ودوسری سہولتیں مہیا کرائی گئیں۔

امن وقانون کی حالت اچھی رہی ہے گذشتہ آٹھویں لوک سبھا چناؤ مشکل حالات کے باوجود بھی سرکاری انتظامیہ اور عوامی تعاون سے شانتی طور پر مکمل ہوا۔ ضلع کی مجموعی ترقی کے لئے سرکاری انتظامیہ کئی پروگرام چلائے جا رہے ہیں۔

شہریوں سے اپیل ہے کہ وہ اپنے طور پر بھرپور تعاون اور مدد دیکر ضلع کو اہل اور باصلاحیت بنائیں

جاری کردہ۔ **کمرتی چندر ساہا** (آئی اے ایس) ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ گیا

بہار میں کمزور لوگوں کو مفت قانونی امداد

صوبائی حکومت نے کمزور کلاس کے لوگوں کو مفت قانونی امداد دینے کے لئے بہار ریاستی قانونی امدادی بورڈ کی تشکیل عمل میں لایا ہے۔ صوبائی حکومت نے اس سلسلہ میں ایک قانون بنایا ہے جس کا نام بہار ریاستی قانونی امدادی قانون ۱۹۸۳ء ہے اس قانون کے تحت کسی آدمی کو کس طرح قانونی مدد مل سکتی ہے یہ نیچے بتایا گیا ہے۔

مفت قانونی امداد کسے مل سکتی ہے

(۱) ایسے سبھی لوگوں کو مفت قانونی مدد مل سکتی ہے جس کی سالانہ آمدنی پانچ ہزار روپے سے زیادہ نہ ہو۔

(۲) اپاہج، الزسچت ذات، الزسچت جن ذات، اور غیر زمین مزدوروں کو یہ قانونی مدد ہر حالت میں دی جا سکتی ہے۔ بلکہ ان کی سالانہ آمدنی کچھ بھی ہو۔

قانونی امداد کی صورت

(۱) ایسے وکیلوں کی ایک فہرست رہے گی جو غریبوں کو مفت قانونی مدد دیں گے یہ مقدموں کے سلسلہ میں وکیل قانونی صلاح دیں گے۔

(۲) قانونی امداد دینے کے لئے ضلع کمیٹی، جھگڑا جھنجٹ کی صلح سمجھوتہ کرانے کی بھی کوشش کرے گی۔

(۳) مقدمہ ہونے پر قانونی امداد کے لائق لوگوں کو مفت میں وکیل دے گا۔ کورٹ فیس، گواہوں کا خرچ، دستاویزوں کی نقل کا خرچ وغیرہ بھی حکومت کی جانب سے کیا جائے گا۔

(۴) اپیل کا بھی سارا خرچ حکومت کی جانب سے کیا جائے گا۔ یہ سارے اخراجات مفت میں کئے جائیں گے۔

(۵) ریل حادثہ / بس / موٹر / ٹرک وغیرہ سے حادثہ ناؤ، یا اسٹیمر وغیرہ سے حادثہ ہونے پر گھائل اور بے سہارا لوگوں کو بھی قانونی مدد دی جائے گی۔

کس طرح قانونی مدد حاصل کی جا سکتی ہے۔

(۱) حکومت نے غریبوں کو مفت قانونی مدد دینے کے لئے ہائی کورٹ پٹنہ اور رانچی میں قانونی امدادی کمیٹی بنائی ہے ہر ایک ضلعی ہیڈ کوارٹر میں اور سب ڈویژن میں قانونی امدادی کمیٹی بنی ہے جو بھی قانونی امداد حاصل کرنا چاہتے ہیں وہ اپنے علاقے کے کمیٹی کے پاس جا سکتے ہیں۔

(۲) قانونی امداد جو حاصل کرنا چاہتے ہیں انہیں اپنے علاقے کی قانونی امدادی کمیٹی کے پاس جانا چاہئے۔

(۳) درخواست دہندوں کو درخواست کا فارم دیا جائے گا اس میں مانگی گئی تفصیل درخواست دہندہ دیں گے۔

(۴) درخواست دہندہ جو انفارمیشن دیں گے اس کی سچائی کے سلسلے میں وہ ممبر سکریٹری کے سامنے شپتھ لیں گے۔

براہ کرم نزدیکی ضلعی یا سب ڈویژنل قانونی امدادی کمیٹی سے یا بورڈ کے سکریٹری سے رابطہ قائم کریں۔

انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشن ڈیپارٹمنٹ، بہار

सू० ज० स० वि० - 344-ए (ए-300) 84-85

نئی کتابوں کا تعارف

نام کتاب :۔ حرفِ مہتب
شاعر :۔ رشمی کانت راہی
صفحات :۔ ۱۱۲ ، قیمت ۲۵/ء
مبصر :۔ سید احمد قادری
ناشر :۔ بجمی اکیڈمی، پولس لائنز
بخشی بازار کٹک واڑلیسا

حرفِ مہتب کے شاعر رشمی کانت راہی کی شاعری کا تعارف پیش کرتے ہوئے عنوان چشتی لکھتے ہیں :

"رشمی کانت راہی کی مادری زبان
اگرچہ گجراتی ہے لیکن یہ اردو کا جادو
ہے کہ وہ اس زبان کے نہ صرف یہ کہ
شاعر ہیں بلکہ اس دور کے حساس
اور باشعور فنکار ہیں "

مطالعہ کے دوران یہ احساس زیرِ نظر کتاب میں جگہ بہ جگہ ہوتا ہے ۔ رشمی کانت راہی نے حیات و کائنات کا بڑا گہرا مطالعہ کیا ہے ۔ خاص طور پر عصرِ حاضر کی محرومیاں یاس ، بے سمتی ، بے چہرگی ، مایوسیاں ، اور گھٹن کے شدید احساسات و جذبات سے راہی کی شاعری معمور نظر آتی ہے ۔ چند اشعار دیکھئے

تن کا لباس پاپ نے پہنا ہے ان دنوں
عریانیت حیات کا گہنا ہے ان دنوں

خوددار اگر بنے تو بنے کوئی کس طرح
حق بات پر بھی چوٹ کو سہنا ہے ان دنوں

اے زندگی بھٹک نہ سکوں کی تلاش میں
بے چینیوں کے ساتھ ہی رہنا ہے ان دنوں

عصرِ حاضر میں خودداری، ضمیر اور انا کے ساتھ جینا مشکل ہے ۔ اس لئے راہی ان سے سمجھوتا کرتے ہوئے نظر آتے ہیں ۔ لیکن چوٹ سہتے ہوئے ستم سہتے ہوئے ۔

راہی کی شاعری میں عصری شعور و آگہی کے ساتھ ساتھ روایتی قدروں کا بھی شدید احساس موجود ہے ۔ اپنے منفرد اور جدید لب و لہجے اور مخصوص اسلوب میں راہی نے خوب صورت شاعری کا نمونہ پیش کیا ہے ۔ جن میں فکر کے ساتھ ساتھ فن بھی بالیدہ نظر آتا ہے ۔

راہی نے غزل کی مروجہ فارم کے ساتھ ساتھ تجربے بھی کئے ہیں۔ ان کے ایک تجربہ کو کرامت علی کرامت نے سی غزل کا نام دیا ہے۔ راہی کی ایک آزاد غزل بھی اس مجموعہ میں شامل ہے جو فکر و معنی کے لحاظ سے اہمیت حامل ہے۔

حرف مسیّب کے مرتب کرامت علی کرامت زیر نظر مجموعہ میں اردو غزلوں کا بھرپور جائزہ پیش کیا ہے سرورق کے پچھلے اور آخری فلیپ پر عنوان چشتی راج نرائن راز کی آرا راہی کے غزلوں سے متعلق موجود ہیں۔ موڈرن پبلشنگ ہاؤس دہلی نے کتاب خوب صورت چھاپی ہے۔ قیمت کچھ زیادہ ہے۔

نام کتاب : کوکن کا مغنی
مرتب : پرویز باغی
صفحات : ۱۶۰ / قیمت : ۳۰/=
مبصر : سید احمد قادری
ناشر : موڈرن پبلشنگ ہاؤس
۹ گولا روڈ، دریا گنج نئی دہلی۔ ۲

مشہور و مقبول شاعر اور ممتاز نثر نگار یع الزماں خاور عرصہ سے اردو زبان و ادب کی خدمات بڑے خلوص اور ایمانداری سے انجام دے رہے ہیں یقینی طور پر وہ اس بات کے مستحق ہیں کہ ان کے فکر و فن پر تو ناقدانہ نگاہیں ڈالی گئی ہیں۔ انہیں یکجا کر کے طور پر بدیع الزماں خاور کی عظمت کا اعتراف کیا جائے۔ اسی سلسلے کی پہلی کڑی زیر نظر کتاب "کوکن کا مغنی" ہے جسے پرویز باغی نے بڑے سلیقے سے ترتیب دیا ہے۔ ترتیب کی وجہ انہوں نے عرض مرتب میں اس طرح بیان کی ہے؛

"بدیع الزماں خاور صاحب ادبی
کوکن کے ایک مشہور و ممتاز اردو
شاعر اور جانے پہچانے نثر نگار ہیں
وہ اپنے کامیاب ادبی سفر کے پچیس
سال پورے کر چکے ہیں۔ اور مختلف
انعامات و اعزازات کے مستحق ٹھہرے
ہیں زیر نظر کتاب اسی سلسلے میں انہیں
خراج تحسین کے طور پر شائع کی جا
رہی ہے"

پچیس سال کا عرصہ بہت طویل عرصہ ہے اس طویل عرصے میں کتنے دشوار گزار، خاردار راستوں سے گزرنا، کتنے درد و کرب اور مشکلات کو جھیلنا پڑا ہوگا۔ ان تمام دشواریوں، مشکلوں، پریشانیوں کے آگے بدیع الزماں خاور نے سپر نہیں ڈالی بلکہ مسلسل تخلیقی سفر کو جاری رکھا۔ اس طویل سفر میں بدیع الزماں خاور کی درجنوں کتابیں خواہ وہ طبع زاد شعری مجموعے حروف، میرا وطن ہندوستان، بیاض، امرائی النفوس کا پیرہن، سات سمندر اور منفی کتاب ہوں یا ترجمہ و نثر خوشبو سبیل، دیار اور دھاراشٹر کی تہذیبی اور ادبی قدریں ہوں۔ منظر عام پر آئی ہیں۔ اور ہر کتاب کو خاطر خواہ پذیرائی ملی ہے جن کے ثبوت زیر نظر کتاب میں شامل مختلف اوقات میں لکھے گئے مختلف مقدمے مقالے اور تبصرے کے اقتباسات ہیں

جن حضرات کے خیالات اور تاثرات شامل ہیں
یا ۔ اعجاز صدیقی، حرمت الاکرام، مالک رام، گیان
ظ الانصاری، مظفر حنفی، کرامت علی کرامت، مشتاق
ن، گوپال متل، عبدالستار دلوی، علاءالدین جینا بڑے
ر پال متل، پولس اگاسکر، عنوان چشتی، قمر رئیس، سلیمان
بادید، مظہر امام، سید احمد قادری، اور عصمت
ی وغیرہ وغیرہ۔

ان میں بیشتر حضرات کے نام ایسے ہیں جو اردو
کے نامور پارکھ کی حیثیت سے جانے اور مانے جاتے

زیر تبصرہ کتاب کئی حصوں میں منقسم ہے۔
ر حصہ بدیع الزماں خاور کے فکر و فن کا نہ صرف
تعارف پیش کرتا ہے بلکہ خاور کی عظمت کا تعین
ن کرتا ہے۔

"خاور صاحب اور میں" کے تحت کتاب کے
پرویز ہاشمی نے ایک مضمون سپرد قلم کیا ہے جس
اور سے پرانے تعلقات اور پیران کی عزت و
ت کا ذکر ہے۔ "کیا کہوں میں حال اپنا" کے
نے خاور کی مختصر سوانح نوشت شامل کتاب
نکے ساتھ ساتھ خاور کا "تھوڑا سا کلام تازہ"
ج دہے۔ موڈرن پبلشنگ ہاؤس نے کتاب
بصورت چھاپ کر اپنی گزشتہ روایت کو برقرار
ہے۔

نام کتاب : منجدھار اور کنارا

سن اشاعت : ۱۹۸۴ء

مبصر : سید احمد قادری

ملنے کا پتہ : ۳۴/بی مولانا محمد علی روڈ
کلکتہ ۲۳

کلکتہ کے گارڈن ریچ میں پولس کمشنر ونود
کمار مہتہ کا قتل ۱۸ مارچ ۱۹۸۴ء کی صبح میں بعض مجرموں
نے بڑی بے دردی سے کیا۔ پولیس کمشنر کا قتل کسی غریب
آدمی کا قتل تو تھا نہیں کہ وہ مشتہر نہ ہوتا۔ چنانچہ بڑے
پیمانے پر ونود کمار مہتہ کے قتل کا ہنگامہ شروع ہوا۔
اور مغربی بنگال کے بے حد معروف شخصیت کلیم الدین
شمس ڈپٹی اسپیکر مغربی بنگال کو اس قتل کا بالواسطہ
بعض سیاسی حریفوں نے ذمہ دار قرار دیا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ ایک بڑے پولیس آفیسر اور ایک
بڑے سیاست داں کے معاملہ کو اس قدر مقامی اور
بیرونی اخباروں نے اچھالا کہ ہر شخص اس کیس میں دلچسپی
لینے لگا۔ ایک جانب جہاں مہتہ کے قتل کا دکھ تھا۔ دوسری
طرف سیاسی رہنما جناب کلیم الدین شمس کی ایسی تصویر
دیکھ کر لوگ رنجیدہ ہو رہے تھے ویسے بعض اخبارات
نے اس کیس کی سچی تصویر پیش کی ہے۔ لیکن بقول شخصے
کہ "جھوٹ اتنا بولو کہ سچ لگنے لگے"۔

اس طرح کلیم الدین شمس کے مخالفوں نے ان کی
صاف ستھری تصویر اور امیج کو مسخ کرنے
کی ہر ممکن کوشش کی لیکن حقیقت اس کے برعکس تھی۔
اور اس کا اظہار تفصیل سے زیر نظر کتاب "منجدھار

"محبت مر گئی کیس" کی پوری تفصیل کے ساتھ ساتھ حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ کلیم الدین شمس کی تصویر صاف ستھری نظر آنے لگتی ہے اور ان کا جو امیج عوام کی نگاہوں میں تھا وہ نہ صرف برقرار رہ جاتا ہے بلکہ ان کی قدر و منزلت مزید بڑھ جاتی ہے۔

نام کتاب: شہر کا خواب
افسانہ نگار: عرفان عارف
صفحات: ۱۰۴ | قیمت: ۱۵/-
مبصر: سید احمد قادری
ناشر: ہم زبان پبلی کیشنز، ۱۹۳ ایم ایچ جی کالونی، مالیگاؤں (ناسک)

"شہر کا خواب" عرفان عارف کے اکیس ۲۱ مختصر اور منی افسانوں کا مجموعہ ہے۔ جس کا پیش لفظ سلطان سبحانی نے لکھا ہے۔ اس پیش لفظ میں سلطان سبحانی نے اردو افسانے خاص طور پر موجودہ عہد میں اردو افسانے کی جو صورت حال ہے اس پر گہری نگاہ ڈالی ہے وہ لکھتے ہیں:

"آج کا افسانہ اپنی لاتعداد شکلوں کے ہجوم میں اپنی ایک مکمل اور واضح شکل کی دریافت اور شناخت کے عمل میں مبتلا ہے۔ اور افسانہ کے مختلف نقاد قریب تیغ زن ہیں۔ جن کے باعث یہ افسانہ ابھی تک اپنے پورے قد و قامت کے ساتھ ابھر نہیں ہو سکا ہے۔ اس وقت سب سے اہم مسئلہ اس کی کہانیت کا ہے علامتی اور تجریدی طرز اظہار کی رو میں اور افسانہ کی کلاسیکی ہیئت اور اس کے STRUCTURE کے توڑ پھوڑ کے عمل میں اس کی روح کہیں منجمد ہو گئی ہے۔ جس کی وجہ سے اس پر UN-READABLE ہونے کا الزام عائد ہو گیا ہے۔ کہانیت دراصل ایک ڈور ہے جو قاری کو افسانہ سے ہم رشتہ کرتی ہے اگر افسانہ تجسس اور READABILITY کھو بیٹھے تو قاری کی شمولیت سے محروم ہو جائے گا اور قاری کی عدم شمولیت اس کے اپنے لئے عدم اعتماد کی تحریک ہے۔ اس لئے افسانہ میں کہانی کے عنصر کی بازیافت ضروری ہے کامیاب افسانہ وہی ہے جو اپنے اپنے بنیادی عناصر کے ساتھ ترسیل کی سطح بھی رکھتا ہو۔"

ان سیاق و سباق میں سلطان سبحانی نے عرفان عارف کے افسانوں کو دیکھا ہے اور دیکھنے کی سفارش کی ہے لیکن شہر کا خواب میں موجود افسانوں کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ افسانہ نگار نے جہاں کوئی قصہ یا ماجرا کو اپنے انداز میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے خواہ وہ موضوع کوئی بھی ہو کامیاب رہے ہیں۔ لیکن جہاں انہوں نے افسانے پر علامت اور تجرید کو لادنے کی کوشش کی ہے بلکہ یوں کہا جائے علامتی اور تجریدی ڈھانچے میں افسانے کو فٹ کرنے کی کوشش کی ہے تو انہیں ناکامی کے سوا کچھ نہ ملا۔ اور وہ علامت اور تجرید کے چکر میں اپنی بات کو قاری تک نہیں پہنچا سکے۔ اور افسانہ

(بقیہ صفحہ ۲۹ پر)

شہر خیال

اکتوبر کا سہیل آیا۔ ادھر آنے لگا ہے۔ اس میں "ابلیس کی مجلس شوریٰ دوم" پر راج بہادر گوڑ کا مقالہ پڑھا۔ یہ بھی سردار جعفری کے دیباچے کی طرح اقبال کی نظم سے ہی زیادہ گفتگو کرتا ہے۔

یہاں دو نظمیں پشکین کی نظموں کا ترجمہ کہہ کر پیش کی گئی ہیں۔ پشکین پر میری کتاب ترقی اردو بورڈ نے [illegible] میں پہلے چھاپی تھی۔ اس میں غالباً یہ نظمیں شامل ہیں۔ ماسکو سے ایک انتخاب اس کی منظومات کا دکوئی چھ ہزار مصرعے) ٹائپ میں دس برس پہلے نکلا تھا۔ وہ پٹنہ میں بھی فروخت ہوا تھا۔ لائبریری میں مل جائے گا۔ اگر پشکین سے کوئی ذاتی عداوت نہ ہو تو براہ کرم یہ نظمیں وہاں سے لے کر پھر ایک بار چھاپ دیجیے اور فرق دیکھیے یہ گدھ "نہیں پنجرے میں بند نکلا شاہین ہے" اور نظم ایسی نہیں جیسی "سہیل" میں نکلی۔

بچن جی نے بھی چند روسی نظموں کا انگریزی سے ترجمہ کیا تھا۔ کسی زمانے میں وہ اس پر انہیں نہرو ایوارڈ بھی ملا، وہاں ایک اعلیٰ درجے کی نظم "شب سرما" میں شاعر اپنی آیا سے جو ماں کی جگہ ہے خطاب کرتا ہے ؎

اسی جام میں گھول لیتے تلخیاں
کہ ٹھنڈا ہو دل گرم ہو کچھ لہو

بچن جی سمجھے کوئی محبوبہ ہے۔ تو پوری نظم کا مفہوم ہی بدل دیا۔ اور دو مصرعے بھونڈا اڑا دیے۔

ظ۔ انصاری (بمبئی)

سہیل بابت نومبر [illegible] نظر نواز ہوا۔ رفتہ رفتہ اس کے مواد کی زرخیزی میں اضافہ ہو رہا ہے۔ آپ لوگ بڑی محنت کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر مرزا خلیل بیگ کا مضمون "سائنسی نقطۂ نظر لسانیات میں" بے حد مفید اور معلوماتی ہے۔ اس سے علم السنہ کے بارے میں سائنسی مطالعہ کی اہمیت افادیت پر خاصی روشنی پڑتی ہے۔ فاضل مقالہ نگار نے لسانیات کے تدریجی ارتقاء تاریخی پس منظر اور مختلف ملکوں میں لسانیاتی مطالعہ کی روایت، منہج و نوعیت، اور سمت و رفتار کا وسیع اور گہرا جائزہ پیش کیا ہے۔ اپنے موضوع کے کثیر الجہت اور پیچیدہ سیاق و سباق میں ڈاکٹر صاحب کا یہ عالمانہ مقالہ ان کی لسانی و فنی بصیرت اور وسعت مطالعہ کا بین ثبوت ہے۔

بلراج حیرت کے شعری مجموعہ "الہام" پر ڈاکٹر تارا چرن رستوگی کا تجزیہ اچھا ہے۔ اس سے حیرت کی شاعری کی جہتوں اور پہلوؤں کی کھلنے

میں مدد ملتی ہے۔ منظومات میں بلراج حیرت، دلوند گوتم اور شاہد رحیم کی نظمیں پسند آئیں۔ غزلوں میں کلیم حیدر شرر، جمیل قریشی، علیم صبا نویدی امتیاز اختر اور عقیل گیاوی کی غزلیں خوب ہیں۔ مشرف عالم ذوقی کا افسانہ بھرپور ہے اور متاثر کرتا ہے ان کی کہانی کا یہ ٹکڑا:

"تجربوں نے زندگی کو معنی عطا کیا ہے
...... یہ لوگ بھی زندگی کے تجربوں
میں داخل ہو کر تہہ در تہہ ہو گئے ہیں"

بڑا معنی خیز ہے۔ اولیس احمد دوراں نے صرف ایک خوب خط پر ٹال دیا۔ ان سے ضرور کچھ لکھوائیے۔

——— فضا ابن فیضی۔ (مئو ناتھ بھنجن یوپی)

"شہر خیال" خیال انگیز عنوان ہے۔ اس مرتبہ مشتاق احمد صاحب کے انداز بیان نے روح کو تڑپا دیا۔ یوں لگتا ہے صاحب موصوف نے قلم کو سیاہی میں نہیں لہو میں ڈبو کر لکھا ہے۔

محترم کے، کے کھتر صاحب نے اس وسیع موضوع کو اختصار کی چادر میں لپیٹنے کی کوشش کی ہے۔ طنز و مزاح کو پل صراط تسلیم کیا گیا ہے۔ اس موضوع پر تنقید کرنا بھی پل صراط کے دہرے فصل سے گزرنا پڑتا ہے۔ ورنہ قدم لڑکھڑاتے ہی قلم اور قلمکار دونوں دھڑام سے گر پڑتے ہیں۔

فکر تونسوی بے شک بڑے مزاح نگاروں کی صف میں دکھائی دیتے ہیں۔ مقدار کے اعتبار سے اگر ایک پلڑے میں فکر صاحب کی کتابیں رکھی جائیں اور دوسرے پلڑے میں فکر تونسوی کو بٹھایا جائے تو کتابوں کا پلڑا جھک جائے گا۔ ان میں جواہر ریزوں کو چھانٹ کر نکالنے کے بعد ان کے مقام و مرتبہ کا تعین کیا جائے تو یقیناً فکر تونسوی صاحب کے ساتھ انصاف ممکن ہے۔

■

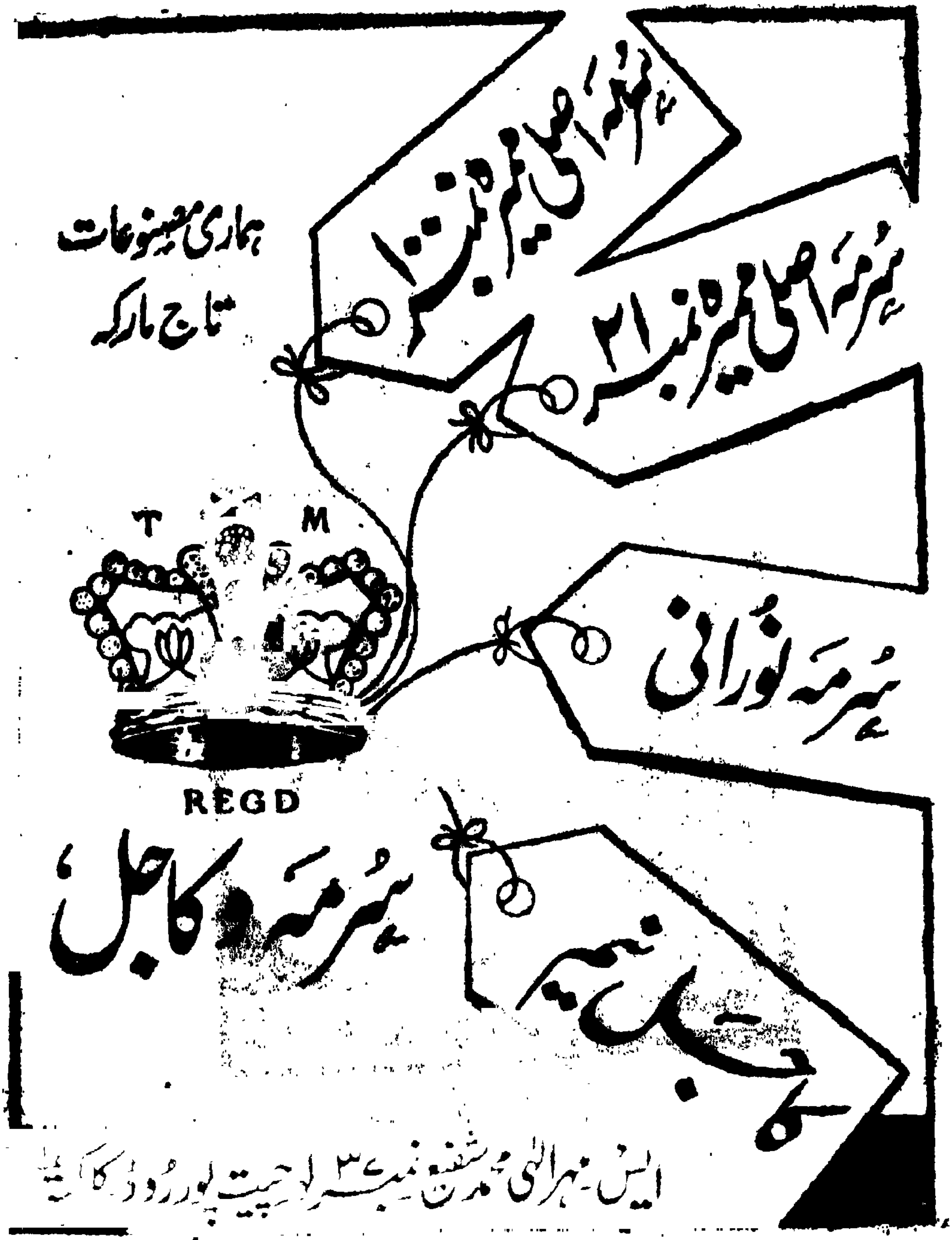
ایوارڈ یا انعام سے کسی فنکار کا فن کار کی قد و قامت ناپا نہیں جا سکتا بلکہ اس کے فن کی گہرائی و گیرائی اس کے قد و قامت کے بلندی کا معیار بنتا ہے۔ میر و غالب ہی کو لیجئے۔ غالب کی صدی عالمگیر پیمانے پر منائی گئی اور میر پر کوئی خاص توجہ نہیں کی گئی۔ لیکن نقادان ادب کے نزدیک میر کو غالب سے بلند پایہ کا غزل گو شاعر تسلیم کرتے ہیں۔ اسی طرح اقبال و ٹیگور کو لیجئے ٹیگور کو نوبل انعام ملا، اور اقبال نوبل انعام کے مستحق نہیں سمجھا گیا لیکن دونوں کی برتری و عظمت ان کے فکر و فن کے لحاظ سے مسلّم ہے اقبال اقبال ہے۔ ٹیگور ٹیگور۔ جناب کھتر صاحب کی اس موضوع پر پہلی کوشش ہے۔ آئندہ ان سے بہتر توقع کر سکتے ہیں۔ اگر تنگئ داماں سے کام نہ لیں۔

——— عبدالقادر ادیب دربھنگا

ایک شمارہ منور رانا کے نام بہت خوب ہے۔ بیل گاڑی، پنگھٹ، گاؤں، بچپن، ماں، دعائیں بہت اچھی طرح سے برتا گیا ہے۔ واقعی آپ نے ایک اچھے فنکار سے ہم کو روشناس کرایا۔

منور رانا کی شاعری ان پر لکھے گئے مضامین سے بھی اچھی ہے۔ کچی سڑک سے بیل گاڑی کا ملی کو رفعا اور اسٹیشن کا منظر پر سکون زندگی کا متلاشی ہے منور رانا اور سہیل دونوں کو مبارکباد۔

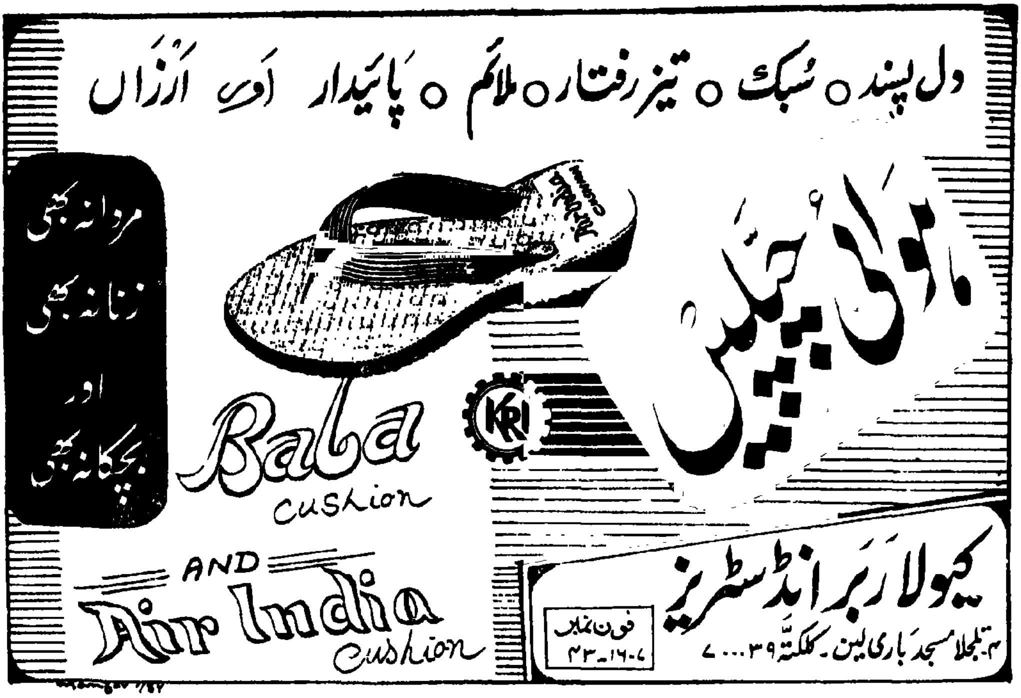
——— منصور اعجاز ڈالٹن گنج



ہماری مصنوعات
تاج مارکہ
سرمہ اصلی ممیرہ نمبر ۱۰
سرمہ اصلی ممیرہ نمبر ۲۱
سرمہ نورانی
T M
REGD
سرمہ و کاجل
منجن نیمیہ
ایس مہرالٰہی محمد شفیع نمبر ۳ راجپیت پور روڈ کلکتہ



نمبر U 18/77 ضرور دیکھیں
نورانی تیل



دل پسند ۰ سُبک ۰ تیز رفتار ۰ ملائم ۰ پائیدار اور ارزاں
مردانہ بھی
زنانہ بھی
اور
بچگانہ بھی
ہوائی چپلیں
Baba
cushion
AND
Air India
cushion
کیولا ربر انڈسٹریز
۴۔ تلجلا مسجد باری لین۔ کلکتہ ۳۹۔۔۔۷
فون نمبر
۴۳-۱۶۰۷

★ ★ ★



گرام "النوری"
دُلہن مارکہ
لاکھوں
کا
پسند
اسپیشل
گل
دانتوں کی
حفاظت
اور تازگی کے لئے
استعمال کیجئے
رجسٹرڈ نمبر
۳۳۵۴۶۱
النوری ٹوبیکو پروڈکٹس۔ جگتدل۔ ۲۴ پرگنہ

egd. No. Gay—4 Regd. with the R. N. P. at R. No. 3520/67
☎ : 1573 47 YEARS OF PUBLICATION
THE SOHAIL MONTHLY, River Side Road, Gaya - 823001

غزل

مجروح سلطانپوری،

★ ★ ★

(نمود)

پنجاب کا مسئلہ

پنجاب کے مسئلہ کو حل کرنا حکومت کی پہلی کوشش ہوگی کم سے کم وزیر اعظم راجیو گاندھی نے تو ایسا ہی کہا ہے. لیکن عملی طور پر حکومت نے ابھی تک اس جانب کوئی ٹھوس قدم نہیں اٹھایا ہے بلکہ ایسا لگتا ہے کہ کانگریس سردار سورن سنگھ کی قیادت میں پنجاب میں اپنی حکومت بنانے کی کوشش کر رہی ہے۔ ابھی یہ کہنا مشکل ہوگا کہ یہ قدم پنجاب کے مسئلہ کو حل کرنے میں کہاں تک مددگار ہوگا ؟

پنجاب کے کچھ حصوں میں پھر تشدد میں اضافہ ہوا ہے، جالندھر، لودھیانہ، ہوشیار پور، اور فرید کوٹ ضلعوں میں حادثے ہوئے ہیں۔ ان ضلعوں میں کچھ تشدد پر آمادہ لوگوں کی گرفتاریاں بھی ہوئی ہیں۔ جالندھر میں لگاتار دو بار طاقتور بم کا دھماکہ ہوا۔ اکال تخت کے پردھان گرنتھی جتھیدار کرپال سنگھ پر جان لیوا حملہ کیا گیا اس طرح کی خبریں بھی آرہی ہیں کہ گردواروں کا استعمال اشتعال پھیلانے والی تقریروں کے لئے کیا جا رہا ہے۔ حال ہی میں پولس نے ایک تقریب میں قوم دشمن تقریر کرنے کے جرم میں کچھ اکالی رضاکاروں کو گرفتار بھی کیا تھا۔ بلا مبالغہ یہ کارروائیاں عام لوگوں میں خوف وہراس پیدا کرنے کے لئے کی جارہی ہیں۔ جب پنجاب کے مسئلہ کے حل کے لئے بات چیت کا ماحول تیار ہونے لگتا ہے تو انتہا پسند اپنی تخریبی کارروائی تیز کر دیتے ہیں وہ چاہتے ہیں کہ تناؤ پیدا کر دیا جائے تاکہ بات چیت کے لئے ماحول تیار نہ ہو۔ اس صورت حال میں یہ ضروری ہے کہ اکالی لیڈر ایک مضبوط نظریہ اپنا کر انتہا پسندوں کی کھلی مخالفت کریں۔ ایسا ن کی حملہ آور کارروائیوں کی مذمت کریں۔ یہ افسوسناک بات ہے کہ ابھی بھی کچھ اکالی لیڈر آنند پور صاحب قرار داد کو بات چیت کے لئے مرکز بنانے پر زور دے رہے ہیں۔ انہیں اس پر زور نہیں دینا چاہئے کیونکہ اس سے خالصتانی انتہا پسندوں کو تقویت ملتی ہے۔ اکالی اور شرومنی گردوارہ پربندھک کمیٹی کے لیڈروں کو کوئی بھی ایسا قدم نہیں اٹھانا چاہئے جس سے انتہا پسندوں کو کسی بھی شکل میں بڑھاوا ملے انہیں پنجاب کے مسئلہ کے حل میں پوری مدد کرنی چاہئے۔

وزیر اعظم کو فوراً پنجاب کے مسئلہ کے حل کے لئے ضروری پہل کرنی چاہئے۔ یہ اچھی بات ہے کہ وزیر اعظم نے اس مسئلہ پر غور کرنے کیلئے ایک وزارتی کمیٹی بنائی ہے اب یہ ضروری ہے کہ اکالی لیڈروں کے ساتھ بات چیت کے لئے پہل کی جائے اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ گرفتار اکالی لیڈروں اور سکھ نوجوانوں کو جن پر جرم یا تشدد آمیز کارروائیوں میں شامل ہونے کا الزام نہیں ہے رہا کیا جائے اس پنجاب میں صحیح صورت حال پیدا کرنے میں مدد ملے گی سکھوں کے بیچ یقین کا ماحول پیدا ہوگا ——— جمیل منظر سہارنپوری

ترقی پسند ادب کا ترجمان

سہیل

فروری ۱۹۵۸ء

مدیر مسئول: ادریس سنسہاروی — چیف ایڈیٹر: مسعود منظر سنسہاروی — ایڈیٹر: جمیل منظر سنسہاروی
معاونین: سہیل احمد جمالی - عبدالقیوم ابدالی — مجلسِ مشاورت: ڈاکٹر تارا چرن رستوگی - ڈاکٹر رئیس احمد - اصغر علی انجینئر
خطاط: نظام الدین احمد - کلیم ڈونگروی — بدلِ اشتراک: — خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ:
فی شمارہ: ۲ روپے سالانہ: ۲۴ روپے — ماہنامہ سہیل - ریور سائیڈ روڈ - گیا — جلد: ۴۷
شمارہ: ۳ — لائف ممبری: ۲۵۱ روپے — فون نمبر: ۱۵۶۳

عظیم فیروز آبادی

ایک کھلا خط ڈاکٹر عبدالمغنی کی خدمت میں

۸ جنوری ۱۹۸۵ء کے قومی آواز میں ڈاکٹر عبدالمغنی صاحب کا ایک مضمون بعنوان "اقبال کا واحد مسئلہ" میرے اس عنوان کے تحت لکھے ہوئے ایک مضمون کی تردید میں شائع ہوا ہے اس مفہوم کی تفہیم و تجزیہ کے لئے ذیل میں اس کا خلاصہ پیش کیا جا رہا ہے۔

(۱) ہماری زبان مورخہ یکم اکتوبر ۱۹۸۲ء میں ایک عجیب و غریب مضمون عظیم فیروز آبادی صاحب کا شائع ہوا ہے وہ علمی اعتبار سے ہماری زبان جیسے باوقار رسالے میں اشاعت کے لائق نہ تھا اس غیر علمی اور بے وقعت مضمون کے مصنف نے صرف چند سطروں کی ایک تحریر کو افسانہ بنانے کی کوشش کی ہے۔ جس کا مقصد کوئی سنجیدہ تحقیق نہیں بلکہ ایک محترم شخصیت پر کیچڑ اچھالنا ہے یا یہ محض ایک عجوبہ پسندی ہے تاکہ ایک شوشہ چھوڑ کر لوگوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کی جائے۔

(۲) اقبال اپنے دور کا ایک انتہائی سند یافتہ انسان تھا جس کے سامنے ہر قسم کی دنیاوی ترقی کے سارے دروازے کھلے ہوتے تھے لیکن اس نے اپنے توکل کی بنا پر دنیا سے بقدر ضرورت اپنا حصہ لیا۔ اور اپنے وقت اور قوت کا بیشتر اور بہترین حصہ اپنے دور کے ذہنی اور اخلاقی تربیت پر اور [illegible] علمی اور ادبی شغل میں صرف کیا۔

(۳) اردو دنیا ابھی اقبال سے اتنی دور نہیں ہوئی ہے کہاں کے مشہور و معروف اشعار بھی لوگوں کو یاد نہ رہے ہوں۔ انہوں نے اپنی اصل کی طرف جو اشارے کئے ہیں اور اپنی مشہور نظم ——— ایک فلسفہ زادے کے نام ——— میں تو گویا اقبال نے اپنی نسلی تحقیر بھی کی ہے۔ اس معاملے میں اگر واقعی کسی کو اقبال کے حقیقی مطمح نظر کے متعلق کوئی تجسس ہو کر [illegible] چاہئے کہ وہ ان نظریات کا [illegible] کرے۔

(۴) شیخ میر عبداللہ اور سر تیج بہادر سپرو جیسی عظیم المرتبت ہستیوں نے اقبال کے کشمیری برہمن ہونے کی تصدیق کی ہے۔

(۵) ان حقائق کی روشنی میں ایک ناقص سی تحریر عظیم فیروزآبادی جیسے لوگوں کے لئے چھوڑ جانے کی اقبال کو کیا ضرورت تھی۔ اصل سوال جس پر ہمیں غور کرنا چاہئے یہ ہے کہ اگر یہ تحریر فی الواقع اقبال کی لکھی ہوئی ہے تو کن حالات میں اور کن مقاصد کے لیے کیوں مرتب ہوئی اور کس نے مرتب کرائی ؟

(۶) عظیم فیروزآبادی کا مضمون نقصویر، پرمذاقی، کم علمی اور کم ظرفی میں پہلے مضمون سے بھی بڑھا ہوا ہے۔

(۷) عظیم فیروزآبادی شاید کوئی فرضی نام ہے۔ لیکن اس مضمون کی دوسری قسط میں ان کی تصویر بھی شائع کی گئی ہے جس سے میرے شبہ کی تردید ہوتی ہے کہ وہ شاید نہ ہو۔ اور شیخ نتھو کی طرح کوئی صاحب پردۂ عدم سے وجود میں آگئے ہوں۔

(۸) اقبال اور ان کے والد کے سلسلے میں افلاطون اور سقراط کے تعلق کا جو ذکر کیا گیا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ عظیم صاحب پڑھے لکھے آدمی نہیں ہیں۔ اور اگر واقعی اقبال نے ایک سقراط اس انداز سے پیدا کیا ہے تو اس میں عیب کی کوئی بات نہیں ہنر کی ہے۔

(۹) "قرآن کو اس طرح پڑھا کرو جیسے وہ تم پر نازل ہوا ہے" یہ واقعی اقبال کے والد شیخ نتھو کا قول ہے اور صحیح مطالعہ کی سمت متعین کرنے کے لئے نہ ناقص طرز اظہار ہے اور نہ اس اسلوب سے قاری کے شریک نبوت ہونے کا احتمال پیدا ہوتا ہے۔

(۱۰) تشکیل جدید، الہیات اسلامیہ اقبال کے ایک ماہر عربی داں ہونے کی سند فراہم کرتا ہے۔

(۱۱) اس مضمون میں عظیم فیروزآبادی نے لفظ وثوق کا استعمال بھی از روے زبان غلط کیا ہے صحیح لفظ رسوخ ہے

(۱۲) ہند نیہ جگن ناتھ آزاد، اور علامہ اقبال کے عالم وفاضل فرزند جناب جاوید اقبال کو اس سلسلے میں روشنی ڈال کر عظیم فیروزآبادی کے دفاع کی تاریکی دور کر دینی چاہئے۔

خلاصہ کافی طویل ہو گیا۔ کیا کیا جائے۔ اس کے بغیر چارہ بھی نہیں تھا۔ میرے نقطۂ نظر کی معقولیت، یا تقویت اور میری تحقیق کی اہمیت یا بے اہمیت سے واقف ہونے کے لئے ضروری ہے کہ میرے اصل مضامین کا مطالعہ کیا جائے۔ اور دیکھا جائے کیا لکھا ہے۔ اور اس میں کہاں تک صداقت اور معقولیت ہے۔ بغیر اس خیال کے، کس نے لکھا ہے اور کیوں لکھا ہے میں اپنے قارئین سے درخواست کروں گا اگر وہ صداقت اور حقیقت کے متلاشی ہیں تو اپنا قیمتی وقت ضائع کر کے میرے اصل مضامین کا مطالعہ کریں۔ ڈاکٹر مغنی صاحب نے میرے مضامین یا میری تحقیق کو جس رنگ میں پیش کیا ہے یا ان سے جو نتائج اخذ کرنے کی کوشش کی ہے وہ خلوص پر مبنی نہیں۔ انہوں نے میرے مضامین کو تعصب اور اقبالی عقیدت مندی کی عینک سے دیکھا ہے مجھے ان کا یہ الزام تسلیم ہے کہ میں پڑھا لکھا آدمی نہیں ہوں۔ اور کالج چھوڑنے کے بعد، کاروباری مصروفیات کی بنا پر مجھے بقدر حوصلہ پڑھنے لکھنے کا وقت

نہیں ملتا۔ اس کے باوجود ڈاکٹر مغنی صاحب کی عالمانہ تنقیدی تصانیف ـــــ "اقبال اور عالمی ادب" اور "اقبال کا نظام فن" پڑھنے کی مجھے سعادت حاصل ہوئی ہے۔ اور مجھے مسرت ہے کہ عالمی سطح کے مقتدر شعرا کی صف میں اقبال کو شامل نہ کرکے کلیم الدین صاحب نے جس احساس کمتری میں اسیر، نامنصفانہ ذہنیت کا ثبوت دیا تھا اسے بے نقاب کرنے میں وہ بڑی حد تک کامیاب ہوئے ہیں۔ میں ان کی ناقدانہ بصیرت، وسعت مطالعہ اور ادبی صحت مذاق کا قائل ہوں۔ لیکن میرے مضمون میں "لغت" و "وثوق" کے غلط استعمال کی جو انھوں نے نشاندہی کی ہے اور اس کی بجائے لفظ رسوخ کے استعمال کا مشورہ دیا ہے۔ اس کی بنا پر ان کی علمیت اور صحت مذاق سے متعلق میرے عقیدے میں تزلزل پیدا ہوگیا ہے۔ میں ایک طالب علم محض ایک مبتدی۔ ممنون ہوں گا اگر وہ اس سلسلے میں ڈاکٹر عابد رضا صاحب بیدار، ڈائرکٹر خدا بخش لائبریری یا پروفیسر ممتاز احمد صاحب صدر شعبۂ اردو پٹنہ یونیورسٹی سے رجوع کریں اور مشورے کے بعد مجھے میری غلطی سے مطلع فرمادیں۔ بالصورت دیگر اخلاقی جرات سے کام لے کر اپنی غلطی کا اعتراف فرمالیں۔ میرا وجود فرضی نہیں ہے۔ دریا یہ وہم کہ ہم ہیں سو وہ بھی کیا معلوم کہ میں اب عدم سے بھی پرے غالب کا ہم نشین نہیں رہا ہوں۔ بلکہ اپنی ذہنی تاریکی کے ساتھ اس خاکدان تیرہ و تار کی ظلمت میں اضافہ کرنے یا ڈاکٹر مغنی صاحب کے تعفن آلود الفاظ میں ہماری زبان کے حوض کوثر میں پیشاب کے قطرے شامل کرنے پر مامور کر دیا گیا ہوں اور غالب کے بقول ـــــ تو اگر بھول گیا ہو تو پتہ بتلا دوں۔ ڈاکٹر صاحب اسے نوٹ کرلیں کہ سند رہے اور بوقت ضرورت کام آئے ـــــ عظیم فیروزآبادی پروپرائٹر یونو سپر گلاس انڈسٹریز فیروزآباد اینڈ نادر بخش اینڈ کو گلاس ورکس فیروزآباد فون نمبر ۱۱۴۷

ڈاکٹر مغنی صاحب کو علم ہے کہ علامہ اقبال کی ابھی تک کوئی مستند سوانح حیات نہیں لکھی گئی۔ ان کی تمام سوانح عمریاں، مدلل مداحی یا غلط بیانیوں کا پلندہ ہے۔ ہندوستان میں پاکستانی کتب کی عدم دستیابی کی وجہ سے ان کی اچھی سوانح نہیں لکھی جاسکتی۔ اور اگر وہاں سے مطلوبہ کتابیں فراہم بھی ہو جائیں تو اقبال کے معاصرانہ اخبارات کی دستیابی اور ان لوگوں سے براہ راست معلومات (FIRST HAND KNOWLEDGE) حاصل کرنے کا موقع ہاتھ نہیں آسکتا جنھیں علامہ کی فیض صحبت کا شرف حاصل رہا ہے پاکستان میں یہ فریضہ بخوبی انجام دیا جاسکتا ہے۔ لیکن وہاں حالات کا دباؤ اتنا سخت ہے کہ جوش جیسے عظیم المرتبت شاعر (جس کی قادر الکلامی علامہ اقبال کے بھی بس کی بات نہیں) کو اقبال سے متعلق اپنے آزادانہ خیالات کے اظہار کی وجہ سے معتوب ہونا پڑا۔ اور ابھی حال میں صدر پاکستان نے اقبال کی نظم "جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی" کو ریڈیو اور ٹی وی سے نشر کرنے پر پابندی عائد کردی ہے (ہماری زبان ۸ جنوری ۱۹۸۵ء صفحہ ۵) اس سے وہاں کے حالات کی سنگینی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ البتہ پاکستان میں اقبال پر اچھے سوانحی مضامین لکھے گئے ہیں لہٰذا اپنی تحقیق کو ... [illegible]

منظرِ عام پر نہیں آئی۔ اور جب تک وہاں کے موجودہ حالات یا سیاسی مصلحتوں میں تبدیلی نہ آجائے ایک اچھی بایوگرافی کی توقع بھی نہیں کی جاسکتی۔ اس کے برخلاف اگر کوئی ہندوستانی ادیب اس غرض سے پاکستان جائے اور وہاں عرصہ تک قیام کر کے مطلوبہ معلومات فراہم کرے تو اس اہم فرض سے عہدہ برآ ہوسکتا ہے۔ لیکن یہاں بھی اس کی مساعی کو اگر آمیز آلود نظروں سے دیکھیں، اس کی نیت پر شبہ کریں، اس کے تحقیق کردہ صحیح واقعات اور اس کی مخلصانہ رائے کو ایک محترم شخصیت پر کیچڑ اچھالنے، ایک مجوبہ پسندی کے شوق کا مظاہرہ کرنے، اور اپنے آپ کو نمایاں کرنے کی مبتذل کوشش قرار دیں تو یہاں بھی یہ کام ہونے سے رہا۔ لیکن یہاں یہ ایک کام ایک دن ہوگا ضرور۔ کیونکہ ہندوستان میں ابھی ایسے لوگوں کا کال نہیں ہے جو حق کے متلاشی اور حقیقت کو اس کے صحیح تناظر (PERSPECTIVE) میں دیکھنے کی تاب رکھتے ہیں۔

میں علامہ اقبال کا رقیب نہیں۔ ان کی دنیاوی جلالت، شہرت اور مقبولیت پر حسد نہیں کرتا۔ رقابت ہمیشہ ہم عصریت، یا ہم پیشگی کی بنا پر ہوتا ہے۔ میں ان کا ہم عصر نہیں، ہم پیشہ نہیں۔ شاعر بھی نہیں کہ ایک شاعر اپنے سوا کسی دوسرے شاعر کی تعریف برداشت نہیں کرتا۔ میں بھی ان کا اس قدر احترام کرتا ہوں اور ان کی شاعری سے آشنا ہو محظوظ ہوتا ہوں جتنا کوئی دوسرا ادب دوست، اردو داں ہوسکتا ہے۔ یقین جانیے بعض دفعہ ان کے کلام سے میری طبیعت میں اس قدر ہیجان پیدا ہو جاتا ہے کہ میری نیند اڑ جاتی ہے۔ اور میں سونے میں دیر تک کامیاب نہیں ہوتا ممکن اس کی وجہ کوئی دوسری اعصابی کمزوری ہو جس کا مجھے علم نہیں۔ لیکن انہیں ایک اعلیٰ شاعر ماننے کے باوجود ایک اعلیٰ انسان نہیں سمجھتا۔ اس ضمن میں میں اپنے استاد محترم رشید احمد صدیقی سے متفق نہیں کہ ایک اچھا انسان ہی اچھا شاعر ہوسکتا ہے۔ بلکہ اس کے برعکس مجھے دوسکی رائے میں صداقت نظر آتی ہے جو کہتا ہے کہ اکثر دنیاوی ترقیاں نامعقول لوگوں کی ہی رہینِ منت ہوتی ہیں۔

پاکستان میں ہی نہیں، ہندوستان میں بھی ہر ذی عقل اچھی طرح سمجھتا ہے کہ سستی شہرت اور مقبولیت حاصل کرنے کا آسان نسخہ یہ ہے کہ اپنا شمار اقبال کے مداحین میں کرالیا جائے آپ کو اچھی طرح معلوم ہے کہ پاکستان میں کتنے ادارے، اور ہندوستان میں کتنے افراد ایسے ہیں جن کی علمیت کا بھرم اقبال کے گن گانے، اور جن کے حلوے مانڈے کا مدار اقبال کا نام بیچنے پر ہے۔ اس برصغیر میں علامہ اقبال نے ایسی ہر دل عزیزی حاصل کرلی ہے کہ کوئی بھی شخص جو ان کی فنی یا شخصی کوتاہیوں کی طرف انگشت نمائی کرے گا عوام ہی نہیں خواص کی نظروں میں بھی معتوب ہو جائے گا۔ چاہے اس کی رائے کتنی ہی معقولیت اور خلوص پر مبنی ہو اس لئے کوئی شخص جو کسی کالج یا یونیورسٹی میں لکچرر ہے، کسی سرکاری یا نیم سرکاری کا سربراہ ہے یا کسی اکاڈمی کا وظیفہ خوار ہے ایسی جرأت یا طاقت نہیں کرسکتا۔ خدا کا شکر ہے غالب کے الفاظ میں، میں کسی کا نوکر نہیں میری خواہش ہے کہ HENRY TROYAT

ئے کی بائیوگرافی کی طرح اردو میں بھی علامہ اقبال کی ایسی ہی سوانح حیات مرتب ہو جائے تو ان کی شب و روز
بیوں، ان کے باطن کی پوشیدہ امنگوں اور آرزوؤں اور ان کے ظاہر کی مخلصانہ یا ریاکارانہ ہنگامہ آرائیوں کو
ے مجلا اور آئینہ کر دے کہ اسے پڑھ کر ہم محسوس کرنے لگیں کہ اس کی جلوت اور خلوت میں ہم ہر سمل اس کے شریک کار
در اور اسے بے نقاب دیکھا ہے۔ یہ کام جتنا وقیع اور دلفریب نظر آتا ہے اتنا ہی مشکل ہے، اقبال بڑی پہلو
دار شخصیت کا مالک ہے وہ کبھی خود کو بھی اپنے آپ سے چھپانے کی کوشش کرتا ہے۔ اور جب آپ اس
ون میں جھانکنے یا تلاش کرنے میں اس کی مدد کے خواہاں ہوتے ہیں تو وہ مسکراتے ہوئے آگے بڑھ جاتا ہے۔
یال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے۔

اس ہشت پہلو شخصیت کو برہنہ دیکھنے کی ہم میں تاب نہیں، اقبال بھی ہماری اس کمزوری سے واقف
وہ ہماری نظروں کے سامنے اپنی شخصیت کے دلفریب پہلو پیش کرتا ہے اور اپنے چہرے کے داغوں کو چھپا
کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھتا۔ اگر ہم ڈاکٹر مغنی صاحب کے مشورے کے مطابق "اقبال کے مشہور و معروف
و یاد رکھیں دریا ان پر اعتبار کریں) جن میں انہوں نے اپنی اصل و نسل کی طرف صریح اشارے کئے ہیں"
یب خوردگی سے نہیں بچ سکتے۔ ڈاکٹر صاحب اجازت دیں تو میں ان کا ایک ناقدانہ مشورہ انہیں یاد دلا
قبال اور عالمی ادب میں صفحہ ۵۱۵ پر فرماتے ہیں ——— "تنقید میں شعراء کے بیانات پر انحصار نہیں
سکتا ہے ——— اور یہاں آپ ہمیں کیا مشورہ دے رہے ہیں؟ اس سلسلے میں میری گزارش ہے کہ تنقید
بار کیا بھی جا سکتا ہے تحقیق میں اس کی مطلق گنجائش نہیں۔ شک تحقیق کی عمارت کا خشت اول ہے۔
م کی عظمت کو خاطر میں لاتی ہے اور نہ کسی حقیر کی حقارت کو نظر سے دیکھتی ہے۔ جب تک کہ اس کی عظمت
ت پر کامل یقین نہ ہو جائے۔ ڈاکٹر مغنی صاحب کی طرح اقبال کی بلند پایہ شاعری کی بنا پر میں بھی انہیں بلند
سان سمجھتا رہا، لیکن برسوں کے انہماک و تجسس کے بعد اس فوق البشر کی عظمت کے ابوالہول کے اندرون کو
ینے کی توفیق ہوئی تو وہ عام انسانی کثافتوں میں لتھڑا ہوا ایک محکوم و مجبور انسان نظر آیا۔ یہ آئینہ دور سے جتنا
ر آتا تھا ہاتھ میں لے کر الٹ پلٹ کر جب دیکھا تو اس کی تابش اور اس کی زنگ آلودگی کی اور اس کی
اور اس کی کثافت کی آئینہ دار نظر آئی۔ اور جب میں نے اپنے مطالعے اور مشاہدے کو قلمبند کرنا
ں پرستاران اقبال اس طرح چراغ پا ہو گئے جیسے اقبال کی تحقیر کرنا میں نے اپنا مقصد حیات بنا لیا ہو۔
کے لئے کبھی انہیں یہ خیال نہیں گزرا کہ جس طرح اقبال کی جھوٹی سچی تعریف کرنا انہوں نے اپنا شعار بنا لیا ہے،
میں ایسا بھی ہو سکتا ہے اس تعریف یا تنقیص سے ہٹ کر اقبال کو اس کے اصل خد و خال میں دیکھنا
مت السمین ہو۔ اس نقطۂ نظر سے جب آپ اقبال کی سوانح عمریوں کا مطالعہ کریں گے تو اس کی عمر

سوانح حیات دروغ بیانیوں کا دفتر نظر آئے گی۔ ایسا لگتا ہے جیسے اقبال کے تذکرہ نگاروں میں اس کو ممتاز
کی ہوڑ لگی ہوئی ہو۔ اس ہوڑ کی نمائش کو میں نے اپنی زیر ترتیب تالیف "سچ کہہ دوں اے برہمن" میں قلم
کی کوشش کی ہے۔ اس کے دو ابواب اقبال کا وصیت نامہ اور اقبال کے والد ہماری زبان میں اور ایک
اقبال کی شادیاں عظیم آباد ایکسپریس پٹنہ میں شایع ہوا ہے۔ ماہرین اقبالیات سے درخواست ہے کہ ان "
واقعات یا تاریخی حقائق میں نے پیش کئے ہیں ٹھنڈے دل سے اس کا جائزہ لیں۔ اگر ان واقعات کے بیان کر
یا ان کی اصلیت کے جاننے میں مجھ سے غلطی ہوئی ہے تو اس سے مجھے آگاہ کریں۔ محض گالیاں دینا یا غم و غصہ کا
تو قارئین کی بدگمانی اور شبہات کو تقویت پہنچاتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب معاف فرمائیں مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ علامہ اقبال کی اخلاقی یا انسانی کمزوری
واقف ہیں، میری طرح شعوری یا غیر شعوری طور پر وہ بھی اس نتیجے پر پہونچے ہیں کہ اقبال ایک بلند مرتبہ شاعر تو تھا
فضائل کے اعتبار سے وہ قابل ذکر انسان نہیں تھا۔ ورنہ شاعرانہ حیثیت سے جہاں اس کی عظمت نمایاں
کے لئے اقبال اور عالمی ادب، اقبال کا نظام فن، اور دوسرے درجنوں مضامین میں انہوں نے ہزار بارہ سو صفحے
سیاہ کئے ہیں وہاں اس کی ایک مختصر سوانح حیات لکھنے کی بھی وہ ضرورت محسوس کرتے۔

خلاف توقع خط زیادہ طویل ہوگیا۔ مجھے اندیشہ ہے قارئین اس کی طوالت سے بور ہوگئے ہوں گے
چاہئے تو یہ تھا کہ اپنے مضمون سے متعلق ڈاکٹر مغنی صاحب کے اعتراضات کا سلسلہ وار ناقدانہ جائزہ لیتا۔ ا
کو صرف یہ کہہ کر مختصر کرتا ہوں کہ ڈاکٹر صاحب کے فرمودات کج بحثی کا بہترین یا بدترین نمونہ ہیں۔ میرا مضمون
وہ اس قدر مشتعل ہوگئے ہیں انہیں احساس ہی نہیں کہ دن کو رات منوانے پر مصر ہیں۔ کج بحثی اور بدگمانی کی انتہا
ہے کہ میرے وجود سے ہی منکر ہیں۔ اقبال کی مشہور نظم فلسفہ زدہ سید زادے کے نام سے متعلق اظہار خیال کرتے
فرمایا ہے کہ اقبال نے اس میں اپنی نسلی تحقیر کی ہے جبکہ فخریہ وہ اس کا اعلان کرتا ہے کہ اس کا تعلق اس قوم
حکمت و فلسفہ جس کی رگ رگ میں سمایا ہوا ہے میں نے لکھا تھا ابن عربی کی فصوص الحکم (جو عربی زبان میں
کو سمجھنے کے لئے انہیں ایک مولوی کی مدد لینی پڑی۔ آپ استدلال کرتے ہیں کہ عربی زبان کے ماہر ہوئے بغیر کوئی دا
تشکیل جدید الہیات اسلامیہ جیسا قابل فخر کارنامہ انجام نہیں دے سکتا۔ شاید پروفیسر جمال خواجہ صد
فلسفہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی QUEST OF ISLAM ڈاکٹر صاحب کی نظر سے نہیں گزری۔ جو عر
نابلد ہیں اور جس کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ علامہ کا یہ کارنامہ فلسفیانہ یا اسلامی فکر کا ایورسٹ نہیں
عربی زبان میں اقبال کی کوئی تصنیف نہیں۔ جس کی زبان و بیان کی خوبیوں کا سید سلیمان ندوی یا مو"
نے اعتراف کیا ہو۔ رہا اسلام سے متعلق علامہ اقبال کا تبحر علمی، اس کا اندازہ سید سلیمان ندوی کے نام علامہ

خطوط سے کیا جاسکتا ہے۔ اس سلسلے میں مزید تلاش ہو تو پروفیسر غلام مصطفےٰ تبسم کے نام ان کا خط ملاحظہ فرمائیے۔
"میری مذہبی معلومات کا دائرہ نہایت محدود ہے۔ البتہ فرصت کے اوقات میں، میں اس بات کی کوشش کرتا ہوں کہ ان معلومات میں اضافہ ہو" (اقبال نامہ حصہ اول ص ۴۶) ڈاکٹر صاحب کی برہمی سے لطف اندوز ہونے کے لئے میں عرض کرتا ہوں کہ عربی تو کجا علامہ کو آخری عمر تک صحیح اور بامحاورہ اردو لکھنے پر بھی قدرت حاصل نہیں ہوئی۔ اگر انہیں اس پر عبور ہوتا تو اپنی مایہ ناز تصنیف REEANSTMCTION OF RELIGIOUS THOUGHTS IN ISLAM کو انگریزی کی بجائے اردو میں لکھا ہوتا۔ اور "تشکیل جدید الہیات اسلامیہ" کی جگہ سیدھے سبھاؤ اس کا ترجمہ فکر اسلامی کی تشکیل جدید کیا ہوتا۔ علامہ کی اس رائے سے میں متفق نہیں کہ اردو میں اتنی صلاحیت نہیں جو کہ ان کے خیالات کے متحمل ہو سکے۔ آخر رضی الدین احمد نے بھی تو نظریہ اضافیت اردو میں لکھی ہے۔ اور مولانا مودودی نے بھی عمیق ترین مذہبی مسائل اسی زبان میں ادا کئے ہیں۔ علامہ اقبال کی اصل و نسل کی تصدیق کے لئے شیخ محمد عبداللہ اور سر تیج بہادر سپرو مناسب گواہ نہیں ہیں۔ مجھے واقفیت حاصل کرنے کے لئے ڈاکٹر اکبر حیدری کشمیری کے مضمون ــــ "کچھ اقبال کے خاندان کے بارے میں"، کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ جو اوّلاً ہمہ فروری ۱۹۸۰ء کے قومی آواز میں اور بعدۂ ہماری زبان دہلی میں شائع ہوا ہے۔

آخر میں مجھے ڈاکٹر صاحب سے مودبانہ گزارش کرنا ہے کہ میری دماغی تاریکی دور کرنے یا میری غلطیوں سے مجھے آگاہ کرنے کے لئے وہ تاریخی حقائق اور معقول و برمحل (TOLTE POINT) دلائل سے کام لیں۔ او عدل و معقولیت کو رہنما بنائیں۔ پروفیسر جگن ناتھ آزاد، یا ڈاکٹر جاوید اقبال میری یا ان کی دستگیری نہیں کر سکتے۔

ہے ادب شرط منہ نہ کھلوائیں
ہم نے سب کا کمال دیکھا ہے

تاریخ کی ابجد

• مستند تاریخیں	ا ــــــــ اردو	باوجود کاغذ کی گرانی کے قیمت
• نقشہ لابہ وعروج	ب ــــــــ بخشی	وہی فی جلد ۴۵ پیسے فی سینکڑہ
• برسات کے تجربہ	ج ــــــــ جنتری	۳۰ روپے، فی ہزار ۲۸۰ روپے
• اور دیگر دلچسپ مضامین	د ــــــــ دیکھئے	(محصول فری)

جو نئے رنگ و روپ کے ساتھ شائع ہو گئی ہے

تاجران کتب کو چاہیے کہ پیشگی رقم کے ساتھ اپنی فرمائش نوٹ کرا دیں، نوٹ :- نمونہ کے لئے ایک روپے کا ڈاک ٹکٹ بھیجئے

اسٹاکسٹ

پٹنہ — سبزی باغ پرویز بک ڈپو، کتاب منزل بک امپوریم، آفتاب بک ڈپو،
مظفرپور — عین الحق بک سیلر، نجم بک اسٹال اسٹیشن روڈ، محمد کریم بخش بک سیلر کمپنی باغ، عبدالخالق دفتری،
بھاگلپور — ظہیر الدین ململی تکلی بازار، مکتبہ اسلامی لہریا سرائے
ستی پور — مدھوبنی لکھیتی اسٹور، سمی بک ڈپو، اسٹیشن روڈ ـ مولوی عبدالوہاب قاسمی، مدھے پور
سیتامڑھی — محمد توفیق بک سیلر، محمد رفیق مہسول چوک، اقبال سینٹر،
سیوان — نظام الدین بک سیلر، چوک بازار، وارثی اسٹور، مدرسہ اسلامیہ احسانیہ گوپال گنج،
گیا — ظفر بک ڈپو، فضل بک ڈپو، جی بی روڈ گیا۔ اسعد بک ڈپو گھسیار ٹولہ حنفیہ بک سنٹر اورنگ آباد
چمپارن — بک امپوریم بیتیا، شیام ساہتیہ سدن سکٹا، یونیورسل بک ڈپو بیتیا، محمد اکرام بک سیلر چوک گیا
عبدالرحمن بک سیلر رکسول، دینی کتاب گھر رام نگر
آرہ — ضیاء الحق، حاجی شرف الدین چوک، سوداگر سنگھ بہیا، بھوجپور
بیگوسرائے — کتابستان، شمیم کتب خانہ مہوا، ولشیال نیشنل بک ڈپو حاجی پور
کٹیہار — اپنا کتاب گھر کٹیہار، جنرل کتاب گھر ریم جی روڈ کٹیہار
پورنیہ — کپور چند ساہا بہیر کار نرسا اررایہ کورٹ محمد اسماعیل اشرفی جوگبنی
کشن گنج — صادق کتاب گھر، رضوان بک ڈپو، جیوتشی پستک بھون، کشتی بک ڈپو
بھاگلپور — حمیدیہ پستک بھنڈار، سہولا چوک، اسلامیہ بک ڈپو، کمالیہ بک ڈپو، تاتار پور

ایس اے بی بخشی کمپنی ۳۲ مولانا شوکت علی (کولوٹولہ) اسٹریٹ کلکتہ ۷۳

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ

اُردو غزل کا نشاۃ ثانیہ اور مجروحؔ سلطانپوری

اسعد الحسن خان — لیکن اصلی نام سے بہت کم لوگ واقف ہیں۔ یہ اور بھی کم لوگ جانتے ہوں گے کہ آپ راجپوت نسل کے ہیں۔ خان لقب کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ عربی فارسی کے علاوہ طب میں دسترس رکھتے ہیں۔

اور لوگ آپ کو مجروحؔ سلطانپوری کے نام سے جانتے ہیں۔ پتہ نہیں طب کے راستے آپ نے کتنوں کو ٹھکانے لگایا۔ کتنوں کی جان بچائی۔ لیکن ادبی مورچہ پر تسلیم کرنا ہوگا کہ آپ نے غزل کے بڑے بڑے شہ زور منکرین کو چیت کر دیا۔ اور ان زوروں کو جو حملوں کی تاب نہ لاکر کچھ مایوس ہو چکے تھے۔ اور ... کی کم مائیگی کے شاکی ہو رہے تھے۔ غزل میں نئے میدانوں ... اور منزلوں کی نشاندہی کر کے ان کے حوصلے بڑھائے۔

ادب اور شاعری کے مورچہ پر آپ اصلی راجپوت بھی ... ت ہوئے اور اچھے طبیب بھی۔

خواجہ الطاف حسین حالی نے بقول فراقؔ "اپنے وقت ... رائج اور مقبول عام غزل گوئی سے اظہار برہمی کیا ہے اور ... کرنا ضروری تھا۔" امیرؔ اور داغؔ کی غزلیں میں زندہ دلی ... رہی ہو لیکن ساری غزل گوئی کو "آنچل اور محرم" کے لئے ... کر دینا غزل کے ساتھ ناانصافی تو تھی ہی، عشق کو بھی گھٹیا ... پر لا کھڑا کر دیا تھا۔

یہاں حسرتؔ موہانی نے اُردو غزل کو نئی لے سے آشنا ... لے شاید نئی نہ رہی ہو۔ کیوں کہ روایت آشنا دماغ جانتا ... حسرتؔ نے اصل میں اُردو غزل کو اس کی سابقہ عظمت ... معشوق اور معتبری بخشی اور عاشق کو رکھ رکھاؤ عطا

کیا۔ — لیکن ڈاکٹر عندلیب شادانی کی اس پر بھی تشفی نہیں ہوئی۔ اُردو والوں نے اس دور کے جن پانچ غزل کے شاعروں حسرتؔ، اصغرؔ، جگرؔ، فانیؔ اور فراقؔ کو پانچ امام مانا تھا۔ جنھوں نے اُردو غزل کو ہزل کی سطح سے اوپر اُٹھایا تھا۔ ان ہی کے خلاف ڈاکٹر عندلیب شادانی نے ۱۹۳۲ء کے ماہنامہ "ساقی" میں وہ مہم چلائی کہ خدائی کی پناہ۔ فراقؔ نے اسی پر تو جھنجھلا کر "دورِ حاضر اور اُردو غزل گوئی" کے عنوان سے جولائی ۱۹۳۲ء میں رسالہ "نگار" میں ایک مضمون لکھا۔

> یہ سمجھنا سخت گمراہی ہے کہ دورِ حاضر میں اُردو نظم نے تو ترقی کی ہے لیکن اُردو غزل محض جھک مار رہی ہے۔ اور "تجربہ چوں پیر شود پیشہ کند دلالی" کے مصداق بن رہی ہے۔

ڈاکٹر عندلیب شادانی نے وار کیا:

> "اس میں (غزل میں — راج) ایک بڑی سہولت یہ ہے کہ تھوڑی سی موزونی طبیعت سے غزلوں کا پورا دیوان تیار ہو جاتا ہے۔ نہ تخیل کی ضرورت نہ مشاہدہ و مطالعہ کی احتیاج، ہر قسم کے الفاظ و مضامین کا وافر ذخیرہ موجود ہے، کسی مخصوص وزن پر الفاظ جوڑ لیے اور غزل بن گئی۔ سننے والوں نے یار فروشی کی خاطر یا اپنی خوش فہمی کا ثبوت دینے کے لیے زبانی یا تحریری اس زور شور سے "واہ واہ" کی کہ شعر کا صحیح ذوق، رکھنے والا ...

ہو کر رہ گئے اور انھیں اپنی صلاحیتِ ذوق پر
شبہ ہونے لگا۔"
یہاں اگر الفاظ کے خوبصورت ڈھیر کو شعر سمجھنے سے
انکار کرنا تو صحیح ہے، لیکن حسرت، جگر، فانی اور فراق پر
یہ الزام تو نہیں لگایا جا سکتا تھا۔
بات صرف اتنی نہیں تھی۔ معاملہ اس مقام سے آگے نکل
چکا تھا جہاں حالی مورچہ لیا تھا۔ یہ ۱۹۳۶ء کے بعد کا زمانہ
تھا۔ اب تو پریم چند نے نئے افسانے کی نیو ڈالدی تھی۔ ہندوستان
میں سامراج کے خلاف اور یورپ میں فاشزم کے خلاف اور
عالمی سطح پر سرمایہ داری ہی کے خلاف سوشلزم کا جہاد چل پڑا
تھا۔ نثر و نظم دونوں ہی نے زندگی کے اس مجاہدانہ سفر میں
انسان کی دستگیری کی تھی۔ ایسے میں غزل سے ایک نئے زاویے
سے اعتراض کیا جا رہا تھا۔ محض عشق خواہ وہ کتنا ہی صالح
کیوں نہ ہو، زندگی کی واحد حقیقت تو نہیں تھا۔ اعتراض یہ
تھا کہ تنگنائے غزل زندگی کے نئے مضامین کے اظہار کی
متحمل نہیں تھی۔ اسی لئے ترقی پسندوں میں غزل سے انحراف
اور نظم کی بڑھنے کا زبردست رجحان تھا۔ خود جگر نے گھبرا
کر کہدیا ؎

فکرِ جمیل خوابِ پریشاں ہے آج کل
شاعر نہیں ہے وہ جو غزل خواں ہے آج کل

دوسری طرف ایسے بھی لوگ تھے جو غزل کے اندر ہی
روایت بھی اور روایت سے بغاوت کی رو بھی جاری و ساری
دیکھتے تھے۔ خود فراق نے اپنے مضمون "غزل کی ماہیت و ہیئت"
میں کہا:

زندگی کے مرکزی اور اہم حقائق و مسائل غزل کے
موضوع ہوتے ہیں۔ ان حقائق میں وارداتِ عشق
کو اولیت حاصل ہے۔ کیونکہ انسانی تہذیب
کے ارتقاء میں جنسیت سے اور اس سے پیدا
ہونے والی کیفیتوں کا بہت بڑا ہاتھ رہا ہے۔ جنسیت
نے اندھے طوفان کو توازن بخشا یعنی
تہذیبِ جنسیت تاریخ کا بہت بڑا کارنامہ
رہا ہے۔ ہم محبوب سے محبت کر کے اور محبت کو
رچا سنوار کے اپنی زندگی کو رچاتے اور
سنوارتے ہیں، حیات و کائنات سے محبت
کرنا سیکھتے ہیں اور زندگی کی دھار کو کند
ہونے سے بچاتے ہیں۔ غزل ہمیں جنسیت کی
اہمیت کا احساس دلاتی ہے اور جنسیت جب
داخلی اور غیبی طریقوں سے عشق بن جاتی ہے
تو اس عشق کے لامحدود امکانات کی طرف
اس عشق کے ذریعے سے تعمیرِ انسانیت کی طرف
غزل اشارہ کرتی ہے۔ پھر یہی عشق حیات و
کائنات سے ایک ایسا والہانہ لگاؤ پیدا کر
دیتا ہے کہ جنسیت کے حدود سے نکل کر عشق
ایک ہمہ گیر حقیقت بن جاتا ہے۔"
("فن اور تنقید" مرتبہ انور کمال حسینی ص ۱۹۷)

کسی اور مقام پر فراق ہی نے کہا ہے کہ عشق اپنے اعلیٰ مقام
پر پہنچ کر "شعور، تحت الشعور اور لاشعور" کے درمیان
کڑی بن جاتا ہے۔
عُرفی نے غمِ عشق اور غمِ دنیا کے اسی ربط کو
اور انداز میں بیان کیا ہے:

در دلِ ما غمِ دنیا غمِ معشوق شود
بادہ گر خام بود پختہ کند شیشۂ ما

اسی بحث اور CONTROVERSY کے پس منظر میں مجروح
پوری کا شعری ذوق پروان چڑھ رہا تھا۔ غالباً وہ ۱۹۴۰ء
ہی سے شعر کہتے تھے۔ ۱۹۴۱ء کے ان اشعار سے

اُف رے وہ عالمِ رخصت کے دیر تک

پھیل گیا

تکتا رہا ہوں یوں ہی تیری رہ گذر کو میں
یہ شوق کا سپیدا، یہ تم، یہ فضا، یہ رات
کہہ دو تو آج روک دوں بڑھ کر سحر کو میں

۱ء کے اس شعر کا مقابلہ کیجئے ؎

مجھے سہل ہو گئیں منزلیں، وہ ہوا کے رخ بھی بدل گئے
تیرا ہاتھ ہاتھ میں آگیا، چراغ راہ میں جل گئے

تو اس سفر کا پتہ چلے گا جو مجروح کے ساتھ اُردو غزل شروع کیا تھا۔ یہاں عرفی کے شعر کی تصدیق ہوتی ہے۔ کے دل کے شیشے میں غمِ عشق کی شرابِ خام، غمِ زندگی کی میں تپ کرے دو آتشہ بن جاتی ہے۔ یہ وہ منزل ہے عشوق کا ہاتھ مل جاتا ہے۔ زندگی کی تاریک راہوں میں ہد چراغ جل اُٹھتے ہیں۔

آپ ہی کہیے کیا مجروح نے اس نئے دور میں غزل کو مقام سے آگے نہیں لایا جہاں حسرت نے چھوڑا تھا، غزل نی علامتوں کو نئے معنوں سے آشنا کر دینا ایک اہم کارنامہ ہے! غالب نے ہرگوپال تفتہ کا نام اپنے ایک خط میں "شاعری معنی آفرینی ہے، قافیہ پیمائی نہیں" اور اگر ے اور قافیہ شعر کو غنائیت بخشتے ہیں تو کیا شعر کو معنے کی کشمکش سے نہیں ملتے؟ پھر یہ زندگی کی کشمکش مسلسل ہے اور ہر دور میں نئی بھی۔ یہی نیا پن اس دور کو انفرادیت تا ہے۔ اسی لئے غزل کی علامتیں بھی ہر دور میں ایک نئے اور ایک نئی انفرادیت چاہتی ہیں۔

میر کے بارے میں ایک نقاد نے کہا ہے کہ "اگر وہ غم کے نہ ہوتے تو اپنے زمانہ کے ساتھ دغا کرتے۔"

جاں نثار اختر نے کہا "میر کا راز اسی میں ہے کہ انھوں کو ایک ایسا لہجہ دے دیا جس میں صرف تحمل اور تاب نت ہی نہیں زندگی کی ایک نئی قوت بھی چھپی ہے۔"

پھر فراق کے نقطۂ نظر کا تجزیہ کرتے ہوئے جاں نثار اختر نے کہا "اس فکری نظام کے زیرِ اثر درد کی شاعری میں انسان دوستی کے عناصر موجود ہیں ...... لیکن اکثر وہ اپنے صوفیانہ طرزِ فکر کو غمِ دوراں سے بچنے کے لئے پناہ کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔"

غمِ روزگار سے بھاگ کر غمِ عشق میں پناہ لینا بھی ہمیشہ ممکن نہیں۔ آل احمد سرور نے کہا ہے:

"پہلے شاعر غمِ روزگار سے بھاگ کر غمِ عشق میں پناہ لے لیتا تھا۔ لیکن سماجی اور سیاسی حالات اور معاشی الجھنوں نے اس دور کے ذہن کی اس طرح پرداخت کی ہے کہ یہ پناہ ناکافی ہو گئی ہے۔"

غزل کے اس پناہ گاہ سے بھاگ نکلنے اور شاہراہوں پر انسانوں کے معروف قدموں کے ساتھ قدم ملا کر چل پڑنے کا نام ہی مجروح سلطان پوری ہے۔

مجروح نے اُردو غزل کی جو خدمت کی ہے اور غزل کو ارتقاء کی جن منزلوں سے آشنا کیا ہے ان کا احاطہ نہایت مشکل ہے لیکن سال بہ سال انکی غزلوں کے اشعار کو دیکھ دیکھ کر اس کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ جب شاعر نے ۱۹۴۱ء یہ خالص رومانی شعر کہے ؎

کسی کسی کو میں تیرے تغافل کا دوں جواب
اکثر تو رہ گیا ہوں جھکا کر نظر کو میں

وہ ۱۹۴۳ء سے کچھ یوں کہنے لگتا ہے ؎

جس سوختہ نظر کی محفل میں آنسو بھی تبسم بن جائے
واں شمع جلائی جائیگی، پروانے کا ماتم کیا ہوگا

۱۹۴۴ء کہیں ظلمتوں میں گھِر کر ہے تلاش دستِ رہبر
کہیں جگمگا اٹھی ہیں مرے نقشِ پا سے راہیں

وہ زمانہ یاد کیجئے۔ ہندوستانی رہنما جیل میں بند ہیں۔ ملک ایک بدحالی کا شکار ہے اور ادھر دنیا سرخ فوج کی جوانمردی

کے افسانے سن رہی ہے۔ ہٹلر کی شکست کا آغاز ہو چکا ہے۔
تب اس شعر کے تہ در تہ معنے آپ پر آشکار ہوں گے ؎

بچا لیا مجھے طوفاں کی موج نے ورنہ
کنارے والے سفینہ مرا ڈبو دیتے

۱۹۴۵ء تبسموں نے نکھارا ہے کچھ تو ساقی کے
کچھ اہلِ غم کے سنوارے ہوئے ہیں میخانے

شبِ انتظار کی کشمکش میں نہ پوچھ کیسے سحر ہوئی
کبھی اک چراغ بجھا دیا، کبھی اک چراغ جلا دیا

شمع بھی، اُجالا بھی، میں ہی اپنی محفل کا
میں ہی اپنی منزل کا راہبر بھی راہی بھی

۱۹۴۶ء یہ ذرا دور پہ منزل یہ اُجالا یہ سکوں
خواب کو دیکھ، خواب کی تعبیر نہ دیکھ

دیکھ زنداں سے پرے، رنگِ چمن جوشِ بہار
رقص کرنا ہے تو پاؤں کی زنجیر نہ دیکھ

ہزاروں ماہتاب آئے، ہزاروں آفتاب آئے
مگر ہم ہم! وہی ہے ظلمتِ خانہ برسوں سے

وہی مجروح سمجھے سب جسے آوارۂ ظلمت
وہی ہے ایک شمعِ سرخ کا پروانہ برسوں سے

ہم تو پائے جاناں پر کر بھی آئے ایک سجدہ
سوچتی رہی برسوں کعبہ ہے کہ ایماں ہے

منتظر ہو کر غمِ حب سے گذرتا جا رہا ہوں میں
غمِ دوراں سلامت اب صدمہ تا جا رہا ہوں میں

۱۹۴۸ء تقدیر کا شکوہ بے معنی جینا ہی تجھے منظور نہیں
آپ اپنا مقدر بن نہ سکے اتنا تو کوئی مجبور نہیں

سنتے ہیں کہ کانٹے سے گل تک ہیں راہ میں لاکھوں ویرانے
کہتا ہے مگر یہ عزمِ جنوں صحرا سے گلستاں دور نہیں

جفا کے ذکر پہ تم کیوں سنبھل کے بیٹھ گئے
تمہاری بات نہیں بات ہے زمانے کی

میں اکیلا ہی چلا تھا جانبِ منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

۱۹۴۹ء وہ جس کے گدازِ محنت سے پُر نور شبستاں ہے تیرا
اے شوخ اسی بازو پہ تری زلفوں کو پریشاں ہونا تھا

آیا ہے ہمارے ملک میں بھی ایک دورِ زلیخائی سمجھو
اب وہ غمِ زنداں دیتے ہیں جن کو غمِ زنداں ہونا تھا

اب کھل کے کہوں گا ہر غمِ دل، مجروح نہیں وہ وقت کہ جب
اشکوں میں سنانا تھا مجھ کو آہوں میں غزل خواں ہونا تھا

ہاں کہ اک محنت کش، میں کہ "دشمنِ تیرگی"
صبحِ نو عبارت ہے میرے مسکرانے سے

زنجیر و دیوار ہی دیکھی تم نے تو مجروحؔ مگر ہم
کوچہ کوچہ دیکھ رہے ہیں عالمِ زنداں تم سے زیادہ

۱۹۴۹ء میں مزدوروں کا ایک جلسے میں مجروح نے اپنے
اپنے رنگ سے بالکل ہٹ کر "سو سنار کی ایک لوہار کی" کے
مصداق جب ایک نظم سنائی۔

امن کا جھنڈا اس دھرتی پر کس نے کہا لہرانے نہ پائے
یہ بھی کوئی ہٹلر کا ہے چیلا مار لے ساتھی جانے نہ پائے

تو مزدوروں نے تالیوں کی گونج میں اس کا خیر مقدم کیا۔ ادب
کے اکثر ٹھیکہ داروں نے اسے بہانہ بنا کر ترقی پسند ادیبوں اور
شاعروں کی خوب ہجو اڑائی کہ یہ نئے ادب کا نیا معیار تھا
اور مرار جی ڈیسائی نے جو بمبئی کے وزیرِ اعلیٰ تھے اس نظم پر
مجروح کو پکڑوا کر جیل میں ٹھونس دیا۔ مجروح کی اپنی ڈگر سے ہٹی
ہوئی سہی ایک نظم کے یہ تین ردِ عمل تھے۔ اور تینوں ہی ہمارے
سماج کے تین عناصر کی نمائندگی کر رہے تھے۔

"چکی کی مشقت" نے حسرت پہ جو رنگ چڑھایا ہوگا، وہی
"جیل" نے مجروح پر کیا ہوگا۔ چنانچہ جیل سے مجروح نے یہ شعر لکھ
بھیجے ؎ ۱۹۵۱ء

دستِ منعم مری محنت کا خریدار سہی

کوئی دن اور میں رسوا سرِ بازار سہی
پھر بھی کہلاؤں گا آوارۂ گیسوئے بہار
میں ترا دامِ خزاں، لاکھ گرفتار سہی
جست کرتا ہوں تو اڑ جاتی ہے منزل سے نظر
حائلِ راہ کوئی اور بھی دیوار سہی

سیرِ ساحل کر چکے اے موجِ دریا سر نہ مار
تجھ سے کیا بہلیں گے طوفانوں کے بہلائے ہوئے

ہو تیغِ اثر زنجیرِ قدم، پھر بھی ہیں نقیبِ منزل ہم
زخموں سے چراغِ راہ گذر بیٹھے ہیں جلائے زنداں میں

سر پہ ہوائے ظلم چلے سو جتن کے ساتھ
اپنی کلاہ کج ہے اسی بانکپن کے ساتھ

شبِ ظلم نرغۂ راہزن سے پکارتا ہے کوئی مجھے
میں فرازِ دار سے دیکھ لوں کہیں کاروانِ سحر نہ ہو

جنونِ دل نہ صرف اتنا کہ اک گل پیرہن تک ہے
قد و گیسو سے اپنا سلسلہ دار و رسن تک ہے

۱۹۵۲ء سے ہندوستان کے لیل و نہار کچھ بدلے بدلے سے ہیں۔ ہندوستان کا اپنا ایک آئین ہے۔ پارلیمنٹ ہے۔ چناؤ ہے، اب زندگی کی کشمکش کے تیور اور ہیں۔ مجروح نے شعر میں اس نئے پن اور اپنے نئے دور کی انفرادیت کو ڈھال لیا۔ ۱۹۵۴ء میں یوں کہتے ہیں ؎

ولے ملی تو ہے اک راہ کہیں سے آ کر
سوچتا ہوں یہ تری راہگذر ہے کہ نہیں
روئے مشرق کی قسم ہم کو ہے اتنا معلوم
شبِ دوراں ترے پہلو میں سحر ہے کہ نہیں
میں جو کہتا تھا سوا لے رہبرِ کوتاہ خرام
تیرا منزل بھی مری گردِ سفر ہے کہ نہیں

"کوتاہ خرام" ترکیب پر غور فرمائیے۔ اور لیجیے یہ "رہبر" کی ۱۹۵۸ء [illegible]

خدا کرے کہ غمِ گیتی کا پیچ و تاب اے دوست
کچھ اور بھی تری زلفوں کو تابدار کرے

اہلِ طوفان آؤ، دل والوں کا افسانہ کہیں
موج کو گیسو، بھنور کو چشمِ جانانہ کہیں
یارِ نکتہ داں کدھر ہے پھر چلیں اس کے حضور
زندگی کو دل کہیں دل کو نذرانہ کہیں
بارۂ دل ہے وطن کی سرزمیں مشکل یہ ہے
شہر کو ویراں کہیں یا دل کو ویرانہ کہیں

۱۹۵۹ء کے آتے آتے مجروح یوں کہتے ہیں ؎

کھلے جو ہم تو کسی شوخ کی نظر میں کھلے
رہے گرہ تو کسی زلف کی شکن میں رہے

اور اب مجروح کی غزل آپ سے یوں مخاطب ہوتی ہے ؎

بچاتے پھرتے آخر کب تلک دستِ عزیزاں سے
اسی کو سوچ کے ہم تو کلاہ و نام و ننگ آئے

اکتا کے ہم نے توڑ دی تھی زنجیرِ نام و ننگ
اب تک فضا میں ہے وہی جھنکار دیکھیے
برقِ تپیدہ، بادِ صبا خستہ اور ہم
ہیں کیسے کیسے اس کے گرفتار دیکھیے

اس [illegible] وہ سنگ کے [illegible] کہا نہ جائے
جب تک کسی ثمر کو مرا دل کہا نہ جائے
میرے ہی سنگ و خشت سے تعمیرِ بام و در
میرے ہی گھر کو شہر میں شامل کہا نہ جائے
جس ہاتھ میں ہے تیغِ جفا اس کا نام لو
مجروح سے تو سائے کو قاتل کہا نہ جائے

مجروح کے فنکار ہاتھوں میں غزل کی روایتی علامات اپنے نئے عصری مفہوم کے ساتھ ابھرتی ہیں اور جس مضمون کو بھی ہاتھ

صدا بہ صحرا

جنید حزیں لاری

اے ملکِ ادب کے شہزادو
شاعر ہیں یہاں کتنے ایسے
جن کو نہ کسی نے پہچانا
جن کا نہ کہیں پر نام چھپا
جو شعر و ادب کی دنیا سے
نزدیک بھی رہ کر دور رہے
کنکر کی طرح بے نور رہے!
جو داد و ستائش کی خاطر
آئے نہ کسی بھی محفل میں
جو سازِ شکستہ دل ہی نہیں
معروفِ نواسنجی بھی رہے
ہر حال میں خونِ دل سے جو
نغمات رقم کرتے ہی رہے
سپنوں کی مدھر مسکانوں سے
تزئینِ جہاں کرتے ہی رہے
فن کاروں میں نام نہیں،
شہرت کے حسیں ایوانوں میں
اس جنس کا کوئی دام نہیں!
شہروں شہروں، گاؤں گاؤں
گمنامی تاریکی کی
گلیوں میں رہتے آئے ہیں!
اُن کو نہ کسی نے پہچانا
اہلِ سخن میں گردانا
پھر بھی نہ انا ان کی جاگی
بے قدری کا بے مہری کا!
کنکر کی طرح بے نور ہیں وہ
شہرت کی طلب سے دور ہیں وہ!
اے شہرِ سخن کے دیدہ ورو!!

پانیوں کی تحریر

کلیم حاذق

دور حدِ نظر تک
سمندر کی یہ بیکراں وسعتیں
اس پہ سایہ فگن نیلگوں آسماں
درمیاں اک خلا
اور سمندر کی پھیلی ہوئی سطح پر
پانیوں پہ بنی ان لکیروں میں کیا ہے؟
یہ تحریر کیا ہے؟
عجب بے زباں لفظ، کشکولِ معنی میں جن کے لئے
آج کچھ بھی نہیں
ایسے لفظوں کی تاویل، تشکیل
سب خواب ہیں!
تہ کے اندر، چھپے قیمتی راز موجود ہیں
پانیوں کی یہ تحریر حدِ معنی سے مفقود ہیں
تا ابد میری آنکھوں کا مرکز، یہ تحریر شاید رہیں بھی
تحیر مری آنکھیں اترنے لگی ہیں تہوں میں
عجب ہچکچاہٹ سی ہے خانۂ دل میں
شاید
چمکتے ہوئے خشک ذرے، جو موجود ہیں
ان میں تاثیر ہے
بس یہی تا
کہ یہ بند شوکیس سے
تتلیوں کو کسی خواہشِ بے ریا کی طرح
کوئی منظر
حسیں، نرم سی کسمساہٹ
کوئی خواب دے جاتے ہیں
پر یہ تحریر کیا ہے
انوکھا معمہ
تجسس کی لہروں میں پلتا ہوا
پھیلتا کوئی نقطہ
کہ جس کی کوئی شکل بھی حافظے میں نہیں!!

آزادی

منصور اعجاز

پھر دریچے یاد کے وا ہو گئے
پھر فلک پر آ گیا تن کر ہلال
یہ شفق میں گھل گیا ہے کس کا خون
آسماں پر ہے یہ کیسا احترام
شور اٹھا ہے کہ پھر کل عید ہے
یاد کے ان وا دریچوں سے کرن
حوصلہ بن کر ابھر جاتی ہے پھر امید کی
ایک دن ایسا کبھی تو آئے گا
ظلم بھی اور جبر بھی شرمائے گا
خونِ مظلوموں کا بھی رنگ لائے گا
جب فلسطیں آسماں پہ چھائے گا
شور اٹھے گا کہ ہم آزاد ہیں

حفاظت

انور شمیم

کئی بار کانٹے
میرے پیروں تلے آئے
اور میرے تلووں کو
لہولہان کر گئے
ایک بار
کئی کانٹے
میرے پیروں تلے دب کر
ٹوٹ گئے

کیونکہ

اب میں
اپنے تلووں کی
حفاظت کے لئے
چمڑے کا جوتا
پہننے لگا ہوں۔ !!

تلاش

نینا جوگن

کچھ دھوپ کا کھٹکا نہیں
جب چھاؤں گھنی ہے
مگر ایسا نہیں ہے
رستہ ہے کٹھن
کوس کڑے
دھوپ کڑی ہے
جو نکھر نکھرا ہے پھول کی سی ہے
ناگ پھنی ہے
یہ چاہ کی ناگن کا ہے بس
جان نہ آنسو
ہاں اور سنا کچھ
وہ بُرا ہو کہ بھلا ہو
وہ بھی کوئی جینا ہے
دکھوں سے جو بھرا ہو

ایک نظم

اندھیرے گھر میں
چاندنی آتی نہیں
چال الگ، رستہ الگ
تری چوکھٹ سے اُٹھ کر
پھر کھڑے رہنا الگ
پلٹ سکتے تو کیوں رکتے
جو گھر ہوتا تو گھر جاتے
نہیں کی روک جو ہے
اِک ٹھکانہ !

ایک نظم

مشرف عالم ذوقی

روشنی سیل ہوس میں کیسے داخل ہوگئی
میرے جذبے کس طرح تطہیر بن کر سو گئے
ڈھونڈھ لی آنکھوں نے میری ایک پھر جنگِ عظیم
پھر لرزتے ہاتھ سے الفت کی تسبیحیں گریں
پھر خدا مسجد سے اور مندر سے غائب ہو گیا
پھر کلیساؤں نے وحشت کی ردائیں اوڑھ لیں
جب تلاش و جستجو کا خاتمہ ہونے لگا
آدمی تھا خود حصارِ تنگ نائی کا اسیر

اندھیروں کے قیدی

خورشید طلب

یہ کہنا کہ سورج طلوع ہو چکا ہے
سراسر غلط ہے
فریب نظر ہے
کہ ہم آج بھی ہیں
اندھیروں کے قیدی
سیاہی ہمارا لہو چاٹتی ہے
کہ ہم
خوف، تشکیک اور واہمے میں
ابھی تک گھرے ہیں
ہمیں از سرِ نو کسی غار میں قید کر کے
کسی نے صبح کا اعلان کر دیا ہے
مگر رات اب بھی ہمارے برابر کھڑی ہے
کہیں روشنی کی علامت نہیں ہے !!
یہ کہنا کہ سورج ....

غزلیں

ڈاکٹر تارا چرن رستوگی

جو اٹھی کیوں شکیبائی کیسے آواز دوں
بس صدائے بازگشت آئی کیسے آواز دوں

ندگی بھر جادہ و منزل سے وابستہ رہا
کب میرے لب پر صدا آئی کیسے آواز دوں

نالی یک کارواں ہونے کو ہو جاؤں مگر
کس سے ہے میری شناسائی کیسے آواز دوں

رچکا ہوں پیش اپنا نامہ اعمال بھی
جلد ہو اے کاش سنوائی کیسے آواز دوں

ے خیال دوست اس دنیا میں میرا کون ہے
اے انیسِ شامِ تنہائی کیسے آواز دوں

د لمحہ خوف سا طاری دلِ لرزاں پہ ہے
جو خبر آئی بری آئی کیسے آواز دوں

نقش سب آرزوئیں راکھ کا ایک ڈھیر تھیں
مجھ پہ کیوں ایسی گھڑی آئی کیسے آواز دوں

با بھٹک کر جادہ و منزل سے آ نکلا ہے جو
کس سے ہے میری شناسائی کیسے آواز دوں

توڑ بازوں سے کرنا دست گیری کی طلب
رائے نکلی خواب گیرائی کیسے آواز دوں

دی مجھ سے بھی کہے کچھ لن ترانی ہی سہی
ہے کہاں اب طور سینائی کیسے آواز دوں

کھ روکا روکنے والوں نے میں چلتا رہا
اور اب منزل قریب آئی کیسے آواز دوں

م د جادہ پر یقیں سے مل گئی منزل تو کیا
دل رہا پھر بھی تمنائی کیسے آواز دوں

نک شوئی ہر طرف پوچھے تو کوئی حالِ دل
ہر جگہ میری ہی پسپائی کیسے آواز دوں

تیاں سلجھا سکے جو بود کی نابود کی
ہے کہاں اب ابن سینائی کیسے آواز دوں

زی گفتار لاکھوں، غازی کردار کون
سامنے ہے سب کی دارائی کیسے آواز دوں

ہے کوئی جو ظلم و استبداد سے ہو پنجہ کش
ہے کسی میں اتنی دارائی کیسے آواز دوں

رز ہو تخلیق انسان خود خداوندِ جہاں
کون جانے کیا ہے سچائی کیسے آواز دوں

ایک پل اک جست ہی میں تھا خلاؤں کے بھی پار
قلبِ مضطر کی شکیبائی کیسے آواز دوں

دیدہ و دانستہ کبھی ایسی خطا مت کرنا
جلد بازی میں جفا کیسی، وفا مت کرنا

عزم محکم سے بدل سکتے ہو عالم کا نظام
اپنی قسمت کا، زمانے کا گلہ مت کرنا

عصر نو کیا ہے؟ ہے دولت زر و اشیا کا
ناسمجھ کیوں ہو، مقدر کا گلہ مت کرنا

رقبۂ معنیٔ الفاظ بڑھاؤ لیکن
معنی و لفظ سے بالجبر زنا مت کرنا

نظمِ فرسودہ کے چہرے نے الٹ دی ہے نقاب
لوگ کہتے ہیں نیا حشر بپا مت کرنا

دل نوازی، سخن نرم، نگاہِ الفت
ان نمازوں کو تو بھولے سے قضا مت کرنا

مشورے دیتے ہیں سجدوں میں گرو کچھ نہ کہو
ایسے لوگوں سے ڈرو خوفِ خدا مت کرنا

سر جھکانے سے تو بہتر ہے یہی سر نہ رہے
صورتِ حال سے سمجھوتا ذرا مت کرنا

دل کی آواز، ذرا غور سے سننا سیکھو
ملک سے، قوم سے اللہ سے دغا مت کرنا

بات تو سچ ہے یہی کہنے کو کچھ بھی کہہ لو
دورِ حاضر کا تقاضا ہے ونا مت کرنا

راز کی بات اشاروں میں کہی جاتی ہے
اس کو الفاظ کا ملبوس عطا مت کرنا

پہلے دنیا کو بدلنے کے تصور پہ چلو
دور ہو جادہ و منزل تو گلہ مت کرنا

دل میں ہو جوش تو منزل پہ پہنچ سکتے ہو
بات اوروں کی سنو ایسی خطا مت کرنا

غزلیں

جناب پرساد راہی

کشتیاں ڈوب رہی ہیں کوئی ساحل لاؤ
اپنی آنکھیں مری آنکھوں کے مقابل لاؤ

پھول کاغذ کے ہیں اب کانچ کے گلدانوں میں
تم بھی بازار سے پتھر کے عنادل لاؤ

بار احساس ہے منزل کی تہی دامانی
کوئی سایہ کوئی پیکر سر منزل لاؤ

مڑ کے دیکھو گے تو پتھر سے بدل جاؤ گے
اب تصور میں نہ بھولی ہوئی محفل لاؤ

ایک آواز ابھرتی ہے پس منظر خود
اے اجالو مری تصویر کا قاتل لاؤ

قصر مرمر میں سلگتی ہوئی روحوں کے لئے
آندھیو کچے مکانوں سے بوئے گل لاؤ

روشنی ہے مری ویران نگاہی کا سبب
اب نہ چہرہ کوئی سورج کے مماثل لاؤ

بر بطِ سکوت میں نغمگی عجیب تھی
قہقہوں کے شہر کی خامشی عجیب تھی

چور چور ہو گئے بے شمار آئینے
پتھروں سے پھوٹتی روشنی عجیب تھی

جیسے دھوپ کی تھکن جیسے سائے کی جلن
اس عظیم شخص کی زندگی عجیب تھی

سرورق پہ دائرے اس کے بعد کچھ کراس
آخری ورق سیہ ڈائری عجیب تھی

ظلمتوں کے گاؤں میں دیپ جھلملا اٹھے
روشنی کے سائے کی موت بھی عجیب تھی

اس کے ہر سوال کے سو جواب تھے مگر
مجرمانِ وقت کی خامشی عجیب تھی

زر نگار آسماں ڈوبتے چلے گئے
مفلسی کے دشت میں تیرگی عجیب تھی

غزل

صلاح الدین صلاح

ہر چند کہ اپنا کوئی غم خوار نہیں ہے
ل ہے کہ کسی طور بھی بیزار نہیں ہے
یا عشق ہمارا ہی سزاوار نہیں ہے
یا غم سے ہی مانوس وہ دلدار نہیں ہے
قرار نہیں ہے، نہ ہوا انکار بھی کب ہے
س بت کو تو جیسے لبِ اظہار نہیں ہے
شاید ترا احساس بھی دم توڑ رہا ہے
پہلی سی وہ آواز، وہ جھنکار نہیں ہے
کیا کیا نہ ستم ڈھائیگا ظالم مرے دل پر
جو ہاتھ میں اس کے کوئی تلوار نہیں ہے
صحرائے جنوں خیز میں مانند ہوا ہوں
ٹکراؤں کہاں سر بھی کہ دیوار نہیں ہے
پامالیٔ انصاف کا چرچا تو بہت ہے
دیوانہ مگر کوئی سر دار نہیں ہے
ل اپنا بھی کیا دل ہی پکارے ہے تو سب کو
لیکن کسی احسان کا طلبگار نہیں ہے
بولئے انصاف کی خاطر بھی کبھی تو
کہئے کہ اب طاقتِ گفتار نہیں ہے
راہی میں رہیگا کہیں چل کے صلاح اب
وہ جنسِ گراں جب سرِ بازار نہیں ہے

غزل

ولی رضوی

وقت سے پہلے بڑے ہم ہو گئے
جتنے قد آور تھے سب خم ہو گئے

زخم کا احساس اب باقی نہیں
آپ کے پتھر ہی مرہم ہو گئے

صبح دم اے شمع تیرے ساتھ ہی
تیرے پروانے بھی بیدم ہو گئے

دیکھ کر رنگِ مزاجِ بندگی
خواجگی کے نقش مدھم ہو گئے

اپنے حصے کی نہیں اِک بوند بھی
سارے ساغر، ساغرِ جم ہو گئے

آپ نے پوچھا تھا کب دل کا مزاج
کیا کہا میں نے کہ برہم ہو گئے

ہم ترا مفہوم سمجھیں کس طرح
اب تو سارے لفظ مبہم ہو گئے

جو تھے جبرِ قیصریت سے نگوں

غزل

مشتاق جاوید

ڈوبتے سورج کے تیور دیکھنا
شام جب ہوگی تو منظر دیکھنا
اپنا سر بھی خون میں تر دیکھنا
میرے ہاتھوں میں بھی پتھر دیکھنا
پھر یزیدی فوج آئی شہر میں
کوچہ کوچہ نیزوں پہ سر دیکھنا
اوڑھ کر شاداب موسم کی ردا
زرد لمحوں کا مقدر دیکھنا
شاخ پر جس وقت پک جائیں گے پھل
کس قدر آئیں گے پتھر دیکھنا
ایک دن بے چہرگی کے دشت میں
ہر طرف چہروں کا لشکر دیکھنا
لڑکھڑائے جب قدم احساس کا
میرا چہرہ کینوس پر دیکھنا
شوخ تتلی چند لمحے بعد ہی
میرے پاس آئے گی اڑ کر دیکھنا
کہہ رہی ہیں موج کی خاموشیاں
وقت پر تم میرا تیور دیکھنا
جب نیا چہرہ نگاہوں میں سمائے
عہدِ ماضی کا کلنڈر دیکھنا

غزلیں

عاصم شہناز شبلی

فردِ گلشن ہی نہ بے برگ و ثمر لگتا ہے
کھو کھلا پھر بھی محبت کا شجر لگتا ہے
جس جگہ جاؤں یہ دیکھوں ہیں لہو کی چھینٹیں
شہر کے شہر کہ فتنوں کا نگر لگتا ہے
میں نے احباب کی دیکھی ہے کچھ ایسی صورت
مجھ کو احساسِ رفاقت سے بھی ڈر لگتا ہے
ساتھ دیتا نظر آتا نہیں میرا کوئی
یوں تو ہر شخص یہاں میرِ سفر لگتا ہے
دے اسی ہاتھ میں گلشن کے تحفظ کی عناں
آج گل چینی میں جو پختہ ہنر لگتا ہے
خانۂ زیست کو کیا مجھ سے یہ پوچھو عاصم
میرا یا کسی مفلس کا یہ گھر لگتا ہے

عقیل گیاوی

جس جگہ پر جو وہیں ٹھہرا ہوا رہ جائیگا
نارسائی کا نقطہ اک دائرہ رہ جائیگا
جگنوؤں سی خواہشوں کا بوجھ پلکوں پر لئے
چڑھتے سورج کا تماشا دیکھتا رہ جائیگا
رفتہ رفتہ دھند میں کھو جائینگے چہرے سبھی
ٹوٹتے رشتوں کا روشن سلسلہ رہ جائیگا
کشتیاں ہو جائینگی غرقاب بحرِ یاس میں
ساحلی مٹی سے چسپاں آسرا رہ جائیگا
دیکھنے آئیگا وہ اپنے گاؤں جب بھی لوٹ کر
رشتۂ خوں کی علامت ڈھونڈتا رہ جائیگا
آسماں سے جب ہلاکت خیز اترے گی بلا
تیرے اندر کا درندہ چیختا رہ جائیگا

رضا چکدیبوی

کیا تم موجوں کے سنگ نہ بہیو
ریت کے ساتھ ہی سنیٹھے رہیو

پھول چڑھیں گے نیلامی
جا کے صبا سے چپکے کہیو

زلفیں کھولے رات کھڑی ہے
بستر پر چپ سادھے رہیو

ساحل دور اور کشتی شکستہ
دل کی موجو! دھیرے بہیو

نیلی دھوپ سے گلیوں گلیوں
حجرے میں تم دبکے رہیو

ساتھ مرا تم دوگے کہاں تک
ریل کے ناچے گاتے پہیو

دھوپ ہے سر پہ سخت رضا جی
دکھ سائے کا کیوں کر سہیو

رضا چکدیبوی

چرچا ہے میرا سارے نگر میں
گو اجنبی ہوں اپنے ہی گھر میں
پیڑوں تلے کچھ درماندہ راہی
بیٹھے ہیں فکرِ برگ و ثمر میں
جنت کے والی ابنائے آدم
مارے گئے ہیں اس بحر و بر میں
صحرا بھی جن کے دو گام بھر تھا
کھو گئے وہ دیوار و در میں
جوگی کو جانے کیا ہو گیا ہے
در در پھرے ہے سارے نگر میں
غازہ ہوئی ہیں اس کے رخوں کا
جو سرخیاں تھیں خونِ جگر میں
مجھ کو رضا تم مانو نہ مانو
میں معتبر ہوں اپنی نظر میں

نسی رام نگری

افسانہ

ظلمتِ شب جہاں جہاں

جمنا کو شہر میں آئے ہوئے ایک ہفتہ سے زیادہ ہو گیا
گاؤں چھوڑنے کے بعد اسے امید تھی کہ وہ زیادہ
اداد اور سکھی زندگی گزار سکے گی۔ آمدنی کی لالچ بھی اسے
ن کے دھوئیں بھرے ماحول میں کھینچ لائی۔

جمنا جوان تھی۔ اُسے ایک لڑکا تھا۔ عمر دو
ال ہو گی۔ جمنا نے اُس کا نام دینو رکھا تھا۔ اس کے
شوہر سے اُس کا اب کوئی تعلق نہ تھا۔ دینو جب
ا نہیں ہوا تھا، جب ہی اُس کا شوہر اُسے چھوڑ کر
گیا ——— جمنا نے دو سال تک اُس کے لوٹ
ے کی راہ دیکھی۔ اُسے مایوس ہو کر دوسرا راستہ
تیار کرنا پڑا۔

شہر سے دور، مزدوروں کی ایک بستی میں چھوٹی
ایک کوٹھری کرائے پر لے کر جمنا رہنے لگی۔ اُس نے
ے مل میں نوکری بھی کر لی۔ مل کے منچلے لوگ اُس کی
دگی کا فائدہ اٹھانے لگے ——— اُس سے
ر چھاڑ کرتے۔ مل مالکوں کے ایجنٹ جن کا کام صرف
ہتا، وہ اچھی اور خوبصورت عورتوں کو اُن کے لئے
ت وقت پر حاضر کرتے رہیں۔ جس سے ان کے سفید
ن پر کوئی داغ بھی نہ آئے اور ان کی ہوسناکی کی
س بھی بجھتی رہے ——— جمنا پر نگاہ گڑائے رہنے
یہ صورت حال کچھ دنوں چلی۔ ایک دن تنگ
جمنا کو مل چھوڑ دینی پڑی۔

اب وہ بابو لوگوں کے ہاں برتن مانجھنے کا کام
کرتی۔ پانچ گھروں کا کام اُس نے سنبھال رکھا تھا۔
مہینہ کے قریب پچیس روپئے مل جاتے۔ وہ اپنی اِس
زندگی سے مطمئن نہیں تھی۔ پھر بھی مایوس نہیں تھی——!

ایک دن اس کے پڑوس کے ایک چپراسی گدری
سے اُس کی جان پہچان ہو گئی۔ گدری کی عمر کوئی تیس
سال ہو گی۔ وہ بالکل دیہاتی تھا۔ اُس کے مقابلے میں
جمنا کہیں زیادہ تیز اور ہوشیار تھی۔ ایک میلی قمیض اور
رالوں سے بھیگی ہوئی اونچی دھوتی پہنے، ننگے پیر اور ننگے
سر دن میں دو تین بار وہ جمنا سے ضرور ملنے آتا——!

موسم دلوانہ ساز ہو رہا تھا۔ جذبات انگیز
برساتی ہوائیں۔ جمنا کے لہنگے اور اوڑھنی کو اڑا دینے کی
کوشش کر رہی تھیں۔ جمنا اپنے کام پر گئی ———
ہوا کی ٹھنڈک جسم کو چنچل اور دل کو جذباتی بنا رہی تھی۔
شام کے وقت کالے کالے بادل چھا رہے تھے۔ اس رنگین
فضا میں جمنا کی آنکھوں میں بھی ایک عجیب سا خمار
تھا——!

آج رمیش بابو کے گھر سے کام کرنے کے بعد جب جمنا
لوٹی تو پانی برسنے لگا ——— اور وہ بالکل بھیگ گئی۔
وہ بھیگنے سے بچ بھی سکتی تھی۔ لیکن آج اسے بارش
کے پانی میں نہانے سے ناقابلِ بیان لطف آ رہا تھا
جوان جمنا کا بھیگا ہوا سڈول جسم گدری چپ
چاپ کیسے دیکھ سکتا تھا۔ جب وہ گھر کے احاطے میں
پہنچی تو اُس نے جمنا سے کہا ———

"کتنی سندر لگتی ہے تو جمنا!"

جمنا لجاتی ہوئی کمرے میں گھسنے لگی۔ گوری نے روک کر کہا ——

"جمنا! میرا تو اکیلے جی نہیں لگتا۔"

"تو میں کیا کروں؟"

"کام پر تجھے بھی لے جایا کر۔ بوجھ ڈھونا میرے لئے مشکل ہے!"

"مرد ہو کر بوجھ نہیں ڈھو سکتے؟"

"تو میرے ساتھ چلا کر تو دن میں پانچ پانچ پھیری کر کے دکھا دوں۔"

"میرے جانے سے کیا جادو ہو جائے گا؟"

"ہاں!"

"سچ!"

"سچ!"

"تجھ سے بوجھ نہ اُٹھ سکے گا۔ چل میرے ساتھ برتن مانجتے ہی چلا کر۔"

"لیکن ...... !"

"کیا لیکن؟"

گوری ایک دم کچھ خیال میں ڈوب گیا۔ وہ سوچنے لگا —— تمنا سے بیاہ ......

احاطے میں رہنے والی دوسری عورتیں منہ جوڑ کر جمنا کی برائی کیا کرتیں۔ گوری کا آنا اُنہیں بہت کھٹکتا تھا۔ اب تو گوری کو آتے دیکھ کر ہنسی اور طنز میں کہنے لگی تھیں۔

"بیاہ کیوں نہیں کر لیتی۔ جمنا! دیکھ ...."

اور ایک دن —— جمنا نے گوری سے بیاہ کر لیا آرام سے رہنے لگی۔ لیکن گوری دن بدن آلسی ہوتا گیا۔ اب اس کی خواہش جمنا کے ساتھ کام کرنے کی بھی نہ ہوتی۔ اکیلی جمنا کو گھر اور باہر کا سارا کام کرنا پڑتا۔ ایک دن جمنا نے گوری سے کہا ——

"تو مل میں نوکری کر لے!"

"مل میں نوکری کون دیتا ہے؟ روز نوکری نوکری ......"

"مل جائے گی۔ چل میرے ساتھ۔"

"تو بڑی لاٹ صاحب ہے نا۔"

"اور نہیں تو کیا۔ سچ ہے۔ پہلے تو میں مل میں نوکری کرتی تھی۔"

"اچھا تو کل چل۔"

سویرا ہوا۔ لوگ اپنے اپنے کام پر جانے —— مل کی چمنی پاس آتی جا رہی تھی۔ گوری کے دل کی دھڑکن بڑھتی جا رہی تھی۔ دل کی دھڑکن بڑھنے کے ساتھ مل کی چمنی کا دھواں بھی گاڑھا ہوتا جا رہا تھا۔ دو مل کے پھاٹک میں گھس گئے۔ کوئی ایک گھنٹے بعد وہ خوش خوش مل کے باہر آئے۔ جمنا اپنی کامیابی پر بے حد خوش تھی۔ گوری نے کہا ——

"تجھ میں کچھ ایسا جادو ہے۔ ! نہیں تو کیا ملتی!"

"چل ہٹ!"

اور پھر دونوں چپ چاپ تیزی سے ... کی طرف بڑھنے لگے۔ گوری نے پھر سکوت توڑا ——

"تو بھی کیوں نہیں پھر مل میں کام کر لیتی۔ وہ بابو تو تجھے جگہ دیتا تھا۔"

"مجھے نہیں کرنی ہے۔"

"کیوں؟ دیکھ خوب روپے ملیں گے چین سے زندگی کٹے گی!"

جمنا سوچنے لگی۔ گھر آ گیا۔ دینو پڑوس میں کھیل رہا تھا۔ دوڑ کر ماں کے پاس آ گیا۔ جمنا نے اُسے گود میں لے لیا۔

——— گوری اب بہت ہوشیار ہو گیا تھا۔ قریب روز سینما دیکھنے جاتا۔ وہ شراب پینے کے ساتھ جوا بھی کھیلنے کا عادی ہو گیا تھا۔ اس طرح وہ اپنی تنخواہ شراب اور جوئے میں اڑا دیتا۔ جمنا کو اب وہ بری بری گالیاں بھی دیتا۔ اکثر لڑائیاں ہوا کرتیں۔ جمنا کے جسم پر مار کے نشان دکھائی پڑتے تھے۔!

ہر روز پیسوں کے لئے جھگڑا ہوتا۔ جمنا نے جو تھوڑے سے روپئے اکٹھے کئے تھے، وہ سب جوئے میں خرچ ہو گئے۔ بہت مشکل سے ایک دو گہنے جمنا اپنے جسم پر چھپائے ہوئے تھی۔ ان پر بھی گوری کی آنکھیں گڑی رہتیں ——— !

مل کے چرن داس نے ایک دن موقعہ پا کر گوری سے کہا ———

"بول ...."

"حضور!"

"ہاں، بس ایک رات ....!

دس روپئے!!"

"ہاں!"

"اچھا!"

سودا ہو گیا ——— جمنا دھوکے سے لے جائی گئی۔ فضا میں اندھیری رات کی سیاہی گہری ہوتی جا رہی تھی۔ ان گنت جھلملاتے ہوئے تارے اس اندھیرے میں جیسے کھو جانا چاہتے ہوں۔ جمنا چرن داس کے ساتھ موٹر میں بے جان سی لیٹی ہوئی چلی جا رہی تھی۔ ہوا تند تھی ——— ہوا کے ساتھ زندگی کی ہر دھڑکن بند ہو جانا چاہتی تھی ——— اور گوری شراب میں دھت لڑکھڑاتے قدموں سے ہاتھ میں دس روپئے لئے بڑبڑاتا گھر لوٹ رہا تھا ——— !!

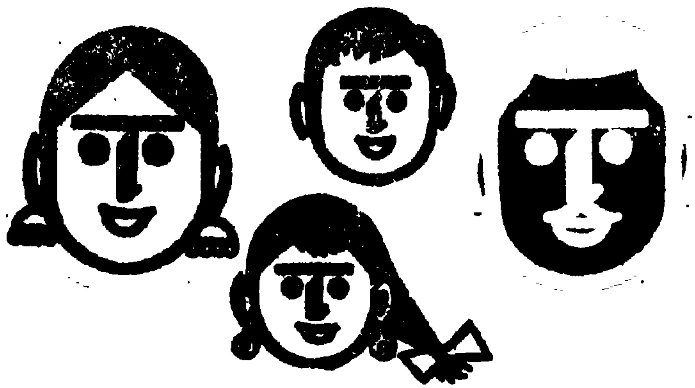
بقیہ: اردو غزل کا نشاۃ ثانیہ

دہر میں مجروحؔ کوئی جاوداں مضموں کہاں
میں جسے چھوتا گیا وہ جاوداں بنتا گیا

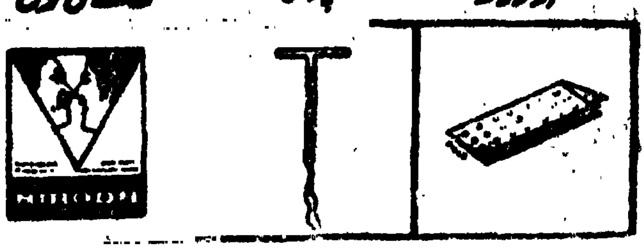
مجروحؔ روایت کے منکر نہیں لیکن روایت کے قیدی بھی نہیں۔ روایت کو عصریت بخش کر اس میں تازگی پیدا کرنا اور اس راستے روایتی علامتوں کو نئی زندگی اور نئی اظہاریت عطا کرنا۔ یہ مجروحؔ کا کارنامہ ہے

ہم روایت کے منکر نہیں لیکن مجروحؔ
سب کی اور سب سے جدا اپنی ڈگر ہے کہ نہیں

دو بچوں کے درمیان
تین سال کا وقفہ رکھیئے



کھانے کی گولی   کاپر ٹی   نرودھ



کوئی بھی طریقہ اپنائیے

davp 84/225

احمد رشید (علیگ)
سرائے رحمن - علی گڑھ

دیر کردی

سخت سردی پڑنے کی وجہ سے علی گڑھ جنکشن سکڑ رہا تھا۔ چند آدمی اِدھر اُدھر گھومتے نظر آ رہے تھے جن کے ہاتھوں میں وہ سوٹ کیس وزنی دکھائی دے رہے۔ لوہے کی راڈ میں لگی ہوئی بلب کی مدھم روشنی سیمنٹ کے بنے ہوئے پلیٹ فارم پر ٹھٹھر رہی تھی۔ اس گنوار عورت کی طرح جو زمین پر لیٹے ہوئے ننگے بچے کو دودھ پلا رہی تھی جس کا لباس جگہ جگہ سے مسک رہا تھا جس میں سے اس کی بانہیں زرد ضیاء روشنی کی طرح چمک رہی تھیں۔ قریب ہی بینچ پر ایک معمولی سی صورت کی عورت اور کوٹ میں ملبوس بار بار اپنی گھڑی کو دیکھتی اور سیدھے ہاتھ کی پشت پر اپنی ٹھوڑی ٹیکے اس طرح بیٹھ جاتی جیسے اس کے اوپر کوئی مرد سوار ہو سکے۔ انتظار میں وہ ایک ایک پل انگلی پر شمار کر رہی ہو ـــــ تھوڑی دیر میں ٹرین کے چنگھاڑنے کی آواز نے اسٹیشن کے سکوت میں ہلچل سی پیدا کر دی تھی اور وہی کتا پلیٹ فارم پر دوڑنے لگا جو کچھ دیر پہلے اپنی دم پچھلی دو ٹانگوں میں چپکائے اِدھر اُدھر گھوم رہا تھا ـــــ لوگوں کے اترنے اور چڑھنے کا عمل کچھ دیر جاری رہا اور خوانچہ والوں کی آوازیں بھی کمزور پڑنے لگیں۔ ایک بچہ کتابوں کے انبار میں دھنسا ہوا تھا جو شاید زندگی کا بوجھ بھی اٹھائے تھا...... (شاید زندگی کا بوجھ بہت ہلکا ہو گیا ہے) ـــــ میں نے اپنے پسندیدہ ناول نگار کا نیا ناول خرید لیا اور چرمی بیگ میں سے وہ زرد رنگ کی فائل نکال لی جس میں وہ سوالات تھے جو مجھے ملک کے نامور ادیب مسٹر رودی کمار سے پوچھنے تھے۔ چند لمحے بعد میں نے فائل اٹھا کر رکھ دی اور اس ناول کو پڑھنے میں محو ہو گیا ـــــ ٹرین چلتی رہی اور میں سفر کی کرامت، ناول کے ایک ایک لفظ میں ڈوبتا رہا اور ایک ایک لفظ میں ڈوبتا بھی رہا اور جب میں باہر نکلا تو گاڑی دھول پور اسٹیشن پر اپنے پیروں کو رگڑ رہی تھی ـــــ میں نے اپنا چرمی بیگ ہاتھ میں لیا اور اسٹیشن کی بھیڑ میں کھو گیا۔ گیٹ پر ایک منحنی سے قد کا ٹکٹ چیکر ایک گنوار آدمی سے جوجھ رہا تھا ـــــ میں نے گیٹ کو عبور کیا تو تھرڈ کلاس کے ویٹنگ روم میں بیٹھے ہوئے ان لوگوں پر نظر پڑی جن کی زندگی باجرہ کی روٹی کے مرکز پر رکھے ہوئے جھولوں پر رقص کرتی ہے، جن کو کھانے سے فرسٹ کلاس کے ویٹنگ میں صوفوں پر بیٹھنے والے کتوں کو بھی بار بار بیت الخلاء کا منہ دیکھنا پڑتا ہے ـــــ اف یہ کتے؟!..... یہ انسان ..... انسان ـــ فرسٹ کلاس..... سیکنڈ کلاس ..... تھرڈ کلاس ..... یہ تقسیم ..... تقسیم جو ٹکڑے ٹکڑے کرتی ہے انسانوں کو...
.....فطرت کو، ہنر سوز کو، فن کار کو اور دھرتی کو.....

اسٹیشن سے جب میں باہر نکلا اس وقت شام کے ۶ بج رہے تھے کچھ سردی بھی بڑھ گئی تھی۔ سامنے قطار میں ننی

ہوئی کچھ گندی سی دوکانیں نظر آئیں ـــــــــ میری نظر ہوٹل پر جم گئی جہاں ایک کوجر بستر سرخ مڑا سا باندھے بیٹھا تھا۔ میں نے چائے کی پیالی میں سردی انڈیلنا چاہی۔

"بابوجی کہاں کے رہنے والے ہوئی ہو۔"

میں نے کہا "یوپی کا" اور اس نے میرے اوپر معنی خیز نظر ڈالی اور بولا "یہاں کہاں آئی ہو"؟

"روی کمار کے یہاں جو ریلوے کالونی کے قریب رہتے ہیں؟"

"ہمارے بھوپی رہتے ہیں راجہ صاحب کی کوٹھی میں۔"

میں نے چائے کی چسکی لی۔ سامنے ایک بوڑھا کلہڑ میں چائے پی رہا تھا اور اس کی لاٹھی کرسی کے سہارے بیٹھی تھی "بابوجی تم اور یہاں نئے ہو۔"

"ہاں" میں سوچنے لگا میں بالکل نیا ہوں، مگر میری پہچان ہے اور یہ "پہچان" جو ۱۲ گھنٹے پہلے کہیں کھوئی ہوئی تھی شاید اس بھیڑ میں جہاں ایک ہی چھت کے نیچے رہنے والے باپ اور بیٹے بھی ایک دوسرے کے لئے اجنبی بنے رہتے ہیں۔

ـــــ آج مجھے اپنے وجود کی اہمیت کا احساس ہوا ہے جیسے کسی نے سمندر کی ایک بوند نکال کر بایر ٹیک دی جو سمندر کی وسیع و عریض اور ناقابل پیمائش گہرائی میں کھوئی ہوئی تھی ......

میں نے اپنا چرمی بیگ لیا اور ریلوے کالونی کو عبور کرتا ہوا اس سرخ عمارت پر میری نگاہیں جم گئیں جو راجاؤں اور نوابوں کی شوکت و حشمت کی تباہی پر خون کے آنسو رو رہی تھی اور ان مزدوروں کی محنت اور مشقت کو سرخ رو کر رہی تھی جن کے پسینے سے آج بھی وہ رنگین ہے۔ وہ چھوٹے چھوٹے جھونپڑوں کے درمیان تھی جس کے سامنے ایک پکی سڑک لیٹی تھی اور سیدھے ہاتھ پر ایک بڑا سا میدان تھی۔ چاروں طرف اندھیرے کے اوپر خاموشی کا سانپ بیٹھا تھا۔ میری دستک نے اس سانپ کو حرکت دی۔ سامنے ایک دروازہ پر ایک بوڑھا سا آدمی کرتے اور دھوتی میں ملبوس اپنی کمر پر ہاتھ رکھے مسکرا رہا تھا۔ "دیکھئے میں آپ ہی کا انتظار کر رہا تھا۔"

کمرے میں سامنے دیوار پر کلاک کا چھوٹا بازو سات کا ہندسہ اور بڑا بازو بارہ کا ہندسہ پکڑے لٹکا ہوا تھا۔

"دیکھئے آپ دو منٹ لیٹ ہیں۔"

"ساری سر"

"کہئے چائے پئیں گے یا ......"

"سردی پڑ رہی ہے" میں نے بات پوری کی۔

اور انھوں نے چائے لانے کو اپنے نوکر کو حکم دیا۔

"اچھا میرا خیال ہے اب مجھے نیا ہو جانا چاہیے۔"

"ارے بھائی آپ بھی تو ایک OUT OF DATE چیز کا انٹرویو لے رہے ہیں۔"

"دیکھئے حضور OUT OF DATE چیز تو نوادرات میں شامل ہوتی ہے۔"

"اچھا چلئے شروع ہو جائیے" مسکرا کر کہا

نے زرد فائل نکالی کمرے پر طائرانہ نظر ڈالی۔ سامنے شیلف میں کتابیں سلیقہ سے رکھی ہوئی تھیں اور ٹیگور کا پنسل یکیچ شیشے میں سے جھانک رہا تھا جو بائیں دیوار پر آویزاں تھا۔

"آپ تنہا رہتے ہیں؟"

"نہیں! میرے ساتھ میرا نوکر بھی رہتا ہے۔"

"میرا مطلب ہے آپ کا کوئی ...."

"میرا کوئی نہیں؟ آپ میرے نہیں؟ کیا یہ دنیا میری نہیں؟ جس کو میں ایک عاشق کی نظر سے دیکھتا ہوں" ہنسے جواب دیا۔

"اور کوئی عزیز"؟

"میرا عزیز میرا فن ہے۔ زندہ رہنے کے لئے کوئی نہ کوئی بہانہ چاہئے اور "لکھنا" ایک بہانہ نہیں اس نے ے جینے کا سلیقہ بھی عطا کیا ہے۔"

"میں سمجھا نہیں۔"

"آپ میری صورت دیکھ رہے ہیں جو میری زندگی کی طرح غیر جاذب نظر ہے۔ لیکن اب نہیں کیونکہ میں نے ھانکنے کے لئے اتنا بڑا خول چڑھا لیا ہے کہ اب مجھے میری بدصورتی اس احساس کے سمندر میں نہ تو دکھائی دیتی ہے اور نہ فو طہ زن ہے جیسا کہ پہلے کبھی ایک لکڑی کی طرح ہر وقت اوپر تیرتی ہوئی دکھائی دیتی تھی شاید اب تو کہیں دور قابل پیمائش میں ڈوب گئی ہے۔

"میرا سوال آپ کی زندگی ہی کے متعلق ہے اس پر ذرا اور روشنی ڈالئے۔"

"میں اگر پیدا نہ ہوا ہوتا تو شاید میری ماں زندہ رہتی لیکن ایسا نہ ہوا چونکہ میرے وجود کی اہمیت برقرار ھنے کے لئے قدرت نے شاید اس مساوات کو برقرار رکھا جس کی وہ قائل ہے اور وہ ننھی سی جان اس احساس میں ب گئی جس کے پیچھے اظہار سے کوئی ادب تخلیق ہوتا ہے۔ زندگی کے نشیب و فراز کی پیمائش کے لئے میرے ال نیتہ دیا جس کی گہرائی میں میری سوچ نے اور اضافہ کر دیا اسی لئے میں بچپن ہی میں یہ پہنتالیس سال کا ادھیڑ ھا ہو گیا حساب لگا لیجئے میں آپ سے زیادہ سے زیادہ پانچ سال بڑا ہونگا؟" ردی کمار نے مسکراتے ہوئے

"معمور بزرگی" کے لئے یہ پانچ سال بہت کم ہیں۔"

مسٹر ردی کمار نے ایک قہقہہ لگایا اور میں بھی ان کے اس قہقہہ میں شامل ہو گیا۔

"ادب میں آپ کس نظریہ کے قائل ہیں؟"

"ادیب ہمیشہ آزادی کا قائل رہا ہے' نظریہ کی غلامی بھی وہ قبول نہیں کرتا جس نے ایک ادیب کی انا ح ہو تفسیر ہو نکہ کچھ عرصہ کے بعد نظریہ ایک پروپیگنڈہ کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور ادیب کبھی ایک مبلغ نہیں سکتا میری نظر میں تخلیق اظہار میں کسی نہ کسی ..." [illegible]

غیر شعوری طور پر"

"کوئی ایسا حادثہ بتائیے جس کا آپ کی زندگی پر گہرا اثر ہو اور اس کا کیا ردّعمل ہوا۔ خاص طور سے میرا اشارہ؟

"کسی حسین حادثہ کی طرف ہے؟" روی کمار نے مسکراتے ہوئے کہا

"جی ہاں" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"میں "عورت" کو آدھی کائنات اور محبت کو پوری کائنات کہتا ہوں۔ چونکہ عورت خوبصورتی کی وہ اینٹ ہے جس کے بغیر کوئی عمارت مکمل نہیں ہوسکتی اور محبت اس عمارت میں روشنی کی ضامن ہے" یوں سمجھ لیجئے جنت جیسی حسین شئے میں جبکہ آدم علیہ السلام کا جی نہیں لگا تو حوا کو نہ صرف پیدا کیا گیا بلکہ دونوں کو محبت جیسے عظیم جذبہ سے والہانہ طور پر وابستہ کیا گیا ——— لیکن جہاں تک میری زندگی کا معاملہ ہے تو مجھے روٹی اور روزی کی فکر نے عورت کے بارے میں سوچنے کا موقع ہی نہیں دیا۔"

اچانک گھنٹہ نے دس بجائے اور میں چونک گیا۔ سوچنے لگا ہمارے انٹرویو کو پورے تین گھنٹہ ہوگئے مگر مسٹر روی کمار کے چہرے پر تھکن کے آثار قطعاً دکھائی نہیں دئے۔

چلتے وقت ایک آخری سوال اور پوچھنا چاہوں گا " آپ اپنے ہمعصر ادیبوں میں سب سے زیادہ کس سے متاثر ہوئے ہیں"۔

"چونکہ اس ملک میں مجھ سے بڑا کوئی ادیب نہیں اس لئے میں نے اپنے معاصرین کو پڑھنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ میں نے ہمیشہ بزرگوں کو پڑھا ہے اور ان ہی سے کچھ سیکھا بھی ہے۔"

"بے شک آپ چوٹی کے ادیب ہیں مگر مجھ کو یہ کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں" میں شاہد صاحب کے فن سے بہت متاثر ہوں۔ جن کو عورت کے جذبات کی عکاسی کرنے میں مہارت حاصل ہے میرے بیگ میں ان کا نیا ناول" شعلۂ احساس" بھی رکھا ہے میرا یقین ہے آپ بھی ان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکیں گے"۔

اس طرح انٹرویو ختم ہوا اور آخری علیک سلیک کے بعد میں نے چرمی بیگ لیا۔ اور مسٹر روی کمار مجھے دروازہ تک چھوڑنے آئے۔

مورخہ ۱۰ مارچ ۸۰ء

مکرمی شاہد صاحب سلام شوق

ابھی کچھ عرصہ پہلے رسالہ" حرف " کے اڈیٹر نے آپ کا نیا ناول " شعلۂ احساس" دیتے ہوئے کہا تھا" عورت کے جذبات کی عکاسی کرنے میں مہارت حاصل ہے" میں اس خیال کی تائید کرتا ہوں چونکہ اس سلسلے میں دو رائے نہیں ہو سکتی۔ مجھے آپ کی کتاب نے کافی متاثر کیا ہے اور یہی وجہ ہے میں نے آپ کی دیگر کتابیں بھی پڑھی ہیں یقیناً مجھے آپ کے فن کا قائل ہونا پڑا۔ میرا یقین ہے ملک کا کوئی ایسا ادیب ہو جس نے عورت کی فطرت کی اس قدر سچی عکاسی کی ہو۔ خاص طور" شریک حیات" پڑھنے کے بعد مجھے یہ احساس ہوا کہ عورت کا اس قدر سچا مرقع پیش کرنا

مرد کے بس کی بات نہیں ...... — آپ کا روی کمار

مورخہ ۲۵؍مارچ سنہ ۷۷ء

مکرمی روی کمار صاحب — سلام حسرت

جنوری کے "حرف" میں آپ کا انٹرویو بھی پڑھا ہے — اور ۲۲ مارچ کو آپ کا محبت نامہ بھی موصول ہوا ہے۔ یاد فرمائی کا شکریہ — آپ کی ذہانت اور ادب نوازی کی داد دینی پڑتی ہے ورنہ اس ملک میں مجھ کو سمجھنے والا ایک بھی "مرد" نہیں — نہ تو اس وقت مجھے کوئی سمجھ سکا جبکہ میں عورت تھی "صرف عورت" — چونکہ میں بدصورت تھی — اور اس احساس نے مجھے احساسِ کمتری میں مبتلا کر دیا جس نے مجھے مرد کا خول پہننے پر مجبور کر دیا — اور آج جبکہ مجھے پہچاننے والا کوئی مرد ملا ہے تو تم نے مجھے "مرد" اور "عورت" کے درمیان کی چیز بنا کر رکھ دیا ہے — م۔ م۔ تجھے ...... مجھے ...... افسوس ...... ہے ...... کہ ... آپ ... دیر سے ملے۔

آپ کی نسرین

افسانہ

تبسم فاطمہ
معرفت ڈاکٹر علی اکبر ملکی محلہ آرہ

حصارِ شب کا طلسم

اپنے پھٹے ہوئے بوسیدہ سے لباس میں۔ ایک ہاتھ میں چھڑی اور دوسرے ہاتھوں میں کاندھے پر لٹکتا ہوا تھیلا۔ اور انگلی کے پوروں سے کٹورا پکڑے ہوئے' ایک بوڑھا سامنے سلیٹی پتھروں سے تعمیر کردہ اسی عالیشان کوٹھی کو پھٹی پھٹی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی۔ دھندلی دھندلی یادوں کا کارواں آہستہ آہستہ اُس کی آنکھوں میں اترتا جا رہا تھا۔ بوڑھے کا ہاتھ پتھروں جیسا سخت تھا۔ ہونٹوں پر پپڑیاں جمی تھیں۔ روز و شب کا فیاز اسی کے چہرے پر صاف دکھائی دے رہا تھا۔ اچانک اُس کی مٹھیاں بھینچ گئیں اور نحیف جسم تند ہوا کے تھپیڑوں سے جیسے کانپ گیا ہو ......!

بوڑھے نے اپنا سر جھکا لیا ————

آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسوؤں کے کئی قطرے گرے اور بوڑھا بڑی بے چارگی سے انہیں پی گیا۔

وہ سب کچھ تو وہی تھا۔ وہی کوٹھی۔ وہی لال سلیٹی پتھر کی دیواروں سے کھیلتی ہوئی سبز بیلیں ..... مگر وقت کے ساتھ سب کچھ کتنا بدل گیا تھا ....

دھندلی دھندلی یادوں کے تعاقب میں نکل گیا بوڑھا۔ کل جہاں کاشی ولا تھا۔

آج وہاں مینشن ولا کا نام پتھروں پر کندہ تھا۔ کہنہ یادوں کی کتنی ہی کرچیاں آنکھوں میں چبھ گئیں۔

اب صدائے درِ لیلٰہ گریستے تو کون سنے ...... کہ کبھی یہ وہی کوٹھی تھی جہاں بچپن نے کبھی قہقہے لگائے تھے ...... ننھے ننھے قدم سارے گھر میں دوڑتے پھرتے تھے .. اور ایک چلبلا قہقہہ رہ رہ کر کوٹھی کے در و دیوار میں پیوست ہو جاتا کتنے فخر سے وہ دوستوں کو بلاتا۔ اپنے وسیع و عریض ڈرائنگ روم میں بیٹھا کر دیدی کی بنائی ہوئی تازہ پینٹنگس دکھاتا۔ پھر کوٹھی کے پیچھے کے اُس باغ میں لے جاتا جہاں ابّا حضور کی عقیدت کے مختلف پھول کھلکھلاتے ہوئے دکھائی دیتے رہتے ہوتے۔ ابّا حضور کو پھولوں سے کیسی رغبت تھی۔ یہ چھوٹی سی دنیا تب کتنی حسین تھی۔ جب آنکھوں میں قمقمے روشن تھے اور وہ اپنے دوستوں کو فخر سے دکھایا کرتا ..." کہ دیکھو ...... دیکھو یہ سن فلاور ہے ..... یہ سفید گلاب ہے ...... یہ سیٹ پلیس ..... اِسے ابّا حضور نے امریکہ سے منگوایا تھا۔ یہ شکاگو سے ...... یہ جاپان سے ...... اور یہ ......

گذرتے ہوئے وقت کی آندھی سب کچھ لے گئی۔ شب و روز کا عجیب سا طلسم ہے جہاں اپنا

ڈٹی ہوئی رانا کے زرد زرد پھول ہی باقی رہ گئے ہیں۔ کوٹھی سے متعلق کتنے ہی واقعات تھے جو آج بھی اُس کے دل میں تازہ تھے جنہیں وقت کا بڑا سے بڑا حادثہ بھی اُسے دل سے حذف نہیں کر پایا تھا۔

ایسے میں اُسے یاد آیا۔ اُس کے سامنے کوئی فقیر سفید پتھروں سے بنے اِسی چبوترے پر بیٹھ جاتا تھا۔ تو وہ بڑی حقارت بھری نظروں سے اُسے دیکھا کرتا تھا۔ پھر نوکروں سے کہتا۔ "اس بوڑھے کو فوراً یہاں سے بھگاؤ۔ جنم جنم کے بیمار لوگوں کو بیٹھنے کے لئے ایک ہی جگہ ملتی ہے۔ اس سے انفیکشن کا ڈر رہتا ہے ...."

اور یاد آیا ..... ایک بار تو اُس نے حد ہی کر دی تھی۔ اُس کی کار جیسے ہی کوٹھی کے پھاٹک میں داخل ہوئی۔ اُس نے دیکھا۔ ایک بوڑھا ..... ایک سات سالہ بچے کے ساتھ پھٹے ادھڑے گندے سے لباس میں سفید پتھروں سے بنے اِس چبوترے پر اطمینان سے بیٹھا ہوا تھا۔ کار جیسے ہی قریب آئی اندر ہوئی بدبو کے تیز جھونکے نے اس کا تعاقب کیا۔ اندر ذہن پر شعلہ کوندا۔

بوڑھا اُسے سامنے دیکھ کر خوف سے کانپ اٹھا تھا ..... "غلطی ہو گئی صاحب کئی دنوں کا بھوکا ہوں .... کچھ کھانے کو دیجئے .... بچہ بھی بھوکا ہے صاحب .... کچھ دیا ہو ...... اللہ تیرا بھلا کریگا ...."

غصے کی شدت سے اُس کی مٹھیاں بھینچ گئیں۔ بدبو کا تیز جھونکا اس کے نتھنوں میں سرایت کر گیا۔ دریوزہ گر بھی رحم کی آنکھوں سے اس کی عزت دیکھ رہا تھا۔ پھر ایک حقارت آمیز نگاہ اُس پر ڈالتے ہوئے وہ نوکروں سے مخاطب ہوا۔

"گیٹ کے اندر کس نے آنے دیا اس کو ..... فوراً باہر نکالو ... کتنی بدبو آرہی ہے اس کے جسم سے تمام جراثیم پھیلے گا .... انفیکشن ...."

اور اچانک اِس نے فقیر کو دیکھا جس کی آنکھوں میں شعلہ سا لپکا۔ پھر تیز چمک لہرائی .... ایسی چمک ..... جسے وہ کوئی نام نہ دے سکا۔ وہ اپنے سات سالہ بچے کو تھامے چبوترے سے اتر گیا تھا۔ لاغر ہاتھوں نے بچے کے سوکھے سکڑے ہاتھوں کو تھام لیا تھا ..... اور جیسے آنکھوں میں اُس سے سوال کر رہا تھا۔ "صاحب! کیا غریب انسان نہیں ہوتے؟ کیا انہیں دنیا میں جینے کا حق نہیں ..... صاحب ..... خدا تمہارا بھلا کرے۔ صا ..... حب ....!!"

اور دیکھتے دیکھتے وقت گذر گیا۔ سب کچھ بدل گیا۔ سب کچھ ختم ہو گیا .... داستان کے لہو لہو اوراق رہ گئے تھے ..... تنہائی کے دوران جس کی ورق گردانی کرتا۔ تغیرات کے کثیف لبادے نے زندگی کی تمام سچائیوں سے اُسے مکمل طور پر آگاہ کر دیا تھا۔ اور اب گذرے دنوں کی تلخ یادیں اُس کا جینا دوبھر کر دی تھیں ـــــــ اُس وقت وہ میٹرک میں تھا۔ ابا حضور کی اچانک موت نے سب کچھ ختم کر دیا۔ اور مرنے کے بعد معلوم ہوا۔ ابا حضور نے صدمے کی آغوش میں آنکھیں موند لی تھیں۔ وہ جوا میں سب کچھ ہار چکے تھے۔ یہ کوٹھی۔ بنگلہ ..... کار' سب کچھ ......

ابا حضور (

تیز چیخ نکل گئی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ مگر اب کون پوچھنے والا تھا۔ وقت کی ستم ظریفیوں نے سب کچھ لوٹ لیا تھا۔ اور دریوزہ گر کے فرسودہ کشکول میں فقط گذری یادوں کے زنگ لگے سکے رہ گئے تھے......!!
کوٹھی نیلام ہو گئی.......

اچانک کے صدمے نے کچھ سوچنے سمجھنے کے لائق نہیں رکھا۔

اور پھر وہی کشکول رہ گیا۔

اور ایک صدائے دریوزہ گر ———!

بوڑھے کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

عمارت سے نکل کر آتا ہوا ایک خوش پوش نوجوان اس کے پاس آکر ٹھہر گیا۔ اور جیسے عجیب نظروں سے اُسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔ بوڑھے کے جسم میں اچانک جیسے زلزلہ آ گیا...... وہ نوجوان کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کو دیکھ رہا تھا...... جیسے دھندلی دھندلی یادوں کے تعاقب میں اُس سات سالہ بچے کا عکس تلاش کر رہا ہو....

اور اچانک اسے ایک گمبھیر سی محبت میں ڈوبی ہوئی نوجوان کی آواز سنائی دی......

" بیٹھ جائیے بابا.... آرام سے بیٹھ جائیے...... میرا جبوترا آپ کے بیٹھنے سے گندہ نہیں ہوگا۔ کوئی جراثیم نہیں پھیلے گا...... نہیں پھیلے گا......"

بوڑھا گذری یادوں کے دفینے تلاشتا ہوا پھر کانپ گیا تھا۔ جیسے حصار شب کے طلسم نے اُسے قیدی بنا لیا ہو......!!

نئی کتابوں کا تعارف

ڈاکٹر علیم اللہ حالی
سید احمد قادری

نام کتاب	شبنم کی آہٹ
مصنف	اکبر حسین اکبر
صنف	شاعری
ضخامت	۱۱۲ ، قیمت ۱۵/=
پتہ	شبنم بک ڈپو ۳۹ اقبال پور لین خضر پور کلکتہ ۲۳ ۔

اکبر حسین کے کلام میں غزل ایک نئی کروٹ
تی ہوئی محسوس ہوتی ہے صنف غزل اپنی ہیئت اور
ئت کے لحاظ سے تغیرات کو قبول نہیں کر سکتی۔ مگر اپنے
ضوع، آہنگ، اشارات، و کنایات نیز الفاظ کی
نشست و برخاست کے اعتبار سے اس میں تنوع کی
پناہ گنجائش ہے یہی وجہ ہے کہ اس بندھی بندھائی
ضابطہ میں مقید صنف سخن میں بھی شعرائے کرام
نفرادی رنگ خصوصیات پیدا کر کے اپنی انفرادیت منوانے
کامیاب رہے ہیں۔ ولی، میر، غالب، آتش،
من، حسرت، اصغر، جگر، فانی، اور فراق کی انفرادی
یان کا انحصار لب و لہجہ کی انفرادیت پر ہے اس
سئلہ پر بہت تفصیل ملتی ہے کہ لب و لہجہ کی یہ انفرادیت
پیدا کرتی ہے۔ اس بحث میں فی الحال پڑنا نہیں

نہیں چاہتا۔ مختصر سی بات یہ ہے کہ یہ انفرادیت
الفاظ کو مخصوص و منفرد زاویے سے استعمال کرنے
اور انہیں اشارات و کنایات کی سطح پر لانے سے پیدا
ہوتی ہے یہ انفرادیت فنکار کے نجی احوال و کوائف سے
گہرا تعلق بھی رکھتی ہے۔

پیش نظر مجموعہ میں جو بات سب سے پہلے
ہمیں اپنی طرف متوجہ کرتی ہے وہ شاعر کا منفرد لب و لہجہ
ہے ـــــ اور جس شاعر کے یہاں اپنا منفرد و مخصوص
آہنگ ہو وہ آج نہیں تو کل ضرور ایک اہم مقام کا حامل
ہو جاتا ہے۔ شروع کتاب میں کلیم الدین شمس (ڈپٹی
اسپیکر مغربی بنگال اسمبلی) نے چند کلمات خیر لکھ کر اپنی
ادب دوستی اور شعر فہمی کا ثبوت دیا ہے۔ خواجہ
تسلیم اختر، فہمیدہ خاتون اور ابوذر ہاشمی کی تحریروں
نے ہمیں شاعر کے تخلیقی مزاج کو سمجھنے میں مدد دی ہے۔

اکبر حسین اکبر ابھرتے ہوئے نوجوان شاعر ہیں
انہیں ابھی بہت سی منزلیں طے کرنی ہیں جس طرح تخلیقی
جذبہ کو دبانا مشکل ہے۔ اسی طرح تخلیقی نگارشات
بھی پردہ گمنامی میں نہیں رہ سکتیں۔ اگر فنکار حصول
شہرت سے زیادہ پرورش لوح و قلم کی طرف متوجہ ہو

تو کامیابی کی منزلیں آسانی سے طے کر لیتا ہے اکبر حسین اکبر اپنے مندرجہ ذیل اشعار کی وجہ سے بآسانی پہچانے جا سکتے ہیں ؎

معلق یوں رہیں گے ہم فضا کے درمیاں کب تک
بناتے ہی رہو گے تم خلاؤں میں مکاں کب تک

چونک پڑتا ہوں میں اکثر راستہ چلتے ہوئے
ہر قدم پر جیسے کرتا ہو کوئی پیچھا مرا!

بے ظرف تو جلائے ہر گام پر چراغ
بھٹکی ہوئی ہواؤں کے تیور نہ دیکھئے

مری وفا پر تمہاری تشکیک یوں لگے گی
جمی رہے مذہبی کتابوں پہ دھول جیسے

جب ہو گا تو ٹوٹ جائے گا!
آئینہ کبھی تو ہو نہیں سکتا:

پیاس کی شدت میں اتری تھی نیند ہماری پلکوں پر
پھر جس نے چونکایا ہم کو وہ شبنم کی آہٹ تھی

شبنم کی آہٹ، نرم، شیریں، اور خوشگوار غزلوں کا ایک تازہ کار گلدستہ ہے۔

مبصر ڈاکٹر علیم اللہ حالی

نام کتاب پنجرے کے پنچھی
افسانہ نگار مانک ٹالہ
صفحات ۲۴۸ قیمت ۴۵/۰
ناشر موڈرن پبلشنگ ہاؤس ۹ گولا مارکیٹ دریا گنج دہلی ۲

زیر تبصرہ کتاب "پنجرے کے پنچھی" مشہور افسانہ نگار مانک ٹالہ کا تیسرا افسانوی مجموعہ ہے اس سے قبل ان کے دو افسانوی مجموعے "پیاسی جھیل" (۱۹۶۳ء) "گناہ کا رشتہ" (۱۹۷۴ء) میں منظر عام پر آکر نا قدین نظر میں مقبول عام ہو چکے ہیں

عرض حال میں مانک ٹالہ نے لکھا ہے:

"ان میں آٹھ کہانیاں، آٹھ مزاحیاں مضامین اور دو خاکے ہیں"

پھر ایک جگہ لکھتے ہیں:

"پہلے میں نے سوچا تھا کہ اس مجموعہ میں مزاحیوں اور افسانوں کی ترتیب الگ الگ رکھوں۔ لیکن کچھ کہانیاں نیم مزاحیہ تھے اور کچھ کہانیاں پوری کی پوری طنز و مزاح سے بھرپور تھیں چنانچہ میں نے انہیں علٰحدہ کرنا مناسب نہیں سمجھا البتہ دو تین خاکے آخر میں دے دیئے ہیں"

مانک ٹالہ کی اس بات سے میں اتفاق نہیں کرتا کہ کہیں نیم مزاحیہ یا مزاحیہ نما کہانی میں کوئی مماثلت یا ربط ہے۔ دوسری بات یہ کہ مانک ٹالہ نے مجموعے کے شامل آخری دو مضامین کو "خاکے" کا نام دیا ہے جبکہ حقیقۃً

یہ ہے کہ یہ دونوں آخری تاثراتی مضامین ہیں نہ کہ خاکے ۔ پہلا کالی داس گپتا رضا سے متعلق اور دوسرا خود اپنے بارے میں لکھا ہے ۔

اب ان تمام افسانوں مزاحیہ مضامین اور تاثراتی مضامین کے مطالعے سے جو بات سامنے آتی ہے وہ ہے مانک ٹالہ کا مزاح ۔ لطیف مزاح پیدا کرنا بھی ایک اہم صفت ہے ۔ جس میں مانک ٹالہ بے حد کامیاب ہیں نوکیلی شگفتگی تازگی اور ندرت کا خوب صورت امتزاج مانک ٹالہ کے فکر و خیال کو معتبر اور منفرد بناتا ہے مزاح کے ساتھ ساتھ طنز بھی بڑے فنکارانہ طور پر موجود ہے

" لیکن جب اردو ادب کے بڑے
بڑے دانشوروں نے پے در پے
اپنے غیر ملکی دوروں کے طویل و عریض
سفرنامے لکھ لکھ کر کاغذ کا بھاؤ اور
کا بخرا بڑھا دیا تو ہم بھی خواب خرگوش
سے جاگے اور میدان ادب میں اپنی گرتی
ہوئی ساکھ کو سہارا دینے کے لئے
ایک سفرنامہ لکھنے کی خاطر ایک اور
غیر ملکی سفر کے لئے پا بہ رکاب اور پا در
رکاب ہونے کے لئے رخت سفر باندھنے
کے اسباب جٹانے لگے ۔"

مانک ٹالہ نے ادب اور زندگی کے بدلتے ہوئے منظر کو بہتر طور پر سمجھا ہے ۔ حیات و کائنات کے اسرار و رموز کا گہرا مطالعہ و مشاہدہ کیا ہے ۔ اور اپنے تجربات احساسات و جذبات کو افسانوں میں بڑی کامیابی اور خوبصورتی سے پیش کیا ہے ۔

" پنجرے کے پنچھی " میں شامل افسانوں کے مطالعہ سے اس بات کا بھی بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ مانک ٹالہ کے افسانے کا فن اور تکنیک پہ گرفت بے حد مضبوط ہے ۔ اور وہ زندگی کے مسائل خاص طور پہ عصری کش مکش ، محرومی ، بے بسی بے کیفی اور بے چہرگی پر گہری نگاہ رکھتے ہیں اور انہیں اپنے افسانوں میں شاندار طریقے سے پیش کرتے ہیں ۔

مانک ٹالہ کا اسلوب بڑا پیارا ہے اور اپنے فکر و فن کو زبان و بیان کی سادگی اور تازگی کے ساتھ پیش کر کے قاری کے دل کی گہرائیوں میں اتر جاتے ہیں ۔ اور یہ خصوصیات ایسی ہیں جو بجا طور پر مانک ٹالہ کو اپنے ہم عصر افسانہ نگاروں میں انفرادیت بخشتی ہیں ۔ مانک ٹالہ کے کئی ایسے افسانے ہیں جو اردو افسانے میں قابل قدر افسانہ کی حیثیت رکھتے ہیں ۔

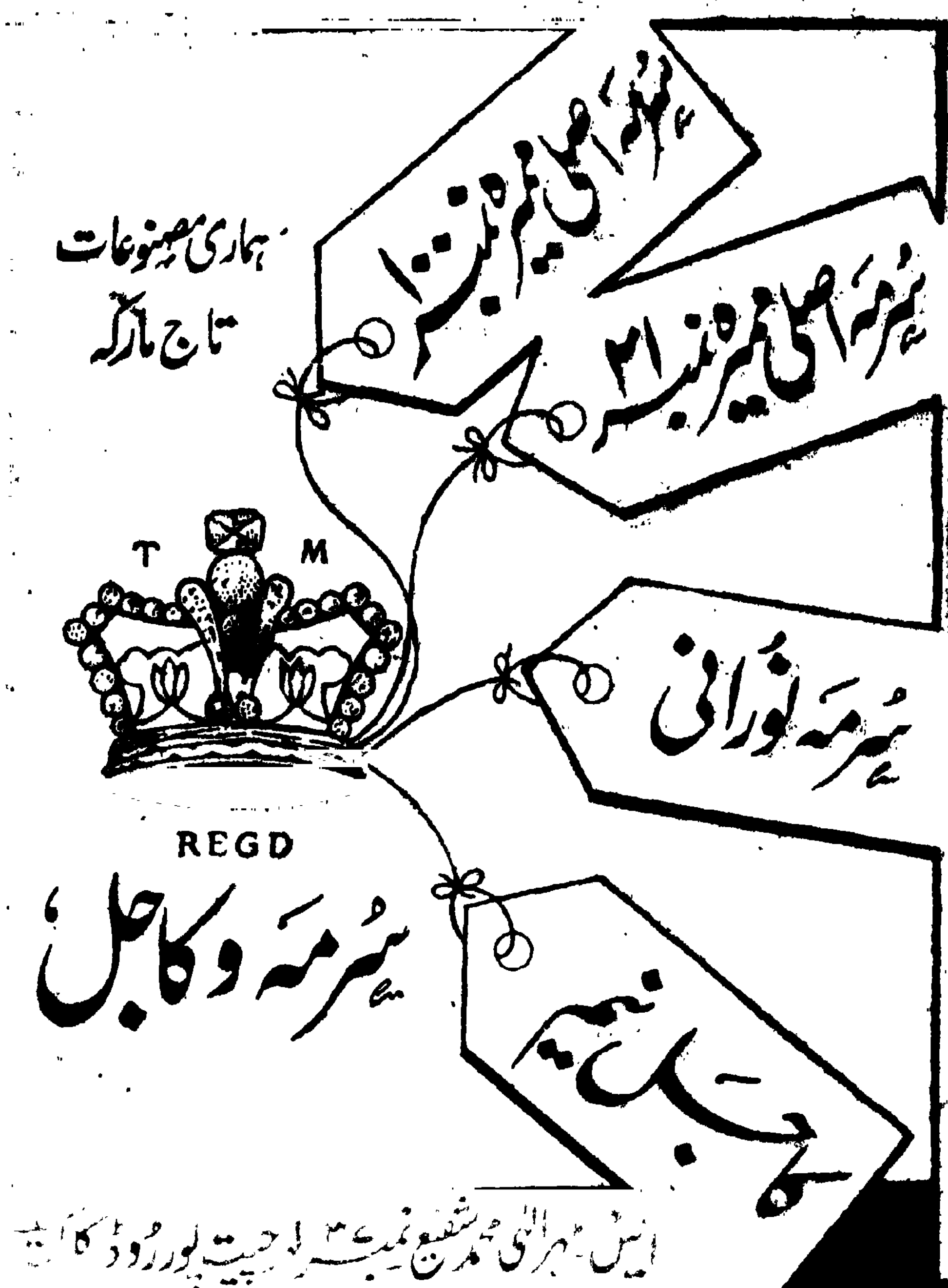
مجموعہ کی کتابت ، طباعت مناسب ہے سرورق سادہ لیکن دیدہ زیب ہے ●

مبصر ——— سید احمد قادری

شہر خیال

کی کہانی بیوی کا سایہ اچھی کہانی ہے لیکن ذکیہ صدیقی کی کہانی "پناہ گاہ" بہت ہی ہلکی پھلکی کہانی ہے ۔ کہانیوں کی تعداد اور معیار بڑھانے کی ضرورت ہے مظفر حسین برنی صاحب کی کتاب " اقبال اور عہد گاندھی جی " پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر علیم اللہ حالی نے انصاف سے کام لیا ہے ۔

——— علاؤ فرید محسن (گیا)


ہماری مصنوعات
تاج مارکہ
T M
REGD
سُرمہ و کاجل
سُرمہ اصلی ممیرہ نمبر ۱۰
سُرمہ اصلی ممیرہ نمبر ۲۱
سُرمہ نورانی
ایس۔ مہر الٰہی محمد شفیع نمبر ۳۷ / ۱ جیت پور روڈ کراچی

شہرِ خیال

ماہ نومبر ۱۹۸۸ء کا شمارہ مل گیا۔ پڑھ کر خوشی ہوئی نثری حصہ معلومات آفریں اور بے حد مفید۔ اس دفعہ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نے غم و غصہ کا انداز دکھلاتے ہوئے ایک سانس میں تابش کے کلام میں جو پایا کہہ دیا۔ علامہ تابش کے ساتھ بھرپور انصاف کیا ہے۔ ڈاکٹر رستوگی کی طرز نگارش دل موہ لینے والی ہے۔ زبان کی سائنس پر عام فہم انداز میں اچھا مضمون ہے۔ پرانی کہانی اپنی مصنوعت کی وجہ سے پرکشش ہے۔ نظمیں و غزلیں خوب ہیں اگر یہی معیار برقرار رہا تو سہیل کی مقبولیت بڑھتی جائے گی۔

——— عبدالقادر ادیب بنگلور

دسمبر ۱۹۸۸ء کے شمارہ میں ڈاکٹر تحمیل میئو کے انگریزی مقالے "ہندوستانی مسلمان عورتوں کے سماجی مسائل" کا اردو ترجمہ بقلم جناب سید شہاب الدین دسنوی نظر سے گذرا۔ اس مقالے پر کافی محنت کی گئی ہے۔ اور تقریباً تین درجن ایسے رسالوں کا مختصر ذکر کیا گیا ہے جو انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں خواتین کی ادارت اور ان کی دیکھ بھال میں نکلا کرتے تھے۔ یہ مقالہ ان طلبا کے لئے چراغ راہ ثابت ہوگا جو اس موضوع پر ریسرچ کر رہے ہیں۔ اس کے لئے ڈاکٹر تحمیل میئو، سید شہاب الدین دسنوی اور ادارہ سہیل کو دلی مبارکباد۔

رونق دکنی سیمابی مرحوم سے متعلق سہیل میں گوشۂ رونق کا بندوبست مناسب ہوا۔ مرحوم نے نصف صدی سے بھی زیادہ بڑی مدت تک بڑی خاموشی سے اردو کی خدمت کی ہے رونق صاحب سے لیا ہوا گرچرن سنگھ کا انٹرویو مختصر سہی لیکن اچھا ہے۔ شعری انتخاب بھی جاندار ہے۔ نئے لکھنے والوں کی معیاری تخلیق سہیل کے ذریعہ عام قاری تک پہونچ رہی ہے یہ سلسلہ قائم رہنا چاہئے تاکہ نئے لکھنے والے آگے بڑھیں ان کی ہمت بلند ہو اور وہ اردو کی ترویج و ترقی اور بقا کے لئے کام کریں۔

——— حسن نجمی سکندرپوری

سہیل برابر مل رہا ہے یہ بات خوش کن ہے کہ سہیل کامیابی کی طرف رواں دواں ہے۔ دسمبر کے شمارہ کی کتابت طباعت اور گٹ اپ وغیرہ بھی خوب ہے ڈاکٹر تحمیل میئو کا مقالہ اردو زنانہ پریس، سماجی تاریخ کا ماخذ، ہم جیسے طالب علموں کے لئے بہت ہی مفید اور معلومات افزا ہے۔ شہاب دسنوی صاحب کو میری طرف سے مبارکباد پہنچا دیجئے کہ انہوں نے انگریزی کے مقالہ کو اردو ترجمہ کر کے ہم قارئین کو فیض یاب ہونے کا موقع بخشا ہے۔

گرچرن سنگھ کا رونق دکنی سیمابی سے مرحوم سے لئے گئے انٹرویو کو پڑھ کر تشنگی کا احساس ہوتا ہے۔ شعری انتخاب بھی خوب ہے خاص کر آسی رام نگری اور نعز قریشی صاحب کی نظمیں اور اویس احمد دوراں، ڈاکٹر ساقی مجلی شہری، اور علی عباس عزل صاحب کی غزلیں بہت ہی اچھی ہیں۔ ڈاکٹر اودے سرن ارمان کی



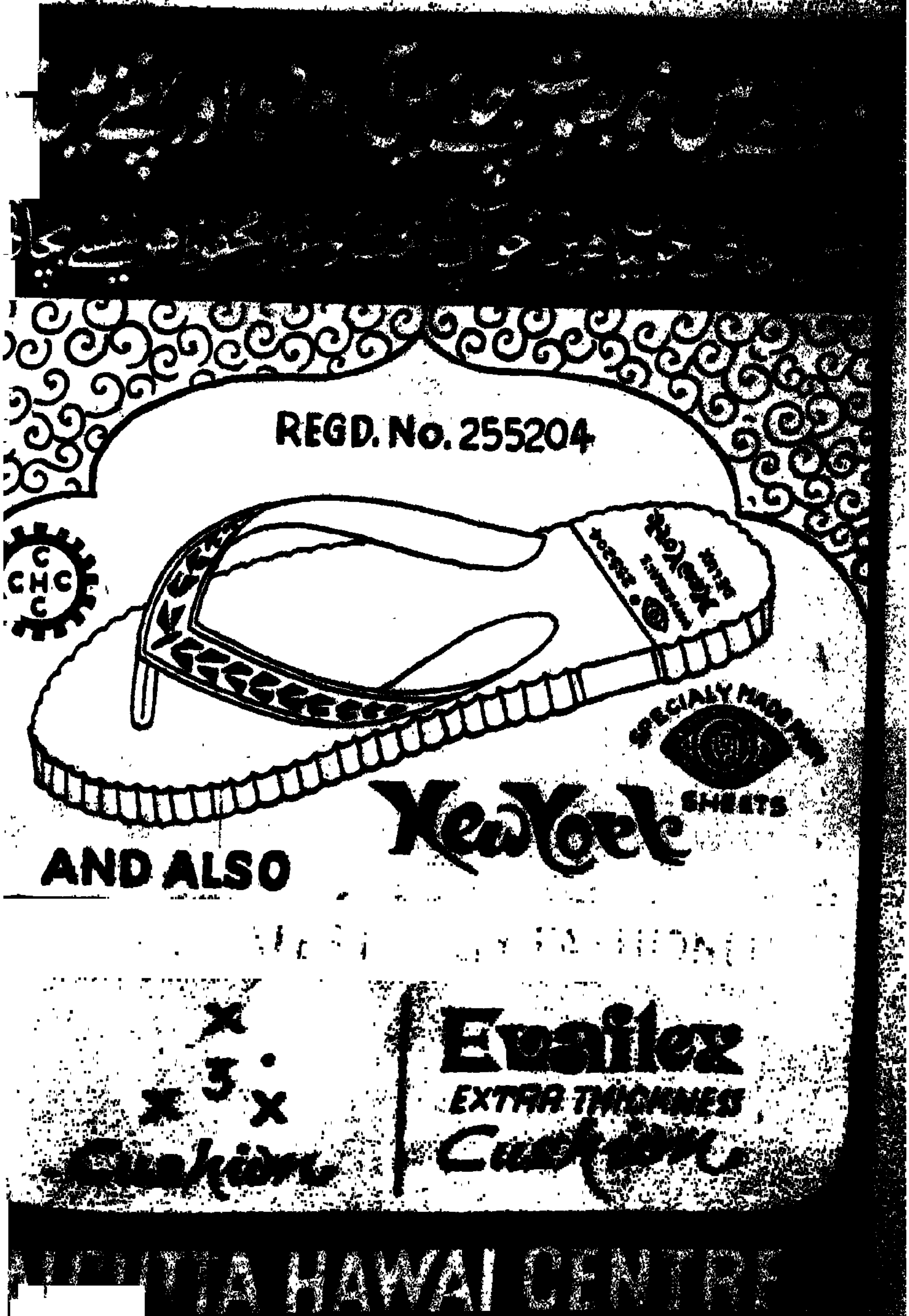
دل پسند ○ سُبک ○ تیز رفتار ○ ملائم ○ پائیدار اور ارزاں
مردانہ بھی
زنانہ بھی
اور
بچگانہ بھی
Baba
cushion
AND
Air India
cushion
کبولا ربر انڈسٹریز
فون نمبر
۴۳-۱۶۰۷
بلا مسجد باری لین۔ کلکتہ ۲۹-۷۰۰۰

* * *



گرام: "النوری"
دلہن مارکہ
لاکھوں کا پسند
اسپیشل
گل
دانتوں کی حفاظت اور تازگی کے لئے
استعمال کیجئے
رجسٹرڈ نمبر
۲۳۵۴۶۱
النوری ٹوبیکو پروڈکٹس۔ جگتدل ۲۴ پرگنہ

No. Gay—4 Regd. with the R. N. P. at R.
1573 47 YEARS OF PUBLICATION
THE SOHAIL MONTHLY, River Side Road, Gaya



سہیل

March 85 Rs. 2/-

★ ★ ★

یہ نایاب [illegible] ناڈوں [illegible]

اور سہرے [illegible] کے لئے ایک [illegible]، شادی بیاہ اور خوشی کی [illegible]

ایک خاص [illegible] ہے۔ جو انجمنوں نیز مومن اور دینی جماعت [illegible]

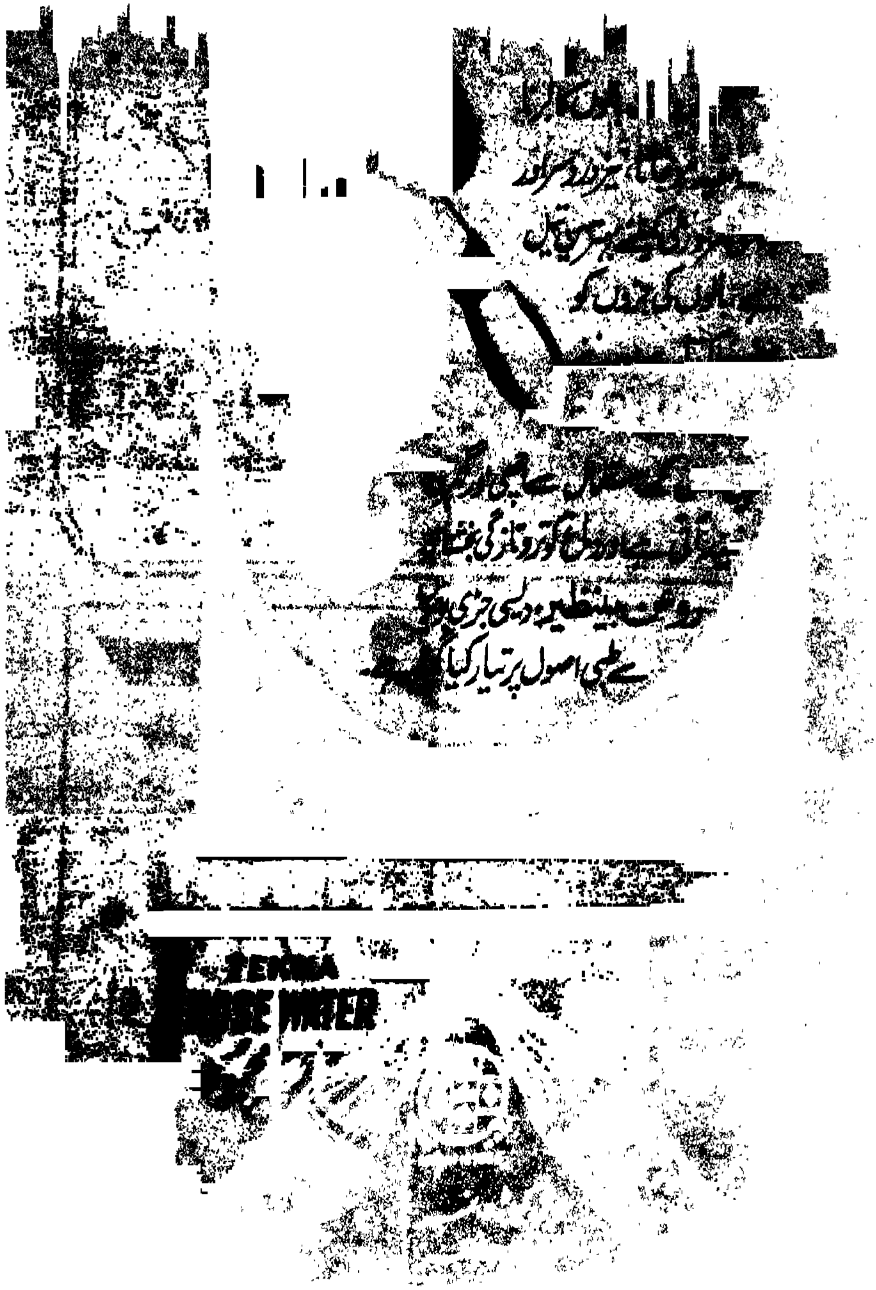
[illegible] سے پہلے مجموعہ نمبر ۲۰۱ ضرور دیکھکر خریدیں۔

حافظ محمد زکریا [illegible] تاجران عطر و تیل [illegible]

برانچ [illegible] — مینارہ مسجد [illegible] روڈ بمبئی ۳

فون نمبر ۳۳۷۸

برانچ ۲ — دوکان نمبر ۱۳ کرافورڈ مارکیٹ [illegible]



دماغ کو تروتازگی بخشتا
دیسی جڑی بوٹیوں
طبی اصول پر تیار کیا

(نمود)

افسانہ کی زبان

افسانہ کی زبان کیسی ہو؟ شاعری اور افسانہ کی زبان میں کیا فرق ہونا چاہیے؟ —— یہ اور اس طرح ے سوالات اکثر و بیشتر ہمارے ناقدین اور فنکاروں کے ذہن میں اٹھتے رہتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ تخلیق کے لئے کسی صوص پیکر، لب و لہجہ، فارم اور زبان کی حدبندی مناسب نہیں۔ تخلیق اس جذبہ و فکر کے اظہار کا نام ہے جو مشاہدہ تجربہ کے طفیل فنکار میں پیدا ہوتا ہے۔ اس پر پابندی لگانا اور پہرہ بٹھانا یا دی النظر میں اس تخلیقی جودت کا گلا گھونٹنے ے مترادف ہے۔ جو ایک ابال کی طرح فنکار کی ذات سے نکلتی ہے۔ بہتے ہوئے آبشار کا راستہ ہم متعین کرنے والے کون تے ہیں۔ یہ بہتا ہوا پانی خود اپنی راہ بنالیتا ہے۔ طبع کی روانی کو رکاوٹ خوب نہیں —— غرض تخلیق کے توسط ے اس طرح کی مختلف باتیں کہی جاسکتی ہیں لیکن اس مسئلہ کو ایک دوسرے زاویہ سے بھی دیکھنا چاہئے۔ فکر و احساس ہو جذبہ و تخیل۔ یہ جب بھی اظہار کی سطح پر آتے ہیں تو الفاظ کا سہارا لیتے ہیں یہی الفاظ ہیں جو فنکار کی ترسیل و اظہار کا سیلہ بنتے ہیں الفاظ MAN MADE ہوتے ہیں۔ ہم نے لفظوں کی تشکیل کی ہے ان کے معنی متعین کئے ہیں۔ ہم ن میں تبدیلیاں بھی کرتے جاتے ہیں نئے حالات اور انکشافات کی روشنی میں ہم الفاظ میں نئی معنوی وسعتیں بھی پیدا تے ہیں —— یہ سب کچھ ہم اس لئے کرتے ہیں کہ اپنے مافی الضمیر کی ادائیگی بہتر سے بہتر انداز میں کرسکیں ہماری ہترین کوشش یہ ہوتی ہے کہ ہم جو کچھ سوچتے ہیں جو کچھ محسوس کرتے ہیں وہ اسی شدت اور توانائی کے ساتھ دوسروں تک منتقل ہوسکے۔ جذبہ و فکر تخلیقی عمل کے وقت خود ہی اپنی ہئیت کا انتخاب کرلیتے ہیں۔ یہ انتخاب شعوری کوشش کا نتیجہ ہیں ہوتا گویا تخلیقی عمل کا سرچشمہ اپنا راستہ خود بنا لیتا ہے —— بلاشبہ اس غیر شعوری انتخاب مختار ہ تجربہ و مشاہدہ نیز مطالعہ بھی کام کرتا ہے۔ جو ایک مدت سے ہمارے ذہن کی تربیت کرتا رہتا ہے۔ لہٰذا کہانی ے لئے جب ہم شعوری طور پر کوئی ایسی زبان استعمال کرنا چاہتے ہیں وہ اس کے فطری بہاؤ سے الگ ہو تو یہ مصنوعی بات ہو جاتی ہے کہانی کی زبان کو شعری زبان میں منتقل کرنے کی کوشش تخلیق کو غیر فطری بنا دیتی ہے۔ ڈھانچہ ے باہر جانے کا عمل بھی اکتساب، تامل، اور کدو کاوش سے عبارت ہوتا ہے۔ غرض ایسی ہر کوشش جس میں خلیق کو اپنے منبع سے ہٹا کر کسی اجنبی سمت میں لے جایا جائے بلاشبہ تخلیق کے فطری رویہ کے منافی ہے۔ افسانہ شاعری بنانے کا تجربہ کرنے والے اسی مرض کے شکار ہیں۔

ادارہ

ترقی پسند ادب کا ترجمان

سُہیل

گیا مارچ ۱۹۸۵ء

مدیر اعلیٰ: ادریس سنسہاروی — مجلس مشاورت: — جلد نمبر: ۴۷ — شمارہ نمبر: ۳

چیف ایڈیٹر: مسعود منظر سنسہاروی — ڈاکٹر تاراچرن رستوگی — خطاط: نظام الدین احمد۔ کلیم ڈنگروی

ایڈیٹر: جمیل منظر سنسہاروی — ڈاکٹر قمر رئیس — خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ:

معاونین: شکیل احمد جابی، عبدالقیوم ابدالی — اصغر علی انجینئر — ماہنامہ سہیل، ریور سائیڈ روڈ۔ گیا ۸۲۳۰۰۱

بدل اشتراک: فی شمارہ ۲ روپے۔ زر سالانہ ۲۴ روپے۔ لائف ممبری ۲۵۱ روپے — فون نمبر: ۲۳۷۵۱

ــــــ فضا ابنِ فیضی ــــــ

دور تک پھیلا ہوا کرفیو کا جنگل سامنے تھا!

(مئو ناتھ بھنجن ــــ اکتوبر کرفیو ۸۴ء کا منظر نامہ)

دور تک پھیلا ہوا' کرفیو کا جنگل سامنے تھا — ہر طرف سے ایک آشوبِ مسلسل سامنے تھا

میں تھکن سے چور آنکھوں میں بھرے شعلے کا ہجوم — اور اک صحرا کہ اس بارش میں جل تھل سامنے تھا

پشت پر کھلتے ہوئے خونریز ماضی کے دریچے — آئینے میں آج کے گزرا ہوا کل سامنے تھا

دے رہی تھیں دستکیں دروازے دروازے صلیبیں — کوچہ کوچہ محشرستانِ مفصل سامنے تھا

ایک کی تلوار تھی اور دوسرے بھائی کی گردن — موت پس منظر میں تھی جس کے وہ مقتل سامنے تھا

آدمی کا جسم لیکن روح خونیں بھیڑیوں کی — نرو بازانِ ستیا کا وہ چھل بل سامنے تھا

راستہ اپنا مگر مسدود تھا چاروں طرف سے — ایک دیوانہ عقب میں' ایک پاگل سامنے تھا

کس نے خنجر سے یہ تہذیبوں کی دستاویز لکھی — وہ ورق تھا جو لہو کی بحرِ جدول سامنے تھا

ہر جنازہ لکھ رہا تھا خود ہی منظر نامہ اپنا — امن کے منشور کا متنِ مکمل سامنے تھا

دی وحدت کا تصور' فلسفۂ جمہوریت کے — امّتِ ابلیس کا ایمان مجمل سامنے تھا

بستیں نخوت گزیدہ عصمتیں دامن دریدہ — چاک چاک انسانیت کا سبز آنچل سامنے تھا

یہ آتش دیدہ تھے قرآں کے اوراقِ مقدس — دل گرفتہ عشوۂ کم خواب و مخمل سامنے تھا

تازہ ہے اب بھی فضا وہ زخمِ لامحفوظیت کا
وقت کا قانون' جوں عضوِ معطل سامنے تھا

وہاں ہر اہلِ نظر بدحواس کیسا ہے
مری کتاب کا وہ اقتباس کیسا ہے

بہ قدرِ وحشتِ معنیٰ ہے یہ تماشا بھی
ہر ایک لفظ' دریدہ لباس کیسا ہے

بجھا کے سو گیا تھا میں شہر کے تمام چراغ
ہوا کا شور' دریچوں کے پاس کیسا ہے

اسے خبر نہ تھی میں زنگ زار کا ہوں صدف
لگا کے غوطہ' شناور اداس کیسا ہے

ٹپکتا شعلہ ہے' دہلیز و در کا سناٹا
یہ قریہ قریہ سلگتا ہراس کیسا ہے؟

تمام چہرے ہیں بے چہرگی کا پس منظر
یہ آئینہ بھی مگر خوش قیاس کیسا ہے

ہر ایک شخص ہوا' اپنے ہی انا کی راکھ
یہ شعلۂ نفس' التماس کیسا ہے

دیا فریب خود اس کے سمندروں نے اسے
وہ موج موج ہی' پیاس پیاس کیسا ہے

بہت قریب رہا مجھ سے وہ' مگر پھر بھی
یہ فاصلہ سا مرے آس پاس کیسا ہے

وہ کیا ہوئیں جو زمینیں تھیں پاؤں پکڑے ہوئے
قلم' ہنر کا شجر' بے اساس کیسا ہے

فضا بلا سے تیرا شیفتہ ہے' مجھ کو تو
یہ دیکھنا ہے' وہ غالب شناس کیسا ہے

(فارم نمبر ۴ دیکھئے رول نمبر ۸)

۱۔ مقام اشاعت : گیا
۲۔ وقفہ اشاعت : ماہنامہ
۳۔ پرنٹر کا نام : مسعود منظر سنہاروی
کیا ہندوستانی شہری ہیں ؟ ہاں
پتہ : ریور سائیڈ روڈ۔ گیا
۴۔ پبلیشر کا نام : مسعود منظر سنہاروی
کیا ہندوستانی شہری ہیں ؟ ہاں
اگر غیر ملکی ہیں تو ملک کا نام : X
پتہ : ریور سائیڈ روڈ۔ گیا
۵۔ ایڈیٹر کا نام : منظر سنہاروی
کیا ہندوستانی شہری ہیں ؟ ہاں
اگر غیر ملکی ہیں تو ملک کا نام : X
پتہ : ریور سائیڈ روڈ۔ گیا
۶۔ ان لوگوں کے نام و پتے جو رسالہ کے مالک ہوں اور جو ایکیوٹی کے ایک فیصد سے زیادہ کے حصہ دار ہوں : X

میں مسعود منظر تصدیق کرتا ہوں کہ میری معلومات و یقین کے مطابق اوپر دیئے گئے تفصیل صحیح ہیں۔ پبلیشر کا دستخط : مسعود منظر سنہاروی
تاریخ : ۲۸ فروری ۱۹۸۵ء

ناشر نقوی (نئی دہلی)

جمیل مظہری اور فکرِ جمیل

لفظ "ادب" جتنا مختصر ہے اس سے کہیں وسیع تر اس کی وسعتیں ہیں اپنی وسعتوں اور بیکرانیوں میں سمندر کے پھیلے ہوئے اس پانی کی مانند ہے جس نے دنیا کی خشکیوں کو اپنے حصارِ حکمت میں سمیٹ رکھا ہے اگر سمندر کا یہ پھیلاؤ نہ ہوتا تو شاید خشکیاں مخلوق کو ریزہ ریزہ کر دیتیں اور اس دنیا کے کارخانے کا شاید کوئی تصور ہی نہ ہوتا۔ انسانی وجود اسی زمین کی طرح ہے۔ جس کے چوگرد ادب کے سمندر کی حکمت عملی کارفرما ہے زندگی حوادثات، حالات کے تجربات فطرت کے محسوسات اور وجودی نفسیات کا ایک ہیجان ہے کہ جس میں جب جب انسان تھکا ماندہ اپنی بے ثباتیوں سے شکستگی کی پیاس محسوس کرتا ہے۔ تب تب یہی ادب کے دھارے ہوتے ہیں جو کبھی نثر، کبھی ظرافت کبھی فنون لطیفہ اور کبھی شعر کے روپ میں اس کے پیاسے ہونٹوں کے راستے اس کی روح تک کو سیراب کر جاتے ہیں اور پھر یہی انسان ایک نئی تازگی ایک نئی شگفتگی اور ایک نئی توانائی سے ہمکنار ہو جاتا ہے۔ شام ڈھلے جب ادب کی ہمہ اصناف کی پروائیاں بربطِ احساس پر دل کی عکاسی کے نغمے چھیڑتی ہیں تو انسان اپنی تمام تر الجھنوں کو بھول کر ایک ایسے ماحول میں کھو جاتا ہے کہ جس کو صرف اس کا خاموش احساس دیکھتا ہے یہی بشری فطرت کے تقاضے ہیں۔ اور یہی مزاجِ بشریت ہے

اب دیکھنا یہ ہے کہ ایسے وہ کون سے مانجھی ہیں جو ادب کی پتوار کو انسانی تقاضوں کو نباہی کرتے ہوئے کھیتے ہیں اردو شاعری نے جو فطرت کے تقاضوں کی تفسیر بھی ہے اور کیفیات کی تفسیر بھی اپنی مختصر سی عمر میں جو کچھ بھی تدریجی ارتقا کی منزلیں طے کی ہیں اس کی حقیقی وجہ آواز میں آواز ملانے کی رسم کا رائج کرنا اور رائج ہونا ہے۔ جس کی حسین مثال صحیح طور پر بیسویں صدی کے تین شاعروں میں ملتی ہے۔ جوش ملیح آبادی، مہدی نظمی، اور علامہ جمیل مظہری۔ ان تینوں کے علاوہ شاید پوری اردو شاعری میں کوئی ایسا شاعر نہیں جو بیک وقت نظم گو بھی ہو، غزل گو بھی ہو، رباعی گو بھی ہو، قطعہ گو بھی ہو، مثنوی نگار بھی ہو، مرثیہ نگار بھی ہو، قومی اور وطنی نغمہ نگار بھی ہو، صحافی بھی ہو، نثار بھی ہو، نقاد بھی ہو اور بذلہ سنج بھی،

اپنے فن میں یگانۂ روزگار اپنے اسلوب میں ادب کے تاجدار۔

علامہ جمیل مظہری بیسویں صدی کے ادب کی وہ موثر آواز تھے کہ جنھیں عہد ساز حیثیت حا
فن کا بانکپن، اسلوب میں جدت طرازی، نگارش میں فکر کی گیرائی، آہنگ میں نیا ولولہ، زبان میں شعلہ
انداز میں وسعت آفرینی، بیان میں تیکھاپن، مزاج میں بدلتی ہوئی قدروں کے نشیب و فراز کا رنگ اور ر
کی آسمان بندیوں میں آذری کا حسین و جمیل تنوع اس سارے جمیل تنوع ہی کا تو ایک نام جمیل مظہری ہے۔

علامہ جمیل مظہری کی شاعری محبوب کے جلووں کی پیچ و خم سلجھانے تک ہی محدود نہیں ر
کی قندیل ہے بصیرتوں کی تمثیل ہے۔ جس میں احساس کمتری کی کہیں سے کہیں تک کوئی گنجائش نہیں۔

یہ مہر تاباں سے کوئی کہہ دے کہ اپنی کرنوں کو گن کے رکھ لے
میں اپنے صحرا کے ذرے ذرے کو خود چمکنا سکھا رہا ہوں !

بیسویں صدی ہی نہیں بلکہ تاریخ اردو ادب کا سنہری باب مولانا سید مظہر حسن مرحوم جو ناخدائے
کے چہیتے شاگرد تھے۔ کی دوسری پشت سے شروع ہوا جس نے خورشید حسنین خورشید کی شفقت
نئی گردوں اور نئی روشنیوں سے مالامال کر کے ادب میں شامل کر دیا، محبت کی لوریاں جمیل مظہری کا ش
گئیں۔ کون سی ناہید صنف ہے جس کی مانگ کا سیندور اور جس کی نازک کلائیوں کی چوڑیاں جمیل مظ
شاعری نہیں۔ غزل کی ساز پر جب ان کی مضراب فکر جھنجھنائی تو پاکیزہ اور معصوم پیار رشک مسرت
ہائے بھرپور شعور کے ہونے کے بعد بھی غیر شعوری ہونے کا معصومانہ انداز ؎

عشق معصوم کے وہ غیر شعوری اقدام لیعنی رخساروں پہ رخسار کا رکھا ہونا

ایک اور جگہ یوں فرمایا ؎

وہ جا چکے ہیں اور آنکھوں پر اعتبار نہیں وہ آ چکے ہیں مگر انتظار باقی ہے

جو یہی رہیں گے تیور تو چھپے گی کیا محبت کبھی ہم خفا خفا سے کبھی تم خفا خفا سے

یہ وہ دھڑکنیں ہیں جنھیں شعوری ہونے کے بعد بھی غیر شعوری کہا جائے گا کیفیات کی منہا ہے جس کے
ساتھ جمیل ایسی دنیا میں لے جا کر کھڑا کر دیتے ہیں جہاں مومن کے علاوہ کوئی دوسرا اس دنیا کو شاید کو
نہ دے سکے گا ؎

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

لیکن طول شب ہجراں پہ جب ستارے کے دھڑکتے ہوئے دل کا احساس فکر کو جھنجھوڑتا ہے تو وہ اس مز

فراموش نہیں کرتا جس کے کھردرے ہاتھوں پر اس کی محنت و مشقت کا صلہ صرف فاقے ہوتے ہیں ؎

شب ہجراں وہاں تیری درازی کون ناپے گا
جہاں فاقہ کشوں کے دن بڑی مشکل سے ڈھلتے ہیں

علامہ جمیل مظہری غزل کو کسی بھی قید کا اسیر ہوتے نہیں دیکھ سکتے بلکہ وقت اور معاشرت کا آئینہ بنانا چاہتے ہیں ایک ایسا آئینہ جس میں ماضی کی پرچھائیاں بھی ہوں حال کے تجربے اور مستقبل کی تعمیری نشاندہی بھی جس میں خودی کو بلندی جذبہ اور بیداری بھی ؎

اتر رہا ہوں بتدریج آسمانوں سے ۔۔۔ بلا رہا ہے تقاضائے آب و گل مجھ کو

عصری لب و لہجہ اور نئے اسلوب بیان میں اپنی بھرپور شعریت کے ساتھ کیا خوب صورت طنز و لطافت ہے ملاحظہ ہو یہ شعر

حقیقتوں نے اوڑھ لی ہے جب اپنے رنگ و بو ۔۔۔ تو احترام فرض ہے ہر آنکھ پر نقاب کا

خود فریبی کے بغاوت کے عناصر علامہ جمیل مظہری کے کلام کے محاسن ہیں ؎

اب تو دھوپ آ پہونچی جھاڑیوں کے اندر بھی ۔۔۔ اب پناہ لینے کو تیرگی کہاں جائے

حقیقت یہ ہے کہ موصوف کا کلام اور فن مضامین کی حد بندیوں میں سمیٹا ہی نہیں جا سکتا۔ ہر صنف پر ان کی اپنی یہ انفرادیت ہے۔ ان کا اپنا مقام عظمت ہے وطن سے پیار کا جذبہ، انقلاب کی چھاپیں ان کے احساس اور ان کی فکر کو ایسا ایسے پہلو دے گئیں کہ فضائیں ان کی نغمات تب تک گاتی رہیں گی جب تک اردو زندہ ہے

جب تک ہے تخصیص کی لعنت کیا ہوگی تعلیم ۔۔۔ جمہوریت دستوریت دونوں نیم حکیم
اس کو بالو، اس کو شکر یہ کیسی تقسیم ۔۔۔ اس کو روٹی اس کو ٹھوکر یہ کیسا اندھیر
وقت کا دھارا پھیرنے والے وقت کا دھارا پھیر

اس حقیقت سے بھی انکار ناممکن ہے کہ جب شاعر سچ اور گہرائیوں میں اترنے لگتا ہے تو اس کے جذباتی مزاج میں خدا کی ذات بھی TARGET بن جاتی ہے اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ شرکت لوا ہو گیا بلکہ خدا سے عاجزانہ اور مخلصانہ شکوہ شکایت بھی ہو جاتا ہے۔ اپنے ایک طویل مرثیے کی تمہید موصوف نے شکوے ہی کے رنگ میں کی ہے گریز کرتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

ہاجرہ پیاس میں پانی کے لئے نہر پہ آئیں ۔۔۔ ان کے اندر از دوش تھے مناسک بن جائیں
اور عباس جو پانی کے لئے نہر پہ آئیں ۔۔۔ پیاس میں بازو کش جنگ کے یں خون میں نہائیں
گو یہ جذبہ تیری عظمت کی منا ہی بھی نہ ہو
یعنی مجذوم آ یئے المستہی بھی نہ ہو !

قول میزان عدالت میں ذرا رب جلیل — اک طرف عزم حسین اک طرف عزم خلیل
شرط انصاف ہے اے صاحب افکار جمیل — اس طرف عون و محمد ہیں ادھر اسماعیل

ذبح فرزند پہ راضی بہ ارادہ تو نہ تھیں
ہاجرہ صبر میں زینب سے زیادہ تو نہ تھیں

علامہ جمیل مظہری کے مراثی میں خالص ہندوستانی تہذیب و تمدن اور ان کی اپنی زبان کا استعمال ہے۔ محاورہ بندیوں، استعاروں، کنایوں نے جو چاشنی اور جو ندرت پیدا کی ہے وہ خالص ان کا ذاتی اسلوب ہے جس اور اہل بیت اظہار کے غم و آلام کو انہوں نے ایک آفاقی پیغام انسانیت سے تعبیر کیا ہے۔ ان کی قربانیوں اور ایثار کو عصری معاشرے کے ماحول میں کیا خوب موازنہ آئینہ دیا ہے فرماتے ہیں ؎

ہے حکمراں عقل پہ دولت ابھی تلک — ایماں کی ہو رہی ہے تجارت ابھی تلک
جاگیر اہرمن کی ہے جنت ابھی تلک — ابلیس ہے معلم فطرت ابھی تلک

پامالی حقوق کا تہذیب نام ہے
انسانیت کی روح کا اک قتل عام ہے

مملکت اصناف سخن کے اس تاجدار کا اپنا منفرد لب و لہجہ ہے غالب یا اقبال سے مماثلت تو ممکن ہے لیکن کوئی میں تیار نہیں کہ علامہ جمیل مظہری نے دوسروں کے چراغ سے اپنا چراغ روشن کیا ہو ان کے اپنے چراغ کی خود اتنی روشنی ہے کہ جن کے سائے میں اردو شاعری درخشندہ رہے گی۔ انہوں نے فن کے آکاش پہ اپنی شہپروں کو کچھ یوں پھیلایا ہے کہ ادب کی ہر صنف کے سر پہ سایہ رہے گا۔
بیسویں صدی کے اس عہد ساز پیغمبر ادب کو اردو ادب ہمیشہ ہمیشہ اپنا عقیدت بھرا اسلام پیش

سید اختر الاسلام (میرٹھ)

علامہ جمیل مظہری کا مسدس "فریاد" - ایک جائزہ

۱ اردو ادب میں نقد و انتقاد کی اس لیے کمی نظر آتی ہے کہ ادیب و شاعر کو یہ خوش فہمی ہوتی ہے کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے لوگ اس کی قدر کر رہے ہیں اور لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ نکتہ چینی اور صحیح بات کہہ کر کیوں تعلقات میں کشیدگی پیدا کریں اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ زندگی بھر شاعر و ادیب کی واہ واہی ہوتی رہتی ہے اگر مرنے کے بعد کوئی صحیح بات کہنے کی جسارت کرتا ہے تو لوگ یہ کہہ کر حوصلہ شکنی کرتے ہیں کہ متوفی کو کیوں کوڑے لگائے جائیں اس طرح ادب میں صرف مثبت اقدار ہی پنپتی رہتی ہے۔ منفی رجحانات کہاں جگہ پائیں۔

علامہ مظہری بہت بلند پایہ شاعر ہیں مگر ان کی مسدس بہ عنوان فریاد اس کسوٹی پہ کھری نہیں اترتی جس کی ان سے امید کی جاتی رہی، ادب برائے زندگی کے لیے ضروری ہے کہ اس سے زندگی کے تئیں ایک ولولہ اور حوصلہ پیدا ہو نہ کہ کسی قسم کی قنوطیت اور یاس و نا امیدی عود کر آئے۔

دبستان غالب کے آخری نمائندہ شاعر، شاعر، نقاد علامہ جمیل مظہری نے غالب سے ان کی سنجیدگی، سادگی، علوئے خیال، فلسفیانہ گہرائی جدت ادا لے کر ان کے ایک شعر کی تضمین اپنی مسدس بہ عنوان فریاد میں کی

تیری اس بزم میں کسی کو ہو دماغ محفل　　پُر ہو جب خونِ تمنا سے ایاغ محفل
جس کو دیکھو سو ہے دل سوز فراغ محفل　　بوئے گل نالۂ دل دودِ چراغ محفل

جو بھی اس بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا
تیر بھی سینۂ بسمل سے پریشاں نکلا

علامہ اقبال سے انھوں نے فنی اظہار اور جذبات نگاری کی خوشہ چینی کی۔ اور انھیں اپنا مرشد فن تسلیم کرتے ہوئے ایک سجدۂ عقیدت کے ساتھ ۶۰ بند والی مسدس تخلیق کر ڈالی شاید اس وقت علامہ مظہری کے سامنے اقبال کا شکوہ تھا کہ جس کو انھوں نے بیانیہ انداز سے بدل کر فلسفیانہ رنگ میں پیش کرنا بہتر سمجھا دانتے نے کہا تھا کہ ہر بڑا شاعر تھوڑا بہت بے دین ہوتا ہے چنانچہ علامہ مظہری نے بھی اس کار گہہ آفرینش کی تعمیر، تجسس اور تشکیک کی نظر سے دیکھا ؎

ذہن تشکیک کی گرہوں کو ذرا کھول کے دیکھ　　دل شاعر کی ترازو پہ اسے تول کے دیکھ

کیوں نہ بہکوں کہ تخیل ہے پریشاں میرا　　عشق کیا عقل نے پھاڑا ہے گریباں میرا
کشتۂ ناز خرد ہے دل ناداں میرا　　ابھی تشکیک کی منزل میں ہے ایماں میرا

فلسفیانہ طرز ادا سے مسدس مکمل خود کلامی کی آئینہ دار ہوگئی جس میں منطقی ربط اور ڈرامائی کیفیت کا فقدان ہوتے ہوئے بھی زبردست عالمانہ تاویل اور فقیہانہ ناپ تول سے شاعر زندگی اور موت کے باہمی رشتے پر متردد، متفکر، متجسس ہے کہ ہر بڑی مچھلی کا خوراک چھوٹی مچھلی ہے۔ پھر گویا یہ تخلیقی سلسلہ دراز سے دراز تر ہوتا جا رہا ہے ؎

ذرہ صحرا میں نہ شامل ہو تو وہ گم گیں ہو　　موج کے واسطے ساحل ہو تو وہ غم گیں ہو
حرش اگر لقمۂ قاتل ہو تو غم گیں ہو　　لقمۂ گربہ کو نہ حاصل ہو تو وہ غم گیں ہو

قطرہ دریا میں نہ گم ہو تو ہو مٹی کی غذا
تنکے گلشن میں نہ جلبسیں تو ہو آندھی کی غذا

قید احساس کی یہ سلسلہ بندی کیسی　　خوئے تخلیق کی افسانہ پسندی کیسی
جب کہ پستی میں اتارا تو بلندی کیسی　　شرط انصاف ہے یہ حوصلہ مندی کیسی

جن کا کچھ جرم نہیں ان کا ستانا کیسا
مشت ذرات کو جس دے کے رلانا کیسا

علامہ مظہری کے لئے مذہب لازمی، ضروری اور عزیز ہے مگر مذہبی لوگوں کا دوہرا کردار انہیں ایک آنکھ نہیں سہاتا۔ اور یہ نکتہ بھی ان کے لئے عقدۂ لاینحل ہے کہ وہی لوگ کیوں فربہ اور خوش و خرم ہیں ؎

پردہ خدمت وہیں ہوس جاہ کریں !   خون بندوں کا پئیں نصرت اللہ کریں
ایسے لوگوں پہ بھی ہوتی رہی شفقت تیری   سچ ہے غالب ہے تیرے قہر پہ رحمت تیری

جن سے پہنچے تمہے ناموس عدالت کو گزند   ان کا پرچم بھی بلند، ان کا ستارہ بھی بلند
اور جو حق کے منادی ہیں وہ زنداں میں ہیں پابند   بات سیدھی ہے کہ گاہے بہ سلامت رنجند

حق و باطل میں بہرحال جدائی نہ ہوئی
یہ تو شاہی ہوئی سرکار خدائی نہ ہوئی

شاعرانہ نقطۂ نظر سے علامہ مظہری کے تئیں تخلیق کائنات کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ خدا نے اپنے اکیلے پن کو دور کرنے کے لیے انسان کو پیدا کیا اور جذبۂ خودی سے معمور کیا۔ پھر اس نے اس کا دامن نعمتوں سے بھر دیا انسان نے اس کا احسان مانا، علامہ مظہری انسان کی اس احسان مندی کو بہ نظر تحسین پیش کرتے ہیں۔

کیا ہے نعمت سے اگر بھر دیا داماں اس کا   تیرا احسان جو وہ مانے تو ہے احسان اس کا

علامہ مظہری کے اس مسدس میں انسان کی پرُ ثن خیالی، جبر مشیت کی کارفرمائی اور عقلی استدلال کی جلوہ گری ہے۔ اس میں انہوں نے کچھ نئی تعریفات بھی پیش کیں۔ مثلاً دنیا کو انہوں نے جبر مشیت کہا ابر رحمت کو انہوں نے زمین کے کلیجے کا دھواں بتایا موت ان کی نظر میں جرم ضعیفی کی سزا ہے اور خدا خودی سے ماورا ر ایک طاقت اس کے ساتھ ہی ارض و سما قید کے سلسلے ہیں ؎

سلسلے قید کے ہیں ارض و سما کچھ بھی نہیں   دو جہاں جبر مشیت کے سوا کچھ بھی نہیں

ابر بن بن کے جو رحمت کا نشاں اٹھتا ہے   یہ بھی گیتی کے کلیجے سے دھواں اٹھتا ہے

موت جب جرم ضعیفی کی سزا ہو یارب   کیوں نہ شاعر تری سلطنت سے خفا ہو یارب

علامہ اقبال نے اپنے شکوہ میں جس مستی کردار کی تفویض مرد مجاہد کے لئے کی تھی علامہ مظہری کے یہاں اس کا سراسر فقدان ہے۔ انہوں نے صرف بارگاہ خداوندی میں دعا کے لئے ہاتھ بلند کر دئے ؎

اب تو مظلوم کی آہوں کو اثر دے یارب — اب تو حکام کو رحم کا جگر دے یارب
چشم واعظ کو بصیرت کی نظر دے یارب — قلب منعم کو محبت کا شرر دے یارب
جن کے خالی ہیں دماغ ان کو خیالات بھی دے
جو ہیں افکار کے مالک انہیں جذبات بھی دے

عشق اک قطرہ ناچیز ہے دریا کر دے — کوہ کو کاہ بنا ذرے کو صحرا کر دے
اک تبسم سے یہ دنیا تہ و بالا کر دے — دیر اتنی ہے کہ تو ایک اشارا کر دے
سحر تو یہ وقت کی رفتار بدل جائے ابھی!
لڑکھڑاتا ہوا انسان سنبھل جائے ابھی

غلام رسول مہر نے علامہ اقبال کے شکوہ کے بارے میں کہا ہے:

"نظم پڑھنے کے دوران ہرگز یہ احساس نہیں ہوتا کہ مسلمان ناخوشگوار حالات سے دوچار ہیں۔ اس میں عظیم انسان کے کارنامے اس حسن ترتیب سے جمع کر دیئے گئے ہیں کہ موجودہ پست حالی کے بجائے صرف عظمت و برتری ہی سامنے رہتی ہے گویا یہ شکوہ بھی ہے اور دعوت عمل بھی۔"

آہنگ کے اعتبار سے علامہ مظہری کی یہ نظم شکوہ کی یاد تو دلاتی ہے مگر فوراً ہی اس سے حالی کے شکوہ ہند کی یاد تازہ ہو جاتی ہے اور یہ انسان ضعیف انسان کی شکستہ دلی اور پست ہمتی کا نوحہ ہو جاتی ہے علاوہ ازیں اس نظم میں حسن ترتیب کا بھی فقدان ہے جس نے اس کے تاثر کو بھی کم کر دیا ہے۔

عظیم امروہوی (امروہہ)

مراثی جمیل میں عصری آگہی

دنیا کی مختلف زبانوں کی جملہ اصناف سخن میں جو تعصب اردو مرثیے کے ساتھ برتا گیا ہے اور جس تنگ نظری کا شکار اردو مرثیہ رہا ہے شاید کہیں اور اس کی مثال نہ مل سکے۔ اسی وجہ سے اردو مرثیہ کو آج تک اس کا صحیح اور جائز مقام نہیں مل سکا۔ اور ایک بڑا حلقہ اس کو ایک مخصوص فرقے کی مذہبی نظم کہہ کر نظر انداز کرتا رہا۔ اور ادبی صنف کی حیثیت سے فراموش کیا گیا۔

اردو مرثیہ پر ابتدا میں حالی اور شبلی نے جو اعتراضات کئے تھے ان میں سے کچھ اعتراضات واقعی قابل غور تھے۔ جن کے لئے مرثیہ نگار شعرا کافی حد تک ذمہ دار تھے۔ لیکن اردو مرثیے کو بیسویں صدی کی نئی نسل نے ان اعتراضات سے کافی حد تک بچا لیا ہے۔ اور ان کے تدارک کی کوشش کی ہے۔ لیکن اس کے باوجود بھی کچھ نقادوں نے مرثیے کی مخالفت کو اپنا مسلک اور مرثیہ پر اعتراضات کو اپنا شیوہ بنا رکھا ہے۔ اب اس کے بعد مرثیہ نگار شعرا نہ کچھ کر سکتے ہیں اور نہ مرثیے کو منصفانہ نظر سے دیکھنے والے اہل نظر۔ کیونکہ اعتراض میں خلوص ہونے کے بجائے اعتراض برائے اعتراض ہے۔

پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب، جعفر علی خاں اثر لکھنوی، علی عباس حسن اور ڈاکٹر محمد حسین جیسے ذہنوں نے مرثیے کا ایماندارانہ جائزہ لیا۔ جس کے نتیجے میں مرثیے کے لئے ایک مخصوص ذہن تیار ہوا۔ جس ذہن نے تقریباً وہ تمام اعتراضات دھو دیئے جو مرثیے کے لئے عام سے ہو کر رہ گئے تھے لیکن اب اس کو کیا کہا جائے کہ اس کے بعد بھی کوئی مرثیہ کی مخالفت کی قسم کھائے رہے اور جوش ملیح آبادی جیسے مرثیہ نگار کے انتقال کے بعد یہ کہے کہ جوش نے اپنی مرثیہ نگاری میں عرب کے امام حسینؓ کو ہندوستان کے جواہر لال نہرو سے قریب کر دیا ہے۔ بات لکھنؤ کے دولہا سے جواہر لال نہرو تک پہونچی، اور اس گمراہی کا سبب صرف آنکھوں پر عصبیت کی عینک ہے۔

بہر حال بیسویں صدی کے شعرا کی وہ صف جس نے اردو مرثیے کے چمن میں بہت سے غنچے

گل کھلائے، مرثیے کے دامن کو وسعت بخشی۔ مرثیے کے کینوس کو بڑھایا، اور ان اعتراضات کا جواب دیا، اس صف میں ایک اہم اور معتبر نام جمیل مظہری کا ہے۔

جوش ملیح آبادی نے یوں تو سب سے پہلے ۱۹۱۸ء میں اپنا پہلا مرثیہ "آوازۂ حق" کہا لیکن اردو مرثیے کو جو جدید فکری نہج ملی وہ ۱۹۲۳ء کا نسیم امروہوی کا مرثیہ ہے۔ جس کے بارے میں پاکستانی نقاد کریم بخش خالد رقم طراز ہیں کہ:

"سب سے پہلا مرثیہ جو مرثیے کے قدیم تخیل سے ہٹا ہوا ہے وہ ۱۹۲۳ء میں منظر عام پر آیا اور اس کے مصنف نسیم امروہوی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اصلاحی مضامین مرزا اوج، فرزدق ہند شمیم امروہوی اور شاد عظیم آبادی نے بھی اپنے اپنے مرثیوں میں نظم کئے تھے مگر رسولؐ و آل رسولؐ کے اسوۂ حسنہ کی تاسی و عزم و عمل کی قوتوں کو بیدار کرنا اور اسلاف اخیار کے جہد و جہاد کی یاد سے خود میں ویسے عمل کی لگن پیدا کرنا جو جدید مرثیے کی روح ہے سب سے اول نسیم امروہوی کے زیر نظر مرثیے میں نظر آتی ہے۔ پورے سات سال کے بعد ۱۹۳۰ء میں جمیل مظہری نے ۱۹۳۹ء میں، سید آل رضا نے ۱۹۴۱ء میں جوش ملیح آبادی نے قدیم طرز مرثیہ گوئی سے ہٹ کر مرثیے کہے۔"

(ماہنامہ اظہار، کراچی اکتوبر ۱۹۸۲ء صفحہ، ترجمان حکومت سندھ پاکستان)

بہرحال قدیم مرثیے پر جو اعتراضات تھے وہ کچھ اس طرح ہیں کہ مرثیے کا مقصد رونا رُلانا ہے۔ اس لئے شعراء شعری محاسن کی طرف دھیان نہیں دیتے۔ یہ تصور کہ معرکۂ کربلا میں حصہ لینے والے ما فوق طاقت بشری رکھتے تھے، کبھی مرثیے کے سامع اور قاری کو ان کی پیروی اور تقلید نہیں کرنے دیتا۔ مرثیے میں رزم و بزم کی زیادتی مرثیے کے موضوع کے خلاف ہے۔ مرثیہ نگار شعراء مورخانہ احتیاط نہیں برتی۔ مرثیے کے اجزا بناوٹی ہیں اور مرثیے کے کردار عربی سے زیادہ ہندوستانی بن گئے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔

موخر الذکر اعتراض تو ایسا ہے کہ جس کا تفصیلی جواب پروفیسر مسعود حسن رضوی، علی عباس حسینی، اثر لکھنوی، سید سخی حسن، اور ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی سے لے کر پروفیسر گوپی چند نارنگ تک دے چکے ہیں۔ اور اسے عیب کے بجائے حسن اور خوبی ثابت کیا ہے۔ اب ہم اگر مرثیے پر باقی اعتراضات کے مطالعے کے بعد جمیل مظہری کے مراثی کا جائزہ لیں تو مندرجہ بالا تمام اعتراضات ریت کی دیوار ثابت ہوتے ہیں۔ اور جمیل مظہری کے مراثی میں شعری حسن بھی عروج پر ملتا ہے۔ جذبۂ تقلید پر بھی وہ ابھارتے ہیں۔ تاریخ کی کسوٹی پر بھی وہ پورے اترتے ہیں رزم کا ذکر بھی تناسب کے ساتھ ہے اور اجزائے مرثیہ بھی بناوٹی نہیں، بلکہ فطری ہیں، مراثی میں شعری حسن

لئے صرف چند مطلع ملاحظہ ہوں ؎

عشق کیا ہے غم ہستی سے رہا ہو جانا اور رہا ہو کے گرفتار بلا ہو جانا
بے پئے مست مئے جام فنا ہو جانا بسکہ دشوار ہے پابند وفا ہو جانا
قید یہ اس میں بڑی ہے کہ دل آزاد رہے
فکر انجام نہ ہو کوشش برباد رہے

کھولا عروس شب نے جو زلف دراز کو خواب گراں نے پیار کیا چشم ناز کو
شعلہ بنایا نرگس جادو طراز کو جھونکا دیا تخیل راز و نیاز کو
سر سے ردائیں ڈھل کے سر دوش ہو گئیں
انگڑائیاں تصور آغوش ہو گئیں

رہبری کرتی ہے مقصد کی اشاعت کیونکر منتقل ہوتی ہے سپنوں سے حرارت کیونکر
بولتی ہے لب انساں سے مشیت کیونکر بولتی ہے لب انساں سے مشیت کیونکر
دل سمجھتے ہیں حوادث کا اشارہ کس طرح
وقت کا پھیر دیا جاتا ہے دھارا کس طرح

خم بہ خم کاکل ہستی کا فسانہ ہے عجیب اس کے بننے کا بگڑنے کا بہانہ ہے عجیب
حیرت بیکسی آئینہ خانہ ہے عجیب اک گرہ بھی نہ کھلی قسمت شانہ ہے عجیب
گتھیاں اور بھی بڑھتی گئیں سلجھانے سے
زلف الجھتی رہی کچھ بن نہ پڑا شانے سے

شاعری بحر معانی کا تلاطم ہے جمیل جسمیں غلطاں ہیں ستارے یہ وہ قلزم ہے جمیل
رنگ و بو کے جو کھلونوں میں خود گم ہے جمیل شاعری اس پہ حقیقت کا تبسم ہے جمیل
اہل دانش ہے وہی اہل بصائر ہے وہی
اس تبسم کو جو پہچان لے شاعر ہے وہی

ایسی اور بھی بے شمار مثالیں جمیل مظہری کے ہاں موجود ہیں۔ ان مثالوں سے اس بات کا اندازہ ہر صاحب نظر لگا سکتا ہے کہ جمیل مظہری کے مراثی میں کتنا شعری حسن ہے۔ اب رہا سوال جذبہ پیروی اور تقلید ابھارنے پر تو وہ بھی ملاحظہ ہو ہے

حیف وہ قوم جو ملت شاہ شہدا — وہ حکومت کی کنیزی میں ہو حریت کی ہرجا
جس طرف دیکھئے ہے موت کا اک سناٹا — نہ کوئی پیر تدبر، نہ جوان غوغا
جسم ہیں مدفن دل محفلیں گورستاں ہیں
بستیاں روح کی اک وادیٔ خاموشاں ہیں

نہ اخوت کی تڑپ ہے نہ سیاست کا شعور — نہ خرد ہے نہ جنوں ہے نہ حیلہ ہے نہ غرور
زندگی میت احساس ہے دل مردہ ہیں — جتنے جذبات ہیں قومی وہ سب افسردہ ہیں

منفعل تجھ سے ہوگی گردش دوراں اے قوم — رائیگاں تجھ پہ ہوا خون شہیداں اے قوم!
غم شبیر میں کس منہ سے ہے تو فریادی — تجھ سے خود ہے ترے مولا کا لہو فریادی

حیف اس خون کی کچھ قدر نہ جانی تو نے — ایک حقیقت تھی کیا جس کو کہانی تو نے
نہ بتا کی تو بہت اشک فشانی تو نے — پھر کا کشت شہدا پر کبھی پانی تو نے
شش کر کشت شہدا مذہب قربانی ہے
اور مجاہد کا لہو اس کے لئے پانی ہے

بجز اس کے لئے پیغام حسین وگلگیر — کہ جہاں دور یزیدی ہو بزور شمشیر!
اس شبستان غلامی میں بہ فتوائے ضمیر — ہر مسلماں کا ہے یہ فرض بہ رب شبیر!
کہ بلند اٹھ کے وہاں نعرۂ تکبیر کرے
عملاً پیروی سنت شبیر کرے

کیا جمیل مظہری کے مندرجہ بالا بند ایسے نہیں ہیں۔ کہ جو قوم کو غیرت دلا سکیں کیا ان کے

لبد عمل ملکہ عمل خیر کا جذبہ نہیں ابھرتا یقیناً ابھرتا ہے اور جمیل مظہری پوری طرح اپنے مقصد میں کامیاب تے ہیں۔ انہوں نے کسی مرثیے میں بھی صرف رونے پر زور نہیں دیا۔ اور صرف کردار پیش نہیں کئے۔ بلکہ اح کی کوشش بھی کی ہے اور سیرت کی پیروی پر بھی ابھارتے ہیں۔

درحقیقت جمیل مظہری کی نظر میں گہرائی بھی تھی اور گیرائی بھی۔ ان کا مطالعہ بھی عمیق تھا اور مشاہدہ وسیع، وہ اپنے دور سے پوری طرح واقف تھے۔ وہ اپنے عصر کی تمام پیچیدگیوں سے آگاہ تھے۔ ان کی نظر معاشرے کی تمام نشیب و فراز تھے۔ وہ سماج کے ہر طبقے سے واقف تھے۔ اسی لئے ان کے مراثی میں جگہ ن کے عصر سے آگاہی کا اظہار ہوتا ہے۔ اور وہ بےباک ہو کر جو کچھ محسوس کرتے ہیں اس کا اظہار کر دیتے اس لئے خود ہی ایک جگہ کہتے ہیں کہ ؎

تنگ سیر سخنی چند یہ کڑوے اشعار
جملہ معترضہ تھے نہ طبیعت پہ ہوں بار

ے مظہری ملک کی آزادی سے بھی مطمئن نظر نہیں آتے اور غلامی و آزادی کے دور میں ان کی نظر میں کوئی فرق نہیں ہے۔ کیونکہ ملک آزاد تو ہوا لیکن ذہن نہیں بدلے، مزاج نہیں بدلے، اور انداز نہیں ے اسی وجہ سے کہتے ہیں کہ ؎

جنس خودی جہاں میں ہے ارزاں اسی طرح
انسان کا غلام ہے انسان اسی طرح

وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ جہاں یہ ماحول ہو اور معاشرے کی یہ حالت زار ہو وہاں فنکار کا رہنا بہت دشوار ینکہ عام انسان سے زیادہ حساس اور زیادہ بیدار ہوتا ہے ؎

سو بینٹ چڑھ رہے ہوں جہاں چارگیہ
اس ملک میں جگہ نہیں [illegible] لئے

ے مظہری اپنے نظریہ کی ایک جگہ اور وضاحت اس طرح کرتے ہیں ؎

مٹھی میں ایک شخص کی قسمت ہزار کی
تو ہین ہے عدالت پروردگار کی

یہ اور محنت کی جنگ صدیوں سے اس روئے زمین پر جاری ہے [illegible] جانے کب تک جاری رہے گی لہ اس کا حل بھی مرسل اعظم نے پیش کیا تھا لیکن دنیا نے اس پر عمل نہیں کیا۔ جارج برنارڈ شاہ جب رستان آیا تو بمبئی میں ایک موقع پر اس سے یہ سوال بھی کیا گیا کہ دنیا میں سرمایہ دار اور مزدور کی جو لڑائی ہر صے سے جاری ہے آخر اس کا کوئی حل ہے یا نہیں۔ اور اگر کوئی حل ہے تو وہ کیا ہے اس پر برنارڈ شاہ ب دیا کہ اس کا حل تو آج سے چودہ سو سال قبل مسلمانوں کے آخری رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ر گئے ہیں۔ اور وہی واحد حل ہے۔ جمیل مظہری کا دل بھی مزدور کے درد سے لبریز ہے جس کا اظہار وہ رح کرتے ہیں ؎

یہی انصاف ہے مزدور کو اجرت نہ ملے خون بھی دے تو اسے خون کی قیمت نہ ملے

جمیل مظہری ایک کامیاب نباض ادب بھی تھے انہیں اس بات کا خوب احساس تھا کہ فنکار کا کیا فرض ہے اور معاشرے کا فنکار سے کیا تقاضہ ہے۔ وہ اپنے عصر کے اس تقاضے کو خوب سمجھتے تھے۔ اس وجہ سے وہ فنکار جو لکیر کا فقیر تھا یا جس کے ہاں مقصدیت مفقود تھی یا سطحی تھی وہ اس کو بھی چاہتے ہیں کہ صحیح راہ اختیار کرے اسی لئے کہتے ہیں کہ ؎

اور شاعر کو خرافات سے فرصت نہ ملی ہجر اور وصل کے جذبات سے فرصت نہ ملی
خط و کاکل کے روایات سے فرصت نہ ملی رنگ و نکہت کی بلا بات سے فرصت نہ ملی

منفعل جذبۂ جنسی کو زبانی کہتے
عمر گذری گل و بلبل کی کہانی کہتے

غرض کہ جمیل مظہری ایک ایسے دیدہ ور اور باخبر شاعر تھے جو اپنے عصر سے پوری طرح آگاہ تھے اور اس کا ثبوت ان کے مراثی ہیں۔ جو ایک طرف اردو مرثیے پر اعتراضات کے جواب ہیں۔ تو دوسری طرف ان کی عصری آگہی کے مظہر ہیں۔



…ہیں گیا

…ب

…ے عباس غزل

…ے میری لاش سجائی
…نے بچے بچے کا رمنائی
…ے ایک آواز لگائی

…ہوئے تم گیان ہوئے
…ہوئے نروان ہوئے
…ے بھگوان ہوئے

…چپ چاپ کھڑا تھا
…تماشا دیکھ رہا تھا
…تے پھینک رہا تھا۔

…جرین کے نام

مشرف عالم ذوقی

…بے جانے والے مہاجرین کے نام)

…اپنی چیزیں جن میں
…یاد کے عکس تھے
اُن کو اے لوگو ہم رخصت ہوتے ہیں

…یا جب نیند آجائے
…جگانا
…ٹوٹ رہے منظر سے ڈر لگتا ہے

گاڑی ہر پل آگے بڑھتی جائے گی

اس بستی سے اتنے کنکر چن ڈالو
جتنے کنکر میرے دل کے اندر ہیں
ہجرت کے رستے میں کھلا گلاب نہیں ہے۔

شناخت

ہندی: وشوناتھ پرتیلیش
ترجمہ: ایم۔ کے۔ اشش

مرا دم گھٹ رہا ہے
کوئی کھول دے شیشے کے اس دروازے کو
تم نے مجھے کیوں قید کر رکھا ہے؟
اس عجائب گھر میں
ہاں!
میرے سینے کی ہڈیاں
ڈھانچوں کی شکل ابھری ہیں
میرے چہرے کا رنگ
یرقان کے موذی مرض سے مرے ہوئے
لاش کی طرح لگتا ہے
میری آنکھیں خلا میں ٹنگی ہوئی ہیں
لیکن
میں تن خامن کی ممی نہیں -
میں انسان ہوں، زندہ ہوں۔
میری جیب میں
میرا پاسپورٹ اور پتہ ہے
میں ہندوستان کا باشندہ ہوں!

٭٭٭

زندگی

تم نے
میری اُمید کی
ہر دہلیز کی چوکھٹ پر صدا دی ہے
سنتا ہوں،
ڈائن بھی ایک گھر چھوڑ دیتی ہے
لیکن
بتا اے زندگی
تو کس شیطان کی نسل ہے؟

ٹوٹن

میرے ہمسفر
بہت کھینچا ہے، میں نے زندگی کو
تمہارے ساتھ چلنے کے لئے
اسی لئے
ڈھیلے پڑ گئے سارے انفاس
جنھیں جوڑنے کی کوشش میں
ابھر آئی ہیں نئی نئی گانٹھیں
لیکن اور بھی
ٹوٹنا ہو گیا ہے
عمر کا سکون!

مشتاق حیدرآبادی

چلو

چلو ویرانہ ہی آباد کر لیں
گلشنِ ہستی میں آخر کیا رکھا ہے
عمر بھر کی تشنگی کا کچھ مداوا ہو
میں تم میں جذب ہو جاؤں
کہ تم مجھ میں سما جاؤ

وصال

اسے پانے کی خواہش میں
میں سرگرداں رہا برسوں
وہ جب مجھ سے ملی تھی ٹوٹ کر
میں نے زمانے کی تھکن ساری
انڈیلی جسم میں اس کے
وہ شاداں اور فرحاں تھی
مگر میں قرب کے کیف میں شعلہ بنا تھا
پے بہ پے ہر عضو جیسے جل رہا تھا
مگر اب نارمل ہوں
اسے پانے کی خواہش

آرزو

چاہتوں کے روز و شب
اب واہمہ لگنے لگے
تم ادھر اسکول میں ہو
اور میں جلتے ہوئے ماحول میں
پھر کوئی منظر کھلے
بچھڑے ہوئے مل جائیں اتنی آرزو ہے !!

مینا کماری کی یاد میں

تری آواز کا جادو
تیرے پیکر کا جمال
شعلۂ حسن خیال
پردۂ زیست پہ تمثیلِ حقیقت بن کر
آرزوؤں کے جزیرے میں کنول مہکائے
ذات کے کرب کو تخلیق بنا کر تو نے
زندگی کے خرابے میں وفا روشن کی
اپنی ہی آگ میں جلتی رہی پہروں لیکن
اک زمانے کو سبق پیار کا سکھایا تو نے
تیرے نغمات سے مہکے گی خیابانِ خیال
تیرے تخیل سے خوشبوئے وفا آئے گی
پردۂ زیست پہ تمثیلِ حقیقت بن کر
تو نے ہر عہدِ تمنا کو سرافراز کیا
تو نہیں ہے مگر احساسِ وفا زندہ ہے
تیرے جذبات کا سرچشمہ رواں لگتا ہے
پردۂ ساز میں آوازِ حقیقت بن کر
تو نے تاریخ کے اک موڑ کو بخشا ہے خرام
اور مشتاق کی جانب سے ہو تسلیم سلام !!

یاد کے نام

اس جھلسے ہوئے ماحول میں
اے جانِ جہان
پھر تری یاد نے ٹھنڈک بخشی !!

ایک نظم

رات پھر تنہا اکیلی اور اداس
یاد کے جگنو نہ بوسوں کی مہک
ملگجی پرچھائیاں ہجر اور خاموشیاں
وصل کی خواہش سلگتی جائے ہے
ٹھیک ہے
اب یار کی جانب چلیں
کیا کریں
کچھ تلخیاں کچھ تشنگی سے کام لیں !

ہمارے عہد کا ہیرو

(دلیپ کمار کی نذر)

ہمارے عہد کا ہیرو
مثالی شخصیت جس کی
وہ اپنی ذات میں بھی انجمن جیسا
کوئی کردار ہو بیٹھا ہے رخ پر
زیب دیتی ہے اسکو
پردۂ سیمیں کی سرداری
میں اس کا وصف کیا لکھوں
قلم عاجز، زباں قاصر
ہمارے عہد کا ہیرو
مثالی شخصیت جس کی !!

> مضمون نگار حضرات اپنی تخلیقات صاف اور خوشخط کاغذ کے ایک ہی رخ، بین السطور کشادہ چھوڑ کر لکھا کریں۔ (مدیر)

…سن بدایونی

…اضی کبھی فردا لگے ہے
…ر زیست بھی کیا کیا لگے ہے

…شم سے چہروں کا گرنا
…ے کیوں ہمیں اچھا لگے ہے

…ے زیست میں نکتہ وروں کو
…الفاظ کا کھلتا لگے ہے

…سر پہ شملہ و دستار لیکن
…کا سر ہمیں ننگا لگے ہے

…طوفاں میں چکراتی ہوئی ناؤ
…رے کی طرف بھی آ لگے ہے

…ے زاویوں سے ایک ہی رنگ
…اجلا کبھی میلا لگے ہے

…ی راہ میں ایک ایک ساتھی
…تو ٹھوکریں کھاتا لگے ہے

…ں سے تصور شامِ غم کا
…ن پر سیہ دھبہ لگے ہے

…جلے ذرا میں شمس نقشہ
…ے کو بدلے کیا لگے ہے

کامران نجمی

[ستم زدگان بھوپال کے نام]

ہر غنچۂ امید کو پامال کر گیا
یہ سال جاتے جاتے بُرا حال کر گیا

ویران کیسے کیسے خد و خال کر گیا
قائم عجب مثال یہ بھوپال کر گیا

تھا جن ہتھیلیوں کو حنا بستگی کا شوق
رنگِ لہو سے کون انھیں لال کر گیا

رکھ لی ہے آج کس نے صداقت کی آبرو
یہ کون اپنے جرم کا اقبال کر گیا

موسم تو یخ زدہ تھا یہ شعلہ سموم کا
آنکھوں کو وقفِ آتشِ سیال کر گیا

خوشیوں کی چاہ کی تھی گر شہریارِ وقت
جھولی میں نقدِ کرب و بلا ڈال کر گیا

تاریکیوں سے پھوٹ ہی ایک جوئے نور
جگنو بلندِ رات کا اقبال کر گیا

اس عہدِ آشنائے قیامت کو کیا کہوں
نجمی جو سب کو وارثِ بے حال کر گیا

شہپر رسول

کشادہ دل ہیں کہ ہم کو گلہ کوئی نہیں
ہمارے ساتھ گدا، بادشاہ کوئی نہیں

میں صاف بچ کے نکل آؤں تو حسد کرنا
تمہارا شہر ہے، میرا گواہ کوئی نہیں

یہ شہر ہے کہ کوئی دشت، کہہ نہیں سکتے
مگر یہاں پہ بحالِ تباہ کوئی نہیں

اسی لیے مجھے منصف نے غیر اہم جانا
کہ میرے ہاتھ میں فردِ گناہ کوئی نہیں

میں خاک پر کبھی اپنے قدم نہیں رکھتا
جہاں میں میرے سفر کا گواہ کوئی نہیں

محاذ چھوڑ کے بھاگا ہوا ہوں صدیوں کا
میں لفظِ عجز ہوں، میری سپاہ کوئی نہیں

بزعمِ خود جو نہ ہو رشکِ آسماں شہپر
"ادبِ جہان" میں ایسی کلاہ کوئی نہیں

غزلیں

اے۔ احمد

ضربِ کاری کا جنوں دل سے نکالا جائے
تارِ بیزار پہ یوں بار نہ ڈالا جائے

زخمہ زن جانتا ہے زیر و بمِ ساز کا راز
بار کن تاروں پہ ڈالا یا نہ ڈالا جائے

ساحلِ چشم پہ ہیں قلب و جگر کے موتی
قطرۂ آب انہیں کہہ کے نہ ٹالا جائے

ایک انساں کے سوا حاملِ بارِ الفت
ہے کوئی دہر میں جس سے یہ سنبھالا جائے

غمِ احباب ہی کیا کم ہے کہ احمد دل میں
کاہشِ گردشِ دوراں کو بھی پالا جائے

قاضی انصار

جانتا کوئی نہیں، پہچانتا کوئی نہیں!
آپ ہی کا شہر ہے پر آپ کا کوئی نہیں

فکرِ مستقبل کوئی ہے یا کوئی فکرِ معاش
مطمئن خوش فہمیوں میں سوچتا کوئی نہیں

جانے کتنی بار چونکا اپنی ہی آواز پر
یعنی گنبد کی صدا تھی دوسرا کوئی نہیں

دوستی پر جب اتر جائیں تو دیدیں کائنات
دشمنی ہو جائے تو پھر آپ سا کوئی نہیں

زندگی سارے لوازم سامنے موجود ہیں
بھوک، بیماری، غریبی مسئلہ کوئی نہیں

صاف گوئی پر مری انصار وہ برہم ہوئے
جرم تو ہے یہ یقیناً پر سزا کوئی نہیں

راجکمار چندن

آپ سے بچھڑا تو کچھ ایسا لگا
شاخ سے پتہ ہوں اک ٹوٹا ہوا

مجھ کو اپنی تیرگی پر ناز تھا
آسماں پر تھے ستارے بے بہا

میں ترے غم میں برابر تھا شریک
تو مرے غم میں تماشائی رہا

اپنے گھر کی سیڑھیاں ہیں کس قدر
ٹھیک سے ہم کو نہیں یہ بھی پتا

آگہی شہرت بڑھانے کے لئے
میں زمیں میں کس طرح گڑتا گیا

خواہشوں سے ہم ہیں چندن دور دور
ان سرابوں میں ہے کیا رکھا ہوا

٭ خواجہ عبد الرزاق

پیٹ کا سوال

گوئی گیارہ بارہ کا عالم تھا، جاڑوں کی رات
ـ شال سناٹے میں کسی رکشے کے چرچرانے کی آواز سنائی
۔ درگا جو شام سے ڈیوڑھی میں بیٹھی اپنے پتی کا انتظا
رہی تھی، آواز سن کر اس کے تیز کان اچانک کھڑے
ہوئے اور بنا پلک جھپکائے غور سے دیکھنے لگی۔ رکشا قریب
اس نے گہری تاریکی میں بھی اپنے پتی کو پہچان لیا۔ پدم
نشے میں دھت رکشے میں اوندھے منہ پڑا تھا۔ پتی
س حالت میں دیکھ کر درگا یکلخت دہل پڑی اور
ٹ پیٹ کر چیخنے لگی۔ پھر کسی غیر مرئی قوت سے اپنے
ن پر قابو پا کر اس نے پدم داس کو رکشے سے اتارا اور
دیتے ہوئے گھر کے اندر لے گئی، اور چارپائی پر لٹا دیا۔
کے ہاتھ پاؤں اور سر دھول مٹی میں اٹے ہوئے
۔ درگا کی نظر اچانک اس کی پھٹی ہوئی جیب پر پڑی
فوراً جیب ٹٹولنے لگی۔ قمیص کی جیب شاید دراست
ہیں کھینچا تانی میں پھٹ گئی تھی لیکن جب اس نے
ٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالا تو تنخواہ کا لفافہ پھٹا
پایا۔ لفافہ میں صرف پچپن روپے تیس پیسے تھے۔
میں اتنی قلیل رقم دیکھ کر وہ حواس باختہ ہو گئی
یسے ہی لفافہ موڑ کر اپنی کمر میں ٹھونس لیا۔ پھر گھر
ٹھنڈا پانی بالٹی میں بھر کر آنگن میں لائی۔ پدم داس
نے دونوں بازوؤں کا سہارا دے کر چارپائی
اٹھا لائی اور چوکی پر بٹھا کر اس کا سر اور ہاتھ پاؤں
طرح دھوئے۔ گندے کپڑے بدل کر اسے پھر
چارپائی پر لٹا دیا۔ اس وقفہ میں پدم داس کا ہوش
قدرے عود کر آیا۔ درگا نے دو روٹیاں اور چائے
لا کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ یوں تو وہ بھوکا تھا ہی،
انتہائی بے صبری سے کھانے پر ٹوٹ پڑا۔ کھانا کھا چکنے
کے بعد وہ چارپائی پر نیم دراز ہو کر بیڑی پینے لگا۔
غیر متوقع طور پر اس کی نظر زمین پر لیٹے بدن سوئے
ہوئے دونوں بچوں پر پڑی۔ معصوم بچے آدھا پیٹ کھا
کر سو چکے تھے۔ اس دوران درگا نے بھی روٹیوں کے
بچے کھچے ٹکڑوں کو زہر مار کر لیا۔ پھر کام سے فارغ
ہو کر وہ پدم داس کی چارپائی کے سرہانے آ کر بیٹھ گئی
پدم داس بدستور بیڑی پیئے جا رہا تھا۔ درگا نے
نہایت رقت بھری آواز میں کہا۔

"سنتے ہو ـــــ تمہاری تنخواہ کا لفافہ جیب
میں پھٹا ہوا تھا اور اس میں صرف پچپن روپے اور
کچھ پیسے تھے، باقی رقم کیا ہوئی؟"

پدم داس کی خمار آلود آنکھوں میں یکبارگی
چنگاریاں بھر گئیں، وہ گرج کر بولا "میں نے تجھے ہزار
بار کہا کہ میرے معاملہ میں تو کچھ نہ بول، لیکن تو نے کتے
کی دم کی طرح پھر ٹیڑھا سوال کیا ہے، منہ بند کر
ورنہ اس دن کی طرح پھر مار کھائے گی"

درگا نے دل کڑا کر کے پھر اسی لہجے میں کہا "ایسا
لگتا ہے کہ تم نے غصہ ہونے کی قسم کھائی ہے، میں جب
بھی کوئی بھی بات کہتی ہوں تو تم

یکدم بگڑا ٹھتے ہو۔ کبھی سیدھے منھ بات نہیں کرتے ہو۔ تمہیں تو کسی بات کی پرواہ نہیں، گھر پر نحوست کے جو گھنے بادل چھائے ہوئے ہیں۔ تمہیں کب دکھائی دیں گے، گھر میں اناج نہیں، بچے آدھا پیٹ کھا کر سو جاتے ہیں، ان کے بدن پر صحیح سلامت کپڑا بھی نہیں۔ ننگ منگوں سا دوپ بگاڑے گھومتے رہتے ہیں۔ اسکول جو جاتے تھے وہ بھی بند ہو گیا۔ پاس پڑوس سے مانگ کر گھر چلاتی پھروں، میں عورت ذات کہاں تک سنبھالوں، اب تو تمہاری کمائی کی کوئی آس نہیں رہی۔ ساری تنخواہ دوستوں کے ساتھ مل کر دارو میں پھونک دیتے ہو۔ بتاؤ اب ان چھپن روپوں سے کس دیوتا پر پھول چڑھاؤں۔ میں محنت مزدوری کر کے کہاں تک گھر کا خرچ چلاتی رہوں۔ اپنا پیٹ جلا کر، بچوں کا آدھا پیٹ کاٹ کر پہاڑ جیسی زندگی کے دن گزار رہی ہوں لیکن تمہیں ذرا اس کا احساس نہیں، اگر تم کسی عورت کو جھیل نہیں سکتے تھے تو شادی کیوں کی تھی، تنہا ملنگ دور بنے پھرتے رہتے۔"

پدم داس چندا ماما کی کہانی کی طرح درگا کی بپتا سنتے سنتے سو گیا۔ درگا نے اُسے بے سدھ سوتے دیکھا تو خود بھی چپ چاپ بچوں کے پاس جا کر زمین پر لیٹ گئی۔

پدم داس سات دن سے سرکاری اسپتال میں بیمار پڑا تھا۔ ایک دن اس نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ جا کر ایک قصبہ میں دیسی شراب پی لی تھی۔ اسی بات سے اس کو قے اور دست آنے لگے اور دو ہی دنوں میں حالت خراب ہو گئی۔ اس کی تشویشناک حالات کو دیکھ کر پڑوسیوں نے مل کر اسے اسپتال میں بھرتی کر دیا۔ سات دن بے ہوشی کے عالم میں گذر گئے۔ کوئی افاقہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اصل اس نے زہریلی شراب پی لی تھی اور شراب کا زہر اس کے تمام جسم میں سرایت کر گیا تھا اس لیے کوئی دوا موثر ثابت نہیں ہو رہی تھی۔ ڈاکٹروں نے اُسے بچانے کی جان توڑ کوششیں کیں۔ مگر وہ نہ بچ سکا۔ چودہ دن تک اسپتال کے بستر پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر آخر دم توڑ دیا۔

پدم داس کے مرنے کے بعد درگا اپنے پتی کے سوگ میں کچھ دن مرجھائی سی رہی لیکن بہت سوچ کر اس نے اپنے بچوں کی آئندہ زندگی کو سنوارنے کے لئے اپنے ٹوٹے دل کو بلند حوصلوں کا سہارا دیا۔ اب تک وہ دلدر کے جھکولے کھاتے کھاتے تنگ آ چکی تھی۔ کربناک ماحول میں گھٹ گھٹ کر سانس لے رہی تھی اور فکر و تردد کی دلدل میں اس کا وجود بے حس پتھر ہو گیا تھا لیکن اب شکست خوردہ کا تمام گرد و غبار اس کے طوفانی حوصلوں کی زد میں آ گیا۔ آخرکار اُسے سماج کے اندھے اصولوں اور روایات کی کھوکھلی دیواروں کو گرا کر اپنی ایک زندگی بنانے کی خاطر میدانِ عمل میں آنا پڑا۔

درگا اپنے چھوٹے کنبہ کی اب تنہا ذمہ دار تھی۔ بچوں کی دیکھ بھال کے علاوہ گھر کی خستہ حالی اس کی اکیلی جان کے لئے بے شمار مسائل پیدا کر رہے تھے، بلاشبہ درگا ایک سلیقہ مند اور سمجھدار عورت تھی۔ وہ گھر کے اخراجات سے نمٹنے کے لئے پتی کی زندگی میں بھی اُپلے بنا کر فروخت کرتی تھی اب اس نے پاس پڑوس سے پرانے اخبار لا کر لفافے بنا کر دکانداروں کو سپلائی کرنا شروع کر دیا۔ بچے بھی

میں بڑے چاؤ سے اس کا ہاتھ بٹانے لگے۔

ایک دن درگا پرانے اخبار لانے کے ارادے سے میجر سلطان سنگھ کے بنگلے پر گئی۔ میجر سلطان سنگھ ملیٹری ریٹائرڈ آفیسر تھے۔ وہ جمشید پور میں چار سال سے اسٹیل فیکٹری میں ایک آفیسر کے عہدے پر فائز تھے۔ درگا جب بنگلے کے دالان میں داخل ہوئی تو دیکھا ان کی ماتاجی برآمدے میں آرام کرسی پر بیٹھی کوئی کتاب پڑھ رہی تھیں۔ درگا کو سامنے دیکھ کر ان کے سنجیدہ چہرے پر قدرے تاسف کے سائے بکھر گئے۔ درگا انہیں سلام کرکے نیچے بیٹھ گئی اور اس کی آنکھوں میں یکلخت آنسو امنڈ آئے۔

ماتاجی نے اس کی دلجوئی کرتے ہوئے کہا "مت رو درگا، بھگوان تیری تکلیف دور کریں گے، بتا کیسے چلی آئی۔ بچے کیسے ہیں تیرے؟"

درگا اپنی ساڑی کے پلو سے آنکھیں پونچھتے ہوئے بولی۔ "ماتاجی اپنی بپتا آپ سے کیا بتاؤں، جانے والا تو ہمیں دنیا میں اکیلا چھوڑ کر چلا گیا اور میں دکھی ہو گئی لیکن اب ان معصوم بچوں کے لئے در در کے دھکے کھانا پڑتے ہیں، دن بھر کام کرتے کرتے بدن کا جوڑ جوڑ ٹوٹ جاتا ہے۔ بھگوان کا شکر ہے اس کی مہربانی سے چار پیسے کما لیتی ہوں۔ ابھی کچھ دنوں سے بڑے لڑکے کو ایک سائیکل دکان میں کام سے لگا دیا ہے۔ وہ بھی کچھ پیسے لے آتا ہے۔ اب تنگ دستی زیادہ محسوس نہیں ہوتی۔ کمپنی کے کوارٹر میں رہتی ہوں۔ گھر کی کوئی تکلیف نہیں ہے میجر [illegible] نے مشورہ دیا تھا [illegible] کہ [illegible] سے میں سلیمان وکیل کے ذریعہ پتی کی کمپنی کے [illegible] ملازمت کی درخواست بھیج دی ہے۔ درخواست میں لکھا ہے کہ پتی کے مرنے کے بعد اب میرا اور میرے معصوم بچوں کا کوئی سہارا نہیں ہے، اپنی بیوگی کی حالت میں کافی پریشان ہوں۔ میرا کوئی ذریعۂ معاش نہیں ہے۔ اپنے سورگ باشی پتی پدم داس کے بدلے مجھے کام دیا جائے۔ سلیمان وکیل نے امید دلائی ہے کہ بھگوان نے چاہا تو میرا کام ضرور ہو جائے گا۔ بس میرے یتیم بچوں کے لئے آپ لوگ بھی دعا کیجئے، اگر میں کام سے لگ گئی تو نزدیک جا کر بھگوان کی پوجا کروں گی۔ آپ یقین جانئے ماتاجی سلیمان وکیل بڑے نیک اور رحمدل آدمی ہیں۔ بیچارے نے میرے لئے اب تک بہت سارے کام کر دئے لیکن ایک پیسہ نہیں لیا۔ اسی لئے میں نے بھی ان کے کام کر دئے لیکن ایک پیسہ نہیں لیا، اسی لئے میں نے بھی ان کے کہنے پر بال بچوں والے ایک مسلمان آدمی کو اپنا ایک کمرہ کرائے پر دے دیا۔ اس سے دو سو روپے ایڈوانس لے کر چھوٹے لڑکے کے لئے ایک پان کی دکان لگا دی ہے۔ لڑکا زیادہ ہوشیار نہیں ہے اس لئے [illegible] بیٹھنا پڑتا ہے۔ [illegible] دکان اچھی [illegible] ہے۔"

اتنے میں موٹر کی آواز سنائی پڑی۔ ماتاجی نے فوراً کہا:

"میجر صاحب آ گئے۔"

میجر صاحب درگا کو دیکھتے ہوئے کمرے کے اندر چلے گئے۔ درگا ان کو دیکھ کر سٹپٹا گئی اور گھبراہٹ کے عالم میں ہچکچاتے ہوئے بولی "کتنے بجے ماتاجی—؟"

"پانچ بج گئے۔"

"ہائے رام، میں آئی تھی کس کام کے لئے مگر باتوں ہی میں کافی وقت گنوا دیا۔"

ماتاجی نے سنجیدگی سے پوچھا "کس کام کے لئے آئی تھی؟"

"میں آپ سے پرانے اخبار لینے آئی تھی۔ جتنے بھی اخبار آپ کے پاس بیکار ہیں، وزن کر کے دے دیجئے، میں خرید لوں گی۔ آپ جانتی ہیں۔ میں اپلے بنا کر بیچتی ہوں اور اب اخباری کاغذ سے تھونگے بھی بنا کر بیچنے لگی ہوں، کیا کروں پیٹ کا سوال ہے۔ کچھ نہ کچھ کرنا ہی پڑتا ہے۔"

اتنے میں ماتاجی نے نوکرانی کو آواز دی۔ نوکرانی آئی تو انھوں نے کہا "بڑی میز کے نیچے پرانے اخبار ہیں سب اٹھا لاؤ۔"

نوکرانی فوراً آ گئی اور ایک ٹوکرے میں ڈھیرے اخبار اٹھا لائی۔ ماتاجی نے اخبار کا ٹوکرا درگا کی طرف ذرا کھسکاتے ہوئے کہا:

"اسے لے جاؤ اور ٹوکرا خالی کر کے واپس کر دو، اور پیسے جو مناسب ہوں نوکرانی کو دے دینا۔"

درگا حیرت و استعجاب سے ماتاجی کا منہ تکنے لگی، اسکے نرم دم ہونٹ کچھ کہنے کو کپکپائے لیکن بار احسان سے وہ کچھ نہ کہہ سکی، پھر سنبھل کر اخبار کا ٹوکرا اٹھایا اور تشکر آمیز نظروں سے انہیں دیکھتے ہوئے بوجھل قدموں آہستہ آہستہ چلی گئی۔

نسیم ستر کھی

سوکھے پتے

اس کا گھر ایک اوسط درجہ درجہ کا گھر تھا گھر کے عین بیچ ایک لمبا چوڑا صحن تھا جس پر سیمنٹ کا پختہ فرش بنا ہوا تھا۔ صحن کی دیواریں چونے کی سفیدی سے ہر وقت چمکتی رہتی تھیں۔ جب وہ شخص اپنے بیوی بچوں کے ساتھ صحن میں بیٹھتا تو وہ سب کے سب بہت خوش ہوتے اکثر پڑوس کی عورتیں بھی اس کے کھلے صحن میں آکر بیٹھتیں تو ان کو بھی خوشی حاصل ہوتی کیونکہ ان کے گھروں کے صحن چھوٹے تھے یا پھر بہتوں کے گھر میں صحن ہی نہیں تھا۔

ایک دن اس شخص کو بیٹھے بیٹھے نہ جانے کیا سوجھی کہ صبح سویرے اس نے پھاوڑا اٹھا کر صحن کھودنا شروع کر دیا۔ شام تک پورے صحن میں سیمنٹ کے ٹکڑے ہی ٹکڑے پھیل گئے۔ جب وہ بنا بنایا صحن کھود رہا تھا تو اس کے بیوی بچے خاموش کھڑے ایک کونے میں یہ تماشا دیکھ رہے تھے ان کے چہروں پر اداسی تھی لیکن اس کا اظہار نہیں کر پاتے تھے۔ اب پورا صحن کچی مٹی کا ہو گیا تھا۔ اس نے پورے صحن کی مٹی برابر کی اس میں دو تین دن تک پانی ڈالتا رہا جب مٹی میں نمی آ گئی تو اس نے صحن کے بیچ بیچ ایک چھوٹا سا پودا لگا دیا اس پودے میں وہ روزانہ پانی ضرور دیتا وقتاً فوقتاً کھاد بھی ڈالتا رہا کچھ عرصے کے بعد پودا کافی بڑا ہو گیا چاروں طرف اس کی شاخیں پھیلنے لگیں ایک عرصہ دراز کے بعد وہ ایک ایسا گھنیان درخت بن گیا تھا جس کی جڑیں پورے صحن میں پھیل گئیں، موٹی موٹی شاخوں نے آگے بڑھ کر دیوار پر قبضہ کر لیا دیواروں کی چمک دمک ختم ہو چکی تھی۔ کیونکہ بہت سے پرندوں نے اس درخت پر اپنا بسیرا بنا لیا تھا۔ پرندوں کے پروں اور ان کی غلاظت سے صحن اور دیواروں کی صفائی ستھرائی میں فرق آ گیا تھا۔ یہ درخت تمام گھر والوں کے لئے بے سود تھا اس لئے کہ اس میں نہ تو کوئی پھل آتا تھا اور نہ ہی اس کی لکڑی کسی کام آ سکتی تھی اس کے برعکس پورے آنگن میں پتے ہی پتے ہر وقت پھیلے رہتے۔ پتے ہوا سے اڑ اڑ کر کمروں کی گندگی میں اضافہ کر رہے تھے۔

ایک دن جھاڑو دیتے ہوئے اس کی بیوی نے کہا۔

”اچھے بھلے صحن کو خراب کر دیا۔ جس کونے میں دیکھو پتوں کا ڈھیر لگا ہے“۔

”ابا۔ یہ سوکھے پتے کس کام کے ہو سکتے ہیں“۔ بیٹی نے آہستہ سے کہا۔

”آپ ان پتوں کو بڑے غور سے دیکھا کرتے ہیں“ بیٹے نے دریافت کیا۔

”پڑوسن کہہ رہی تھیں کہ کیا تمہارے ابا کا دماغ خراب ہو گیا ہے جو وہ ہر وقت سوکھے پتوں کو دیکھا کرتے ہیں“ بیٹے نے دریافت کیا۔

ان سب کی باتیں سن کر وہ کچھ دیر خاموش رہا۔ پھر اس نے کہنا شروع کیا۔ تم لوگ ان باتوں کو نہیں سمجھ

سکتے کیونکہ تمہاری تعلیم محدود ہے اور اسی کے تحت تمہاری سوچ بھی ہے۔ تمہارے اطراف میں جو لوگ رہتے ہیں ان کی بھی سوچ ایک عام انسان کی سوچ ہے۔ تمہیں شاید یہ نہیں معلوم کہ ان سوکھے پتوں کی لکیروں میں کچھ چھپا ہوا ہے۔ مجھے اعتراف ہے کہ ان لکیروں کو پڑھنے والوں کی تعداد ہر عہد میں بہت قلیل ہوتی ہے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ ان پتوں کو جلا کر اپنا کھانا تیار کر لیتے ہو تمہارا پیٹ یقیناً بھر جاتا ہے۔ لیکن ایک ایسی خلش باقی رہتی ہے جو تمہیں تسکین کے بجائے آئے دن پریشانیوں میں مبتلا کر دیتی ہے۔ ان پتوں کی تاریخ بہت قدیم ہے۔ کہتے ہیں کہ آج سے ہزاروں سال پہلے ان پتوں پر لکیریں کھینچی گئی تھیں۔ پھر جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا انسانوں نے ان لکیروں کو پڑھنا اور سمجھنا شروع کیا اور پھر انسان کو اطمینان حاصل ہوتا گیا۔ اگر ذہنی تسکین چاہتے ہو تو ان سوکھے پتوں کی حفاظت کرو ان کی لکیروں کو پڑھنے کی کوشش کرو۔

اس شخص کی باتیں سن کر وہ سب کے سب بےساختہ ہنسنے لگے۔ اب ان بچوں اور بیوی کو مکمل طور پر یقین ہو گیا تھا کہ ہمارا باپ اور ہمارا شوہر بہکی بہکی باتیں کرنے لگا ہے جس کا کوئی سر پیر نہیں ہوتا انہیں آئے دن پڑوسنوں سے طعنے سننے کو ملتے تھے۔ اکثر وہ یوں کہتیں کہ بہن تمہاری تقدیر پھوٹ گئی۔ تمہارے میاں عجیب سنکی ہیں اچھے بھلے گھر کو کوڑا کرکٹ کا ڈھیر بنا کر رکھ دیا۔ اب جب دیکھو اس کے پتوں کو بٹورتے رہتے ہیں۔

پھر یوں ہوا کہ کچھ عرصہ بعد وہ شخص مر گیا۔ اس کے گھر میں اس کے عزیز و اقارب اور دوست جمع ہوئے اس کے گھر کی صفائی کی گئی۔ نہ کوئی بینک کا اکاؤنٹ نہ ہی نقد روپیہ پیسہ۔ بلکہ جگہ جگہ کپڑے کی پوٹلیوں میں سوکھے پتے تہہ بہ تہہ بڑے سلیقے سے گڈیاں بنا کر رکھے گئے تھے۔ اب جو لوگ وہاں جمع ہوئے تھے ان میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی وہ آپس میں اس طرح باتیں کر رہے تھے۔

"ان پتوں کو جلا دینا چاہیئے" ایک آواز

"نہیں ان سب کو جمع کر کے دریا میں بہا دیا جائے۔" دوسری آواز

"نہیں نہیں ایسا نہیں کرنا چاہیئے جو کچھ ہے اسے قائم رکھا جائے۔" تیسری آواز

چوتھے شخص نے آگے بڑھ کر کہنا شروع کیا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک ایسا شخص جو بہت سا اثاثہ چھوڑ کر مرتا ہے۔ اس کے ورثا میں اس کی تقسیم بڑی آسانی سے ہو جاتی ہے خواہ ورثا کو ایک مدت انتظار کرنا پڑے مگر نتیجہ ضرور برآمد ہوتا ہے اور مسئلہ کا حل نکل آتا ہے۔ یہاں پر مجھے حیرت اس بات کی ہے کہ مرنے والے نے نہایت ہی حقیر اور بے مصرف اثاثہ چھوڑا ہے جس کا ہم سب فیصلہ نہیں کر پاتے کہ اسے کیا کیا جائے۔؟

"یہ سن کر وہ سب کے سب چپ ہو گئے اور سر جھکائے اپنے گھروں کو واپس ہو لئے۔"

ز الدین عارفی

تاریک راہوں کے ہمسفر

شہلا سے میری پہلی ملاقات اس وقت ہوئی
ں جب دفتر جاتے ہوئے ایک روز راستے میں اچانک
اری بس ایک جگہ خراب ہو گئی تھی۔ گرمی کا موسم
ا۔ اور اس روز شاید کچھ زیادہ ہی گرمی تھی بس
تمام مسافر گرمی کی زیادتی کی وجہ سے پریشان ہو رہے
لیکن ہر آدمی اپنی سیٹ پر ہی بیٹھا تھا، کوئی اپنی
نہیں چھوڑ رہا تھا۔ شاید اس لئے کہ باہر تیز دھوپ
ے اور جسم کو جھلسا دینے والی گرم ہوائیں چل رہی تھیں
ے اندر بھی بس سے باہر نکلنے کی ہمت نہیں پیدا ہو رہی
لیکن میں اپنے دل پر جبر کر کے اپنی سیٹ سے اٹھا
بس سے نیچے اتر کر کسی دوسری گاڑی کا انتظار
نے لگا تھا اس لئے کہ مجھے اپنے دفتر پہنچنے کی اس
کچھ جلدی تھی۔ چند ہی لمحے کے انتظار کے بعد ایک
سری بس آ گئی تھی اور میں اس کی جانب لپکا تھا
ہ مجھ سے پہلے ایک محترمہ اس خراب بس سے بھاگتی
ں آ کر دوسری بس میں داخل ہو گئیں اور مجھے ان
بعد ہی بس میں سوار ہونے کا موقع مل سکا تھا۔
یں فوراً چل پڑی تھی اور اسے اتفاق کہئے کہ ہم دونو
ک ہی سیٹ پر جگہ ملی تھی ——— بس تیزی سے
مار کی سڑکوں پر دوڑ رہی تھی، سامنے مناظر کو پیچھے
تی ہوئی۔ تب کچھ دیر کے بعد جب مجھے قدرے
ن کا احساس ہوا تھا تو میں نے اپنے پاس بیٹھی
ہوئی اس عورت پر ایک بھرپور نگاہ ڈالی تھی جو اب کسی میگزین کی ورق گردانی میں محو تھی۔ مجھے گھورتا ہوا محسوس کر کے اس نے بھی میگزین سے اپنی نگاہیں اوپر اٹھائیں تھیں اور تا دیر مجھے عجیب سی نگاہوں سے دیکھتی رہی تھی۔ اف اس کی آنکھیں تھیں یا دو جلتے ہوئے چراغ۔ میں تو پسینے پسینے ہو گیا تھا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کی آنکھوں کے دو سلگتے ہوئے انگارے میرے سارے وجود کو پل بھر میں پگھلا کر رکھ دیں گے۔ اور واقعی میں بالکل موم کی مانند پگھل چکا تھا۔ اس کی آنکھوں کے چراغ جلتے رہے اور میرا وجود پگھلتا رہا۔

شہلا میری زندگی میں داخل ہونے والی پہلی عورت تھی جس نے مجھے متاثر کیا تھا اور مجھے محسوس ہوا تھا جیسے شہلا کوئی انجان عورت نہیں بلکہ میرے وجود کا ایک حصہ ہو۔ اس کے لئے اپنے دل میں اپنا پن کا ایک نامعلوم سا جذبہ پا کر خود مجھے بے حد حیرت ہوئی تھی اور میں سخت تذبذب میں مبتلا تھا کہ آخر میرے دل کی یہ کیفیت کیوں ہوئی تھی ......

لیکن ایک کشش تھی جو مجھے ہر لمحہ اپنی طرف کھینچ رہی تھی اور میں ایک تنکے کی طرح کسی تیز دھارے میں بہتا چلا جا رہا تھا۔ میں بہتا گیا اور بہت دور نکل گیا۔ اور شہلا سے میری یہ پہلی ملاقات میری زندگی

کے سفر میں ایک ایسا موڑ ثابت ہوئی تھی جس نے مجھے میری منزل کا پتہ دے دیا تھا۔

میری طرح شہلا بھی ایک شادی شدہ عورت ہے، وہ ایک بچے کی ماں ہے سہاگ کی امانت ہے۔ کسی کی امیدوں اور آرزوؤں کی دلہن ہے۔۔۔۔۔۔

اور شہلا میری زندگی میں مرکزیت کا درجہ حاصل کرنے والی وہ عورت بھی ہے۔ جو اب میرے لئے سب کچھ ہے۔۔۔۔۔۔ لیکن خود شہلا کے دل میں میرے لئے کوئی جگہ ہے یا نہیں، اس کی زندگی کے کسی لمحے پر میرا کوئی ادعا ہے یا نہیں یہ بات آج تک میں کبھی نہیں جان سکا۔

پھر سوال یہ بھی ہے کہ شہلا کے دل میں اپنے لئے محبت اور پیار کے جذبوں کی تلاش و جستجو کا مجھے حق ہی کیا حاصل ہے؟ کبھی کبھی تو مجھے اپنے وجود سے نفرت ہونے لگتی ہے یہ احساس کر کے میں شہلا کی خوشیوں سے بھری زندگی میں غم کی تیز دھوپ بن کر بھلا کیوں داخل ہوا۔۔۔۔۔۔؟ کیوں آج اس کے سکھ کا کانٹا بن رہا ہوں۔ اس سے اس کی خوشیاں چھیننے کا مجھے کیا حق حاصل ہے۔۔۔۔۔۔؟؟

دل میں ایک خیال پیدا ہوتا ہے کہ میں شہلا سے ملنا جلنا بالکل ترک کر دوں، اس لئے کہ اس میں اس کی بھلائی ہے اور اس کی بھلائی کے لئے اگر مجھے اپنے جذبات و احساسات کو کچلنا بھی پڑے تب مجھے ایسا ہی کرنا چاہئے۔ یوں بھی محبت کے بارے میں میرا اپنا نظریہ ذرا عام تصور سے مختلف ہے۔ عام طور پر لوگ محبت کی تکمیل اپنے محبوب کو اپنے ذاتی قبضے میں لے لینے میں ہی سمجھتے ہیں۔ لیکن میرے خیال میں عاشق کا یہ جذبہ در اصل معشوق کی کو اپنے قبضے و قدرت میں لانے کا نام نہیں ہے۔ بلکہ اس کی شخصیت اس کے جذبات اور اس کے کردار کی سالمیت کے مکمل احترام کا نام ہے۔ چناں چہ مجھے شہلا کے لئے ہر قربانی دینے کے لئے ہمیشہ آمادہ رہنا چاہئے۔

اور میں فیصلہ کر لیتا ہوں کہ شہلا سے نہیں ملوں گا۔۔۔۔۔۔ پھر کئی کئی روز تک اس سے میری ملاقات نہیں ہوتی ہے، لیکن شہلا میری نظروں سے دور رہ کر بھی میرے دل کے بالکل نزدیک رہتی ہے، اس کا خیال، اس کا تصور کوشش کے باوجود میں اپنے دل کے نہاں خانے سے نکالنے میں بالکل ناکام ثابت ہوتا ہوں۔ اکثر ہی ایسا ہوتا ہے کہ میں شہلا کے لئے آنسوؤں کی سوغات لٹاتا ہوا ساری ساری رات بستر پر کروٹیں بدلتا ہوا گزار دیتا ہوں۔ تصور میں اس سے باتیں کرتا ہوں اور رات کی تنہائی میں اسے لمبے لمبے خطوط لکھتا ہوں اور پھر صبح ہونے سے پہلے ہی انہیں ضائع کر دیتا ہوں۔

میری بیوی میرے بدلے ہوئے حالات سے اچھی طرح واقف ہے۔ وہ یہ جان چکی ہے کہ میں ہر لمحہ کسی کے لئے سلگتا رہتا ہوں۔ کسی کی یادوں کو گلے لگا کر پہروں روتا اور سسکتا ہوں۔ کبھی کبھی تو وہ مجھ سے پوچھ بھی بیٹھتی ہے۔۔۔۔۔

"آخر آج کل آپ کو کیا ہو گیا ہے؟ ہمیشہ فکر مند رہتے ہیں، نہ وقت سے کھانا، نہ سونا، ایسی بے ترتیب زندگی کب تک گزاریں گے آپ۔۔۔ آپ کی سرخ آنکھیں دیکھ کر مجھے تو اب ڈر لگنے لگا ہے۔ کبھی ان آنکھوں کی ٹھنڈی چھاؤں میں مجھے اپنی زندگی محفوظ محسوس ہوتی تھی میں ایک سکون کا احساس کرتی تھی لیکن اب تو آنکھوں کو دیکھ کر دہشت ہوتی ہے۔ خدارا مجھے بھی

کچھ بتائیے۔ اتنا غیر کیوں سمجھتے ہیں مجھے۔ دل کی باتیں اگر دل ہی میں رکھی جائیں تو دل کا بوجھ بہت بڑھ جاتا ہے۔ میں آپ کے دکھ سکھ کی ساتھی ہوں پھر کیوں نہ آپ مجھ سے اپنے دل کی باتیں کہہ کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر لیتے ہیں؟"

اور پھر وہ رونے لگتی ہے۔ بہت روتی ہے۔ جیسے اپنے آنسوؤں کے طوفان میں ساری دنیا کو بہا دے گی۔ اور میں اس کی باتیں سن کر اور بھی پاگل ہو جاتا ہوں مجھے یاد آتا ہے کہ ایک روز اپنے دل کے اس بوجھ کو ہلکا کرنے کے لئے تو میں نے شہلا سے پہلی مرتبہ اپنی محبت کا اظہار کیا تھا، میں نے اس سے کہا تھا۔

"شہلا! میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔"

وہ کچھ دیر تک نہ جانے کیا سوچتی رہی پھر بولی تھی۔

"کہیے کیا کہنا چاہتے ہیں؟"

"شہلا ایسا ہے کہ ......؟"

میری آواز حلق میں اٹک رہی تھی۔

"کہیے نا میں سن رہی ہوں۔"

"شہلا میں تمہیں اپنے دل کی اتھاہ گہرائیوں سے چاہتا ہوں، بہت پیار کرتا ہوں تم سے، تمہارے بغیر شاید اب میں زندہ نہیں رہ سکتا......"

میں نے بمشکل یہ چند جملے اس کے گوش گزار کئے تھے، میری باتیں سن کر اچانک وہ بہت سنجیدہ ہو گئی تھی۔ اس نے اپنی آنکھیں اٹھا کر میری جانب دیکھا تھا اور کچھ دیر تک بڑی عجیب سی نگاہوں سے مجھے گھورتی رہی تھی۔ اسکی آنکھوں کے سمندر میں جذبات کا ایک طوفان امنڈ رہا تھا۔ شاید وہ بہت کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن حالات نے اسکے لبوں پر پہرے لگا دیے تھے۔ میں جانتا تھا کہ وہ کیا کہنا چاہتی ہے اور اسکی مجبوریاں بھی مجھے معلوم تھیں۔ پھر بھی اسکی زبان سے میں کچھ سننا چاہتا تھا۔ شہلا رو رہی تھی اور اس کو روتا ہوا دیکھ کر مجھے محسوس ہو رہا تھا جیسے ساری کائنات رو رہی ہو۔

"شہلا! کچھ بھی تو کہو...... کچھ کہنے سننے سے دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے......"

اور میری زبان سے یہ چند الفاظ سن کر وہ بالکل پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا ایک سیلاب سا امنڈ رہا تھا اور ان آنکھوں سے ٹپکتا ہوا آنسوؤں کا ایک ایک قطرہ جیسے چیخ چیخ کر مجھ سے اپنی بے بسی کی داستان کہہ رہا تھا۔

اور آج اپنی بیوی کی زبان سے یہ سن کر کہ کچھ کہنے سننے سے دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے میں اپنے دل پر ایک بھاری بوجھ محسوس کر رہا ہوں۔ دل میں ایک خیال آتا ہے کہ اپنی بیوی کو ساری باتیں بتا دوں اس سے یہ کہہ دوں کہ وہ اب میری فکر چھوڑ دے، اس لئے کہ مجھے تو اب ایک ایسا روگ لگ گیا ہے جو لاعلاج ہے اور اب تو مجھے عمر بھر کسی کی یادوں کو گلے لگا کر رونے، سسکنے اور تڑپتے ہی رہنا ہے۔ لیکن میں ایسا نہیں کر سکتا۔

میری بیوی میرے سامنے نگاہیں جھکائے کھڑی ہے اور اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کے ننھے روشن ہیں۔ جو شاید میری زندگی کی تاریکیوں کو اجالے میں بدل دینا چاہتے ہیں۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ مجھے کبھی اپنی بیوی کی ذات میں پیار و نسائیت کی وہ خوشبو ہی نہیں محسوس ہوئی ہے جس کی تلاش و جستجو میں آج تک میں بھٹک رہا ہوں۔

تاریخ کی ابجد

• مستند تاریخیں	ا ———	اردو	باوجود کاغذ کی گرانی کے
• نقشہ لاہور وغیرہ	ب ———	بخشی	وہی فی جلد ۲۵ پیسے فی سیکڑہ
• برسات کے نکچھتر	ج ———	جنتری	۲۰ روپے فی ہزار
• اور دیگر دلچسپ مضامین	د ———	دیکھئے	(محصول خریدار)

جوئے رنگ و روپ کے ساتھ شائع ہوگئی ہے۔

تاجران کتب کو چاہئے کہ پیشگی رقم کے ساتھ اپنی فرمائش نوٹ کرادیں۔ نوٹ نمونہ کے لئے ایک روپے کا ڈاک ٹکٹ بھیجئے

اسٹاکسٹ

پٹنہ — سبزی باغ پرویز بک ڈپو، کتاب منزل، بک امپوریم، آفتاب بک ڈپو

مظفر پور — معین الحق بک سیلر، شمع بک اسٹال اسٹیشن روڈ، محمد کریم بخش بک سیلر کمپنی باغ، عبدالحق دفتری

دربھنگہ — ظہیر الدین ملی کشکول بازار، مکتبہ اسلامی لہریا سرائے۔

سمستی پور — مدنی لکھیپتی اسٹور، سمی بک ڈپو، اسٹیشن روڈ، مولوی عبدالوہاب قاسمی مدھے پور

سیتامڑھی — محمد توفیق بک سیلر، چوک بازار، وارثی اسٹور، محمد رفیق ڈسول چکلہ، اقبال سینٹر

سیوان — نظام الدین بک سیلر چوک بازار، وارثی اسٹور، مدرسہ اسلامیہ اصابنیہ گوپال گنج

گیا — ظفر بک ڈپو، فضل بک ڈپو جی بی روڈ، اسعد بک ڈپو گھیار ٹولہ، حنفیہ بک سینٹر اورنگ آباد

چمپارن — بک امپوریم بتیا، شیام ساہتیہ سدن سکٹی، یونیورسل بک ڈپو بتیا، محمد اکرام بک سیلر چوگیا
عبدالرحمٰن بک سیلر رکسول، دینی کتاب گھر رام نگر

آرہ — ضیاء الحسن حاجی شرف الدین چوک، سوداگر سنگھ ہمیا بھوجپور

بیگوسرائے — کتابستان، شمیم کتب خانہ لہرا۔ ویشالی نیشنل بک ڈپو، حاجی پور

کٹیہار — اپنا کتاب گھر کٹیہار، جنرل کتاب گھر ایم جی روڈ کٹیہار

پورنیہ — کپور چند ساہا۔ بیسپر کارنر، ارریہ کورٹ، محمد اسماعیل اشرفی جوگینی

کشن گنج — صادق کتاب گھر، رضوان بک ڈپو، جیوتشی پستک بھون، شمشی بک ڈپو

بھاگل پور — مسعودیہ پستک بھنڈار سہنولا چوک، اسلامیہ بک ڈپو، کمالیہ بک ڈپو، تاتار پور

ایس اے بی بخشی کمپنی ۳۲ مولانا شوکت علی (کولوٹولہ) اسٹریٹ کلکتہ ۷۳

نئی کتابوں کا تعارف

ڈاکٹر علیم اللہ حالی
اکبر محفوظ عالم

نام کتاب :	ازبر
مصنف :	بلراج حیرت
صنف :	شاعری
ضخامت :	۱۴۴ صفحات
قیمت :	۳۰ روپے
پتہ :	بی ۲۹۲/۱، ساؤتھ موتی باغ (نانک پورہ) نئی دہلی ۱۱۰۰۲۱

بلراج حیرت کا یہ حسین وجمیل شعری مجموعہ اپنے معیار طباعت اور شاندار گٹ اپ کی وجہ سے پہلی نظر ہی اپنی طرف کھینچتا ہے، اس خوبصورت پیش کش کے لئے جگدیش چندر رنوز اور رام پرکاش راہی کو مبارکباد دینی چاہئے جنہوں نے اس مجموعہ کی ترتیب و تزئین کا کام انجام دیا ہے۔ بلراج حیرت چاہتے تو اپنے اس مجموعہ پر بطور پیش لفظ کئی مشاہیر ادب سے لکھوا سکتے تھے مگر انھوں نے اس فرسودہ روایت کے خلاف اپنی شاعری کے بارے میں خود لکھ کر قاری کو بلا واسطہ قریب کرنا چاہا ہے۔ حیرت آزاد فضا میں شاعری کرنے کے قائل ہیں COMMIKT MENT وہ تخلیق فن کے لئے زہر سمجھتے ہیں۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

"میری دانست میں تخلیق شعر ذاتی شاعر، و جذبات و آگہی کی مرہون ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ احساسات و محسوسات سماجی تنظیم اور ماحول سے تو متاثر ہوتے ہیں لیکن انہیں کسی ادبی تحریک کا تابع کرنا ان کا گلا گھونٹنے جیسا ہے۔"

ان کے اس نقطۂ نظر کی عکاسی ان کے کلام میں بھی نظر آتی ہے۔ ان کی شاعری کا INW AR DNESS اظہار و بیان اور فکر و احساس کے اعتبار سے انہیں نئی فضاؤں کی طرف لے جاتا ہے۔ شاعری کو وہ خود کلامی کا درجہ دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں ایک مخصوص انداز کی محویت کا اندازہ ہوتا ہے، ایک جگہ فرماتے ہیں۔

میں خود سے محو تکلم تھا اپنے مجانہ
مجھے خبر نہ تھی دنیا بھی سن رہی ہوگی

حیرت صاحب کو اس پر حیرت نہیں ہونی چاہئے کہ شاعری حدیث دیگراں بھی بن جاتی ہے اور جو شاعری فنکار کی ذات سے باہر نکل کر جس قدر دوسروں کی کہانی بننے کی صلاحیت رکھتی ہے وہ اس قدر کامیاب ہوتی ہے۔

بلراج حیرت نئے محسوسات کو خوبصورتی سے پیش کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ عہد نو کے مسائل و مصائب حیرت کے یہاں منفرد رنگ میں نظر آتے ہیں، آج کی نامرادی و محرومی حیرت کے کلام میں ایک ناتمام کرب کی علامت کے طور پر ابھرتی ہے ایک جگہ کہتے ہیں:

ے

ہماری سرشت ایک پیاسی نظر
ہمارا مقدر سفر در سفر

سادگی اور پختگی جرت کے کلام کی دوسری اہم خصوصیت ہے۔ وہ غم کی شدتوں میں بھی اپنی غیر معمولی برداشت کا ثبوت دیتے ہیں۔ درد کی شدت اور برداشت کی کوشش نے مل کر ان کے کلام میں ایک خوب صورت تہداری پیدا کر دی ہے۔ اظہار غم کہیں کہیں ان کے یہاں ایک عام بیان کی طرح سامنے آتا ہے لیکن اس بیان کی تہ میں اتر کر قاری کو ان کے رنج بے پایاں کا پتہ چلتا ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار کی بیانیہ سادگی اور پھر ان کے دروں میں پوشیدہ کرب کا انداز بلراج جرت کے کلام کی تفہیم میں آسانی پیدا کرتی ہے۔

کتنے مایوس مجھے دیکھ کے ہیں
لوگ جیسے کہ تماشا ہوں میں
اور بے حال نہ ہو جاؤں کہیں
مجھ سے مت پوچھئے کیسا ہوں میں

بڑی مدت سے مجھ میں ایک ایسا شخص رہتا ہے
جو میرے نام سے کرتا ہوا فسانے بیان اپنے

مجھ میں پوشیدہ کوئی ہے وہ جسے
اتنا عرصہ ہو دم نے جھتا
میں کس بستی میں آ کر بس گیا ہوں
مری جانب عسرت کیسا غلط ہے

بلراج جرت غیر منا عامہ انداز میں جذ
گہرائیوں کو شعر کے پیکر میں اتارنے کی صلاحیت
ہیں۔ غزل جیسی پیش پا افتادہ صنف میں یا
روش ان کی تخلیقیت کی علامت ہے۔ از برا
نظمیں بھی ہیں لیکن یہ غزلوں کے مقابلہ میں غیر ا

علیم اللہ حالی

نام کتاب : سمندر پھر بلاتا ہے
مصنف : عرفی آفاقی
صنف : شاعری
ضخامت : ۱۹۲ صفحات
قیمت : بیس روپے
پتہ : مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر نئی د ۲۵

عرفی آفاقی نے اپنے اس مجموعۂ کلام میں کسی
دوسرے سے تعارف لکھانے کی بجائے ابتدا
کتاب میں خود اپنا منظوم تعارف پیش کیا
اس میں انھوں نے اپنے رنگ سخن پر بھی روشنی
ہے اور ایک جگہ کہا ہے کہ

گل چشم و چراغ صحرا ہوں
میں نہیں زیب و زینت دشت

لیکن یہ تعارف انکسار محض ہے، آفاقی
شاعری گل صحرا نہیں بلکہ حقیقتاً دستار کی زیب
و زینت بننے کے لائق ہے۔ ان کا ضخیم مجموعہ
آفاقی کی شاعری کا ایک اچھا اثر قائم کرتا ہے
اپنی غزلیہ شاعری میں صنف غزل کے روایتی حسن
اور اس کی اقدار کا احترام کرتے ہیں اس کے سا
وہ جگہ جگہ اپنی انفرادیت کے نشانات بھی بناتے
ہیں۔ مندرجہ ذیل اشعار عرفی آفاقی کے تخلیق

۔۔ کی فنی ہنرمندی اور غزل کی روایات سے ان کے ۔۔۔ لے تعلق کا ثبوت ہیں ۵

زبان زباں وہی اک داستان شوق رہی
چھپا چھپا جسے رمز آشنائے فن نے کہا

حاصل زندگی ہو گئے ہیں
لمحے کچھ رائیگاں رائیگاں سے

تھی ہمیں اپنی پہچان منظور
خود جدا ہو گئے کارواں سے

عمرائے عمر دو روزہ! ترے سو جاں سے نثار
حادثہ پیش نہ آئے بھی تو بیماری ہو

نئے رسمیں ہیں سب آداب کو جی چاہتا ہے
بات وہ کہئے تو اب جس سے دل آزاری ہو

ورنہ چیخ اٹھیں گے اندر دل کے سناٹے
منھ میں ہے زباں جب تک بولتے رہو لوگو!

عرفی میں اس حیات کو اب اور کیا کہوں
جیسے کوئی سرور نہ دے اور شراب دے

عرفی کے مجموعہ کلام سے یہ چند اشعار نقل کئے ۔۔ گئے ہیں ایسے بلکہ ان سے بہتر متعدد اشعار ہیں ۔ اور ان کے مطالعہ سے عرفی آفاقی کی اہمیت ۔۔ حیثیت مسلم ہو جاتی ہے۔ آفاقی غزل و نظم پر یکساں قدرت رکھتے ہیں۔ وہ غیر معمولی قوت ۔۔ تخلیق کے حامل ہیں اور عام محسوسات و مشاہدات

میں بھی ایک نیا گوشہ تلاش کر لیتے ہیں۔ نظموں میں "کھنڈر کھنڈر شہر غزل" ایک شام ایک تیاگ، "یہی جو ٹھہری ہے اب رسم آئینہ کاری" کاروبار اور "سمندر پھر بلاتا ہے" خاصی اہم ہیں عرفی آفاقی اپنے موضوع کی پیش کش کے لئے نادر اسلوب اپناتے ہیں۔ ان کے یہاں اظہار کرنا خاص سلیقہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ "طوفان" اور "پھر یوں ہوا" اور "ایک آوارہ شام" نظمیں بھی بھلی لگتی ہیں۔

عرفی آفاقی کے یہاں جذبہ کی شدت و توانائی ان کے اظہار میں تاثیر پیدا کرتی ہے۔ اندر اور باہر کی دنیا ہمیں آفاقی کی شاعری میں ملتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ ان کا کلام اور یہ مجموعہ ادبی حلقوں میں سراہا جائے گا۔ اس کا مجھے یقین ہے۔

علیم اللہ حالی

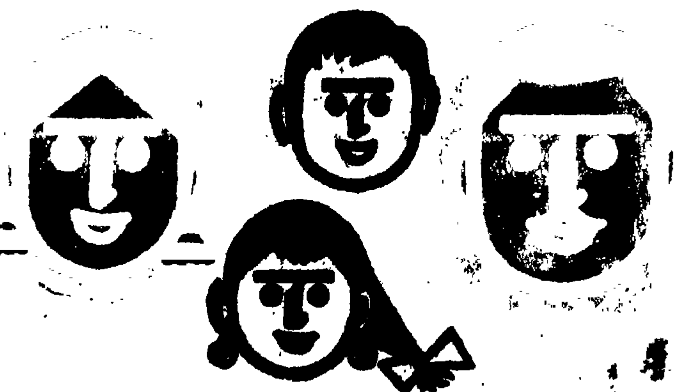
کتاب کا نام : کعبۃ اللہ میں لہو کی بوندیں
مرتب کا نام : عبدالرحمٰن انصاری
ضخامت : دو سو صفحات
قیمت : بیس روپے
تقسیم کار کا پتہ : عارف عظیمی معرفت گئو خانہ اسٹور نمبر ۱۶۶ کیشب چندر سین اسٹریٹ کلکتہ ۹
مبصر : اکبر محفوظ عالم

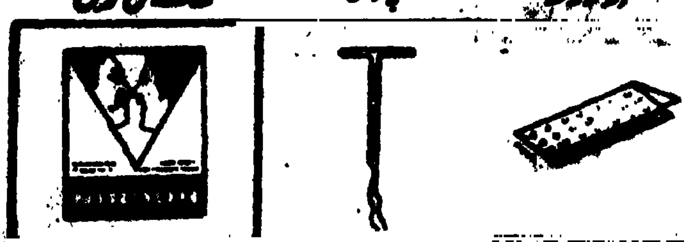
"کعبۃ اللہ میں لہو کی بوندیں" میری نظر سے گذری اول تا آخر مطالعہ کیا۔ کتاب کو نہایت سلیس زبان اور سہل الفاظ سے پُر پایا۔ مرتب عبدالرحمٰن انصاری۔ نہایت آسان زبان میں لکھتے ہیں تاکہ ہر کم پڑھا لکھا شخص بھی اس سے مستفید ہو۔ زیر نظر کتاب بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے کتابچے

اندر کیلے کیا نہیں ہے۔ وہ ہر قاری خود ہی فیصلہ کرے گا۔ موصوف نے نہایت ہی حقائق بیانی خوش اسلوبی اور انصاف پروری سے کام لے کر سینکڑوں اخبارات، علماء کرام کے فتوے اور عربوں کی خواہشات نقصان کے نتیجے کو اپنی دیانت اور امانت کے انداز میں اس طرح سپرد قلم کیا ہے مسجد الحرام میں خون خرابہ، کعبتہ اللہ پر شر پسندوں کا حملہ، سنگ اسود پر شہیدوں کے خون کے چھینٹے، مقدس قرآن کے قانون، خانہ کعبہ کے اندر بکتر بند گاڑیاں، بیت الحرام میں دیکھتے گولی مارنے کا حکم، حرم شریف کے معرکے میں شہید ہونے والے افراد، دہشت گردوں کی معافی، مسلم اور غیر مسلم ممالک میں مظاہرے، عینی مشاہدوں کا آنکھوں دیکھا حال، حاجیوں کے بیانات، علماء حرم کا متفقہ فیصلہ، فتویٰ، بیان، علماء حرم کے اسماء گرامی، مسجد حرم پر قبضہ کرنے والے افراد کو پھانسی، منافقین کے سر قلم کا آنکھوں دیکھا حال، خانہ کعبہ پر حملے پہلا واقعہ نہیں، قرآن شریف میں بیت اللہ اور پوری تحریر نکے مجموعے کا نام کعبتہ اللہ میں لہو بوندیں رکھا ہے۔ نام سے ہی پتہ چلتا ہے کہ کعبہ میں لہو کی بارش کتنی زوردار سے ہوئی تھی۔ اس سے عالم اسلام کو کیا نقصان پہونچا تھا موصوف نے خانہ خدا کی بے حرمتی کا پس منظر نہایت دل تڑپا دینے والے اور روح کو گرما دینے والے انداز میں حوالۂ قلم کیا ہے۔ ہر شخص کو یہ کتاب خرید کر پڑھنا چاہیے تاکہ تمام حوالے کے ذریعہ یکم محرم الحرام ۱۴۰۰ھ مطابق ۲۰ نومبر ۷۹ء بروز منگل کو ہونے والے ہنگامے خون خرابے فساد فی الارض المقدسہ کی داستان سے یا

اکبر محفوظ عالم

دو بچوں کے درمیان
تین سال کا وقفہ رکھیئے

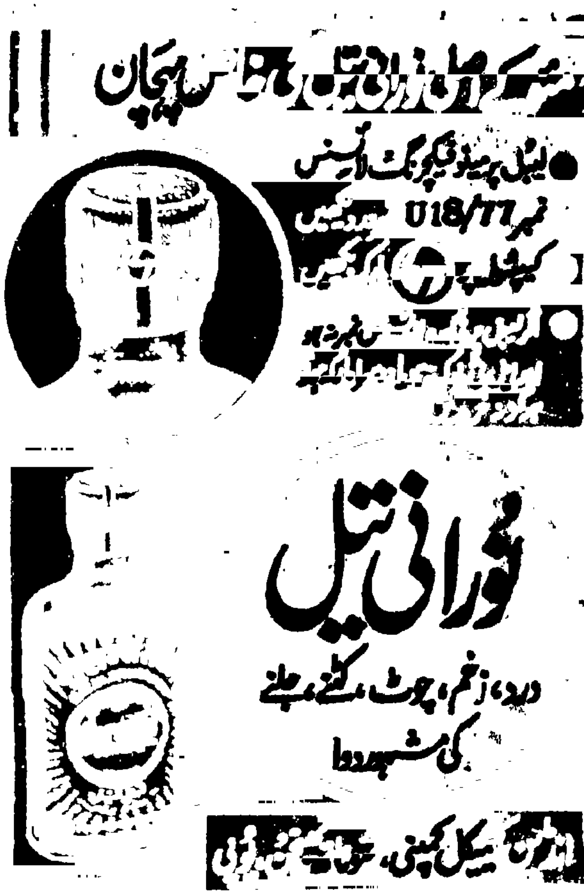




کوئی بھی طریقہ اپنائیے

davp 84/225

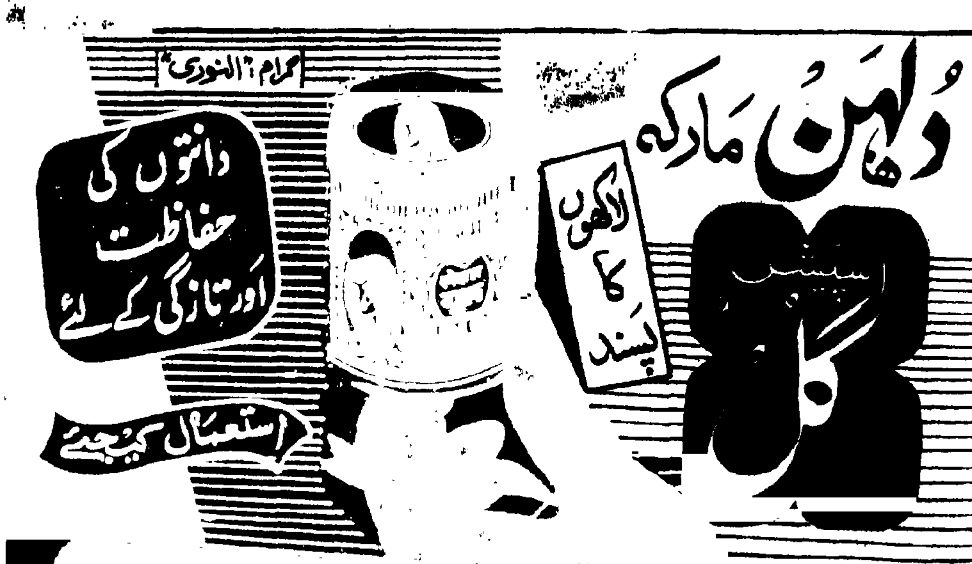

ہماری مصنوعات
تاج مارکہ
سرمہ اصلی ممیرا نمبر ۲۱
سرمہ نورانی
REGD
سرمہ وکاجل



لیبل پر مینوفیکچرنگ لائسنس
نمبر U18/77
نورانی تیل
درد، زخم، چوٹ، کٹنے، جلنے
کی مشہور دوا


دل پسند ○ سُبک ○ تیز رفتار ○ ملائم ○ پائیدار اور ارزاں
مردانہ بھی
زنانہ بھی
اور
بچگانہ بھی
Baba
cushion
AND
Air India
cushion
کیولا ربر انڈسٹریز
فون نمبر
۴۳-۱۶۰۷
۱۲ تلجلا مسجد باری لین ۔ کلکتہ ۳۹..۰۰۷

* * *


گرام: النوری
دُلہن مارکہ
دانتوں کی
حفاظت
اور تازگی کے لئے
لاکھوں
کا
پسند
استعمال کیجئے
رجسٹرڈ نمبر
۲۳۵۴۶۱
النوری ٹوبیکو پروڈکٹس۔ جگتدل ۲۴ پرگنہ

L. No. Gaya-8 Regd. with the R. N. P. at R. No.
☎ : 1573 47 YEARS OF PUBLICATION
THE SOHAIL MONTHLY, River Side Road, Gaya - 823001

سہیل



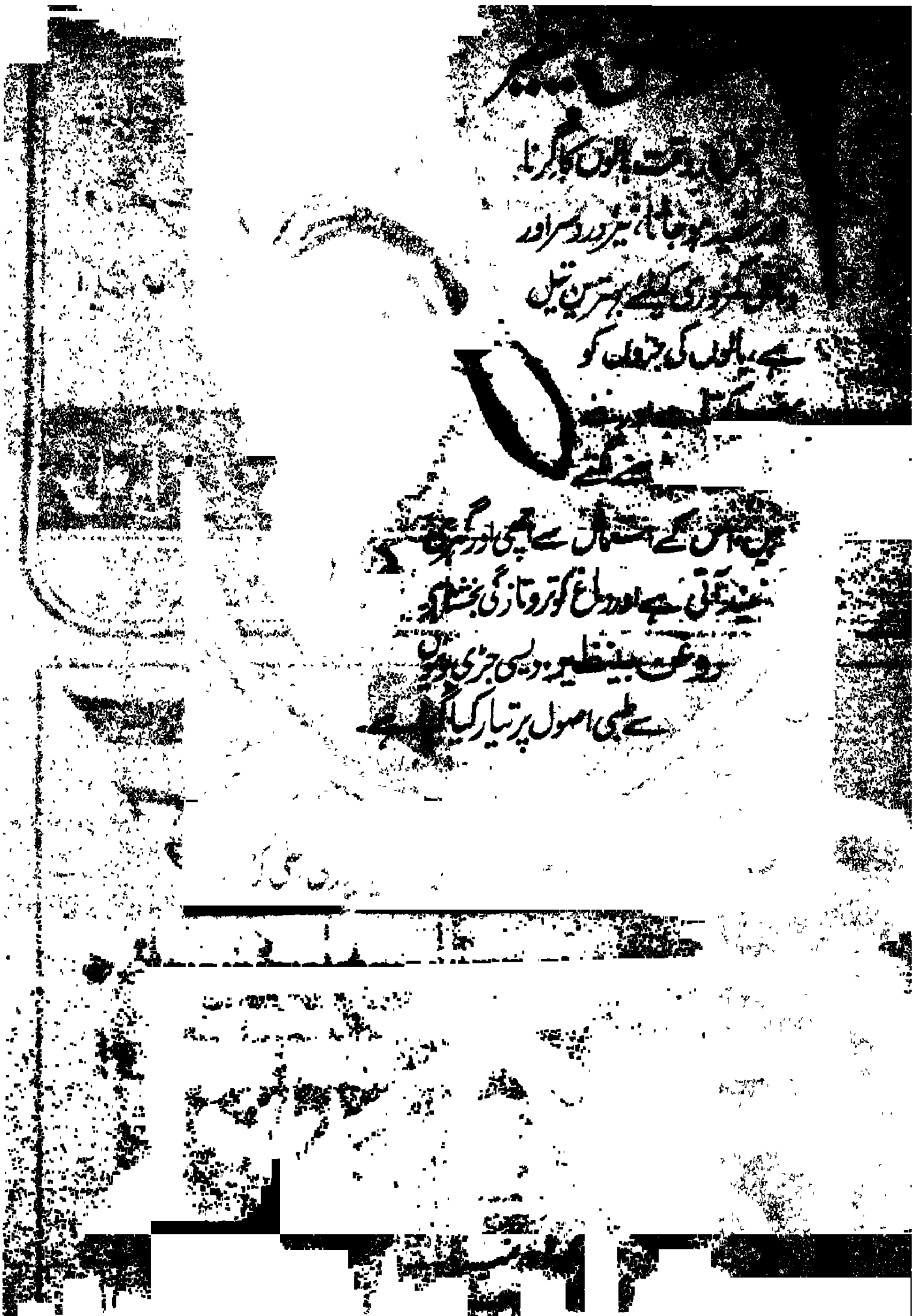
April '85

* * *

سچی

مٹھائیاں اور ٹافیاں




بالوں کا گرنا
سر درد اور
کیلئے بہترین تیل
ہے، بالوں کی جڑوں کو
کے استعمال سے اچھی اور گہری
نیند آتی ہے اور دماغ کو تروتازگی بخشتا ہے
روغن بینظیر، دیسی جڑی بوٹیوں
سے طبی اصول پر تیار کیا گیا ہے

نمود

شاہ بانو کیس اور سپریم کورٹ کا تاریخی فیصلہ

اندور کی شاہ بانو کے نان و نفقہ کے مقدمہ میں سپریم کورٹ نے جو تاریخی فیصلہ دیا ہے اس سے مسلم حلقوں میں ایک صحت مند بحث کا آغاز ہوا ہے۔

شاہ بانو کیس —— اندور کی شاہ بانو کی شادی اندور کے محمد احمد خاں کے ساتھ ۱۹۳۲ء میں ہوئی تھی جن سے ان کے تین لڑکے اور دو لڑکیاں ہیں۔ ۱۹۷۵ء میں یعنی شادی کے بعد (۴۳ برس بعد) محمد احمد خان نے اپنی بیگم کو گھر سے نکال دیا۔ اور مزید تین سال بعد جب بیگم نے خان صاحب کے خلاف نان نفقہ کا دعویٰ کیا تو خان صاحب نے انہیں طلاق دے دی۔ عدالت نے خان صاحب کو حکم دیا کہ وہ بیگم کو مبلغ ۲۵ روپئے ماہانہ ادا کریں۔ شاہ بانو کے مطابق خان صاحب کی آمدنی پانچ ہزار روپے ماہانہ ہے۔ اس لئے انہوں نے مدھیہ پردیش ہائی کورٹ میں اپیل کی اور ہائی کورٹ نے یہ رقم بڑھا کر ۱۷۹ روپے ۲۰ پیسے کر دی۔ خان صاحب نے اس عورت کو جس نے ۴۳ برس تک ان کی خدمت کی تھی، قلیل رقم دینا بھی گوارا نہیں تھا۔ انہوں نے مسلم پرسنل لاء کا سہارا لے کر ہائی کورٹ کے فیصلہ کے خلاف سپریم کورٹ میں اپیل کر دی۔

سپریم کورٹ نے اپنا فیصلہ سنا دیا، جس نے تہلکہ مچا دیا۔ پانچ ججوں نے جس میں چیف جسٹس بھی شامل تھا۔ خان صاحب کی اپیل کو خارج کر دیا اور ان کی اس دلیل کو تسلیم نہیں کیا کہ چونکہ وہ شاہ بانو کو طلاق دیدی ہے؛ اس لئے ان کے نان نفقہ کی ذمہ داری عدت کے دن گزر جانے کے بعد ختم ہو گئی۔ شاہ بانو نے ضابطہ فوجداری کی دفعہ ۱۲۵ کے تحت جوڈیشیل مجسٹریٹ کی عدالت میں کیس دائر کیا تھا اور اپنے شوہر سے پانچ سو روپے ماہانہ نان نفقہ طلب کیا تھا۔ سپریم کورٹ نے اسی دفعہ کے تحت خان صاحب کی اپیل خارج کر دی اور اپنے فیصلہ میں کہا کہ دفعہ ۱۲۵ (الف) کی وضاحت (بی) میں بیوی کی تشریح میں مطلقہ بیوی بھی شامل ہے اور اس میں کوئی لفظ ایسا نہیں ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ مسلم خواتین اس کے دائرے میں نہیں آتیں۔ ججوں نے فیصلہ دیا کہ دفعہ ۱۲۵ ایک سیکولر دفعہ ہے۔ جہاں تک مسلم خواتین کا تعلق ہے۔ مسلم مطلقہ عورت جب تک دوبارہ شادی نہ کرے اس دفعہ کے تحت اعانت پانے کی مستحق ہے، اس قانون کے تحت اس کو جو حقوق حاصل ہیں وہ مسلم پرسنل لاء سے متاثر نہیں ہوتے کیونکہ مسلم پرسنل لاء کے مطابق عورت کو صرف عدت

کی مدت میں بھی نان نفقہ کا حق حاصل ہے اور اس صورتحال پر توجہ نہیں دی گئی ہے جس کی دفعہ ۴۴ میں رعایت رکھی گئی ہے اس لئے یہ کہنا غلط ہے کہ مسلم شوہر مسلم پرسنل لاء کے مطابق عدت کے بعد اپنی نادار مطلقہ بیوی کے نان ونفقہ کے لئے ذمہ دار نہیں۔ عدالت نے واضح کیا کہ صورتحال یہ ہے کہ اگر عورت خود کفیل ہے تو عدت کے بعد شوہر کے اوپر نان نفقہ کی ذمہ داری ختم ہو جاتی ہے۔ چنانچہ عدالت نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ مسلم طلاق شدہ عورت بہرحال دفعہ ۱۲۵ کے تحت نان نفقہ طلب کر سکتی ہے۔ عدالت نے اس پر افسوس کا اظہار کیا کہ آئین کی دفعہ ۴۴ مطوبہ اور غیر موثر ہو کر رہ گئی ہے۔ (اس دفعہ کے تحت ریاست یہ کوشش کریگی کہ ہندوستان کے عوام کے لئے یکساں سیول کوڈ نافذ کیا جائے) عدالت نے کہا ایسی کوئی سرکاری سرگرمی نظر نہیں آتی جس سے پتہ چلے کہ یکساں سیول کوڈ کی تیاری کی جا رہی ہے۔ اور چونکہ اس بات کی توقع نہیں ہے کہ کوئی بھی فرقہ اس معاملے میں اعانت دیگر بلی کے گلے میں گھنٹی باندھنے کی ذمہ داری لیگا۔ اس لئے یہ حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ عوام کے لئے یکساں سیول کوڈ کو نافذ کرے کیونکہ قانون سازی کا اختیار صرف حکومت کو ہے۔ عدالت نے یہ بھی کہا کہ مشترکہ سول کوڈ سے قومی ہم آہنگی کے قیام میں مدد ملے گی۔

مذہبی جذباتیت یا جذباتی مذہبیت سے قطع نظر عام طور سے مسلم دانش وروں علماؤں اور مفکروں کو مسئلہ کی سنگینی کو تسلیم کرنا چاہئے اور شادی بیاہ، طلاق وراثت جیسے معاملات میں بہت سی ایسی پیچیدگیاں ہیں جنھیں عصری تقاضوں اور سائنسی نقطۂ نظر کو دھیان میں رکھتے ہوئے سلجھانا ضروری ہے۔ حالاں کہ مسلم سیاست دانوں اور مسلم رہنماؤں نے پورے شد و مد سے سپریم کورٹ کے فیصلے کی مخالفت کی ہے مگر صلاح الدین اویسی جیسے فرقہ پرست مسلم رہنما کو بھی یہ کہنا پڑا کہ ہم اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے کہ مسلم معاشرے میں عورتوں پر ظلم ہو رہا ہے۔

مسلم علماؤں اور دانشوروں کو چاہئے کہ وہ ان مسائل پر غور کرنے کے لئے سر جوڑ کر بیٹھیں اور حل تلاش کریں۔ ▲▲

جمیل منظر سنسہاروی

معذرت

معذرت خواہ ہوں کہ اپریل کا شمارہ کافی تاخیر سے آپ تک پہنچ رہا ہے۔ دراصل پچھلے ماہ ایک صحافتی ڈیلیگیشن کے ساتھ تھائی لینڈ، ہانگ کانگ اور چین کے دورے پر گیا ہوا تھا جس کی وجہ سے شمارہ کافی تاخیر سے آپ کی خدمت پہنچ رہا ہے۔

کوشش کر رہا ہوں کہ وہاں کے تاثرات سفرنامہ کے ذریعے آپ تک پہونچا دوں۔

(جمیل منظر سنسہاروی)

فیض احمد فیض

ہم جیتیں گے ہم جیتیں گے

ہم جیتیں گے ہم جیتیں گے
ہم آخر اک دن جیتیں گے
یوں مل کر اپنی فوج بڑھے
کاندھے سے کاندھا ٹکرائے
یوں اپنا جھنڈا لہرائے
آکاش پہ لالی چھا جائے
اس دن جب اپنا دن آئے
ہم جیتیں گے ہم جیتیں گے
آخر ہم اک دن جیتیں گے
کیا ڈر ہے لاٹھی گولی کا
ہر چھاتی اپنی ڈھال بنے
یہ دھرتی دھمکے پاؤں تلے
اور چال ببر کی چال بنے
پھر جو بھی رن میں حال بنے
ہم جیتیں گے ہم جیتیں گے
اب تک سیٹھوں نے راج کیا
اس بار ہمارا نمبر ہے
جو ساتھی جنگ میں کام آئے
اُن سب کا سایہ سر پر ہے
پھر کیا ڈر ہے، ہم جیتیں گے ہم جیتیں گے۔

(۱۵، جون ۱۹۸۴ء)

ترقی پسند ادب کا ترجمان

سہیل گیا

اپریل ۱۹۸۵ء

جلد نمبر: ۴۷
شمارہ نمبر: ۴

بیادِ محسن: اویس سنہاروی مرحوم

چیف ایڈیٹر: مسعود منظر سنہاروی
ایڈیٹر: جمیل منظر سنہاروی
معاونین: شکیل احمد جلالی
عبدالقیوم ابدالی

مجلسِ مشاورت: ڈاکٹر تاراچرن رستوگی
ڈاکٹر قمر رئیس
مظفر علی انجینئر

خطاط: ڈاکٹر نظام الدین احمد
کلیم ڈنگروی

بدل اشتراک: فی شمارہ ۲/ روپے
سالانہ ۲۴/ روپے
دیگر ممالک ۲۵۰/ روپے

خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ:-
ماہنامہ سہیل
ریور سائیڈ روڈ۔ گیا

اس شمارہ میں

سوویت اخبار کے لئے

مسعود علی خاں کے ذریعہ

فیض کا آخری انٹرویو

سوویت یونین کے باتصویر ہفتہ وار "اگونیوک" نے ممتاز اُردو شاعر فیض احمد فیض کا انٹرویو شائع کیا ہے جو انھوں نے کچھ عرصہ قبل ہی اس رسالہ کو دیا تھا۔ فیض نے اس میں ۲۲ سوالوں کا جواب دیا ہے جو ترقی پسند تحریک کی ابتدا تا تاریخ اور خود فیض کی زندگی اور ... احاطہ کرتے ہیں۔

آزادی اور تقسیم وطن کے بعد ابتدائی خوشی کے لمحات بہت مختصر تھے۔ جلد ہی مایوسی کا دور شروع ہو گیا تھا۔ اس کے باوجود پاکستان کے دانشوروں نے ایک آزاد اور جمہوری پاکستان کی تعمیر کی کوشش کی۔ ادیبوں اور شاعروں نے جمہوریت کی پوری آزمائش کے دوران اسی مقصد کو شرمندۂ تعبیر کرنا اپنا مطمح نظر قرار دیا۔

فیض نے کہا کہ نوجوانوں نے خاص طور سے اس آواز پر لبیک کہا۔

جبر و استبداد اور قید و بند کی صعوبتوں نے اس جوش اور اُمنگ کو نئی جلا بخشی۔ قید و بند کے دن اُن کی شاعری کے لئے بڑے ثمرآور ثابت ہوئے۔

"جب میں جیل سے رہا ہو کر آیا تو میں نے دیکھا کہ آزاد پاکستان کا خواب بکھر چکا ہے۔ اسے دوبارہ جوڑا نہیں جا سکتا۔ ملک کو جدید نوآبادکاروں کے ہاتھ فروخت کر دیا گیا ہے۔ ٹریڈ یونین تحریک کو تہس نہس کر دیا گیا ہے۔ ایک نئی ٹریڈ یونین "قیادت" کو فروغ دیا گیا ہے جو سرد جنگ کے سرکاری راستہ کی حمایت کرتی ہے۔ مزدور طبقہ اس جھٹکے سے اُبھر نہیں سکا تھا۔ اسی طرح سے آزاد صحافت کو بھی تباہ کر دیا تھا۔ صرف شاعری پر انحصار نہ کرنے والے شخص کے لئے تمام راستے بند کر دیئے گئے تھے۔ اب میرے لئے صرف یہی راستہ رہ گیا تھا کہ میں اپنی شاعری کو جدوجہد کے لئے استعمال کروں۔

"کیا آپ نیرودا اور ترسودا جیسے شاعروں کا راستہ نہیں اپنا سکتے تھے؟"

فیض نے جواب دیا: "اس میں ناظم حکمت کا نام بھی جوڑا جا سکتا ہے۔ ان شاعروں نے قومی اور عوامی تحریکوں میں حصہ لیا۔ مگر پاکستان کے تعلق سے وہاں کی صورت حال کی بعض اپنی خصوصیات اور پھر میری عمر کو بھی دھیان میں رکھنا ہوگا۔

دوسری بات یہ ہے کہ انفرادی جدوجہد کے امکانات بہت محدود تھے۔ میں ہمیشہ سوچتا تھا کہ عوام کو بیدار کر کے ان کے شعور کو بلند کر کے، انھیں اپنے مقصود اور مقاصد سے آگاہ کر کے ہی میں ممکنہ حد تک اپنا حصہ بٹا سکتا ہوں۔ زندگی کے ہر موڑ پر میں نے اپنے اس ایقان سے وفا کی خواہ میں کالج میں پڑھاتا رہا یا نئے ٹریڈ یونینسٹوں کی تربیت کرتا رہا، فاشزم کے خلاف جہاد میں شریک رہا یا ایک صحافی کے فرائض انجام دیتا رہا۔

فیض کہتے ہیں کہ جب سیاست میں راست شرکت ناممکن ہو گئی تو انھوں نے ساری توجہ ثقافتی محاذ پر مرکوز کر دی جہاں انھیں جدید نوآبادیاتی راج کے طرز پر بنائے گئے بیہودہ کلچ

سیاسی ڈھانچہ اور ساونزم کے وکیلوں سے نبرد آزما ہونا پڑا۔ ہم نے وہ سب کچھ کیا جو ہمارے بس میں تھا۔

میری ہمیشہ سے یہ رائے رہی کہ بہتر زندگی کے لئے ہمارے عوام کی جدوجہد ناگزیر طور پر فلسطینی عوام کی اپنی آزاد ریاست کے لئے جدوجہد جیسی تحریکوں سے ناگزیر طور پر جڑی ہوئی ہے۔

سوال: "آج کے حالات میں عام آدمی کو یہ حق ہے کہ وہ یہ دریافت کرے کہ نجات کا راستہ کیا ہے؟"

جواب: "یقیناً انھیں حق ہے۔ [illegible] ۔ [illegible] نے ایسے حالات پیدا کئے رکھے ہیں جن کی کوئی تاریخی مماثلت نہیں ہے۔ ہماری سابقہ محرومیوں نے امید کے نئے چراغ روشن کئے اور پھر سہانے سپنے دیکھنے کے دن آئے۔ مگر ہم نے کبھی یہ نہیں سوچا تھا، یہ بات ہمارے خیال میں بھی نہ آسکی تھی کہ ایسی بندشیں، ایسی حد بندیاں ہوں گی۔

تخلیق کار جو مستقبل کو دیکھ سکتے ہیں، انھیں نجات کا راستہ دکھانا چاہیئے، مگر کیا وہ دوسروں کو بھی ہمنوا بنا سکتے ہیں۔ اسکا انحصار بہت سی معروضی پہلوؤں پر اور سب سے زیادہ اس بات پر ہے کہ کیا ایسی تنظیم موجود ہے جو فیصلہ کن قدم اٹھانے کے لئے تیار ہو۔ انفرادی ادراک بھی اجتماعی ادراک سے جدلیاتی تعلق کی بنیاد پر واضح اور روشن ہوتا ہے جب ادیب یا شاعر اپنے اجتماعیہ سے الگ تھلگ پڑ جاتا ہے تو تخلیقی عمل بھی بے ثمر ہو جاتا ہے۔ میری رائے میں بہت سے تخلیق کار اس کمزوری کا شکار ہیں کہ وہ عوام کے شعور اور فہم کو اور نہ صرف سیاسی میدان میں بلکہ زندگی کے دوسرے شعبوں میں بھی ان کے کردار کو کم کر کے آنکتے ہیں۔

بعض نوجوان بے صبری کا مظاہرہ کر سکتے ہیں اور منزل تک پہنچنے کے لئے جدوجہد کا چھوٹا سا راستہ بھی تلاش کر سکتے ہیں مگر حقیقی نجات کے لئے کوئی چھوٹا سا راستہ نہیں ہے۔ آج تک کوئی ایسا تیز رفتار طیارہ نہیں بنا جو ہمیں اڑا کر سیدھا جنت تک پہونچا دے۔ جہاں ایک طرف بے صبری، جدلیاتی عمل، اور سماجی تغیر کی حرکیات کو نظر انداز کرنا غلط ہے، وہیں بے عملی اور لاتعلقی کا رویہ بھی نفرت رساں ہے۔

سوال: ایسا لگتا ہے کہ آپ نے اپنے موقف کا اظہار کرنے کے بجائے ان اداروں اور فارموں کو ہی ترک کیا جو آپ کے موقف سے میل نہیں کھاتے تھے؟

جواب: میں ان لوگوں کے خلاف ہوں جو جدوجہد کو ہی منزل سمجھتے ہیں۔ ایسوا نظریات کے جہاں تضاد ہے کوئی مفر نہیں، میں ایک پرامن انسان ہوں، میں اس نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ جہاں نوک جھونک سے مقصد حاصل ہو، وہاں دوسرا طریقہ اختیار کرنا چاہیئے۔

اس انٹرویو کے دوران فیض نے عوامی روایتوں عشق و محبت کے پاکیزہ جذبات، عوام اور ان جذبوں سے حوصلہ، گاؤں کے لوگوں کے ساتھ بیتے دنوں اور والد کے انتقال کے بعد اپنی اور خاندان کی مفلسی کا تفصیل تذکرہ کیا ہے۔

فیض سے پوچھا گیا کہ کیا انھوں نے ضعیفی کے لئے کیا کیا ہے؟

فیض نے جواب دیا: اس سے آپ کا کیا مطلب۔ میں کام کرتا ہوں، روز کام کرتا ہوں، ہر سال کام کرتا ہوں اور اپنی روزی خود کماتا ہوں۔ میری کوئی جائیداد نہیں حد تو یہ ہے کہ جس گھر میں میں رہتا ہوں وہ بھی میرا اپنا نہیں ہے۔

سوال: مگر آپ کو کچھ زمین تو ورثہ میں ملی تھی؟

جواب: میں نے وہ سب دیدی۔ جو کسان اس پر کام کرتے تھے، وہ مشکلات سے دوچار تھے۔ جیسے ہی رہائی جب میں جیل سے رہا ہو کر آیا تو میں نے اپنی ماں سے کہا وہ زمین انھیں کو ہی دیدیں جو اس پر کھیتی کرتے ہیں۔ ماں نے اسے منظور کر لیا۔ اب گاؤں میں میرے پاس صرف ایک ایکڑ زمین ہے۔ یہ زمین واحد رشتہ ہے جو مجھے زمین اور وہاں کے لوگوں سے باندھے ہوئے ہے۔ ~~جیسے~~ دل کا ایک حصہ وہیں رہ گیا ہے۔

سوال: کیا آپ کی کوئی خواہش ہے؟

بات پھیل گیا

(بقیہ آخری انٹرویو)

جواب: میری خدا سے صرف یہی دعا ہے کہ میں بے یار و مددگار ضعیفی کے ایسے دنوں تک زندہ نہ رہوں جب کہ میں معذور ہوں۔ مجھے بے مقصد اور بے سود زندگی گذارنے کے تصور سے ہی ڈر لگتا ہے۔"

ہم جانتے ہیں کہ فیض، موت سے پہلے سیالکوٹ کے قریب اپنے گاؤں گئے تھے۔

انٹرویو کے آخر میں فیض نے کہا تھا کہ ان کے لئے اپنے چاہنے والوں اور جنھیں انہوں نے چاہا، ان کی یاد ہی عزیز ترین شے ہے۔

(بقیہ فیض ایک انقلابی شاعر)

کٹتے بھی چلو، بڑھتے بھی چلو، بازو بھی بہت
ہیں سر بھی بہت
اے ظلم کے مارو لب کھولو، چپ رہنے والو
چپ کب تک
کچھ حشر تو ان سے اُٹھے گا، کچھ دور تو نالے
جائیں گے

انہیں عزائم کے ساتھ انقلاب کی مشعل کو انھوں نے اپنی زندگی کے آخری لمحے تک جلائے رکھا۔

پورے کئے سب حرفِ تمنا کے تقاضے
ہر درد کے ابھارا، ہر اک غم کو سنوارا
واپس نہیں پھیرا کوئی فرمان جنوں کا
تنہا نہیں لوٹی کبھی آواز جرس کی

اس راہ میں جو سب پہ گذرتی ہے وہ گذری

تنہا پسِ زنداں، کبھی رسوا سرِ بازار
گرجے ہیں بہت شیخ سرِ گوشۂ منبر
کڑکے ہیں بہت اہلِ حکم برسرِ دربار
چھوڑا نہیں غیروں نے کوئی ناوکِ دشنام
چھوٹی نہیں اپنوں سے کوئی طرزِ ملامت
اس عشق نہ اس عشق پہ نادم ہے مگر دل
ہر داغ ہے اس دل پہ بجز داغِ ندامت

انقلاب کا ایسا سچا علمبردار، قلم کا ایسا بہادر سپہ سالار اور ادب کا ایسا گوہر تابدار اب ہم میں نہیں رہا۔

(بقیہ جیل کی یاد میں)

اس غزل میں نواب صاحب کے خاص دو شعر تھے۔

شیخ سے بے ہراس ملتے ہیں
ہم نے توبہ ابھی نہیں کی ہے
ذکرِ جنت، بیانِ حور و قصور
بات گویا یہیں کہیں کی ہے

فیض کی شاعری سے لطف اندوز ہونے کے لئے ان کی شاعری کو ان واقعات، حالات اور محرکات سے وابستہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے (حالاں کہ انھوں نے ان کی تخلیق میں مدد کی ہے کہ ان کی تخلیق ایک خاص سرزمین میں پیوست ہونے کے باوجود اس سے الگ، مختلف اور منفرد ہے۔ اس شعر و شاعری کی محرکات اس کا لازمی جز ہیں) لیکن فیض کی تخلیق جینیس سے گذرنے کے بعد ان کی حیثیت ثانوی اور ذیلی ہو جاتی ہے اور جو چیز ہم کو ملتی ہے وہ ہے فیض کی روح اور نفس اور فکر و تخئیل کی تعمیر کا حیرت ناک اچھوتاپن بے مثل صناعی اور حسن و لطافت اور پاکیزگی اور طہارت کی ایک بے پایاں جستجو، جیسے کہ بہار کے موسم میں مختلف پھولوں سے روشن کسی باغ میں ملی جلی انجانی مہک سے بھری عطر بیز ہواؤں کے ہلکے ہلکے جھونکوں میں ہوتی ہے۔ آپ اس کو محسوس کر سکتے ہیں پکڑ نہیں سکتے۔ اس کو پکڑنا اور پہچاننا مشکل ہے اس لئے کہ ان کی جیسی اور کوئی دوسری چیز نہیں اور نہ ہی فن کا عروج ہے۔

مضمون نگار حضرات سے گذارش

مضمون نگار حضرات اپنی تخلیقات صاف اور خوش خط، کاغذ کے ایک ہی جانب، بین السطور کشادہ چھوڑ کر لکھیں۔

(مدیر)

سید سجاد ظہیر

فیض احمد فیض: جیل کی یادیں

لب پہ حرفِ غزل، دل میں قندیلِ غم

اس قربت کے باوجود جو ہمارے مابین ہے، میں الفاظ کو [illegible] وقت میں سخت الجھن میں مبتلا ہوں۔ فیض کا تقریباً سارا کلام ان کے چار مجموعوں میں ہے 'نقش فریادی'، 'دستِ صبا'، 'زنداں نامہ' اور 'دستِ تہِ سنگ'۔ یہی ان کی تخلیقی زندگی کی مکمل داستان ہے۔ خوش قسمتی سے ہم میں سے لاکھوں نے انھیں بار بار پڑھا ہے۔ یہ ان کے اپنے لفظوں میں بیان کی ہوئی داستان ہے۔ اصل، سچی، اندرونی، دلچسپ اور بڑی خوبصورت داستان، اس کے علاوہ اس سے بہتر نہیں یا کوئی دوسرا شخص کیا کہہ سکتا ہے؟ میں کبھی سوچتا ہوں کہ آخر لوگ کسی فن کار کی خارجی، روزمرہ کی زندگی، اس کے عادات و خصائل، اس کی سماجی حیثیت، اس کی چال ڈھال، اس کے بات کرنے یا شعر پڑھنے کے انداز، وہ کہاں پیدا ہوئے، اس نے کتنی اور کہاں تعلیم پائی، علانیہ اور خفیہ کتنی عورتوں سے اس نے محبت کی، اس کا سیاسی اور سماجی نقطۂ نظر کیا ہے، اسی قسم کی بہت سی باتیں معلوم کرنے کی کوشش کیا کرتے ہیں۔ یقیناً ہم ان باتوں کے معلوم ہو جانے کے بعد فن کار کے کردار کو سمجھ لیں گے اور یہ بھی جان لیں گے کہ کیسے کیسے اثرات پڑے جن نے اس کے فکر و نظر کو متاثر کیا۔ یہ بھی جان لیں گے کہ وہ کیسا آدمی ہے۔ لیکن [illegible]

میں سب کچھ معلوم کرنے کے بعد بھی ہم پھول، اس کے رنگ کی جاذبیت، دل آویزی، اس کی پنکھڑیوں کی نرمی اور ملائمت، اس کی دل آویز خوشبو، مہک یعنی اس کی مجموعی لطافت اور اس کے حسن کا اندازہ کیسے لگا سکتے ہیں؟ وہ بنا تو انہی چیزوں کے میل سے ہے جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے لیکن ان سے کسی قدر مختلف ہے۔

انسان اخلاق کے میدان میں عام طور پر ایک بات کو سخت ناپسند کرتے ہیں اور وہ ہے قول و عمل کا تضاد یعنی ہم کہیں کچھ، اور دعویٰ کریں کچھ، اور عمل کریں کچھ، اور ہمارا دیش ریشیوں منیوں، صوفیوں اور اولیاء اللہ، درویشوں اور بھگتوں اور مہاتماؤں کا دیس ہے۔ لیکن ہمارے ہی دیس میں بگلا بھگت کی اصطلاح بھی رائج ہے۔ اور ہم میں سے اکثر نے خود گزشتہ تیس چالیس برس میں یہ تجربہ کیا ہے کہ ہمارے ملک میں ایک خاص قسم کی ٹوپی اور لباس جو کبھی دیش بھگتی اور پاکیزگی اور انکساری کی علامت سمجھے جاتے تھے اب عام ہندوستانیوں کی نظروں میں بالکل ان کے متضاد باتوں کے نشان سمجھے جانے لگے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہندوستان اور پاکستان بلکہ ان ملکوں کے باہر بھی جہاں جہاں فیض کے متعلق لوگوں کو علم ہے۔ فیض کی غیر معمولی مقبولیت اور لوگوں کو ان سے والہانہ محبت کا ایک سبب ان کی شاعری کی خوبیوں کے علاوہ یہ بھی ہے کہ لوگ فیض کی زندگی اور ان کے عمل، ان کے دعووں اور ان کے عمل میں تضاد نہیں دیکھتے، [illegible]

کرنوں کی دُنیا کے قوانین، مروجہ اخلاقی قوانین سے اگر مختلف نہیں تو دوسری ہی سطح کے ہوتے ہیں، ان کی شعری حیثیت میں کوئی فرق نہیں آتا۔

میں مثال کے طور پر چند واقعات آپ کو بتانا چاہتا ہوں۔ فیض ۹ مارچ ۱۹۵۱ء کو لاہور میں اپنے مکان سے اچانک گرفتار کر لئے گئے۔ اس وقت وہ پاکستان کے دو سب سے اہم اخباروں پاکستان ٹائمز اور امروز کے ایڈیٹر تھے۔ ان کے ساتھ پاکستانی فوج کے چیف آف دی جنرل اسٹاف جنرل اکبر خان اور کئی دوسرے بڑے افسران بھی بڑے ڈرامائی انداز میں گرفتار کر لئے گئے۔ سارا پاکستان ہل گیا۔ اخباروں میں روز یہ افواہیں شائع ہوتی تھیں کہ ان سب لوگوں کو فوجی بغاوت کی سازش کے جرم میں گولی مار دی جائے گی۔ میں اس وقت لاہور میں تھا اور مجھ سے آکر لوگوں نے بتایا کہ کسی کو اس کا علم نہیں فیض کس جیل میں ہیں۔ کئی ہفتے تک ان کی بیوی اور بچیوں کو بھی اس کا علم نہیں تھا۔ نہ کبھی کو فیض سے ملنے کی اجازت تھی۔ یہ بھی کہا گیا کہ فیض کو جیل میں جسمانی ایذا پہونچائی جا رہی ہے۔ (بعد کو معلوم ہوا کہ یہ بات غلط تھی)، البتہ دوسری باتیں صحیح تھیں) یعنی وہ بالکل تنہا اور تکلیف دہ حالات میں رکھے گئے تھے۔ کوئی کتاب (سوا قرآن مجید کے) اخبار، رسالے یا کاغذ، قلم یا دوات تک ان کو نہیں دیا گیا تھا۔ نہ خود کچھ لکھ سکتے تھے! نہ کسی کا کوئی خط وغیرہ پا سکتے تھے۔ مختصر یہ کہ حالات نہایت ہی روح فرسا تھے۔ انھیں حالات میں فیض نے وہ اپنا مشہور قطعہ کہا ؎

متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خونِ دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے
زباں پہ مہر لگی ہے تو کیا کہ رکھ دی ہے
ہر ایک حلقۂ زنجیر میں زباں میں نے

اور اس مضمون کی وہ غزل بھی کہی ؎

ہم پرورشِ لوح و قلم کرتے رہیں گے
جو دل پہ گزرتی ہے رقم کرتے رہیں گے
ہاں تلخیٔ ایام ابھی اور بڑھے گی
ہاں اہلِ ستم مشقِ ستم کرتے رہیں گے
مے خانہ سلامت ہے تو ہم سرخیٔ مے سے
تزئینِ در و بامِ حرم کرتے رہیں گے

میں نے فیض کا یہ کلام خود اُن کی زبانی حیدر
سندھ کی جیل میں سُنا تھا۔ اس لئے کہ ان کی گرفتاری
تقریباً تین مہینہ بعد میں بھی گرفتار کر لیا گیا تھا اور را
سازش کیس کے کل قیدی ایک اسپیشل ٹرین میں لاہور
حیدر آباد سندھ پہونچائے گئے۔ یہ اسپیشل ٹرین اور
کا سفر بھی عجیب و غریب اور در اصل اسپیشل تھا
تیرہ قیدی ایک ہی ٹرین کے الگ الگ ڈبوں میں۔
ہر ایک قیدی دو اسٹین گن سے مسلح سپاہیوں اور ا
انسپکٹر پولیس کے ساتھ فرسٹ کلاس کے ایک ڈبے
حراست میں تھے۔ ہم ایک دوسرے سے مل نہیں سکتے
اور نہ ہم کو یہ پتہ تھا کہ دوسرے ڈبہ میں کون ہے
یہ موقع اُن باتوں کے بیان کرنے کا نہیں اور نہ اب ا
کوئی خاص اہمیت ہے۔ جیل کے اندر ہماری ملا
ہوئی اور جب ہم نے اپنی آپ بیتیاں سنانے کے بعد
سے پوچھا کہ شاعری کا کیا حال ہے؟ تب انھوں
اپنی یہ تازہ چیزیں سنائیں۔ کاغذ قلم نہ ہونے کی وج
اس وقت تک تین مہینہ میں کہا ہوا کلام در اصل لو
پر ہی رکھا ہوا تھا۔ حیدر آباد میں جب ہمیں قلم اور
رکھنے کی اجازت ملی تب یہ کلام بیاض میں قلمبند کیا

حیدر آباد سندھ کے جیل خانہ میں ہم تقریباً
رہے۔ ایک اسپیشل ٹریبونل جو جیل کے اندر ہی بیٹھا کر
اس کے سامنے ہم کو روزانہ پیش ہونا پڑتا تھا اور د
بحث جرح اور صفائی کے وکیلوں کا جواب سیکڑوں
کی گواہیاں، یہ سب سنتے رہتے تھے۔ عام طور پر یہ چند
نہایت بورنگ ہوتے تھے۔ ملزموں کے کٹہرے میں ہم سد
ملزم دو صفوں میں بیٹھتے تھے۔ دوسری یا آخری صف
بائیں سرے پر میں اور فیض پاس پاس بیٹھے سرگوشی
کرتے رہتے۔ اور سامنے بڑکا ہوتی کاغانی ربھی کاروا

کبھی گواہوں کی دستاویز پر اپنے نوٹ لیتے۔ ہم تعزیرات پاکستان کی بے شمار دفعات میں ماخوذ تھے۔
جن میں سب سے سنگین فوجی بغاوت کے ذریعے حکومت پاکستان کا تختہ اُلٹنے کی سازش اور فوجی بغاوت پھیلانے کا الزام تھا۔ جس کی سزا موت تھی۔ ہمیں اس وقت ہنسی آتی تھی جب ہمارے خلاف جھوٹی گواہیاں پیش ہوتی تھیں۔ ان موقعوں پر کبھی کبھی ہم اور ہمارے ساتھی بیساختہ ہنس دیتے جو عدالت کی توہین کے مترادف سمجھا جاتا۔ اس پر اسپیشل ٹریبونل کے صدر جسٹس عبدالرحمٰن جن کو ہائی بلڈ پریسر کی شکایت تھی غصہ سے بالکل لال پیلے ہو جاتے (وہ بہت گورے چٹے تھے) اور زور زور سے چلا کر ہم کو خاموش رہنے کی ہدایت کرتے اور اگر اس پر بھی کسی کو اور زیادہ ہنسی آتی تو وہ دھمکی دیتے تھے۔
اپنی قسمت کا فیصلہ کرنے والے جج کو ناراض کرنا اور بھڑکانا کوئی دانشمندی نہیں تھی لیکن ہم بھی آخر مجبور تھے۔

ان دنوں ہم لوگ ہر پندرہ دنوں پر چھٹی کے دن ایک طرحی مشاعرہ کرتے تھے جس کے لئے شعر کہنا ہر قیدی کے لئے لازمی تھا۔

دراصل یہ فیض کے خلاف ایک سازش تھی تاکہ ان کو شعر لکھنے پر مجبور کیا جائے۔ ان ہی حالات میں فیض نے وہ غزل لکھی ؎

تم آئے ہو نہ شبِ انتظار گذری ہے
وہ بات ان کو بہت ناگوار گذری ہے

انہی دنوں ایک دن ہم نے اخباروں میں یہ خبر پڑھی۔ انارکلی میں ایک خوبصورت لڑکی جس کے کندھوں پر بال گھٹا چھائی تھی ہنستی بولتی گذرتی تھی۔ ایک مولانا کسی دکان پر بیٹھے تھے۔ ان کو یہ منظر دیکھ کر خوش ہونے کے بجائے سخت غصہ آیا اور اس بے پردگی میں انہیں اسلام کی توہین نظر آئی چنانچہ وہ ایک قینچی لئے ہوئے اپنی جگہ سے گردے اور لپک کر اس بیچاری لڑکی کی زلفیں کاٹ دیا۔ خیر اس مداخلت بیجا پر مولانا پکڑے گئے اور ان کو سزا ہوئی۔ معلوم ہوتا ہے فیض اس واقعے سے بہت متاثر ہوئے۔ اور انہوں نے اپنی غزل میں یہ شعر لکھا ؎

دلبری ٹھہری زبانِ خلق کھلوانے کا نام
اب نہیں لیتے پری رو زلف بکھرانے کا نام

ظاہر ہے ان حالات میں سب سے زیادہ تکلیف ہمیں اس وقت ہوتی تھی جب ہم پر غداری اور وطن دشمنی کا الزام لگایا جاتا تھا۔ اس کی صفائی ہم اس عدالت میں کیا پیش کرتے جو بنائی ہی اس لئے گئی تھی کہ خاص قانون کی مدد لیکر راولپنڈی سازش کے مقدمے کے لئے ایک خاص قانون بنایا گیا تھا جس کی ایک دفعہ یہ بھی تھی کہ یہ مقدمہ خفیہ طور پر چلایا جائے گا اور اس کی روداد کے کسی حصّہ کو بھی مشتہر کرنا بجائے خود ایک جرم ہوگا۔ تمام ملزموں کو کسی نہ کسی طرح سزا دی جائے لیکن فیض چپ بیٹھے اور اپنی متعدد نظموں، غزلوں، قطعات اور منفرد اشعار میں انہوں نے اپنی ایسی بیمثال صفائی پیش کی کہ ان پر الزام لگانے والے خود ہی مجرم نظر آنے لگے۔ اس قسم کی نظموں میں "دو عشق" اور "نثار میں تیری گلیوں پہ" خاص طور پر ان کیفیتوں کا اظہار کرتی ہیں۔ "دو عشق" میں فیض نے نئے اور بے مثال استعاروں کا استعمال کیا ہے ؎

تنہائی میں کیا کیا نہ تجھے یاد کیا ہے
کیا کیا نہ دلِ زار نے ڈھونڈی ہیں پناہیں
آنکھوں سے لگایا ہے کبھی دستِ صبا کو
ڈالی ہیں کبھی گردنِ مہتاب میں باہیں

تنہائی کی کیفیتوں کا بیان ہر شاعر اپنا پیدائشی حق سمجھتا ہے اور آجکل کے بعض شاعروں اور مفکروں نے تو اس کو باقاعدہ فلسفہ بنا لیا ہے اور اپنی مفروضہ تنہائی کو اتنی اہمیت دیتے ہیں جتنا زور ایک خدا کو ماننے والا مسلمان اللہ تعالیٰ کی تنہائی اور یکتائی کو دیتے ہیں۔ لیکن آپ ذرا فیض کی اس دردناک لیکن حسین تنہائی کا تصور کیجئے جس میں دستِ صبا کی نرمی اور ٹھنڈک محبوب کے ہاتھوں کی یاد دلاتی ہے اور چاند کے قمر کو دیکھ کر دوست کی غیر موجودگی میں اس کے گلے میں باہیں ڈال

دینے کو جی چاہتا ہے۔

انسان کی آزادی اور انسانی وقار کی قدر و منزلت انسانی رشتوں میں خلوص و محبت، شرافت اور پاکیزگی انسان پر ہونے والے ہر قسم کے جبر و ظلم و استحصال اور رعونت و فرعونیت کے خاتمے اور ان مقاصد اور اس بلند نصب العین پر پہنچنے کے لئے ایسی کاوشیں اور سپردگی جیسی کہ عاشق تقریباً مجنونانہ طور پر اور تحت روحانی تخیلاتی اور جسمانی مجاہدے کی کیفیت میں کرتے ہیں۔ فیض کی بہترین شاعری کے موضوعات یہی ہیں۔ ان کا لہجہ کبھی نرم، ملائم اور سست رو کبھی تیز اور رواں دواں۔ ان کے طرز تخاطب کبھی سادہ، کبھی پیچیدہ، کبھی براہ راست اور خطیبانہ، کبھی تہ بہ تہ پردوں اور نقابوں میں دلکش بھی۔ مثلاً دیکھئے اس قطعہ کی آہنگ کتنا بلند اور پُر شور ہے ؎

ہمارے دم سے ہے کوئے جہاں میں اب بھی
عبائے شیخ و قبائے امیر و تاج شہی خجل
ہمیں سے سنتِ منصور و قیس زندہ ہے
ہمیں سے باقی ہے گل دامنی و کج کلہی

وہ کبھی اسی بات کو آہستہ سے مسکرا کر یوں کہہ دیتے ہیں ؎

اہل ستم کی بات کرو
عشق کے دم قدم کی بات کرو
بزم ثروت کے خوش نشینوں سے
عظمتِ چشم نم کی بات کرو
جان جائیں گے جاننے والے
فیض فرہاد و جم کی بات کرو

فیض کی سہل اور سادہ شاعری کی بات آئی تو ایک دلچسپ واقعہ اور سن لیجئے:

حیدرآباد سندھ کے جیل میں ہم پر پہرہ دینے کے لئے جو وارڈر مقرر تھے ان میں ایک صاحب تھے جن کو سب لوگ نواب صاحب کہہ کر پکارتے تھے۔ یہ حضرت کافی گورے چٹے اور موٹے تازے تھے اور ہر وقت پان کھاتے رہتے تھے اور سندھی اور پنجابی پہرے داروں کے درمیان ایسی ہی وردی میں ملبوس ہونے کے باوجود اپنی صاف شستہ اردو اور اس کے لہجے کی وجہ سے فوراً پہچانے جا سکتے تھے۔ دریافت کرنے پر انھوں نے بتایا کہ وہ لکھنؤ کے ہیں اور مغلیہ محل کے نوابوں کے خاندانوں کے چشم و چراغ ہیں (ویسے پاکستان پہنچ کر یوپی اور حیدرآباد دکن سے آئے ہوئے مہاجروں میں سے بہت سے لوگ نواب بن گئے ہیں) بہرحال ان صاحب کو جب معلوم ہوا کہ فیض شاعر ہیں اور میں لکھنؤ کے ایک جانے بوجھے شیعہ خاندان کا فرد تو ہم دونوں میں خاصی دلچسپی لینے لگے۔ ہم بھی ہمدردوں کی تلاش میں رہتے تھے۔ ان کے جذبۂ ہمدردی سے فائدہ اٹھا کر ہم ان سے چھوٹے موٹے غیر قانونی کام لے سکتے تھے جسے جیل کی اصطلاح میں "کرم" کہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ نواب صاحب شاعر بھی تھے۔ اپنی ہلکی پھلکی غزلیں فیض کو سناتے اور فیض سے کلام سنانے کی فرمائش کرتے لیکن فیض کلام سن کر تھوڑی سی تعریف کرکے چپ سادھ لیتے۔ ایک دن انھوں نے چپکے سے مجھ سے کہا حیدرآباد میں مشاعرہ ہونے والا ہے فیض صاحب ذرا ایسی سی غزل لکھ دیں لیکن ویسی نہیں جیسی فیض عام طور سے لکھتے ہیں جو فقیر صاحب کو زیادہ پسند نہیں آتی تو بڑا اچھا ہو اور نواب صاحب اسے مشاعرہ میں پڑھ دیں گے۔ میں نے فیض صاحب کو نواب صاحب کا پیغام پہنچا دیا اور یہ بھی کہہ دیا کہ اس لکھنؤ والے پر تمہارے کلام کا کوئی رعب بیٹھ جائیگا۔ اگر اسے خوش رکھنا ہے تو اس کے مطلب کی کہیں۔ فیض بولے بھئی لکھنؤ والوں کو خوش کرنا میرے لئے بہت مشکل ہے۔ آخر میں سیالکوٹ کا پنجابی ہوں لیکن کوشش کرتے ہیں۔ البتہ نواب صاحب سے کہو وہ اس کے عوض میں ہمارا کام کر دیں۔

نہ گل کھلے ہیں نہ ان سے ملے ہیں نہ مے پی ہے
عجیب رنگ میں اب کے بہار گزری ہے

دو ایک دن میں ہی فیض نے نواب صاحب کی فرمائش پوری کر دی اور یہ غزل لکھی ؎

تیری صورت جو دلنشیں کی ہے
آشنا شکل ہر حسیں کی ہے (بقیہ ص ۱۳ پر)

خوش سہرامی

فیض، حیات و کائنات کا شاعر

فیض احمد فیض کی جامع اور پہلودار شخصیت کا اگر ہمہ جانب ہو رہا تجزیہ کیا جائے تو یہ مشکل کسی بھی تنقید نگار کے سامنے آ سکتی ہے کہ مرحوم فیض پر کس نقطۂ نظر سے تنقید کی جائے! یہ سوال فیض کی تہہ دار شخصیت کے سلسلے میں پہلے بھی جواب طلب تھا جب وہ زندہ تھے۔ اور اب جب کہ وہ اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں اور ہمارے درمیان نہیں رہے اس سوال کی اہمیت اور بڑھ گئی ہے۔ غالباً فیض ان نابغۂ روزگار شعرا میں سے تھے جن کے بارے میں کہا گیا ہے ؎

سالہا در کعبہ و بت خانہ می نالد حیات
تا ز بزم عشق یک دانائے راز آید بروں

اس میں شک نہیں کہ فیض صاحب کی زندگی میں ان پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ لیکن مرحوم کے نقاد مجھے اجازت دیں تو میں کہنا چاہتا ہوں کہ فیض کی پہلودار اور حیات و کائنات کے تغیر پذیر حوال سے ہم آہنگ شخصیت پر کوئی ایسا ہمہ گیر جامع تبصرہ میری نگاہ سے کم ہی گزرا جس کے لئے مرحوم کی ذات گرامی اور ان کی شاعری متقاضی تھی۔ میں بھی اس معاملے میں اپنے عجز طبیعت کا اعتراف کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اگرچہ میری یہ بھی خواہش تھی کہ فیض کی شاعرانہ عظمتوں، فنی خوبیوں اور اردو ادب میں ان کے نمایاں کردار کی مثبت قدروں سے عوام کو متعارف کیا جائے اور ان انقلابی صداقتوں کا تجزیہ عصر حاضر اور روشنی کے تقاضوں کے تحت جدید نکتہ نظر سے کیا جائے جو مرحوم فیض کے شاعرانہ شعور اور فنکارانہ احساس کی ہمہ جہت [illegible] میں ضم ہو کے کارفرما ہیں۔ یہ ہی نہیں بلکہ [illegible]

جو عہد جدید کو ہر لحاظ سے متاثر کر سکے۔ اور یہ کہ فیض جیسا عظیم انقلابی شاعر، صاحب صحافی اور ترقی پسند سیاسی اور سماجی [illegible] دانش ور حقدار ہو کہ عہد حاضر کا نقاد و مبصر مرحوم فیض پر کام کرے۔ یہ تنقید و تحقیق کے ان فرائض سے عہدہ برآ ہونے کی سعی جمیل کریں گے جو ان کی ہنگامی موت کے ساتھ ان کے ذمہ داری پر عاید ہوتے ہیں اور کہ جس کا مطالبہ مرحوم کی روح آج بھی کر رہی ہے۔

فیض صاحب پر کچھ لکھنے سے پہلے دیکھنا یہ ہے کہ مرحوم کے خود خیال کے پس منظر کی حقیقی بنیادیں کس عقیدہ اور اصول پر رکھی گئی ہیں۔ اور ان کی باطنی زندگی میں داخلی و خارجی محرکات و مشاہدات، تجربات، شواہد اور تاریخی حقائق کا کہاں تک دخل ہے۔

ان باتوں کے علاوہ تنقید نگار کو شاعر زیر نظر کی ادبی حیثیت [illegible] ارتقا کے مختلف مرحلوں کا بھی گہری نظر [illegible] نظر انداز نہ ہو [illegible] تفصیل سے جائزہ کرنا ہوگا۔ جس سے ایک طرف تو شاعر کے تخلیقی شعور کا اندازہ ہو سکے اور دوسری طرف ادبی قدروں کی [illegible] سے بھی انصاف کیا جا سکے۔ لیکن یہ سب کچھ غیر جانبدارانہ صداقت اور خلوص کے اس معیار کے مطابق ہونا چاہیے جو ہر زمانے کے ادب و فن کی صحت مند قدروں کے لئے مخصوص ہے۔ دیگر معنوی و لسانی محاسن کے علاوہ فیض کا ادب روحانی قدروں سے بھی اپنا نرم و نازک لیکن خاص رشتہ رکھتا ہے جسے نظر انداز کر دینا آسان کام نہیں۔ مثال کے طور پر مرحوم مسلسل مہد گل، تغیر و انقلاب، [illegible]، زنجیر و سلاسل،

تیری فکر و نظر رکھنے والا ایسا باغی ہے جس کا رشتہ متحرک و بے باک زندگی کے نشیب و فراز سے اس قدر استوار ہے کہ کسی صورت بھی اسے توڑا نہیں جا سکتا۔ حسرت مرحوم نے قید بامشقت کے دوران کہا تھا ؎

ہے مشقِ سخن جاری چکی کی مشقت بھی
کیا طرفہ تماشہ ہے حسرت کی طبیعت بھی

فیض کو بھی راولپنڈی سازش کیس میں ایوب شاہی نے سزائے [illegible] کے بعد "دیس نکالا" دے دیا تھا۔ جلاوطنی کی حالت میں فیض نے بھی کچھ انہیں صعوبتوں کا ذکر کیا ہے۔ لیکن اپنے روایتی انداز میں، فرماتے ہیں ؎

مرے دل مرے مسافر ہوا پھر سے حکم صادر
کہ وطن سے دربدر ہوں، دیں گلی گلی صدائیں
کریں رخ نگر نگر کا کہ کوئی سراغ پائیں !!
کسی یار نامہ بر کا، ہر اک اجنبی سے پوچھیں
جو پتہ تھا اپنے گھر کا سرِ کوئے ناشناساں
ہمیں دن سے رات کرنا کبھی اس سے بات کرنا
کبھی اس سے بات کرنا

شبِ غم بری بلا ہے تمہیں کیا کہوں کہ کیا ہے
ہمیں یہ بھی تھا غنیمت جو کوئی شمار ہوتا
ہمیں کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا

(فیض)

مرحوم مولانا حسرت نے قید و بند کی مصیبتوں کے سیدھے سیدھے انداز میں کہہ کر اپنی شاعرانہ طبیعت کے "طرفہ تماشا" ہونے کا تجزیہ اظہار کیا ہے۔ چکی کی مشقت یعنی سامراجی جبر و استبداد کے باوجود مشقِ سخن جاری رہنے کا وہ مومن مسلم کا بے باکانہ اعلان کرتے ہیں جو ہر زمانے میں انقلابی مجاہدوں کا طرۂ امتیاز رہا ہے۔ جب کہ جلاوطنی کے صرف تصور سے ہی فیض کو "در بدر پھرنا"، گلی گلی صدائیں دینے"، اور نگر نگر کے پھیرے کا ذکر ایسے غم آمیز انداز میں کر گیا ہے جس سے وطن کے چھوٹ جانے اور دربدر کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور ہونے کی دل دوز درد و گداز حالت کا اظہار ہوتا ہے اور پھر یہ ارمان کہ کسی یار نامہ بر کا سراغ پردیس میں مل جائے۔ یا سرِ کوئے ناشناساں کسی اجنبی سے گھر کا پتہ پوچھیں اور اسی دھن میں ہمیں دن سے رات کرنا، کبھی اس سے بات کرنا، کبھی اس سے بات کرنا۔ یہ ہلکے پھلکے انداز میں گہرے غم و اندوہ کی وہ حالتیں ہیں جن کی ٹیس یا کسک کچھ وہی اہلِ دل جانتے ہیں جن کو غریب الوطنی کی ناخواستہ صعوبتوں کا سامنا کرنا پڑا ہو۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے ؎

بیٹھ جاتے ہیں جہاں چھاؤں گھنی ہوتی ہے
ہائے کیا چیز غریب الوطنی ہوتی ہے

"چھاؤں گھنی ہوتی ہے" کے چھوٹے سے ٹکڑے میں کتنی وسعتیں پنہاں ہوتی ہیں۔ کون جانے کہ مسافر کی مجبوری اس کی انا اور خودداری کے خلاف مجرمانہ حملہ ہے۔ اور اس کو مجبور غربت کر دینے والی مستبد قوت کے خلاف اس کا رد عمل کیا ہے! اور پھر اس کی بے بسی کا یہ عالم کہ اسے یہ سب کچھ بہرصورت برداشت کرنا ہوگا۔ فیض نے اس دردناک کیفیت کا اظہار اگرچہ "خون دل" میں انگلیاں ڈبو کر کیا ہے مگر نہایت قلندرانہ شان سے اور رندانہ لب و لہجہ میں جس سے باطنیت کے رستے ہوئے ناسور کی جھلک تو ملتی ہے لیکن اس کی شاعرانہ آن بان اور مجاہدانہ حق گوئی پر کوئی دھبہ نہ آئے۔ ظاہر ہوتا ہے کہ "وطن بدر" ہونے کا غیر منصفانہ بلکہ جابرانہ حکم سن کر احتجاجی تیز تحمل کے ساتھ کچھ شعر شاعر کے حساس دل کی گہرائیوں سے نکلے ہیں۔ وہ اچانک نہیں نکلے بلکہ یہ ایک ایسی چوٹ کو جھیلنے کے بعد اور اس کے نتائج پر صبر و شکیب کے ساتھ غور کرنے کا قدرتی رد عمل ہے جس کا یقین میدانِ صداقت میں لڑنے والے ہر سورما کو فطری طور پر ہوا کرتا ہے۔ فیض بھی جانتا تھا کہ منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لیے اس کے سامنے ایک خون کا دریا ہے اور پار اترنا ہے" اس کے رویے میں تصنع اور بناوٹ کا معمولی سا شائبہ بھی نظر نہیں آتا۔ اس لئے وہ کسی خوف و خطر کے بغیر کہہ اٹھتا ہے ؎

شبِ غم بری بلا ہے، تمہیں کیا کہوں کہ کیا ہے؟
ہمیں یہ بھی تھا غنیمت جو کوئی شمار ہوتا!

و پھر بقولِ غالب "ہیں کیا بُرا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا"۔ اب از روئے انصاف کہئے کہ فیض کی یہی سیدھی سادی باتیں کس قدر اثر انگیز ہیں؟ یہ اور بات ہے کہ جابر و سفاک حکمرانوں کے گناہ گار ضمیر اس سے متاثر نہ ہو سکے۔ تاہم شاعر نے اپنے جذبوں کے اظہار میں کوئی کسر نہ چھوڑی جو مرغِ بسمل کی طرح اس کے تحت الشعور میں تڑپ رہے تھے۔ اگرچہ سارے فسانے میں کسی ناگوار بات کا کوئی ذکر نہ تھا۔ پھر بھی فوجی مارشل اس کی آواز سے خوفزدہ ضرور تھے۔ اس لئے کہ یہ ایک بیباک قلندر کی سچی آواز تھی۔ جس سے باطل کے ایوانوں میں بار بار زلزلے آتے رہے۔

ان سب صداقتوں کا احاطہ کرنے کے بعد ضروری ہے کہ ماضی کے انقلاب آفریں تواریخ کے ان اوراق کی ورق گردانی کی جائے جن کا حقیقی تعلق "حیات و کائنات" کے ان مسائل سے ہے جنھیں ترقی پسند ادب (خواہ وہ کسی زبان کا ادب کیوں نہ ہو) نظر انداز نہیں کر سکتا۔ ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں نے ہمیشہ کے لئے پورے خلوص اور جرأت کے ساتھ مسائل سے نبرد آزما ہونے کا ذمہ اٹھا رکھا ہے۔ صرف ذمہ ہی نہیں بلکہ جیالے ادیب و شاعر اپنے قول کے اس قدر صادق رہے ہیں کہ انھوں نے اپنے عزائم کی تکمیل کے لئے بڑھ چڑھ کر قربانیاں بھی دی ہیں۔ جہاں وطن کے سرفروشوں نے آزادیٔ وطن کے لئے دار و رسن کو بوسہ دیکر ان فرائض کو اپنے لہو سے پورا کیا ہے۔ وہاں ان کے دوش بدوش لوح و قلم کے مجاہد ادیبوں اور شاعروں نے سامراج کے خلاف بغاوت کے شعلے بھڑکانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ تواریخ ادب گواہ ہے کہ میر و مصحفی سے لے کر اکبر الہ آبادی تک، اور اکبر سے اقبال و سیماب اور جوش تک غیر ملکی سامراج کے خلاف وہ بھرپور وار کئے کہ فرنگی حکمراں بدحواس ہو کر رہ گئے۔ مرحوم اکبر نے مغربی تہذیب و تمدن کو اپنے تیکھے لیکن گوارا طنز و مزاح سے یہاں تک آڑے ہاتھوں لیا کہ سامراجی نواز اور مغربی فیشن کے دلدادہ طبقے تڑپ اٹھے۔ مصحفی اور میر نے وطن اور اہل وطن کے تحقیر و تذلیل پر غم کے آنسو بہائے۔

میر مرحوم نے تو دلی کا مرثیہ کہہ کر دل کی بھڑاس نکالی۔ اور مصحفی کا یہ شعر تو آج بھی زبان زد خلائق ہے ؎

ہندوستاں کی دولت و حشمت جو کچھ کہ تھی
ظالم فرنگیوں نے بہ تدبیر کھینچ لی۔

مرحوم اقبال نے عوام کو فلسفۂ اتحاد و آزادی کے رموز سکھائے تو علامہ سیماب اکبرآبادی نے برطانوی غلبے کے خلاف ہجو ملیح کے تیر و نشتر چلائے اور اس کے شاطرانہ ویدسبہ کی دھجیاں فضائے آسمانی میں بکھیر کر ثابت کر دیا کہ ترقی پسند ادب نے ہر دور میں عوام کو راہ صواب دکھانے میں کبھی جھجک یا تذبذب سے کام نہیں لیا۔ لیکن شاعرِ انقلاب جوش ملیح آبادی نے سامراجی جبر و استبداد کے روبرو نہ صرف مدافعانہ قوت سے کام لیا بلکہ اپنی تاب سخن سے جارحانہ حملے کئے۔ یہی نہیں بلکہ جوش نے تو اپنی قوم کو بھی غلامی کے خلاف لڑنے کے لئے طعنے دے دے کر اٹھانے کی کوشش کی۔ "مادرِ ہند" کو جوش مرحوم نے اپنی جرأت مندانہ حمایت کا یقین دلاتے ہوئے کس یقین و اعتماد سے کہا کہ اے ہندوستان جس وقت تو مجھ کو پکارے گا میری تلوار غیروں کے سروں پر جگمگائے گی ؎

مری تلوار غیروں کے سروں پر جگمگائے گی
ترے ہونٹوں کی جنبش ختم بھی ہونے نہ پائیگی

سودگیہ رام پرشاد بسمل اور اشفاق اللہ حسرت مرحوم نے بھگت اور آزادی کے گیت گاتے ہوئے تختۂ دار کو لبیک کہا۔ یک جہتی و قومی یگانگت کے اس میدان میں آنجہانی چکبست مرحوم و مغفور حالی بھی سرگرم سخن نظر آتے ہیں۔ چونکہ ترقی پسند ادب کو زندگی کے معاملات سے کسی صورت الگ نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے اس ضمن میں تنقید کے ساتھ ساتھ تنقید و تفحص کی اہمیت کو مدنظر رکھنا ضروری ہے۔ ادب و احتساب کا یہ وہ سنگم ہے جہاں تنقید و تحقیق کی مشترکہ افادیت کے بغیر معاملات سلجھائے نہیں جا سکتے۔

جناب فیض کا جنم ۱۹۱۵ء میں سیالکوٹ کے مقام پر ہوا۔ ان کی تعلیم و تربیت لاہور میں ہوئی۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد فیض کا تقرر ایک کالج میں پروفیسر کے طور پر ہو گیا۔

۔۔۔ سے ترقی پسندوں کے امام ڈاکٹر تاثیر کالج کے پرنسپل تھے۔ ان کی جوہر شناس نظروں نے فیض کو پہچان لیا اور اس کے جوہر نکھارنے، سنوارنے میں انھوں نے عالمانہ شفقت و سچائی کے ساتھ رہنمائے کامل کا کام کیا۔ تاثیر صاحب کی سرپرستی میں فیض کی شاعری پھولنے پھلنے لگی اور وہ ناموری و شہرت کے اس مقام کی طرف تیزی سے بڑھنے لگے جو ہر ایک کو نصیب نہیں ہوتا۔ اس میں شک و شبہہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اگر مرحوم فیض کی زندگی میں ڈاکٹر تاثیر نہ آتے تو فیض کی ادبی تاریخ کچھ اور ہوتی۔ علاوہ ازیں یہ بھی حقیقت ہے کہ راولپنڈی سازش کیس (۱۹۵۱ء) نے بھی اس معاملے پر سونے پر سہاگہ کا کام کیا۔ اگر فیض کو سازش کے اس مقدمہ میں ماخوذ نہ کیا جاتا تو وہ ذاتی تجربہ و مشاہدہ کی روشنی میں ان تلخ حقائق کی شدتوں سے بہرہ ور نہ ہوتے۔ اور ان کے شاعرانہ شعور پر سیاسی مصلحتوں کے وہ گھناؤنے راز فاش نہ ہونے پاتے جو برسرِ اقتدار مستبد فوجی حکمرانوں کے خبث نیت کا واضح ثبوت تھے۔ یوں تو اردو ادب ماضی میں ایک بدیسی طاقت کے ساتھ برطانوی سامراج سے آمنے سامنے ٹکرا کر فتح یاب ہونے کا تجربہ کر چکا تھا لیکن آزادیٔ وطن کے بعد اپنے ہم مذہب حکمرانوں کی مکارانہ فریب کاریوں سے واقف نہیں تھا۔ مرحوم فیض پر شاید پہلی بار یہ حقیقت ظاہر ہوئی ہوگی کہ فسطائی حکومتوں کا کوئی دین ایمان نہیں ہوتا۔ اور ان کے بربریت پسند دل و دماغ پر اخلاقی اصولوں کا کوئی اثر نہیں ہو سکتا۔ تعجب تو اس بات پر ہے کہ وہ انگریز جنھیں عام طور سے اسلامی اصطلاح میں کافر و مرتد کہا جاتا ہے۔ صداقت و عدم تشدد (ستیہ، اہنسا) جیسے اخلاقی اصولوں سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے۔ لیکن وہ پاکستانی حکمران ایک مسلمان شاعر کی حقیقت پسندانہ جسارت کو گوارا نہ کر سکے۔ جن کو اسلامی اخوت کا دعویٰ تھا۔ مرحوم فیض جیسا خوددار اور حساس شاعر محض اسلام کے نام پر اس ریاکارانہ بربریت کے آگے سرِ تسلیم خم نہیں کر سکتا تھا کیوں کہ اس کے اندر ایک بے باک روح تھی اور فطرتاً اسے اعلائے کلمۃ الحق کے لئے بے باک قلم عطا کیا گیا تھا۔ راولپنڈی سازش کیس (۱۹۵۱ء) فیض کی زندگی کا واحد وہ حادثہ ہے جس نے اسے محشرِ خیال بنا کے رکھ دیا۔ یوں تو فیض زندگی بھر غمِ جاناں و غمِ دوراں کا شکار رہے۔ اور گردشِ حالات کے تحت مسلسل جد و جہد ان کی زندگی کا حصہ بن کر رہ گئی تھی۔ لیکن راولپنڈی کے مقدمہ سازش نے تو نہ صرف ان کے عقائد کی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیا۔ بلکہ وقتی طور پر ان کے عقیدوں میں بھی انقلاب آگیا۔ ان حالات میں اس دور کے ہر ترقی پسند ادیب، شاعر کو ذہنی گھاؤ لگے۔ کیونکہ وہ سرکاری جبر و استبداد سے کسی قیمت پر بھی سمجھوتہ نہ کر سکتے تھے۔ اس مقدمہ میں فیض کے علاوہ کچھ دیگر ترقی پسند شعرائے اردو کو گرفتار کر لیا گیا۔ فیض کو حکومت کے خلاف بغاوت کے جرم میں چار سال قید کی سزا دی گئی۔ ادبی شخصیتوں کے علاوہ کچھ فوجی افسروں کو بھی پابندِ زنجیر و سلاسل کر دیا گیا۔ قید و بند کی صعوبتوں کے علاوہ مرحوم فیض پر جو بھیانک وار کیا گیا۔ وہ یہ کہ اسے لکھنے پڑھنے کی رعایت سے محروم کر دیا گیا جس کا فیض پر شدید ردِ عمل ہوا۔ اور اس نے بپھرے ہوئے جذبات کو تسکین دینے کے لئے اس سرکاری چیلنج کا جواب یوں دیا کہ ؎

متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو غم ہے!
کہ خونِ دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے

جناب فیض مرحوم کا تعلق بیسویں صدی کی اس پیڑھی سے تھا جس نے پہلی جنگ عظیم کے آغاز و انجام سے کچھ پہلے جنم لیا۔ مثلاً میراجی، ن۔م۔ راشد، اختر الایمان، سردار جعفری، معین احسن جذبی، مخدوم محی الدین، مجاز (اسرار الحق مجاز) مجروح اور جاں نثار اختر، وغیرہ۔ ان میں کچھ ایسے اربابِ قلم بھی تھے جو تیسری دہائی کے وسط تک جوان ہو چکے تھے۔ یہ زمانہ متوسط طبقہ کی بیداری کے لئے نہایت سازگار زمانہ تھا۔ اور اسی زمانے میں تیزی سے بدلتے ہوئے حالات نے فیض کے سیاسی شعور کے لئے بھی تازیانے کا کام کیا۔ سیاسی شعور کے ساتھ ان کے اندر اٹھتی ہوئی رومانی اور جمالیاتی مستی نے بھی انگڑائی لی۔ ان دونوں کیفیتوں کے حسین امتزاج نے فیض کے فن کو نکھار عطا کیا کہ فیض کی سیاسی، رومانی اور جمالیاتی

حیثیت میں کوئی فرق نہ رہا۔ گویا ان کے ذوقِ سلیم کی کٹھالی میں تپ کر جلالِ شاعرانہ خوبیاں ہم آہنگ ہو کر رہ گئیں۔ یہی وجہ ہے کہ فیض کو کچھ نقادوں نے اسے مجذوب کہا اور کسی نے اسے سالک سمجھا۔ حالانکہ "جذب و سلوک" کی مستیوں نے باہم شیر و شکر ہو کر فیض کی قلندرانہ شان پر مہرِ تصدیق ثبت کر دی تھی۔ غلط نہ ہوگا۔ اگر کہہ دیا جائے کہ فیض کی قلندری جذب و سلوک اور حال و قال کی حدوں سے بالاتر ہو کر اس مقام پر جلوہ گر تھی جہاں

"جو رفعتوں میں بامِ مشیت سے کم نہ تھا" (جوش)

اس دعوی کی دلیل میں فیض صاحب کے یہ شعر پیش کئے جا سکتے ہیں ؎

لب پہ حرفِ غزل، دل میں قندیلِ غم
ہم چلے آئے لائے جہاں تک قدم

اپنا غم تھا گواہی ترے حسن کا
دیکھ قائم رہے اس گواہی پہ ہم

اس میں کوئی شک نہیں کہ فیض مرحوم نے زندگی بھر تابِ سخن اور جولانیٔ قلم سے وہ کام لیا جس کی اردو ادب کی زندگی اور معاشرے کی فلاح و بہبود کے لئے ہر زمانے میں ضرورت رہی ہے۔ مرحوم شاعر نے قید و بند کے ہلاکت خیز زمانے میں اپنی مشہور نظم "زنداں نامہ" تخلیق کی۔ اور یہ حقیقت ہے کہ آج سے تیس پینتیس برس پہلے زنداں نامہ کو جو قبولِ عام حاصل ہوا۔ آج تک بھی اس میں کوئی کمی نہیں آئی۔ بقولِ اقبال ؎

دل سے جو آہ نکلتی ہے اثر رکھتی ہے
پر نہیں طاقتِ پرواز مگر رکھتی ہے

اگر زندگی کے تیز رفتار عمل سے پیدا ہونے والے انقلابی نتائج پر کسی کا اختیار نہیں ہوتا تاہم حساس طبیعت رکھنے والے ادیب و شاعر حسبِ استعداد اپنا ردِ عمل ظاہر کرنے میں پیچھے نہیں رہتے۔ اور اس سے کم از کم اتنا فائدہ تو ہو سکتا ہے کہ سماج کے لئے ان دھندلکے گھاٹیوں میں نئی نئی راہیں مہیا کر کے وہ مدافعانہ قوت پیدا کر دیں جو ہر نو فنکار ادا کر سکتے ہیں۔ منطقی عالم اور نہ بے حس سماعت والی۔

عوام کو متاثر کرنے کی صلاحیت قدرت نے صرف شاعروں اور ادیبوں کو عطا کی ہے۔ جو حیات و کائنات کے اجتماعی و انفرادی رشتوں پر نہ صرف گہری نظر رکھتے ہیں۔ بلکہ ان کی فطری و نفسیاتی تنوع اور تلون مزاجی سے بھی کما حقہٗ واقف ہوتے ہیں۔ عرفانِ حقیقت کا یہی وہ مقام ہے جہاں ان کی مستقبل شناس نگاہیں یقین و اعتماد اور کبھی کبھی سادگی اور معصومیت کے ساتھ ان اہم حقائق کی نقاب کشائی کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہیں۔ جو وقت و حالات کے پردوں میں بے تاب و بے قرار ہوتے ہیں کہ کسی دانائے راز کی نگاہِ دور رس ان تک پہنچ جائے۔ ان حالات میں رمز شناس اربابِ قلم کی تخلیقات کو الہام کا درجہ نصیب ہو جاتا ہے اور اس کی شاعری کو جزو ئیست از پیغمبری کی سند عطا کرنے سے ادب کا مورخ انکار نہیں کر سکتا۔ فیض کے یہاں بھی الہام و بشارت کا یہ سلسلہ کہیں کہیں ملتا ہے۔ جس سے جبر و استبداد کے خلاف اکثر عوام کے یقین و اعتقاد کو تقویت ملتی رہی ہے۔ حوصلہ شکن حالات میں بھی وہ عوام کو للکارتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

اے خاک نشینو! اٹھ بیٹھو، وہ وقت قریب آپہونچا ہے
جب تخت گرائے جائیں گے، جب تاج اچھالے جائیں گے

تسلیم کہ فیض شاعرِ انقلاب تھا۔ لیکن اس نے نہ تو مرحوم جوش ملیح آبادی کی سی گھن گرج سے سماعتِ عامہ کو جھنجھوڑنے کی کوشش کی۔ اور نہ ہی اقبال کی فلسفیانہ لے میں علم احساس و تفکر کی گہرائیوں کی آزمائش کو پسند کیا۔ فیض صاحب نے جو بات بھی کہی، خواہ وہ بات سیاسی تھی، فلسفیانہ تھی، یا رومانی اس نے ہر خیال کے لئے مخصوص ترا شیدہ انداز ہی کو اظہار و ترسیل کا ذریعہ بنایا۔ فیض اول و آخر شاعر تھے اور شاعر ہی رہے۔ جوش و اقبال سے ہٹ کر اس نے کچھ ایسا اسلوب بیان اپنایا جس میں شعریت، سوچ، رس، رنگ اور مٹھاس کی لہریں صاف صاف جھلکتی دکھائی دیتی ہیں۔ مرحوم علامہ سیماب اکبرآبادی کی طرح فیض بھی حیات و کائنات کا نباض و مفکر ہے اور فکر و فن اور لہجہ و آہنگ کی ہر سطح پر اپنی پوری پوری پہچان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کڑوی سے کڑوی بات کو بھی میٹھے اور پُر خلوص لہجے میں کہہ دینے کا ڈھنگ جانتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ فیض کی مکمل شاعری ان ہی پہلوؤں سے مکمل واقف ہونے کے باوجود

"ذرا یا تلخ ترمی زن" کا قائل نہیں۔ وہ گردشِ روزگار کے مخالف و مہلک تھپیڑوں کو تیکھی نظروں اور جگرلے تیوروں سے دیکھنا پسند نہیں کرتا۔ بلکہ اسے اپنے ستادہ تحمل اور فنکارانہ تبسم پر بھروسہ تھا اور وہ اسی خوبی کے ذریعہ کڑی سے کڑی مصیبت میں بھی کبھی نہیں گھبرایا۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیشہ اس کا تیر نشانے پر بیٹھتا ہے اور وہ حالات سے کبھی شکست نہیں کھاتا۔ مخالف طاقتوں کو تند تیز یا تلخ و ترش لہجے میں دعوتِ مبارزت دینے کے فیض عادی نہیں کیوں کہ غیر شاعرانہ تلخ و ترش کسی فنی تہذیب اور ادبی شرافت کے سراسر خلاف ہے۔ اسے ہر جارحانہ حملے کا جواب مسکراہٹوں اور دلیلوں سے دیکر انہیں متاثر کرنے کا سلیقہ آتا ہے۔ تغیر و انقلاب کے تیز طوفانوں کے سامنے بھی اس کے پائے استقلال میں کبھی لغزش نہیں آئی۔ مشکل ترین حالات میں بھی پورے حوصلہ اور عزم کے ساتھ فوری فیصلہ دینے کی صلاحیت اسے فطرتاً حاصل ہے۔ فیض اپنے فیصلوں کی صداقت میں کامل یقین و اعتماد کے ساتھ راہِ عمل تجویز کر سکتا ہے۔ اس کی انگلیاں ہمیشہ وقت کی نبض پر رہتی ہے۔ فیض کی قوتِ فکر اور پروازِ خیال وقت کے ساتھ ہم رفتار رہکر فیصلہ دے سکتی ہے کہ ؎

یہی جنوں کا یہی طوق و دار کا موسم
یہی ہے جبر یہی اختیار کا موسم
قفس ہے بس میں تمہارے تمہارے بس میں نہیں
چمن میں آتشِ گل کے نکھار کا موسم

۶۵ ۔ ۱۹۶۴ء میں فیض کے لئے اس کی بدقسمتی طبع بلا ہو گئی اور شکست خوردہ ایوب شاہی نے اسے وطن بدر کر دیا۔ دیس نکالے کے اس صبر آزما دور میں وہ بھارت آگئے اور کم و بیش تین چار برس تک یہاں قیام پذیر رہے۔ یہاں عوام اور عوامی نمائندوں نے انہیں سر آنکھوں پر بٹھایا۔ ارباب قلم نے فیض کے اعزاز میں ادبی محفلوں اور مشاعروں کا اہتمام کیا۔ سرکاری اور غیر سرکاری طور پر ان کی خاطر داری اور مہمان نوازی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا گیا۔ میری خوش قسمتی کہ جلا وطنی کے اس زمانے میں مجھے بھی کچھ دوستوں کے ساتھ ترقی پسندوں کے اس رہنما سے دو باتیں کرنے کا مختصر لیکن اہم موقع نصیب ہوا۔ جس کی مجھے دیرینہ خواہش تھی۔ عندالملاقات جناب فیض سے امروز بالاقطعہ جبر و اختیار کا موسم سن کر میں نے بھی اپنی رباعی پیش کرنے کی جسارت کی ؎

ساون ہے کہ اربابِ یقیں کا موسم
یہ دانش و آگاہی و دیں کا موسم
آ پہونچا ہے الہام کے نغمے لیکر
رندانِ خراباتِ نشیں کا موسم

مرحوم فیض نے رباعی سنی اور داد دیکر میری حوصلہ افزائی کی۔ تبرکاً مندرجہ ذیل اشعار عطا فرمائے ؎

شامِ فراق آگئی اور وہ آ کے ٹل گئی
دل تھا کہ پھر بہل گیا جاں تھی کہ پھر سنبھل گئی
جب تجھے یاد کر لیا صبح مہک مہک اٹھی
جب ترا غم جگا لیا رات مچل مچل گئی

فیض جب تک زندہ رہا۔ اس نے حقیقت پسند ادب کی روایات کا پرچم اٹھائے رکھا۔ وہ مصورِ حیات تھا۔ اور اس نے تفکر پسند لوگوں کے جذبات کی حتی الامکان عکاسی کی۔ اپنے وقت کے غیر جمہوری نظام اور اس کا منصفانہ طریقۂ کار سے ٹکرانے والے اس شاعر نے زندگی بھر استحصال پسند اور بورژوائی نظام کی بدعتوں کو ننگا کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ یہ ہی نہیں بلکہ اس نے سخت گیرانہ نظام کی زنجیر و سلاسل کو توڑنے کی کوشش کی تاکہ عام انسان کے اس داخلی جذبے اور باطنی عمل کو پیش کیا جائے۔ جو آزادی کے باوقار زمانے کا بے صبری سے منتظر ہے۔ فیض میں یہ خوبی بھی ہے کہ وہ اپنے مشاہدہ و تجربہ کا اظہار کرنے میں پوری طرح دیانتدار ہے۔ وہ بناوٹ یا مبالغے سے کام لینے کا عادی نہیں۔ وہ جیسا دیکھتا ہے یا محسوس کرتا ہے اپنے پسندیدہ انداز اور عوامی زبان میں خلوص کے ساتھ بیان کر دیتا ہے۔ کم و بیش اپنے دور کے عام قاری کے لئے وہ ناقابلِ فہم نہیں۔ یہ اس کی اہم خصوصیت ہے جس کی مثال آسانی سے نہیں مل سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ فیض کا مطالعہ کرنے والے اسے بار بار پڑھ سکتے ہیں۔ اور [illegible]

حقائق سے خالصتاً رد عمل میں استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ میں ذاتی طور پر بھی اس حقیقت کو جانتا ہوں کہ فیض زندگی بھر ایسے منصفانہ سماجی نظام کے سپنے دیکھتے رہے جو عام آدمی کی ترقی کے مناسب مواقع فراہم کرنے کی ذمہ داری پوری کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ خود جناب فیض کا دعویٰ ہے کہ وہ عالمی بھائی چارے کا شاعر ہے۔ اور نہایت خلوص و محبت کے ساتھ وہ اپنے اسی عقیدے کے ساتھ ہمیشہ علمبردار رہا ہے۔ اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ اس کا یہ دعویٰ حق بجانب ہے۔ فیض مرحوم پر ماہ، میں انسان دوستی اور انسان پرستی اور اخوت کا قدآور مبلغ اور مثار نظر آتا ہے۔ اور اس نے شعر و سخن کے وسیلے سے انسانی سماج کو باہمی اتحاد و محبت کا جو پیغام دیا ہے۔ اس کی ضرورت و اہمیت ماضی سے بھی زیادہ عصرِ حاضر میں محسوس ہوتی ہے اور یقیناً مستقبل میں بھی ہوتی رہے گی۔ بقول فیض ؎

زنداں میں بھی وہ تلاشِ بہار کرتے رہے
شبِ سیاہ سے طلبِ حسنِ یار کرتے رہے
نہیں شکایتِ ہجراں کہ اس وسیلے سے
ہم ان سے رشتۂ غم استوار کرتے رہے
انہیں کے فیض سے بازارِ عقل روشن ہے
جو گاہ گاہ جنوں اختیار کرتے رہے

فیض کا وہ بار خیالات اور کیفیت عشق و جنوں سے بحث کرنے میں بھی اپنے مخصوص معتقدات کا اظہار کرنے سے نہیں کتراتے۔ خواہ وہ ان کی بحث متنازعہ ہی کیوں نہ ہو۔ غالب مرحوم کا خیال ہے کہ وہ کام کے آدمی تھے لیکن عشق نے انہیں نکما کر دیا تھا۔ جب کہ فیض کا کہنا ہے۔

"وہ لوگ بہت خوش قسمت تھے جو عشق کو کام سمجھتے تھے یا کام سے عاشقی کرتے تھے ہم جیتے جی مصروف رہے کچھ کام کیا کچھ عشق کیا اور عشق سے کام الجھتا رہا کام عشق کے آڑے آتا رہا پھر آخر ہم نے تنگ آ کر دونوں کو ادھورا چھوڑ دیا۔"

دل و دماغ کی فطری کشمکش سے قطع اب یہ سوال بجائے خود طلب ہے کہ فیض کے نزدیک عشق کیا چیز ہے؟ بالخصوص محبت و ترکِ محبت کے معاملے میں ان کا مسلک کیا تھا؟ اور کس حد تک منجمد؟ شاید اس مسئلہ پر شعرائے دلی و ماں اور دیگر شعراء قدیم و جدید جناب فیض کے ساتھ متفق نہیں ہو سکتے۔ مرحوم مخمور دہلوی صاحب کی طرح تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ ؎

محبت کی نہیں جاتی محبت ہو ہی جاتی ہے
یہ شعلہ خود بخود بھڑکتا ہے بھڑکایا نہیں جاتا

اور پھر یہ بھی مخمور صاحب کا یہ فیصلہ ہے کہ ؎

محبت کے لئے کچھ خاص دل مخصوص ہوتے ہیں
یہ وہ نغمہ ہے جو ہر ساز پر گایا نہیں جاتا

لیکن فیض کا عقیدہ یہ ہے کہ

"اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا"

فیض کو ترقی پسند میر کہا جائے یا انقلاب پسند غالب لیکن یہ حقیقت ہے کہ وہ حقیقت پسند شاعر تھے۔ جو میر کی طرح تیوری چڑھا کر کہہ سکتا ہے ؎

گرو کج جبیں یہ سرِ کفن مرے قاتلوں کو گماں نہ ہو
کہ غرورِ عشق کا بانکپن پسِ مرگ ہم نے بھلا دیا

اس میں میر کے جذبۂ عشق کے ساتھ ساتھ غالب مرحوم کا لاابالیانہ انداز بھی تھا۔ ملاحظہ فرمایئے کس شان استغنا سے کہا ہے ؎

نہ رہا جنونِ رخِ وفا یہ رسن یہ دار کرو گے کیا؟
جنہیں جرمِ عشق پہ ناز تھا وہ گناہ گار چلے گئے

فیض مرحوم داد و ستد کے معاملے میں بھی مخصوص معیار رکھتے تھے۔ وہ شعر فہم سے داد ملنے پر خوش ہوتے لیکن کسی نااہل کی داد پر کوئی رد عمل ظاہر کئے بغیر چپ رہتے تھے۔ اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ اس معاملے میں وہ سخت گیر تھے۔ بلکہ اس کے برعکس فیض نہایت منکسر المزاج، کریم النفس اور مرنجان مرنج آدمی تھا۔ البتہ فن اور داد شعر کے معاملے میں اس کا معیار دیگر اربابِ فن سے کچھ الگ تھا۔ زندگی کے ہر معاملے میں فیض مرحوم کی وضعداری، مروت، بزرگانہ شفقت و سنجیدگی مشہور تھی۔ اور جوانوں میں ان کی زندہ دلانہ شوخی اور بذلہ سنجی کے چرچے رہتے تھے۔

حقیقتاً فیض پرانی دنیا تہذیب کا حسین سنگم ہونے کے باوجود جدید روایات شعر و ادب کے روح رواں بھی تھے۔ حالانکہ شروع سے وہ اگر یہ بھی کہہ سکتے تھے کہ "مجھ سے پہلی سی محبت میرے محبوب نہ مانگ" تم رعنائی کے تمام تجربات حقائق کے راز اس پر فاش کر دیئے گئے۔ اور وہ کہہ اٹھا ؎

میں نے سمجھا تھا کہ تو ہے تو درخشاں ہے حیات
تیرا غم ہے تو غم دہر کا جھگڑا کیا ہے

لیکن فیض ان مشاہدات کی روشنی میں، جو اس کے سامنے آئے۔ انہیں کہنا پڑا ؎

اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا
مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ!

فیض کے کلام میں غنائیت اور سنجیدہ تقاضوں کے ساتھ ساتھ زندگی کی صداقتوں کی تہہ تک پہنچنے کی تمنا بے قرار دکھائی دیتی ہے۔ اور وہ وقت اور حالات کے مطابق ادب و فن کی اس خارجی توانائی کا گہرا احساس رکھتا ہے۔ جو زندگی کو ناقابل تسخیر، ولولہ، جوش اور امنگ عطا کرتی ہے۔

فیض کی موت کو دنیائے شعر و ادب کے لئے بہت بڑا حادثہ کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا۔ ان کی موت ایک فرد واحد یا شاعر کی موت نہیں بلکہ "مرگِ انجمن" کے مترادف ہے۔

وہ اپنی ذات میں ایک ایسا ادارہ تھا۔ جو انقلاباتِ زمانہ کا رخ حسب تقاضا موڑ سکتا تھا۔ اس عظیم فن کار کی موت کے ساتھ ترقی پسند کا وہ دور تھا جس نے تاریخ پر غیر فانی اثرات مرتب کئے۔ بقول خوش ؎

نگاہ بلند، دل آمیز، ذوقِ بے پایاں
رموزِ دانِ حقیقت تھا اگر مجاز تھا تو
تری نگاہ کو جس نے جہاں کو جان لیا
جہاں میں کو نہ سمجھا وہ ایک راز تھا تو

شاید حافظ شیرازی نے فیض جیسی غیر فانی شخصیتوں کے بارے میں فرمایا ہے ؎ ہرگز نمیرد آں کہ دلش زندہ شد بہ عشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

فیض احمد فیض : ایک انقلابی شاعر

غفار شاکر

وہ بات جس نے مرحوم فیض احمد فیض کو ایک عالمی فن کار اور ایک سیاسی مفکر کی حیثیت بخشی، انکی انقلابی شاعری ہے۔ انقلاب کے بارے میں ان کا تصور عام تصور سے الگ ہی تھا۔ انقلاب کا مفہوم اُن کے نزدیک اس سیاسی سماجی نظام کو بدل دینا تھا۔ جو ناکارہ ہو چکا ہے اور اس کی جگہ ایسا نظام لانا تھا جو بدلے ہوئے نظام سے مطابقت رکھتا ہو، اور اس کے لئے جس قسم کے انقلاب کا تصور انھوں نے کیا تھا، وہ تھا نفسیاتی انقلاب، جس میں نہ صرف سماج کا ظاہری ڈھانچہ ہی نہیں بدلا جاتا بلکہ دل و دماغ بدلے جاتے ہیں، زندگی کی قدریں تبدیل کی جاتی ہیں اور انسانوں پر محنت کرکے ایسے افراد ڈھالے جاتے ہیں جو آگے جاکر انقلاب مطلق کے باعث بنتے ہیں۔ ادب اس قسم کے انقلاب کے باعث مددگار ہو سکتا ہے۔ اس لئے کہ وہ زندگی کی اعلیٰ قدروں کا ہمیشہ سے ہی حامل و حامی رہا ہے۔

انجمن ترقی پسند مصنفین سے وابستہ ہو کر فیض مرحوم نے اسی نفسیاتی انقلاب کے لئے جدوجہد کی، بلکہ وہ اس انقلابی عمل کا نمونہ تھے جس کی دوسری مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔ اس انقلاب کے لئے سب سے پہلے انھوں نے خود اپنی ذات میں انقلاب پیدا کیا۔ وہ ایک خوش حال گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے والد افغانستان میں چیف سکریٹری کے عہدے پر فائز تھے۔ ابتدائی عیش و آرام میں ان کی پرورش ہوئی تھی۔ زندگی کے اسی ظاہری حسن نے انھیں حسن پرست بنا دیا تھا۔ تعلیم کے لئے انگلینڈ گئے، تو لوٹتے وقت اپنے ساتھ ایک ولایتی میم لے آئے۔

شاعری شروع کی تو حسن و عشق کی واردات کو اپنا موضوع سخن بنایا لیکن جوں ہی انجمن ترقی پسند مصنفین کے ساتھ جڑ کر انقلاب کا پرچم اپنے ہاتھ میں لیا۔ غم جاناں کو بھول کر غم دوراں کی بات کرنے لگے۔ ان کے سب سے پہلے مجموعۂ کلام "نقش فریادی" کے نصف ثانی کی پہلی ہی نظم کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں ؎

جا بجا بکتے ہوئے کوچہ و بازار میں جسم
خاک میں لتھڑے ہوئے خون میں نہلائے ہوئے
جسم نکلے ہوئے امراض کے تنوروں سے
پیپ بہتی ہوئی گلتے ہوئے ناسوروں سے
لوٹ جاتی ہے ادھر کو بھی نظر کیا کیجے
اب بھی دلکش ہے ترا حسن مگر کیا کیجے
اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا
مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ

عشق و محبت کے علاوہ زمانے کے اور دکھوں اور وصل کی راحت کے بجائے اور راحتوں کی حمایت نے مرحوم فیض احمد فیض کو ایک [illegible] انقلاب ندا

کردیا تھا اس کا اندازہ ان کے ہی ان اشعار سے لگایا جاسکتا ہے ؎

جب کبھی بیٹھ کے روتے ہیں وہ بےکس جن کے
اشک آنکھوں میں بلکتے ہوئے سو جاتے ہیں
ناتوانوں کے نوالوں پہ جھپٹتے ہیں عقاب
بازو تولے ہوئے منڈلاتے ہوئے آتے ہیں
جب کبھی بکتا ہے بازار میں مزدور کا گوشت
شاہراہوں پہ غریبوں کا لہو بہتا ہے
آگ سی سینے میں رہ رہ کے ابلتی ہے نہ پوچھ
اپنے دل پر مجھے قابو ہی نہیں رہتا ہے

ایک سوال مجھے رہ رہ کے پریشان کرتا رہا اور شاید آپ کے ذہنوں میں بھی ابھر رہا ہو کہ آخر فیضؔ کی ذات میں یہ تبدیلی کیوں کر پیدا ہوئی۔ آیئے اسے سمجھنے کے لئے رابرٹ فراسٹ کی نظم کے اس مصرع پر غور کریں :

"میرا اور دُنیا کا جھگڑا دو پریمیوں کا جھگڑا ہے"۔

مرحوم پروفیسر آل احمد سرور نے اس مصرع کی بڑی اچھی تشریح کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں :

"شاعر زندگی سے محبت کرتا ہے اور کبھی کبھی وہ زندگی کے ایک بلند مقصد کی خاطر زندگی ہی کے سستے اور کاروباری تصوّر سے لڑتا ہے۔ شاعر کے خواب صرف خیالی دُنیا کی پرچھائیاں نہیں ہوتے بلکہ ان میں ایک گہری اور روشن حقیقت کی کرن ہوتی ہے۔ اس کرن کی خاطر وہ اندھیروں سے ہی نہیں سورج سے بھی لڑنے کو تیار ہو جاتا ہے۔ زندگی کی بصیرت اور ایک دردمند دل شاعر کی دولت ہے۔ بصیرت تو اسے فطرت سے ملتی ہے مگر اس میں جِلا زندگی کے سوز و ساز اور درد و داغ سے ہوتی ہے۔"

اس تشریح کی روشنی میں جب ہم مرحوم فیض احمد فیضؔ پر غور کرتے ہیں تو اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ شاعر ہونے کی حیثیت سے دردمند اور حساس دل اور زندگی کی بصیرت تو انھیں حاصل تھے ہی۔ ان میں جِلا پیدا ہوئی جب انھوں نے ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہو کر مظلوم و بے سہارا لوگوں کے دکھ درد کے بارے میں سوچنا شروع کیا وہ ان سے متاثر ہوئے بنا نہ رہ سکے۔ جس کے نتیجے میں انھوں نے اپنی اسی دُنیا کے خلاف لڑائی چھیڑ دی جس نے انھیں تو سب کچھ دیا تھا لیکن دوسرے بےشمار انسانوں کو دکھ درد، ناانصافیوں اور محرومیوں کے اور کچھ نہیں۔ ان کی زندگی کے اندھیروں کے مقابلے میں فیضؔ کو اپنی زندگی کے اُجالے ہیچ لگنے لگے۔ ان اندھیروں کو دور کرنا انھوں نے اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا۔ اور اس عظیم مقصد کی خاطر اپنی ہی زندگی کے چکا چوند کر دینے والے اُجالوں میں کھوئے رہنے کے گھٹیا تصوّر کے خلاف انھوں نے جنگ شروع کر دی۔ اس کے بعد ان کی شاعری کے موضوع بن گئے یہ ؎

جن دیکھتے ہوئے شہر دنیا کی فراواں مخلوق
کیوں فقط مرنے کی حسرت میں جیا کرتی ہے
یہ حسیں کھیت پھٹا پڑتا ہے جوبن جن کا
کس لئے ان میں فقط بھوک اُگا کرتی ہے

یہ ہر اک سمت پُراسرار کڑی دیواریں
جل بجھے جن میں ہزاروں کی جوانی کے چراغ
یہ ہر اک گام پہ ان خوابوں کی مقتل گاہیں
جن کے پرتو سے چراغاں ہیں ہزاروں کے دماغ
اپنا موضوعِ سخن ان کے سوا اور نہیں
طبعِ شاعر کا وطن ان کے سوا اور نہیں

انھیں موضوعات کی آگ سے انھوں نے انقلاب کی مشعل روشن کی جس نے نہ جانے کتنوں کے دل و دماغ روشن کئے، کتنوں کے لہو کو گرمایا اور کتنوں کے سینوں میں بغاوت کے شعلے بھڑکائے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ان کے یہ اشعار زبان زدِ خاص و عام ہو گئے ؎

اے خاک نشینوں اٹھ بیٹھو وہ وقت قریب آپہونچا ہے
جب تخت گرائے جائیں گے جب تاج اُچھالے جائیں گے

[illegible]

غزل

فیض احمد فیض

ستم کی رسمیں بہت تھیں لیکن نہ تھی انجمن سے پہلے
سزا، خطائے نظر سے پہلے عتاب جرمِ سخن سے پہلے

جو چل سکو تو چلو کہ راہِ وفا بہت مختصر ہوئی ہے
مقام ہے اب کوئی نہ منزل، فرازِ دار و رسن سے پہلے

نہیں رہی اب جنوں کی زنجیر پر وہ پہلی اجارہ داری
گرفت کرتے ہیں کرنے والے خرد پہ دیوانہ پن سے پہلے

کرے کوئی تیغ کا نظارہ، اب ان کو یہ بھی نہیں گوارہ
بضد ہے قاتل کہ جانِ بسمل فگار ہو جسم و تن سے پہلے

غرورِ سرو و سمن سے کہدو کہ پھر وہی تاجدار ہوں گے
جو خار و خس والیٔ چمن تھے عروجِ سرو و سمن سے پہلے

ادھر تقاضے ہیں مصلحت کے ادھر تقاضائے دردِ دل ہے
زباں سنبھالیں کہ دل سنبھالیں اسیر ذکرِ وطن سے پہلے

زہر فوراً مارتا ہے
شراب قسطوں میں

اکسائز اور نشہ بندی ڈیپارٹمنٹ، بہار

सू० ज० स० नि० 393 (सू०-348)/84-85

غزلیں

جنید حزیں لاری

بڑے جتن سے جسے آنسوؤں نے پالا تھا
وہ زخم پھول کی مانند کھلنے والا تھا
قریب تھی کوئی منزل، نہ ہم سفر کوئی
ہجومِ یاس میں کس نے مجھے سنبھالا تھا
جھلس کے رہ نہ گیا ہو وہ ریگزاروں میں
کہ نرم خوابوں کی دنیا کا رہنے والا تھا
ملا تو جھک کے ملا ہم سے خاکساروں سے
وہ اپنے قد سے بھی کتنا بلند و بالا تھا
اب ایک گوشۂ تاریک ہے جہاں میں ہوں
مرے ورود سے پہلے یہاں اجالا تھا
کتابِ زیست ہوئی جا رہی تھی بوسیدہ
ورق ورق اسے میں نے بھی دیکھ ڈالا تھا
حزیں کہ شاعرِ گمنام تھا زمانے میں
ہر ایک بات، ہر انداز میں نرالا تھا

ملک زادہ جاوید احمد

ان کی جانب سرِ انجمن دیکھتے
آپ پھر میری غزلوں کا فن دیکھتے
اپنے قد سے بڑا شعر کہتا اگر
کم نظر بولتے، کم سخن دیکھتے
جو غزل کہتے ہوئے بس یونہی مر گئے
تھی یہ حسرت ہم اپنا وطن دیکھتے
مفلسی، ذلت، حالات، مجبوریاں
کس کو کس کو غریب الوطن دیکھتے
دھجیاں پھاڑ کر شعر کہنے لگے
اپنے اندر کی کب تک گھٹن دیکھتے
ہر زمانے کے مسائل سے آزاد ہو
ایسا کوئی تو بھارت رتن دیکھتے
جو کمایا گیا قرض کی قسط میں
کاش وہ دن تو ہاتھوں میں دھن دیکھتے

ملک زادہ جاوید احمد

شاخ سے ٹوٹی ہوئی کچھ پتیوں کو کوسنا
بعد میں بوڑھے شجر کا آندھیوں کو کوسنا
جب تمہیں ڈھلتے ہوئے سورج سے ڈر لگنے لگے
آئینے کو دیکھنا، تنہائیوں کو کوسنا
میں تو دریا ہوں تمہیں پانی پلا دوں گا مگر
مشغلہ ہے اور عادی ندیوں کو کوسنا
گرمیوں میں اب کہ ہم کیسے جدا ہو جائیں گے
فاصلے دکھ دیں تمہیں تو چٹھیوں کو کوسنا
کینوس پر عکس اس کا جب نظر آئے نہیں
رنگ تو معصوم ٹھہرے انگلیوں کو کوسنا
یاد آتی ہے وہ اک ٹوٹی ہوئی عینک مگر
اللہ پھر دادی کا گھر کی بچیوں کو کوسنا
ذہن بھی جاوید جب قیدی نظر آنے لگے
تم روایت کی پرانی رسیوں کو کوسنا

عمران عظیم

سپاہیوں کا، تھکن کا حلیف لگتا ہے
تمہارے شہر میں سورج ضعیف لگتا ہے
جس آدمی کے ارادے بہت توانا ہیں
وہ دیکھنے میں بلا کا نحیف لگتا ہے
جو دوسروں پہ بڑا بن جتا کے آیا ہو
وہ اپنے آپ کو کتنا خفیف لگتا ہے
کھڑا ہوا ہے جو سوکھا درخت رستے میں
وہ کج کلاہ بھی اس کا حلیف لگتا ہے
میں تیرے ہونٹوں سے دشمن کا نام بھی سن لوں
مگر مجھے ترا لہجہ لطیف لگتا ہے
عظیم آنکھوں میں ویرانیاں بسی ہوں اگر
سحر کا وقت بھی کتنا کثیف لگتا ہے

غزلیں

شاہد ساگری

تیغِ الفت سے سدا قلب و جگر کٹتے ہیں
جب نگاہوں کی خطا ہوتی ہے سر کٹتے ہیں
نونہالانِ چمن کیسے کریں سیرِ چمن
جب بہار آتی ہے گلشن میں تو پر کٹتے ہیں
یوں ہی بے موت مرا کرتے ہیں غم کے مارے
سر ہزاروں کے سرِ راہ گذر کٹتے ہیں
وحشتِ نوشی چلا کرتی ہے مقراضِ نظر
کتنی سہل نہیں ہوش کے پر کٹتے ہیں
آج کے دور میں انسان کی قیمت کیا ہے
آہ کٹتے ہیں یوں جیسے شجر کٹتے ہیں
راہِ منزل میں تو کٹتے نہ کہیں غم شاہد
جا کے منزل پہ بہت اہلِ سفر کٹتے ہیں

نفیس شاداب

بے وجہ دل ہمارا دکھانے سے کیا ملا
جلتے ہوئے کو اور جلانے سے کیا ملا
بے کار اپنا وقت گنوانے سے کیا ملا
نادان کو اپنے شعر سنانے سے کیا ملا
مجنوں کہا کسی نے تو پاگل کسی نے آج
صحرا کی خاک ہم کو اڑانے سے کیا ملا
سب اجنبی سے ہو گئے احباب شہر میں
گاؤں کو اپنے چھوڑ کے آنے سے کیا ملا
اب دیکھتے ہی دیکھتے ہونے لگے عیاں
شاداب دل کے گھاؤ چھپانے سے کیا ملا

ڈاکٹر ساقی مچھلی شہری

سب مرے شہر میں ہیں تنگ نظر کیسے کہوں
جانتا ہوں یہ حقیقت ہے مگر کیسے کہوں
عمر بھر دھوپ میں جلنا تو مری قسمت تھی
میرے آنگن میں نہ تھا کوئی شجر کیسے کہوں
غم کسی کا کوئی اس یگ میں کہاں سنتا ہے
دوستوں سے یہ سبب دیدۂ تر کیسے کہوں
مصلحت اپنی جگہ پر ہے ضمیر اپنی جگہ
دامنِ ظلمت کو اجالوں کا نگر کیسے کہوں
جو بظاہر مرا ہمدرد نظر آتا ہے
میں اسے خوب سمجھتا ہوں مگر کیسے کہوں
اجنبی جس طرح ٹھہرے ہوں کسی ہوٹل میں
ایسا ماحول جہاں ہو اسے گھر کیسے کہوں
یوں تو گردن پہ یقیناً ہے وہ لیکن ساقی
انکساری نہ ہو جس میں اسے سر کیسے کہوں

نہال عثمانی

ہر ایک وعدہ تمہارا حباب جیسا ہے
کہ انتظار بھی اندھے کے خواب جیسا ہے
تمہارا عشق ہے بے جان پتھروں کی طرح
ہمارا پیار مہکتا گلاب جیسا ہے
زمانہ تو نے ابھی تک پڑھا نہیں مجھ کو
مرا وجود تو روشن کتاب جیسا ہے
کریگا دل شکنی اور سب سے کہہ دیگا
یہ اک گناہ تو ہے پر ثواب جیسا ہے
نہال عالمِ ہستی کی بات رہنے دو
جو دیکھتے ہو سمندر سراب جیسا ہے

جمال احمد خاں

نئی تاریخ، نیا سال لکھا کرتے ہیں
بیتے دن کو بھی ذرا جوڑ لیا کرتے ہیں
ہم نہ مانیں کہ ترا پیار سلامت ہوگا
رشتے کتنے ہیں؟ جو بشاش رہا کرتے ہیں
کبھی دنیا سے جو بیزار ہوا کرتے ہیں
تیری رومان بھری بات سنا کرتے ہیں
تازہ زخموں کا ہے پھر خوف ہوا ہے بھی
کتنے اجسام یہاں روز کٹا کرتے ہیں
اپنے ہونے کا ہمیں کاش جو ہوتا احساس
دن کو جیتے ہیں اگر شام مرا کرتے ہیں
بجھتے شعلوں کو ذرا اور بجھا ڈالا ہے
ہم ہیں بیدار، خبردار رہا کرتے ہیں
سلگی سانسوں کا ذرا حال تو پوچھا ہوتا
اے نئے دور کے حکام جلا کرتے ہیں

رشی کانت راہی

آئینۂ وجود پہ یادوں کی دھول ہے
پرچھائیوں کے ساتھ الجھنا فضول ہے
سمجھو تو مختصر ہے نہ سمجھو تو ہے طویل
اپنی بھی کچھ خطا ہے تمہاری بھی بھول ہے
پھولوں کے حسن پر ہی نہیں ہے مری نگاہ
کانٹوں سے رسم و راہ بھی اپنا اصول ہے
گیتا کا فیصلہ ہو کہ قرآن کا حکم ہو
یہ بھی قبول ہے مجھے وہ بھی قبول ہے
راہی یہ شاہکار کہ کہتے ہیں دل جسے
دوشیزۂ حیات کے جوڑے کا پھول ہے

پریندر پٹواری

شامو دلال

ہاں تو صاحب میں یہ کہہ رہا تھا کہ بات اسکتش [illegible] کے لحاظ سے [illegible] آپ نے مسکرا [illegible] امید وار [illegible] کا مسئلہ [illegible] کے مسائل بھی حل کر دوں گا۔ فی الحال آپ کی [illegible] سے [illegible] صاحب بے فکر رہئے۔ سگریٹ بھی لیجئے اور ہمیں بھی پلائیے۔ مگر آپ کو مل جائے گا۔ ہاں نہیں۔ وہ تو صاحب عمارتوں کا جنگل ہے۔ کھو دے گے وہاں۔ اور پھر آپ کے مطلب کی کوئی چیز ہے ہی نہیں [illegible] سمجھے۔ ارے صاحب وہاں فلیٹ نہیں۔ ہوٹل ہیں [illegible] دھرم شالائیں ہیں۔ مگر آپ کے سب بے معنی [illegible] کلرک جو ہے۔ نہیں نہیں آپ شرمندہ مت ہو یئے۔ میں بھی کلرک تھا کبھی [illegible] آپ کی ہی طرح سیدھا سادہ۔ نہیں سمجھے۔ ارے ہاں [illegible] بارے میں [illegible] نے کچھ بتایا ہی نہیں۔ میرا نام شام لال ہے۔ لوگ مجھے پیار [illegible] کے مارے مجھے پکارتے ہیں۔ شامو دلال ... کیوں چونک پڑے۔ اے صاحب دلال لفظ کوئی [illegible] لفظ تھوڑے ہی ہے۔ کوئی زمین کا دلال، کوئی ایمپلائمنٹ کا دلال، کوئی سیاسی دلال، کوئی سماجی دلال۔ [illegible] دلانے کا دلال — اور دلال دلال ہی ہے — اپنا اپنا فیلڈ ہے — نہیں سمجھے۔ ابھی آپ کے چہرے [illegible] آپ نے با معنی خیز نظروں سے دیکھنے کے بجایا ورنہ آپ کی عمر کے [illegible] (GENERATION) بہت ذہین [illegible] کم عمری میں ہی بالغ نظر آتے ہیں۔ ادھر کیا دیکھ لیتے وہ تو ہوٹل کا دلال ہے۔ ادھر دیکھو۔ یہ بیچاری بھلا کیا [illegible] تک فریاد بیچنے والا دلال ہے۔ یعنی مڈل مین (MID- DLE MAN) — فقط مدد کرنے کی خاطر — جیسے میں بیٹھا رہتا ہوں اس چوراہے پر — آپ جیسے ضرورت مند لوگوں کی مدد کرنے کی خاطر —

ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا۔ کہ گھر گھر والی سے ہوتا ہے — ہے کہ نہیں — ورنہ صاحب گھر فقط مکان ہوتا ہے — اچھے اچھے مکانوں میں کوئی رہتا نہیں تو وہ کھنڈر بن جاتے ہیں۔ نہایت ڈراونے کھنڈر — گویا جسم ہے۔ روح نہیں یعنی بے معنی سی چیز — میں تو کہتا رہتا ہوں کہ اگر یہ بات یہی میں لوگ دیتے تو جناب ویرانوں میں بہار آ جائے گی شاعر سے پوچھو تو اسے وہ انقلاب کہہ دے گا۔ طویل سے طویل تر نظمیں کہہ ڈالے گا — اور اپنی شہرت کی خوشبو چار سو پھیلا دے گا — اور اگر کسی نے فلم بنا ڈالی تو انٹرنیشنل فیم لے گا — خیر چھوڑو ان باتوں کو اُس کھانے کی خوشبو سونگھنے سے کیا فائدہ جو مل ہی نہ سکے آپ کی پرابلم — گھر ہے۔

مگر بیا بانوں میں بہار کا ذکر کرتے کرتے میں یہ بھول ہی گیا کہ تم بھی تو گزارے ہو — بس لے لو اب اس سیدھی سڑک کو چھوڑ کر پہلی آن [illegible] پر [illegible] ہو گا — ارے کیوں پریشان ہو رہے ہو — وہ بھی تو انسانوں کی بستی ہے — گندی [illegible] ہے۔ مگر اندر سے بھی ستھرا ہو جناب۔ یہ چھوٹا سا گھر — [illegible] ہے تو کیا ہوا۔ ہمارے دیش کی حالت بھی تو خستہ ہے — ہے کہ نہیں ؟

ہاں۔ ہاں ۔ عظمت نہیں۔ بجلی نہیں۔ مگر دو دکھو دیں
([illegible] ۴) تو ہیں۔ یا ٹیپ لائن بھی ہوں گی تو نے۔
پانچ سال کے بعد تو حالت ہی مختلف ہوگی۔ ہے نہ
نہیں؟ — ارے جناب چھت کو کیا دیکھ رہے ہیں
آپ — نہیں گرے گا — یہ کمزور دیواریں پچھلے ۸۰ سال
سے کھڑی ہیں — اور پھر یہاں آپ اکیلے تو نہیں رہیں گے
— سوال پوچھنے کی ضرورت نہیں جناب میں خود ہی
بتا دیتا ہوں — جناب گھر کی مالکن — !
مالکن کا شوہر مل مزدور تھا — ٹی بی کھا گئی اسے
— بچوں کو بھوک نے گھسیٹ گھسیٹ کر شمشان
بھومی پہنچا دیا — یہ مقدم تو ابھی [illegible] دیکھو شمشان
نزدیک ہی ہے — سرکار نے مفت جگہ دی ہے —
مگر بات مالکن کی ہو رہی تھی — مالکن نرم دل ہے
— مہربان ہے — جوان نہ سہی خوبصورت تو ہے
— اور پھر بھوکی ہے — ننگی ہے — ضرورت مند
ہے — سمجھے نہیں — ارے جناب مانگا کا ڈر سے
آئے ہوئے — شہریوں کے داؤ پیچ نہیں سمجھ پاتے —
مگر معاملہ تو دودھ کی طرح صاف ہے — نہیں سمجھے
... میری اس سفید داڑھی کو کیوں گھور گھور کر دیکھ
رہے ہو — اس کے پیچھے ایک شیطان نہیں بلکہ ایک
تجربہ کار انسان ہے — دیکھو بھئی — نہ تو میں نے کسی
فلم کی تصویریں دکھائی ہیں اور نہ ہی کسی انقلابی
شاعر کی تحریر پڑھ کر سنائی ہے — فقط صاف اور
کھری بات بتا دی ہے — سچ کہو — کیا فیصلہ کیا ہے
— یہاں کمرہ ملے گا اور کمرہ والی بھی — ایسے تھیں
میں نے تمہیں بہکایا یا نہیں تو کیوں بھڑک اٹھے ہو —
خبردار — ہاتھ مت لگاؤ — اس سے پہلے کہ میری
سست رگوں میں خون تیزی سے دوڑنے لگے —
یہاں سے چلے جاؤ — دل جوان نہیں تو دماغ تازہ کیسے
ہو سکتا ہے — دل میں امنگیں نہیں تو زندگی کو چھونے
کی ہمت کیسے — بیمار ذہن — فرسودہ سوچ —

ارے میری قسمت ہی پھوٹ گئی ہے — شامو دلال اگر
میں پیدا ہوتا تو اپنی بیٹی کو ہالی ووڈ کی ایکٹرس ضرور
بنا دیتا [illegible] یا پھر کسی کروڑ پتی کو سونپ کر اسے
دو وقت کا کھانا تو دلا سکتا — نہیں — نہیں میری
آبرو تو نہیں لٹ سکتی — اف — مگر — یہ دل میں ہوک
سی کیوں اٹھ رہی ہے — مگر — مگر — تم کھڑے کھڑے
میرا منہ کیوں دیکھ رہے ہو؟ — نہیں —
نہیں — میں رو نہیں رہا ہوں — مجھ میں حالات کا مقابلہ
کرنے کی ہمت ہے — تو نہ سہی اور سہی —
ہمارے ملک کی آبادی ۷۰ کروڑ ہے — چلے جاؤ
— چلے جاؤ — ورنہ شامو دلال چاقو نکال کر
شامو دادا بن جائے گا۔

میں ایک [illegible] ریٹائرڈ کلرک سہی مگر ایک حوصلہ
مند دلال بھی ہوں — اپنی بیٹی کا سہی — چلے جاؤ
میرا خون ابل پڑا ہے — اور اب — تمہارا قتل
ہوگا — پھر مجھے پھانسی ہوگی — اور میری بیوہ بیٹی
ہماری ادھوری کہانی کو تھوڑا اور آگے لے جائے گی
میں کہہ رہا ہوں — تم دفع ہو جاؤ یہاں سے —
میری چھاتی میں درد ہو رہا ہے —
چلے جاؤ — چلے جاؤ — اُف — ہے رام —
ہے رام — رام — رام۔

مشتاق احمد نوری

ڈسٹرکٹ پبلک ریلیشنز آفیسر۔ پورنیہ (بہار)

کائیں..... کائیں......

باپ کسی بے انتہا ضروری کام میں مشغول ہے اس کے بغل میں ہی اس کا ننھا سا بیٹا اپنے کھلونے کے ساتھ کھیل رہا ہے۔ بیٹے کی عمر مشکل سے تین سال ہے۔ گھر کی منڈیر پر ایک کوا کائیں کائیں کر رہا ہے۔ بیٹا کوے کی طرف دیکھتے ہوئے باپ سے سوال کرتا ہے۔

"ابو ابو— وہ کیا ہے؟"

"بیٹا وہ کوا ہے۔" باپ فوراً ہی جواب دیتا ہے۔

بیٹا باپ کا جواب سن کر خاموش نہیں رہتا۔ تھوڑی دیر بعد وہی سوال دہراتا ہے۔

"ابو وہ کیا ہے؟"

"بیٹا وہ کوا ہے۔ کالا کالا کوا۔"

بیٹا چپ ہو جاتا ہے۔ پھر کبھی کوا اور کبھی باپ کی جانب دیکھتا ہے۔ پھر باپ کا ہاتھ پکڑ کر ہلاتے ہوئے کہتا ہے۔

"ابو— وہ کالا کالا کیا ہے؟"

باپ بڑے پیار سے بیٹا کے سر پر ہاتھ پھیرتا ہے۔ اسکے رخسار کو پیار سے تھپتھپاتے ہوئے کہتا ہے۔

"بیٹا وہ کالا کالا کوا ہے۔ جو کائیں کائیں کرتا ہے۔"

بیٹا اب بڑے غور سے کوے کی جانب دیکھتا ہے مگر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاید اسکی تشفی نہیں ہو پائی ہے۔ اس کا جذبۂ تجسس اب بھی تشنہ ہے۔ وہ بار بار ایک ہی سوال دریافت کر کے اپنی پوری تشفی کرنا چاہتا تھا اس لئے پھر وہی سوال دہراتا ہے۔

"ابو——— وہ کائیں کائیں کرتا ہے— وہ کیا ہے———؟"

باپ بچے کو اٹھا کر اس کا منہ چوم لیتا ہے اور پھر بہت ہی پیار سے کہتا ہے۔

"بیٹا— وہ کوا ہے— جو کالا ہوتا ہے اور کائیں کائیں کرتا ہے۔"

ماں بچہ کی اس حرکت کو بہت دیر سے دیکھ رہی تھی اسے غصہ آ جاتا ہے اور بچہ کو ڈانٹتی ہے کہ

وہ بار بار ایک ہی سوال دہرا کر باپ کو پریشان کیوں کر رہا ہے۔ مگر باپ ماں کو چپ رہنے کی تاکید کرتے ہوئے بہت ٹھہرے لہجہ میں کہتا ہے۔

بیگم اسے مت ڈانٹو۔۔ اسے سوال کرنے دو۔ یہ اس کے سیکھنے کی عمر ہے۔ یہ اپنے اردگرد کی ساری چیزوں کو سمجھنا چاہتا ہے۔ بار بار دریافت کر کے اپنے ذہن میں بٹھانا چاہتا ہے تاکہ دوبارہ کسی اور سے دریافت نہ کرنا پڑے۔"

پھر وہ اپنے بیٹے کو گود میں اٹھا کر اس سے دریافت کرتا ہے:۔

"بیٹا وہ کیا ہے۔" بچہ فوراً جواب دیتا ہے۔

"ابو۔ وہ کوا ہے۔ اور کائیں کائیں کرتا ہے۔"

پھر وہ اپنے بیٹے کو گود میں اٹھا کر اس سے دریافت کرتا ہے۔

"بیٹا۔ وہ کیا ہے۔" بچہ فوراً جواب دیتا ہے۔

"ابو۔ وہ کوا ہے۔ اور کائیں کائیں کرتا ہے۔"

باپ کھلکھلا کر ہنس پڑتا ہے اور ماں بھی اس کا ساتھ دیتی ہے۔

باپ اور بیٹے کے درمیان سے ایک لمبا عرصہ گزر گیا ہے ———

اب بیٹے نے باپ کی جگہ لے لی ہے۔ مگر باپ کے دل میں اپنے بیٹے کی وہی محبت ہے جو آج سے تیس سال قبل تھی۔

بیٹا دفتر جانے لگتا ہے۔ ہوا سے ٹفن تھما کر خدا حافظ بائی بائی کہہ رہا ہے۔ بوڑھا باپ بیٹے کے نزدیک جا کر پیار سے کہتا ہے ——— "بیٹا میری دھوتی جواب دے گئی ہے اس کی ضرورت شدید ہے۔ دفتر سے واپسی پر میرے لئے ایک دھوتی ضرور لیتے آنا۔"

بیٹا باپ کی بات سنتا ہے اور دفتر روانہ ہو جاتا ہے۔ واپسی پر اس کا ہاتھ خالی ہوتا ہے۔ باپ سوچتا ہے

"ہو سکتا ہے دفتر کی مصروفیت میں وہ دھوتی لانا بھول گیا ہو۔"

دوسرے دن پھر دفتر جاتے وقت باپ بیٹے کو یاد دلاتا ہے۔

"بیٹا کل شاید تم اپنی مصروفیت میں بھول گئے ہو گے۔ آج ضرور لیتے آنا۔ دیکھو نا۔ دو دن سے غسل بھی نہیں کر پایا۔"

بیٹا پھر کچھ کہے بغیر دفتر چلا جاتا ہے مگر واپسی میں اس کا ہاتھ خالی ہوتا ہے۔ باپ کے دل میں ذرا بھی میل نہیں آتا۔

"ممکن ہے۔ آج پھر یاد نہ رہا ہو کام بھی تو بہت ہے بے چارے کو۔"

آج تیسرا دن ہے آج بھی باپ بیٹے کو اپنی فرمائش یاد دلاتا ہے۔

"بیٹا۔ آج جمعہ ہے یہاں جانا ہے مگر پھٹی اور گندی دھوتی کے کارن نہیں جا سکتا ——— آج بھولنا مت۔۔۔ معمولی ہی سہی۔۔۔ لے ہی لینا۔۔۔"

(باقی صفحہ پر)

م بارک پوری
(بنگلہ دیش)

ادھوری کہانی کا المیہ

رسالہ "تحریر" کے مدیر کا خط ملا

"بنگلہ دیش میں جنگ آزادی کے بعد کسی موضوع پر کہانی ارسال کریں جو فن کی کسوٹی پر پورا اترے"۔

خط ملنے کے بعد کئی روز تک سوچ کے سمندر میں غرق رہا۔ مجھ پر بے چینی کی کیفیت طاری رہی۔ خیالوں میں بنتا رہا مگر کوئی نیا پلاٹ ذہن میں نہیں آیا۔ فکر و فن سے ہم آہنگ ہو کر تکنیک اور موضوع کے لحاظ سے اچھوتی کہانی لکھنا چاہتا تھا۔ اچانک میرے ذہن میں ایک کوندا سا لپکا اور دماغ میں خیالات اور واقعات کی لہریں اٹھنے لگیں۔ بنگلہ دیش بننے کے بعد کی سفاکیوں کے مناظر کے سامنے موجیں مارنے لگے۔ لوٹ مار۔ قتل و خون اور ظلم و بربریت کا ایسا بازار گرم ہوا کہ انسانیت شرم سے پانی پانی ہو گئی تھی۔

گزرتے ہوئے واقعات کی دبی ہوئی چنگاری راکھ سے برآمد ہوئی۔ تلخی میرے قلب میں اتر گئی۔ رات سونے کے لئے بستر پر دراز ہوا تو ذہن میں خیالات کا تلاطم برپا تھا۔ نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ اضطراری کیفیت میں ٹیبل لیمپ جلایا۔ قلم اور کاغذ سنبھالا۔ عرصہ سے ایک واقعہ ذہن میں خلش بنا ہوا تھا۔ دماغ میں ایک بجلی سی چمکی اور کہانی کا تار و پود بننے لگا۔

میں نے کہانی بہت ہی چابک دستی سے لکھی۔ تکنیک، زبان و بیان اور کردار کے انتخاب و تعمیر کا خیال رکھا تھا۔ واقعات و حقیقت کے رنگ میں پیش کرنے کی کوشش کی تھی۔

دوسرے دن مدیر "تحریر" کو کہانی ڈاک سے بھیج دی۔ ایک ہفتہ کے بعد مدیر کا جواب آیا ..... "کہانی میں ندرت نہیں۔ اسے دوبارہ لکھئے۔ اس بات کا خاص خیال رکھئے کہ کہانی عصری ادب کی ترجمان ہو"۔ دوہری محنت سے طبیعت گھبرا گئی۔ پھر بھی دل پر جبر کر کے کہانی کو نئی شکل دی۔ جذبے کا نکھار، زبان کی آرائش اور تخیل کی اڑان سے کہانی کو سجایا۔ ہر زاویہ سے پرکھا۔ جانچا کہ کوئی جھول نہ ہو۔ کتر بیونت کے بعد کہانی میں اور بھی توازن اور تاثر پیدا ہو گیا۔ زندگی اور اس کے کرب و محرومی کی داستان بن گئی۔ دوسرے ہفتے پھر جواب آیا "......کہانی میں تنوع نہیں، اس لئے معیار پر پوری نہیں اتری...."

میں جز بز ہو گیا۔ کم از کم مدیر صاحب کہانی اچھی یا بری ہونے کی وجہ تو بتاتے۔ میں نے اس کہانی کو ایک خاص انداز میں لکھنے کی کوشش کی تھی۔ چونکہ مدیر کے ذہن میں اس کہانی کے متعلق پہلے ہی ایک شبہ قائم ہو گیا تھا اس لئے مسترد کر دیا۔ آخر ان کے معیار کا معیار کیا ہے؟

اچانک ایک ہفتہ بعد ڈھاکا جانے کا پروگرام بن گیا۔ شام کو اپنے کام سے نپٹ کر مدیر کے دفتر پہونچا۔ ملیح رنگ، چشمے کے پیچھے شوخ و شنگ آنکھیں، وہ میز کی دوسری طرف کرسی پر بیٹھے، لکھنے میں مصروف تھے۔ بڑے تپاک سے ملے۔

" میں نے جو کہانی بھیجی تھی، ناپسند ہونے کی معلوم کرنا چاہتا ہوں۔" میں نے کرسی پر بیٹھنے کے بعد پوچھا

" آپ کی کہانی کا اپنی دھرتی سے کوئی رشتہ نہیں۔ آپ کا جو نظریہ ہے، اس سے میں متفق نہیں ہوں۔"

اڈیٹر صاحب نے پیکٹ سے سگریٹ نکالی۔

" میں نے کہانی جس نظریہ سے لکھی ہے۔ آپ صرف اس بنیاد پر اسے رد کردیں۔ اس طرح گمراہی کی صورت حال پیدا ہوتی ہے۔"

" افسانہ نگار کو جادۂ اعتدال سے آگے نہیں بڑھنا چاہئے۔" انھوں نے سگریٹ ہونٹوں کے درمیان دبا لیا " جدیدیت سے افسانہ کا فن مجروح ہوتا ہے۔"

" جدیدیت کے اسی دھارے نے روایتی زنجیروں کو توڑ کر فکر و شعور کا نیا ذخیرہ دیا۔ بلکہ کہانی کو حقیقت سے قریب کردیا۔

" آپ کی کہانی میں حقیقت کی بجائے جذبات کا استعمال نمایاں ہے۔" انھوں نے سگریٹ سلگا کر گہرا کش لیا۔

" کہانی کا خمیر حقیقت سے اٹھتا ہے اور حقیقت کہیں دور خلا میں پرواز نہیں کرتی۔"

" ہر ملک کے ادب کی جڑ اس کی مٹی سے پیوست ہوتی چاہیے، ورنہ اس کی شناخت نہیں ہوگی۔" انھوں نے سگریٹ کا دھواں فضا میں چھوڑتے ہوئے کہا۔

" دراصل آپ کو کہانی اس لئے پسند نہیں آئی کہ آپ لوگ اپنی شناخت کے لئے اس دھرتی میں جڑیں تلاش کررہے ہیں۔" میں نے استہزائیہ انداز میں کہا " جبکہ یہاں کسی کے پاس شناختی کارڈ نہیں۔"

" آپ کی کہانی میں ماضی کی بازیافت سنائی دیتی ہے۔" اڈیٹر صاحب اپنے دلائل پیش کرنے لگے۔

" فرض کیجئے کہ کوئی اساطیری کہانی لکھ رہا ہو تو کیا وہ اس لئے رد کردی جائے گی کہ اس میں ماضی کی جھلکیاں ہیں۔" ——— انھوں نے خاموش نظروں سے میری طرف دیکھا پھر میز کی دراز سے میری کہانی کا مسودہ نکالا۔

" آپ ذرا اپنی کہانی پڑھئے ——— بلکہ طوالت میں جانے کی بجائے آخری حصہ سنائیے۔" انھوں نے مسودہ میری طرف بڑھا دیا ——— میں نے کہانی کا آخری صفحہ پڑھنا شروع کیا :۔

"........ وہ ایک گھر سے دوسرے گھر میں چھپتا پھر رہا تھا۔ اس کی جان کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ موت سائے کی طرح اس کے پیچھے لگی ہوئی تھی۔ اسے کہیں بھی جائے پناہ نہیں مل رہی تھی۔ وہ جس مکان میں چھپا ہوا تھا، اسے مشتعل ہجوم نے گھیر لیا۔ وہ بڑی مشکل سے کھڑکی کے راستے کود کر بھاگا۔ "پکڑو پکڑو ——— مارو" لوگوں نے اسے فرار ہوتے دیکھ لیا تھا۔ وہ لاٹھیاں، ڈنڈے، بانس لئے اس کے تعاقب میں تھے۔ وہ بھاگتا ہوا جان بچانے (باقی صفحہ پر)

قاسم خورشید۔ پٹنہ

بھولا

کہانی : راجندر سنگھ بیدی
ڈرامائی تشکیل : قاسم خورشید

کردار

بھولا : ۷ سال۔ مرکزی کردار
دادا جی : ۷۰ سال۔ بھولا کے دادا جی
ماں : ۲۳ سال۔ بھولا کی ماں
رامو کاکا : ۶۲ سال۔ گاؤں کے باعزت شخص
ماما : ۲۸ سال۔ بھولا کا ماما

اور

گاؤں کے دوسرے لوگ

[اسٹیج دو حصوں میں بٹا ہوا ہے۔ بھولا کی جھونپڑی اور گاؤں کے کھیت اور پگڈنڈیاں۔ نو وارد اسٹیج پر آتا ہے۔]

نو وارد — یہ ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ یہاں آپ کو ہندوستانی گاؤں کی تمام خوبیاں نظر آئیں گی۔ بیلوں کے گلے میں بجتی ہوئی گھنٹیاں، ہرے بھرے کھیت۔ ہل چلاتے ہوئے کسان، دادا اور نانا کی پریوں کی کہانیاں سنانے والے بڑے بوڑھے، ہر شام یہاں کے ہر گھر میں دیے جل جاتے ہیں اور دور سے دیکھنے پر ایسا لگتا ہے جیسے ایک جگہ کچھ ستارے جمع ہو گئے ہوں۔

وہ سامنے والی جھونپڑی آپ دیکھ رہے ہیں! اس میں ہی ننھا بالک بھولا اپنے دادا جی اور بیوہ ماں کے ساتھ رہا کرتا ہے۔ بھولا ان دونوں کی زندگی کا خوبصورت سہارا ہے۔

[اس وقت سات سالہ بھولا اپنے دادا جی کے ساتھ جھونپڑی سے باہر آتا ہے ۳ ۴]

دادا — بیٹا میں تم سے ہمیشہ کہتا ہوں صبر کیا کرو۔

بھولا — نہیں، نہیں دادا جی سناؤ نا کہانی۔

دادا — میں کہتی رات میں تو کہانی سنا تا ہی ہوں، یہ دن میں بھی تو......؟

بھولا — نہیں..... نہیں..... تم روز آدھی کہانی کہہ کر سو جاتے ہو۔

دادا — (مسکراتے ہوئے) الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے۔ کیوں؟ کہانی سنتے سنتے سو تو جاتا ہے اور الزام مجھ پر دھرتا ہے

بھولا - تو کیا ہوا تم اس کہانی کو ہی پورا کر دو - دن میں تو نہیں سو سکتا نا!
دادا - دیکھ بیٹا! دن میں کہانی سننے سے مسافر اپنا راستہ بھول جاتے ہیں۔

[بھولا کی ماں چھاچھ سے بھرا ایک مٹی کا برتن لئے اسٹیج پر آتی ہے
وہ سفید ساڑی میں ملبوس ہے]

ماں - بھولا ضد نہ کیا کر! داداجی کو کھیت پر جانے دے۔

دادا - نہیں ..... نہیں ..... اسے مت ڈانٹو ..... سننے دو کہانی .... بیٹا یہ گھڑی تو ملہ کے یہاں دے آتا ہوں - جب تک تو چٹائی نکال کر باہر بچھا۔

بھولا - اچھا! لیکن دھوکہ مت دینا .....!

[داداجی مسکراتے ہوئے پگڈنڈی کی طرف چلے جاتے ہیں۔ بھولا اپنی ماں کے ساتھ جھونپڑی کے اندر چلا جاتا ہے۔ دوسری طرف سے گاؤں کے رامو کاکا آتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں]

دادا - کہاں جا رہے ہو بھائی! اس بڑھاپے میں بھی تمہیں چین نہیں ہے - کہاں تو گٹھیا کے مریض ہو اور اس پر ادھر چہل کرنے سے فرصت نہیں۔

رامو کاکا - اسی بھولی تمہارے گھر کی طرف ہی جا رہا تھا۔ بھولا نے ساری بستی میں ہنگامہ کر رکھا ہے کہ آج سے راکھی بندھوانے اس کا ماما شہر سے آنے والا ہے۔

دادا - ہاں بھائی وہ تو ہر سال راکھی بندھوانے اپنی بہن کے پاس ضرور آیا کرتا ہے اور وہ اس کے لئے کئی دن سے مکھن جمع کر رہی ہے۔

رامو کاکا - بھائی بہن میں پریم ہو تو ایسا! اچھا شہر میں وہ کرتا کیا ہے؟

دادا - شاید کوئی کاروبار کرتا ہے۔

رامو کاکا - کتنے بجے تک وہ یہاں پہنچ جائے گا؟

دادا - دن ڈھلنے سے پہلے پہنچ جایا کرتا ہے۔

رامو کاکا - تمہارا بھولا کہاں ہے؟

دادا - گھر ہی میں ہے بس کہانی سننے کی رٹ صبح سے لگا رہا ہے۔

رامو کاکا - بنا باپ کا بچہ ہے کبھی کبھی تو اسے دیکھ کر آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔

دادا - (اداس لہجے میں) کیا کیا جائے بھگوان کی جو اچھا تھی - سو ہوا - ٹھیک ہے! اب چلتا ہوں ..... جے رام جی کی۔

[اسٹیج پر اندھیرا - داداجی واپس گھر آتے ہیں۔ بھولا نے جھونپڑی کے باہر چٹائی بچھا رکھی ہے لیکن وہ اس جگہ موجود نہیں ہے]

دادا - آگئی بیٹی! بھولا کہاں گیا؟

ماں - ابھی تو یہیں تھا کہیں کھیلنے نکل گیا ہوگا۔

دادا - کیوں بھائی کے آنے کا انتظار کر رہی ہو۔

ماں - شام سے پہلے انہیں آ ہی جانا چاہیے؟

دادا ۔ ہاں بیٹی اگر کوئی کام نہیں ہوا تو ہو سکتا ہے کچھ ہی دیر میں پہنچ جائے ۔ آج تو لوگ دوالی کچھ زیادہ دھوم دھام سے منا رہے ہیں ...... ارے یہ بھولا کہاں چلا گیا؟

[بھولا سیڑھی پر آتا ہوا]

بھولا ۔ جاؤ ہم تم سے بولیں گے ہی نہیں! کتنی دیر پہلے چٹائی بچھا دی تھی ۔ میں اندر بیٹھا بیٹھا تم لوگوں کی باتیں سن رہا تھا ۔ اچھا بتاؤ دادا جی ماما ہمارے لئے کیا کیا لائیں گے ۔

دادا ۔ ابھی تو تو ہم سے باتیں ہی نہیں کرنا چاہتا تھا ۔

بھولا ۔ ہاں تم لوگوں کے بارے میں بات کہاں کر رہا ہوں ۔ میں تو ماما جی کے بارے میں پوچھ رہا ہوں .... اچھا اچھا بابا! روٹھو مت ..... میں تم سے بھی بات کروں گا ...... چلو جلدی سے کہانی سنا دو ۔

دادا ۔ (مسکراتے ہوئے) تو صد کرنے کہانی سے گا ہی! ٹھیک ہے! ... دیکھ ہو میں کہانی سنا رہا ہوں ۔ کوئی مسافر راستہ بھول گیا تو تو سمجھے گا ...... چل آ میرے پاس بیٹھ ..... ہاں تو کسی دیش میں ایک راجا رہا کرتا تھا ۔

بھولا ۔ ہر دیش میں ایک ہی راجا کیوں رہا کرتا ہے؟

دادا ۔ تو کہانی سنے گا یا نہیں؟

بھولا ۔ اچھا سناؤ ..... !

دادا ۔ کسی دیش میں ایک راجا رہا کرتا تھا ۔ اس کے تین بیٹیاں تھیں ۔ چھوٹی لڑکی بہت سندر تھی ..... اس کی سندرتا کے چرچے دھیرے دھیرے دور دور تک ہونے لگے ....

[اسٹیج پر اندھیرا ۔ نو وارد روشنی کے ایک دائرہ میں کھڑا نظر آتا ہے]

نو وارد ۔ ہاں تو صاحبان! اس دن بھولا نے ضد کر کے کہانی سن لی ۔ یہ پہلا موقع تھا جب دادا جی نے اسے پوری کہانی سنائی تھی ۔ لیکن وہ کہانی سننے کے بعد بہت خوش نہیں تھا ۔ ایسی بات نہیں کہ بھولا کو کہانی پسند نہیں آئی تھی بلکہ اسے دن میں کہانی سننے میں زیادہ مزا اس لئے بھی نہیں آیا کہ دادا جی کے اسے کچھ ڈرا دیا تھا ۔

[شام کا سنگیت ۔ سٹیج سے دھیرے دھیرے نو وارد چلا جاتا ہے ۔ بھولا کا جھونپڑی کا باہری حصہ ۔ بھولا دادا جی کے ساتھ پلنگ پر سویا ہوا ۔ ماں اپنے بھائی کی راہ دیکھتی ہوئی]

دادا ۔ جا ..... جا کر سو جا بیٹی ..... لگتا ہے اب وہ نہیں آئے گا ....

ماں ۔ پتہ نہیں اس بار بھیا کو کیا ہو گیا ...... ہر سال سویرے ہی آ جاتے تھے ۔

دادا ۔ ہو سکتا ہے کسی ضروری کام میں پھنس گیا ہو ۔

ماں ۔ لیکن خبر تو کر دیتے ۔ اب ایسا بھی کیا ہے ۔ میں نے اتنی محنت بیکار ہی کی نہیں آنا تھا تو کم سے کم ایک چٹھی ہی بھیج دیتے

دادا ۔ ارے جوان آدمی ہے! اور آج کل کے نوجوان تو ہوتے ہی ہیں لاپرواہ! انہیں کسی کی بھاؤ نا سے کیا؟ پتہ نہیں یاد بھی ہے یا نہیں کہ آج دوالی ہے ۔

ماں ۔ نہیں! اب ایسا بھی کیا ہے ہر سال آہی جاتے تھے ۔ ضرور کسی کام میں پھنسے ہوں گے وہ اپنی بہن کو نہیں بھول سکتے ...... بھولا سو گیا ہے کیا ......؟

دادا ۔ ہاں بیٹی ..... اب تو بھی آرام کر لگتا ہے رات کافی ہو گئی ہے ...... سارا گاؤں سو چکا ہے ۔

[بھولا کی ماں لالٹین لے کر جھونپڑی کے اندر چلی جاتی ہے]

دادا - (خود سے) ہے بھگوان! کیا جیون ہے اس کا بھی! ایک بھائی کو راکھی باندھنے کے لئے اس نے اتنی تپیا کی اور اسے نراشا ہی ہاتھ لگی۔ تیری بھی کیا لیلا ہے پربھو!

[دھیرے دھیرے اسٹیج پر مکمل اندھیرا۔ کچھ دیر بعد روشنی، دادا جی جگتے ہیں۔ بستر سے بھولا غائب ہے۔ چاروں طرف اندھیرا ہے۔ بھولا کی ماں کو آواز دیتے ہیں۔]

دادا - بیٹی دیکھنا بھولا تمہارے بستر پہ ہے کیا؟

ماں - (بھاگتی ہوئی باہر آتی ہے) کیا ہوا بھولا باہر نہیں ہے! وہ تو میرے بستر پہ بھی نہیں ہے۔

دادا - بھولا ..... بھولا ..... لیکن اتنی رات گئے وہ کہاں چلا گیا!

ماں - ارے دیکھئے ..... آخر بھولا کہاں چلا گیا ..... بھولا ..... ارے بھولا ..... اف کہاں چلا گیا ..... بھولا ..... بالو ..... بالو ..... بھولا .....

[گاؤں کے دو تین آدمی لالٹین کے ساتھ اسٹیج پہ آتے ہیں]

آدمی ۱ - کیا ہوا؟ بھولا نہیں ہے۔

دادا - میرے ساتھ ہی سو رہا تھا نہ جانے کہاں چلا گیا؟

ماں - (روتے ہوئے) کوئی بھولا کو دیکھو..... ہے بھگوان میرا کون ہے اس کے سوا .....

آدمی ۲ - آج کل گاؤں سے بچے بہت غائب ہو رہے ہیں۔

رامو کاکا - ارے یوں کھڑے رہنے سے کچھ نہیں ہوگا ..... چلو اسے تلاش کرنے ..... آؤ بھائی سب لوگ میرے ساتھ آؤ ..... چراغ بتی ہاتھوں میں لے لو ..... چلو جلدی کرو ..... ارے آؤ بھی!

[پس منظر میں شور۔ فضا میں بھولا کو پکارنے کی آوازیں چاروں طرف سے گونج رہی ہیں۔ اسٹیج پہ مکمل اندھیرا، خاموشی، پھر دھیرے دھیرے روشنی ہوتی ہے [illegible] قدموں سے دادا جی جھونپڑی کی طرف آتے ہیں۔ بھولا کی ماں جھونپڑی کے باہر گم سم بیٹھی ہے۔ دادا جی کے ہاتھ میں لالٹین]

دادا - (ہانپتے ہوئے) سارا گاؤں چھان مارا سبھی اسے کھوجنے نکلے لیکن کہیں پتہ نہیں چلا ..... جانے بھگوان کیا چاہتا ہے ہم غریبوں سے ..... یہ انیائے ہے۔ گھور انیائے ..... ہم نے کب اس کے خزانے سے کچھ مانگا تھا .....؟ ہماری چھوٹی سی خوشی بھی اسے کھلتی ہے ہے بھگوان! کیا کیا ہے ہم غریبوں نے (بھولا کی ماں پر سکتہ چھایا ہوا ہے، وہ کچھ بول نہیں پا رہی ہے) گھبرا مت بیٹی! میرا دل کہتا ہے بھولا جہاں بھی ہوگا ٹھیک ہوگا۔ اب رات بیتنے دے صبح ہونے پر ہی کچھ پتہ چلے گا ..... جانے کیوں مجھے نیند آگئی تھی۔ روز تو جگا ہی رہتا تھا ..... اچھا تو چنتا مت کر بیٹی۔ میں ندی کی طرف دیکھ کر آتا ہوں۔

[دھیرے دھیرے مکمل اندھیرا۔ اسٹیج کے دوسری طرف کوئی چلتی ہوئی شئے نظر آتی ہے اور ساتھ ہی بھولا کے کراہنے کی آواز ابھرتی ہے وہ کسی جھاڑی میں پھنسا ہوا ہے۔ ایک آدمی بھٹکتا ہوا اس طرف جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے ——— "ارے! کون ہے جھاڑی میں؟"]

بھولا - (لالٹین اس کی طرف کرتے ہوئے) میں ہوں بھولا ! ارے ماما جی تم ! میں تمہیں ہی کھوجنے نکلا تھا۔

ماما - (جھاڑی سے بھولا کو نکالتے ہوئے) بیٹے آتنی رات گئے تمہیں اکیلے باہر نکلنے کے لئے کس نے کہا تھا ؟

بھولا - نہیں ..... نہیں ..... مجھے کسی نے نہیں بھیجا ہے ..... میں تو خود لالٹین لے کر تمہیں کھوجنے نکلا تھا۔ ..... مجھے معلوم تھا کہ تم اپنا راستہ بھول گئے ہو گے۔

ماما - وہ کیسے ؟

بھولا - میں نے دادا جی سے ضد کر کے دن میں کہانی سن لی تھی نا ! ماما جی مجھے معاف کر دو۔

ماما - بیٹے ! میں سچ مچ اپنا راستہ بھول گیا تھا۔ اگر یہیں یہاں روشنی نہیں دیکھتا تو نہ جانے ساری رات کہاں کہاں چکر لگانا پڑتا۔ اچھا چلو گھر کی طرف چلیں۔

بھولا - ماما جی آنے میں دیر کیوں ہو گئی ؟

ماما - بیٹے کام بہت زیادہ تھے اس لئے شام کے وقت گھر سے نکلا ہی۔ اسی لئے آنے میں دیر ہو گئی۔ تیری ماں تو راہ تک رہی ہو گی۔

بھولا - اس نے بہت انتظار کیا جب تم نہیں آئے تو شاید سو گئی۔ بہت سا مکھن جمع کر کے رکھا ہے تمہارے لئے جانتے ہو ماما جی جب رات میں میری نیند کھلی تو میں نے چاروں اور دیکھا تم نہیں آئے تھے میں چپکے سے لالٹین لی اور تمہیں کھوجنے نکل گیا۔

ماما - لیکن گھر میں تو سبھی پریشان ہوں گے۔

بھولا - تم نہیں آتے تو ماں کے رکھے مکھن کا کیا ہوتا ؟ غلطی میں نے کی تھی لیکن سزا ماں کو کیوں ؟ ..... ماما وہ دیکھو گھر آ گیا۔ پہلے میں جا کر ماں کو تمہارے آنے کی خبر دوں گا۔

(بھولا دوڑتا ہوا اپنی جھونپڑی کے پاس پہنچتا ہے۔ ماں اور دادا جی بت سے بیٹھے ہیں بھولا جھونپڑی کے پیچھے سے چلاتا ہے)

بھولا - ماں ..... ! ماں ..... ماما ..... آ گئے ..... ماما آ رہے ہیں وہ دیکھو ..... دیکھو نا ! ماما جی سچ مچ راہ بھول گئے تھے ماں ..... رو ؤ نہیں ماں ..... دادا جی تم بھی رو رہے ہو ..... میرے ماما ! ماما جی ..... اچھا ..... اچھا ..... اب دن میں کہانی نہیں سنوں گا ..... نہیں سنوں گا۔

{ ماں اور دادا جی دھیرے دھیرے بھولا کی طرف بڑھنا چاہتے ہیں اور پھر ٹھہر جاتے ہیں۔ ماحول میں موسیقی گونجنے لگتی ہے اور دھیرے دھیرے اندھیرا ہو جاتا ہے۔ }

فیملی پلاننگ پروگرام میں عوام مدد دیں

وزیر اعلیٰ بہار کی اپیل

بڑھتی ہوئی آبادی ملک کا ایک اہم مسئلہ ہے۔ اس سے صوبے کی معاشی اور سماجی ترقی پر بڑا ہی گہرا اثر پڑا ہے۔ ملک میں جو بھی ترقی ہوئی ہے اس کا فائدہ بڑھتی ہوئی آبادی کی وجہ کر لوگوں کو نہیں مل پایا ہے۔

بڑھتی ہوئی آبادی کو روکنے کیلئے پہلے پانچ سالہ منصوبہ سے ہی فیملی پلاننگ پروگرام چل رہا ہے پچھلے دس بارہ سالوں میں اس پروگرام کو کامیاب بنانے کے لئے کافی کوششیں کی گئی ہیں۔

مرکزی حکومت اور صوبائی حکومت نے اس پروگرام کو کامیاب بنانے کے لئے دس ہفتے کا خاص پروگرام بنایا ہے۔ جو ۳۱ مئی ۸۵ء تک چلے گا۔ اس پروگرام کے دوران بندھیا کرن، نسبندی اور لوپ لگانے کا آسانیوں کا فائدہ مہیا ہوگا۔ اس پروگرام کی کامیابی بہت حد تک لوگوں کی مدد پر منحصر کرتا ہے سبھی کلاس، مذہب اور شہریوں کا یہ فرض ہے کہ وہ اس اہم پروگرام میں اپنی خدمات دیں۔

فیملی پلاننگ پروگرام اپنی مرضی کا پروگرام ہے اور حکومت اس میں سبھی کی مدد چاہتی ہے آیئے ہم سبھی اپنے ہی فائدہ کے اس نیشنل پروگرام میں اپنی خدمات پیش کریں۔ ابھی دس ہفتے کا جو خاص فیملی پلاننگ پروگرام ہے اس میں حکومت کی جانب سے سبھی سرکاری عملوں، سبھی غیر سرکاری یونٹوں، سبھی سیاسی لیڈروں، سبھی مذہب اور فرقے کے لوگوں کو اپنی خدمات دینے کی دعوت دیتا ہے

بندیشوری دوبے (وزیر اعلیٰ بہار)

सू० ज० स० लि-8-म (स्वा-1)/85-86

...پھیل گیا

...ر الدین علی احمد میموریل لکچرز نئی دہلی

حسن نعیمی سکندر پوری

اردو کے کاروباری عاشق اسے نقصان پہنچا رہے ہیں

حسب سابق فخر الدین علی احمد لکچرز کا سالانہ جلسہ ایوان غالب نئی دہلی میں" بتاریخ ۷ اپریل ۱۹۸۵ء صدارت آنند نرائن ملا منعقد ہوا۔ جس میں پروفیسر آل احمد سرور نے اپنا گراں قدر مقالہ "اردو اور ...ستانی تہذیب" پیش کیا۔ جلسے کا آغاز کرتے ہوئے جناب زینت سرور شاہ قائم مقام ڈائرکٹر غالب انسٹی... نے فرمایا کہ یہ جلسہ نومبر ۱۹۸۴ء میں ہونے والا تھا لیکن سابق وزیر اعظم محترمہ اندرا گاندھی کے سانحہ ... بنا پر ملتوی کر دیا گیا تھا۔

سرور صاحب نے اپنے مقالے میں سب سے پہلے جناب فخر الدین علی احمد کے اخلاق و عادات رہن سہن روز مرہ کے معمولات پر مختصر روشنی ڈالتے ہوئے کہا ہے کہ وہ ایک شریف، ہمدرد اور نیک مسلمان ... انھیں اپنی تہذیب اور اردو زبان سے بے پناہ محبت تھی۔ تقسیم کے بعد انھیں کی کوششوں سے ...م اردو کو زندہ رکھنے اور پھولنے پھلنے کے لئے" ایوان غالب کی شاندار عمارت کی تعمیر ہوئی جہاں بیٹھ کر ... کے شیدائی، اس عوامی زبان کے فروغ دینے کی تجاویز پر آزادانہ گفتگو کرتے ہیں۔

مقالے میں اردو کو ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کی علامت قرار دیتے ہوئے کہا گیا ہے کہ تقسیم کے بعد ...ت میں ملکی مسائل کو ایک محدود اور مخصوص سیاسی نقطۂ نظر سے دیکھا جانے لگا ہے۔ اردو ہے" احیا ...تی" ہندو، ہندی اور ہندوستان' کے فریب میں مبتلا بھارت نے' اردو کو بھی احیا پرستی کی صلیب ...ا دیا ہے۔ یہ احیا پرست جس تہذیب کو عربی تہذیب" کہتے ہیں وہ در اصل ایرانی، تورانی اور ترکی ...یب ہے جس کے اثرات اردو زبان پر زیادہ ہیں۔ عربی اثرات تو مقابلتاً بہت کم ہیں۔

سیاسی تبدیلیاں تو ہوتی رہتی ہیں اور ہوتی رہیں گی۔ گپت عہد میں تبدیلیاں ہوئیں سیرات اشوک ...د میں اور زیادہ تبدیلیاں ہوئیں لیکن دیہی نظام ہر تبدیلی اپنی جگہ رہا۔ کسی ملک کی تہذیب کو ... کے پہاڑوں دریاؤں اور موسموں کا مطالعہ کر کے پہچانا جا سکتا ہے۔

اردو زبان کی تاریخ پر مختصر روشنی ڈالتے ہوئے مقالہ نگار نے نشان دہی کی ہے کہ اردو کھڑی ...

بولی کا چلن، ہندی یا کھڑی بولی کے بہت پہلے ہو چکا تھا۔ اردو کے نمونے "دوہوں" کی شکل میں بہت پہلے سے ملتے ہیں۔ اردو کے مشہور شاعر ولی دکنی کے زمانے میں اردو زبان وسط ایشیا کے لب ولہجہ اور خیالات سے متاثر ہوئی۔ دہلی کے شرفا کی تہذیب درباری تھی اور ان کی زبان بھی محدود تھی لیکن جب خان آرزو۔ ناجی اور حاتم نے ریختہ کی عظمت کو تسلیم کیا اور مصحفی کے دربار سے یہ اعلان ہوا کہ اردو کا معیار فارسی کے برابر ہو گیا ہے لہٰذا اس کا بے دھڑک استعمال ہونا چاہیئے۔ تو اس پر کھلے دل سے عمل درآمد ہونے لگا۔

نظیر اکبرآبادی کا اور اکبر الٰہ آبادی کی شاعری خالص ہندوستانی تہذیب کی شاعری ہے جو ادمنیت، واقعیت اور وطنیت کے جذبے سے بھرپور ہے۔ اُس دور میں لکھی گئی نظم "آدمی نامہ" انسانیت پر ایک اچھی نظم ہے۔ ترقی پسندوں نے بھی اس سلسلے کو اردو ادب میں آگے بڑھایا۔ حالی کے بعد اقبال اور ان کے بعض ہمعصروں کے کلام میں بھی ایسے عناصر ملتے ہیں۔ یہ شعر ملاحظہ فرمائیں :-

قریب آ تلا ہے روز محشر، چھپے گا کشتوں کا خون کیوں کر
جو چپ رہے گی زبان خنجر لہو پکارے گا آستین کا

ادمنیت، واقعیت اور وطنیت کی ترجمانی جیسے جیسے بڑھتی گئی، مذہبی شاعری کا زور ٹوٹتا گیا۔ دنیا کی ہر زبان میں مذہبی شاعری کا حصہ زیادہ ہے لیکن جیسے جیسے انسان نے ترقی کی اور اس کے ذہن و قلب پر بے فکری اور رومان کا غلبہ ہوا، مذہبی شاعری کم ہوتی گئی۔ انیس کے مرثیوں میں ہندوستانیت کی وجہ سے جان آ گئی اور ہندوستانی رسم و رواج کی شمولیت سے ان کی مقبولیت میں چار چاند لگ گئے

صدر محترم آنند نرائن ملا نے فرمایا کہ حالات کے تحت آج اردو زبان کے تحفظ کی ضرورت ہے یہ مقدم ہے اور اردو ادب کا تحفظ مؤخر۔ زبان ہی نہیں رہی تو ادب کہاں سے آئے گا اور جو ہے اسے کون سمجھے گا نہ مناسب اسکول۔ نہ ٹرینڈ ماسٹر نہ ٹریننگ کا کوئی معقول انتظام۔ ان ضروریات کا بندوبست پہلے ہونا چاہیئے لیکن نہیں ہو رہا ہے۔

(بقیہ ادھوری کہانی) کھیلتے ایک تالاب میں اتر گیا۔ تالاب کچوری پاتا سے ڈھکا ہوا تھا۔ اس نے اپنا سر کچوری پاتا کے پتوں میں چھپا لیا۔ وہ دوسروں کی نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا۔ بدقسمتی سے وہاں کھیلتے ہوئے بچوں نے اسے تالاب میں چھپتے دیکھ لیا تھا۔ جب بلوائیوں کا گروہ وہاں پہونچا تو بچوں نے اسکی نشان دہی کر دی۔ بس پھر کیا تھا۔ اس کے سر پر بانس اور لاٹھیاں برسنے لگیں۔ اس کا بھیجا پاش پاش ہو گیا۔ تھوڑی دیر میں اسکی لاش پانی کی سطح پر ابھر آئی .... " ——— کہانی ختم ہونے سے پہلے اڈیٹر نے نکتہ اٹھایا :-

" برادر۔ دوستو۔ نئے کہانی میں کوئی نیا پن نہیں۔ پہلے ہندو مسلمان پر کہانیاں لکھی گئی تھیں۔ اب بہاری بنگالی کے موضوع پر لکھی جا رہی ہیں۔ پہلے مذہب کی بنیاد پر کہانی تخلیق کی گئی تھی۔ اب زبان کی بنیاد پر .... ان دونوں ہندوؤں اور سکھوں کے درمیان وہی دقیانوسی کہانی دہرائی جا رہی ہے۔ صرف کردار بدل گئے ہیں۔

نئی کتابوں کا تعارف

نوٹ: تبصرہ کے لئے کتاب کی دو جلدوں کا آنا ضروری ہے۔

نام کتاب: رام لعل کے افسانے
افسانہ نگار: رام لعل
صفحات: ۱۹۲۔
قیمت: ۵۰ روپے
ناشر: نریندر ناتھ سوز
پتہ: سیمانت پرکاشن۔ ۹۲۲ کوچہ روہیلا ترا بہرام۔ دریا گنج۔ نئی دہلی ۲-۰-۱۱
مبصر: سید احمد قادری

اردو زبان و ادب کے وقار اور عظمت میں اضافہ کرنے والوں میں ایک اہم نام رام لعل کا ہے۔ انھوں نے اپنے فکر و فن اور مطالعے و مشاہدے سے اردو افسانے میں کئی اہم اور قابل قدر اضافے کئے ہیں۔ ان کے اب تک کئی افسانوی مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں اور تقریباً ہر مجموعہ نے شہرت اور مقبولیت حاصل کی ہے۔

نریندر ناتھ سوز اس لحاظ سے لائق مبارکباد ہیں کہ انھوں نے شروع سے اب تک کے کئی اہم اور مشہور افسانوں کو یکجا کرکے شائع کیا ہے۔

ایک سو بانوے صفحات پر رام لعل کے پھیلے ہوئے افسانوں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ رام لعل کی گرفت افسانے کے فن اور تکنیک پر ہے۔ جو مضبوط ہے اور وہ اپنے فکر و احساس کو خوش اسلوبی اور خوبصورتی سے پیش کرتے ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب میں مختلف موضوعات، مسائل، اور احساسات و جذبات سے لبریز افسانے ہیں۔ اور چونکہ رام لعل کا مطالعہ و مشاہدہ بڑا گہرا ہے۔ اس لئے وہ اپنے فکر و خیال کو ایک خاص قسم کی کیفیت اور وسعت پیدا کرنے میں جو کامیاب نظر آتے ہیں۔

رام لعل کے افسانوں میں سماجی، سیاسی اور معاشرتی شعور کافی بیدار نظر آتا ہے۔ رام لعل نے نچلے اور متوسط طبقے کی گھٹن، مجبوری، بے بسی، بے کسی، افلاس اور استحصال کو قریب سے دیکھنے اور شدت کے ساتھ محسوس کرنے کے ساتھ ساتھ سرمایہ داروں کی بے دردی، اور بے حسی کی صحیح عکاسی بھی کی ہے۔

عصر حاضر میں ذات کا درد و کرب، گھٹی گھٹی فضا، عدم تحفظ کا احساس، مشینی زندگی، بے سمتی اور بے چہرگی وغیرہ بھی رام لعل کے افسانوں کے اہم موضوعات ہیں۔

رام لعل کے افسانوں کا فکری اور فنی پہلو اس وقت ابھر کر نظر آتا ہے، جب رام لعل اپنے تجربے اور مشاہدے کو من و عن بیان کرنے کی بجائے حقیقت اور تخیل کے امتزاج کو پیش کرتے ہیں اور افسانے کی تشکیل و ترتیب میں موضوع، مواد، فکر اور خیال میں فنی حسن سموتے ہیں۔

رام لعل کسی ازم سے وابستہ نہیں ہیں، ہاں، ان کا حیات و کائنات کو دیکھنے اور سمجھنے کا اپنا ایک

[illegible] ہے۔ اور جب انہی لکھتے وقت وہ کردار واقعات پیدا کرتی، اور اپنے احساسات و جذبات سے انصاف کرتے ہیں اور فطری تقاضوں کو پورا کرتے نظر آتے ہیں — "ڈکشنری" رام لعل لکھتے ہیں۔

"افسانہ لکھنا ایک فطری رویہ ہے۔ لکھنے سے پہلے سوچتا ضرور ہوں لیکن لکھتے وقت طے شدہ نکات بالکل بھول جاتا ہوں کیونکہ ان لمحوں میں کہانی کے کردار یا ان کی کہانی مجھے اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ میں تخلیق کو مولڈ (MOULD) کرنے کے بجائے اپنی انگلیوں سے اس کے خدوخال واضح کرتا ہوں؟ اور یہ یقین رکھتا ہوں اور یہ بھی جانتا ہوں کہ انگلیوں کی حرکت ذہن کے چکر کے تابع ہوتی ہے۔"

انتخاب میں شامل تقریباً تمام افسانے لعل کے مشہور اور مقبول افسانوں میں جاتے ہیں۔ لیکن "چاپ" "قبر" "اکھڑے ہوئے" "نئی دھرتی پرانے گیت" "بیلڈ نمبر" "پڑھا" "شہری پاکستان کا" "تماشائی" "بھیڑ" "اور یہی نصیب" وغیرہ ایسے افسانے ہیں جو افسانے میں قابل قدر اضافہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب کی کتابت، طباعت وغیرہ بے حد خوبصورت اور معیاری ہے۔ [illegible] ریڈنگ میں احتیاط نہیں برتا گیا ہے۔ جس کی وجہ سے کئی خامیاں جگہ پا گئی ہیں۔ سرورق حسین دیدہ زیب ہے۔ قیمت مناسب ہے۔

(سید احمد قادری)

شہرِ خیال —— قارئین کے خطوط

سہیل کے فروری اور مارچ ۱۹۸۵ء کے شمارے ایک ساتھ ملے۔ فروری کا شمارہ پڑھ چکا ہوں۔ حلیم فیروز آبادی کا کھلا خط اور ڈاکٹر رستوگی کی غزلیں نہایت بصیرت افروز ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ اردو میں تنقید ہی نہیں بلکہ تحقیق بھی یک رخی ہوتی ہے اور موضوعات کے تعلق سے اقبال ہی نہیں بلکہ غالب بھی اسی زمرے میں آتے ہیں اسد ڈاکٹر رستوگی کا درج ذیل شعر تو ساری غزلوں پر حاوی ہے :-

غازیٔ گفتار لاکھوں غازیٔ کردار کون
سامنے ہے سب کی دارائی کسے آواز دوں

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کا مجروح سلطان پوری پر مضمون تشنہ رہا۔ یہ میں اس لئے عرض کر رہا ہوں کہ میں بھی مجروح صاحب کی غزلوں کا شیدا ہوں۔

امید ہے مزاج بخیر ہوں گے۔

(بلراج حیرت)
نئی دہلی

تازہ شمارہ ملا واقعی پسند آیا۔ آپ کا اداریہ بہت اچھا اور بے باک ہے۔ پتہ نہیں کب آئے گا وہ دن جب یہ ہیروں کو سیدنا کے چنگل سے نجات مل سکے گی۔

کلیم الدین شمس کی تہنیت واقعی بہت اہم رہی ہے۔ ان کی شعلہ بیانی سے کئی بار لطف اندوز ہونے کا موقع ملا ہے۔ وہ اپنی تقریر کی طرح اس انٹرویو میں بھی بہت بے باک رہے ہیں۔ ہندوستانی مسلمانوں کے لئے اس طرح سوچنے والے بہت کم رہنما ہیں۔ سید شہاب الدین نے جب تحریک شروع کی تھی تو آپ کے شہر کے ہی ایک صنعت کار نے ان پر الزام لگایا تھا کہ وہ خواہ مخواہ مسلمانوں کے مسیحا بننا چاہتے ہیں —— شمس صاحب کے خیالات سے اس بات کا اندازہ تو لگایا ہی جا سکتا ہے کہ ہمیں کس نہج پر کام کرنا چاہیئے —

اس بار آپ نے نثری حصہ کے ساتھ انصاف کیا ہے۔ شردن کمار ورما نے خوب مزاح پیدا کیا ہے۔ ان کے قلم سے کہانیاں اور منظوم تخلیق تو دیکھتا رہا ہوں اس بار مزاحیہ پڑھ کر اور بھی لطف آیا۔

ظہیر صدیقی کی نظموں کا تجزیہ پسند آیا —— میرا خیال ہے مضمون کے شروع میں لیسنگ اور بائرن ٹننگ کے انگریزی حوالے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس کے بغیر بھی سماجی حقیقت نگاری کو سامنے لایا جا سکتا تھا —— ہم اپنی چیزوں کو اگر اپنے نظریہ کے ساتھ ہی پیش کریں تو زیادہ مناسب رہے گا ——

کلیم الدین احمد صاحب زندگی بھر اردو کو انگریزی میزان سے تولتے رہے —— فائدہ ——

منظوم حصہ بھی جاندار ہے نئے سال کا یہ پہلا شمارہ اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ آپ کا عزم جوان ہے اور آپ اسے خوب سے خوب تر کی طرف لے جانے کیلئے کوشاں ہیں۔ (رخسانہ انصاری - پورنیہ)

اس میں کوئی شک نہیں کہ ماہنامہ "سہیل" ایک خوبصورت، معیاری اور مفید جریدہ ہے اور بتدریج ترقی کی طرف گامزن ہے۔ فروری کے شمارے میں تبسم فاطمہ کا "حصارِ شب کا طلسم"۔ دیر کردی۔ احمد رشید" ——— غزلوں میں صلاح الدین صلاح، ملا رضوی، مشتاق جاوید، جمنا پرساد راہی، عقیل گیاوی، عاصم شہزاد، رضا حیدر نقوی اور عشرت ظفر، ذوقی، خورشید طلب، نیتا جوگی، حزیں لادی کلیم حاذق وغیرہ کی نظموں نے کافی متاثر کیا ———

مارچ کے شمارہ میں مشتاق حیدر آبادی کی نظمیں اچھی ہیں۔ علی عباس عزل کا چینل بھی برا نہیں ہے۔ شمس بدایونی، کامران غنی، انور شہپر رسول کی غزلیں بار بار پڑھی جائیں گی۔ "پیٹ کا سوال۔ خواجہ عبدالرزاق"۔ "سوکھے پتے۔ تسنیم سنرکھی"۔ "تاریک راہوں کے سفر" فخر الدین عارفی کے افسانے معیاری ہیں۔ لیکن اس شمارے کی خصوصیت حضرت علامہ جمیل مظہری سے متعلق مضامین ہیں۔

نیازمند
ساقی پھلی شہری۔ بھدوہی (ولافتی)

گرامی قدر! خلوص جاوداں

سال رواں کا پہلا "سہیل" نظر سے گزرا —— مشمولات میں کلیم الدین شمس کا انٹرویو خاصا اہم ہے تاہم ان کی تمام باتوں سے اتفاق نہیں کیا جاسکتا وہ مسلمانوں کو منتشر ہوکر ہر پارٹی میں رہنے کی تلقین کرتے ہیں جبکہ قرآن اپنے ماننے والوں سے صراحت کے ساتھ کہتا ہے "ولا تفرقوا" (آل عمران)

یہاں پر کلیم صاحب کا نظریہ، قرآن سے متصادم ہے، اور پھر انھوں نے آر ایس ایس میں شامل ہونے کے لئے واقعہ صلح حدیبیہ کو بطورِ جواز پیش کیا ہے جو انتہائی مضحکہ خیز ہے، یہ صحیح ہے کہ بظاہر یک طرفہ شرائط پر اس وقت آپ حضورؐ نے صلح کرلی تھی، تاہم اس مصالحت کے باوجود وہ کفارِ مکہ کے ساتھ شامل نہیں ہوئے تھے بلکہ مدینہ میں اپنا الگ تشخص برقرار رکھا تھا اس بنیاد پر اگر آر۔ ایس۔ ایس سے ہماری وقتی مصالحت مسلمانوں کے حق میں مفید ہو، تو یقیناً کرنی چاہیے۔ لیکن اس میں شمولیت تو ایک لمحہ کے لئے بھی گوارا نہیں کی جاسکتی۔ ہم اس میں شامل ہوکر کوئی انقلاب برپا کرنے سے تو رہے، البتہ ہمارے عقیدہ وایمان میں ضرور انقلاب آجائے گا۔

فضل امام ملک کی نظمیں "کرفیو" سے پچھلے کرفیو کی یاد تازہ ہوگئی۔ کرفیو کے شب و روز کا اظہار انھوں نے بڑی دلیری اور سلیقہ سے کیا ہے۔ کوئی مصلحت ان کو یہ اشعار رکھنے سے روک نہ سکی۔

صبح پچھلے محلے سے اٹھالی گئی لڑکی کو
پولس گاڑی یہاں چھوڑ جائے گی
اور تب؟
چلو تب تک جشن مناتے ہیں
کرفیو کا مزہ لیتے ہیں

ان تلخ حقائق سے کسی کو انکار نہیں مگر جرأت اظہار کس میں ہے؟

غزلوں میں ڈاکٹر ساقی پھلی شہری نے زیادہ متاثر کیا، بالخصوص ان کا یہ شعر انسان کی معنوی شخصیت کا کتنا سچا عکاس ہے۔

"چہرہ بتا رہا تھا حقیقت نہیں ہے یہ
لب کہہ رہے تھے آپ سے مل کر خوشی ہوئی"

افسانوی ادب میں نازنین سعید کا ترجمہ "بہت دیر بعد" بہت پسند آیا۔ اس میں عورت کی تہہ دار نفسیات کی سلوٹیں اور پرتیں کھل کر سامنے آجاتی ہیں۔ وفا کی پتلی پونم بھی نظر آتی ہے "تو بے وفائی کا مجسمہ بنتو بھی" ترجمہ میں تخلیقی خصوصیات پیدا کر کے ترجمہ نگار نے افسانہ کو مزید توانائی بخش دی ہے۔

آپ کا
رضوان اللہ آروی
لائبریری اسسٹنٹ خدا بخش لائبریری پٹنہ

مکرمی تسلیم

مارچ کا شمارہ ملا۔ "سمندر پھر بلاتا ہے" پر تبصرہ دیکھا۔ کرم نوازش کا شکریہ۔ "سہیل" (ماہ اگست ۱۹۸۴ء) میں اس سے پہلے بھی کتاب مذکور پر تبصرہ آچکا ہے اور وہ بھی ڈاکٹر علیم اللہ حالی ہی کے زور قلم کا نتیجہ تھا۔

دونوں تبصرے میرے سامنے ہیں۔ دونوں رد اور لب و لہجہ کے اعتبار سے ایک دوسرے سے کس قدر متضاد و متخالف ہیں یہ کہنے کی ضرورت نہیں ایسی صورت میں فاضل تبصرہ نگار کی کسی بھی رائے کی خواہ وہ تنقیص پر مبنی ہو یا تحسین پر کیا وقعت رہ جاتی ہے؟ سوال یہی ہے اور یہ نہایت اہم سوال ہے۔ رہی یہ بات کہ موصوف میرے کلام کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں اور وہ رائے کس نوعیت کی ہے۔ یہاں اس سے بحث نہیں۔ ہر شخص کو اختیار ہے۔

تازہ تبصرے میں ایک جگہ موصوف سے ذرا سی چوک ہو گئی ہے۔ "تعارف" کا زیر حوالہ شعر اپنے سیاق و سباق میں افتخار کا آئینہ دار ہے نہ کہ انکسار کا۔ "زیب و زینت دستار" کے بالمقابل "چشم و چراغ صحرا" کی ترکیب بھی انھیں معنوں پر دلالت کرتی ہے۔

امید ہے مزاج بخیر ہوگا۔
عرفی آفاقی (لکھنؤ)

بقیہ کائیں کائیں صفحہ کا

بیٹا باپ کو گھور کر دیکھتا ہے اور بہت ہی ناگوار لہجہ میں کہتا ہے۔

"یہ کیا کوے کی طرح کائیں کائیں کر رہے ہیں میں نے سن لیا تھا پہلے ہی دن اتنی جلدی بھی کیا ہے۔ آجاتی آپ کی دھوتی۔ بس"

باپ کچھ نہیں کہتا ـــ وہ اپنے کمرے میں آتا ہے ـــ اور تیس سال قبل کا لمحہ اس کے سامنے تھرکنے لگتا ہے۔

"ابو یہ کیا ہے۔"
"بیٹا یہ کوا ہے۔"
"ابو وہ کالا کالا کیا ہے۔"
"بیٹا وہ کوا ہے اور کائیں کائیں کرتا ہے۔"
"...... کائیں...... کائیں کرتا ہے......"
"کائیں...... کائیں......"

ہم سب ایک ہیں

ہمارا ملک نہ کسی خاص فرقے کا ملک ہے، نہ کسی خاص مذہب کا۔ یہ بھی
فرقوں، زبانوں، مذہبوں، اور کلچر کا ملک ہے، ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی،
وغیرہ سبھی کے تانے بانے سے یہ ملک بنا ہے۔ شاعر رویندر ناتھ ٹیگور، اور قاضی
نذر الاسلام یا دنکر اور اقبال سبھی نے اس کے گیت گائے ہیں۔

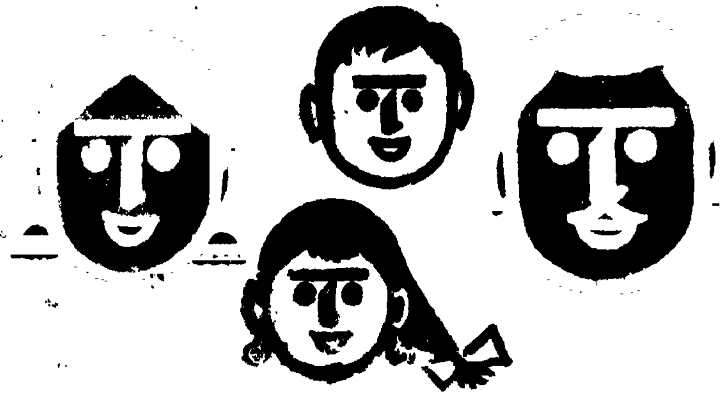
تلسی اور کبیر کے گیت آج بھی اس ملک کے سبھی گھروں میں گائے جاتے ہیں
نانک کی وانی آج بھی ہندوؤں کے گھروں کو پاک کرتی ہے۔ مختلف کلچر میں
یک جہتی یہی ہماری خوبی ہے یہ آج کا نہیں صدیوں پرانا رواج بنا ہوا ہے۔
اور یہی ہماری خصوصیت بھی ہے۔

آیئے ! ہم سبھی مل کر اس مہان خصوصیت کو اور مضبوط بنائیں

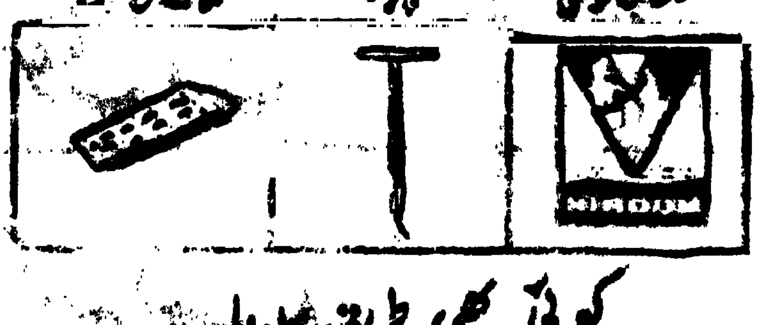
مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم، وطن ہے ہندوستاں ہمارا

स्व० अ० स० नि० 2 स० (स्व०-2)/85-86

دو بچوں کے درمیان
تین سال کا وقفہ رکھیے



کنڈوم کی گولی سے کاپرٹی سے کھانے کی دوا



کوئی بھی طریقہ اپنایئے



دل پسند ○ سُبک ○ تیز رفتار ○ ملائم ○ پائیدار اور ارزاں
مردانہ بھی
زنانہ بھی
اور
بچگانہ بھی
Baba Cushion
AND
Air India Cushion
کیولا ربر انڈسٹریز
فون نمبر
۴۳-۱۶۰۷
۴۔ تلجلا مسجد باری لین۔ کلکتہ ۳۹-۷۰۰۰

* * *



گرام: "النوری"
دلہن مارکہ
لاکھوں کا پسند
دانتوں کی حفاظت اور تازگی کے لئے
استعمال کیجئے
رجسٹرڈ نمبر
۲۳۵۴۶۱
النوری ٹوبیکو پروڈکٹس۔ جگتدل ۲۴ پرگنہ

: 1573 47 YEARS OF PUBLICATION
THE SOHAIL MONTHLY, River Side Road, Gaya - 823001



سہیل

JA Nomani
11-7-85



May, 85

Rs. 2/-

★ ★ ★

(نوٹ

وزیراعظم راجیو گاندھی کا قتل؟

جیو گاندھی کے آخر امریکہ کے دورہ کا پر انتہا پسند اُن کا قتل کرنا چاہتے تھے۔ یکہ کی سرکاری خفیہ ایجنسی کے اس انکشاف سے ساری دُنیا میں سنسنی یل گئی۔ فیڈرل بیورو آف انوسٹیگیشن کے ڈائرکٹر ولیم ولیبسٹر کے مطابق ں سازش کے سلسلہ میں کچھ لوگوں کو گرفتار بھی کیا گیا۔ اِن کے مطابق سکھ انتہا ندوں کا یہ گروپ وزیراعظم کے قتل کے ساتھ ہندوستان کے خلاف چھاپہ مار ائی کی تیاری میں بھی لگا تھا۔

پچھلے ۳۰ سالوں میں شاید پہلی بار امریکہ کی اِس خفیہ ایجنسی نے ایسا کیا ہے جس کے لئے ہندوستانی امریکہ کا شکریہ ادا کر سکیں۔ مگر سکھ انتہا پسندوں مرکز اور ذریعہ امداد امریکہ ہی میں ہے۔ اِس انکشاف سے ہم خوش نہیں ہو سکتے یں کیونکہ سکھ انتہا پسندوں کا سب سے مضبوط پہلو یہ ہے کہ خالصتانی نظریہ لوگ پنجاب میں اتنے نہیں ہیں جتنا امریکہ، انگلینڈ، اور کناڈا میں لوگ یں۔ یہ ایسے سکھ ہیں جن کی جڑیں ہندوستان سے کٹی ہیں اور جنہیں اب اس سے کوئی لینا دینا نہیں ہے۔ ایسے خالصتانی حمایتیوں کا سب سے بڑا مرکز ریکہ میں رہا ہے، اور امریکی پریس، ٹیلی ویژن اور حکومت نے سالوں سال نھیں پناہ دی ہے۔

اصل سوال یہ ہے کہ کیا یہ سکھ انتہا پسند اپنے بل بوتے پر ہی ہندوستان یکجہتی اور امن پر چوٹ کر رہے ہیں یا ان کے پیچھے کوئی غیر ملکی طاقت بھی ؟ اس سوال پر وزیراعظم اور مخالف پارٹیوں کے لیڈروں کو پارٹی لائن سے اوپر کر سوچنا ہوگا۔ ——— ہندوستان کے وزیراعظم کے قتل کی کوشش صرف ایک ے خلاف سازش نہیں ہے۔ شریمتی گاندھی کے قتل سے اس ملک میں جمہوریت کی جڑیں ئی ہیں۔ ابھی تک ہندوستان تیسری دُنیا کے دوسرے ملکوں کی حمایت سے الگ تھا جہاں راج ا قتل ایک عام بات ہے۔ ابھی تک ہمیں یہی فخر رہا ہے کہ ۱۹۶۴ء، ۱۹۶۶ء، ۱۹۷۷ء، اور ۱۹۸۰ء میں حکومت میں تبدیلی جمہوری طریقے سے ہوئی تھی۔ ایسا کسی بھی دوسرے شیائی ملکوں میں نہیں ہوا۔ دراصل راجیو گاندھی کے قتل کر کے خواب دیکھنے والے پاگل نہیں راجیو گاندھی کی نہیں ہندوستان کے وزیراعظم کا قتل کر کے یہاں سیاسی بحران لاکر ے کو پاکستان، شری لنکا، برما، کمبوچیا، ایران، بنگلہ دیش، سوڈان اور یوگانڈا کے ذخیرہ قطار میں بیٹھانا چاہتے ہیں۔ اِس سازش کو صرف ناکام کرنے کے لئے ہی نہیں بلکہ سازش یں کو پوری طرح کچلنے کے لئے سارے ملک کو اور سبھی جماعتوں کو ایک ہونا پڑے گا۔ اگر نہیں بچے گا تو راجیو گاندھی یا اور کسی کا بھی کوئی مطلب نہیں ہوگا۔ نہ ہندوؤں سکھوں کا اور نہ ہی ہم سب کا۔

(فضل نظر شہابی)

ترقی پسند ادب کا ترجمان

سہیل گیا

مئی ۱۹۸۵ء

جلد نمبر: ۴۷
شمارہ: ۵

مدیر مؤسس: ادریس سنہاروی مرحوم

چیف ایڈیٹر: مسعود منظر سنہاروی
ایڈیٹر: جمیل منظر سنہاروی
معاونین: شکیل احمد جامی، عبدالقیوم ابدالی

مجلس مشاورت: ڈاکٹر تارا چرن رستوگی
ڈاکٹر قمر رئیس
اصغر علی انجینئر

خطاط: ڈاکٹر ظفر الدین احمد
کلیم ڈیہوی

بدل اشتراک: فی شمارہ ۲ روپے
سالانہ ۲۴ روپے
لائف ممبری ۲۵۱ روپے

خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ:
ماہنامہ سہیل
ریور سائیڈ روڈ، گیا

اس شمارہ میں

ڈاکٹر تارا چرن رستوگی

اقبال ہو اقبال ہو کے علمبرداروں کے نام

یہ کون لوگ ہیں جو تحقیق و تنقید کو اپنے مفروضات ذہنی کے تحت پروان چڑھنے سے روکتے ہیں۔ میرے نزدیک اردو زبان و ادب ہی نہیں ہے۔ کلچر بھی ہے اور ہر چند کہ بیشتر ان اردو سے صرف میرے دوستانہ مراسم ہی رہے ہیں اردو کو اپنا دین و ایمان بھی سمجھتا آیا ہوں۔ مگر میرا یہ ایمان کمزور نہ ہونے کے باوجود کبھی کبھی متزلزل ضرور ہونے لگتا ہے۔ بالخصوص اس وقت یا ایسے حالات در پیش ہو جانے پر جب تنقید و تحقیق ادبیات علم و دانش فکری، نظریاتی پہلوؤں سے متعلقہ امور پر بحث و تحمیص کچھ لوگ کذا و کذب پر اتر آتے ہیں۔ ضرورت افہام و تفہیم کی ہوتی ہے۔ چشم بینا کو دھوکہ دے کر رعب جمانے کی کوشش کرنا، حفظ مراتب سے روگردانی کرتے ہوئے غزغزو غرغر پر اتر آنے سے ہم اپنی کم ظرفی ہی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ایک عمر انگریزی درس و تدریس انگریزی ادبیات و نیز تقابلی ادبیات پر ریسرچ اسکالرز کی نگرانی میں حروف چار مضامین میں ایم اے اور انگریزی میں ڈاکٹریٹ وغیرہ پس منظر کا مجھ جیسا خاک ادبی گفت و شنید کو نظر انداز کر دے وہ انقضا نہیں ہو سکتا۔ اقبال و اقبالیات پر اعلیٰ سطح کا کام علی سردار جعفری، جگن ناتھ آزاد، قمر رئیس، بشیر احمد ڈار، ۔۔۔ الدین احمد اور راقم الحروف ہی نے کیا ہے۔ خون لگا کر شہیدوں میں شامل ہونے والوں کی کب کمی رہی ہے مزید براں اقبال کو اشتراکیہ سوکم سیکرک، اور جماعت اسلامی ذہنیت والے نہیں سمجھ سکتے۔

ریسرچ کے معیار پر پورے اترنے والے درج ذیل تین مضامین شائع ہوتے ہی سورج سوا نیزے پر اتر آیا یا اقبال الدین سرجال الاقبال، یعنی غالی اقبالیے میدان میں اتر گئے۔

(۱) علامہ اقبال کا وصیت نامہ از محمود عظیم فیروز آبادی، ہماری زبان یکم اکتوبر ۱۹۸۲ء

(۲) اقبال کے والد شیخ نتھو حصہ اول ہماری زبان ۲۲ اکتوبر ۱۹۸۲ء

(۳) 〃 〃 دوئم 〃 ۱۵ نومبر ۱۹۸۲ء

محولہ فوق تینوں مضامین اعلیٰ معیار کے ہیں۔ اتفاق و اختلاف، افہام و تفہیم کے دروازے کبھی بند نہیں ہوتے ڈاکٹر مغنی صاحب ان مضامین پر الف ہو گئے۔ اور یہ لکھا کہ:

• محمود عظیم فیروز آبادی کا مضمون شائع ہوا ہے اس میں غیر معمولی اور توقیلہ مضمون کے مصنف نے صرف چند سطروں

کو تحریر کر کے افسانہ بنانے کی کوشش کی ہے..... یہ وہی حرکت ہے جو کچھ عرصہ پیشتر تاراچرن رستوگی صاحب کر
تھے۔ لہٰذا اس میں کوئی نیا پن نہیں ہے۔

درج ذیل خط میں لفظ "حرکت" کیا شوقیانہ نہیں ہے؟ مغنی صاحب کا مضمون ان کی علمیت کا غماز ہے
احمد کی کتاب "اقبال ——— ایک مطالعہ" کا جذباتی تجزیہ کو دے بھرا ہوا جواب لکھنے والا کس معیار کی بات کر
ایسے عالمی ادب جناب مغنی صاحب آپ تو اس کی تشریح بھی نہیں کر سکتے۔ عالمی ادب ایک گراں کن اصا
جس پر میرا مضمون شاعر بمبئی میں آ رہا ہے۔

مغنی صاحب کے "محراب و منبر" کرنے پر ادر بیگم صالحہ عابد حسین کا خط موصول ہونے پر ہماری زبان
کے چھکے چھوٹ گئے۔ اور مجبور ہو کر درج ذیل معذرت نامہ پیش کر دیا۔

ہماری زبان کے شمارے مورخہ یکم اکتوبر ۱۹۸۶ء میں محمد عظیم فیروز آبادی صاحب کا مضمون کا مقالہ
"اقبال کا وصیت نامہ" شائع ہوا تھا۔ اس میں جو غیر شائستہ زبان استعمال کی گئی ہے اس کے لئے
ہم قارئین سے معذرت خواہ ہیں۔ (ہماری زبان ۲۲ دسمبر ۱۹۸۶ء)

یعنی مغنی صاحب کو سارٹیفکٹ دے دیا گیا یا ان کی بات کی تصدیق کر دی گئی۔ یہ عجیب و غریب ادبی صحاف
کہ غیر شائستہ مضامین والے زبان کو شائع کر دے اور بعد کو غیر شائستگی کی نشاندہی کئے بغیر معافی ما
اتر آئے۔ معذرت کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ کیونکہ عظیم صاحب ہر اعتبار سے معیاری گفتار و کردار کے آدم

ہماری زبان کے شمارے مورخہ ۲۲ دسمبر ۱۹۸۶ء میں عظیم صاحب کے مضامین سے متعلق دو مراسلے
شائع ہوئے ہیں۔ پہلا مراسلہ بیگم صالحہ عابد حسین صاحبہ کا ہے۔ بہت اچھا مراسلہ ہے۔ کاش وہ یہ مشورہ بھی
دیتیں کہ لوگ اقبال کو برہمن زاد (؟) وغیرہ بتانا بند کر دیں چونکہ غلط بیانی کا ازالہ کرنے کی ضرورت پیدا ہو جاتی

دوسرا مراسلہ جناب ڈاکٹر اختر حسین صاحب کا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے کہ عظیم صاحب سمجھے
ہیں۔ اور علامہ کے بارے میں تحقیق کر رہے ہیں۔" اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے دو ٹروں کی فہرست وغیرہ سے کو
پیش کرتے ہوئے بالواسطہ اقبال کی ذات کو "شیخ سپرو" بتلایا ہے یہ شیخ سپرو کیا بلا ہے؟ مگر اس پر
مزید کچھ کہنے کے پہلے قدرے پس منظر کی جانب رجوع کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ معذرت کے ساتھ تفصیل
میں خاکہ پیش کرتا ہوں۔

نہ جانے کیوں کچھ اردو حلقوں میں بالخصوص ان نام نہاد اشخاص پر مشتمل حلقوں میں جو اقبال کے صاف و شفا
چہرے پر داڑھی لگا دینا چاہتے ہیں یا کبھی اس کے گلے میں جنیو ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ریسرچ کے معنی و
نقطۂ وحدہ و داربہ کیا ہیں وہ نہیں جانتے اور تین چار اشخاص قابل گردن زدنی سمجھے جاتے ہیں۔ کلیم الدین احمد
فراق گورکھپوری، عظیم فیروز آبادی، ڈاکٹر اکبر حیدری کشمیری۔ اور خاکسار رستوگی۔ اگر لوگوں کا بس چلے تو کلی
کو جو اور رحمت سے گھسیٹ لائیں۔ اور فی النار کر ڈالیں کیونکہ مرحوم نے یہ کہا تھا کہ اقبال کو عالمی ادب میں کوئی
نہیں دیا جا سکتا۔ فراق صاحب اب اس جہاں میں نہیں رہے۔ مگر چونکہ انہوں نے کہا تھا کہ اقبال کی شاعری

یا گیا

ب العین سے ناآشنائے محض ہے۔ اور جارحانہ تمائلات و رجحانات کو جنم دیتی معلوم ہوتی ہیں۔ ہندو ہیں ہم وطن
سلم ہیں ہم وطن ہیں / سکھ ہیں ہم وطن ہیں / عیسائی ہیں ہم وطن ہیں / سارا جہاں ہمارا۔ کیا بات ہوئی۔؟ ایسے دعوے
زیں ردعمل پیدا کر سکتے ہیں۔

جناب اکبر حیدری کشمیری نے بھرپور ثبوت پیش کرتے ہوئے یہ ثابت کر دیا کہ حاجی لول اقبال کے جد امجد نہیں تھے
تے اور انہوں نے کبھی شادی ہی نہیں کی۔ شیخ نتھو درزی پیشہ ناخواندہ شخص تھے بنایت فاضلانہ طور پر عظیم
بادی نے کئی سال پیشتر ہماری زبان کو ایک مضمون دیا تھا بہ عنوان "کیا اقبال کشمیری پنڈت تھے؟" مضمون
وضاحت و تشریح سے اس غلط بیانی کو کہ اقبال کشمیری برہمن زاد" (؟ نژاد) تھے فوکس میں لا کر قابل ترک
ا۔

ان دونوں اصحاب سے پہلے میں نے دو مضمون ہماری زبان نیو دہلی کو دئے تھے۔
(۱) اقبال سے متعلق چار فیصلہ طلب امور
(۲) چہ گفتت، چہ شنیدی، چہ در گماں آمد
ان میں شبہات مع دلائل پیش کئے تھے۔ (۱) اقبال برہمن زاد (ویسے زاد کہنے سے ذم کا پہلو نکلتا ہے نژاد کہنا
کیونکہ زادہ کے ایک معنی لڑکا بھی ہوتا ہے) نہیں تھے۔ سپرو کوئی گوتر गोत्र نہیں ہوتی۔ گوتر کو گوت
ہ تنزل طور پر تربیت یافتہ لوگ ہی کہتے ہیں۔ صریحاً غلط بیانی ہے۔ (۲) اقبال نے مسجد قرطبہ میں نماز نہیں
مسجد قرطبہ (جواب دراصل CATHE DRAL یعنی بڑا گرجا ہے) اقبال کو جانماز پہ کھڑا دکھاتی تصویر
ہے۔ قابل توجہ ایک بات اور بھی ہے۔ جہاں نماز مسجد (؟) کے اندر ہے وہی سیڑھیوں پر بچھا دکھایا گیا ہے۔
بال کھڑے ہیں۔ (۳) اقبال کی برگساں سے ملاقات محض افسانہ نگاری پر مشتمل شاہکار ہے (۴) تاریخ
سے متعلق سوال تھا جواب طے ہو چکا ہے۔

عرض کرتا چلوں۔ پہلے مضمون کے محرک سہیل بھائی (سہیل عظیم آبادی) تھے۔ میں نے اپنے شبہات ان کے
پیش کئے تھے بھائی جان نے مجھے کہا کہ شائستہ زبان میں مضمون کی شکل دیکر لکھ ڈالو۔ حکم کی تعمیل کرتے ہوئے
مضمون لکھ کر ہماری زبان کو دے دیا۔ سہیل بھائی نے اس کا کشمیری زبان میں ترجمہ "شیرازہ" ریاست جموں
میں بھی نکلوا دیا۔ کہیں سے بھی یہ آواز نہیں آئی کہ "ہم اقبال کے خاندان سے وابستہ ہندو شاخ کے لوگ ہیں"
کہا کرتے تھے کہ ہندو شاخ ابھی تک کشمیر میں ہے۔ جذباتی رستخیزی متعدد مضامین میں ظہور پذیر ہوئی جن کا
شا استدلال میں نے اپنے دوسرے مضمون میں چہ گفتت، چہ شنیدی، چہ در گماں آمد میں دے دیا۔
جناب صفدر سیتاپوری (ہومیوپیتھک کے ڈاکٹر جو بہائی مذہب سے غالباً وابستہ ہو گئے تھے) نے ایک
ثلث کہا مارا جو زیر بحث نکات سے کوئی واسطہ ہی نہ رکھتا تھا۔

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا
وہ بات ان کو بہت ناگوار گزری ہے

میں نے دنداں شکن جواب لکھ کر ہماری زبان کو پیش کر دیا تھا۔

اقبال ھوٗ اقبال ھوٗ کرے مگر حقیقت یہ ہے کہ ہندوپاک کے ادیبوں اور ناقدوں میں اقبالیات پر سب سے زیادہ موضوعات میں نے ہی فراہم کئے ہیں۔ مثلاً

اقبال اور گائتری منتر، اقبال کے نظریۂ انتقاد، شعر اقبال کا احتجاجی آہنگ اور

IQBAL & RELIGIONS OTHER THAN ISLAM

IQBAL-s WORKS: A Sociological Perspective

Iqbal & Tagore

Iqbal-s Works: A Sociological perspective مزید براں

Iqbal Works: A Psycho Sociological Perspective

غالباً یہاں یہ بتانا بے محل نہ ہوگا کہ "اثر" سے متعلق کلیہ سب کے پہلے میں نے ہی وضع کیا ہے۔ جو میرے اس مقالے Western Influence in Iqbal جس پر مجھے انگریزی ادبیات میں ڈاکٹریٹ ملی شامل ہے اور جس کو میں اردو میں شائع ہونے والے اپنے متعدد مضامین میں بھی پیش کر چکا ہوں۔

شاعر اقبال یقیناً بڑا شاعر تھا عظیم شاعر تھا۔ وید، اپنشد، گیتا وغیرہ بھی اس کے زیر مطالعہ آئے مگر جیسا کہ گائتری کے ترجمے سے ظاہر ہوتا ہے کہ جو بھی مطالعہ تھا وہ میکس مولر کی تصنیفات کی توسط سے تھا گائتری منتر میں صرف ۲۴ حروف ہیں، میکس مولر کے گائتری منتر کی تفسیر کو اقبال نے نظم کیا ہے۔ اور بہتر ترجمہ کیا ہے۔ مخزن میں جب یہ ترجمہ شائع ہوا تھا تو اس کے ساتھ ہی شذرات میں اقبال نے سوریہ نرائن اپنشد کا ذکر کیا ہے۔ صرف سوریہ اپنشد ہی کہنا چاہئے تھا۔ سوریہ نرائن اپنشد کوئی نہیں ہے۔ مگر میکس مولر نے چونکہ یہی نام لکھا تھا لہٰذا اقبال نے بھی لے لیا۔ بہر کیف ترجمہ بہت خوب ہے اس موضوع پر میری گفتگو بمبئی کے کسی شمارے میں شائع ہوا تھا۔ اقبال سنسکرت سے بالکل نابلد تھا اور عربی پر بھی عبور نہ

بات کہیں سے کہیں پہونچ گئی۔ جب میں نے ثابت کر دیا کہ اقبال برہمن زادہ نہیں تھے۔ تو سہیل نے پوچھا کہ تو اب یہ بتاؤ کہ اقبال نے اتنا بڑا جھوٹ کیوں بولا کہ

برہمن زادۂ رازآشنائے روم و تبریز ست

جواباً میں نے عرض کیا کہ ایک اعتبار سے اقبال کی بات کو درست قرار دیا جا سکتا ہے۔ اقبال نے گائتری کا کیا تھا لہٰذا گائتری منتر کے خالق رشی وشومتر विश्वामित्र سے وہ ناواقف نہ تھے۔ اسی وشومتر "جہاں دوست" کے نام سے اقبال نے جاوید نامہ میں پیش کیا ہے۔ مزید براں اقبال کو یہ بھی معلوم ہوگا کہ آریہ دھرم میں دو پیدائشیں (جنم) مانی جاتی ہیں۔ جسمانی اور روحانی۔ ایک عمر پر پہونچ جانے پر یا بالغ ہو جانے سے کچھ پیشتر ہی گائتری منتر دیا جاتا ہے (یہ ہندو رواج ہے) اور یہ گائتری لینے والا گویا دوسرا جنم لیتا ہے یعنی اس کا رمز آشنا ہو جاتا ہے لہٰذا گائتری منتر لینے والے کو براہمن کہا

ہے۔ یہ نظریہ آریہ سماج کا ہے۔ اور اقبال اس سے واقف ہوں گے۔ ان کا مطالعہ بھی تھا۔ اور سوامی رام تیرتھ سے ان
ستانہ مراسم بھی تھے۔ اگر اس استدلالی کھینچ تان کو تسلیم کیا جائے۔ تبھی اقبال کو برہمن نژاد کہا جا سکتا ہے۔
اور نژاد میں فرق ہے) اسلام ویسے بھی ان تمام امتیازات سے بالاتر ہے۔
اقبال نے ایشیا کے خلاف اور مغربی استعماریت کے خلاف سب سے پہلے آواز اٹھائی جو قابل ستائش ہے۔

نسل، قومیت، کلیسا، سلطنت، تہذیب، رنگ
خواجگی نے خوب چن چن کر بنائے مسکرات

جواب شکوہ، طلوع اسلام وغیرہ نظمیں بہترین سماجیاتی و تاریخی پس منظر بھی رکھتی ہیں۔ اور دعوت حریت
دیتی ہیں۔ اقبال نے جمال الدین افغانی کے پیغام پر غائر توجہ صرف کی تھی۔ مشرق اور مغرب کو بطور قاطیغوریاس
(Categories) اور اصطلاح استعمال کرنے والا پہلا افغانی ہی تھا۔ مغربی طاقتوں کی استعماریت اور دوسری
بالخصوص مشرقی اقوام کا استحصال کرنے والی مغربی طاقتوں کے خلاف نعرہ بلند کرنے والا پہلا شخص افغانی تھا
دوسرا اقبال۔ ساتھ ہی اقبال پر سر سید کی تحریک کے اثرات مرتب ہو رہے تھے۔ افغانی مغرب کی سائنس اور علوم
کا بھی تھا۔ اور وہ مسلمانوں سے مغربی علوم و فنون کا بائیکاٹ کرنے کی تلقین نہیں کرتا تھا۔ وہ مسلمانوں کو عروج
پر دیکھنا چاہتا تھا۔ اقبال کی بھی یہی خواہش تھی۔ لیکن افغانی کی طرح اقبال گفتار و کردار کے غازی نہ
افغانی زبردست مقرر تھا مگر اقبال کی تقاریر میں افغانیت نہ تھی۔ ان کی شاعری میں افغانیت ہے اور انسانیت
عروج آدم پر اقبال کی توجہات مرکوز رہی۔

عروج آدم خاکی سے تارے سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہ کامل نہ ہو جائے۔

ایک اور شعر جو ان کے کلیات میں شامل ہے نہ باقیات میں، قابل توجہ ہے

چشم آدم آں سوئے افلاک نواعش ہم نیافت
از غبار مہر و ماہ اندیشہ گرد آلود بود!

نا میں ان کا یہ شعر قابل داد ہے

من درون سینۂ خود سومناتے ساختم
آستان کعبہ را دیدم جبیں فرسودہ بود

قبال بہ حیثیت شاعر خاص وسیع عظمت کا حامل ہے۔ شعر اقبال سے آگے بڑھنے والوں کو بیگم صالحہ عابد
صاحبہ کا مراسلہ بغور پڑھنا چاہیے۔ اور کچھ کہتے یا لکھتے وقت احتیاط برتنا چاہیے۔ ورنہ درج ذیل سوالات
ت سامنے آنے لگتے ہیں۔ جو ریسرچ کے اعتبار سے ناگزیر بھی ہیں اور لغات اہم بھی ہیں۔
(۱) اقبال قطعاً برہمن زاد یا نژاد نہ تھے درزی زادے تھے۔
(۲) اقبال نے اپنے والد صاحب کا نام تبدیل کیا تھا نا خواندہ نتھو کو میر محمد اور لبد کو نور محمد بنا ڈالا۔

(۴) آفتاب اقبال جو پہلی بیوی سے محمد اقبال کے بڑے صاحبزادے تھے۔ ان کو گھر سے نکال دیا اور عاق کیوں؟ یہ ثبوت میرے پاس تھا یعنی آفتاب اقبال کا خط میرے خط کے جواب میں، خط ہذا کی فوٹو اسٹیٹ کاپی عظیم آبادی نے کروالی تھی۔ وہ یقیناً مرحوم کے کاغذات میں ہوگی۔ میرے پاس جو مراسلہ تھا جو الیہ زدہ ہو گیا۔ لینڈ میں گھر کے چار افراد زندہ دفن ہو گئے۔ اور میری چار ہزار کتب پر مشتمل لائبریری تباہ و برباد ہو گئی۔ صرف ۱۳-۷ کتب اور مسودات صاف کئے جاسکے۔ بہرکیف! مراسلہ ہذا کا پھٹا ہوا حصہ ہنوز میرے پاس موجود ہے میں اس میں مزید کچھ کہنا نہیں چاہتا۔ تاہم ایک بات عرض کردوں۔ کہ اقبال کے ایک دوست کنہیا لال گابا ہوا کرتے تھے اپنے دوست کی طرح فل چینک تھے۔ مسلمان ہو جانے پران کا اقبال کی تجویز پر خالد لطیف گابا ہو گیا۔ اور اس کے، ایل گابا ہمارے سامنے رہے۔ انہوں نے اپنی سوانح حیات FRIENDS & FEOS میں اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اقبال کی ازدواجی زندگی خوش گوار نہ تھی۔ وہ اقبال کو پاکستان کا باشکوہ مقبرہ کہتے تھے، نیز وہ دل برداشتہ اور مایوس شخص تھے۔

(۵) اقبال پر روشنی ڈالنے والی ایک اور کتاب "والدۂ آفتاب" پاکستان میں شائع ہوئی ہے۔

(۶) اقبال پر ایک صاحب اقبال سنگھ نے انگریزی میں کتاب ARDENT PILGRIM لکھی تھی جو خاصی اہم تصنیف ہے اقبال سنگھ کا ایک مضمون ORGANISER DELHI 1969 کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ جن میں منجملہ دیگر امور ایک طوائف کے گلا گھونٹنے کا ذکر کیا گیا تھا۔

(۷) اقبال کو جرمنی کی میونخ یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی جس ریسرچ سے ملی تھی اقبال نے انگلینڈ پہونچ اس کا انگریزی ترجمہ DEVELOPMENT OF METAPHYSICS IN PERSIA کیمبرج یونیورسٹی میں پیش کیا مگر اس یونیورسٹی نے اس مقالے پر CERTIFICATE OF RESEARCH ہی دیا۔ کیا حقیقت سے کچھ نتیجہ نکلتا ہے۔؟ اقبال کی یہ تصنیف معیاری نہیں ہے۔

(۷) اقبال اور برگساں کی ملاقات کو محض افسانوی شاہکار ہی سمجھنا چاہئے۔ (ملاحظہ ہو چہ گمت شنیدی، چہ در گماں آمد، جو میں نے ہماری زبان کو دیا تھا)

(۸) کیا اقبال نے ایم اے فلسفہ تھرڈ ڈویژن میں پاس نہیں کیا؟

(۹) کیا بہ حیثیت فلسفی اقبال کو فارابی، ابن سینا، ابن رشد ایسے مسلم حکماء کے برابر مقام و مرتبہ دیا ہے؟۔

(۱۰) کیا اقبال کے وہ لکچر جو بعنوان CONSTRUCTION OF RELIGIOUS THOUGHT IN ISLAM میں کوئی ابداعیت (ORIGINALITY) ہے؟ کیا ان میں معتزلہ اور ان کے اسلاف کے خیالات کی صدائے بازگشت نہیں ہے؟ کیا اس میں مغرب کے فلسفیوں کے یہاں سے خوشہ چینی کی ہے۔ کیا ندوہ اور دیوبند کے دبستان خیالات کے حامل علمائے دین اقبال کے خیالات سے اتفاق کرتے ہیں ... مثلاً درست درج ذیل شعر کو بھی اسلام ... [illegible]

ز جبرئیل امین قرآن بہ پیغام نمی خواہم ✧ ہمہ گفتار معشوق است قرآن کہ من دارم

الغرض اس نوعیت کے مسترات کی تعداد کم نہیں ہے۔ اگر ریسرچ کرنے اور گلہائے عقیدت پیش کرنے میں کوئی غرض
ہیں ہے تو بات اور ہے۔ اقبال کی شاعری نے مسلمانوں میں ہی نہیں غیر مسلمانوں میں بھی بیداری پیدا کی۔ بالخصوص اس
بعیت کی نظموں نے جن میں استحصال و استعماریت کی خبر لی گئی ہے۔ پرکار و شعور کسی ریسرچ کسی بات سے روگردانی نہیں کر

قدم بے باک تر نہ در حریم جان مستقاں
تو صاحب خانہ آخر چرا دل دانہ می آئی (اقبال)

— ۰ —

گرمئی شوق میں وہ جراتِ رندانہ کہاں
وائے محرومئ تقلید و زوال تنقید (اقبال)

بہ میں نہیں آتا، اقبال کی جا بجا تعریف و توصیف کیوں کی جاتی ہے؟ دروغ گوئی کو تنقید کیوں سمجھا جاتا ہے۔ یا ان خواہ
مزورت کیوں پیش آتی ہے؟

اسلام نے دنیا کی تاریخ میں قابل قدر رول ادا کیا ہے۔ نظر غائر سے دیکھنے والی بات یہ بھی ہے کہ "ہندو"
دی "ہندوستان" تینوں الفاظ فارسی کے ہیں۔ پہلا لفظ بطور قاطیغوریاس (category) استعمال
یا گیا تھا۔ جو بعد کو مذہب کا نام ہی بن گیا۔ ریسرچ کرنا جوئے شیر لانے سے کم دشوار و محال کام نہیں ہوتا۔
وس کا مقام ہے کہ پڑھے لکھے لوگ جاہلوں کی سی بات کرنے لگتے ہیں ؎

خاک شد فطرت بہ پستی لیک فرگاں ورنداشت
ورنہ از ما تا بہ بام آسماں یک زینہ بود (بیدل)

ال کی عظمت سے کبھی روگردانی نہیں کی جا سکتی، مگر بالاخوانی، الخراق، و اغلاق کو بھی کیوں روا رکھا جائے۔
ال ہوئے اقبال ہوئے معنی، اور ضرورت لغزہ ہوگا۔ ویسے پسند اپنی اپنی خیال اپنا اپنا۔ اگر کوئی اقبال ہوئے
تال ہوئے بطور وظیفہ پڑھنا چاہتے ہیں۔ تو وہ شوق سے کر سکتے ہیں۔ مگر اپنی نام نہاد علمیت یا مضرات ذہنی کو وہ
سروں پہ نہیں مقوب سکتے ؎

ہم کھٹکتے ہیں دل مُغنی میں کانٹے کی طرح
چونکہ ہم کہتے نہیں اقبال ہوا اقبال ہوا

مُغنی صاحب سے دل سے میرے مضامین عظیم فیروز آبادی اور اکبر حیدری کے مضامین پڑھنے کی
ت گوارہ فرمائیں۔ اور سیکھنے کی استعداد و صلاحیت پیدا کریں کہ ریسرچ کسے کہتے ہیں کو سمجھ سکیں۔

— ۰ —

توقیر احمد خاں

اقبال ایک شاعر

عام طور پر ایک روایتی عقیدہ بن گیا ہے کہ اقبال شاعر نہیں فلسفی، حکیم، مفکر اور بڑے دانشور ہیں
ں میں کوئی شک نہیں کہ وہ بڑے مفکر، فلسفی اور حکیم تھے۔ لیکن با ایں ہمہ اقبال کے شاعر ہونے سے کسی طرح بھی
ر نہیں۔ اگر وہ شاعر نہ ہوتے تو اپنی حکمت، اپنے فلسفہ، اپنی فکر اور اپنی دانش کو باوزن مصرعوں، ردیف اور
فیوں کے بکھیڑوں میں پڑ کر پیش نہ کرتے۔ نہ کہیں غزل کہنے کی ضرورت تھی۔ اور نہ مثنوی، رباعی، ترکیب بند، مسدس
، تضمین وغیرہ شاعری کی مختلف اصناف سخن کا رنگ اپنایا اور اس میں شعر کہنا صرف شاعر ہی کا کام ہو سکتا ہے۔ ان
کلام کی یہ مسحور کن غنائیت، نغمہ، سرور، رمز، کنایات اور شاعرانہ اشارات اس بات کے دلائل ہیں کہ اقبال
۔ شعر کسی شاعر کا کلام ہے۔ خود اقبال کے یہاں بھی اس کے اشارے ملتے ہیں جب وہ کہتے ہیں ؎

من نوائے شاعر فردا ستم۔ تو پھر اس کا کیا مطلب ہے؟ کیا انہوں نے خود کو شاعر تسلیم نہیں کیا
، جب وہ کہتے ہیں ؎

تہذیب نوی کارگہ شیشہ گراں ہے — آداب جنوں شاعر مشرق کو سکھا دو

ال شاعر مشرق کا لفظ اقبال نے اپنے لئے استعمال کیا ہے۔ اور نہ صرف شاعر بلکہ مشرق کا شاعر تسلیم کیا
ہے۔ اور اس سے بڑھ کر یہ کہ "شاعر مشرق" خدا تعالیٰ کی زبان سے کہا گیا ہے (یہ شعر اقبال کی نظم فرمان خدا
ہے) بہرکیف وہ ایک یقینی طور پر شاعر تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ اقبال نے اپنے پیغام کی ترسیل کے لئے
شعر کو ذریعہ اظہار بنایا۔ اگر وہ شاعر نہ ہوتے تو شعراء ان کے کلام پر اعتراض نہ کرتے اور اقبال بھی ان کے
تراضات کا جواب رسم و رواج کے مطابق شاعرانہ کلام سے مثالیں چھانٹ کر نہ دیتے، ذکر اقبال میں لکھا ہے

اقبال کا ایک شعر تھا ؎

آرزو دیا سکو یہ کہتی ہے — اک نئے شہر کا نشاں ہوں میں

تنقید سیدھی نے لکھا ہے کہ "آرزو دیا ہی سے یہ کہتی ہے" ہونا چاہئے، کو یہاں دوسری نہیں

اس پر اقبال کا جواب نقل کیا ہے جو حسب ذیل ہے:

"...... آپ کا ادعا ہے کہ یہاں 'کو' کی جگہ 'سے' ہونا چاہئے میں کہتا ہوں کہ 'سے' اور 'کو' دونوں ہو سکتے ہیں۔ اور اساتذہ کا کلام میرا مؤید ہے فخر المتقدمین و المتاخرین امیر علیہ الغفران ایک غزل میں فرماتے ہیں ؎

مر کے راحت تو ملی پر ہے یہ کھٹکا باقی ۔۔۔ آکے عیسیٰ سر بالیں نہ کہیں قُم مجھ کو

اس شعر میں کہنا کا مقولہ ایک مرکب نام یعنی قُم ہے اور حضرت مرحوم اس "صلہ" کو استعمال کرتے ہیں۔ مومن فرماتے ہیں ؎

دیا اس بدگماں کو طعنۂ غیر ۔۔۔ غضب ہے کیا کہوں اپنی زباں کو

شیخ غلام ہمدانی مصحفی جن کے انداز کے جناب حسرت دارفتہ ہیں فرماتے ہیں ؎

کہیو لے باد صبا بچھڑے ہوئے یاروں کو ۔۔۔ راہ ملتی ہی نہیں دشت میں آواروں کو

اور لیجئے مرزا رفیع سودا دولت مند بخیل کی ہجو میں فرماتے ہیں ؎

غرض اٹھ کر چلا وہ جب واں سے ۔۔۔ کہہ گیا کان میں یہ مہماں سے

چاہو جو کچھ کہ اب تناول کو ۔۔۔ کہہ دو بلوا کے تم بکاول کو!

مرزا نے پہلے شعر میں کہنے کا صلہ 'سے' استعمال کیا ہے اور دوسرے میں 'کو'۔ اب فرمائیے آپ کے دلیرانہ دعوے کی تردید ہوئی یا نہیں؟"

اقبال کا ایک شعر تھا ؎

آشیاں ایسے گلستاں میں بناؤں کس طرح ۔۔۔ اپنے ہم جنسوں کی بربادی کو دیکھوں کس طرح

"تنقید ہمدرد" نے اعتراض کیا کہ بناؤں اور دیکھوں کا قافیہ غلط ہے۔ اس پر اقبال نے لکھا کہ بلاشبہ اس شعر میں ایطائے خفی ہے جس کو شایگاں کے نام سے بھی موسوم کرتے ہیں تسلیم کرتا ہوں کہ قواعد قافیہ کی رو سے یہ قافیہ غلط ہے مگر اساتذہ نے اکثر فن قافیہ کے اصولوں کی پابندی نہیں کی اس کے بعد اقبال نے بطور سند یہ اشعار پیش کئے ؎

پھر دل میں مرے لگی ہے آتش ۔۔۔ نالے سے برس رہی ہے آتش

— مومن —

جب وادیٔ وحشت میں گزر میرا ہوا ہے ۔۔۔ ہر ایک بگولے نے تعظیم اٹھا ہے

— ناسخ —

سنگ دل تجھکو مرے ساتھ یہ کاوش کب تک ۔۔۔ مری شورش کے لئے غیر سے سازش کب تک

اس کے بعد اقبال نے شعرائے فارسی کے کلام سے بے شمار مثالیں پیش کر کے بتایا ہے کہ قواعد قافیہ کی خلاف ورزی عام ہے مثلاً ؎

چہ گفت آں خداوند تنزیل وحی! خداوند امر و خداوند نہی!

— فردوسی —

چناں نادر افتادہ در روضۂ کہ در لاجوردی طبق بیضۂ!

— سعدی —

مہاراجہ سرکشن پرشاد شاد کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

"میں نے پہلے عریضے میں ایک شعر آپ کی خدمت میں لکھا تھا اس زمین میں دو شعر اور ہو گئے عرض کرتا ہوں ؎

گم گشتہ کنعاں ہے اے خوگر زنداں تو ہستی کے خیاباں میں ہر پھول زلیخا ہے

چاہے تو بدل ڈالے ہیئت چمنستاں کی تو ہستی بینا ہے، دانا ہے، توانا ہے!

ایک دوسرے خط میں مہاراجہ صاحب کو لکھتے ہیں:

"...... زیادہ کیا عرض کروں، جی رہا ہوں، دو شعر حاضر ہیں، مولانا اکبر کا رنگ ہے

دیکھیے چلتی ہے مشرق کی تجارت کب تک شیشۂ دیں کے سبب جام و سبو لیتا ہے

ہے مداوائے جنوں نشتر تعلیم جدید میرا سرجن رگ ملت سے لہو لیتا ہے

یہاں اقبال نے اپنے کلام کو شعر کہہ کر مخاطب کیا ہے۔ اور ان کے شعر سنانے میں شاعر ہی کی طرح داد طلبی کی بو آتی ہے۔ ایک اور خط میں لکھتے ہیں:

امید کہ سرکار کا مزاج بخیر ہو گا۔ بچوں کو میری طرف سے دعا کہیے، مثنوی کے حصہ دوم کے تین ابتدائی اشعار عرض کر کے اس خط کو ختم کرتا ہوں ؎

چوں مرا صبح ازل حق آفرید نالہ در ابریشم عودم تپید!

عشق را داغے مثال لالہ بس در گریبانش گل یک نالہ بس

من ہمیں یک گل بدستارت زنم محشرے بر خواب سرشارت زنم

یہاں بھی اپنی گراں مایہ تصنیف کو مثنوی اور پھر ابتدائی کلام کو اشعار فرمایا۔

یہ اور اس قسم کے متعدد دلائل و براہین اس بات کے مؤید ہیں کہ اقبال شاعر ضرور تھے۔ عبدالمجید سالک صاحب نے لکھا ہے:

"ایک مرتبہ اقبال سے پوچھا گیا کہ آپ کی تعلیمات نے سوئی ہوئی قوم کو بیدار کر دیا لیکن

یہ شکایت ہے کہ آپ نے خود عمل کر کے بطور مثال پیش نہیں کیا"

علامہ نے جواب دیا:

"کیا یہ میرا عمل نہیں ہے کہ میں نے قوم کو بیدار کر دیا ہے اور تمہارے سامنے عمل کی شاہراہ پیش کر دی ہے...... پھر فرمایا دنیا میں جلیل القدر انبیا کے سوا اور کوئی مثال نہیں ہے کہ کسی شخص نے خود ہی کوئی اصولی نظریہ قائم کیا ہو اور خود ہی اس پر عمل کر کے دکھایا ہو۔"

مولوی محمد علی ایم اے کینٹ نے بھی ایک دفعہ اسی قسم کا سوال کیا تھا جس کا جواب علامہ نے یہ دیا کہ:

"اگر میں اپنی پیش کردہ تعلیمات پر عمل پیرا ہو کر تو صرف شاعر نہ ہوتا بلکہ مہدی ہوتا"

آخری جملے سے صاف عیاں ہے کہ اقبال خود بھی اپنے آپ کو شاعر سمجھتے تھے اور اقبال نے یہ جگہ جگہ لکھا ہے:

او حدیث دلبری خواہد ز من — آب و رنگ شاعری خواہد ز من

مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ — کہ میں ہوں محرم راز درون میخانہ

خوش آگئی ہے جہاں کو قلندری مری — وگرنہ شعر مرا کیا ہے شاعری کیا ہے

تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کی شاعرانہ عظمت سے انکار کیا جائے اور اقبال کو شاعر کہنا مذموم اور اہانت آمیز تصور کیا جائے۔ بلکہ اس کا مطلب یہی ہے کہ میرے اشعار کو صرف شعر سمجھ کر مت پڑھو اور ان میں صرف شعریت تلاش نہ کرو۔ بلکہ اس کے اصل مفاہیم و مطالب پر غور کرو اسی لئے علامہ خود بھی کسی فرمائش پر شعر نہ کہتے تھے اور نہ سناتے تھے۔ بلکہ کہا کرتے تھے کہ شعر خلوت میں بیٹھ کر پڑھنے کی چیز ہے۔ اسی لئے فرماتے ہیں:

اگر ہو ذوق تو خلوت میں پڑھ زبور عجم — فغان نیم شبی بے نوائے راز نہیں

اس طرح باوجود اس سعی کے کہ شعر اقبال میں فکر و فلسفہ، حکمت و دانش کی باتیں ہیں۔ اقبال کے شعر کو میزان شعر پر پرکھنا اچھا نہیں۔ اقبال کا شعر شعریت سے پُر ہے جو محاسن شعری شعر میں پائے جاتے ہیں وہ سب کے سب اقبال کے شعر میں موجود ہیں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ اگر اقبال شاعر نہ ہوتے تو وہ اسلامی دنیا میں صرف حکیم الامت، مفکر اسلام، شناسائے فطرت فلسفی اور دانشور کہلاتے۔ اور شاعر نہ کہلاتے۔ رہا معاملہ پیغام کا تو پیغام کا کام سعدی اور رومی نے بھی شعر ہی سے لیا ہے۔ کیا سعدی اور رومی کو شاعر تسلیم نہیں کریں گے اگر ہاں تو کیا وجہ ہے کہ اقبال کو شاعر نہ مانا جائے اور اس طرح پیغام رساں ہونے کی نسبت سے حالی اور اکبر کو بھی شاعر نہ سمجھنا چاہیے کیونکہ میر نے بھی کہا تھا۔

ہم کو شاعر نہ کہو میر کہ صاحب ہم نے — درد دل کتنے کئے جمع تو دیوان کیا

اور غالب نے بھی اپنے شعر سے عار کیا ہے

سو سال سے ہے پیشہ آبا سپہ گری! کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے :

اس طرح کہنے سے میر اور غالبؔ کو شاعر تسلیم نہ کیا جائے گا۔ اور یوں کہنے سے ان کی شاعرانہ عظمت میں واقعہ نہ ہوگی بلکہ دنیا نے اور بڑھا چڑھا کر ایسا لکھا کہ دونوں صرف شاعر کی حیثیت سے ہی دنیائے ادب تھے۔ اور میر اور غالبؔ کو شاعر کے علاوہ کوئی اور مخلوق تسلیم نہیں کیا جاتا۔ اگر اقبال نے کہہ دیا کہ "شاعری معنوی مقصودیت" تو کیا بات ہوگئی۔ مولانا شبلی نے لکھا ہے کہ فلسفہ اور شعر دو برابر کی چیزیں ہیں جس طرح فلسفی بننا آسان نہیں اسی طرح شاعر بننا بھی سہل نہیں۔ لغوی اعتبار سے شاعر وہ باشعور شخص ہے جو دوسروں کو بھی شعور میں لے آئے۔ شاعر کے اسی امتیاز کی بنا پر مولانا روحی نے شاعری کو "جزویست پیغمبری" کہا اور اسی امتیاز کی بنا پر عرب میں "الشعراء تلامیذ الرحمان" کا مقولہ مشہور رہا ہے۔ یہ عرض کا مقصد یہی ہے کہ فلسفہ کی طرح شاعری بھی آسان کام نہیں۔ دنیائے حکمت میں جہاں فلسفی کو بڑا مقام ہے اسی کے ساتھ شاعر کا مقام بھی بلند ہے۔ اور اقبال کے یہاں تو یہ دونوں چیزیں (فلسفہ و شعر) یکجا ہیں اور فن اپنے بغیر نہیں رہتا۔ اقبال کا فن بھی ان کی شعرگوئی میں نمایاں ہوگیا۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ "راز دان میخانہ" تھے اور ایسی ایسی باتیں کہہ جاتے تھے جو عقل و فہم انسانی کو خیرہ کرتی ہیں لیکن اس کا استعمال انہوں نے شعر میں کیا۔ اور شعر کے سانچے میں یہ اوکار ٹھیک پڑے اور اقبال اپنی شعرگوئی کو روک نہ سکے ورنہ نثر کے ذریعہ بھی اپنا پیغام پہونچا سکتے تھے لیکن تاثر اور رخصا کے لئے شعر سے بڑھ کر موثر وسیلہ نہیں دوسرا جو فنون کا مصدر ہے۔ تاہم یہ بات بھی قابل قبول ہے کہ اقبال اگر شعر نہ کہتے تو ان کا شمار مشاہیر کے ان اکابر میں ضرور ہوتا جن میں طوسی، جنید، رازی، غزالی، بایزید بسطامی، اور بوعلی سینا وغیرہ ہیں لیکن ان اکابر کے ساتھ رومی، سعدی، حافظ، غالب، کیٹس، ورڈزورتھ، گوئٹے، دانتے، ملٹن، شیکسپیر، ہیگل و نطشے وغیرہ مختلف مشاہیر عالم کی صف میں ہیں۔ اور اقبال کا یہ کمال فن شعر میں قدم رکھنے کے سبب ہے

اصغر علی انجینیر

...مل مسلمان — مذہب اور علاقائی تشخص کا مسئلہ

جدید ہندوستان میں جہاں ایک طرف مذہب [کی] سیاسی اہمیت بڑھتی جا رہی ہے وہاں دوسری طرف لسانی [او]ر علاقائی تشخص کا مسئلہ بھی ایک نئی اہمیت اختیار کرتا جا رہا ہے۔ کہیں ان میں ٹکراؤ ہوتا ہے اور کہیں یہ ایک دوسرے [کو] اور زیادہ مضبوط بناتے ہیں۔ آج کے سماجی سیاق و سباق میں مذہب اور تشخص کے مسئلے کو سمجھنا اور اس کی اہمیت کا جائزہ لینا بے حد ضروری ہو گیا ہے۔ ملک میں اکثر و بیشتر مذہب اور ذات پات کے نام پر فسادات رونما ہوتے رہتے ہیں۔ ہم ابھی مرادآباد اور بلیچی کے ہولناک واقعات کو بھولے بھی نہیں تھے کہ ترونویلی (تامل ناڈو) اور میرٹھ میں پھر ذات پات اور فرقہ وارانہ فسادات کے شعلے بھڑک اٹھے ہیں۔ وشو ہندو پریشد کی زہریلی مہم ہو یا اسلامی احیائیت کی تحریک، آج کے بدلتے ہوئے سماج میں مذہب اور اس پر مبنی تشخص ایک نئی اہمیت اختیار کرتا جا رہا ہے۔ اس لئے سماجی حرکیات (social dynamics) کے فعال عوامل کو سمجھنا اور سماجی تبدیلی کے عمل میں مذہب اور علاقائی تشخص کے رول کا جائزہ لینا بہت ضروری معلوم ہوتا ہے۔

ہندوستان ایک ترقی پذیر ملک ہے۔ پچھڑے ہوئے ملکوں میں عموماً اور ہندوستان میں خصوصاً معاشی وسائل [illegible] اور ذرائع کم ہیں اور نسبتاً آبادی زیادہ۔ ترقی کی شرح [آ]بادی میں اضافے کی شرح کچھ ہی کم ہے اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بڑھتی ہوئی آبادی کے پیش نظر یہ معاشی ترقی ناکافی ثابت ہوتی ہے۔ مذہب اور ذات پات اپنی جگہ پر لیکن اکثر فرقہ وارانہ یا ذات پات کی بنیاد پر ہونے والے فسادات میں معاشی عوامل کا بڑا اہم رول ہوتا ہے۔ ساتھ ساتھ ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ عوام کا سیاسی شعور معاشی ترقی کے مقابلہ میں کہیں زیادہ تیزی سے ترقی کرتا جا رہا ہے۔ اگر آج ہر طبقوں کے ساتھ انصاف نہیں ہوتا تو ان میں آپسی اتحاد کا جذبہ اور بڑھتا ہے اور نفسیاتی اعتبار سے تشخص (identity) یا ذات پات کی پہچان اس اتحاد کو مضبوط بنانے میں کافی مددگار ثابت ہوتی ہے۔ اس لئے اپنے حقوق منوانے میں آج تشخص یا پہچان کی اہمیت بڑھتی جا رہی ہے۔

مسلمانوں کے لئے بھی تشخص کا مسئلہ آج کے سیاق و سباق میں بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ مسلمانوں کے معاملے میں تشخص کی بنیاد خالص مذہبی بنتی جا رہی ہے۔ یا کم از کم عام طور پر یہ غیر مسلموں کا تاثر ہے۔ کیا یہ بات درست ہے؟ کیا مسلمانوں کے معاملے میں مذہبی پہچان کے علاوہ علاقائی اور لسانی پہچان کی کوئی اہمیت نہیں ہے؟ ان سوالوں کا جواب ہمیں مقامی پر کی گئی تحقیقات کے ذریعے ہی تشفی بخش طور پر مل سکتا ہے۔

یہ تاثر صحیح نہیں ہے کہ مسلمان ایک ایسی متحدہ قوم ہو جن میں لسانی [illegible] اور علاقائی [illegible] نہیں

ثیا اور مذہبی رشتہ ان تمام رشتوں کو زیر کر دیتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کا مذہبی تشخص قدرے مضبوط سہی لیکن انکا علاقائی اور لسانی تشخص بھی اتنا کمزور نہیں جتنا عام طور پر تصور کر لیا جاتا ہے۔ کاشمیری مسلمان ہوں یا گجراتی، کیرالا مسلم ہوں یا اتر پردیشی، ان سب کی اپنی علاقائی پہچان بھی ہے۔

یہاں ہمیں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیئے کہ علاقائی پہچان جتنی مختلف ہوگی یہ مذہبی تشخص کے مقابلے میں اتنی ہی زیادہ اہمیت اختیار کرتی جائے گی۔ مثلاً یو پی اور مدھیہ پردیش یا بہار کے مسلمانوں کے لسانی اور علاقائی تشخص میں زیادہ اختلاف نہیں ہے اس لیے مقابلتاً ان کی مذہبی پہچان زیادہ اہم ہوجاتی ہے۔ لیکن کاشمیری یا کیرالائی مسلمانوں کا علاقائی اور لسانی تشخص یوپی یا بہار کے مسلمانوں کے مقابلے بہت زیادہ مختلف ہے۔ اس لیے یہاں مذہبی تشخص کے مقابلے میں علاقائی اور لسانی تشخص زیادہ اہمیت اختیار کر لیتا ہے

تامل ناڈو کا معاملہ بھی یہی ہے۔ تامل ناڈو کی اپنی تہذیب ہے جو آریائی تہذیب سے بھی زیادہ قدیم ہے۔ اور یہاں کے لوگوں کو اپنی زبان اور اس کے ادبی اور علمی سرمائے پر بجا طور پر فخر ہے۔ انہی نفسیاتی عوامل سے مل کر تامل ناڈو کا اپنا تشخص ابھرتا ہے۔ [illegible] یہ تشخص اپنا [illegible] ہے۔ تامل مسلم بھی اس تشخص کا حصہ ہیں اور انہیں بھی اپنی زبان اور کلچر پر بڑا فخر ہے۔ تامل مسلمان ساتھ ساتھ اپنے مذہبی بھی ہیں۔ علاقائی پہچان کے ابھرنے سے مذہبی تشخص کا جذبہ کمزور نہیں ہو جاتا۔ تامل ناڈو کے مسلمان اس کا بہترین ثبوت ہیں۔

تامل ناڈو میں تامل مسلمانوں کے علاوہ اردو بولنے والے مسلمان بھی ہیں جو کرناٹک اور آندھرا پردیش (حیدرآباد کے علاقے) سے آکر یہاں بس گئے تھے۔ تامل مسلم اور اردو بولنے والے مسلمانوں میں [illegible]

جا سکتا ہے۔ جس کی بنیاد وہی علاقائی تشخص کا اختلاف ہے۔ اردو بولنے والے مسلمان تامل مسلمانوں کے مقابلے میں اپنے آپ کو زیادہ بہتر مسلمان سمجھتے ہیں۔ یہ بڑی بدقسمتی کی بات ہے کہ عام طور پر اردو بولنے والے مسلمان یہ رویہ اپناتے ہیں۔ حالانکہ زبان کا تعلق مذہب سے نہیں ہوتا۔ اردو بولنے والے مسلمانوں کے اس رویے کی ایک اور وجہ ہے۔ وہ اپنے آپ کو اشراف کا درجہ دیتے ہیں اور اپنا نام عام طور پر وسط ایشیا سے آئے ہوئے اشراف سے جوڑتے ہیں جن کا تعلق اس زمانے کے حکمران طبقوں سے ہوتا تھا۔ جب کہ تامل مسلمان اکثر ٹیپو کے زمانے میں یہیں مسلمان ہوئے تھے اور انکا تعلق نچلی ذاتوں سے تھا۔

یہی وجہ ہے کہ جب بچھڑی ہوئی ذاتوں کو حکومت کی طرف سے مراعات حاصل ہونا شروع ہوئیں تو تامل مسلمانوں نے اپنے لئے بچھڑی ہوئی ذات کا اسٹیٹس حاصل کرنے کی کوشش شروع کردی۔ محمد اسماعیل نے جو تامل مسلم تھے، اور اس علاقے کی مسلم لیگ کے صدر بھی تھے۔ ۱۹۴۸ء میں وزیر اعلیٰ کو ایک یادداشت میں لکھا کہ چونکہ تامل مسلمانوں کا تعلق بچھڑی ہوئی ذاتوں سے ہے خود اردو بولنے والے مسلمانوں کا نہیں اس لئے یہ مراعات صرف تامل مسلمانوں کو ملنا چاہیئے۔ اسی کی بنیاد پر اس دور کی [illegible] حکومت نے تامل مسلمانوں کو بچھڑی ہوئی ذاتوں کا اسٹیٹس [illegible] منظور کر لیا اور اردو بولنے والے مسلمان اس سے محروم رہے۔ اسی لئے اردو والے مسلمانوں [illegible] کو عام طور پر تامل ناڈو میں دکھنی مسلمان کہا جاتا ہے) محمد اسماعیل کو جو مسلم لیگ کی صدارت کی وجہ سے قائد ملت کہلاتے تھے۔ قائد لبّے (تامل مسلمان لبّے کہلاتے تھے) کہنا شروع کر دیا۔ اب دکھنی مسلمانوں نے بچھڑی ذاتوں کو دی جانے والی مراعات حاصل کرنے کے لئے بچھڑے ہونے کی سرٹیفکیٹ [illegible] شروع کر دیئے۔ تامل [illegible]

[illegible] مسلمانوں میں یہ کشیدگی اسی لئے پیدا ہوئی کہ موخرالذکر اپنے آپ کو اشرف تصور کرتے تھے اور اول الذکر کو جلاہے۔ موجودہ تامل حکومت نے سبھی مسلمانوں کو اب بیک ورڈ [illegible] دیگر مراعاتیں دیدی ہیں۔ اور اب یہ آپسی تناؤ کم ہوتا جا رہا ہے۔ لیکن آج بھی تامل ناڈو مسلم لیگ میں صرف تامل مسلمان پائے جاتے ہیں۔ اور عام طور پر دکھنی مسلمانوں کو مسلم لیگ میں شریک نہیں کیا جاتا۔ تامل ناڈو میں کل

تامل ناڈو مسلم لیگ اور تامل مسلم

ملا کر دکھنی مسلمانوں کی تعداد ایک تہائی سے زیادہ نہیں ہے۔ ان میں سے زیادہ تر مدراس اور مدراس ڈسٹرکٹ میں پائے جاتے ہیں۔ تامل مسلمان دکھنی مسلمانوں کے مقابلے میں زیادہ خوش حال ہیں۔ تامل مسلمان تاجر ہیں اور عام طور پر چمڑے اور لوہے کی تجارت کرتے ہیں۔ [illegible] غریب تامل مسلمان بھی نوکری پر تجارت کو ترجیح دیتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ تامل مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ اردو والوں کے مقابلے میں زیادہ خوش حال ہے لیکن علم کے میدان میں دکھنی مسلمان آج بھی تامل مسلمانوں سے آگے ہیں۔ چونکہ ایک زمانے میں دکھنی مسلمانوں کا تعلق حکمراں طبقے سے تھا۔ آج بھی ان کے یہاں علمی اور تہذیبی روایتیں زندہ ہیں۔ تامل مسلمان چونکہ ٹیپو کے زمانے میں نچلی ذاتوں سے مذہب تبدیل کر کے مسلمان ہوئے تھے ان کے یہاں آج بھی تہذیبی اور علمی روایتیں کمزور ہیں۔ تجارت سے خوش حالی پچھلے چند دہوں میں حاصل ہوئی ہے۔

چونکہ دکھنی مسلمان اپنے آپ کو طبقۂ اشرافیہ سے تصور کرتے تھے اور بہتر تہذیبی روایتوں کے حامل تھے تامل مسلمانوں سے شادی کرنا کسر شان سمجھتے تھے لیکن اب [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] دکھنی مسلمان ہیں [illegible]

اب عام طور پر دکھنی مسلمانوں اور تامل مسلمانوں میں شادیاں ہونے لگی ہیں اور (۳۱) [illegible] دکھنیوں کی تعلیم و تہذیب اور تاملوں کی خوشحالی مل کر ایک نیا اور بہتر امتزاج پیدا کر رہی ہے۔ اب ان کا آپسی تناؤ اور تعصبات بھی کم ہوتے جا رہے ہیں۔

جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا تامل مسلمان اکثر تاجر پیشہ ہیں اور اکثر چمڑے اور لوہے کی تجارت کرتے ہیں۔ مدراس میں بڑی تجارت تو ہندوؤں کی بیچ کی ذاتوں مثلاً مدلیار وغیرہ کے ہاتھوں میں ہے اور صنعت اکثر برہمنوں کے ہاتھ میں لیکن چھوٹی تجارت اکثر تامل مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے۔

بازار مسلمانوں کے

دلچسپ بات یہ ہے کہ مدراس کے مشہور برما بازار کی ۹۹ فیصد دکانیں تامل مسلمانوں کے اجارے میں ہے۔ برما بازار مدراس شہر کی خاصی دلچسپ جگہ ہے۔ یہاں کثرت سے غیر ملکی سامان بکتا ہے جو اکثر سنگاپور اور ہانگ کانگ سے آتا ہے۔ اس میں کچھ مال اسمگلنگ کا بھی ہوتا ہے لیکن پوچھ تاچھ سے یہ اندازہ ہوا کہ سنگاپور اور ہانگ کانگ سے آنے والے اکثر مسافر جنوب مشرقی ایشائی ممالک میں تامل مسلمانوں کی بڑی تعداد پائی جاتی ہے۔ یہ لوگ ان ممالک میں بھی اکثر تجارت کرتے ہیں اور اونے پونے داموں پر اپنی چیزیں ان چھوٹے چھوٹے تاجروں کے ہاتھوں فروخت کر دیتے ہیں۔ یہ بازار بندرگاہ کے بالکل پیچھے ہے اور یہاں صبح سے شام تک خریداروں کی بھیڑ لگی رہتی ہے اور شام کو خاصی رونق ہوتی ہے۔ برما بازار میں غیر ملکی اشیا اور چیزوں کے مقابلے میں کافی سستے داموں میں مل جاتی ہیں اور بغیر کسی روک ٹوک کے کھلے عام یہ بزنس ہوتا ہے جیسا بازار کی دکانیں باقاعدہ لائسنس یافتہ ہوتی ہیں۔ اگر تامل زبان آتی ہو تو مول تول کرنے میں بڑی آسانی ہو جاتی ہے کیونکہ برما بازار کے تامل مسلم ہندوستانی اور انگریزی بہت کم جانتے ہیں۔ بہرحال برما بازار مدراس

میں خاصے کی چیز ہے۔

تامل مسلم چونکہ علاقائی تشخص کا بڑا گہرا احساس رکھتے ہیں اس لئے یہ تامل قومی دھارے کا اٹوٹ حصہ ہیں اور غیر مسلم سے ان کی تفریق مشکل ہی سے کی جا سکتی ہے۔ یہ تفریق جتنی کم ہوتی ہے (دوسرے لفظوں میں علاقائی تشخص کا احساس جتنا گہرا ہوتا ہے) فرقہ وارانہ تناؤ اتنا ہی کم ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کشمیر، کیرل، تامل ناڈو جیسے علاقوں میں فرقہ وارانہ منافرت کم پائی جاتی ہے۔ تامل ناڈو میں تبدیلیٔ مذہب کا جو واقعہ ہوا اس کا اثر تامل ناڈو سے باہر جتنا ہوا ہے تامل ناڈو میں نہیں ہوا۔ ہندو دستور پرستوں کو تامل ناڈو سے باہر فرقہ وارانہ منافرت پھیلانے میں جتنی کامیابی ہوئی تامل ناڈو میں نہیں ہوئی۔ آج بھی تامل مسلمان بڑے فخر سے یہ بات کہتا ہوا سنائی دیتا ہے کہ ہمارے علاقے میں مذہبی تفریق اور فرقہ وارانہ منافرت نہیں پائی جاتی۔ اور یہ بات بڑی حد تک درست بھی ہے۔ ڈی ایم کے حکومت کا بھی سارا زور تامل تشخص پر زور دینے پر ہے جس سے علاقائیت سالمیت کا احساس بڑھتا چلا جاتا ہے اور مذہبی تفریق کا احساس کمزور پڑتا رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں شدت سے مذہبیت کے احساس کے باعث منافرت بہت کمزور رہ جاتی ہے۔ یہاں فرقہ وار کمزور ہونے کی ایک اور وجہ بھی ہے۔ تامل قوم حسامی اکثر بچھڑی ہوئی ذاتوں سے تعلق رکھتے یا تو معاشی طور پر بہت پچھڑے ہوئے ہیں یا اکثر [illegible] کی ملازمتوں میں ہیں۔ انہوں نے کئی نسلوں سے تا[illegible] کو خوشحال تاجر طبقے کے طور پر تسلیم کر لیا ہے اور معاشی طور پر اپنا حریف سمجھنے کے بجائے اپنے سے بہتر تصور کرتے ہیں۔ جہاں معاشی مقابلے کا احساس ہو وہاں فرقہ وارانہ منافرت بھی زیادہ گہرا روپ اختیار کر لیتی ہے۔

نسانی تہذیب و ترقی کا وہ نیا دور

بدیع الزماں خاور

روں سال پہلے
روں میں رہنے والا پتھر کے زمانے کا انسان
کمپیوٹر اور ایٹم کے دور سے گزر رہا ہے
ند ہو یا مریخ
کے لیے اب کوئی سیارہ اجنبی نہیں رہا
وہ خلاؤں میں سفر کرنے لگا ہے

اروں سال پہلے
نگلوں میں زندگی بسر کرنے والے انسان کی
ترقی دیکھ کر
مان لرزہ براندام ہے
نے والے اس دور کے تصور سے
ب آج کے کمپیوٹر اور ایٹمی اسلحے بھی
ہزاروں سال پہلے کے پتھروں اور ہتھیاروں کی طرح
تاریخ کا حصہ بن چکے ہوں گے۔

کہتے ہیں کہ آنے والا وہ دور انسان کے عروج کا
ایک نیا دور ہوگا۔
اور اس دور کے انسان کے سامنے
آج کا ترقی یافتہ انسان بھی
ہزاروں برس پہلے غاروں میں رہنے والے پتھر کے زمانے کے
انسان ہی کی طرح
غیر مہذب اور پسماندہ دکھائی دے گا۔
خدا کرے / انسانی تہذیب و ترقی کا وہ نیا دور
جس کی آہٹ ہی سے ستارے سہمے ہوئے ہیں
اس آخری جنگ سے پہلے ہی آ جائے
جس کے دہانے پر
یہ دنیا اس وقت سے کھڑی ہے
جب سے
غاروں اور جنگلوں میں رہنے والا ہزاروں برس پہلے کا انسان
کمپیوٹر اور ایٹم کے عہد میں داخل ہوا ہے۔

لہو امر ہے

قمر ساحری

ہے خوف ہے کہ میرے لفظوں میں
بجلیوں کی چمک دمک ہے
ہی خوف ہے
ری رگوں میں لہو کے بدلے
مہیب سیال زلزلوں کے
مہیب طوفاں رواں دواں ہیں
یہ بجلیاں یہ مہیب سیال زلزلے
اس سکوت عہد رواں کی آواز بن جائے۔
زمیں بیدار ہو نہ پائے
سکوت عہد رواں کا قصر
بلند دیوار و بام و دریچہ
گرج چمک کڑکڑاہٹوں سے
تباہ و مسمار ہو نہ جائے۔
وہ چاہتے ہیں
مرے خیالوں کے سلسلوں کو جہاں سے
بن پائے توڑ ڈالیں۔
تمام لفظوں تمام معنوں کی گردنوں کو مروڑ ڈالیں
مگر ہمیشہ یہی ہوا ہے
ورق ورق پر یہی لکھا ہے
لہو امر ہے ......!
لہو امر ہے ——؟؟
لہو رگوں میں رواں رہے گا
جواں رہے گا۔
خموشیوں کی زباں رہے گا
زمیں کا ترجمان رہے گا

——۰۰——

منزل کا بلاوا

انور ظہیر ایم اے

جب بھی پوچھا ہے کسی نے مجھ سے میرا حالِ زار
کچھ کہا کچھ زیرِ لب اور پھر خموشی چھا گئی
مجھ کو یہ ڈر ہے مری آنکھوں کے حلقے دیکھ کر
تم بھی میری طرح ہی کرب آشنا ہو جاؤ گے
روح زخمی، دل فسردہ، آنکھ پرنم، ہونٹ خشک
یاس کی کرچیں جگر میں آج بھی پیوست ہیں
پھر بھی ہنستا کھیلتا بڑھتا چلا جاتا ہوں
اک نئی منزل نئی امید کی آغوش میں
یاس و محرومی کے احساسات سے بچتا ہوا
جانی پہچانی صداؤں کی طرف کھنچتا ہوا
اب وہاں میں آن پہنچا ہوں بہ فیضِ جذبِ دل
کھول کر باہیں جہاں منزل بلاتی ہے مجھے ▲

فن کار کا آلہ

عبید احمد ثاقب

میں آلہ ہوں! کہنے لگا اک روز یہ ڈالی
اور آلہ بھی ایسا جو ہو فن کار کا آلہ
فن کار بھی ایسا کہ جو خود فن میں ہو راسخ
صدیوں نے جسے بخشا ہو فن میں ید طولیٰ
فن کار کا آلہ

وہ روایات کا پالا
بے بہرہ روایت سے ہو آلہ تو سمجھے
دریوزہ گری ہے
میں آلہ ہوں آلہ

ہے ایک ہی بس آلے کو ہاتھوں میں اٹھانے کا طریقہ
اور وہ ہے فقط حسن تراشوں کا سلیقہ
وہ صدیوں کی میراث کا پالا ہوا ورثہ
وہ طرز کہ فن پارے ہوئے جس سے ہویدا
آغاز کرو فن کے اماموں کی روش سے
پھر جو بھی بناؤ گے سرفراز رہو گے
تم چشمِ جہاں میں ▼▼

اگر.....

نقیب اکبر

اگر وقت سے پہلے میں مر گیا تو
میری لاش
ان چیل، کووں کو تم دان کر دینا
جو سال ہا سال سے
چوٹیوں پر
یوں ہی اپنا آسن جمائے
چاٹ کر خون سورج کا زرد ہو رہے ہیں ▼

سپاٹ ہتھیلی پر اگا ہوا سورج

میرے دونوں ہاتھوں کی
یہ ٹیڑھی میڑھی لکیریں روز ہی
اک ایک کر کے مٹنے لگی ہیں
مگر
خوش ہوں میں

ایک پیغام یہ مل رہا ہے
اک نیا انقلاب آئیگا زندگی میں

ٹوٹے خواب

عزیز الرحمٰن بھاگلپوری

خواب تو خواب ہے
ایک رنگین مستی بھرا جام ہے
ٹوٹ جائے اگر
زہر بن کر رگوں میں پھیلنے لگے
ٹوٹ کر آدمی
دھیرے دھیرے ہوا میں بکھرنے لگے

زہر

زہر جو زندگی کو ہمارے ملا
ایک قطرہ اگر
رکھ لو اپنی زباں پر
تو وحشی کی صورت
گلی اور بازار میں
ننگے ہو کر بھٹکتے پھرو ▲

اس سے گریز اس قدر آسان بھی نہ تھا
وہ گھر کا فرد بھی نہ تھا مہمان بھی نہ تھا

ہر ہر قدم پہ وقت نے چادر سی تان دی
نکلے تو سر چھپانے کا سامان بھی نہ تھا

ہلکان ہو رہا تھا میں دامن کی فکر میں
دیکھا جو غور سے تو گریبان بھی نہ تھا

آوارگی سکھائی کچھ احساس لطف نے
کچھ یہ کہ اس کا کوئی نگہبان بھی نہ تھا

لوگوں نے خواہ مخواہ غلط رنگ دیدیا
اس کیلئے میں اتنا پریشان بھی نہ تھا

اس تشنہ مو کو عطا کر کے چند بوند
دریا میرے بدن کا پشیمان بھی نہ تھا

دل کو ادارل رہنے کی عادت سی پڑ گئی
تجدید التفات کا امکان بھی نہ تھا

جوہر صدیقی

ابوالبیان شمیم، گیا

زخمی پڑے ہیں لوگ شبابوں کے شہر میں
کانٹوں پہ چل رہے ہیں گلابوں کے شہر میں

تپتا ہوا آسمان ہے شرابوں کے شہر میں
پیاسا ہے ہر سوال جوابوں کے شہر میں

سونپا گیا ہے نالوں کو سازوں کا اہتمام
نغمے سسک رہے ہیں ربابوں کے شہر میں

جذب نگاہ شوق کی رسوائی یوں بھی ہے
جلوے ہیں بے پناہ نقابوں کے شہر میں

ہم سے خود اپنے چہرے نہ پہچانے جائیں گے
ہم لوگ یوں ملیں گے کتابوں کے شہر میں

تصویر اس کی پھرتی ہے ہر ایک آنکھ میں
رہتا ہے ایک شخص حجابوں کے شہر میں

جوہر کی سادہ لوحی ذرا دیکھئے انہیں
رحمت کی جستجو ہے عذابوں کے شہر میں

علی عبداسد عزل

انگلیاں اٹھتی ہیں لیس میری وضع پردر نہ — ان کی محفل میں تو ہر بات روا ملتی ہے
سو دے والوں نے ہر اک موج ہوا تھیلی — اب کہاں کان کو خود مری صدا ملتی ہے،
نگہ یار سے خفگی کی شکایت کب تھی — چشم حیراں سے ہوں شاکی کہ خفا ملتی ہے
تری تہذیب ہیں تو اس کا چلن تھا ہی نہیں — مری وحشت میں مگر رسم وفا ملتی ہے
لے کتابوں میں لہو میں اپنا جلانے والے — اسی آلودگی سے تازہ ہوا ملتی ہے
تری خاطر جو سجاتے ہیں تبسم اپنا — ان کے سینوں میں بپا بزم عزا ملتی ہے،
حرم و دیر کے کھولے تو شفا خانے مگر — یہاں ہر مرض کی بس اک دوا ملتی ہے
اب تو پابندی زنجیر سلاسل بھی نہیں — رقص دیوانگی کس شے سے ہوا ملتی ہے
آئیے پھر سے اٹھائے ہیں منارہ بلے — دیکھیں اس بار ہمیں کیسی سزا ملتی ہے
مجھ سے کچھ کہتی نہیں یونہی گذر جاتی ہے — اب بھی ملتی ہے صبا اب بھی صبا ملتی ہے
آتش لذت تخلیق سے تو بھی گزرا — کیوں صحیفوں میں فقط میری خطا ملتی ہے
تری محفل کی اذیت سے کہیں زیادہ ہے — مجھکو جو عالم تنہائی سزا ملتی ہے

زندگی جھیل گئے سادگی کے بل پہ عزل
عقل سے داد ملی بھی تو قضا ملتی ہے۔

سیدہ شانزے معراج

میری خودداری میری خو سے انا لے جائے گی
مجھ کو ساحل سے تلاطم تک بہا لے جائے گی!
تشنگی میں امتیاز گلشن و صحرا کیسے!
کیا خبر تھی وقت رخصت وہ نگاہ واپسی
ڈھونڈ مجھ کو خلوت شب میں کہ شبنم کی طرح
آرزو جینے کی ہے تو جی چٹانوں کی طرح،

کیا خبر تھی وہ نظر سب کچھ چرا لے جائے گی
اور کیا اس کے سوا موج بلا لے جائے گی!
چل پڑیں گے جس طرف تجھ کو گھٹا لے جائے گی
جاتے جاتے مجھ سے جینے کی ادا لے جائے گی
صبح کی پہلی کرن مجھ کو اڑا لے جائے گی،
ورنہ پتے کی طرح تجھ کو ہوا لے جائے گی

اپنے ہونٹوں کو سیئے بیٹھے ہیں اک مدت سے ہم
اب نسیم صبح آئی بھی تو کیا لے جائے گی

ملک زادہ جاوید احمد

تیری آواز جو آئی تو ٹھہر جاؤں گا
ورنہ رستہ ہوں میں منزل سے گزر جاؤں گا
رفتہ رفتہ مرے چہرے کو سبھی بھول چکے
آئینہ چھوڑ کے نکلا تو کدھر جاؤں گا۔
اپنی بربادی کو دیدوں گا کتابی چہرہ
میں اگر دھوپ سے ڈرتا ہوا مر جاؤں گا
قد کا چھوٹا ہوں مگر ذہن کی وسعت ہے بہت
کون کہتا ہے کہ تنقید سے ڈر جاؤں گا
آنے والی نسلیں مجھے ڈھونڈیں گی ضرور
ہاں میں تاریخ ہوں صدیوں میں بکھر جاؤں گا
دن میں بچوں کی خوشی کا مجھے حل ڈھونڈنا ہے
آج جاوید میں کچھ دیر سے گھر جاؤں گا

عائشہ عالیہ

ہزاروں اشک بہتے ہیں مگر دریا نہیں بنتا
اجالوں میں بھی اب انسان کا سایا نہیں بنتا
میسر خواب کے منظر ہوں کیسے میری آنکھوں کو
کہیں کا بھی کوئی پتھر ... میرا تکیہ نہیں بنتا
میں آذر ہوں کے راتوں دن نئے چہرے بناتا ہوں
مگر کیا بات ہے بن بن کے بھی تجھ سا نہیں بنتا
مجھ کو میں کس کا چھت آنگن جو ڈھونڈی سی لکھ لے
کہ گاؤں میں بھی اب تو کوئی گھر کچا نہیں بنتا
عجب گھر ہے کہ دروازے ہزاروں ہو کے بھی اس میں
مرے آنے کا کوئی رستہ نہیں بنتا

ویریندر پٹواری

جوگن

برگد کے اس پیڑ سے مجھے بہت پیار ہے کیونکہ یہ ایک ایسی چھتری ہے جو مجھے بارش اور دھوپ کی شدت سے بچا لیتی ہے۔ اماں کہتی ہے کہ مہاتما بدھ نے بھی ایک ایسے ہی درخت کے نیچے بیٹھ کر تپسیا کی تھی۔ پاس طرف اس کٹیا میں رہنے والی جوگن بھی جگت کلیان کے لئے برسوں سے تپسیا کر رہی ہے۔ سادھو سنت، پیر فقیر اتنی کٹھن تپسیا کیوں کرتے ہیں؟

میں جب بھی یہاں سے گزر کر سوچتا ہوں تب شاخ پر بیٹھے ہوئے دو پرندے یوں چہچہانے لگتے ہیں گویا کہہ رہے ہوں۔ نا سمجھ ہو تم۔ میرے قدم رک جاتے ہیں اور میں درخت کی چھاؤں میں بیٹھ کر یا دھوپ میں چھلنے پتوں کو دیکھتا رہتا ہوں یا پھر چونچ سے چونچ ملا کر پرندوں کی سرگوشیانہ باتیں سنتا رہتا ہوں۔ شاید اماں ٹھیک ہی کہہ رہی ہے کہ یہ پرندے شیو اور پاروتی ہیں۔ جو یہاں چھپ کر زندگی کے رنگوں کو دیکھتے رہتے ہیں۔ لیکن آج یہ دونوں سہمے سہمے کیوں نظر آ رہے ہیں۔ شاید وہ بے شکل کا چہرہ ان کا بھی تعاقب کر رہا ہے۔ وہ بھی لرز رہے ہیں۔ شاخوں میں بھی لرزش ہے اور وہ بھی دہشت زدہ ہیں۔

دراصل جس سے ہم اس قدر خوفزدہ ہیں وہ کوئی ایسا جن یا راکشس نہیں جس نے اپنی جان کسی طوطے میں بند کر دی ہے بلکہ وہ کسی انجانے شخص کے ہاتھ میں دکھائی دیتی ایک جادوئی چھڑی ہے جو [illegible] بٹن دباتے ہی اڑ کر آگ برساتی ہے۔ اور اگر وہ اڑ کر یہاں پہنچ گئی تو آگ کا ایک دریا بہہ جائے گا۔ سب کچھ ختم ہو جائے گا۔ برگد کا یہ قدیم پیڑ بھی۔

پرندوں کی سرگوشیانہ باتیں سن کر جب میں نے بھاگ جانا چاہا تو میری نظر جوگن پر رک گئی۔ گلے میں رودراکش کی مالا پہنے گیروی رنگ کے وستر پہنے اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے گویا وہ بھگوان سے کہہ رہی تھی کہ میری تپسیا مکمل ہو چکی ہے اور اب مجھے نروان نہیں وردان چاہئے۔

چاروں طرف تاریکی پھیل گئی اور گویا موت بے قابو ہو گئی۔ اچانک ایک سنسناہٹ سی ہوئی۔ کوئی پتوں کی سیڑھیوں سے اتر کر میرے سامنے سے گزر کر جوگن کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

پرندے چہچہانے لگے اور جادوئی چھڑی اٹھا کر جوگن کے سامنے رکھ [illegible] ہوئے ہوئے [illegible] چھڑی کو جوگن کے نرم ہاتھوں میں دیکھ کر میں نے آنکھیں بند کر دیں اور پیڑ کے ساتھ لپٹ کر پرندوں کی باتیں یوں سنتا رہا جیسے دھرت راشٹر سنجے سے مہابھارت کا آنکھوں دیکھا حال سن رہا ہو۔

"گرمی کی شدت برداشت نہیں کر پائے گی شاید!"

"[illegible] ہے۔ آگ اور راکھوں کی طرح۔ مگر کیا وہ چھڑی کو دنیا کہیں پھینک دے گی؟"

"نہیں۔ کیا وہ نہیں جانتی کہ صحرائی بستی میں کچھ لوگ رہتے ہیں اور جنگلوں میں بھی خدا کی مخلوق موجود ہے۔"
"پھر سمندر میں پھینک دیتے جوگن"
"نہیں وہاں مگرمچھ ہیں۔ سنہری پھولوں والی مچھلیاں بھی تو ہیں۔"
"شاید ہوا ایسی کوئی برفیلی چوٹیوں پر پھینک دے۔"
"نہیں وہ مسیحا ہے۔ ایسا نہیں کرے گی۔ تپش سے برف پگھل جائے گی اور سیلاب آجائے گا۔ سب کچھ بہہ جائے گا۔ یہ برگد کا پیڑ بھی۔"
"پھر کیا ہوگا؟"

وہ دونوں خاموش ہوگئے۔ میں سمجھ گیا یہ سمندر کی خاموشی ہے مگر جوگن کا صبر و تحمل تھا۔

چھڑی آگ برسا رہی تھی اور جوگن کے ہاتھ سے نکل کر اڑ جانا چاہتی تھی۔ آگ برسانا چاہتی تھی مگر جوگن کی گرفت مضبوط تھی۔

اچانک پرندوں نے شور مچایا تو میں نے دیکھا کہ جادوئی چھڑی ٹھنڈی ہوچکی ہے مگر جوگن خود ایک راکھ کا ڈھیر ہوگئی ہے۔

صبح ہوئی تو بادل گرج اٹھے۔ پرندے بھی رو پڑے اور آسمان بھی ——
جیسے سب کچھ ٹوٹ سا گیا۔ مگر سارا عالم آنسوؤں کی رو میں کے ساتھ بہتا ہوا نظر آیا۔

برگد کا پیڑ بچ گیا اور جب ایک کارواں جادوئی چھڑی کو اپنے پاؤں تلے روند کر میرے قریب پہنچ گیا تو پکار چلا کر کہنے لگے —— جادوئی چھڑی کے ٹکڑے ٹکڑے کر دو ورنہ تمہارے ٹکڑے ہوجائیں گے۔

میں دور کھڑا راکھ کا ڈھیر دیکھ کر سوچ رہا ہوں کہ جوگن برگد کے پیڑ کی خاطر قربان ہوگئی بالکل ویسے ہی جیسے حضرت عیسیٰ نے اپنا بلیدان دیا تھا۔

نسیم بن آسی

گیارہواں بچہ

گوپی کو صبح اٹھتے ہی سب سے پہلے سرتی کی دھن ہوتی تھی۔ ایک دن رامو سرتی لیتے ہوئے اس کے پاس آیا۔ اور کہا تھا یار گوپی تم بھی ذرا لو ۔۔۔ گوپی نے ایک چٹکی لے کر منہ میں رکھ لی۔ پھر وہ جیسے سرتی کھاتے دیکھتا، اس کے سامنے ہاتھ پھیلا دیتا ۔۔۔ شراب ہو یا سرتی، چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی۔ سرتی بھی وہ "ہرن" چھاپ کھاتا تھا۔ اس دن لاجونتی نے کہا ۔۔۔ سرتی کی طرح بھی کوئی شراب کی یاد پکارے گا تو تم اسے بھی پی سکتے ہو۔ گوپی نے کہا ۔۔۔ اپن کو کسی چیز سے مطلب نہیں، صرف سرتی کافی ہے۔ تم یہ بھی نہیں دیکھ سکتی۔ لیکن اس کے بغیر تمہارے ساتھ بھاڑ بھی نہیں جھونکا جا سکتا ۔۔۔

اندھیرا دھیرے دھیرے دور ہونے لگا تھا۔ صبح کی سپیدی دبے پاؤں مسکراتی ہوئی بڑھ رہی تھی۔ ۔۔۔ درختوں پر چڑیاں نغمہ سرا تھیں۔ لاجونتی ابھی تک سو رہی تھی ۔۔۔ گوپی نے ڈبیا سے سرتی نکال اور اس میں چونا ملا کر ملنے لگا۔ کھونٹے میں بندھے جانور اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ جب وہ ان کے کھانے کے لیے چارہ لے کر آنے لگا۔ تو بیلوں کی گھنٹیاں بج اٹھیں۔ بھینسوں نے بان کی آوازیں لگائیں ۔۔۔

صبح چمکیلی ہوتی جا رہی تھی۔ پاس کے کنوئیں پر کوئی "جاگو موہن پیارے جاگو" گا رہا تھا کائنات کی ہر چیز جاگنے لگی تھی لیکن لاجونتی ابھی تک سوئی ہوئی تھی۔ بار بار جگانے پر بھی اس کا اٹھنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ گوپی کے دل کا اندھیرا بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ تھوڑی سی دیر میں دودھ لینے والے گاہک بھی آجائیں گے۔ اسے دودھ لے کر بازار بھی جانا ہے۔ "او جھینتی! او لجیش!! آج کوئی کام نہ ہوگا کیا؟" اس نے زور سے پکارا۔ اس کے دونوں لڑکے کب کے جاگے ہوئے ہیں۔ لیکن آنکھیں بند کر کے چپ سادھے ہوئے تھے۔

لاجونتی اسی طرح بے سدھ پڑی تھی۔ اس کا سب سے چھوٹا بچہ اس کی چھاتی سے چمٹا ہوا تھا۔ دوسرے بچے اس کے آس پاس سوئے ہوئے تھے۔ دور وانسے پر رکھے پوال کے ڈھیر میں ایک کتیا سوئی تھی۔ اس کے پلے اس کے تھن کو نوچ رہے تھے۔ لاجونتی کا منہ کھلا تھا۔ وہ ناک کے بجائے منہ سے سانس لے رہی تھی۔ چہرہ زرد تھا۔ سانس کی آواز نہ آتی تو یہی معلوم ہوتا، اب وہ اس دنیا میں نہیں ہے۔ لوگ کہتے تھے "دس بچے جنتے جنتے اس کا خوبصورت چہرہ زرد ہو گیا ہے۔ عورت نہ ہوئی بچہ جننے کی مشین ہوئی ۔۔۔!" اس کے ساتھ کی بیاہی سکھیا، جمنا اور آنندی ابھی کل کی بیاہی معلوم ہوتی تھیں!!

کچھ دیر بعد لاجونتی کی آنکھیں کھلیں۔ پلکیں نیند سے اب بھی بوجھل تھیں۔ چہرے سے ایک تھکن تھا۔

تھی۔ اُس کی پڑوسی لڑکی اُس سے پہلے بیاہی گئی تھی۔ اور گھر کے کام دوڑ دوڑ کر کر رہی تھی۔ پھر بھی لاجونتی اُسے کام چور کہتی تھی۔ اُسے جلدی جلدی گالیاں دیتی تھی۔ اس لئے کہ وہ ذہنی طور پر بے حد چڑچڑی ہو گئی تھی۔ اُس کا جی چاہتا' وہ سب کو گالی دے۔ سب سے لڑے۔ اُس کو گوپی سے سب سے زیادہ نفرت تھی۔ جو ہر وقت اُس کے پاس ہی رہنا چاہتا تھا۔ جیسے وہ کوئی بھینس ہو۔ کسی کھونٹے میں بندھی ہو۔ اور گوپی ایک بھینسا کی طرح اُسے پریشان کر رہا ہو ——!!

افق کے پردے سے سورج جھانکنے لگا تھا۔ رمیش نے چلایا ' بابو! بھینس لگاؤ' لیکن گوپی کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔ آج لاجونتی کیوں نہیں اٹھ رہی ہے۔ اس نے کون سا کام کیا ہے جو اتنی تھک گئی ہے۔ وہ صبح بہت جلد اٹھ جایا کرتی تھی۔ لیکن آج ؟ دودھ دوہنے سے پہلے گوپی نے بالٹی کو الٹ دیا جس سے اُس میں ایک بوند بھی پانی نہ رہے۔ بھینس مکھیاں اڑانے لگا دو تین گاہک بھی آ گئے آج لاجونتی کو عجیب سستی معلوم ہو رہی تھی۔ وہ چت لیٹی تھی۔ کبھی دائیں کبھی بائیں کروٹ بھی بدلتی۔ لیکن ایک پل بھی آرام نہ تھا!

گوپی کو اب چنتا ہونے لگی تھی۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ اس نے جلدی جلدی آئے ہوئے گاہکوں کو نبٹایا۔ اُسے باقی دودھ بازار لے جانا تھا۔ اس نے سوچا' وہ بازار ہی سے کوئی ٹکیہ لے لے گا۔ جسے کھانے کے بعد لاجونتی کی ساری تکلیف دور ہو جائے گی — لاجونتی کی کمر میں جب بھی درد ہوتا' وہ بازار سے درد والی ٹکیہ لایا کرتا تھا —! شاید آج بھی کمر ہی میں درد ہو' اُس نے سوچا۔ "کیا کمر میں درد ہو رہا ہے؟" اُس نے پوچھا۔ لاجونتی خاموش رہی — کچھ دیر بعد بولی —— "درد نہیں' مرد' ہو رہا ہے" "مرد" کون سی بیماری ہے۔ گوپی کو لاجونتی کی یہ بات سمجھ میں نہ آئی — لیکن اس کا موڈ دیکھ کر پھر اسے پوچھنے کی ہمت نہ ہوئی۔ لاجونتی اب بھی اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ بولی —— تم اس مرض کو کیا جانو؟ صرف عورتیں جانتی ہیں' یہ 'مرد' کتنا مہلک مرض ہوتا ہے —— !!

چائے کی دکان پر دودھ دینے کے بعد گوپی گھر لوٹنے لگا رات وہ بھی اچھی طرح نہیں سو سکا تھا — بچے رونے لگے تھے انہیں چپ کراتے آدھی سے زیادہ رات گزر گئی تھی۔ وہ دروازہ پر پہنچا۔ لاجونتی آنگن میں الٹی کر رہی تھی — اور گیارہویں بچے کو جننے کی تیاری کر رہی تھی —!!

راجہ عبدالرزاق

پرایا درد

سبودھ خاں کوئی دو مہینے سے میونخ کے جنرل اسپتال میں زیر علاج تھا۔ امسال میونخ میں جو عالمی ہاکی ٹورنامنٹ ہوا۔ اس میں جرمنی کے مقابلہ میں ہندوستان کی طرف سے کھیلتے ہوئے سبودھ خاں بری طرح زخمی ہو گیا تھا اسکی تیمارداری کے لئے خاص طور سے جولی کو مامور کیا گیا تھا۔ جولی نہایت شفیق اور سنجیدہ نرس تھی۔ سبودھ کی تیمارداری پر انتہائی دلجمعی سے توجہ دے رہی تھی۔ اپنی کارکردگی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتی تھی۔ روزمرہ کی طرح آج بھی وہ ٹمپریچر چیک کرنے کے لئے سبودھ کے کیبن میں داخل ہوئی تو اسے سویا ہوا پایا۔ نہ جانے کیا سوچ کر وہ سامنے پڑے ہوئے اسٹول پر خاموش بیٹھ گئی اور عجیب نگاہوں سے اس کے پرکشش چہرے کو دیکھنے لگی۔ اس کے خراب دماغ میں مختلف خیالات رقص کر رہے تھے لیکن وہ اپنے چہرے کے تاثرات سے کسی قسم کا اظہار ہونے دینا نہیں چاہتی تھی۔ سبودھ یک بیک اپنے گہرے خواب سے چونک اٹھا جیسے کسی نے اس کے زخمی پاؤں کو اپنی گرفت میں لے کر کھینچ دیا ہو۔ جولی گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔ اس کے خوبصورت اور دلکش پیکر کو سامنے دیکھ کر سبودھ کے بوجھل چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ بکھر گئی۔ جولی نے فوراً اپنے حواس پر قابو پا کر دل آویز تبسم کے ساتھ اسکی پیشانی پر اپنا نرم اور نازک ہاتھ پھیرتے ہوئے دھیمی آواز میں کہا۔

"منہ کھولیے۔ ٹمپریچر چیک کرنا ہے" وہ اپنے داہنے ہاتھ میں تھرمامیٹر پکڑے ہوئی تھی۔

ٹمپریچر لینے کے بعد وہ جانے لگی تو سبودھ نے اسے روکتے ہوئے کہا۔ "کیا پوزیشن ہے نرس؟"

"اب نارمل ہے" اس کے مخروطی ہونٹوں پر آسودہ مسکراہٹ کھیل گئی۔

"میں تمہاری پرخلوص خدمت کا بے حد شکرگزار ہوں نرس، تم اپنے لوگوں کی طرح مجھ پر خاص توجہ دیتی ہو" جولی قدرے جھینپ سی گئی، پھر وہ ایک دلفریب تبسم سے بولی "یہ کوئی خاص بات نہیں، یہ تو میرا فرض ہے"

"لیکن تمہاری بات کچھ اور ہے نرس"

"اچھا ———" وہ عجیب نظروں سے اسکو دیکھنے لگی۔

"مجھے کب چھٹی ملے گی نرس، اب مجھے کوئی تکلیف محسوس نہیں ہوتی ہے۔ میں آہستہ آہستہ چل بھی سکتا ہوں"

"چھٹی کے بارے میں ڈاکٹر بتا سکتے ہیں آپ کو، لیکن آپ کیوں گھبراتے ہیں، آپ کے علاج پر خاص توجہ دی جاتی ہے تاکہ آپ کو کوئی بھی تکلیف نہ ہو [illegible] آپ کو یہاں [illegible]؟" جولی کے رسیلے ہونٹوں پر مسحور آمیز تبسم کے تارے بکھر گئے۔ اس نے ایک پیار بھری [illegible] کے سرہانے [illegible] شان دلربایانہ سے تیزی سے باہر چلی گئی۔ سبودھ خاں کی بے تاب نظریں دروازے پر [illegible] کردہ۔

[illegible] تھی کہ وہ بہت جلد واپس آئے گی۔

آج بھی وہ فرصت کے اوقات میں آکر سبودھ کے [illegible] تھی۔ نہ جانے آج کیوں اس نے دلکش چہرے پر غیر معمولی سنجیدگی نمایاں تھی [illegible] سرخ [illegible] پر سفیدی جھلک رہی تھی اور شہد جیسے رسیلے ہونٹ [illegible] [illegible] نقیس شانوں پر الجھی ہوئی تھیں۔ برقی روشنی میں وہ یوں لگ رہی تھی جیسے وہ کسی چابکدست سنگ تراش کا شاہکار ہو [illegible] دلی کیفیات سے متاثر ہو کر سبودھ [illegible] اعتماد سے بولا

"اپنے دل کی کہانیوں سے [illegible] شکر گزار ہوں جولی! میرے درد! تم نے بھی محسوس کیا؟"

جولی کی گھنیری پلکیں ایک لمحہ کو اٹھیں اور پھر جھک گئیں۔ عورت کی آنکھیں روح کا آئینہ ہوا کرتی ہیں۔ سبودھ کو یقین ہو گیا کہ جولی کے دل میں بھی اس کے لئے محبت کے جذبات کی چنگاریاں دبی ہوئی ہیں۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے آسمان کی لامحدود بلندیوں پر دمکتا تارے اکنار کی [illegible] دوسرے میں سمٹ گئے۔ [illegible] بیتاب [illegible] ہو کر اس کا نازک ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا:

"میں تم سے محبت کرتا ہوں جولی!"

[illegible] نگاہوں سے سبودھ کو دیکھنے لگی۔ اس کے چہرے سے یہ واضح تھا کہ وہ [illegible] کی نظریں جھک گئیں اور اپنا سفید نازک ہاتھ آہستگی سے واپس کھینچ [illegible]

[illegible]

"[illegible] ستانی فنکار ہو اور فنکار اپنے ملک کی جان ہوتے ہیں۔ تمہارے ملک کو بھی بجا طور پر تمہارے [illegible] ہوگا اور میں ایک معمولی جرمن [illegible] اور میرا فرض ہے اپنی قوم [illegible] مجھے [illegible] ہم دونوں مختلف مذاہب کے عقیدت مند ہیں اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ میں ایک عورت ہوں مجھے خاندانی روایات کو نظر انداز کرنے کا کوئی حق نہیں۔"

سبودھ چند لمحوں کے لئے دم بخود سا ہو گیا پھر اس کے طلسماتی سراپا کا جائزہ لیتے ہوئے نہایت بے باکی سے بول اٹھا:

"جولی — میں تمہارے لئے اپنا سرمایۂ حیات نذر کرنے کو تیار ہوں۔ تم یقین جانو مجھے جب کسی چیز کی خواہش ہوتی ہے! میں اسے ہر قیمت پر حاصل کر لیتا ہوں۔ تم بھی میری خواہش ہو، میں تمہیں اپنا کر رہوں گا"

"یہ ناممکن ہے سبودھ۔ دیکھو جذبات کے دھارے میں بہہ کر فضول اپنی جان ہلکان نہ کرو۔ تم ذرا سنجیدگی سے سوچو یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ مشرق اور مغرب کیسے مل سکتے ہیں؟"

"یہ کچھ سوچنا تھا سوچ لیا ہے جولی! میں سماج کے اندھے اصولوں اور خاندانی روایات کی کھوکھلی [illegible] کر خود اپنی روش بناؤں گا۔ مالک مجھے حوصلہ اور استقامت دے۔"

"ضد اندھی ہوتی ہے سبودھ، تمہیں اس کی بھاری قیمت چکانا پڑے گی۔ یہ جرمن قوم مذہب اور سماج [illegible] بڑی بد دماغ ہوتی ہے، البتہ تمہاری ضد کا بس ایک ہی حل ہو سکتا ہے، وہ یہ کہ تمہیں اپنا [illegible] پڑے گا۔ کیا تم محبت کی خاطر اتنی بڑی قربانی دے سکتے ہو؟"

"[illegible]" سبودھ کے صبر و ضبط کے بند یکبارگی ٹوٹ گئے۔ وہ جذباتی انداز میں کہنے

جولی اگر دنیا میں محبت نہ ہوتی تو یہ دنیا کی تمام زندگیاں بے رونق اور بے لطف ہوتیں۔ محبت روح ہے ۔ ہر قلب سے ہے محبت ایک پاکیزہ جذبہ ہے اس کے پرستار فرشتوں سے بھی زیادہ معصوم اور بے گناہ ہوتے ہیں۔ مذہب خدا کی دین ہے اور سب انسانوں کا خدا ایک ہے۔ خدا کی پرستش کرنا ہمارا فرض ہے جس طرح تم جیسے گاڈ کہتی ہو، اُسے ہم بھگوان اور خدا کہتے ہیں مگر اس میں کوئی فرق نہیں۔" منہ جس کی آواز رکھوکر ہوگئی جذبات سے اس کی آنکھیں نم ہوگئیں۔ اس کرب آلود منظر سے متاثر ہوکر جولی کے ... کی چہرہ زرد ہوگئی اور اس کی جھیل جیسی نیلی آنکھیں جل تھل ہوگئیں۔

سیودھ جب اسپتال سے ڈسچارج ہوا تو اسے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے کوئی محبوس پرندہ ... کر آسمان کی لامحدود وسعتوں میں پرواز کر رہا ہو۔ اسپتال سے چھٹی پانے کے بعد وہ ... لاج میں ٹھہر گیا۔ چند دن بعد اس نے اپنی خواہش کے مطابق عیسائی مذہب اختیار کرکے ... جولی سے شادی کرلی۔ جولی کی ماں نے فرط مسرت سے مغلوب ہوکر اپنی بیٹی داماد کے نام ... لکھ کر دیا۔ وہ چاہتی تھیں کہ سیودھ جو کچھ شہرت حاصل کرکے مستقل طور پر میونخ میں رہ جائے۔ ... وہ پہلے اپنے وطن جاکر اپنی ماں کا آشیرواد لینا چاہتا تھا۔ اس لئے کچھ دن بعد وہ اپنی ... کو ... ہندوستان چلا آیا۔

... تلاؤ گاؤں کا بڑا اور بہت پرانا تالاب تھا۔ اس کے چاروں طرف املی کے بڑے بڑے ... پیڑ تھے۔ گاؤں والوں نے اس کا نام املی تلاؤ رکھ دیا تھا۔ املی تلاؤ کے دو سمت نہانے کے لئے سیاہ پتھر کے کشادہ گھاٹ تھے۔ پوربی گھاٹ سے متصل ایک چھوٹا سا خوبصورت مندر تھا۔ لوگ ... ن کے صحن میں سورج دیوتا کی پوجا کرتے تھے۔
اتوار کا دن تھا سرکاری چھٹی کا دن۔ رات کی بوندا باندی کی وجہ سے آسمان اب تک ابر آلود تھا۔ جولی اپنے بچے ... کو چھوڑ کر کپڑے دھونے کے لیے صبح صبح املی تلاؤ کے گھاٹ پر چلی آئی۔ وہ کپڑے دھو رہی تھی کہ ... آواز سنائی دی۔ آواز سن کر یکلخت اس نے تمام جسم میں ایک سنسنا ہٹ دوڑ گئی۔ وہ بھی ... سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ لیکن کہیں کچھ نہیں دکھائی دیا۔ وہ پھر اپنے کام میں مشغول ہوگئی۔ ... اِدھر درختوں کے درمیان سے سریتا کی تیز نگاہ تو اس نے دھان پان سی حسین جولی کو دور سے پہچان لیا۔ اسے دیکھتے ہی ... نے آواز دی۔ اس کی ہلکی سی آواز سن کر جولی ہڑبڑا کر کھڑی ہوگئی اور پگڈنڈی کی طرف دیکھنے لگی۔ ... کر پر گھڑا رکھے مسکراتے ہوئے قریب آکر کھڑی ہوگئی اور گھڑا نیچے رکھ کر ہمدردانہ لہجہ میں بولی:
"... تے سویرے چلی آئی جولی؟"
"سریتا دیدی" بچے کے میلے کپڑے جمع ہوگئے تھے دھونے چلی آئی۔"
"... جتیس سو رہا ہے؟"
"... اب بیٹے دونوں سو رہے ہیں، آج آفس کی چھٹی ہے نا۔"
"... پتہ نہیں کیوں ... دل نہیں لگتا جولی۔"

"اور کس بات کا دیدی، میں تو اکثر اکیلی چلی آتی ہوں، سوچا آج سویرے ہی کیوں نہ اپنا کام ختم کرلوں آج اتوار ہے۔ یہاں سارا دن بھیڑ لگی رہتی ہے۔"

"تم بڑی محنتی ہو جولی! تمہیں کبھی خالی ہاتھ بیٹھے نہیں دیکھا۔ دن بھر کچھ نہ کچھ کرتی رہتی ہو۔" سریتا اپنا گٹھا سوکھی گھاس سے مل رہی تھی۔

"کل رات تمہارے گھر سے بچوں کے رونے کی آواز آرہی تھی۔ کیا بات تھی دیدی؟" جولی نے ہمدردی سے پوچھا۔

"کیا بتاؤں جولی" سریتا کی آواز یک بیک بھرا گئی۔ "میری تقدیر ہی پھوٹی ہے۔ شرابیوں کے گھر میں کبھی سکون نہیں ہوتا۔ یہاں آئے دن ایک نہ ایک مسئلہ منہ پھاڑے کھڑا رہتا ہے، تمہیں اپنا دکھڑا کیا سناؤں جولی۔ نحوست کی آندھی! آگ میں پڑی ہوئی گیلی لکڑی کی مانند دن رات جل رہی ہوں اور اپنے بچوں کے مستقبل کے بارے میں سوچ سوچ کر اپنا خون جلا رہی ہوں۔"

سریتا کی دکھ بھری بپتا سن کر جولی کی روح کانپ گئی۔ اور وفور جذبات سے اس کی نیلی آنکھیں آبگوں ہو گئیں۔ جب اس نے سارے کپڑے دھو لئے تو انہیں بالٹی میں رکھ کر جانے کے لئے کھڑی ہو گئی۔ تو سریتا نے بھی جلدی سے اپنا گھڑا کھنگال کر پانی بھر لیا۔ پھر دونوں ایک ساتھ چل پڑیں۔

راستہ میں چلتے چلتے اس نے پھر کہا۔ "جولی، میں نے سنا تم اپنے دیس چلی جاؤ گی؟"

"ہاں دیدی، تم نے ٹھیک سنا ہے۔"

"کیوں ــــ ؟" حیرت و استعجاب سے سریتا کا چہرہ دھواں دھواں ہو گیا۔

"بات دراصل یہ ہے کہ وہاں دیس میں ہمارا بہت بڑا فارم ہے، ماں بیچاری اکیلی رہتی ہے۔ اس کا ہاتھ بٹانے والا کوئی نہیں ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ سب و دھم ماتو یہاں صرف پانچ سال کے معاہدہ پر کام کر رہے تھے۔ اب یہ معاہدہ ختم ہو رہا ہے اور سچ پوچھو تو مجھے یہاں اچھا بھی نہیں لگتا۔ آئے دن ہنگامہ، دنگا فساد کسی دن سکون نہیں، حتیٰ کہ جان و مال کی بھی خیر نہیں۔ یہاں کے حالات سے میں گھبرا گئی ہوں، چاہتی ہوں جلد سے جلد جرمنی لوٹ جاؤں، وہاں کی صحت بخش آب و ہوا سے ہماری تندرستی بھی اچھی رہتی ہے، ہر طرح کی سہولت ہے اور کسی نوع کا خوف نہیں ......" آپس میں دونوں باتیں کرتے ہوئے اطمینان سے آ رہی تھیں مگر گھر کے قریب پہونچتے ہی جولی کو اپنے بچے کے بے اختیار رونے کی آواز سنائی دی۔ وہ بدحواس ہو کر دوڑی اور گھر میں چلی گئی۔ سریتا اسے دیکھتی رہ گئی۔ پھر وہ بھی اپنی گیلی ساڑی کا پلو سنبھالتے ہوئے اپنے گھر کی طرف مڑ گئی۔

راجدھانی کی ادبی جھلکیاں

حسن نجمی سکندرپوری

یوم اقبال کی سادہ اور سنجیدہ تقریب

مرکز علم و دانش نئی دہلی کے زیر اہتمام، غالب اکادمی میں جناب یونس سلیم صاحب...... کی صدارت اور ذہین نقوی صاحب کی نظامت میں بتاریخ ۲۱ اپریل ۱۹۸۵ء شاعر مشرق علامہ اقبال کا ۴۸ واں "یوم وفات" انتہائی سادگی اور سنجیدگی سے منایا گیا۔ اس ادبی جلسے میں جناب حسن عسکری پریس اتاشی حکومت پاکستان (مقیم ہند نئی دہلی) نے اپنے ملک کی نمائندگی کی۔ ایک پاکستانی دانشور جناب عبدالغفار راؤ بھی بحیثیت مہمان خصوصی شریک جلسہ تھے۔

ڈائرکٹر اقبال اکادمی پٹنہ جناب اسرار جامعی نے اقبال کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے انھیں محب وطن اتحاد کا حامی اور "شاعر ملت" کے نام سے یاد کیا اور مثال کے طور پر اقبال کے وہ مقبول عام اشعار پیش کئے جن میں برصغیر کی عظمت کی ترجمانی کی گئی ہے۔

"اقبال کا تصور انسان" کے عنوان سے جناب شہاب جعفری نے ایک مختصر مقالہ پیش کیا، جس میں کہا گیا ہے کہ میر، غالب اور دوسرے عظیم شعرا کی صف میں اقبال بھی آتے ہیں جن کا اپنا ایک منفرد تصور انسان ہے۔ میر تقی نے کہا ہے:-

الٰہی کیسے ہوتے ہیں جنھیں ہے بندگی خواہش
ہمیں تو شرم دامن گیر ہوتی ہے خدا ہوتے

غالب تشکیک کے ظلمت خانے سے آواز دیتے ہیں:-

نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

محترم مہمان جناب عبدالغفور راؤ نے اقبال پر ایک پر مغز، مدلل اور خوبصورت تقریر کی اور کہا کہ اقبال جہاں ایک عظیم شاعر ہیں وہیں ایک عظیم مفکر بھی ہیں۔ ان دونوں میں خط امتیاز کھینچنا بہت مشکل ہے۔ اس کے علاوہ اقبال کی ایک تیسری حیثیت بھی ہے اور وہ ہے مصلح قوم کی۔ اقبال کی مشہور نظم حقیقت حسن میں ان کی شخصیت کے ان تینوں پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔ اقبال نے حب الوطنی کی راہ پر چلتے ہوئے "حب ملت" کا دامن بھی پکڑا۔ یہ ان کے...... ذہن کا تدریجی ارتقا ہے۔ فاضل مہمان نے اقبال کے تدریجی ذہنی ارتقا کی مزید وضاحت کی اور کہا کہ اقبال پر یہ ایک بہتان ہے کہ وہ قومی شا[illegible]نے کے

بعد مسلمانوں کا شاعر بن گیا۔

فاضل مقرر نے آگے چل کر کہا کہ فلسفۂ اسلام جب عرب سے نکل کر ایران میں داخل ہوا تو عرب فاتحین اس پر قابو نہیں رکھ سکے۔ ایرانیوں نے اسے اپنے علوم و تہذیب کے آئینے میں دیکھا اور اس کے مطابق عمل کیا۔ مسلمان یہیں سے جمود اور بے عملی کے شکار ہوئے۔ یہی وہ اسباب تھے جن کی بنا پر حضرت علیؓ اندھا دھند فتوحات کی تائید میں نہیں تھے۔ وہ دل و دماغ کی تسخیر کو مقدم سمجھتے تھے۔ فلسفۂ اسلام ہندوستان میں بھی اسی جمود اور بے عملی کا شکار رہا اور اس کے ڈانڈے ترک دنیا، گوشہ نشینی اور رہبانیت سے جا ملے۔ یہ سلسلہ مغل شہنشاہ اکبر کے زمانے تک چلتا رہا۔ متحرک عمل اور جد و جہد کی بنیاد مشہور و معروف مصلح حضرت مجدد الف ثانی نے ڈالی جسے اقبال جیسے مفکروں نے آگے بڑھایا۔

صدر جلسہ جناب یونس سلیم نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ اقبال کو ایک شاعر، مفکر اور فلسفی کی حیثیت سے زندگی میں ہی کافی شہرت مل گئی جو اردو کے کسی دوسرے شاعر کو نصیب نہیں ہوئی۔ محمد حسین آزاد اور حالی نے اردو شاعری میں جس انقلابی نظریے کی بنیاد ڈالی، اس کے اثرات اقبال کے یہاں پوری طرح نمایاں ہیں۔ اقبال نے عالم اسلام کی نئی نسل کو جس طرح متاثر کیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔

صدارتی تقریر کے خاتمے کے بعد مرکز علم و دانش کے سکریٹری جناب ابرار کرت پوری نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ اس کے بعد مشہور گلوکار صاحب سنگھ نے ساز و آواز کا پروگرام پیش کیا جو اقبال کی غزلوں پر مبنی تھا۔

تیرگی سے نہ کیجئے اندازہ ۔ کچھ گھروں میں دیے نہیں ہوتے (محسن بھوپالی پاکستان)

۱۷ مارچ ۱۹۸۵ء کو نئی دہلی میں منعقدہ ایک مشاعرے کے سلسلے میں پاکستان اور لندن سے کچھ شعراء تشریف لائے تھے۔ انجمن ترقی اردو ہند کے زیر اہتمام ۲۰ مارچ ۱۹۸۵ء کو اردو گھر میں ان مہمان شعراء کے اعزاز میں ایک استقبالیہ جلسہ منعقد کیا گیا جس کی صدارت بزرگ شاعر جناب آنند نرائن ملاؔ نے فرمائی۔ جناب محمود سعیدی نے نظامت کا بار سنبھالا اور جناب ڈاکٹر خلیق انجم نے مہمانوں کا فرداً فرداً تعارف کروایا۔ اس کے بعد ایک مختصر شعری نشست ہوئی جس میں مہمان شعراء نے اپنا کلام پیش کر کے سامعین سے بھرپور داد حاصل کی۔ قارئین کی دلچسپی کے لئے ان شعراء کے کچھ منتخب اشعار پیش کئے جا رہے ہیں۔

سلیم کوثر

جگ بھی بھٹکتا رہتا ہے کہیں ساحل سے ۔ اور پانی میں بھی ہلچل نہیں ہونے دیتا
عالم ذات میں درویش بنا دیتا ہے ۔ عشق انسان کو پاگل نہیں ہونے دیتا

صبح ترمصطفیٰ شبنم (لندن)

سرد راتوں سے حرارت نہیں ملنے والی ۔ اب تو سورج سے تمازت نہیں ملنے والی
اس سے پھر صورت تجدید وفا بھی کیا ہو ۔ اب طبیعت سے طبیعت نہیں ملنے والی

حبیب حید رآبادی (لندن)

اپنی ہستی کا خریدار کہاں سے آئے — جس میں بک جائیں وہ بازار کہاں سے آئے
چشمۂ فکر تو بے آب پڑا ہے کب سے — اب خیالات کی منجدھار کہاں سے آئے

ناصر زیدی

ہمت کوہ شکن ہے مجھ میں — پھر بھی صدیوں کی تھکن ہے مجھ میں
دشت در دشت لئے پھرتی ہے — خواہش سرو و سمن ہے مجھ میں
جس ظلمت میں مقید تھا کبھی — اب اجالوں کی گھٹن ہے مجھ میں

حسن رضوی (پاکستان)

موسم ہے یہ کیسا کہ پرندے نہیں لوٹے — ہے شام وہی رنگ حنا گیر وہی ہے
وہ جس نے مری یاد میں لب تک نہیں کھولے — کمرے میں مرے آج بھی تصویر وہی ہے

محترمہ کشور ناھید (پاکستان)

تو بھی مری طرح دل دھیان اٹھائے خبر کا — لوٹ کے چھاؤں سو گئی، قافلے کوچ کر گئے

شجر سے پتے یوں ہی تو گرا نہیں کرتے — بچھڑ کے لوگ زیادہ جیا نہیں کرتے
جو آ ہوا لے ہیں موسم انھیں شمار میں رکھ — جو دن گزر گئے ان کو گنا نہیں کرتے

محسن بھوپالی (پاکستان)

خوب ہے، خوب تر ہے۔ خوب ترین — اس طرح تجربے نہیں ہوتے
بات بین السطور ہوتی ہے — شعر میں حاشیے نہیں ہوتے
تیرگی سے نہ کیجئے اندازہ — کچھ گھروں میں دئے نہیں ہوتے

جمیل الدین عالی

نہ شکایت نہ تقاضا کرنا — دوستوں کو یوں ہی دیکھا کرنا
ایک دو ایسا نہیں جو بتلائے — وہ نہ مل پائے تو پھر کیا کرنا
ہم تو اس غم کا سبب بھی کہہ دیں — لوگ کہتے ہیں مت ایسا کرنا

آنند نرائن ملا

نہ کوئی گیت سناتے ہیں گزرتے ہوئے دن — نہ کوئی درد جگاتے ہیں گزرتے ہوئے دن
دل سے چپ چاپ جیسے پاؤں گزر جاتے ہیں — جیسے اب آنکھ چراتے ہیں گزرتے ہوئے دن

سیّاحوں کی توجّہ کا مرکز "بہار"

پاٹلی پُترا کے پُرانے راج نگر، نالندہ کی مشہور یونیورسیٹی اور راج گیر کی خوبصورت دیواروں کی جھلک، سہسرام میں شیر شاہ کا مقبرہ، ویشالی، اسے راج اور لوریانند گڑھ کے اشوک استوپ، بودھ گیا، دیوگھر، پارس ناتھ کے پُرانے مندر اور پٹنہ سیٹی کے سکھ گردوارہ کو ضرور دیکھیں۔

راجگیر کے گرم پانی کے جھرنوں میں نہانا اور چھوٹا ناگپور کے جھرنوں، پہاڑوں جھیلوں اور جنگلوں کی قدرتی خوبصورتی کو دیکھنا نہ بھولیں۔

راجگیر میں آسمانی لفٹ کے ذریعہ رتناگیری پر تعمیر عالمی امن استوپ کا بھی درشن کریں۔

جمشید پور، ہٹیا (رانچی)، سندری، دھنباد، پنچیت، میتھن، تلیا اور بَرونی کے مشہور و معروف صنعتی مرکزوں کو ضرور دیکھیں۔

پٹنہ، راجگیر، گیا، رانچی، نیترہاٹ، ڈالٹین گنج، دیوگھر، اور مظفر پور میں ٹورسٹ وین، اور اعلیٰ درجہ کی آرام دہ موٹر گاڑیاں بھی مہیّا ہیں۔

راجگیر، بودھ گیا، ویشالی، نیترہاٹ، دیوگھر، ڈالٹین گنج اور ہزاری باغ میں سیاحوں کے رہنے کے لئے اعلیٰ درجہ کی رہائش کا انتظام ٹورسٹ ڈیپارٹمنٹ کے ذریعہ کی گئی ہے۔

مزید معلومات کے لئے پٹنہ اور مختلف جگہوں کے ٹورسٹ انفارمیشن سنٹر سے رابطہ قائم کریں

ٹورسٹ ڈیپارٹمنٹ بہار

सू० जा० स० नि० — 29 स (सू- 37)/83 - 84

حسن نجمی سکندرپوری

ترقی پسند ادبی تحریک آج کی اہم ضرورت

انجمن ترقی پسند مصنفین لندن کے جنرل سکریٹری اور انجمن ترقی اردو (لندن) کے صدر جناب ماشوؔر کاظمی ان دنوں دہلی میں موجود ہیں۔ انجمن ترقی پسند مصنفین لندن کے زیر اہتمام اس سال انجمن کی پچاسویں سالگرہ آئندہ ماہ جولائی میں لندن میں منائی جانے والی ہے۔ موصوف اس سالگرہ کی تیاری کے سلسلے میں صلاح و مشورہ کی غرض سے یہاں آئے ہوئے ہیں۔

انجمن ترقی پسند مصنفین دہلی کی جانب سے اردو گھر راؤز ایونیو نئی دہلی میں بتاریخ ۲۲ مارچ ۱۹۸۵ء زیر صدارت جناب علی سردار جعفری، جناب ماشور کاظمی کا پرجوش استقبال کیا گیا۔ اس جلسے کے ناظم پروفیسر قمر رئیس نے مہمان کا مختصر تعارف کرایا۔ اس کے بعد انجمن ترقی پسند مصنفین کے فیڈریشن کے جنرل سکریٹری مسٹر بھیشم ساہنی نے ماشور کاظمی صاحب کا استقبال کرتے ہوئے فرمایا کہ لندن میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی داغ بیل ۱۹۳۵ء میں پڑی تھی۔ جسے پچاس برس ہو گئے۔ چنانچہ اسی سال وہاں اس کی پچاسویں سالگرہ منائی جا رہی ہے۔ ہندوستان میں بھی ۱۹۸۶ء میں انجمن کی پچاسویں سالگرہ منائی جائے گی۔

اپنی تقریر جاری رکھتے ہوئے بھیشم ساہنی صاحب نے کہا کہ ہندوستان کی مختلف زبانوں کے ترقی پسند ادیبوں نے زبان و ادب کی شاندار خدمت انجام دی ہے اور صاف ستھرا ادبی مواد مہیا کیا ہے۔ تنظیمی نقطہ نگاہ سے اس انجمن میں کچھ کمزوری آئی ہے لیکن اس کی آئیڈیالوجی اپنی جگہ ہے۔

ڈاکٹر خلیق انجم نے معزز مہمان کو خوش آمدید کہتے ہوئے فرمایا کہ نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کے حملوں کے بعد اردو حیدرآباد (دکن) اور فیض آباد (یوپی) پہنچی۔ ۱۸۵۷ء کے بعد اس زبان نے رام پور، لکھنؤ اور دوسرے مقامات کو بھی اپنا مسکن بنایا۔ ۱۹۴۷ء کے بعد یہ لندن، کناڈا، امریکہ اور دوسرے بیرونی ممالک میں پہنچی۔ یہ زبان جہاں گئی وہاں کی بولیوں کے محاورے اور تلفظ سے متاثر ہوئی اور صوتی اعتبار سے اتنی بدل گئی کہ بعض اوقات سیدھے سادے الفاظ کا تلفظ بھی سمجھنا مشکل ہو گیا۔ ماشور کاظمی صاحب ان قافلوں میں شامل ہیں جن کے ذریعہ اردو سمندر پار پہنچی اور اپنا حلقہ وسیع سے وسیع تر بناتی جا رہی ہے۔

ڈاکٹر صدیق الرحمٰن قدوائی نے جو ماشور کاظمی صاحب کے حلقۂ احباب میں شامل ہیں۔ انھیں خراج تحسین پیش کرتے ہوئے اپنے تعاون کا یقین دلایا۔

ناظم جلسہ پروفیسر قمر رئیس نے معزز مہمان سے سوال کیا کہ وہ بڑی تعداد میں ہندوستان پاکستان کے علاوہ امریکہ اور لاطینی امریکہ کے ترقی پسند مصنفین کو جمع کر رہے ہیں۔ اتنے بڑے اجتماع کا آخر مقصد کیا ہے؟
اس سوال کا جواب دیتے ہوئے جناب کاظمی صاحب نے فرمایا کہ دنیا موت کے دہانے پر کھڑی ہے۔ ایسی تناؤ بڑھ رہا ہے جس کے حصار میں عام آدمی اپنے آپ کو بے بس اور لاچار محسوس کر رہا ہے۔ برّ اعظم ایشیا خاص طور پر بہت بڑے خطرے سے دوچار ہے جسے مغربی ممالک اپنی ہوس کا نشانہ بنائے ہوئے ہیں۔ ان کی خواہش ہے کہ ایشیا جنگ کا اکھاڑا بن کر تباہ و برباد ہو لیکن یوروپ اور امریکہ اس کی آنچ سے محفوظ رہیں۔
کاظمی صاحب نے مزید فرمایا کہ یہ انسان ہی ہے جو مہلک ہتھیار تیار کرتا ہے اور یہ انسان ہی ہے جو اپنی جد وجہد کے ذریعہ ان ہلاکت خیز ہتھیاروں سے بنی نوع انسان کو بچا سکتا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ دنیا بھر کے امن پسند فنکار ایک جگہ جمع ہوں اور بغیر کسی دباؤ کے آزادانہ طور پر فیصلہ کریں کہ اس ایٹمی اور نیوکلیائی دور میں معصوم اور بے گناہ انسانوں کو کیسے بچایا جا سکتا ہے؟
مشہور و معروف ترقی پسند شاعر ڈاکٹر مظہر امام نے کاظمی صاحب کی آمد پر دلی مسرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ یہ ایک عظیم مقصد اور عظیم کارنامہ ہے اسے کامیاب بنانے کی ہر ممکن کوشش ہونا چاہیئے
صاحب طرز افسانہ نگار جناب جوگندر پال نے جناب عاشور کاظمی کا استقبال کرتے ہوئے کہا کہ غیر ممالک کے ترقی پسند ادیبوں کی آوازیں وہی توانائی اور جبر و استبداد کے خلاف آواز بلند کرنے میں وہی ہمت و جرأت دکھائی دیتی ہے جو پہلے تھی لیکن اپنے ہم وطن ترقی پسند ادیبوں میں کچھ تھکن کا احساس پیدا ہو گیا ہے۔
جوگندر پال صاحب نے یہ آگاہی دی کہ گذشتہ پچاس برسوں میں ادب اور سماج میں جو تبدیلی آئی ہے وہ پانچ سو برسوں میں دیکھنے میں نہیں آئی۔ ان تبدیلیوں کو سمجھنے اور انھیں اپنے فن میں سمونے کی ضرورت ہے۔ اگر ایسا نہیں ہوا تو ہم پیچھے رہ جائیں گے اور تیز رفتار زمانہ بہت آگے نکل جائے گا۔
جناب اعجاز علی ارشد صوبہ بہار سے آئے تھے۔ یہ ایک اتفاقی امر تھا۔ موصوف نے بھی استقبالیہ جلسے میں شرکت کی اور جناب عاشور کاظمی صاحب کو بہار آنے کی دعوت دی اور ہر طرح کے تعاون کا یقین دلایا۔ ارشد صاحب نے یہ بھی کہا کہ ترقی پسند تحریک کی تاریخ مرتب ہونے جا رہی ہے اسے ملاقاتی طور پر ہونا چاہیئے۔
صدر جلسہ جناب سردار جعفری نے عاشور کاظمی صاحب کی آمد پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ ادیبوں شاعروں اور دانشوروں کو اس نازک گھڑی میں اپنے اختلافات کو بھول کر کام کرنا چاہیئے۔
ڈاکٹر شارب ردولوی نے مہمان کو نذرانہ خلوص پیش کرتے ہوئے حاضرین جلسہ کا بھی شکریہ ادا کیا جن کی شمولیت کی بنا پر یہ استقبالیہ جلسہ کامیاب ہوا۔ موصوف نے یہ بھی فرمایا کہ دنیا جس عہد سے گذر رہی ہے اور اس کے سر پر جیسے جیسے خطرات منڈلا رہے ہیں اس کے پیش نظر فنکاروں کو بھی سوچنے کی ضرورت ہے۔ ترقی پسند ادبی تحریک آج کی اہم ضرورت ہے اور اس کے ذریعہ دنیا کو جنگ کے جہنمی شعلوں سے بچایا جا سکتا ہے۔

[redacted]

خطوط، عظیم فیروز آبادی کے نام

ابو محمد شبلی • شمس بدایونی • نعمان شوقی • تاج پیامی • مشرف عالم ذوقی

فروری کے شمارے میں جناب عظیم فیروز آبادی کا "کھلا خط ڈاکٹر مغنی کی خدمت میں" پڑھا۔ مغلوب الغضب مراسلہ نگار نے ڈاکٹر مغنی صاحب کے مضمون کا خلاصہ پیش فرمایا تھا۔ تو اس کا سلسلہ وار جواب بھی دیتے۔ تین چوتھائی لکھنے کے بعد چاہئے تو یہ تھا" کا احساس بھی ہوا تو روشنی کے مقلد کو اپنے دائرے میں اپنی انا کے دفاع سے فرصت نہ ملی۔ اور وہ از مضامین کو توڑ کر مضمون کے دفاع میں کچھ بھی نہ لکھ سکے۔ ایسا بھی کیا غصہ۔

اس مراسلہ کو "قومی آواز" یا "ہماری زبان" میں چھپنا تھا کہ ان اخباروں کے قاری عظیم فیروز آبادی صاحب کے مضامین سے لطف اندوز ہو چکے تھے اور اقبال کے پیغمبرانہ مصرعہ

آہ بیچاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

کی یاد تازہ ہو گئی تھی ڈاکٹر مغنی صاحب کا جواب بھی وہیں چھپا تھا قارئین "سہیل" کی اکثریت ان اخباروں میں چھپے ہوئے مضامین سے واقف نہ ہو گی۔ اس لئے بھی ضروری تھا کہ وہ مغنی صاحب کو نمبر وار جواب دیتے۔ مگر وہ اپنے غصہ پر قابو نہ پا سکے۔

عظیم فیروز آبادی صاحب کے مرتب کردہ "خلاصہ" کے نمبر پانچ (۵) کو ذہن میں رکھ کر ان کے مراسلہ کو بار بار پڑھا۔ مگر پورے پانچ صفحہ کے اس مضمون میں جس میں قارئین "سہیل" کو اپنا قیمتی وقت ضائع کرنے کی دعوت دی گئی ہے کہیں بھی اس کا جواب نہ ملا۔ ڈاکٹر مغنی صاحب کا "اصل سوال" اب بھی اپنی جگہ باقی ہے۔ جسے محقق نے ... کاری اور الفاظ کی بازی گری میں چھپانے کی کوشش کی ہے۔ اور یہ عمل فن تحقیق کے منافی ہے۔

علامہ اقبال کے قریب تر معاصرین کی ایک رائے یہ بھی ہے کہ وہ شاید صوفیوں کے "فرقہ ملامتیہ" سے تعلق رکھتے تھے شاید عظیم فیروز آبادی کے ذہن سے اقبال کا یہ "لوازن سہیل" محو ہو گیا ورنہ مجھ اور کیسے رہا مکن ہے وہ اس رائے سے بے خبر ہی ہوں۔

بہرحال ایک کیپٹلسٹ نے اپنی آنے والی تصنیف یا تالیف کی پبلسٹی تو کر ہی دی کم از کم یہ سودا ان کے لئے گھاٹے کا نہیں رہا۔

والسلام

دعاگو

ابو محمد شبلی

معرفت دانش محل، امین الدولہ پارک لکھنؤ ۱۸، ۰۱۸ ۲۲۴۰

عظیم فیروزآبادی صاحب کا خط اس مرتبہ خاص توجہ کا سبب بنا۔ ہماری زبان" میں اقبال کے سلسلہ کی کئی تحریریں نظر سے گزری ہیں۔ دو ایک مرتبہ خواہش بھی ہوئی کہ ان کی تحریروں پر کچھ اظہار خیال کیا جائے مگر یہی ابھی سانپ کو بل سے باہر آنے دو۔ تاکہ اس کی صحیح جسامت کا اندازہ ہو جائے۔

فیروزآبادی صاحب (اس میں شک نہیں کہ پڑھے لکھے آدمی ہیں۔ تحقیق ان کا میدان عمل ہے۔ لیکن اس میں تعمیری پہلو کم ہے تخریبی زیادہ۔ مثال کے طور پر اگر بقول فیروزآبادی ان کے "یہ ایک تحقیقی مسئلہ ہے" تو وہ اس تحقیق کو پیش کرتے وقت انتہائی جذباتی کیوں ہو جاتے ہیں۔ اقبال اور اقبال کے والد کی شان میں اکثر جملے ہتک آمیز کہہ گئے ہیں۔ تحقیق تحقیق ہے۔ وہ دل آزاری، تعصب اور جذباتیت سے پاک ہونا چاہئے۔ عظیم فیروزآبادی صاحب کی تحریر ابھی تحقیقی خوش سلیقگی سے عاری ہے۔ اس میں جذباتیت اور ذاتیات کو ٹٹولنے کی تڑپ بہت زیادہ ہے۔ ظاہر یہ چیز قاری ہی محسوس کر سکتا ہے۔ وہ خود نہیں۔ اگر وہ اپنی تحقیقات کو سلیقے کے ساتھ پیش کریں تو اہل علم یقیناً ممنون ہوں گے۔

مخلص

شمس بدایونی (بدایوں)

"سہیل" کے فروری کے شمارہ میں عظیم فیروزآبادی کا "ایک کھلا خط ڈاکٹر عبدالمغنی کے نام" پڑھنے کا اتفاق جسے عظیم صاحب نے اپنے تخریبی مضمون "اقبال کا وصیت نامہ" پر ڈاکٹر عبدالمغنی کے تبصرے کی تردید کے طور پر دفاعت کے لئے لکھا ہے۔ ایک قاری ہونے کے ناطے میں نے اپنا فرض سمجھا کہ اس خط سے قارئین کے درمیان جو غلط فہمی پیدا ہو گئی ہوگی اس کو دور کروں۔

عظیم صاحب نے اقبال کے بارے میں یہ دعویٰ کیا ہے:

"میں بھی ان کا اسی قدر احترام کرتا ہوں اور ان کی شاعری سے اتنا ہی محظوظ ہوتا ہوں جتنا کوئی دوسرا ادب دوست اور اردو داں ہو سکتا ہے۔ یقین جانئے بعض دفعہ ان کے کلام سے میری طبیعت میں اس قدر ہیجان پیدا ہو جاتا ہے کہ میری نیند اڑ جاتی ہے اور میں سونے میں دیر تک کامیاب نہیں ہوتا۔ ممکن ہے اس کی وجہ کوئی دوسری اعصابی کمزوری ہو جس کا مجھے علم نہیں۔"

اور پورا خط پڑھنے کے بعد یہ معلوم ہوتا ہے کہ عظیم صاحب کو نیند نہ آنے کی وجہ واقعی اعصابی کمزوری ہی ہے۔ کیونکہ ایسا شاعر جسے بقول ان کے "بامحاورہ اردو لکھنے پر قدرت حاصل نہ ہو" اس کی شاعری میں وہ کیفیت سما سکتی جس سے طبیعت میں ہیجان پیدا ہو۔

عظیم صاحب نے صرف اس لئے اقبال سے عقیدت مندی ظاہر کرنے کے چند جملے لکھے ہیں کہ ان کے پس پردہ قارئین کو دھوکہ دے کر اپنی غلط بات منوا سکیں۔

اقبال کے مداحین میں اپنا نام درج کرانے کو عظیم صاحب سستی شہرت اور مقبولیت حاصل کرنے کا وسیلہ سمجھتے ہیں جبکہ اردو کا ہر قاری جانتا ہے کہ صرف چند ہی اقبال پر لکھنے والوں کو جنھوں نے واقعی خلوص کی بنا پر اور تحقیق

" سے کام لیا۔ انہیں ہی شہرت حاصل ہوئی، سب کو نہیں۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ اقبال کے مخالفین میں اپنا نام درج کر چند دہائیوں سے سستی شہرت حاصل کرنے کا ذریعہ بنا ہوا ہے خواہ وہ شہرت کلیم الدین احمد کو حاصل ہوئی ہو یا فیروز آبادی کو۔ اقبال کا وصیت نامہ، اقبال کے والد اور اقبال کی شادیاں وغیرہ مضامین اقبال کی مداحی میں لکھے گئے تو عظیم صاحب کا چرچہ آج کیوں ہوتا؟

عظیم صاحب نے اقبال کی مستند سوانح حیات کا بھی رونا رویا ہے۔ وہ غالباً جوش کی "یادوں کی برات" کے سوا دستخر تحریر کو سوانح حیات ماننے پر تیار نہیں۔ میں انہیں بایوگرافی کے فن کے متعلق BOISE STATE UNIVERSITY (U.S کے پروفیسر C.L. SAHNI کے الفاظ میں آگاہ کرنا چاہوں گا۔ جو بایوگرافی کو

"DESIRE TO WRITE ABOUT OTHER MEN AND TO PERP-
-ETUATE THE MEMORY OF SOMETHING FINE AND
BEAUTIFUL AND BELOVED."

یا۔ اور بایوگرافی کی صحیح اور جامع تعریف عیسیٰ سے چھ سو سال بیشتر یعنی بایوگرافی کے پہلے مصنف DAMSCINS نے سے اب تک زیادہ تر لوگ یہی مانتے ہیں لیکن ایسا لگتا ہے کہ عظیم صاحب THE MEMORY OF EVERYTHING GROSS AND UGLY AN HATEF کو ہی بایوگرافی سمجھتے ہیں۔ نہیں تو اقبال کی سوانح حیات کی کمی نظر نہیں آتی۔

عظیم صاحب کا یہ سوال نہایت ہی طفلانہ ہے کہ مغنی صاحب نے اقبال پر ہزار بارہ سو صفحات سیاہ کئے لیکن حیات کیوں نہیں لکھی۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی A.C. BRADLEY سے کہے کہ اس نے SHAKESPEAREAN TRAGE. کیوں لکھی۔ شکسپیر کی سوانح حیات کیوں نہیں لکھی۔ انگریزی ہی، اردو یا دنیا کی کوئی زبان ہو مشکل تمام بیس فیصد ہی شعراء و ادباء ایسے ہوں گے جن کی سوانح حیات لکھنے کی ضرورت محسوس کی گئی ہو۔

عظیم صاحب جوش کو اقبال کے مقابلہ میں قادر الکلام شاعر ٹھہراتے ہیں۔ اردو کا ایک معمولی قاری بھی ان کی یہ بات ہنس کر ٹال دے گا۔ میں انہیں بتانا چاہوں گا کہ شاعر نے صرف

میرا نعرہ انقلاب و انقلاب و انقلاب

ہے۔ اقبال نے جتنے موضوعات پر قلم اٹھایا جتنے مضامین اور فلسفے حسن فنکاری اور شعری حسن کے ساتھ پیش کئے ان کی تعریف صرف ہند و پاک ہی نہیں بلکہ یورپ کے مختلف زبانوں کے اہل نظر حضرات نے بھی کی جن میں مشہور انگریزی HERBERT READ کا نام قابل ذکر ہے۔ جوش کو اقبال سے قادر الکلام شاعر کہنا سراسر تعصب ہے۔ عظیم فیروز آبادی نے بہت چالاکی سے اقبال کے چہرے کو داغدار بنا کر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً وہ لکھتے

"اگر ہم ڈاکٹر مغنی صاحب کے شعور سے مطابق اقبال کے مشہور و معروف اشعار کو یاد رکھیں،

(دیانت پر اعتبار کریں) جس میں انہوں نے اپنے اصل و نسل کی طرف صریح اشارے کئے ہیں تو ہم فریب خوردگی سے نہیں بچ سکتے"۔

بہت اچھا! لیکن علامہ اقبال کے اس جملے "میری مذہبی معلومات کا دائرہ نہایت محدود ہے"، جس میں انکساری سے کام لیا گیا ہے۔ اعتبار کر لیں تاکہ اس سے قارئین کو گمراہ کیا جا سکے۔ بہت خوب! نیوٹن نے تو کہا تھا کہ اس نے علم کے سمندر کے کنارے سے صرف چند سنگریزے اٹھائے ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ اس کی THEORY OF GRAVITY کی کوئی اہمیت نہیں۔ جبکہ اس نے سائنس کی دنیا پر اتنا بڑا احسان کیا ہے جس کا کوئی حساب نہیں۔

عظیم فیروز آبادی نے محض اپنی بات منوانے کے لئے اس قدر غلط طریقۂ استدلال اختیار کیا ہے کہ مفتی صاحب کا ان کے خلوص پر شک کرنا ضروری ہے۔ مثلاً عظیم صاحب اقبال کی کتاب RECONSTRUCTION OF RELIGIOUS THOUGHTS IN ISLAM کو انگریزی میں لکھنے سے نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ "علامہ کو آخری عمر تک صحیح اور با محاورہ اردو لکھنے پر قدرت حاصل نہیں ہوئی"۔ اس قسم کے جملے عظیم صاحب کی کم علمی کا ثبوت ہیں کیونکہ انہوں نے اگر مختلف زبانوں کی ادبیات کا مطالعہ کیا ہوتا تو انہیں ضرور معلوم ہوتا کہ اکثر زبانوں کے مشہور ادباء و شعراء نے دوسری یا غیر ملکی زبانوں میں اپنی تصانیف پیش کر کے اس زبان میں اپنی مہارت کا ثبوت دیا ہے۔ مثال کے طور پر انگریزی کے مشہور انشائیہ نگار BACON نے اپنے تمام فلسفیانہ مضامین اور نیوٹن نے اپنی معرکۃ الآرا تصنیف PRINCIPIA لاطینی زبان میں لکھی۔ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ نیوٹن یا بیکن اچھی انگریزی لکھنے پر قادر نہ تھے۔

سچ پوچھئے تو مفتی صاحب کو عظیم صاحب کے مضمون کا نوٹس ہی نہیں لینا چاہئے تھا کیونکہ بہت سے لوگوں نے اقبال کی شاعری پر تخریبی ضرب لگائی لیکن جب اس میں کوئی تزلزل پیدا نہیں ہوا اور وہ کامیاب نہ ہو سکے تو کردار کشی (CHARACTER ASSASSINATION) کا سہارا لیا۔ یعنی ان کی شخصیت کو مسخ کر کے پیش کرنا شروع کیا۔ لیکن اس کے باوجود بھی اقبال کی شاعری کی مقبولیت میں اضافہ ہی ہوتا رہا۔

آخر میں عظیم فیروز آبادی صاحب سے میری گزارش ہے کہ وہ تنقید برائے تنقیص کے فارمولے پر عمل نہ کریں اور تعصب سے کام نہ لے کر دوسرے اہل نظر حضرات کی آراء پر غور و فکر کے بعد کوئی فیصلہ کریں۔ اس بات کی طرف بیسویں صدی کے انگریزی زبان کے مشہور نقاد T.S. ELIOT نے بھی THE FUNCTION OF CRITI CISM میں اشارہ کیا ہے۔

THE CRITIC ONE WOUCD SUPPOSE IF HE IS TO
JUSTIFY HIS EXISTENCE, SHOULD ENDEAVOUR
TO DISCIPLINE HIS PERSONAL PREJUDICES AND
CRANKS — TARES TO WHICH WE ARE ALL
SUBJECT — AND COMPOSE HIS DIFFERENCES
WITH AS MANY OF HIS FELLOWS AS POSSIBLE,

"IN THE COMMON PURSUIT OF TRUE JUDGEMENT"

نعمان شوقی
جنرل سکریٹری دائرۂ ادبیہ جہاد پورا، آرہ ۸۰۲۳۰۱

سہیل گیا فروری ۱۹۸۵ء جلد ۴ شمارہ ۳ میں عظیم فیروزآبادی کا " ایک کھلا خط ڈاکٹر عبدالمغنی صاحب کی خدمت میں" شائع ہوا ہے۔ اقبال سے متعلق عظیم فیروزآبادی کا مضمون ہماری زبان اکتوبر ۱۹۸۴ء میں شائع ہوا تھا۔ اور اس کی تردید میں عبدالمغنی صاحب کا ایک مضمون بعنوان " اقبال کا وصیت نامہ " ہماری زبان جنوری ۱۹۸۵ء میں شائع ہوا ہے۔ عظیم فیروزآبادی کا یہ خط عبدالمغنی صاحب کے جواب میں ہے۔ اس سلسلے میں مجھے کچھ عرض کرنا ہے۔ اقبال پر ہر دور میں کیچڑ اچھالنے کی کوشش کی گئی ہے۔ کبھی ان کی اردو زبان سے ناواقفیت پر ناک بھوں چڑھائی گئی ہے، کبھی ان کی ذات پر بھی حملہ کیا گیا ہے۔ اور ہر دور میں غلط اعتراضات کا مسلسل جواب دیا گیا ہے۔ میں عظیم فیروزآبادی کی توجہ خالد نظیر صوفی کے مضمون "بے داغ ہے مانند سحر اس کی جوانی" کی طرف دلانا چاہوں گا۔ جو ڈاکٹر طاہر تونسوی کی مرتب کردہ کتاب "حیات اقبال" میں شامل ہے یہ مضمون بہت تحقیق اور جستجو کے بعد چھاپا گیا ہے۔ اس میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ اقبال پر ہر قسم کا الزام سراسر غلط اور بہتان ہے۔ اقبال جس کی جوانی یورپ میں بے داغ رہی۔ وہ اپنے ملک میں کیوں بدکردار ہوتا! اقبال کا سب سے زیادہ تابناک پہلو جس پر تہجد گزار زاہد اور فقیہ بھی رشک کریں یہ ہے سے

زمستانی ہوا میں گرچہ تھی شمشیر کی تیزی
نہ چھوٹے مجھ سے لندن میں بھی آداب سحر خیزی

کچھ باتیں عظیم فیروزآبادی کے خط کے حوالے سے عرض کرنا چاہوں گا۔ مغنی صاحب نے لفظ وثوق پر اعتراض کیا ہے۔ یہ لفظ یقین کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے تو ٹھیک ہے لیکن اس کے معنی ہیں پیش کیا گیا ہے تو غلط ہے جہاں تک عظیم صاحب کے وجود کے فرضی ہونے کا تعلق ہے مغنی صاحب کا شبہ بالکل صحیح ہے کیونکہ عظیم صاحب کو ادیب، شاعر، ناقد، محقق کی حیثیت سے کوئی نہیں جانتا۔ ان کی سخن فہمی، تنقید اور تحقیق کا تو یہ عالم ہے کہ اقبال کے مقابلہ میں جوش کو بڑا الکلام شاعر کہتے ہیں۔ اور جوش کو عظیم المرتبت شاعر کے خطاب سے بھی نوازتے ہیں۔ بس اسی سے عظیم صاحب کی عالمانہ عظمت اور صلاحیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ایاز کو اپنی قدر خود پہچاننی چاہیے۔ چند باتیں اور بھی عرض کرنا چاہتا ہوں۔ عظیم صاحب لکھتے ہیں " میں اقبال کا رقیب نہیں " یہ چور کی داڑھی میں تنکے والی بات ہے۔ اگر وہ رقیب نہیں تو دوست بھی نہیں۔ جب ہندوستان میں تقسیم کے بعد اقبال کا نام لینا بھی جرم تھا اس وقت عظیم صاحب کہاں تھے۔ کچھ رفاقت یا رقابت کا ثبوت فراہم کیا ہوتا۔ الفت نہ سہی، نفرت ہی سہی کے مصداق اقبال پر کچھ لکھا ہوتا۔ اس وقت یہ ذمہ داری جگن ناتھ آزاد نے صرف اپنے سر لی۔ اور آج تک انہوں نے اقبال پر دس بارہ کتابیں شائع کی ہیں۔ اور ماہرین اقبال شناسی میں ان کا اعلیٰ مقام ہے۔ عظیم صاحب لکھتے ہیں " پاکستان میں ہی نہیں ہندوستان میں بھی ہر ذی علم اچھی طرح جانتا ہے کہ سستی شہرت اور مقبولیت حاصل کرنے کا آسان نسخہ ہے کہ اپنا شمار اقبال کے مداحین

میں کرا لیا جائے ۔ ایسی بات کوئی ذی فہم نہیں بلکہ نافہم ہی جانتا ہوگا۔ کیونکہ اول تو یہ کہ اقبال کے مداحین میں شمار کرا لینا ہی آسان نہیں۔ اس کے لئے اقبال کو سمجھنا ہوگا اور اقبال کو سمجھنا ہر ایرے غیرے نتھو خیرے کا کام نہیں۔ خود عظیم صاحب نے یہ آسان نسخہ کیوں نہیں آزمایا۔ بقول ان کے " ہماری زبان کے حوض کوثر میں پیشاب کے قطرے شامل " کرکے وہ کیوں شہرت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اگر انہوں نے اقبال کی مداحی میں کوئی مضمون لکھا ہوتا تو اب بھی گمنامی کے غار میں پڑے ہوتے خود انہوں نے سستی شہرت کا آسان نسخہ آزمایا اور اقبال پر کیچڑ اچھالنا شروع کر دیا۔ وہ اقبال کی مداحی میں کچھ لکھ بھی تو نہیں سکتے تھے۔ کیونکہ اقبال پر لکھنے سے پہلے اقبال کے کلام کو سمجھنا ضروری ہے۔ اور جو شخص اقبال کے مقابلہ جوش کو قادر الکلام شاعر کہے وہ اقبال کو کیا سمجھ سکتا ہے۔ اگر واقعی انہوں نے اقبال کو سمجھا ہوتا تو بجائے مالک رام، جگن ناتھ آزاد، اور خلیفہ عبدالحلیم اور عبدالمغنی کے عظیم فیروز آبادی کی کتابیں اقبال پر ہوتیں ۔

عظیم صاحب لکھتے ہیں " اقبال اپنے چہرے کے داغوں کو چھپائے رکھنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتا۔" اقبال پر یہ جھوٹی تہمت ہے اس نے اپنے متعلق کئی نظمیں لکھی ہیں، اس کی نظم " نصیحت " ملاحظہ ہو دنیا کا کوئی شخص اپنے متعلق اتنا صاف اور واضح الفاظ میں نہیں لکھ سکتا جتنا اقبال نے اس نظم میں لکھ دیا ہے۔ شاید یہاں " چہرے کے داغوں " سے مراد عظیم صاحب کی ان چہرے کے داغوں سے ہے جنہیں جوش نے " یادوں کی برات " میں اپنے بارہ معاشقوں اور جنسی بے راہ رویوں کے ذریعہ نمایاں کیا ہے۔ عظیم صاحب چاہتے ہیں کہ اقبال کا چہرہ بھی جوش کی طرح داغدار ہوتا۔ شاید جوش ملیح آبادی کی قادر الکلامی اور ان کی عظیم المرتبت شاعر ہونے کے اسباب بھی ان کے یہی چہرے کے داغ ہیں۔ اقبال نے اپنے چہرے کے داغوں کو کبھی نہیں چھپایا۔ اس نے کبھی انکار نہیں کیا کہ وہ نتھو کا بیٹا ہے جن کا پیشہ درزی کا تھا اس نے اپنے باپ کی تعریف کی تو یہ قابل تعریف بات ہے نہ کہ قابل مذمت۔

اقبال ایک عظیم شاعر تھے اور ایک عظیم انسان بھی۔ انہوں نے اپنے چہرے کے داغوں کو کبھی نہیں چھپایا۔ کئی زبانیں جانتے تھے اور عربی زبان و ادب میں ام اے میں اول آنے کے باوجود کچھ باتوں کو سمجھنے کے لئے بقول عظیم فیروز آبادی ایک مولوی سے ابن عربی کی فصوص الحکم پڑھی۔ انہیں اسلام مذہب پر عبور حاصل تھا اس کے باوجود پروفیسر غلام مصطفےٰ تبسم کے نام خط میں لکھتے ہیں " میری مذہبی معلومات کا دائرہ محدود ہے ،، یہ اقبال کی تواضع اور انکساری۔ مولانا مودودی نے اسلام کے سلسلے میں بہت کچھ لکھا ہے بلکہ وہ جماعت اسلامی کے بانی بھی ہیں۔ لیکن ایک حدیث کی صداقت کا انکشاف مولانا مودودی پر اقبال ہی کے ذریعہ ہوا جس کا اقرار بھی مودودی نے کیا ہے۔ سید سلیمان ندوی اقبال کی کتابوں پر تبصرہ کے وقت جو اعتراضات کرتے تھے اس کا جواب اقبال نے مستند کتابوں کے حوالوں اور اتنے ثبوت کے ساتھ دیا ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ کتابیں سید سلیمان ندوی کی نظر سے نہیں گزریں۔ ورنہ وہ اقبال پر اعتراض نہیں کرتے۔ اقبال کے کچھ اور روشن پہلو ہیں، انہوں نے پروفیسر کی ملازمت سے محض اس لئے استعفیٰ دیدیا تاکہ وہ آزادانہ فرنگیوں کے خلاف لکھ سکیں۔ انہیں جب سر کا خطاب دیا جانے لگا تو انہوں نے خاموشی سے لینا گوارا نہیں کیا۔ بلکہ اپنے استاد کے لئے شمس العلماء کے خطاب کی شرط بھی رکھ دی اور

صلاحیت کی ثبوت کے لئے خود اپنے آپ کو پیش کیا۔ اقبال کو نظام حیدرآباد نے وظیفہ بھیجا تو لینے سے انکار کر دیا
انہیں پتہ چل گیا تھا کہ روپیہ زکوٰۃ کا ہے۔ اقبال کی غیرت نے اسے لینا بھی گوارہ نہیں کیا۔

جناب عبدالمغنی نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ اس نے (اقبال نے) اپنے توکل کی بنا پر دنیا سے بقدر ضرورت حصہ
ڈمراؤں مہاراج اور سری جی کے درمیان ایک مقدمہ کے سلسلے میں اقبال کو بھی بلایا گیا تھا۔ اقبال آرہ تشریف
تے اس زمانہ میں بھی ایک دن کا اقبال کو ایک ہزار معاوضہ ملتا تھا اقبال قانونی طور پر پانچ روز ٹھہر سکتے تھے
روکا بھی جارہا تھا لیکن وہ اپنا کام ایک ہی روز میں کر کے لوٹ گئے۔ انہوں نے کہا کہ مزید دنوں کے لئے معاوضہ
نہیں گوارا نہیں۔

عبدالمغنی نے بجا فرمایا ہے "تنقید میں شعراء کے بیانات پر انحصار نہیں کرنا چاہئیے" کیونکہ شاعر کبھی تعلّی سے کام
ہے اور کبھی انکساری سے۔ اگر انہیں تسلیم کر لیا جائے تو تنقید کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔ خود عظیم صاحب کے قادر
م اور عظیم المرتبت شاعر جوش اپنی شاعری کے بارے میں کیا بیان دیتے ہیں ملاحظہ ہو ؎

میری کائنات شاعری کی نیو بھی سنگ فتور
ایک طفلانہ بلوغ ایک کھوکھلا سن شعور

م صاحب اپنے قادر الکلام اور عظیم المرتبت شاعر جوش کے اس بیان پر انحصار کریں گے؟ شاید کلیم الدین
س کے اس بیان پر انحصار کیا تھا۔ اسی لئے وہ کہتے ہیں "جوش کے پاس الفاظ کا کھوکھلا ڈھول تھا جسے انہوں نے
رسے بجایا"۔ اور ثبوت میں کلیم الدین نے مندرجہ بالا شعر بھی پیش کیا تھا۔

غالب نے ایک جگہ کہا تھا "گر نہیں ہیں میرے اشعار میں معنی نہ سہی"۔ کیا اس پر انحصار کر لینا چاہئیے۔ اور پھر
نے بھی تو کہا تھا "مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ"۔ اگر اقبال کی شاعری شاعری نہیں۔ تو بیسویں صدی
ں شاعر کی شاعری کو شاعری کہیں۔ میرا تو دعویٰ ہے اقبال بیسویں صدی کا عظیم ترین شاعر ہے۔ اس صدی میں
ے بڑا شاعر دنیا کے کسی حصہ میں پیدا نہیں ہوا ہے۔ میرے اس دعویٰ کی تصدیق ایک انگریز ناقد ہربرٹ ریڈ۔
HERBERT یوں کرتا ہے:

"ادھر ہمارے ملک کے مشاہیر تو کیٹس کے زمانہ کی پرانی ڈگر پر چلے جارہے ہیں۔ اور بلبلوں اور پرندوں
اور دوسرے چھوٹے چھوٹے موضوعات پر نظمیں لکھ رہے ہیں۔ اور ادھر لاہور میں ایک ایسی نظم
(اسرار خودی) شائع ہوئی ہے جس نے ہندوستان کے مسلمان نوجوانوں پر پوری طرح تسلط کر لیا
ہے۔ ایک نوجوان مسلمان لکھتا ہے کہ اقبال اس عہد کا مسیح ہے جس کی آتش نفسی نے مُردوں کو
زندہ کر دیا ہے۔ یہ معجزہ اس قسم کی ظاہری کشش کا مرہون منت نہیں جو مبلغوں اور دنیا کو نجات کا
پیغام دینے والوں کے لئے مخصوص ہے۔ یہ اعجاز ایک نظم نے دکھایا ہے۔ جس کے حسن و جمال کے آئینہ
میں فلسفۂ جدید کے اکثر پہلو منعکس نظر آتے ہیں۔ اس میں خیالات کی روانی ہے لیکن اتحاد پایا جاتا
ہے اور اس کی منطق ساری کائنات کے لئے آوازِ غیب کا حکم رکھتی ہے"۔

لیکن تحقیق میں اختصار کرنا چاہئے۔

جہاں تک اقبال کے اصل و نسل کا تعلق ہے ڈاکٹر اکبر حیدری کے مقابلہ میں شیخ عبداللہ اور شیخ بہادر سپرو زیادہ مستند ہیں۔ خاص کر شیخ بہادر سپرو جن کی گوت اوپر چل کر اقبال کی گوت سے مل جاتی ہے۔ جگن ناتھ آزاد "محمد اقبال ایک ادبی سوانح" میں لکھتے ہیں:

"اردو زبان و ادب کا شوق رکھنے والوں کے لئے یہ بات بڑی دلچسپی کا باعث ہوگی کہ چند پشتیں اوپر جاکر سر محمد اقبال اور ہندوستان کے مایۂ ناز وکیل اور ادیب سر تیج بہادر کا گھرانہ ایک ہی ہو جاتا ہے۔ اقبال کے دادا شیخ محمد رفیق کشمیری رواج کے مطابق "رفیقا" کے نام سے مشہور تھے۔"

عظیم فیروزآبادی اپنے خط کے آخر میں لکھتے ہیں "پروفیسر جگن ناتھ آزاد یا ڈاکٹر جاوید اقبال میری یا ان کی دستگیری ہی نہیں کر سکتے"

ہے ادب شرط منہ نہ کھلوائیں
ہم نے سب کا کمال دیکھا ہے

اس کو کہتے ہیں منہ چڑھانا اور اپنے منہ میاں مٹھو بننا۔ اور ساتھ ہی دوسروں پر کیچڑ اچھال کر اپنے چہرے کے داغ چھپانا۔ اگر واقعی عظیم صاحب آزاد اور جاوید سے بڑھ کر "کمال" رکھتے ہیں (ان کے حمد اور شعر سے تو یہی پتہ چلتا ہے) تو اقبال کے مطالعہ کے سلسلے میں دنیا کے مختلف ممالک میں جو انجمنیں قائم ہیں ان میں شرکت کے لئے آزاد اور جاوید کو بیکار ہی بلایا جاتا ہے۔ ماہر اقبال اور اقبال شناسی کے سلسلہ میں صرف ایک شخص کو بلاتے یعنی عظیم فیروزآبادی کو رہے نام اللہ کا۔

تاج پیامی (گیا)

سہیل ہمیشہ سے میرے مطالعے کا خاص حصہ رہا ہے میں نے پہلی بار کسی رسالے میں یہ بات محسوس کی ہے کہ کسی مکتبۂ فکر کا ہمنوا ہوتے ہوئے بھی سہیل نے غیر جانبداری کے اصولوں کو اپنا کر ادب کی صحیح سمت کی مکمل نشاندہی کی ہے۔ اور یہ بات ہی سہیل کی عظمت دلانے کے لئے کافی ہے۔ اولیس سنبھلوی مرحوم کے زمانے میں بھی سہیل اسی شان سے ہوتا رہا اور اب اولیس مرحوم کے دونوں صاحبزادے یعنی جمیل منظر اور مسعود منظر کی نگرانی میں بھی یہ غیر جانبداری کے اصولوں کو لے کر بڑی ارتقائی منزلیں طے کر رہا ہے۔ غیر جانبدارانہ رویئے کا کھلا ثبوت تازہ شمارہ (فروری ۱۹۸۶ء) کا وہ خط ہے جو عظیم فیروزآبادی نے مدیر اعلیٰ کے نام تحریر کیا ہے۔ یہ میری بدقسمتی ہے اور میں اسے اپنے مطالعے کا عیب بھی تصور کرتا ہوں کہ میں نے اس سے قبل کبھی عظیم فیروزآبادی کا نام نہیں سنا تھا۔ موصوف اقبال کے رقیب ہیں یا نہیں۔ مجھے اس سے کوئی مطلب نہیں۔ مگر اقبال کے بارے میں جو ان کا نظریہ ہے میں اس سے کسی طور پر متفق نہیں ہوں۔

"پاکستان میں ہی نہیں ہندوستان میں بھی ہر ذی عقل اچھی طرح سمجھتا ہے کہ سستی شہرت اور مقبولیت حاصل کرنے کا آسان نسخہ یہ ہے کہ اپنا شمار اقبال کے مداحین میں کرا لیا جائے۔"

مجھے موصوف کے ساتھ پوری پوری ہمدردی ہے کہ انہوں نے اس آسان نسخے کو نہیں آزمایا۔ اور اس لئے وہ شہ

اور مقبولیت حاصل نہیں کر سکیں۔ جو دوسرے حاصل کر رہے ہیں۔ دنیٔے نسرتا!
میں خود بھی اقبال کے مداحین میں ہوں اور اس بات کا دم بھرتا ہوں کہ ؎

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

ب اس تشریح کی کوئی ضرورت نہیں کہ اقبال نے اردو ادب کو کیا دیا۔ اردو شاعری کو کیا دیا۔ اقبال وہ دریا بیکراں ہوا تھا
اس پر جتنا بھی فخر کریں کم ہے کھوئے ہوؤں کی جستجو اور آتش رفتہ کے سراغ کا یہ شاعر صدیوں میں کبھی کبھار ہی
پیدا ہوتا ہے۔ میرا بس چلے تو اقبال اس عظیم شخصیت کی تشبیہہ یا قمت مسیحا کا ہیولہ - SPECTER OF APO-
CALYPSE - سے دوں۔ اہل بصیرت کی دھندلی آنکھوں سے شکوہ ہے کہ اپنے باخبر ہونے کے راز سے وہ اب تک
شناسا نہیں ہوئے۔ مجھے ان بولے نا قدوں پر ترس آتا ہے جو اقبال شکنی کا الزام اپنے سر لے کر خوشی سے پھولے نہیں سمایا
تے ہیں۔ کالرج اور اس طرح کے دوسرے نقاد شکسپیر کے بارے میں ایک بھی غلط بات برداشت نہیں کر سکتے۔ کالرج نے
یہاں تک کہا ہے کہ وہ انگریز کا بچہ نہیں ہے جو شکسپیر کی عظمت سے انکار کرتا ہے۔ وہاں اپنے مستند اور معتبر شاعر
ادیبوں کی خامیوں کو چھپانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ہمارے یہاں زبردستی خامیاں تلاشنے کی مہم جاری ہے۔ عیب
دں یا نہ ہوں مگر عیب گنائے جائیں گے۔ اور کبھی کبھی جب عظیم فیروز آبادی صاحب جیسے اہل نظر کا اس طرح کا خیال کوئی
نظر سے گزرتا ہے۔ تو ماتم کرنے کو جی چاہتا ہے۔ اگر عظیم صاحب اس بات پر زور دیتے ہیں کہ اقبال کی مستند سوانح
حیات لکھی جائے کہ ہر بڑے شخص کی سوانح حیات قلم بند کی گئی ہے۔ اگر اقبال اس درجے کا شاعر تھا تو یہ ضروری ہے کہ ان
سوانح حیات بھی قلم بند کی جائے۔ اور پھر وہ خود ہی یہ رائے بھی قائم کر لیتے ہیں کہ اقبال کی چونکہ سوانح حیات نہیں لکھی
ئی ہے یا پھر مغنی صاحب جیسے نقادوں نے اقبال پر موٹی موٹی کتابیں ضرور لکھیں مگر سوانح حیات قلم بند کیوں کہ وہ
است نہ کر سکے۔ تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ بھی اقبال کی ذاتی زندگی کے لغزشوں سے آگاہ تھے اس سے اقبال کی تہہ دار
شخصیت کا بھی اندازہ ہو جائے گا اور ان کے چور پہلوؤں اور نیز باطن کی پوشیدہ امنگوں اور آرزوؤں کا بھی پتہ چل
جائے گا۔

یہ عظیم صاحب کے خیالات ہیں۔ عظیم صاحب اقبال کی شاعری سے الگ ان کے چور پہلوؤں کے بارے میں
ننے کے لئے زیادہ فکر مند نظر آتے ہیں۔ شاید وہ اقبال کی شاعری کو ان کی ذاتی لغزشوں میں ٹٹولنا چاہتے ہیں اور
یہی وجہ ہے کہ وہ مثال شائے کی بایوگرافی کی طرح اقبال کی بایوگرافی کو مرتب کرنے میں زیادہ دلچسپی لیتے ہیں اور اسے قرار
واقعی دیتے ہیں۔ افسوس آتا ہے عظیم صاحب کے دماغ پر اور ترس بھی آتا ہے۔ اقبال، اقبال سے آگے کوئی نہیں تھا۔ وہ
سے آگاہ ہونے کے لئے تفصیل بتانا ضروری ہے کہ مشہور واقعہ ہے کہ وہ کچھ سیاح فرید کو بتا کر تے تھے اور بات کر تے تھے
یا کرتے تھے و لیکن کتنے ہی پیر اور اولیا ہیں جن کے ظاہر اور باطن کو سمجھنے میں تصوف کی ہر ایک بھول بھلیاں
بت نہیں ہو سکتی ہے۔ اس کے لئے اس مقام کا تعین ضروری ہے کہ مقام پر وہ شخصیت ہے۔ اب چاہے منصور
ملاح ہوں یا شبلی۔ سب ایک مقام بابرکت کے مالک تھے۔ کچھ کہا جاتے ہیں جو ظاہر سے بادشاہ دکھتے ہیں

اور باطن میں فقیر۔ فقر میں شاہی تو عام سی چیز ہے۔ مگر شاہی میں فقیری کا مرتبہ جب بلند ہے یہ تصوف کی باتیں ہیں۔ اسے اللہ والے ہی جانیں۔ میں اقبال کو بھی اسی مقام اعتبار پر جلوہ افروز دیکھتا ہوں۔ جہاں اس کا ظاہر اور باطن دونوں ایک ہو گیا ہے۔ اور دونوں مل کر وہ فلسفۂ خودی بن گیا ہے۔ جو ایک پوری قوم کے لئے مشعل راہ ثابت ہوئی۔ لغزشیں کس سے نہیں ہوتیں مگر ان لغزشوں سے انسان سنبھلتا ہے۔ جب کبھی سنبھلنے کے بعد اپنا محاسبہ کرتا ہے۔ تو وہ ان لغزشوں کے تار عنکبوت سے دور نکلنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ وہ مقام ہوتا ہے جہاں وہ شاہین بننے کے لئے ساتویں آسمان کے در کھول دیتا ہے ہوسکتا ہے اقبال سے ایسی عام لغزشیں سرزد ہوئی ہوں غلطیاں ہوئی ہوں تو ہم اس کا بھی احترام کرتے ہیں۔ کہ شاعری کو پیغمبری کا درجہ دینے والے نے اپنے لئے کبھی لغزشوں کا راستہ اپنایا مگر وہیں نہیں رہا بلکہ اسے چھوڑ کر اپنی روح کے لئے ایک ایسے نئے پیکر کی تلاش شروع کی جو ہر طرح کی غلطیوں سے پاک تھا۔ اور جس کا عکس اس کی الہامی شاعری میں تھا اقبال کے بارے میں یہ بھی افواہ ہے کہ اس نے شراب پی ہے۔ ہوسکتا ہے پی ہو۔ مگر اس کا کوئی واضح ثبوت نہیں ملتا اور اگر کبھی پی بھی ہو تو محض اس وجہ سے میں یہ کہنے کی غلطی نہیں کرسکتا کہ وہ (اقبال) فضائل کے اعتبار سے قابل ذکر انسان نہ تھا۔ تحقیق کا تقاضا ہے کہ معلومات مکمل ہوں اور ٹھوس ہوں۔ پوری جانچ پڑتال کے بعد کوئی بات کہی جائے۔

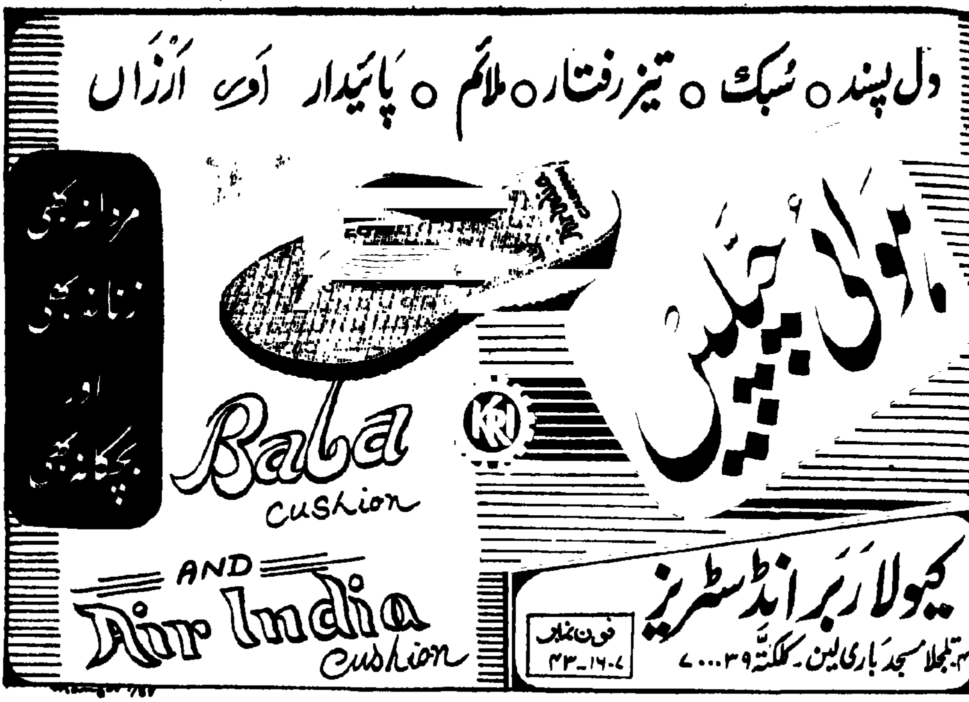
یہ بے ہودہ باتیں ہیں ایک عظیم شخص پہ تہمت ہے۔ الزام ہے۔ عظیم صاحب کو چاہئے کہ وہ ادب سے کنارہ کشی اختیار کرلیں۔ اس لئے کہ علم میں ابھی وہ سمجھنے کی قوت پیدا نہیں ہوئی کہ ہم اپنے عہد کے اس عظیم شاعر کے بارے میں ایک کلمہ شکایت بھی سن سکیں۔ جہاں تک بایوگرافی کی بات ہے وہ ضرور لکھی جانی چاہئے تھی اور لکھی بھی جانی چاہئے۔ میں اس بات سے اتفاق رائے رکھتا ہوں۔ اس سے اقبال کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کی عکاسی ممکن ہو سکے گی۔ مگر بایوگرافی لکھنے کے لئے وہ ہاتھ چاہیں جو آج ہم میں نہیں ہیں۔ وہ آنکھیں چاہئے جو تعصب سے پاک ہوں۔ عظیم صاحب کی بحث اتنی کمزور ہے کہ وہ لفظ و لوق کے استعمال کو درست ثابت کرنے کے لئے مغنی صاحب کو ڈاکٹر عابد رضا بیدار سے مشورے کا حکم دیتے ہیں۔ حیف...... صد حیف......

یہاں میں یہ بات واضح کردوں کہ کسی سے کوئی ذاتی بغض نہیں رکھتا ہوں۔ ہوسکتا ہے کہ اس خط سے یہ گمان گذرے کہ میں مغنی گروپ کا کوئی آدمی ہوں۔ تو میں یہ عرض کرتا چلوں کہ میرا کسی بھی گروپ سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ میں خود بھی ان کے اس مقام اعتبار پر ہوں جہاں کسی کو اپنا حریف نہیں سمجھتا بلکہ ببانگ دہل بہ انداز غیضی یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ سو

امروز نہ شاعرم حکیم ٭ دانندۂ حادث و قدیم

مغنی صاحب نے اقبال کا فلسفہ بھلے ہی پڑھا ہوں اسلام سے انہیں جیسی بھی عقیدت رہی ہو۔ مگر اس کا دل صاف نہیں ہے اس لئے میں انہیں ایک سنجیدہ مفکر اور نقاد کہنے سے ہچکتا ہوں۔ تعصب کے چشمے کا استعمال وہ آج بھی کر رہے ہیں۔ مجھے ان سے عقیدت محض اس لئے ہے کہ وہ اقبال سے عقیدت مندی کا دم بھرتے ہیں۔ ان کے خط مریخ نیر جو آج بھی جمع ہیں اور مریخ کی سیڑھی لگا کر ادب و تہذیب کے چاند کو ماند کرنے پر تلے ہوئے ہیں مجھے ان سے ہمدردی ہے اور مغنی صاحب کے مذاق حسن پر افسوس بھی آتا ہے۔

مشرف عالم ذوقی
بہادر پور اردو، آرہ


دل پسند ۰ سُبک ۰ تیز رفتار ۰ ملائم ۰ پائیدار اور ارزاں
ہوائی چپلیں
مردانہ بھی
زنانہ بھی
اور
بچگانہ بھی
Baba
cushion
AND
Air India
cushion
کیولا ربر انڈسٹریز
۴۔ تلجلا مسجد باری لین۔ کلکتہ ۷۰۰۰۳۹
فون نمبر
۴۳-۱۶۰۷

* * *


گرام: "النوری"
دُلہن مارکہ
اسپیشل
گُل
لاکھوں کا پسند
دانتوں کی حفاظت اور تازگی کے لئے
استعمال کیجئے
رجسٹرڈ نمبر
۲۳۵۴۶۱
النوری ٹوبیکو پروڈکٹس۔ جگتدل۔ ۲۴ پرگنہ

gd. No. Gay—4 Regd. with the R. N. P. at R. No. [illegible]
☎ : 1573 47 YEARS OF PUBLICATION
THE SOHAIL MONTHLY, River Side Road, Gaya - 823001

ایک

شفیع مشہدی

کے نام



ماہنامہ سہیل گیا

جون و جولائی ۱۹۸۵ء

جلد نمبر: ۴۷
شمارہ: ۶ - ۷

مدیر موسس: سلطان الحسن سنہاروی

چیف ایڈیٹر: منصور منظر سنہاروی
ایڈیٹر: جمیل منظر سنہاروی
معاونین: شکیل احمد جمالی
عبد القیوم ابدالی

مجلس مشاورت: ڈاکٹر تارا چرن رستوگی
ڈاکٹر قمر رئیس
اصغر علی انجینیئر

ناظر منظر شمسی
کلیم القاسمی

زر اشتراک: فی شمارہ ۲ روپے
سالانہ ۲۴ روپے
لائف ممبری: ۲۵۱ روپے

اس شمارہ کی قیمت: ۶/- روپے

خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ:
ماہنامہ سہیل
... گیا
... ۱۵

اس شمارہ میں

خصوصی پیش کش "ایک شمارہ شفیع مشہدی کے نام"

بہار اردو اکادمی کی تازہ مطبوعات

نمبر شمار	مطبوعات	صفحات	قیمت	روپے
1	یادگارِ سلیمان (مرتبہ عبدالقوی دسنوی)	256	25.00	"
2	انتخاب مضامینِ سرسید	88	07.50	"
3	مثنوی سحرالبیان (میر حسن)	128	08.00	"
4	نیرنگِ خیال (محمد حسین آزاد)	88	07.50	"
5	اکبر الٰہ آبادی (سیمینار میں پڑھے گئے مقالات)	277	[illegible]	"
6	نصیر حسین خیال (مقالات و مطبوعات)	272	20.00	"
7	ہندوستان کے قدیم فارسی شعرا (ڈاکٹر اقبال حسین)	164	16.00	"

اپنے یہاں کے کتب فروش

—— یا ——

اکادمی کے دفتر سے طلب کریں

جاری کردہ: محمد یونس سکریٹری بہار اردو اکادمی

۸/بی۔ سری کرشنا پوری پٹنہ۔ ۱

ایک شمارہ

شفیع مشہدی

کے نام

ترتیب

جمیل منظر شسہاروی

بہار اردو اکادمی کی کارگذاریاں

اعداد و شمار میں

نمبر شمار	مسئلہ	تعداد	مجموعی رقم	روپے
1	اشاعتی امداد سن 1972ء سے	318	8,74,814.00	"
2	مطبوعہ کتابوں پر انعام	250	2,69,550.00	"
3	کتب خانوں کی امداد	232	3,95,750.00	"
4	تعلیمی اداروں کی امداد	52	5,69,500.00	"
5	شاعروں، ادیبوں اور صحافیوں کو مالی امداد	106	2,47,800.00	"
6	ادبی انجمنوں کی امداد، تقریبات کے انعقاد کیلئے			
7	وظیفہ: اسکول کے طلبا و طالبات کے لئے	472	4,26,930.00	"
	" : کالج اور یونیورسیٹی کے طلبا و طالبات کے لئے	169		
	" : ریسرچ اسکالر کے لئے	16		
8	اکادمی ایوارڈ	31	95,000.00	"
	" (جنکی مادری زبان اردو نہیں ہے)	24	53,000.00	"

جاری کردہ:

محمد یونس
سکریٹری بہار اردو اکادمی
۸۰/۹/ـ ...ری کرشنا پوری پٹنہ

ماہنامہ سہیل، گیا

بہاریں

- سیاست صالحہ کے علمبردار
- ملک و ملت کے قافلہ سالار
- اُردو زبان اور اُردو کلچر کے محافظِ اعظم
- شعر و ادب کے رسیا
- شعرا و ادبا کے ہم نوا

میرے بزرگ اور سہیل کے مونس خداداد

جناب محمد حسین آزاد

(سابق وزیر حکومت بہار)

کی نذر

انتہائی اخلاص و احترام کے ساتھ

گر قبول افتد زہے عز و شرف

منجانب: ادارہ "سہیل" نیو سائیڈ روڈ، گیا

ہم سب ایک ہیں

ہمارا ملک نہ کسی فرقے کا ملک ہے، نہ کسی خاص مذہب کا، یہ سبھی فرقوں، زبانوں مذہبوں اور کلچر کا ملک ہے۔ ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی وغیرہ سبھی کے تانے بانے سے یہ ملک بنا ہے۔

شاعر رویندر اور قاضی نذر الاسلام یا دنکر اور اقبال سبھی نے اس کے گیت گائے ہیں۔ تلسی اور کبیر کے گیت آج بھی اس ملک کے سبھی گھروں میں گائے جاتے ہیں۔ نانک کی وانی آج بھی ہندوؤں کے گھروں کو پاک کرتی ہے۔

- مختلف کلچر پھر بھی ایکتا، یہی ہماری خصوصیت ہے۔
- یہ آج کا نہیں صدیوں کا اپنا رواج ہے۔
- یہی ہماری مریادا ہے

آئیے! ہم سبھی مل کر اس خاص رواج کو اور مضبوط بنائیں

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا

ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

सू० ज०स०नि - 41 - न (पू- 89)/85-86

عرض مرتب

ماہنامہ سہیل گیا نے عصری تخلیقی نگارشات اور عصری فن کاروں کو صحیح مقام و مرتبہ دلانے کی جو کوشش کی ہیں، ان سے قارئین اچھی طرح واقف ہو گئے۔ ہم نے ہمیشہ اس امر کی کوشش کی ہے کہ تخلیقی جوہر و جہات کا پتہ لگا کر اس کو مہمیز کریں اور اس طرح بہتر تخلیقات کی پیش کش کے لئے ایک صحت مند فضا پیدا کریں۔ ہمیں اس کام میں سخت ترین دشواریوں سے بھی واسطہ پڑا۔ ہوتا یہ ہے کہ ہم عصر فن کاروں پر قلم اٹھانے میں بہت ہیں۔ کبھی اس خیال سے کہ کہیں "ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو" اور کبھی دوسروں پر لکھتے ہوئے "شکست انا" کا احساس ہوتا ہے۔ اس کے باوجود ہم نے ماضی قریب میں جو خصوصی شمارے شائع کئے ہیں، ان کے معیار کی تمام اہل نظر قارئین نے داد دی ہے۔

یہ شمارہ ہم جناب شفیع مشہدی کے فکر و فن اور ان کی شخصیت کے لئے مخصوص کر رہے ہیں۔ شفیع مشہدی ایک ایسے فن کار ہیں جنھوں نے اپنے سفر کی ابتدا سے ہی اپنی پہچان دینی شروع کر دی تھی ——— اور یہ کہ ان کا فن وقت کے ساتھ ساتھ آگے ہی بڑھتا رہا ہے۔ ادبی دنیا کی سرد مہری اور کساد بازاری کے باوجود، نامساعد حالات سے مقابلہ کرتے ہوئے مشہدی نے جس تندہی اور تخلیقیت کے ساتھ شاعری، افسانہ نگاری، ڈرامہ نگاری اور بعض دوسرے شعبوں میں اپنا مقام محفوظ کرا لیا ہے۔ اس سے ہم بہت واقف ہیں، ایسے میں ان کے سفر کے سنگِ میل کی نشاندہی کر رہے ہیں اور دوسری طرف سرمند ناز پر ایک اور تازیانہ کے طور پر انھیں بہتر سے بہتر تخلیقات کی تخلیق کے مواقع ہاتھ آ رہے ہیں۔ اس طرح ہمیں یقین ہے کہ اس نمبر کے لئے ادبی تخلیقات سے دلچسپی رکھنے والے اور کاروانِ ادب کو رواں دواں دیکھنے والے حضرات ہماری کوششوں کو سراہیں گے ——— اور ہمارا سب سے بڑا انعام یہی ہے کہ ادب کے قارئین سہیل کو پڑھیں اور اپنی پیاس بجھائیں۔ جمیل منظر سکندرآبادی

مسعود منظر روس کے لئے روانہ سہیل کے چیف ایڈیٹر جناب مسعود منظر ۱۲ویں انٹرنیشنل یوتھ فیسٹیول میں شرکت کرنے کے لئے ہندوستانی وفد کے ساتھ ماسکو (روس) تشریف لے گئے ہیں۔ موصوف کا روس میں قیام ۲۳ جولائی سے ۱۰ اگست تک رہے گا۔ فیسٹیول میں شرکت کرنے کے بعد وہ روس کے ادیبوں اور دانشوروں سے بھی ملاقات کریں گے۔

(ادارہ)

ایک شمارہ شیخ شہری کے نام

• کے لئے •

بصد خلوص اور نیک خواہشات کے ساتھ ــــ

سلیم انصاری

• پروپرائٹر •

ویسٹرن ایسوسیٹس الیکٹریکل انڈسٹریز
ججیہ روڈ، گیا

فون
آفس ــــ ۳۳۱
رہائش ــــ ۵۸۱

جمیل منظر سنسہاروی

(انٹرویو)

شفیع مشہدی سے ایک ادبی ملاقات

ج۔م: آپ کی پیدائش کب اور کہاں ہوئی؟ آپ کے آباد اجداد کا تعلق کس علاقے سے ہے؟ آپ کی تعلیم و تربیت کہاں ہوئی؟ اور خاندانی حالات کے بارے میں کچھ بتایئے؟

ش۔م: میری پیدائش ۱۹۳۹ء میں گیا میں ہوئی۔ میرے والدین بہار کے ہی رہنے والے تھے۔ والدہ کا تعلق میتھو شریف سے تھا۔ حضرت چاند شاہ صاحبؒ کے سایۂ شفقت میں ان کی پرورش ہوئی تھی۔ اس لئے ان کے مزاج میں بھی فقیری کی صفتیں موجود تھیں۔ ہمارا خاندان گیا شہر کے تاریخی محلے عالم گیر پور المعروف بہ نادرہ گنج میں آباد تھے۔ ابتدائی تعلیم گیا ضلع اسکول اور ہادی ہاشمی اسکول میں ہوئی۔ گیا کالج میں بھی رہا اور پھر تعلیم کے سلسلے میں دہلی یونیورسٹی چلا گیا۔

والد کا سلسلۂ نسب مشہد (ایران) سے وابستہ ہے مطلب یہ کہ اجداد مشہد سے تشریف لائے تھے۔ اس لئے میں اپنے نام کے ساتھ مشہدی لکھتا ہوں۔

ج۔م: آپ کی تخلیقات میں انسانی زندگی کے بیشتر مسائل نمایاں ہیں تو آپ یہ بتایئے کہ "ادب برائے ادب" اور "ادب برائے زندگی" دونوں میں کس بات سے آپ متفق ہیں؟

ش۔م: میں بنیادی طور پر ادب برائے ادب یا ادب برائے زندگی جیسی تشریحات سے ادب کو خانوں میں بانٹنے کا قائل نہیں ہوں۔ ادب اور چولی دامن کا ساتھ ہے۔ نہ زندگی کے تقاضوں سے پہلو تہی ممکن ہے اور نہ ادب کے اصولوں سے نظر انداز کر کے ادب کی تخلیق ممکن ہے۔ فن کار اپنے اردگرد کے مشاہدوں اور احساسات کی ترجمانی کرتا ہے اور جو فن کار پوری دیانت داری سے ان اصولوں کو برتتا ہے اسی کو سچا فن کار کہا جاتا ہے۔ کسی ازم یا تحریک کی تقلید کرنے والے کو میں فن کار کی صف سے باہر سمجھتا ہوں۔

ج۔م: ترقی پسند تحریک اور جدیدیت ان دونوں نے اردو ادب پر جو اثرات مرتب کئے ہیں اس کے تناظر میں آپ کا کیا خیال ہے؟

ش۔م: ترقی پسند تحریک نے اردو ادب کا رخ ہی موڑ دیا تھا۔ گل و بلبل اور سطحی رومانیت میں ڈوبے ہوئے ادب کو زندگی کی حقیقتوں سے اس نے آشنا کیا اور ایک صحت مند رجحان کی بنیاد ڈالی۔ یہ اور بات ہے کہ اس کا کچھ حصہ پروپیگنڈا اور ایک مخصوص نظریے کی اشاعت کی بھینٹ چڑھ گیا اور اکثر لوگ فیشن کے طور پر اس کی تقلید کرتے گئے۔ غالباً اسی طور پر کچھ لوگوں نے اس کا ساتھ چھوڑا اور ایک نئی اصطلاح جدیدیت کے نام سے سامنے آئی۔ جدیدیت جہاں تک جدید حسیت اور عصری آگہی کا نام ہے اس سے کوئی کافر ہی انکار کر سکتا ہے۔ نئے استعاروں، نئی علامتیں اور نئے استعا

[illegible] اُردو ادب کو الامال کیا ہے۔ اس کے باوجود جدیدیت کے نام پر السیعدھٹ پٹانگ قسم کی چیزیں بھی سامنے آئی ہیں جنہیں نہ جدیدیت کہا جا سکتا ہے اور نہ ادب۔

ج۔م: اُردو کے مستقبل کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

ش۔م: اردو کا مستقبل اُردو داں طبقے کے ہاتھ میں ہے۔ اُردو آزادی سے پہلے بھی ہندوستان کی سرکاری زبان نہیں تھی اور اب بھی نہیں ہے، اُردو کے اندر جو قوتِ نمو ہے اسی نے اسے زندہ رکھا ہے اور اب تو یہ زبان اس قدر پھیل چکی ہے اور اتنی ترقی یافتہ ہو چکی ہے کہ اسے مٹانا ممکن نہیں اس لئے مستقبل کی طرف سے مایوسی نہیں ہے۔

ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ محض زبانی ہمدردی سے کام نہیں چلنے والا۔ اُردو کے چاہنے والوں کو فعال ہونا چاہیئے اور اس کی نشو و نما میں لگے رہنا چاہیئے۔ اس کے حقوق کے لئے لڑائی لڑنی ہوگی اور اس زبان کے ساتھ جو متعصب طبقہ دشمنی کر رہا ہے اس کے ارادوں کو ناکام بنانا ہوگا۔

ج۔م: کچھ لوگ اُردو رسم الخط ہی بدل دینے کی بات کرتے ہیں۔ اس سلسلہ میں آپ کی کیا رائے ہے؟

ش۔م: رسم الخط بدلنے کی بات انتہائی لغو ہے اور اسے اُردو دشمن تحریک کہا جا سکتا ہے۔

رسم الخط زبان کا حسن ہے، اس کی انفرادیت ہے۔ اگر انفرادیت کو ختم کر دیا جائے تو باقی کیا رہ جاتا ہے۔ مگر اتنا ضرور کہوں گا۔ رسم الخط کی دشواریوں اور خامیوں کو دور کیا جانا چاہیئے اور اس طرف ماہرانِ لسانیات کو توجہ دینی چاہیئے۔

ج۔م: بہار میں اُردو زبان کو دی گئی مراعات سے آپ کس حد تک مطمئن ہیں؟

ش۔م: بہار میں اُردو زبان کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ ملنے سے ایک بہت بڑا نفسیاتی فائدہ پہونچا ہے۔ اُردو داں حلقوں میں ایک خود اعتمادی پیدا ہوئی ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ سوائے اس کے کہ کچھ لوگوں کو نوکری مل گئی اور کوئی خاص فائدہ نہیں ہوا۔ جو مراعات دی گئی ہیں زیادہ تر فائلوں اور سرکلروں میں ہی رہ گئی ہیں، ان [illegible] نہیں ہو سکا ہے۔ میرا تجربہ تو یہ ہے کہ خود اُردو والے ان مراعات سے فائدہ کبھی نہیں اٹھاتا ہے۔ ایک تکلیف دہ سرد مہری اور بے نیازی کی حالت ہے۔ میں کچھ دن پہلے تک سب ڈویژنل مجسٹریٹ تھا جہاں اُردو دوسری [illegible] تھی مگر درخواستیں اُردو میں دینے والا ہی نہیں۔ میری کوششوں کے بعد یہ سلسلہ کچھ شروع ہوا تھا اس سے قطعی مطمئن نہیں تھا۔ حیرت کی بات یہ ہے مجھے یہ بتایا گیا کہ میرا سب ڈویژن بہار میں نمبر ایک ہے۔ اگر اوّل کی یہ حالت تھی تو آخر اور دوسرے ضلعوں کا حال آپ خود سمجھ لیں۔

بہرکیف یہ ایک بڑا کام ہوا ہے اور اُردو داں طبقہ کو اس سے فائدہ اٹھانا چاہیئے۔

ج۔م: بہار کے ادیب اور شاعر آج ہندوستان کے دوسرے علاقوں کے مقابلہ میں زیادہ بہتر تخلیقات پیش کر رہے ہیں آپ کا کیا خیال ہے؟

ش۔م: میں بہار اور دوسرے علاقوں کے ادیبوں کا مقابلہ نہیں کروں گا۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ بہار کے ادیب و شاعر بہتر ادب پیش کر رہے ہیں۔ ہندوستان کا کوئی بھی ایسا ادبی رسالہ نہیں ہے جس پر بہار کے فن کاروں کا نقش موجود نہیں۔ یہ صورتِ حال بڑی خوش آئند ہے۔

ج۔م: بنیادی طور پر آپ افسانہ نگار ہیں۔ یہ بتائیے اُردو افسانہ نگاری کی جدید روش آپ کو کس حد تک مطمئن کرتی ہے؟

ش۔م: بات گھوم پھر کر پھر وہیں آجاتی ہے کہ [illegible] ine writing نے غیر جینوئن کیا ہے؟ جدید سے مجھے انکار نہیں مگر جدیدیت کے نام پر کچھ لوگ لکھ رہے ہیں اسے افسانے کے صف میں نہیں رکھا جا سکتا میں اس سے غیر مطمئن ہوں۔

ج۔م: اُردو افسانوں پر جو تنقید لکھی جا رہی ہیں کیا

سے آپ مطمئن ہیں ؟

ش۔م: حقیقت یہ ہے کہ اُردو میں تنقید بہت کم لکھی جاتی ہے۔ زیادہ تر یہ تبصرہ ہوتا ہے یا پھر تعریف یا تضحیک۔ اسی شمارے میں میرا ایک مضمون بھی تنقید سے متعلق شائع ہو رہا ہے۔ ہر چند کہ وہ طنزیہ مضمون ہے مگر اس میں کچھ حقیقتیں بھی پنہاں ہیں۔ البتہ کچھ تنقیدی مضامین ضرور آئے ہیں

ج۔م: کچھ لوگ اُردو افسانے کی ابتدا بیسویں صدی کی دوسری دہائی مانتے ہیں۔ حالاں کہ انیسویں صدی کے آخیر میں ہی یلدرم کے افسانے وجود میں آچکے تھے اور وہ افسانوں میں اہم مقام رکھتے ہیں۔ اُردو افسانوں کی ابتدا کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے ؟

ش۔م: یہ اہم بات ہے کہ یلدرم کے افسانے (ترجمے) کے افسانے میں بڑا فرق ہے مگر اسے افسانوں کی ابتدا ضرور مانتا ہوں۔

ج۔م: اُردو میں خواتین افسانہ نگاروں کی تعداد پہلے تو بہت ہی کم تھی مگر ادھر اس میں خاصہ اضافہ ہوا ہے۔ شفیق بانو شفیق جیسی خواتین نے اس دور میں افسانے لکھنے اور شائع کرانے کی جرات کی جب سماج عورتوں کی اس کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ عصمت چغتائی پہلی افسانہ نگار ہیں جن کی جرأت و بے باکی نے کئی نسلوں کے حوصلے بلند کئے ہیں۔ قرۃ العین حیدر نے تمام افسانہ نگاروں کو پیچھے چھوڑ کر ایک ایسی امتیازی حیثیت حاصل کرلی ہے جو خصوصاً خواتین کے لئے بے حد حوصلہ افزا ہے۔

عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر، شکیلہ اختر اور جیلانی بانو کا نام اہم افسانہ نگاروں میں لیا جاسکتا ہے۔ ادھر کچھ نئی اہم لکھنے والیاں افسانہ نگار خواتین میں ذکیہ کا نام لیا جاسکتا ہے۔

ج۔م: مسعودی صاحب! آپ شاعری بھی کرتے ہیں شاعری کی وجہ خاندانی شعری ماحول اور روایت ہے یا کچھ مخصوص واقعات و حادثات جو آپ کی شاعری کے لئے محرک ہوئے ؟

ش۔م: میرے خاندان میں شاعری کا نہ تو ماحول تھا اور نہ روایت۔ ادبی ذوق مجھے اپنے بڑے بھائی بدیع مشہدی صاحب سے ملا۔ مجھے شاعری کی طرف کسی مخصوص واقعہ یا حادثے نے نہیں کھینچا بلکہ دورانِ طالب علمی مشاعروں سے تحریک لی۔ اور احساسات کی ترجمانی کا ذریعہ بنی۔ چونکہ بہت حد تک یہ میری ذات سے وابستہ رہی۔ اسی لئے میں نے اس کی اشاعت سے ہمیشہ گریز کیا۔ شاید پہلی بار سہیل کے اس نمبر میں اسے رسوا کر رہا ہوں ورنہ اب تک یہی کہتا رہا تھا کہ افسانے اور ڈرامے دوسروں کے لئے لکھتا ہوں اور شاعری اپنے لئے۔

ج۔م: شاعری کے لئے آپ نے کن حضرات کی رہنمائی میں فرمائی ؟

ش۔م: کسی کی نہیں۔ فیض سے بے حد متاثر تھا اور اب بھی ہوں۔ میری رہنمائی میرے اپنے احساسات نے کی ہے۔

ج۔م: آزاد غزل اور نثری نظم کے بارے میں آپ کے کیا تاثرات ہیں ؟

ش۔م: آزاد غزل اور نثری نظم دونوں کے بارے میں میری اچھی رائے نہیں ہے۔ ابھی تک کسی آزاد غزل یا نثری نظم نے مجھے متاثر نہیں کیا ہے۔

ج۔م: کلیم الدین احمد مرحوم نے غزل کو نیم وحشی صنف قرار دیا ہے۔ اس سلسلے میں آپ کی کیا رائے ہے ؟

ش۔م: میں غزل کو ایک خوبصورت صنف شاعری سمجھتا ہوں۔ کلیم الدین احمد مرحوم بہت بڑے ناقد اور اسکالر تھے میں بہت چھوٹا آدمی ہوں۔ مگر ان کی اس رائے سے میں بالکل متفق نہیں ہوں۔ مجھے آپ یہ حق دیتے ہیں یا نہیں ؟

ج۔م: غزل اور نظم میں آپ کس صنف کو اظہار خیال کے لئے بہتر سمجھتے ہیں ؟

ش۔م: میں سمجھتا ہوں یہ ایک حد تک ذاتی تجربے کی بات ہے۔ مجھے نظم کی وسعت زیادہ پسند ہے۔ میں نے یہ محسوس کیا ہے کہ غزل میں اکثر مجھے تنگیٔ داماں کی شکایت

ہو جاتی ہے جب کہ نظم کا کینوس مجھے زیادہ سازگار نظر آتا ہے۔

ج۔م: کہتے ہیں کہ شاعری الہام کا دوسرا نام ہے۔ آپ کی کیا رائے ہے؟

ش۔م: میں شاعری کو الہام کا دوسرا نام نہیں مانتا ہوں۔ یہ شعوری عمل ہے۔ شاعر کے اپنے احساسات و مشاہدات اور تخیلات سے شعر کی تخلیق ہوتی ہے۔ اسے الہامی کہنا مناسب نہیں ہے۔

ج۔م: مشاعرے کے سلسلے میں آپ کی رائے ہے؟ اور کیا اس سے اردو زبان کو فائدہ پہنچ رہا ہے؟

ش۔م: شاعری کے لئے مشاعرہ نقصان دہ اور اردو زبان کی اشاعت کے لئے سودمند ہے۔

مشاعروں میں عامیانہ شاعری اور گلوکاری پر ملنے والی واہ واہ شاعر کے ذہنی سفر کو روک دیتی ہے وہ اسے ہی منزل سمجھ لیتا ہے۔ اور عام لوگوں کے ذوق کو مدنظر رکھکر شاعری کرتا ہے۔ اچھی تخلیق کے لئے یہ زہر کا کام کرتی ہے۔

ج۔م: کوئی خوبصورت گلوکارہ آپ کی غزل آپ کے روبرو بہت دلکش انداز سے گا رہی ہو تو آپ کو کیسا لگے گا؟

ش۔م: بہت اچھا لگے گا۔ کیا یہ کہنے کی ضرورت ہے؟

ج۔م: اردو ڈراموں کے مستقبل کے بارے میں آپکا کیا خیال ہے؟

ش۔م: اردو ڈراموں کے مستقبل کیا ہوگا یہ تو کہنا مشکل ہے مگر آثار اچھے ہیں اس لئے کہ اب ہم اس مؤثر ترین وسیلے کی اہمیت کا اندازہ کرنے لگے ہیں۔ اور اسٹیج کے علاوہ اب ایک نیا اسکوپ ٹی۔وی کی صورت میں سامنے آیا ہے۔ نئے لوگ اس طرف متوجہ ہیں اس لئے مستقبل اچھا ہی نظر آتا ہے۔

ج۔م: آپ نے اپنے بیشتر ڈراموں میں اصلاحی خیالات پیش کئے ہیں کیا یہ سمجھا جائے کہ آپنے یہ ڈرامے ریڈیو کے لئے لکھے ہیں؟

ش۔م: میں کوئی ریفارمر نہیں ہوں اور نہ مجھے ہپوکریسی آتی ہے کچھ بنیادی ویلیوز (values) ہیں جو مجھے ورثے میں ملے ہیں اور یہ اقدار مجھے اپنی جان سے زیادہ عزیز ہیں۔ ان ویلیوز میں صرف میرا عقیدہ ہی نہیں، ان خارزار راہوں پر چلتا ہوں میرے پیر زخمی ہیں مگر قدم کبھی نہیں ڈگمگائے۔ انھیں ویلیوز کی جھلک ڈراموں میں کبھی آجاتی ہے۔ یا پھر وہ احساسات ہیں جو میری فکر کا حصہ ہیں۔

ج۔م: پٹنے کے ادبی ماحول کے سلسلے میں اپنے تاثرات لکھیئے!

ش۔م: یہ سوال آپ مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہیں۔ اچھا یہی ہے اس سے زیادہ نہ پوچھئے۔

ج۔م: کوئی اہم واقعہ جس سے آپ کی زندگی متاثر ہوئی ہو؟ کوئی بات یا پیغام جو قارئین سہیل تک پہونچانا چاہتے ہوں؟

ش۔م: زندگی واقعات و حادثات کا مجموعہ ہی ہے۔ میری زندگی میں کچھ ایسے واقعات و حادثات بھی ہیں جو ناقابل فراموش ہیں مگر یہ بے حد ذاتی ہیں اس لئے انہیں رسوا نہیں کرنا چاہتا ہوں۔ قارئین کے لئے پیغام؟ میں اپنے آپ کو اس کا اہل نہیں سمجھتا۔ ہاں گذارش کر سکتا ہوں کہ میری تحریروں کو اسی خلوص سے پڑھیں جس خلوص سے میں لکھتا ہوں۔

ج۔م: اپنی ذاتی زندگی کے بارے میں کچھ بتائیے؟

ش۔م: میری ذاتی زندگی بیحد خوشگوار ہے۔ میری شریک حیات گھر میں ذکیہ ہیں اور ہمارے گھر کا چراغ شبل میری بیٹی اور جہاں زیب (جانی) میرا بیٹا۔ چار افراد کا یہ چھوٹا سا کنبہ ہے جہاں سکون و مسرت ہے اور جن کے بیچ میں سارے غم بھول جاتا ہوں۔

ج۔م: آپکی کون کون سی کتاب منظر عام پر آچکی ہے؟

ش۔م: افسانوں کا مجموعہ "شاخ لہو" کے نام سے ۱۹۷۸ء میں شائع ہوا تھا۔ ڈراموں کا مجموعہ "دوپہر کے بعد" ۱۹۸۴ء میں شائع ہوا۔ افسانوں کا دوسرا انتخاب زیر ترتیب ہے۔ شاید میں شعری مجموعہ بھی ترتیب دوں گا۔ ❖

ذکیہ مشہدی

دھرم سنکٹ

ہندی کا ایک لفظ ہے "دھرم سنکٹ" یہ ہندی کے ان چند الفاظ میں سے ہے جو کچھ مخصوص تصورات کی ترسیل کر سکے مجھے بہت پسند ہیں۔ تلاش کے باوجود اس کا اردو متبادل نہیں مل سکا۔ انگریزی مترادف حاصل کرنے کی کوشش ناکام رہی۔ شاید انگریز دھرم سنکٹ میں مبتلا ہوتے ہی نہیں۔ خیر! چونکہ زیادہ تر اردو داں حضرات ہندی سے واقف ہوتے ہی ہیں اس لیے میں اس لفظ کو استعمال کر رہی ہوں۔ دھرم سنکٹ سے شفیع مشہدی کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ دراصل اس وقت دھرم سنکٹ میں ہوں اور اس میں مبتلا کرنے والے ہیں سہیل۔ کسی بیوی سے یہ کہنا کہ وہ اپنے شوہر کی شخصیت پر روشنی ڈالے، اسے شدید قسم کے دھرم سنکٹ میں ڈال دینا ہے۔ زیادہ تر ہندوستانی بیویاں جو عام نارمل ازدواجی زندگی گزار رہی ہیں (اور کم از کم اس پہلو کے اعتبار سے میں بھی عام نارمل ہوں۔ خواہ باقی پہلو مشکوک قرار پائیں) اپنے شوہر کو مجازی خدا سمجھتی ہیں۔ مجازی ہی سہی جب خدا تسلیم کر لیا تو عیوب اوجھل ہو جاتے ہیں اور خوبیاں نمایاں ہو جاتی ہیں کہ ورنہ توازن بگڑ جائے گا۔ شوہر اور بیوی میں سے کسی کا بھی، میرا مطلب مضمون کے توازن سے ہے۔ بہر حال میں کوشش کروں گی کہ شفیع مشہدی کو صرف بیان کروں اپنی رائے اپنے آپ تک محدود رکھوں۔ ویسے شوہر کے ساتھ مجھے شہریت بھی عزیز ہے جسے شفیع اکثر خطرے میں ڈالتے رہتے ہیں۔ ان کو چھیڑنا اپنی شامت بلانا ہے۔

ہم لوگوں کی نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ اس وقت ہم لوگ دلی میں تھے۔ نئی دلہن سے ملنے کے لیے آنے والوں کا سلسلہ جاری تھا۔ انہیں میں فارن سروس کے ایک صدیقی صاحب بھی تھے۔ ان کی شامت جو آئی تو پوچھ بیٹھے۔

"مشہدی تم تو ہو گئے کے ادھر، تمہاری دلہن یوپی کی۔ یہ شادی ہوئی کیسے؟"

خود صدیقی صاحب یوپی کے تھے۔ اور ان کے لہجے میں تفاخر بے حد نمایاں تھی۔

شفیع مشہدی نے انتہائی سنجیدگی بلکہ مسکینی سے جواب دیا۔ "کیا بتاؤں، بہاری تو بے وقوف ہوتے ہی ہیں۔ پھنس گئے گرو۔"

ایک زعفرانی قہقہہ پڑا اور مسکینی صدیقی صاحب کے چہرے پر طاری ہو گئی۔ شاید میرے چہرے پر بھی ہو گئی ہو۔

یہ تو بارہ سال قبل کی بات تھی۔ ابھی حال کی بات ہے کہ میں ان سے کہہ رہی تھی کہ انہوں نے آفس کی مصروفیات کچھ ضرورت سے زیادہ اوڑھ لی ہیں۔ اور ادبی صلاحیتیں ضائع کر رہے ہیں۔ بہت دنوں سے کچھ لکھا نہیں۔ کہنے لگے۔

"فنکار کے لیے وقت کی کمی اتنی نقصان دہ نہیں ہے۔ جتنی کہ ذہن کی آسودگی۔ تخلیق کے سوتے خشک ہو جاتے ہیں۔"

بات سنجیدگی سے ہو رہی تھی۔ میں نے جھنجھلا کر کہا "کہیے تو میں بھاگ جاؤں تاکہ تخلیق کے سوتے پھر جاری ہو جائیں۔" زور کا قہقہہ لگا کر کہنے لگے "پھر تو آسودگی ہی آسودگی ہے رہا سہا ادب بھی ختم ہو جائیگا۔"

میری سمجھ میں نہیں آیا کدھر دیکھوں۔ ایسے موقع اکثر آتے رہتے ہیں جب میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کدھر دیکھوں۔

دوستوں کی محفل میں ان کی برجستہ حاضر جوابی اور بذلہ سنجی LIFE OF THE PARTY کا درجہ دیتی ہے۔ بزم محفلیں ان کی وجہ سے زعفران زار رہتی ہیں۔ دوستوں کی بات آئی تو بتا دوں کہ ان کا حلقۂ احباب بہت وسیع ہے اور اس میں ایسے لوگ شامل ہیں جو بقول خود ان کے "وقت پڑے تو خون دینے سے احتراز نہ کریں گے۔" (میرا خیال ہے کہ اس طرح کے دوست اسی شخص کو حاصل ہوتے ہیں، جو ضرورت پڑنے پر خود دوسروں کو خون دینے کے لئے تیار رہے) ان وفادار اور مخلص دوستوں کی وجہ سے شفیع مشہدی خود کو خوش قسمت تصور کرتے ہیں اور نازاں بھی ہیں۔ اتفاق سے یہاں میں بھی ان سے اس طرح اتفاق کرتی ہوں۔

ایک مرتبہ کسی صاحب سے ایک اور صاحب نے "ان کی پسند، ناپسند کے متعلق پوچھا۔ کہنے لگے ناپسند تو بعد میں بتاؤں گا، پہلے پسند سن لیجئے "سیم، تل کوٹ، جوشؔ"۔ پوچھنے والا بیچارہ منھ تکنے لگا۔ بولے اجی صاحب اس میں منھ تکنے کی کیا بات ہے۔ آپ کی سمجھ میں اتنی چھوٹی سی بات نہیں آتی کہ سبزیوں میں سیم، مٹھائیوں میں تل کوٹ، اور شاعروں میں جوشؔ مجھے پسند ہیں۔"

دروغ برگردنِ راوی ——— یہ لطیفہ مجھے شفیع مشہدی نے ہی سنایا تھا لیکن خود ان کی پسند تین الفاظ کے دائرے میں نہیں آسکتی۔ چند چیزیں جو میں نے ایک جُگ ساتھ بتانے کے بعد دریافت کی ہیں وہ ہیں ہنگامے، کتابیں، بچے، پھلواری، پھول، خوشبو، ہری مرچیں اور ——— میں (بزعم خود)۔ ہنگامے ظاہر ہے تنہا نہیں برپا کئے جا سکتے ان میں بہت سے دوسرے افراد کو شامل کر کر ملوث کرنا پڑتا ہے۔ لوگوں کو حرکت میں لانے، انہیں کچھ کرنے کی ترغیب دینے کی صلاحیت شفیع مشہدی میں بدرجۂ اتم موجود ہے اس لئے لوگ ساتھ دیتے ہیں، مگر خوب دیتے ہیں۔ کوئی مہینہ بغیر کسی ہنگامہ آرائی کے گذر جائے تو شفیع سنیاس لینے پر آمادہ دکھائی دینے لگتے ہیں۔ اس لئے کبھی گھر پر کوئی ادبی نشست ہو جاتی ہے تو کبھی بزم موسیقی اور کبھی کوئی پارٹی، یہ ہنگامے گھر تک محدود نہیں رہتے کبھی کبھی پورا شہر ان میں شامل ہو جاتا ہے۔ پٹنہ میں ہونے والا آل انڈیا جشنِ ظرافت شفیع مشہدی کا ہی BRAIN CHILD ہے۔ عوام ہر سال بے چینی سے اس کا انتظار کرتے ہیں۔

حال ہی میں مشہدی کی پوسٹنگ موتی ہا تھی۔ وہاں چونکہ ان کا تعلق براہِ راست ایڈمنسٹریشن سے تھا۔ اس لئے مصروفیات بالکل بڑھ گئی تھیں۔ IDENTIAL OFFICE میں رات کے بارہ بارہ بجے تک کرنا، دن میں فیلڈ میں مصروف رہنا، ہنگامی حالات میں تین تین راتیں بغیر پلک جھپکائے گزار دینا۔ لیکن اس مصروفیت اور ذہنی تناؤ کے باوجود چھوٹے سے اس شہر میں کلچرل سرگرمیوں کی بھرمار کر دی۔ صرف سال کا قیام کے دوران دو ڈرامے اسٹیج کرائے۔ اُدیشا، آسام اور پنجاب ادا اس کے پروگرام ہوئے۔ مقامی فن کاروں کو ڈھونڈ کر یکجا کیا اور موسیقی کی انگنت محفلیں سجائیں۔ فرقہ وارانہ کشیدگی والے علاقوں میں قومی یکجہتی کے کئی پروگرام ہوئے جن کا خاطر خواہ اثر بھی پڑا۔ اہلِ شہر گرویدہ ہو گئے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ جنون بھوتوں والی انرجی آخر ان کو ملتی کہاں سے ہے دوسرے یہ کہ اتنے مختلف کاموں کو محدود وقت میں کس طرح فٹ کرتے ہیں کہ سارے کام نمٹ جاتے ہیں اور بخیر و خوبی نمٹ جاتے ہیں۔

ایک مرتبہ شفیع نے مجھ سے کہا تھا "میرے پاس ایک چھوٹا سا بچہ ہو، ایک موٹی سی دلچسپ کتاب اور کھانا مل جائے تو میں کسی اور چیز کی خواہش کے بغیر کئی دن گھر میں بند رہ سکتا ہوں اور اس وقت مجھے اپنے اہم ہونے کا احساس بڑی شدت کے ساتھ ہوا تھا اور میں نے اعلانِ جنگ کر دیا تھا۔ کہنے لگے میں نے وقت پہ کھانا ملنے کی شرط بھی رکھی ہے اور ظاہر ہے وہ تم ہی دو گی اس لئے کتاب اور بچے کے ساتھ تم بھی شامل ہو۔" میں اللہ کے باورچی عبدل میاں کی قائم مقام بن گئی ہوں۔ NOSTALGIA کے ساتھ شفیع ان دنوں کا ذکر کرتے ہیں

ب نیلی کا جھیلا نہ تھا۔ زندگی اتنی پیچیدہ نہیں تھی۔ کھانا
پکوانا گھر ان کے باورچی عبدل میاں کے ذمے تھا۔ رات کو
کتاب پڑھتے پڑھتے لائٹ کھلی چھوڑ کر بغیر لباس
بدلے ہوئے (شاید کبھی جوتوں سمیت) بستر پر آڑے
ترچھے سو جاتے تھے اور صبح کو ساڑھے نو بجے بستر چھوڑا کرتے
تھے۔ اب عبدل میاں تو اللہ کو پیارے ہوئے۔ اُن کی ڈیوٹی
انجام دے رہی ہوں۔ شفیع پڑھتے اب بھی ہیں۔ کہتے ہیں
یہ بھی ان کی کمزوری ہیں۔ لیکن زندگی کی پیچیدگیاں اور
دوسروں کی مصروفیات بڑھ چکی ہیں۔ اس لئے دو بجے رات تک
پڑھتے پڑھتے لائٹ کھلی چھوڑ کر آڑے ترچھے بستر پر نہیں
سوتے۔

بچے ان کو بہت پسند ہیں۔ صرف اپنے ہی نہیں، دوسروں
کے بھی۔ اپنے بچے تو سبھی کو اچھے لگتے ہیں۔ خالی وقتوں
میں اکثر بچوں کے ساتھ لوڈو، کیرم، اسکریبل (SCRABBLE)،
اور بڑا ہو تو) نٹ بال، بیڈ منٹن، حتیٰ کہ ڈینگا پانی
کھیلتے نظر آتے ہیں۔ بچے ان سے بے انتہا مانوس اور فری
ہیں۔ ایک دن ہماری بیٹی ان کے پیٹ پر ہاتھ پھیر کر کہہ رہی
تھی "بابا تمہاری توند تھوڑی سی نکل آئی ہے۔ ایکسر سائز
کیا کرو۔" اپنے والدین کے ساتھ اس طرح کی RAPPORT
کی خوش قسمتی مجھے نہیں ملی۔ شفیع کو بھی نہیں ملی ہوگی۔
بے تکلفی اور ساتھ کھیلنے کے رشتے کے باوجود اگر ان
کے تیوریوں پر بل آتے ہیں تو بچے دبک کر بیٹھ جاتے ہیں۔ بچوں
کو کسی چیز کو منع کر دیں تو دوبارہ اس کی ضد کی ہمت
نہیں کرتے۔ گھر کے باہر ماتحتوں اور جونیئر افسروں کے ساتھ بھی
محبت اور ڈسپلن کا توازن برقرار رکھتے ہیں۔ زیادہ تر ہوتا یہ
ہے کہ محبت کو ڈسپلن آزمایا جائے تو دوری بڑھ جاتی
ہے، باپ یا افسر سخت گیر قرار پاتا ہے۔ محبت و یکجہتی
ڈسپلن پر حرف آتا ہے۔ شفیع کو میں ایک کامیاب
منتظم قرار دیتی ہوں۔

میں اکثر چھوٹے بڑے مشاعروں میں بدتمیزی پر
آمادہ عوام کو دیکھتی ہے جو ان کے ڈائس پر آتے ہی خاموش
ہو گئے ہیں۔ جہاں مچھلی بازار کا گمان ہوتا تھا وہاں سن

سن کرتا ہوا سناٹا چھا گیا ہے۔ اس مضمون کے قارئین میں
ایسے لوگ شامل ہوں گے جنھوں نے یہ منظر خود دیکھا ہوگا کہ
کسی ادبی جلسے میں قطامت خاطر خواہ نہیں ہو رہی ہے یا
عوام کے تیور اچھے نہیں ہیں تو "شفیع مشہدی کو بلایئے"
کا شور بلند ہوا ہے۔ شخصیت کے اس طلسم کا تجزیہ میں نہیں
کر پائی ہوں۔ کیوں ہے اور کہاں سے آیا ہے، میکن ہے۔
اس کی گواہی بہت سے لوگ دیں گے۔

کھانے میں شفیع مشہدی کو کھچڑی بہت پسند ہے۔
اگر کوئی خاتون یہ مضمون پڑھ رہی ہوں گی تو شاید یہ سوچ کر
مسکرا اور رشک کر رہی ہوں گی کہ بہت ہی سادہ شوہر سے واسطہ
پڑا ہے۔ ان کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ شفیع کی کھچڑی ایک
مدت تک کھانے کے پتھر کے شوربے کی طرح ہوتی ہے۔ ایک صاحب
نے بگا جریں، گوشت، شلجم، چقندر، ٹماٹر، دال، مکھن اور گرم
مصالحے استعمال کر کے شوربا تیار کیا۔ اس میں ایک عجب
[illegible] پتھر کا ٹکڑا بھی ڈال دیا تھا۔ لوگ اسے پتھر کا شوربا
کہا کرتے تھے۔ شفیع صاحب کی کھچڑی کے ساتھ بھنا ہوا گوشت
آلو کا بھرتا، دہی، اچار، پاپڑ، سلاد اور ہری مرچیں ضروری
ہیں۔ کھچڑی ان سارے لوازمات میں بطور garnish استعمال
ہوتی ہے۔ ویسے بھی یہ کھاتے کم ہیں اور شور زیادہ مچاتے ہیں۔

پھول اور خوشبو شفیع کی کمزوری ہیں۔ ذاتی طرف سے
پھول لگواتے اور گھر کو گلزار بنا دیتے ہیں۔ خوشبو البتہ
بیچارے کو کم بلکہ تقریباً ترک کر دینی پڑی ہے۔ اس کی
وجہ یہ ہے کہ مجھے خوشبو سے الرجی ہے۔ ہلکی اور قیمتی
خوشبوئیں بھی مجھے نزلے اور آنکھوں کی تکلیف میں مبتلا
کر دیتی ہیں۔ شفیع مشہدی کہتے ہیں "پہلے جنم کیا تھیں
مجھے" میں پہلے جنم میں کیا تھی لیکن میں کچھ اچھے کام
ضرور کر گئی تھی جو ایسا شوہر ملا جس کے ساتھ نہ صرف adjustment
آسان ہے بلکہ جس کی صلاحیتوں پر فخر سے
سر بلند کیا جا سکتا ہے۔ وہ نہ شوہر ــــ وہ بھی ہندوستانی
شوہر ــ بلکہ سیدھی سی کھیر ہو گئی ہے۔

شمس الرحمن فاروقی

پس منظر

یہ سوال اکثر اٹھایا گیا ہے کہ ڈرامے کی اصل خوبی کیا ہے کیا اس کی اصل خوبی یہ ہے کہ جب یہ اسٹیج پر کھیلا جائے تو دیکھنے والوں کو متاثر کرے یا اس کی خوبی یہ ہے کہ جب اسے کتاب کی حیثیت سے پڑھا جائے تو اس کی ادبی شان پڑھنے والے کے دل میں گھر کرے لیکن اسٹیج پر اس کا تاثر کسی خاص خوبی یا حسن کا حامل نہ ہو، ڈرامے کو کیا کا فن کہنے والے نقادوں کا خیال ہے کہ ڈرامہ کا ادبی حسن ایک ثانوی چیز ہے لیکن اس نقطۂ نظر کی بعض دشواریاں بھی ہیں۔ مثلاً بہت سے ڈرامے اسٹیج کے لئے لکھے ہی نہیں گئے یا بہت سے ڈرامے جس قسم کے اسٹیج کے لئے لکھے گئے اب اس کا وجود نہیں ہے۔ پہلی بات کے جواب میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ جو ڈرامہ اسٹیج کے لئے نہیں لکھا گیا وہ ڈرامہ ہی نہیں ہے۔ اور دوسری بات کے جواب میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر وہ قدیم اسٹیج یا دیسی اسٹیج جس کے لئے ڈرامہ لکھا گیا تھا موجود نہیں بھی ہے تو بھی ڈرامہ اسٹیج پر اپنی اہمیت برقرار رکھے گا۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ آج اس کا اس تاثر سے کچھ مختلف ہو جو اصل قدیمی یا دیسی اسٹیج پر کھیلے جانے سے حاصل ہوتا۔

ڈرامہ اسٹیج کا فن ہے یہ بات اس چیز سے بھی عیاں ہوتی ہے کہ ڈراموں کا ڈائرکٹر یا ایکٹر دونوں مل کر ڈرامے کو اس طرح پیش کر سکتے ہیں کہ اس کی تعبیر کچھ بدلی ہوئی نظر آئے۔ مثلاً ہیملٹ کو اس طرح پیش کیا جا سکتا ہے کہ وہ کوئی داستانی افسانہ معلوم ہو۔ یا ہیملٹ کا کردار بھی اس طرح پیش کیا جا سکتا ہے کہ اپنے خیالوں میں کھوئے ہوئے ایک بے عمل نوجوان کی طرح ایک سخت گیر اور ضدی مزاج کا انسان نظر آئے۔

ان باتوں کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ڈرامے کے فن میں اسٹیج مقدم ہے۔ کیونکہ اسٹیج پر کھیلے جانے کے ذریعہ ہی ڈرامے کی مختلف تعبیریں ممکن ہیں۔ لہٰذا یہ بھی ممکن ہے کہ کسی ڈرامے کی ادبی حیثیت کمزور ہو لیکن وہ اسٹیج کے لئے اچھا ثابت ہو۔ فلموں کی مثال سامنے ہے کہ اکثر فلموں میں ادبیت نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی لیکن پھر بھی وہ کامیاب ٹھہرتی ہیں۔ اردو میں ڈرامے کا میدان محدود ہے لیکن یہاں بھی یہ بات صاف نظر آتی ہے کہ جن ڈرامہ نگاروں نے اسٹیج کے تقاضوں کو ملحوظ رکھا ہے وہ ان ڈرامہ نگاروں سے بہتر ثابت ہوئے ہیں جنھوں نے ادبیت کی تلاش میں قلم توڑے ہیں۔ لیکن یہ طے کرنا بھی آسان نہیں کہ اسٹیج کے تقاضے کیا ہیں۔ یونانی ڈراموں میں کرداروں کی تعداد دو یا تین سے زیادہ نہیں ہوتی اور وہ لمبے لمبے مکالمے بھی نہیں بولتے۔ اس کے برخلاف برنارڈ شا کے یہاں کئی کردار ہوتے ہیں اور اس کے اکثر کردار لمبی لمبی تقریریں کرتے ہیں۔ یہ القابی کا نامکمل ڈرامہ "روز جیزا" جو برنارڈ شا کے "مین اینڈ سپرمین" کے طرز پر ہے اور اپنے طویل مکالموں کے باوجود آج بھی مقبول ہے۔ اس طرح بعض ڈراموں میں منظر جلد از جلد بدلتا ہے اور بعض میں پورا ایکٹ ایک ہی منظر پر ختم ہوتا ہے۔ دونوں طرح کے ڈرامے کامیاب بھی ہوتے ہیں اور ناکام بھی۔ اس سے

(باقی صفحہ ۸۲ پر)

سبز پرندوں کا سفر

کلام حیدری

ریاکاری افسانوں اور ناولوں کا موضوع رہا ہے۔ اور آئندہ بھی رہے گا۔ کیونکہ ہمارے کردار میں یہ عیب شامل ہے خصوصاً موجودہ جمہوریت زیادہ تر ریاکاری کا نتیجہ ہے۔ انتخاب اور انتخابی داؤ پیچ میں ایک ہی خیال یا مقصد پیش نظر رہتا ہے انتخاب جیتنا ——— طریقہ کار کوئی اہمیت نہیں رکھتا اخلاقیات کی کوئی گنجائش نہیں۔ ان سب کی نمائش ہو سکتی ہے لیکن محض ریاکاری کے طور پر کہ انتخاب جیتنا ہی اصل مقصد ہے۔ اقتدار حاصل کرنے کے لئے مذہب اخلاقیات دولت تمام حربے استعمال کئے جاتے ہیں۔ زندگی کی تمام خوبصورت اور عمدہ قدریں مسمار کر دی جاتی ہیں۔ قتل کر دی جاتی ہیں ——— صرف اقتدار کے حصول کے لئے

کہانی "سبز پرندوں کا سفر" ان ہی عناصر سے بنائی گئی ہے۔ طنز کے نشتر غضب ہیں۔ اور بے ساختہ آ گئے ہیں کہانی میں گہرائی یا وسعت یا اعلیٰ تخلیق کی تلاش کرنے سے مایوسی ہوتی ہے۔ لیکن آج پر افسانہ نگاری کی گرفت مضبوط ہے۔

(بشکریہ ماہنامہ آہنگ گیا، فکشن نمبر)

رضا نقوی واہی

مشہدی: ایک ہفت رنگ شخصیت

عرصہ ہوا مشہور طناز مجتبیٰ حسین نے ایک دلچسپ مزاحیہ
خاکہ لکھا تھا جس کا عنوان تھا "شفیع مشہدی: معروف
ادبی"۔ اس وقت تک میں شفیع مشہدی کی پوری جودتی
سے واقف نہیں تھا۔ صرف اتنا جانتا تھا کہ وہ بہار سول
سروس کے ایک ذمہ دار رکن ہیں اور افسانہ نگاری اور شاعری
بھی کرتے ہیں۔ ان کے افسانے مختلف رسائل میں شائع ہوتے
رہتے تھے جنھیں میں شوق سے پڑھا کرتا تھا۔ بہار کے افسانہ
نگاروں کی وہ کھیپ جو کلام حیدری، انور عظیم، بدیع مشہدی
اور احمد یوسف وغیرہ کے بعد ابھری تھی، اس میں شفیع مشہدی
بھی شامل تھے۔ یہ تمام افسانہ نگار عصری مسائل کی عکاسی
غیر مبہم اور دلکش زبان و اسلوب میں سلیقے سے اپنے طور پر کرنے
کے عادی ہیں۔ اور ابلاغ و عدم ترسیل کا مسئلہ ابھی پیدا
نہیں ہوا تھا۔ یعنی یہ وہ زمانہ تھا جب اردو افسانہ نگار
جدیدیت کے نام پر معمہ سازی کی دھن میں مبتلا اور قاری
ان معموں کا حل تلاش کرنے میں ذہنی جھٹکے کھا کھا کے حواس
باختہ نہیں ہوا تھا۔ ۱۹۷۰۔۷۱ء تک شفیع مشہدی بہار
کے مختلف اضلاع میں اپنی ملازمت کی میعاد پوری کرتے ہوئے
حکومتِ بہار کے افسر کے عہدے پر دوبارہ دہلی پہنچے۔ پہلے
تعلیم کے سلسلے میں وہ دہلی میں رہ چکے تھے۔ وہاں ادبی تعلقات
دیگر ادبی شخصیتوں کے علاوہ مجتبیٰ حسین سے ہوئی جو طنز و
کے میلے لگوانے والے ٹھیکہ داروں کے چودھری ہیں۔ حیدرآباد
بمبئی اور دہلی میں ہنگامے برپا کرنے کے بعد، اب وہ دوسرے
علاقوں میں بھی ظریفانہ ادب کا جھنڈا گاڑنے کے منصوبے
بنا رہے ہیں۔ جب انھوں نے شفیع مشہدی کی طبیعت
میں ظرافت کے جراثیم کا سراغ پا لیا تو انہیں بھوپال کے
ایک مزاحیہ دنگل میں اپنے ساتھ لے گئے۔ وہاں مشہدی نے
قلم برداشتہ لکھا ہوا اپنا ایک اکلوتا لیکن اچھوتا مضمون
سنا کر چیل گھاٹی کے اس علاقے کو تسخیر کر لیا اور یوں
ایک ہی جست میں ممتاز طنازوں کی منڈلی میں شامل
ہو گئے۔

مجتبیٰ حسین کو گوہرِ مقصود ہاتھ آتا نظر آیا تو انھوں
نے پیر تسمہ پا کی صورت مشہدی کے اعصاب پر سوار
ہو کر انھیں اکسانا شروع کر دیا کہ طنز و مزاح کے غزوہ کا علم
شہر عظیم آباد میں بھی گاڑنا چاہیے۔ ادھر میں بھی تاک
لگائے بیٹھا تھا کہ کوئی موقع دستیاب ہو تو زندہ دلانِ
حیدرآباد کے ادبی جلسوں کی طرح پٹنہ میں بھی ہنسنے
ہنسانے کا کاروبار شروع کیا جائے۔ شکر خورے کو شکر
کی مثل صادق آئی۔ حسنِ اتفاق سے موجودہ وزیر [illegible]
و اوقاف جناب محمد حسین آزاد ۱۹۷۵ء میں بھی بہار
کابینہ کے اہم رکن تھے۔ انہیں شفیع مشہدی کی اصلی

دفتری اور تنظیمی صلاحیتوں کی خبر تھی، لہذا ان کو اپنے نجی سکریٹری کے عہدے پر دہلی سے پٹنہ بلوالیا۔

ایک دن ایک صاحب مجھ سے ملنے آئے۔ خوش وضع خوش لباس، نرم گفتار، ذہین و سنجیدہ معلوم ہوا۔ یہی صاحب شفیع مشہدی تھے جن کے افسانے پڑھ کر میں لطف اندوز ہوا کرتا تھا۔ بالمشافہ یہ پہلی ملاقات تھی۔ دیر تک مختلف موضوعات پر باتیں ہوتی رہیں۔ گفتگو کے دوران انھوں نے پٹنہ میں مزاحیہ کانفرنس منعقد کرنے کا شوشہ چھوڑا۔ میں نے احتیاط طور سے اس تجویز کا خیر مقدم کرتے ہوئے "چیل کے گھونسلے میں ماس کہاں" کا عذر پیش کیا تو انھوں نے بڑے اعتماد سے کہا کہ "ماس" کا انتظام ہو جائے گا۔ اس ملاقات کے بعد جب وہ ڈھائی تین ماہ تک میرے یہاں نہیں آئے تو میں نے سوچا کہ شاعر یا افسانہ نگار تو صرف گفتار کا غازی ہوتا ہے اور یہ صاحب شاعری اور افسانہ نگاری دونوں کرتے ہیں لہذا ان کے قول و فعل کا کیا بھروسہ۔ سمجھا وہ مزاحیہ کانفرنس کے انعقاد کا خیال۔ اس عرصے میں پٹنہ اپنی تاریخ کے سب سے بھیانک سیلاب کی زد میں آگیا۔ غیر سرکاری شہری علاقوں کا تو ذکر ہی کیا، سکریٹریٹ، راج بھون، ریڈیو اسٹیشن، کے احاطوں میں کشتیاں چلنے لگیں۔ وہ تباہی مچی کہ الاماں۔ اس طرح ۱۹۷۵ء ختم ہو گیا۔ نئے سال ۱۹۷۶ء میں مشہدی نے دوبارہ ملاقات کر کے مزاحیہ کانفرنس کا ذکر چھیڑا تو میں نے کہا کہ یہ ساری باتیں بعد میں ہوتی رہیں گی۔ اگر آپ واقعی سنجیدہ ہیں تو آئیے آج ہی اس منصوبے کا تفصیلی خاکہ تیار کر لیا جائے۔ چنانچہ اسی بیٹھک میں خاکہ تیار کیا گیا۔ اس کے بعد کی داستان طویل ہے۔ مختصر یہ کہ نومبر ۱۹۷۶ء میں کل ہند جشن ظرافت کا انعقاد ہوا جو سیمینار، مزاحیہ نثری نشست اور مزاحیہ مشاعرہ پر مشتمل تھا۔ جناب محمد حسین آزاد نے سرپرستی قبول کی اور شفیع مشہدی نے سکریٹری کا عہدہ سنبھالا۔ ملک کے گوشے گوشے سے مشہور و مقبول مزاح نگار پٹنہ میں اکٹھا ہوئے۔ کرناٹک کے وزیر محمد علی مرحوم نے مشاعرہ کی صدارت کی۔ اور انھوں کے ہاتھوں شفیع مشہدی کے افسانوی مجموعے "شاخِ لہو" کا اجرا ہوا۔

مزاحیہ مشاعرے کے دن دوپہر کے وقت میں مشاعرہ گاہ کے انتظامات کا جائزہ لینے کے لئے ٹرنٹ کلا مندر پہنچا تو نقشہ یہ نظر آیا کہ چند مزدور، منہ کھولے، آنکھیں پھاڑے نیچے کھڑے ہیں۔ اور مشہدی بانس کی سیڑھی پر چڑھے، ڈائس کی عقبی دیوار پر بینر ٹانگ رہے ہیں۔ قمیص کی آستین چڑھی ہوئی ہے، ایک ہاتھ میں ہتھوڑا ہے، دوسرے میں کانٹیاں۔ سیڑھی سے نیچے اترے تو پیشہ ور مکینک کی طرح مائک کو ٹیسٹ کرنے لگے۔ اُدھر سے مطمئن ہوئے تو فرش بچھانے، کرسیاں اور صوفے قرینے سے سجانے میں مزدوروں کے دوش بدوش مصروف ہو گئے۔ ایک سینیر ڈپٹی مجسٹریٹ کو جو شاعر بھی ہو، افسانہ نگار بھی ہو، مزدوروں کے ساتھ گھل مل کر انہماک سے کام کرتے ہوئے دیکھنے کا تجربہ میرے لئے نیا اور انوکھا تھا۔ اور اسی وقت Dignity of Labour کا صحیح مفہوم میری سمجھ میں آیا۔ شام ہوئی کہ ہال سامعین سے کھچا کھچ بھر گیا سارا ہی شہر اُمڈ آیا تھا۔ مشاعرے کا افتتاح ہوا۔ شفیع مشہدی نے نظامت کا منصب سنبھالا۔ پہلے تو مشہدی نے گرچہ مزاح انداز میں غیر مقفیٰ تقریر کی۔ اس کے بعد ہر شاعر کا خوبصورت اور موزوں الفاظ میں تعارف کراتے ہوئے دعوتِ سخن دیتے رہے۔ درمیان میں کچھ شگوفے، کچھ چٹکلے، کچھ لطیفے بھی سنائے جاتے تھے تاکہ سامعین ــــ وہ کچھ دیر سنا کر نہ کوئی

طلسم سے آزاد نہ ہو سکیں۔ اس طرح نصف شب سے کچھ قبل تربت کلامت در کا ہال قہقہہ زار بنا رہا اور اس عمل مزاح نگاروں کے کلام کے ساتھ ساتھ مشہدی کی گل افشانی تار کا بھی دخل تھا۔ ہوٹل میں مہمانوں کی دیکھ بھال کانفرنس کے اختتام کے بعد انھیں ریلوے اسٹیشن ایرپورٹ پہنچانے کی ذمہ داری بھی انھیں کے سپرد جسے انہوں نے بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیا۔

اب مشہدی کا سے میری بے تکلفی بڑھتی گئی۔ اور جلد ملاقاتیں ہونے لگیں۔ کبھی ان کی قیام گاہ پر کوئی یا شعری نشست ہوتی، کبھی خود میرے گھر پر۔ ہر نشست میں انہوں نے نظامت کی۔ اپنے جاندار جملوں سے رنگ محفل کو نکھارا، دوسروں کا کلام سنا، دل داد دی، خود بھی اپنا کلام سنایا کبھی تحت تلفظ اور کبھی بڑے دلکش ترنم میں۔ ان کی شاعری سننے کا موقع مجھے اب ملا اور ان کے کلام کی ندرت و حلاوت نے ان کے افسانوں کی طرح انکی شاعری کا بھی رسیا دیا۔

بہرحال، ہر سال جشن ظرافت منعقد ہونے لگا اور مشہدی [illegible] کے انتظامات پر چھائے رہے [illegible] یہاں تک کہ وہ پٹنہ سے تبدیل ہو کر موتی ہاری بہ حیثیت ایس ڈی او پولس افسر چلے گئے مگر جب [illegible] میں جشن ظرافت منعقد [illegible] موتی ہاری سے آتے اور [illegible] پروگرام کو کامیاب بنا کر [illegible] ان کے انداز خطابت و [illegible] مثت [illegible] میں جب بھی کوئی تقریب [illegible] پٹنہ سے باہر کے [illegible] شاعر کی حیثیت سے مدعو کیا [illegible] نشست کا کلام بھی لیتے۔

موتی ہاری کا ذکر آگیا تو ضمناً وہاں کا ایک واقعہ بھی سن لیجئے۔ بہ حیثیت ایس ڈی او وہاں پہونچے ابھی تھوڑا ہی عرصہ گذرا تھا کہ ایک شب ان کے علاقے میں زبردست سیلاب آگیا، جو اونچے اونچے پشتوں کو توڑ کر، دیہاتوں کو غرق آب کرنے لگا۔ بارہ بجے رات میں ان کو خبر دی گئی۔ شب خوابی کے لباس میں تھے، اسی حالت میں اٹھ کر جیپ اٹھائی اور ایک بجے شب میں جائے واردات پر پہنچ گئے۔ وہاں افرا تفری کا عالم تھا۔ سرکاری عملوں میں کوئی موجود نہیں تھا۔ ٹوٹے ہوئے پشتوں کو جلد سے جلد درست کروانا تھا۔ وسائل کی کمی تھی۔ انھوں نے اپنی گل فشانی گفتار کے جوہر کو آزمایا، نزدیک پاس کے کچھ نوجوانوں کو ہمت دلائی۔ خود بھی کدال اور ٹوکری لیکر ان لوگوں کے ساتھ ہو گئے۔ سبھوں نے مل کر مٹی کھودی اور سیل بلا کو روکنے میں لگ گئے۔ ایس ڈی او صاحب کے اس عملی کارنامے کو دیکھ کر دیہاتوں کے دوسرے لوگ بھی اکٹھا ہو گئے۔ اور سب کے سب تندہی سے فوجی سطح پر کام میں جٹ گئے۔ صبح ہوتے ہوتے پشتوں کی دراڑیں بند کر دی گئیں۔ اور شفیع مشہدی نے اپنی ذہانت، سوجھ بوجھ اور محنت و لگن سے درجنوں بہت سارے دیہاتوں کو سیلاب کی آفت سے بچا لیا۔ یہ خبر آگ کی طرح تمام علاقے میں پھیل گئی جس نے بلا تفریق مذہب و ملت، ہر دل میں مشہدی کی عزت و عظمت کا سکہ بٹھا دیا۔ ایڈمنسٹریشن نے بھی کھل کر تعریف کی۔ میں نے جب یہ خبر سنی تو مجھے ۷۶ء کی وہ مہیب یاد آگئی جب کہ جشن ظرافت کے انتظامات میں منہمک [illegible] پر بیٹھے یہ حضرت شاہ وکا میں بیٹھ کر تک رہے تھے۔

بہرحال شانہ بہ [illegible] کی اشاعت کے بعد مشہدی صاحب نے سید ٹیپو کے [illegible] ڈرامے لکھنے شروع کیے جن میں سے بعض

پٹنہ اور دہلی کے اسٹیشنوں سے نشر ہوئے، اور بعض مختلف مقامات پر کامیابی سے اسٹیج بھی کئے گئے۔ ان ڈراموں کا ایک مجموعہ "دوپہر کے بعد" شائع بھی ہوا، جس پر بہار اردو اکادمی نے خاطر خواہ انعام دیا۔ یوں ایک افسانہ نگار اور شاعر دیکھتے ہی دیکھتے ایک اہم ڈرامہ نگار بھی بن گیا اور میں نے محسوس کیا کہ جو شخص فطری تخلیق کار ہوتا ہے۔ جس کا مشاہدہ تیز، جس کی عصری مسائل پر گرفت مضبوط ہوتی ہے، وہ اعلیٰ منصبی مصروفیات میں گھرے رہنے کے باوجود، اپنے فکروفن کی صورت گری جس میڈیم سے بھی چاہے، کامیابی سے کرسکتا ہے۔ اس کا ثبوت مجھے ان کی مزاحیہ خاکہ نویسی یا بعض طنزیہ مضامین سے بھی ملا۔ جو ادھر چند برسوں سے وہ جشن ظرافت کے لئے یا دوسری تقریبات کے لئے پڑھنے کے لئے لکھتے آئے ہیں۔ اس طرح مجھ پر مشہدی کی رنگارنگ شخصیت کی پرتیں رفتہ رفتہ کھلتی گئیں۔ لیکن مشہدی کی شخصیت کی کہانی ان کی بیگم ذکیہ مشہدی کے ذکر خیر کے بغیر ادھوری رہ جائے گی۔ اس لئے ذیل کی چند سطریں ان کی نذر کرتا ہوں۔

میرے گھر میں ذکیہ کی حیثیت گھر کے ایک فرد جیسی ہے۔ جس طرح مجھے اپنی بہو بیٹیاں عزیز ہیں۔ اسی طرح ذکیہ مشہدی کو بھی عزیز رکھتا ہوں اور وہ بھی میرے گھر کو اپنا گھر سمجھ کر آتی جاتی رہتی ہیں۔ خاص کر جب میرے یہاں کوئی ادبی نشست ہوتی ہے تو وہ سویرے سویرے آکر باورچی خانے کا انتظام اپنے ہاتھوں میں لے لیتی ہیں۔

ذکیہ اپنی شادی سے قبل جب لکھنؤ یونیورسٹی میں زیر تعلیم تھیں، تو اسی زمانے سے افسانے لکھا کرتی تھیں، جن میں معاشرے کے چھوٹے بڑے مسائل پر روشنی ڈالی جاتی تھی، مگر ان افسانوں کو وہ شائع نہیں کراتی تھیں۔ شادی کے بعد افسانہ نگاری کا سلسلہ باقاعدہ شروع ہوا

شادی سے پہلے شاید مشہدی کو ذکیہ کی افسانہ نگاری کی خبر نہیں تھی، یا اگر تھی تو خود اپنی افسانہ نگاری کا رعب ڈالنے کے لئے انکو اپنا افسانہ بہتر بنایا ہوگا۔ مگر شاید موصوف کو یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ خود شاعری، افسانہ نگاری اور افسری ایک ساتھ کرتے رہنے کے عادی ہیں جس کی وجہ سے ان کی فکر ذہن کے مختلف خانوں میں بٹی ہوئی ہے، جب کہ ذکیہ نے ابتدا سے ہی صرف افسانہ نگاری کی۔ اس لئے ان کی توجہ صرف ایک ہی صنف ادب پر مرکوز رہی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس میدان میں اعتماد اور ثابت قدمی سے آگے بڑھتی رہیں۔ متعدد اور معیاری رسائل میں افسانے چھپتے رہے اور ان کا شمار ان چند اہم خواتین افسانہ نگاروں میں ہونے لگا جو گذشتہ پندرہ بیس برسوں میں سامنے آئی ہیں۔ اب ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ "پرائے چہرے" بھی شائع ہو چکا ہے۔

میری دعا ہے کہ یہ جوڑا سدا خوش و خرم رہے۔ آمین

(خاکہ)

یوسف ناظم

تیغ مشہدی

وقت گزاری کے یوں تو کئی مشغلے ہیں جن میں آدمی مبتلا ہو کر اپنی عاقبت خراب کر سکتا ہے لیکن ان میں سے ایک مشغلہ ایسا ہے جس کی نوعیت شخصی اور ذاتی ہے اور اس عمل سے سماج پر کوئی برا اثر نہیں پڑتا۔ (سماج پر برا اثر اب پڑ بھی کیا سکتا ہے؟)۔ یہ مشغلہ ہے اپنے پرانے کاغذات ٹٹولنا۔ مہینے کے ۷۲۰ گھنٹوں میں سے اگر پانچ سات گھنٹے بھی اس دلچسپ مشغلے پر صرف کئے جائیں تو ذہن کے بند دریچے اور بالکونیاں کھل سکتی ہیں اور آپکے کہنہ دل و دماغ کو تھوڑی سی شادابی اور تازگی بھی مل سکتی ہے — کچھ کم میٹھے ساتھ تو میرا ہوتا رہا ہے۔

ابھی چند دن پہلے ایک خط دریافت ہوا۔ اس خط کا ایک جملہ آپ کی نذر ہے (نذر کرنے کا یہ طریقہ میں نے شاعروں میں استعمال ہوتے دیکھا ہے۔ مجرب نسخہ ہے) لکھتے ہیں:

"آپ کو شاید اطلاع نہ ہو کہ ۱۲ فروری کو میں نے شری سنجے گاندھی کے پانچ نکاتی پروگرام کی خلاف ورزی کی تھی اور ایک بچے کا باپ بن گیا۔ بچی کا نام تو آپ نے آج تک رکھا نہیں اب اس بچے کا نام آپ کیا خاک رکھیں گے۔ مگر عادت سے مجبور ہوں خواہ مخواہ آپ کو لکھ رہا ہوں۔"

مجھے معلوم تھا کہ ان صاحب کے بچوں کا نام اگر میں نے تجویز کرنا شروع کر دیئے تو وہ سنجے گاندھی کو بالکل بھول جائیں گے صرف اس وجہ سے کہ موصوف اپنے بچوں کے نام خود سوچ نہیں سکتے تو انھوں نے — اب جانے بھی دیجئے۔ اس خط پر تاریخ پڑی ہے ۲۹ر مارچ ۱۹۷۷ء یوں آٹھ سال ہو گئے ہیں۔ اتفاق سے یہ خط میرے ہاتھ اسی وقت لگا ہے جب بچے کی سالگرہ قریب (دیکھئے عنقریب) آ رہی ہے۔

مکتوب نگار ہیں شیخ مشہدی اور لوگ انہیں اس لئے پسند کرتے ہیں کہ موصوف اپنے بارے میں اب تک یہ طے نہیں کر سکے ہیں کہ وہ افسانہ نگار ہیں یا مزاح نگار، ڈرامہ نگار ہیں یا شاعر۔ کبھی کبھی تو وہ تنقید نگار بھی ہو جاتے ہیں۔

شفیع مشہدی مجھے کئی سال پہلے پہلی مرتبہ بمقام بھوپال دستیاب ہوئے تھے۔ سن ہوگا یہی کوئی ۷۶/۱۹۷۵ء۔ اسوقت مرحوم تخلص بھوپالی حیات تھے اور انھوں نے بھوپال میں مزاح نگاروں کا ایک جلسہ منعقد کیا تھا بمعہ مزاحیہ مشاعرہ۔ اور ہم لوگ بھوپال میں جمع ہو گئے تھے۔ مثلاً فکر تونسوی، مجتبیٰ حسین، اور حیدر آباد کے شاعروں کا عظیم الشان قافلہ (حیدر آباد کے مزاح گو شاعر مشاعروں میں شرکت نہیں کرتے اس پر حملہ کرتے ہیں اور مشاعرہ لوٹ لاتے ہیں)۔ اسی جلسہ میں شرکت کے لئے شفیع مشہدی بھی آئے تھے۔ دلی سے جین کے ساتھ۔ سب لوگ ایک ہی جگہ ٹھہرے تھے۔ ایک بڑے ہال میں اور ایسا معلوم ہو رہا تھا۔ جیسے کسی اسپتال کے جنرل وارڈ میں ایسے مریضوں کا جمگھٹا ہو جن کے مرض کی تشخیص نہ ہو سکتی۔ صبح سویرے چلنے کے وقت شفیع مشہدی ملے۔ پہلے میں شفیع مشہدی سمجھا۔ میں حیران کہ یہ تخلص بھوپالی تو بڑے مہتم آدمی نکلے۔ دور دور سے لوگوں کو بلوالیا۔ میں نے پوچھا آپ مشہد سے کب آئے؟ معلوم ہوا انھیں مشہد سے آئے تو صدیاں ہو گئیں۔ خود انھیں تو معلوم نہیں کہ مشہد ہوتا کہاں ہے؟ اس بات پر ہم نے معانقہ کیا کیوں کہ معانقہ تو پہلے ہوا کر چکے تھے اور یکایک دوست بن گئے۔ (آنکھوں پر غفلت کا پردہ پڑ گیا تھا)۔ ہم ہندوستانیوں میں یہ بڑی کمزوری ہوتی ہے کہ دوست بہت جلد بن جاتے ہیں۔ ایک دوسرے کو شریف سمجھنا ہمارے یہاں کا بہت پرانا رواج ہے۔ اور مجھے بہت خوشی ہوئی کہ شفیع مشہدی اس رواج کے پابند ہی نہیں، تابعدار نکلے۔ شفیع مشہدی نے بھوپال کے اس سیمینار میں اُردو کی غزل نگاروں اور مزاح نگاروں کے بارے میں ایک مقالہ بھی پڑھا۔ مجھے اس لئے یاد رہ گیا کہ کافی طویل تھا۔ مقالہ نگار نے کسی بھی مزاح نگار کی اپنی تعریف و توصیف سے محفوظ نہیں رکھا۔ ان کے مقالے کے ہر جملے میں ایک لغت موجود تھی اور ہر پیراگراف میں کئی مزاح نگاروں کے سلسلے میں انھوں نے ایسے ایسے معلق الفاظ استعمال کئے تھے۔ جو اس سے پہلے شاید میں نے صرف البلاغ الہلال کے پرچوں میں پڑھے تھے۔ (ہو سکتا ہے کہ کچھ پیرا انہوں نے انہیں پرچوں سے لے لئے ہوں۔ شبہ اس لئے بھی ہوتا ہے کہ وہ مقالہ کہیں چھپا نہیں)

شفیع مشہدی ... والے ہیں یا شاید گیا؟ باوجود اس کے کہ سرکاری ملازم ہیں انھوں نے اپنی پیشانی کو کافی خندہ رکھا ہے۔ اور اسی خندہ پیشانی سے وہ سب سے ملتے اور بچھڑتے ہیں۔ مزاح نگاری کی طرف متوجہ ہونے کی بھی وجہ ان کی خندہ پیشانی ہی ہے۔ ۱۹۷٦ء میں رضا نقوی واہی کے ساتھ سازش کر کے انھوں نے ایک جشنِ ظرافت پٹنہ میں منعقد کیا تھا۔ نہایت ہی اعلیٰ پیمانے پر۔ انھوں نے بتایا تھا کہ سرکاری عہدہ دار، غیر سرکاری کام زیادہ خوش اسلوبی سے کر سکتے ہیں۔ اس کے چار پانچ سال بعد بہار اُردو اکیڈمی نے جب اکبر آلہ آبادی سیمینار منعقد کیا تو اس میں بھی شفیع مشہدی در پیش تھے۔ ان کا گھر خاصا بے تکلف تھا۔ اور لوگ اُن کے گھروں میں اس طرح آ اور جا رہے تھے گویا یہ گھر نہ ہو مغل سرائے ہو۔ پٹنہ کے شہریوں پر لازم ہے کہ ان کے پاس ایک اسکوٹر ہو۔ شہر میں شور و غوغا بھی اسکوٹروں کا ہے۔ شفیع مشہدی کے پاس بھی ایک اسکوٹر ہے۔ لیکن یہ اسے بہت کم باہر نکالتے ہیں۔ ڈرتے ہیں کہ محکمہ آثارِ قدیمہ کے کسی شخص کی نظر اس پر نہ پڑ جائے۔

شفیع مشہدی کے چہرے پر اب بھی سرخی جھلکتی ہے۔ (ان کا خون طرح ابھی سفید نہیں ہوا ہے) جب انھیں کسی بات پر غصہ آتا ہے تو یہ سرخی اور زیادہ جھلک

بلد چھلک جاتا ہے۔ ۱۹۷۶ء میں جشنِ ظرافت کے موقع پر
جب ان کی کہانیوں کے پہلے مجموعے "شاخِ لہو" کی رسمِ رونمائی
انجام دی گئی تھی تو وہ اس قدر شرمائے تھے کہ خدا بخش
لائبریری کا وہ ہال جہاں وہ خوبصورت تقریب منعقد
ہوئی تھی "گلزار" بن گیا تھا۔ کتاب کا نام بھی انھوں نے
غالباً تو "شاخِ لہو" رکھا۔ اس کتاب کے منصۂ شہود پر
آنے سے پہلے شاخوں کے بارے میں ہمارا علم
محدود تھا۔ ۱۹۴۴ء کے بعد ہم نے فارسی پڑھی نہیں
تھی اور ۱۹۴۴ء تک جو فارسی پڑھی تھی ہم بھول
گئے تھے۔ شاخِ آہو کی ترکیب ضرور ذہن کے کسی گوشے
میں محفوظ تھی۔ لیکن شاخِ لہو ہمارے لئے بالکل نیا
لفظ تھا۔ اور اگر ہم پٹنہ نہیں جاتے تو شاید ہمارے
ذخیرہ الفاظ میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔ شفیع مشہدی
سے کبھی ہم نے اس بارے میں پوچھنا مناسب نہیں سمجھا
ن بہنوں کا سکرٹ مشہور ہے۔ اس کے بعد ہم نے دیکھا
ذکیہ مشہدی کے افسانے جگہ جگہ چھپ رہے ہیں۔
شفیع مشہدی کو مجبوراً ڈرامہ نگاری اختیار کرنی پڑی۔
بیاکوں اور بیویوں میں یوں ہی کیا کم توارد ہوا کرتا ہے۔
عملی زندگی میں بھی روا رکھا جائے۔ اس لئے شفیع
مشہدی نے خاموشی سے ڈرامے لکھنے شروع کر دیئے۔
"دوپہر کے بعد"۔ صبح سے دوپہر تک تو کہانیاں
لکھتے رہے۔ دوپہر کے بعد ان کا ڈرامہ بھی ہے اور
ڈراموں کی کتاب کا نام بھی۔ احتیاطاً انھوں نے اس
کتاب کا انتساب ذکیہ مشہدی کے نام کیا ہے۔ چونکہ
کتاب میں اپنے نام منتسب کی ہوئی کتاب کا بھی ایک درجہ
ہوتا ہے جو اپنی تصنیف کا ہوتا ہے۔ اس لئے ذکیہ مشہدی

نے کوئی ڈرامہ نہیں لکھا۔ تاہم شفیع مشہدی نے مزید
احتیاط یہ بھی کی ہے کہ اپنے مجموعۂ کلام کی اشاعت کا بھی
اعلان کر دیا ہے۔ شاعری سب سے محفوظ میدان ہے۔
یہاں تعاقب کا کم امکان ہے۔ شفیع مشہدی کے افسانوں
کا دوسرا مجموعہ بھی تیار ہے اور صرف اس لئے رکا ہوا
ہے کہ مصنف کو اس کا نام نہیں مل رہا ہے۔ ناموں
کے معاملے میں ان کی کمزوری ...
ملاحظہ ہو اقتباس اُن کے خط کا جو ...
گیا ہے۔)

شفیع مشہدی دل کھول کر تو باتیں کرتے ہیں لیکن
پوری طرح منہ نہیں کھولتے اور اس کا نتیجہ عام طور پر یہ
ہوتا ہے کہ ان کے آدھے سے زیادہ الفاظ دبے رہ جاتے
ہیں جہاں سے کہ برآمد ہوتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ان
کی لطف دیتی ہے۔ اصل میں عمر کی ایک خاص منزل پر
پہنچ نہیں پاتے کو اس سطح پر رہنا چاہیئے کہ دو ایک
دوسرے کو کہے بغیر بھی سمجھ لیں۔ چونکہ بدقسمتی
سے ہم اس سطح پر نہیں پہنچ پاتے اس لئے ہمیں زیادہ سے
زیادہ گفتگو کرنی پڑتی ہے۔ سنا ہے امریکہ اور روس
میں ایسا نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ امریکہ اور روس
آپس میں گفتگو کئے بغیر ایک دوسرے کو سمجھے ہوئے ہیں۔
یہ زیادہ تندرست آدمی بھی نہیں ہیں۔ دل کے کمزور
معلوم ہوتے ہیں لیکن ان کا سکریٹری ...
پہنچانے سب کا مہ آمد تدبیر آتی ...
اسپیشلسٹ تو کمزور کرتے ... فیس وصول کر لیتے
ہیں کہ مریض کا دل بیٹھ جاتا ہے)۔ خرید و فروخت
کے بھی بڑے شوقین ہیں۔ ایک مرتبہ ... گیا تک ان کے

انھیں اکثر سفر کرنے کا اتفاق ہوا۔ جہاں جہاں ان کا تبادلہ ہوا، انھوں نے پلیٹ فارم پر اتر کر مزدور کچھ نہ کچھ خرید لیا۔ لیکن انھیں یہ نادم ہونا چاہیے کہ کون سی چیز زیادہ نقصان دہ ہے جسے نہ خریدیں تو ناممکن ہے۔ معدے کی انھوں نے کبھی پرواہ نہیں کی۔ شرط یہ ہے کہ معدہ کسی دوسرے کا ہونا چاہیئے۔ پہلے سے کہا تک کہ تم بدھ کی باتیں کرتے رہے اور جب تک اطمینان نہیں کر لیا کہ میں سب باتیں سمجھ گیا ہوں کسی دوسرے موضوع کو ہاتھ نہیں لگایا۔

دوسروں کو فلاح و بہبود کے بہت سے مشورے دیتے رہتے ہیں بلکہ وقت مقرر کر رکھا ہے کہ آیئے اپنے حصے کے مشورے لے جایئے۔ لیکن برسوں سے پٹنہ میں ہیں نہ کوئی خانگی مکان کرائے پر لیا نہ مکان بنوانے کی آرزو کی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ طالب علمی کے زمانے میں ہاسٹل میں نہیں رہ سکے تھے، اب رہ رہے ہیں۔ مہمانوں کو بھی بلا لیتے ہیں (خود کی تکلیف کی نہ سہی، مہمانوں کی تکلیف کا تو خیال کرنا چاہیئے)۔ معلوم نہیں ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد کہاں بسیں گے۔ جہاں بھی بسیں گے جشن ظرافت منعقد کریں گے اور خود اپنے ڈرامے تو اسٹیج پر پیش ہی کریں گے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد انکی کیا کیفیت ہوگی اس کی ایک ہلکی سی کیفیت "دوپہر کے بعد" میں نظر آتی ہے۔

[فلیش بیک]

صاحب: بیگم بیگم!! ذرا چائے بھیج دو باہر۔ مہتہ صاحب آئے ہیں۔

بیگم صاحبہ (بڑبڑاتی ہیں)۔ دن بھر کا یہی چکر ہے۔ نہ انہیں کام ہے نہ مہتہ صاحب کو۔ بس بیس بار چائے بناؤ۔ بھلے یہ دفتر میں رہتے تھے۔ مجھے دن میں تو سکون ملتا تھا۔"

اس فلیش بیک میں اور بھی بہت سی باتیں جو زیادہ تکلیف دہ ہیں۔ اتنی کہ میرا نقل کو بھی جی نہیں چاہتا۔

"دوپہر کے بعد" کا پس منظر شمس الرحمٰن فاروقی صاحب نے لکھا ہے۔ اور شفیع مشہدی کے فلیش بیک کی تکنیک کو کافی سراہا ہے اور اس تعریف کا مصنف کے دل پر اتنا گہرا اثر ہوا کہ مصنف نے اپنے پیش لفظ کا عنوان فلیش بیک رکھ دیا۔

شفیع مشہدی ہنسی اور انشائیے بھی لکھتے ہیں اور افسانے اور ڈرامے بھی۔ تاریخ ہند میں ایسا اجتماع ضدین صرف محمد بن تغلق کے حصے میں آیا تھا۔ تاریخ اردو میں شفیع مشہدی ان کا جواب ہیں۔ فرق یہ ہے کہ انھوں نے اپنا صدر مقام دولت آباد کو نہیں عظیم آباد کو بنایا ہے۔

شفیع مشہدی اور ذکیہ مشہدی دونوں کی لحاظ سے ایک دوسرے کے ہم عصر ہیں۔ اس لئے دونوں ایک دوسرے کا بہت لحاظ کرتے ہیں۔ لیکن یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ کس کا کس پر اثر ہے۔ انہیں ہم عصر سے زیادہ ہم ... کہنا چاہیئے۔ صفحۂ قرطاس پر یہ ہم قلم ہیں اور منظر عام پر ہم قدم —— پارکر کا پین سیٹ معلوم ہوتے ہیں —— ادب کے میدان میں ڈبلز کی ایسی ٹیمیں خال خال لیکن جو بھی ہیں نیک فال ہیں۔

شفیع مشہدی کو بہرحال اب یہ طے کر لینا چاہیئے کہ انہیں کیا لکھنا ہے ورنہ بعد میں تو بہت دیر ہو جائے گی اتنی دیر کہ اکیسویں صدی آ جائے

پبلشر مسعود منظر نے ملت آرٹ پریس، سلطان گنج، پٹنہ ۶ میں چھپوا کر دفتر ماہنامہ 'سہیل'، [illegible] روڈ، گیا سے شائع کیا۔

مجتبیٰ حسین

شفیع مشہدی: مصروف آدمی

شفیع مشہدی کو میں اس وقت سے جانتا
جب یہ س۔ ش۔ مشہدی کے نام سے بڑے ع غ قسم کے افسانے
[illegible]رتے تھے۔ گو ان سے کبھی شخصی طور پر ملاقات نہیں ہوئی تھی مگر
[illegible] جیسے میں انھیں بچپن سے پڑھتا آیا ہوں۔ مگر جب ملاقات
[illegible] تو پتہ چلا کہ یہ مجھ سے عمر میں ایک سال چھوٹے ہیں۔ بہت
[illegible]ک اس نکتہ پر غور کرتا رہا کہ اگر یہ مجھ سے چھوٹے ہیں تو پھر میں
[illegible]نے بچپن سے کس س۔ ش۔ مشہدی کو پڑھتا آیا ہوں۔ بالآخر
[illegible]ے تسلیم کرنا پڑا کہ ہمارے یہاں بعض ادیب ایسے بھی ہیں جو
پیدا ہونے سے پہلے ہی لکھنا شروع کر دیتے ہیں۔

شفیع مشہدی سے میری پہلی ملاقات دہلی میں [illegible]
[illegible] ہوئی تھی، پھر یہ دوستی ایسی بڑھی کہ ہم لوگ رہینِ ستم ہائے
[روز]گار رہنے کے باوجود کبھی ایک دوسرے سے غافل نہیں رہے
[illegible]سے ایک بار احمد ندیم قاسمی کا خاکہ لکھنے کو کہا گیا تو
[illegible]نے کہا تھا کہ جب احمد ندیم قاسمی کے بارے میں کچھ لکھنا چاہتا
[illegible] تو بار بار یہی ایک جملہ میرے ذہن میں آتا ہے "احمد ندیم
[illegible] بڑا شریف آدمی ہے" ــــ لیکن میں کتنی بار یہی ایک
[illegible] لکھ سکتا ہوں۔

شفیع مشہدی بھی دراصل یہی ایک جملہ والی شخصیت
[illegible]۔ آدمی بہت شریف ہیں، یہ اور بات ہے کہ بہار سول سروس سے
وابستہ ہیں، شریف آدمی کو زندہ رہنے کے لئے کیا
[ک]یا کرنا پڑتا۔

شفیع مشہدی جس قسم کی کہانیاں لکھتے ہیں اس قسم کی
[illegible]نیاں لکھنے کے لئے آدمی کے پاس قلم، کاغذ اور تھوڑی سی
سائیکالوجی کا ہونا نہایت ضروری ہے۔

ایک زمانہ تھا جب اردو افسانے سیکس کی مدد سے لکھے
جاتے تھے۔ شفیع مشہدی نے سیکس کی جگہ سائیکالوجی کو
شامل کر لیا ہے۔ تین چار برسوں میں میں نے شفیع مشہدی
کو ہر رنگ میں دیکھا ہے۔ اور یہ ہر رنگ میں بید مصروف نظر
آئے۔ جب سے یہ مجھ سے ملے ہیں تب سے یہ مصروف ہیں۔
پتہ نہیں کس بات میں مصروف ہیں۔ دہلی میں ملتے تو ہمیشہ اپنی
مصروفیت کا رعب مجھ پر گانٹھا کرتے تھے۔ پتہ چلتا کہ دفتر کے
کام میں مصروف ہیں، گھر کے کام میں مصروف ہیں۔ دوستوں
کے کام میں مصروف ہیں۔ بعض اوقات ان کے گھر فون کرتا تو
معلوم ہوتا کہ سونے میں مصروف ہیں، لیٹنے میں مصروف ہیں،
غسل کرنے میں مصروف ہیں۔ "مصروفیت" کا عنوان دیئے
بغیر وہ کوئی کام نہیں کر سکتے۔ سول سروس میں ہونے کا یہی
ایک فائدہ تو ہوتا ہے۔

بچے شفیع مشہدی کی بڑی کمزوری ہیں۔ کہیں بھی کوئی بچہ
نظر آجائے تو وہ اس پیار کرنے لگ جائیں گے۔ اس میں
اپنے پرائے کی کوئی تخصیص نہیں ہوتی۔ میں جب ان کے گھر جاتا
تو ان کی گود میں ان کے بھائی کے بچے ہوتے تھے یا پڑوسیوں
کے بچے۔ اکثر یوں ہوتا کہ میں ان سے ملنے کی غرض سے جاتا اور
وہ میرے پہنچنے کے باوجود بچوں سے کھیلنے میں مصروف
رہتے۔ سڑک پر بھی انھیں کوئی بچہ نظر آتا تو اس کی طرف
لپک پڑتے تھے۔

مجھے اس وقت ایک لطیفہ یاد آتا ہے کہ ایک صاحب کے

گیارہ بچے تھے اور وہ اس کے باوجود بچوں سے بڑا پیار کرتے تھے۔ ایک دن وہ سڑک سے گذر رہے تھے کہ انھیں وہ بچی روتی ہوئی نظر آئی۔ بچی سے بہت پوچھا کہ اس کے ماں باپ کہاں رہتے ہیں۔ کس گھر میں رہتے ہیں تاکہ اسے وہاں پہونچا دیں۔ لڑکی نے کوئی جواب نہ دیا۔ بالآخر یہ اسے اپنے گھر لے آئے۔ بیوی سے کہنے لگے۔ "بیگم! سڑک پر یہ روتی ہوئی ملی تھی۔ بیچاری شاید یتیم ہے۔ جہاں ہمارے گھر میں گیارہ بچے ہیں اس بچی کو بھی پال لو۔"

اس پر ان کی بیوی نے کہا۔ "آپکی عقل تو نہیں سٹھیا گئی ہے۔ یہ تو ہماری منی نزہت ہے نزہت۔"

خدا کے فضل سے فی الحال شفیع کو صرف دو بچے ہیں۔ اگر خدا نخواستہ ان کے گھر میں دس گیارہ بچے ہوتے تو بچوں سے ان کا پیار اس لطیفہ کو حقیقت کا روپ دے دیتا۔

شفیع بیحد سیدھے سادے اور سیریس آدمی ہیں اور ایسے سیدھے سادے آدمی کے ساتھ مذاق کرنے کو بہت جی چاہتا ہے۔ میں نے بھی ان کے ساتھ ایک مذاق کیا تھا۔ دو سال پہلے جب بھوپال میں مزاح نگاروں کی کانفرنس ہونا طے پائی تو میں نے شفیع سے کہا کہ وہ اس کانفرنس کے لئے طنز و مزاح پر ایک مقالہ لکھیں۔

شفیع فوراً تیار ہو گئے۔ لیکن نتیجہ یہ ہوا کہ ہر تھوڑی دیر بعد میرے دفتر پر فون کرتے اور کچھ اس قسم کے سوالات پوچھتے۔ "بھئی یہ بتاؤ کہ پطرس نے لاہور کا جغرافیہ لکھا یا تاریخ؟"

"یوسف ناظم کی کتاب "فٹ نوٹ" ان کے انگریزی مضامین کا مجموعہ ہے یا اردو مضامین کا؟"

"رشید احمد صدیقی مزاح لکھتے ہیں یا طنز؟"

"طنز کیا چیز ہے، مزاح کیا ہے؟"

تقریباً ایک ماہ تک میں اردو طنز و مزاح کا "انکوائری آفس" بنا رہا۔ لیکن ایک ماہ بعد صورتحال بدل گئی۔ کیونکہ شفیع نے اس مدت میں اتنا طنز و مزاح پڑھ لیا تھا کہ مجھے یوں لگنے لگا جیسے طنز و مزاح کے معاملے میں مجھے شفیع سے بہت کچھ سیکھنا ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ شفیع ہر کام دیانتداری کے ساتھ کرنے کے عادی ہیں۔ میں نے تو مذاق مذاق میں شفیع کو طنز و مزاح کے معاملے میں الجھایا۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ وہ اس مذاق کو اتنا سیریس لے لیں گے۔ دو سال گذرنے کے باوجود بھی وہ میرے اس مذاق کو سمجھ نہیں سکیں ہیں۔ اور پٹنہ میں مزاح نگاروں کی کانفرنس اس بات کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔

جب تک یہ دہلی میں تھے ہمیشہ یہ دھمکی مجھے دیتے تھے کہ اپنے افسانے کا مجموعہ شائع کریں گے۔ پھر یہ اپنی دھمکی کو ساتھ لیکر پٹنہ آ گئے۔ پتہ چلا کہ محمد حسین آزاد صاحب کے پرائیوٹ سکریٹری بن گئے ہیں۔ میں نے سوچا کہ منسٹر کے پرائیوٹ سکریٹری بننے کے بعد کم از کم اب تو یہ اپنے افسانوں کا مجموعہ شائع نہیں کریں گے۔ پھر اسی اثنا میں یہ اطلاع ملی کہ پٹنہ میں سیلاب آ گیا ہے۔ میں نے فون کر کے شفیع کی خیریت پوچھی تو معلوم ہوا کہ ان کے گھر میں چھ فیٹ تک پانی آ گیا ہے اور یہ کہ ان کا سارا سامان پانی میں بہہ گیا ہے۔ میں یہ فرض کر کے مطمئن ہو گیا کہ ان کے افسانے کے مسودے بھی غالباً گنگا کی لہروں کی نذر ہو گئے ہونگے۔

میں یہاں اپنے ایک شاعر دوست کا ایک لطیفہ بیان کر چکا ہوں کہ حیدرآباد میں ایک چھوٹا سا تالاب ہے جس میں ایک سال کچھ ایسی طغیانی آگئی کہ کئی گھر برباد ہو گئے۔ طغیانی کے دوسرے دن میرے شاعر دوست ملے تو بہت اداس نظر آئے۔ میں نے اداسی کی وجہ پوچھی تو کہنے لگے۔

"یار میں تو برباد ہو گیا۔ گھر کو ہر شے پانی میں بہہ گئی۔ سامان کا مجھے فکر نہیں ہے دوبارہ آ جائیگا۔

مگر مجھے دکھ اس بات کا ہے کہ میرا سارا غیر مطبوعہ کلام جو چھ صندوقوں میں بند تھا وہ گندہ نالہ میں بہہ گیا۔

اس پر میں نے کہا "یار! اس میں غلطی کس کی ہے ... نہیں تمہاری ہے۔ اگر تم نے پہلے ہی اپنے کلام کو نالے میں پھینک دیا ہوتا تو گندہ نالہ کو اتنی زحمت برداشت کرکے تمہارے گھر تک پہنچنے کی ضرورت پیش نہ آتی۔"

مگر شفیع کے افسانوں کا معاملہ دوسرا ہے گنگا کی طغیانی بھی شفیع کے افسانوں کے مسودوں کا کچھ نہ بگاڑ سکی۔

"وہ شمع کیا بجھے جسے روشن خدا کرے"

بڑی خوشی ہے کہ دیر سے ہی شفیع مشہدی کے افسانوں کا مجموعہ شائع ہو گیا ہے۔ ایک سچے اور مخلص دوست کے ناطے میری ساری نیک تمنائیں اور ساری ہمدردیاں شفیع کے ساتھ ہیں، جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔

مشیت ایزدی کو یہی منظور تھا۔ اب انہیں صبر کرنا چاہیے کیوں کہ یہ میرا ذاتی تجربہ ہے کہ ایک ادیب جب صاحب کتاب بن جاتا ہے تو نقادوں کے ہاتھوں اس کا سکون چھن جاتا ہے

[شفیع مشہدی کے افسانوں کا مجموعہ "شاخِ ہو" کی رسمِ اجرا منعقدہ ۱۴ر دسمبر ۱۹۷۶ء میں پڑھا گیا۔]

بقیہ: دوسرا کینسر (ڈرامہ)

مجھ سے گڈو کی حالت نہیں دیکھی جاتی۔

نشاط: (سپاٹ مگر سخت آواز میں) یہ آپ نے کیا کہا کہ ... کے آدرش پر تو مجھ کو ناز تھا

کی ایمان داری کے سہارے جیسے ہر تکلیف خوشی خوشی برداشت کر لی تھی۔ (تیز آواز میں) آج کہہ دیجئے کہ یہ جھوٹ ہے، کہہ دیجئے کہ یہ جھوٹ ہے۔ جو کچھ آپ نے کہا جھوٹ ہے (رونے لگتی ہے)۔

صدیقی: (رک رک کر) نشاط سنو تو۔ میں کیا کرتا؟ گڈو کو کینسر ہے۔ اس کا علاج نہ ہوا تو وہ مر جائیگا۔

نشاط: (چیخ کر) گڈو کو مر جانے دیجئے (پھر رک رک کر بولتی ہے) میں جانتی ہوں کہ گڈو کو کینسر ہے۔ گڈو مر بھی سکتا ہے مگر (آواز تیز ہو جاتی ہے) میں ماں ہو کر بھی برداشت کر سکتی کہ گڈو کینسر سے مر جائے مگر یہ نہیں برداشت کر سکتی کہ یہ دوسرا کینسر آپ کو لگ جائے۔ (روتے ہوئے بولتی ہے) میں آپ کے جسم کو یہ دوسرا کینسر لگنے نہیں دوں گی۔ میں آپ کو یہ کینسر نہیں لگنے دوں گی۔ واپس کر دیجئے (چیختی ہے) پھینک دیجئے۔ لوٹا دیجئے۔ میں یہ دوسرا کینسر نہیں لگنے دوں گی۔ نہیں! نہیں!! نہیں!!!

(روپے پھینک دیتی ہے)

(ڈراپ سین)

بہار میں اقلیتی فرقہ کی بھلائی کے لئے سرکار کے ذریعہ اٹھائے گئے نئے قدم

بہار ریاستی حکومت اقلیتی فرقہ کی ترقی اور بھلائی کے لئے کوشاں ہے۔ وزیر اعظم ہند شری راجیو گاندھی کی شاندار قیادت میں ریاستی حکومت ایسے مختلف پروگرام تیزی سے چلا رہی ہے جن سے ان اقلیتی طبقوں کو قومی کے اہم دھاروں سے جوڑنے میں مدد ملے گی۔ اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دینے، مدرسوں اور قبرستانوں سہولت دینے، بنگالی، پنجابی وغیرہ زبانوں کی ترقی نیز مختلف اکادمیوں کے قیام کرنے، اردو مشاورتی کمیٹی ضروری بنیادی پرنٹوں کے نکالنے کے لئے رقم کا نصف حصہ گرانٹ کی شکل میں دینے اور پٹنہ میں اردو بھون" (اردو... کے قیام جیسے مختلف ترقیاتی اقدامات کرنے کے سرکار کے ذریعہ فیصلے کئے جا رہے ہیں۔

(الف) ریاست سرکاری نوکریوں میں ۱۰ فیصد عہدوں پر اقلیتی طبقہ سے ہی بحالی کی جائے گی۔

(ب) اقلیتی طبقہ کی اقتصادی ترقی کے لئے سرکار کے ذریعہ دس کروڑ روپے کی خصوصی رقم سے "بہار ریاست اقلیتی مالیاتی کارپوریشن لمیٹڈ" کا قیام عمل میں آ چکا ہے۔ یہ کارپوریشن آمدنی کے ذرائع مہیا کرنے کے لئے مذہبی اقلیتی ز... کے ایسے افراد کو جن کی سالانہ آمدنی (کاشتکاری سے ہونے والی آمدنی سمیت) ۱۲ ہزار روپے سے زیادہ نہیں ہے معاشی اور اقتصادی کارروائیوں کے لئے لاگت یوجنا کی ۴۰ فیصد (زیادہ سے زیادہ دس ہزار روپے) قرض کے طور صرف پانچ فیصد سیکڑہ سالانہ سود کے در پر دیگا۔

یوجنا لاگت کا باقی ۶۰ فیصد قرض کی صورت میں امدادی بینکوں سے دلوانے کا انتظام کیا گیا ہے۔

قرض سے متعلق درخواست ضلع مجسٹریٹ اپنے ذریعہ وصول کریں گے اور اس کی جانچ پڑتال اپنے انتظامیہ سے کرا کر قرض سے متعلق درخواستوں کو منظور شدہ بینکوں کے متعلقہ آفیسر کو بھیجیں گے۔

ریاستی سرکار کے ذریعہ انوسوچیت جاتی، جن جاتی کے لوگوں کی معاشی اور سماجی ترقی کے لئے دیو... دوسری تنظیموں کا قیام پہلے ہی عمل میں آ چکا ہے۔

وزیر اعلیٰ شری بندیشوری دوبے کی کامیاب قیادت میں ریاستی سرکار اقلیتی طبقہ کو مکمل تحفظ کے لئے عہد کر چکی ہے۔ حکومت امید کرتی ہے کہ سبھی فرقے کے لوگ دل سے قومی یک جہتی اور محبت کے ماحول کو برقرار رکھنے میں سبھی قسم کا تعاون دیں گے۔

جاری کردہ

محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ بہار

सू० ज० सं० बि० 66- स (सू-63)/85-86

مشتاق احمد نوری

شفیع مشہدی: معصوم آدمی

(۱)

شفیع مشہدی کا نام ذہن میں آتے ہی ایک ایسے مخلص اور معصوم انسان کی شبیہ ابھرتی ہے جس سے اگر کوئی فرمائش کرے

"مشہدی صاحب! مجھے آپ کے سر کی ضرورت ہے" تو مشہدی اپنا سر ان کے ہتھیلیوں پر بڑے ہی خلوص سے رکھتے ہوئے دریافت کریں گے

"اور کچھ چاہئے بھائی؟"

جو شخص مشہدی سے ذاتی طور پر واقف ہے اسے یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ مشہدی اپنی پہلی ہی ملاقات میں ہی لوگوں کو اپنا گرویدہ بنا لیتے ہیں اور ان کا خلوص ملاقاتی کو دوسری ملاقات کے لئے مجبور کر دیتا ہے۔ ان کی مسحور کن شخصیت اور چہرے پر پھیلی ہوئی شرافت دل میں اس طرح سما جاتی ہے کہ انہیں بھلا دینا مشکل ہو جاتا ہے۔

ان کی شخصیت پر کچھ لکھنے سے قبل میری آنکھوں میں ان سے پہلی ملاقات کا منظر گھوم رہا ہے جو ۱۹۶۷ء میں ارریا میں ہوئی تھی۔ شفیع مشہدی ارریا (پورنیہ) میں اسسٹنٹ ڈسٹرکٹ سپلائی آفیسر تھے اس کے علاوہ انہیں کورٹ کا کام بھی سونپا گیا تھا۔ ارریا ایک چھوٹی سی جگہ ہے اور اپنی مٹی کے اعتبار سے مردم شناس اور مخلص بھی۔ وہاں مشہدی کا ایک مخصوص حلقہ تھا جس میں چاپلوسوں کی گذر اس طرح ناممکن تھی جس طرح عقلمندوں کی جھونپڑی میں خوشحالی کی کرن۔ اور میرے خیال میں ارریا سے ہی انہوں نے باضابطہ طور پر اپنی افسانہ نگاری کی ابتداء ۱۹۶۶ء میں کی تھی۔ اس سے قبل بھی وہ لکھتے اور شائع ہوتے رہے تھے مگر جب ۱۹۶۶ء میں ان کی ایک خوب صورت سی نفسیاتی کہانی "خون جگر ہونے تک ......" بیسویں صدی میں شائع ہوئی تو ان کی کہانی نے قارئین کے حلقے میں کھلبلی مچا دی۔ بیسویں صدی کا یہ وہ دور تھا جب اس میں کرشن چندر، خواجہ احمد عباس، عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر، رام لعل، نور شاہ، واجدہ تبسم اور ایسے ہی مشہور فنکاروں کی کہانیاں شائع ہوا کرتی تھیں۔ قارئین کے سیکڑوں خطوط اور نذر شتر فرائی کی بار بار فرمائش جیسے ان کی کہانی میں دراڑ پیدا کر دی بعد انہیں لکھتے رہنے پر مجبور کیا۔ اور تیر ترکش در تتمۂ جام سوغات سلطان، زخم اور ناخن اور آگ جیسی نفسیاتی کہانی بیسویں صدی کے ذریعے سہارے کے

میں ان دنوں آزاد اکیڈمی ہائر سکنڈری اسکول اڑیا کا طالب علم تھا۔ ظاہر سی بات ہے ایک ۹ ویں کے طالب علم کی رسائی ان دنوں ایک مجسٹریٹ تک ہو سکتی تھی۔ جبکہ اپنے چچا کی لال پیلی آنکھیں دیکھ کر ہی خشک ہونے لگتا تھا۔ میں نے انہیں دنوں ۱۹۶۶ء میں کہانی لکھنے کی ابتدا کی تھی۔ بڑی خواہش تھی کہ مشہدی سے ملوں۔ اور مدد چاہوں مگر ان کے عہدے کا رعب غالب رہا۔ اور میری خواہش دل میں ہی گھٹ کر رہ گئی۔ آخر جب ان کی کہانی "درد تہہ جام" شائع ہوئی تو میں نے اڑیا سے انہیں ایک تعریفی خط لکھ مارا۔ اور یہ خواہش ظاہر کی کہ اگر طبیعت پر گراں بار نہ ہو تو میں آپ سے ملوں۔

ان کے حلقہ احباب میں میرے ایک چچا نظیر احمد صاحب بھی تھے۔ اتفاق سے مشہدی صاحب ان سے میرے متعلق دریافت کیا اور جب چچا نے حقیقت بتائی تو انہوں نے مجھے بلوا بھیجا۔

ایک اتوار کے دن میں ڈرتے ڈرتے چچا کے ساتھ ہی ان سے ملنے گیا۔ ساتھ میں ایک کہانی اور ایک غزل بھی۔ وہ بہت ہی شفقت سے پیش آئے اور کہا۔

خط لکھنے کی کیا ضرورت تھی۔ آپ خود سے آجاتے۔ مجھے خوشی ہوتی۔

کہانی انہوں نے رکھ لی۔ اور غزل پڑھ کر کافی خوش ہوئے، اس وقت چچا کے علاوہ افروز صاحب موجود تھے انہیں میری غزل سنائی اور مطلع کی کافی تعریف کی۔

ہم دار پہ چڑھ کر بھی حق ہی کو صدا دیں گے
اب اور جہاں والے کیا ہم کو سزا دیں گے

یہ میری دوسری غزل تھی، غزل کو میں نفر حمید خلش کو دکھا چکا تھا اور ان کی اصلاح بھی اس میں شامل تھی۔ پھر بھی مشہدی نے غزل کے مقطع میں ایک ہلکی سی تبدیلی کر کے اسے اور حسین بنا دیا۔ مقطع یوں تھا۔

کچھ سوچ کے ہم نے بھی یہ عہد کیا لوذی!
اب دل سے محبت کی وہ یاد مٹا دیں گے

مشہدی نے دوسرے مصرع میں 'وہ' کی جگہ 'ہر' کر دیا اس سے شعر کا حسن دوبالا ہو گیا۔ غزل انہوں نے اس وقت واپس کر دی۔

"آپ دو چار دن بعد آئیں میں کہانی دیکھ کر رکھوں گا۔"

میں اس روز جلدی ہی وہاں سے چلا آیا۔ ان کے خلوص اور ان کی اپنائیت کا رنگ چڑھ چکا تھا۔ مجھے یہ امید نہیں تھی کہ وہ دو چار دن میں میری کہانی دیکھنے کی فرصت نکال پائیں گے اس لئے میں پندرہ دن بعد اتوار کے دن ہی وہاں پہونچا، انہوں نے مجھے دیکھتے ہی فرمایا۔

"کہانی تو میں نے دوسرے دن ہی دیکھ لی تھی۔ آپ نے اتنی دیر کیوں لگا دی۔ خیر بیٹھئے، اطمینان سے باتیں ہوں گی۔"

مجھ سے قبل ایک سپلائی انسپکٹر وہاں موجود تھے۔ جو اپنی ناشی غلطی کی وجہ کر پھنس گئے تھے۔ اور مشہدی صاحب کے یہاں مدد کے لئے پہونچے تھے۔ میں نے دیکھا مشہدی بھائی اسے کافی ڈانٹ رہے تھے زمانے کے اونچ نیچ سے واقف کرا رہے تھے۔ اور وہ بیچارہ سر اور حضور سے نیچے بات نہیں کر رہا تھا۔ میں نے یہ محسوس کیا کہ مشہدی کی اس سرزنش میں بھی ایک شفقت تھی، ایک بزرگی تھی (یہ الگ بات کہ ان دنوں ان کی عمر ۲۶، یا ۲۵ سال رہی ہوگی)

پھر بڑی شفقت سے مجھ اسپیکر کو بٹھایا۔ ناشتے میں آلو کے پراٹھے پیش کئے اور چائے کے بعد ہی انہیں جانے ماتحت سے ان کی یہ شفقت نہ صرف ان کے خلوص کو ظاہر کرتی تھی بلکہ یہ ان کے بڑے پن کی دلیل تھی۔ اس دن ان سے طویل گفتگو ہوئی۔ اور کہانی کے سلسلے میں انہوں نے مجھے بڑی تفصیل سے بتایا کہ کہانی میں کیسے الفاظ ہوں اور طرح کی سادگی برتی جائے۔ اور کس طرح کرداروں کے ساتھ انصاف کیا جائے پھر مجھے کوشش چند کی کہانیاں کا حکم دیا۔ اور میں گھنٹہ دو گھنٹہ بعد وہاں سے واپس آگیا۔

اس طرح آہستہ آہستہ میں ان سے بہت قریب آگیا اور پھر ہر اتوار کی صبح کا یہ معمول بن گیا کہ میں صبح بجے تک ان کے یہاں پہونچ جاتا۔ ان دنوں وہ تنہا تھے۔ عبدل میاں ان کے وفادار باورچی تھے جو بہت لذیذ بناتے تھے اتوار کے دن ناشتے میں آلو کے پراٹھے تیار ہوتے ہم دونوں ساتھ ہی ناشتہ کرتے پھر چائے کے بعد موضوع چھڑ جاتا۔ اور کبھی میں ان کی کہانی کو فیئر کرتا۔ اور رسالے کو بھیجتا۔

پھر دوپہر میں عبدل میاں بہت ہی لذیذ کھچڑی پیش کرتے۔ آلو کے بھرتے کے ساتھ تو لطف آجاتا۔ کھانا نے کے بعد تھوڑی دیر آرام کرتے، میں رسالے پڑھتا۔ پھر گفتگو ہوتی۔ شام کی چائے ساتھ ہی پیتے۔ اور کبھی پیدل قدمی کے لئے محل جاتے۔ اور رات گئے میں واپس آتا۔

اریا کے دوران قیام انہوں نے مجھے اتنا پیار دیا کہ میں زندگی بھر بھلا نہیں سکتا۔ ہمیشہ ایک چھوٹے بھائی جانا۔ ان دنوں پورنیہ میں عنایت الرحمٰن عنایت صاحب ڈسٹرکٹ جج تھے بہت ہی پر لطف اور بلغ و بہار۔ وہ اکثر سیشن کیس کی سنوائی کے لئے اریا تشریف لے جاتے۔ اور جب بھی وہ اریا جاتے تو مشہدی کے یہاں شام میں محفل ضرور جمتی۔ اس محفل میں ظفر حمید خلش (جو آزاد اکیڈمی میں انگریزی کے استاد تھے) جمال، اسماعیل کنول، افروز ایڈوکیٹ، نعیم الدین صاحب اور ظفیر الدین صاحب بزرگوں میں مولوی قدیم شریف رکھتے۔ جن کے قدرداں تھے مشہدی بھائی۔ ان کی استادانہ شاعری کی وہ خوب تعریف کرتے۔ اور عروں اور دوستوں کے علاوہ ایس۔ ڈی۔ او اور دیگر مجسٹریٹ بھی موجود ہوتے۔ ان دنوں اریا میں انجنی ایس ڈی او تھے اور مشہدی کو بے انتہا عزیز رکھتے تھے۔

اس طرح یہ محفل رات ۹ بجے تک ضرور چلتی اور پھر عبدل میاں کے بنائے شیر مال اور چائے پر ختم ہوتی جناب ت الرحمٰن مسند پر دراز ہوتے اور ہر شعر پہ جم کر داد دیتے۔ مگر اب وہ محفلیں ویران ہو چکی ہیں۔ اور احباب گئے ہیں۔ صرف یادیں ہی یادیں باقی رہ گئی ہیں۔

مشہدی ہر کسی کے آڑے وقت میں کام آتے اور کبھی بھی انہوں نے بدلے کی توقع نہیں کی۔ دوست سب ان کی ذات سے فیض یاب ہوتے رہے۔ مگر دوستی کے سلسلے میں انہوں نے کبھی بھی اپنے اصول کو سے جلنے نہ دیا۔ مجھے آج بھی ایک واقعہ یاد ہے جو زندگی بھر یاد رہے گا۔

اگست ۱۹۶۵ء کا زمانہ تھا۔ میں ہائر سکنڈری اسکول میں فرسٹ ڈویژن میں کامیاب ہوا۔ اسکول سے سرٹیفکیٹ لے کر گھر آیا تھا۔ مشہدی صاحب سب سے زیادہ خوش ہوئے تھے۔ اور اخبار لے ے دیکھنے چلے گئے اس کے بعد انہیں خوشخبری سنائی۔ شام میں جب میں وہاں گیا تو مجھ سے دو دن میرا سرٹیفکیٹ انہیں دیا اور پوچھا کہ کس سبجیکٹ میں کتنا نمبر ہے۔ مجھ کو ناک سمجھنے کے لئے کہا تھا کہ اس کی کاپی ان سے اٹیسٹ کروانے ان کے دفتر گیا۔ اتفاق سے اوریجنل مارکس اپنے ساتھ لانا بھول گیا تھا میں نے ان کے سامنے مارکس کی کاپی رکھی تو انہوں نے اوریجنل کی مانگ کی۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اور پنسل جو ساتھ لانا بھول گیا آپ کو سارے نمبر زبانی یاد ہیں" مگر انہوں نے انکار کرتے ہوئے کہا
"آپ اور پنسل لے کر آئیں میں بغیر اس کے انسپکٹ نہیں کروں گا"
ان کے اس طرح کہنے پر مجھے بے حد غصہ آیا۔ ان سے جتنا شدید لگاؤ تھا۔ غصہ بھی اتنا ہی شدید تھا اور غصہ اس بات کا تھا کہ انہوں نے مجھ پر اعتبار نہیں کیا۔ میں تیر کی طرح اپنے کمرہ آیا اور رجسٹر اور پنسل لے کر ان کے پاس گیا اور تقریباً ان کے سامنے پھینک دیا۔ انہوں نے نظر بھر میری جانب دیکھا اور رجسٹر اور پنسل دیکھتے ہی انسپکٹ کر دیا اور سنجیدگی سے کہا۔

"میں جانتا ہوں کہ آپ صحیح ہیں مگر اصولاً اور پنسل کی موجودگی ضروری تھی اس لئے اس میں آپ کو ناراض نہیں ہونا چاہئے"

میرا غصہ فوراً تو دور نہیں ہوا دل میں دبا رہا۔ مگر جب میں نے بعد میں غور کیا تب احساس ہوا کہ یہ شخص اپنا اصولوں کے حصار میں گھرا ہے اور اس کے لئے اصول رشتوں ناطوں سے بلند ہیں۔ اور ایسے لوگ اس دنیا میں بہت کم ہوتے ہیں۔

مشہدی بھائی اکتوبر ۱۹۶۶ء میں اڑیسہ سے فرسا (دھنباد) کے لئے روانہ ہو گئے۔ جہاں انہیں سرکل آفیسر کی حیثیت سے جوائن کرنا تھا۔ مجھے اچھی طرح ان کی جدائی کا وہ منظر یاد ہے۔ چونکہ ایس ڈی او کا بھی ٹرانسفر ہو گیا تھا اس لئے دونوں ساتھ ساتھ جا رہے تھے۔ مشہدی کا سارا سامان ٹرک میں لدا ہوا تھا۔ اور وہ ایس ڈی او کے یہاں سامنے میدان میں کھڑے تھے اور چاروں طرف ان کے احباب، ماتحت گھیرے کھڑے تھے۔ میں دیر سے وہاں پہنچا ان کے پاس گیا تو زبان گنگ تھی۔ جذبات امڈ امڈ آ رہے تھے جدائی کی گھڑی شاق گزر رہی تھی۔ اس لئے صرف سلام ہی کر سکا اور ان کے پاس کھڑا ہو گیا۔ انہوں نے سلام کا جواب دے کر کہا
"آپ آ گئے؟ آپ کی کاپی ناظر صاحب کے یہاں دے دی ہے"

پھر بھرے دل کے ساتھ ہم ایک دوسرے کو دیکھتے رہے وہ دیگر احباب سے بھی ملتے رہے۔ مگر جذبات ان پر غالب آ رہے تھے۔ وہ بولنا کچھ چاہ رہے اور بول کچھ اور رہے تھے۔ افروز صاحب، جمال صاحب، نسیم صاحب اور دیگر قریبی احباب وہاں موجود تھے۔ سب کی حالت یکساں تھی۔ اور وہ جان لیوا گھڑی بھی آ ہی گئی جب روانگی کا وقت آیا وہ اچانک میری طرف مڑے اور گلے لگ کر سسک پڑے پھر تو میرے آنسوؤں کا بند ٹوٹ گیا۔ اور ہچکیوں نے پورے وجود کو ہلا کر رکھ دیا۔ وہاں موجود سارے احباب سے وہ گلے لپٹ کر لپٹ اور لگاتار روتے تھے ان کا سرخ چہرہ اور بھی سرخ ہو گیا۔ آنکھیں انگارہ اور سارا چہرہ آنسوؤں سے تر ——— ہچکیاں تھیں کہ رکنے کا نام نہیں لے رہی تھیں

فی امان اللہ اور خدا حافظ کی صداؤں کے درمیان وہ کار پر چڑھے اور کار دھواں اڑاتی چلی گئی۔ وہ منظر جب بھی یاد آتا ہے آنکھیں نم ہو جاتی ہیں۔ میں اس دن غور کرتا رہ گیا کہ آخر اس نوجوان کے شخص میں کون سی وہ خوبی ہے کہ یہ سب کو اپنا لگتا ہے دل میں اتنی گہرائی تک اتر جاتا ہے کہ جدائی بہت شاق گزرتی ہے۔ وہ سب کو اس طرح اپنا گرویدہ بنا لیتا ہے گویا وہ صرف پیار کرنے اور کروانے کے لئے ہی پیدا ہوا ہے۔ اور ان کی محبت کی آنکھیں ہی [illegible]۔ ہر شخص بے حس تماشائی بھی اس دن وہ رو پڑا تھا۔ [illegible] اور اپنا پن ایک عجیب تھی۔

ان کی معصوم شخصیت، ان کا بے پناہ خلوص، اور ایمانداری، و اصول پسندی ———

(۲)

نرسا جوائن کرنے کے بعد ان پر غموں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ وہ بے انتہا ذہنی اذیتوں کے شکار ہوئے بے پناہ دکھ جھیلا۔ اس دوران انہوں نے جو خطوط لکھے ان سے ان کی حالت [illegible] کا [illegible] ہے [illegible] ایسی زندگی کی ذہنی کشمکش میں گزارا ہے کہ جس میں مبتلا ہو کر آدمی ذہنی توازن کھو بیٹھتا ہے۔

وہ برابر خط لکھا کرتے۔ خط کے ذریعے میری غزلوں اور کہانیوں کا اصلاح کرتے، مشورے اور میری کامیابیوں کی دعا کرتے۔

وہ اپنی ماں کو جان سے زیادہ عزیز رکھتے تھے اور سب سے چھوٹے بیٹے ہونے کے ناطے سب سے عزیز بھی تھے، مشہود کی شادی ہونے والی تھی اور اسی دوران ان کی ماں کی طبیعت علیل ہو گئی۔ خدا کی شان کہ ان کی بارات نکلنے سے ایک یا دو دن قبل ہی ان کی ماں ہمیشہ کے لئے روٹھ گئیں۔ انہوں نے اس سانحہ کو کیونکر جھیلا ہوگا۔ یہ خدا ہی جانتا ہے۔ اس سانحہ کی اطلاع انہوں نے ان الفاظ میں دی تھی۔

"—— جس گھر سے بارات نکلتی۔ اس گھر سے جنازہ نکلا، ماں بیٹے کے سہرے کا ارمان دل میں سجائے ایسی روٹھیں کہ من نہ سکیں۔"

اس حادثے نے مشہود کو ذہنی رنجیدہ کر دیا تھا۔ ۱۹۶۹ء کے آخر سے یہ دور ان کے لئے بڑا جان لیوا تھا ان کے ذہنی حالت کا اندازہ ان کے خطوط سے لگایا جا سکتا ہے۔ خط کے کچھ ضروری حصے پیش ہیں۔

نرسا
21.1.70

...... زندگی نے مجھ سے کچھ ایسا برتاؤ کیا ہے۔ کہ ذہنی طور پر مفلوج ہو گیا ہوں کچھ لکھنے پڑھنے کو جی نہیں چاہتا۔ غم کا اظہار کم ظرفی ہے مگر زندگی کبھی کبھی اپنا قرض مع سود وصول کرنے لگتی ہے تو پیمانۂ صبر چھلک جاتا ہے۔

میں ان دنوں ایسے ہی ذہنی خلا سے گزر رہا ہوں وقت بہترین مرہم ہے اور ممکن ہے میں بھی معمول پر آجاؤں۔ مگر حال کی تلخی نے مستقبل کی امیدوں کو مدھم کر دیا ہے۔

...... مجھے خط لکھتے رہئے کہ مجھے خطوط کی ضرورت ہے طبیعت بہل جاتی ہے۔"

ان کے اس خط کا میں نے جواب دیا تھا، صبر کی تلقین کر سکتا تھا۔ اور ہمدردی کا اظہار ——— میرے خط کے جواب میں انہوں نے لکھا تھا۔

نرسا
5.2.70

شاید آپ کو میری حالات کا ٹھیک طرح علم نہیں تھا۔ والدہ کی موت کے بعد [illegible] اور [illegible] کی [illegible] موت کا [illegible] مبتلا [illegible] اب ان [illegible] [illegible] کہ زندگی مجھ سے [illegible] زندگی کا قرض مع سود ادا کر رہا ہوں

اندرون خود سے ایک المناک داستان ترتیب دے لیا ہوں۔ اور اجڑی ہوئی زندگی کے اس ویرانے میں دور دور تک کہیں مسرت کے آثار تک نہیں دکھائی دیتے۔ پھر بھی زندہ ہوں اپنی سخت جانی پر حیرت اور قدرت کی ستم ظریفی پر تعجب ہے۔ بہرکیف زندہ رہنا ہے کہ موت بھی اپنے بس میں نہیں ہے"

صرف انہیں دو خطوں سے ان کی ذہنی کیفیت کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے ۶۹ء سے سنہ ۷۲ء کا مشہدی کی کربناک زندگی کا عرصہ ہے جسے وہ بھولنا چاہتے ہیں اس لئے میں تذکرہ چھوڑتا ہوں۔

پھر وہ ملازمت کے سلسلے میں دہلی چلے گئے۔ وہاں ان کے بڑے بھائی خواجہ بدیع الزماں مرکزی شعبۂ تعلیم سے منسلک تھے۔ انہیں کے ساتھ رہنے لگے۔ اور اس طرح ماحول کی تبدیلی اور اپنوں کے قرب نے انہیں کچھ سکون عطا کیا۔

دہلی کے قیام کے دوران ہی سنہ ۱۹۷۲ء کے آخر میں ان کی شادی ہوئی۔ ذکیہ لکھنوی تہذیب کی پروردہ تھیں اور کافی تعلیم یافتہ اور شائستہ بھی —— شادی سے قبل ذکیہ لکھنؤ کے ایک مشن کالج میں لکچرر تھیں۔ مگر شادی کے بعد انہوں نے ملازمت ترک کردی اور میاں کے دامن سے لپٹ گئیں۔ ذکیہ مشہدی کافی شوخ طبیعت کی مالک ہیں اور ظرافت بھری ان کی گفتگو کافی دلچسپ ہوتی ہے۔ دہلی میں مشہدی کی مصروفیت کم تھیں۔ سنہ ۱۹۷۲ء سے ۱۹۷۴ء تک ان کی زندگی کا دور بڑا خوشنما اور پرسکون کا دور تھا۔ انہیں ایک عرصہ بعد ذہنی یکسوئی اور خوشی نصیب ہوئی تھی۔ اور زندگی اب انہیں حسین نظر آنے لگی تھی۔ اور ان کا ہی یہ شعر ان کی زندگی کا جزو بن گیا تھا۔

وصل کی شب ذرا دیکھے کوئی رنگت ان کی
کبھی لالہ، کبھی سنبل، کبھی ریحان ہونا

(۳)

سنہ ۱۹۷۴ء میں جب محمد حسین آزاد صاحب حکومت بہار کی وزارت میں پھر شامل کئے گئے تو انہوں نے دہلی جاکر مشہدی بھائی کو گھسیٹ لیا۔ مشہدی آنا تو ہرگز نہیں چاہتے تھے۔ مگر آزاد صاحب کی محبت اور ان کی ضد کے سامنے وہ مجبور ہو گئے۔

مجھے آج بھی یاد ہے۔ میں بھی ان دنوں میں پٹنہ میں تھا۔ مشہدی بھائی پٹنہ آچکے تھے اور کوارٹر نہ ملنے کی وجہ سے سرکٹ ہاؤس کے کمرہ نمبر ۱۳ میں مقیم تھے۔ ایک عرصہ بعد ان سے ملاقات ہو رہی تھی۔ میں دھڑ سے ہی اندر گیا وہ مجھے دیکھ کر چونک پڑے۔ اور بہت ہی گرم جوشی سے ملے۔ اور کہا۔

"تم یہاں ہو۔ اب مجھے یقین ہے کہ میرا مجموعہ ضرور شائع ہوگا"

بات بھی درست تھی، مشہدی بھائی لکھنے کے معاملے میں بہت کاہل ہیں۔ یا یوں کہئے کہ اپنے معاملے میں جتنے کاہل ہیں، دوسروں کے معاملہ میں اتنا ہی تیز —— ان کا مجموعہ صرف ان کی کاہلی کی وجہ کر ہی اتنی تاخیر سے شائع ہوا۔ کہانی لکھ کر بھی وہ چھوڑ دیتے۔ پڑی ہے تو پڑی ہے۔ اب کون صاف کرے کون بھیجے؟ اور یا یہ کام میرے ذمہ تھا۔ نوسا جانے کے بعد اپنی کاہلی کا احساس ان کو تھا میں بار بار خط لکھ کر یہ تاکید کرتا تھا کہ کہانی لکھیں۔ صاف کریں اور رسالہ کو روانہ کریں۔ مگر ہر بار ان کی کاہلی آڑے آتی رہی۔

چنانچہ ایک خط میں جسے انہوں نے ارریا سے جانے کے مہینہ بھر بعد لکھا تھا اس کا اعتراف یوں کیا ہے:

ارریا

6.11.68

"........ تم نے ٹھیک ہی لکھا ہے کہ میں لکھنے میں کاہل ہوں، واقعی ابھی تک نہ تو کوئی افسانہ بھیج سکا ہوں اور نہ ہی نظم۔ ایسے ہی موقع پر تمہاری کمی اور بھی شاق گذرے گی۔ تم نے اس سلسلہ میں پوری مدد کی ہے مجھے افسوس رہے گا کہ میں تمہیں اپنی ازلی کاہلی کے باعث وہ توجہ اور اتنا وقت نہ دے سکا جس کی تمہیں ضرورت تھی۔ بہرحال میں مطمئن ہوں کہ تمہارے ذہن میں تخلیق کی ایک لگن جو چنگاری کی طرح ابھری ہے وہ یقیناً ایک دن شعلہ بنے گی جس کے آب و تاب سے ادب کا سرمایہ روشن ہوگا تم تو کافی محنتی ہو، تمہارے آگے ایک شاندار مستقبل ہے خدا تمہاری مدد کرے۔

پورنیہ میں تم طارق صاحب (پروفیسر طارق جمیلی) سے مدد لے سکتے ہو۔ مگر میں مشکوک ہوں کہ تمہاری تشفی ہو سکے گی۔ اگر ضرورت ہو تو میری خدمات تمہارے لئے وقف ہیں۔ بس "واپسی" میں دیر ہو تو پے در پے ریمائنڈر دیتے جانا ...."

دیکھتے ہی دیکھتے وقت گزرتا رہا۔ اس دوران وہ وائرلیس ڈائریکٹر کو اٹرمیں منتقل ہو چکے تھے۔ زمانے کے مجموعہ کا مسودہ تیار کرنا تھا۔ میں نے ان سے کہانیاں طلب کیں۔ انہوں نے بہت تلاش کے بعد دو رسالے مسکرا سامنے رکھدیا۔ میں تو سر پیٹ کر رہ گیا۔

"انہیں کہانیوں سے مجموعہ شائع ہوگا"؟

"میرے پاس تو بس اتنی ہی ہیں" ان کا جواب سن کر ان کی معصومیت پر ہنسی آئی، پھر مجھے ہی گورنمنٹ لائبریری، اردو خدابخش لائبریری کی خاک چھاننی پڑی۔ اور کسی طرح صرف ۱۴ کہانیاں جمع ہو سکیں۔ ایک کہانی جسے انہوں نے ۱۹۶۹ء سے ۱۹۷۱ء کی اذیتوں کے درمیان لکھا تھا ہزار کوشش کے باوجود نہ مل سکی۔ مجموعہ میں شامل بھی نہ کی جا سکی۔

مسودہ بہار اردو اکیڈمی میں داخل کر دیا گیا۔ اکیڈمی سے مالی تعاون بھی ملا۔ پھر کتابت کا مسئلہ درپیش یہ مرحلہ بھی طے ہوگیا۔ اور باری آئی پروف ریڈنگ کی مگر ان کے پاس وقت ہی کب تھا؟

منسٹر کے پرائیوٹ سکریٹری ہونے کے ناطے وزارت کی ساری ذمہ داریاں ان پر تھیں اور آزاد حسب شہدی بھائی کی وجہ سے بالکل آزاد تھے۔ انہیں اتنا یقین تھا کہ مشہدی کے رہنے کی وجہ سے انہیں کسی کی فکر کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔

ان دنوں ذکیہ بھابی بھی پٹنہ آگئی تھیں۔ ان کے لئے میاں کی مصروفیت کا نیا تجربہ تھا کہاں دہلی کی اور کہاں پٹنہ کی بے پناہ مصروفیت۔ یہاں تو مصروفیت ان پر یوں غالب آگئی تھی جس طرح امر بیل درخت پر غالب آتی ہے۔

شام کو وہ جب بھی واپس آتے بھابی ہونٹوں پر پیاری سی مسکراہٹ سجائے ان کا انتظار کرتی ملتیں۔ ان کے ساتھ فائلوں کا انبار دیکھ کر ان کی مسکراہٹ مدھم ہو جاتی۔ وہ شام کو چائے کے بعد پھر فائلوں میں گم ہو جاتے۔ رات میں تھک کر چور ہو کر سو جاتے۔ صبح پھر وہی فائل۔ فائل ہی فائل —— ذکیہ بھابی

ان سے کہتیں۔
"آپ خود کو اس طرح فائلوں میں گم کر دیتے ہیں کہ میں ہزار کوششوں کے باوجود آپ کو تلاش نہیں کر پاتی"
مشہدی صرف مسکرا کر رہ جاتے"

بہر حال بھرپور ریڈنگ کا کچھ کام میں نے کیا اور کچھ مشہدی نے۔ اس طرح ان کا مجموعہ ۱۹۷۶ء میں شائع ہوا۔ "شاخ لہو" کے ادبی حلقوں میں آتے ہی ان کی شہرت میں اضافہ ہوا اور لوگوں کو یاد آیا کہ پس، شین مشہدی کے بعد شفیع مشہدی کے نام سے لکھنے والا افسانہ نگار ابھی زندہ ہے۔ ورنہ ان کی مصروفیت نے تو ان کے اندر کے فنکار کو مار ہی ڈالا تھا۔

(۴)

مشہدی کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ بے حد محنتی ہیں۔ اپنے بس سے زیادہ محنت کرتے ہیں۔ اس طرح دن رات کام کرنے سے ان کی صحت پر بھی کافی اثر پڑا اور کئی بار وہ لو بلڈ پریشر کے شکار ہوئے۔ مگر پھر بھی ان کے کام کرنے کی یہ عادت کم نہ ہوئی۔

ڈاکٹروں نے خوراک کی طرف توجہ دینے کی صلاح دی۔ مگر ماشاء اللہ خوراک دیکھ کر ہنسی آتی ہے۔ بیگم تو ایسی ملیں کہ جس شے کو بھی ہاتھ لگا دیں کم بخت کو مزیدار بکنا ہی ہے۔ مگر کھانے والا ہے کہاں؟ بالکل مختصر سی خوراک اور اتفاق یہ ہے کہ خود بھابی بھی کم خوراک ہیں۔ اور دونوں بچے بھی والدین پر گئے ہیں۔ اس لئے بھابی کے ہاتھوں کی ساری لذت بیکار جاتی ہے ہاں کبھی کبھار ہم جیسوں کو لطف اندوز ہونے کا موقع ضرور ملتا ہے۔

مشہدی بہار ایڈمنسٹریٹیو سروس کے رکن ہیں ہمیشہ اچھے عہدے پر فائز رہے۔ مگر ہر کام اور ہر منزل پر انہوں نے اپنے اصول اور اپنی ایمانداری کو بڑی مضبوطی سے تھامے رکھا۔ کبھی بھی اپنی زندگی میں وہ کمزور لمحہ نہیں آنے دیا جس کے سامنے انہیں شرمندہ ہونا پڑے۔ انہوں نے ہر اس شخص کی مدد کی۔ جس نے بھی مدد چاہی۔ مگر بغیر کسی غرض کے۔ اس سلسلے میں ایک دلچسپ واقعہ کا ذکر ضروری ہے۔

ایمرجنسی سے کافی قبل کی بات ہے آزاد صاحب انجینئرنگ کے منسٹر تھے اور مشہدی ان کے سکریٹری اسی محکمہ کے ایک سینئر آفیسر تھے جن کے ساتھ عرصہ سے ناانصافی ہوتی آرہی تھی۔ کوئی بھی سننے کو تیار نہیں تھا ان کی ہر کوشش ناکام ہوتی رہی۔ تھک ہار کر وہ مشہدی صاحب سے ملے۔ اور اپنی روداد غم ان سے کہہ سنائی مشہدی نے غور سے سنا اور جواب دیا۔

"آپ پریشان نہ ہوں۔ اگر آپ کا کیس جنوئن ہوگا تو ہفتہ بھر میں کام ہو جائے گا۔ دوسری صورت میں میں معذور رہوں گا"

چونکہ ان کا کیس واقعی جنوئن تھا۔ اس لئے حسب وعدہ انہوں نے ہفتہ بھر کے اندر ہی ان کا وہ کام کروا دیا جو ایک طویل عرصے سے رکا ہوا تھا۔ اور جس کی وجہ سے انہیں ہزاروں کا نقصان ہو رہا تھا۔ وہ آفیسر بہت خوش ہوئے، اور "دستور زمانہ" کے مطابق انہوں نے اس کام کا "معاوضہ" مشہدی کو دینا چاہا۔ مگر دوست کے اسٹاف سے انہیں یہ معلوم ہو گیا کہ مشہدی اس معاملے میں نہ صرف کورے ہیں بلکہ "سخت" بھی ہیں۔ تو انہیں کافی دکھ ہوا۔ پھر بھی انہوں نے ایک بڑے سے ٹوکرے میں پھل بھر وایا اور ان کے گھر پہنچے۔ مشہدی موجود نہیں تھے۔ وہ صاحب پھل کا ٹوکرا اندر بھجوا کر چلے آئے۔ شام میں مشہدی آئے

پھر جب اس کی جانکاری انہیں ہوئی تو کافی ناراض ہوئے اور ان صاحب کو بلوا کر ان کو واپس کرتے ہوئے کہا
"آپ غلط جگہ آگئے ہیں جناب۔ میں کام ضرور کرتا ہوں مگر معاوضہ نہیں لیتا۔ آئندہ کبھی مجھ سے ایسی توقع ہرگز نہ کریں۔"

وہ صاحب کافی شرمندہ ہوئے اور ان کی لاکھ کوششوں کے باوجود مشہدی نے ان کا ایک کپ چائے تک پینے سے انکار کر دیا۔

یہ واقعہ آج کے لئے انوکھا ہے۔ مگر حقیقتاً مشہدی وہ کنول ہے۔ جو کیچڑ میں بھی پاک و صاف ہو کر سر اٹھا کر مسکراتے ہوئے [illegible] پیدا کرتا ہے۔

ان کی زندگی میں "آمدنی" کے [illegible] بھی انہوں نے اپنے اصول کے معیار کو نہیں گرایا۔ ان کی جگہ کوئی اور ہوتا تو لاکھوں میں کھیلتا اور عیش کرتا۔ مگر انہوں نے جس اصول اور ایمانداری کو اپنے سینے سے لگا رکھا ہے وہ انہیں کبھی بھی پستی میں نہیں گرنے دے گا۔

اصول کی خاطر انہوں نے اپنوں میں اور غیروں میں کوئی تمیز نہیں کی۔ میں ان سے بہت قریب رہا ہوں۔ انہوں نے میرے لئے بھی اپنے اصول کو نہیں توڑا۔

اسی دوران کی بات ہے غالباً ۱۹۷۶ء کی۔ میں پٹنہ میں پبلک سروس کمیشن کی تیاری میں مصروف تھا۔ سوچا اگر کہیں "لگ" جاتا تو مالی دشواری سے نجات مل جاتی۔ مشہدی صاحب منسٹر کے سکریٹری تھے۔ چاہتے تو ایک سے ایک نوکری دلوا دیتے، مگر میں ان کے مزاج سے واقف تھا۔ اس لئے ان سے میں کبھی کچھ نہیں کہا۔ جب میرے لئے وہاں رہنا بار ہو گیا تو میں گھر واپس آگیا۔ مشہدی نے پھر پٹنہ بلوا لیا۔ اور ایک جگہ لیو (LEAVE) ویکینسی تھی۔ بہت معمولی پوسٹ کے لئے۔ وہیں درخواست دینے کو کہا۔ میں جب درخواست لے کر آفیسر کے پاس گیا۔ تو اس نے مجھے اور ڈگری دیکھ کر دوسرے دن آنے کو کہا۔ اور وہ خود دوسرے دن مشہدی سے ملنے گیا۔ اتفاق سے میں بھی ان کے یہاں اندر موجود تھا۔ وہ صاحب مشہدی صاحب سے بولے "سر! آپ نے جس لڑکے کو بھیجا ہے اس جگہ اسے ایڈجسٹ کرنے میں کوئی دشواری تو نہیں ہے۔ مگر ہی از اوور کوالی فائیڈ فار دس جاب"۔ مشہدی کا جواب تھا۔
"آپ اس کی شخصیت اور کوالی فیکشن پر نہ جائیں۔ جو بھی کام ہوگا وہ کرے گا۔ اب اس کے لئے یہاں دیکھیں"

میں اس جگہ بحال کر لیا گیا۔ اور دوسرے دن ہی مجھے افسر اعلیٰ نے منسٹر کے ڈیپوٹ کر دیا۔ اور ہر ماہ مشہدی صاحب سے ابسنٹی لکھوا کر لائیں۔ مشاہرہ بن جایا کرے گا۔

میں پٹنہ میں ہی رہنے لگا اور ہر ماہ خود ہی آبسنٹی لکھتا، مشہدی بھائی دستخط کر دیتے۔ اور میں دفتر کو دے آتا۔ اور اس قلیل مشاہرے سے کم از کم پٹنہ میں رہنے کی سہولت تو ہو گئی تھی۔

ایک بار میں چھٹی لے کر گھر آیا۔ اور تقریباً ڈیڑھ ماہ رہ گیا۔ واپسی پر مشہدی بھائی نے وجہ [illegible] کی، میں نے وجہ بتا دی۔ پھر میں نے مشاہرہ کے لئے پورے ماہ کا ابسنٹی بنایا اور ان کے سامنے دستخط کرنے کے لئے رکھ دیا۔ انہوں نے پڑھا اور دستخط کرنے سے انکار کر دیا۔

"آپ جب تک گھر میں تھے میں اس کی ابسنٹی نہیں دے سکتا۔ جتنے دن یہاں رہے ہیں اسی کی [illegible]"

قمر اعظم ہاشمی

مشہدی کے ڈرامے

ڈرامے کی کامیابی کا انحصار، اس کی اسٹیجی صلاحیتوں پر ہے۔ اس کا مفہوم صرف یہی نہیں ہے کہ ڈرامائی واقعات میں عملی سرگرمیاں، بیانات و مکالمات پر حاوی ہوں بلکہ یہ بھی ہے کہ حیاتی رویّے کے تعلق سے فکر و نظر میں اشاراتی وسعت اور گہرائی موجود ہو تاکہ اسٹیج کے عملی مظاہرے کے دوران انہماک برقرار رہے اور ناظرین کے لئے ڈرامے کی واقعاتی صورتحال توجہ طلب بن جائے۔ اردو میں اچھے ڈراموں کی کمی پہلے سے چلی آ رہی ہے۔ اور فکر و فن کے اعتبار سے مکمل معیاری ڈرامہ تو اب تک نہیں لکھا جا سکا ہے۔ چنانچہ قدیم یا جدید ادب میں ڈرامے سے کہیں کوئی شغف ملتا ہے تو یہ ایک واقعہ بن جاتا ہے۔

شفیع مشہدی ایک باذوق شاعر بھی ہیں اور ذہین افسانہ نگار بھی۔ لیکن یہ دونوں جہتیں تو بعض حضرات کے یہاں بیک وقت مل جاتی ہیں۔ مشہدی صاحب کی انفرادیت کا امتیازی پہلو یہ ہے کہ وہ ڈرامہ نگار بھی ہیں۔ اور اہم بات یہ ہے کہ ڈرامائی فن اور اس کے اسٹیجی تقاضوں سے ناواقف نہیں ہیں۔ "دوپہر کے بعد" کے ڈراموں کا پیش منظر لکھتے ہوئے شمس الرحمٰن فاروقی صاحب ان ڈراموں کے سلسلہ میں چند سطریں خاص طور پر تحریر کی ہیں۔

شفیع مشہدی کے ڈراموں کی نمایاں خوبی مکالموں کی برجستگی ہے۔ ڈرامے کے بعض ایسے طریقے جو اسٹیج پر آسانی سے نہیں برتے جا سکتے: مثلاً فلیش بیک، یا مناظر کی کثرت یا تنوع، ان کا استعمال مشہدی نے بڑی خوبی سے کیا ہے۔ ڈرامے کا فن کا بنیادی عنصر یہ ہے کہ مکالمے کے ذریعے واقعات ظاہر ہوں اور کردار کی تصویر کشی بھی ہو۔ شفیع مشہدی اس نکتے سے بخوبی آگاہ ہیں۔

محض مکالموں کی برجستگی اور مکالموں کے ذریعہ واقعات کی ظہور پذیری، نہ مکمل ڈراما بنا سکتی ہے اور نہ کسی ڈرامے کی کامیابی کا سبب بن سکتی ہے۔ شفیع مشہدی کے ان ڈراموں کے مطالعے سے، اس کی صراحت تو بہرحال ہو جاتی ہے کہ انھوں نے ڈرامہ لکھنے کے شوق محض کی تکمیل ہی کو محض سب کچھ نہیں سمجھا ہے بلکہ ڈرامائی فن کے تقاضوں کی تکمیل کی کاوش بھی کی ہے۔

"دوپہر کے بعد" میں کل چھ ڈرامے شامل ہیں۔ "اجنبی دیواریں"، "کمپرومائز"، "دوپہر کے بعد"، "انگلیاں فگار اپنی"، "پتھروں کا شہر" اور "مٹھی بھر خاک"۔ ان کی امتیاز کا ایک بنیادی پہلو یہ ہے کہ یہ تمام ڈرامے ریڈیو کے لئے لکھے گئے اور نشر ہو چکے ہیں۔ ریڈیائی ڈراموں کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ کچھ تھوڑی سی ترمیم کے بعد انھیں اسٹیج پر بآسانی پیش کیا جا سکتا ہے۔ شفیع مشہدی کے ان

ڈراموں میں یہ خصوصیت موجود ہے۔ ڈرامے کے واقعات اور اتفاقی مناظر و لوازم اتنے پیچیدہ اور گنجلک نہیں کہ انہیں اسٹیج سے پیش کرنے میں کوئی غیر معمولی رکاوٹ پیش آجائے۔ موضوعی طور پر بھی ان ڈراموں کی اہمیت کا سبب یہ ہے کہ ان کے اندر عصری زندگی کا واضح اور گہری بصیرت موجود ہے۔

"اجنبی دیواریں" کا مرکزی کردار شاہد ہے۔ سلطانہ، شاہد کی بیوی ہے۔ معاونت کے لئے چند اور کردار پیش کئے گئے ہیں۔ ایک متوسط تعلیم یافتہ طبقہ کی گھریلو زندگی کو سلیقے سے پیش کیا گیا ہے۔ شاہد ایک باعزت پیشے سے وابستہ ہے مگر اپنی محدود آمدنی میں گھر کے تمام مسائل پر قابو پانے سے قاصر۔ ماڈرن سوسائٹی میں اپنے معیار لیاقت کو معتبر بنانے کے لئے شاہد نے اپنے دوست حامد سے ریفریجریٹر خریدنے کے لئے چار ہزار روپے قرض لئے۔ حامد نے اس قرض کی واپسی کا کبھی مطالبہ نہیں کیا اور پھر اچانک اس کا انتقال ہو گیا۔ حامد کے انتقال کا جذباتی ردعمل، شاہد پر رونما ہوا۔ وہ دلی صدمے میں مبتلا ہوا۔ اسے حامد کے احسان نے ایک شدید کشمکش میں مبتلا کر دیا۔ کئی طرح کے احساسات کی شدت اس کے اندر پیدا ہوئی۔ حامد نے قرض دیا، قرض کی واپسی کا کبھی مطالبہ نہیں کیا۔ اب حامد جیسا کوئی دوست نہیں کہ جس سے وقت پڑنے پر قرض مانگ سکے، احساسات کی ان لہروں کے علاوہ داخلی سطح پر شاہد ایک خلش آمیز جذباتی تضاد کا بھی مبتلا ہے۔ قرض کی رقم کو واپس کرنے کی فکر بھی دامن گیر ہے اور اپنی اقتصادی حالت کے دباؤ کے تحت وہ اس رقم کو ضبط بھی کرنا چاہتا ہے۔ ڈرامہ نگار نے شاہد کی اس اندرونی اضطراب آمیز کشاکش کو نہایت سلیقے اور نفسیاتی بصیرت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ حتیٰ کہ حامد کے اچانک انتقال کی خبر سے صدمے کا جو تاثر شروع میں پیدا ہوا تھا، چار ہزار روپے کے قرض کو ہضم کر لینے کے امکان کو سامنے پاکر، دھیرے دھیرے ایک انجانی مسرت کے تاثر کا رنگ اختیار کر لیتا ہے۔ اسے ایک خوشی سی محسوس ہونے لگتی ہے کہ وہ قرض کی ادائیگی سے بچ گیا۔ سلطانہ اس کے لبوں کی مسکراہٹ دیکھ کر متوحش ہو اٹھتی ہے کہ کہیں صدمے نے زیادہ جذباتی نہ بنا دیا ہو۔ اس کے استفسار پر وہ اپنے اوپر قابو پاتا اور دل کی صحیح کیفیت کو چھپا لیتا ہے۔ ڈرامہ نگار نے عصری زندگی کی صداقتوں کے ردعمل میں بننے اور بگڑنے والی نفسیاتی رو کو تخلیقی بصیرت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ پانچ سین پر مشتمل اس ڈرامے میں چھوٹے چھوٹے فقروں اور برجستہ واقعات کی ظہور پذیری کی حرکت، ردعمل اور مرکزی کردار اضطراب و تذبذب نے اثر خیز بنا دیا ہے۔ پانچ سین پر مشتمل ڈرامہ "دوسرا [illegible]" میں بھی سماجی زندگی کی الجھنوں کا واضح شعور موجود ہے۔ صدیقی، ڈرامے کا مرکزی کردار ہے۔ نشاط اس کی بیوی ہے۔ گڈو ان کا بیٹا [illegible] کی بیماری کا شکار ہے۔ صدیقی کی جائز آمدنی اس کے اخراجات ہی کے لئے ناکافی ہے۔ اس نے اپنے بیٹے (کی) جان بچانے کے لئے مجبوری کی حالت میں دین محمد ٹھیکیدار سے رشوت کی رقم لی۔ نشاط کو اس کی اطلاع ہوئی، شدید جذباتی ردعمل سے دوچار ہوئی اور اپنے شوہر اس اقدام کے خلاف، اس نے اپنی برہمی کا اظہار کرتے اسے واپس کر دینے کا مطالبہ کیا خواہ یہ بیماری گڈو کی ہی لے لے۔ متوسط طبقے کی گھریلو زندگی میں عام طور پر بیویاں شوہروں کی رشوت خوری کو پسند کرتی ہیں۔ کیوں کہ ان کو آرائشات و لوازم عزیز ہوتے ہیں۔ اس میں نشاط کا کردار مثالی بن گیا۔

"مدبر کے بعد" چار مناظر پر مشتمل ایک ایسا ڈرامہ ہے جس میں ملازمت سے سبکدوشی کے بعد کی زندگی کو موضوع بنایا گیا ہے۔ مرزا صاحب ایک اصول پسند [illegible] ہیں۔ ان کی بیگم کے علاوہ ایک بوڑھا ملازم، اس کے قابل توجہ کردار ہیں۔ مرزا صاحب ملازمت کی زندگی میں بہت اچھے اوقات میں رہتے ہیں۔ ملازمت سے سبکدوشی کے بعد مرزا صاحب کے لئے روز و شب کو گزارنا مشکل ہو جاتا ہے۔ انہیں جتنا اپنی بیکاری کا احساس ہے، اس سے زیادہ ان کی بیگم کے لئے وہ "بزرجمہر" بن جاتے ہیں۔ چنانچہ بعض معمولی گھریلو کاموں کے سلسلے میں وہ مرزا صاحب کا تعاون لینا چاہتی ہیں اور مرزا صاحب کو یہ بات ذہنی طور پر شاق گزرتی ہے۔ وہ اپنے بوڑھے ملازم شرفو کی ضعیفی کو غیر شعوری طور پر محسوس

...ر کے گھر کی ملازمت سے سبکدوش کر دینا چاہتے ہیں تاکہ وہ ...رام سے اپنی زندگی گزار سکے۔ شرفو پر اس فرمائش کا رد عمل ...تا ہے، اور ریٹائرڈ ہو جانے کو ہرگز پسند نہیں کرتا، یہ ...یہ "نابینیچگی" خود مرزا صاحب کے ذہن کی عکاسی بن جاتی ...ے۔ ڈرامہ نگار نے مرزا صاحب کے وسیلے سے لازماً زندگی ...معروف طبقے کے افراد کے ذہن و مزاج کی عکاسی کی ہے جو ...زمت کے دوران ایک خاص سانچے میں ڈھل جاتے ہیں۔ ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد بھی اس سے لپٹے ...ہتے ہیں۔

ڈرامہ "انگلیاں فگار اپنی" میں شعر و ادب کی ناقدری ...ملائی گئی ہے۔ "پتھروں کا شہر" میں شہری زندگی کی ظاہرداری ...تصنع پسندی کو موضوع بنا کر شہری ماحول سے شدید ...ہٹ کے میلان کو پیش کیا گیا ہے۔ آٹھ مناظر پر مشتمل ...ر "مٹی بھر خاک" قومی یک جہتی اور حب الوطنی کے ...وع پر ہے۔ غرض یہ کہ اس مجموعے کے تمام ڈرامے حیات ...ال کے کسی نہ کسی خاص پہلو کی ترجمانی کرتے ہیں اور ...کے اندر ایک واضح نقطۂ نظر بھی موجود ہے۔

...فیع مشہدی نے اپنے عہد کی شخصی و معاشرتی، ...رادی اور اجتماعی زندگی کی تجرباتی صداقتوں نے پیچیدہ ...تر نزاکتوں کو اپنے ان ڈراموں میں انسان دوستی کے ...سلوبی حسن کے ساتھ پیش کیا ہے۔ انہوں نے ...

...سے مسائل حیات کی روشنی ان ... مسئلہ کی جڑوں میں پہنچنے کی کوشش بھی کی ہے اور اخلاقی قدروں کے زوال و انحطاط کے رد عمل میں جو اضطراب انگیز داخلی کشمکش ... ہے۔ اس کا احتساب بھی کیا ہے۔ یہ مختصر ڈرامے محدود زمانی فاصلے رکھتے ہیں اور آوازوں کے نشیب و فراز ادھورے جملوں اور صوتی اشاروں کے سہارے انکی تکنیک موثر بنائی جاتی ہے۔ اس لیے مشہدی کے ان ڈراموں میں یہ مناظر نمایاں ہیں۔ کرداروں کی داخلی کیفیات کی عکاسی کے لیے خود کلامی کے عنصر کو جابجا وسیلۂ اظہار بنایا گیا ہے۔ فلیش بیک کے استعمال کے لیے بھی سہل اور موثر بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ مجموعی طور پر مشہدی کے یہ تمام ڈرامے ان کی فنی ریاضت اور تخلیقی بصیرت کو ہمارے سامنے لاتے ہیں۔ ان ڈراموں کے مطالعہ سے اس کی وضاحت بھی ہوتی ہے کہ اس پسماندہ صنفِ ادب کی روایتوں کے فروغ کے امکانات کی جستجو سے وہ غافل نہیں ہیں لیکن اس ضمن میں مزید یہ ضروری ہے کہ "اردو اسٹیج" کے مسئلہ کو سامنے رکھا جائے۔ کم از کم ہمارے یہاں تو ایک اردو اسٹیج بھی ایسا نہیں ہے جس کی تشکیل میں کوئی محنت کی گئی ہو اور جہاں کسی ڈرامے کے عملی مظاہرے کے لئے خارجی وسائل اور تربیت یافتہ اداکار موجود ہوں۔ اسٹیج کی سہولتیں مفقود ہوں تو فن و فکر کے اعتبار سے معیاری ڈراموں کی تخلیق کا حوصلہ کیسے...

سماجی تحفظ پنشن پروگرام کے تحت نئے پنشن کی منظوری

حکومت بہار نے سماجی تحفظ پروگرام کے تحت نئے پنشن کی منظوری پر روک ہٹایا ہے اور ۲ فیصد کی قید ہٹا کر بہار سرکار سماجی تحفظ پنشن قانون ۱۹۸۰ کی دفعات کے مطابق پنشن پانے کے حقدار سبھی لوگوں کو پنشن منظور کرنے کا حکم دیا ہے۔

سماجی تحفظ پنشن قانون ایسے سبھی لوگوں پر لاگو ہوتی ہے جن کی عمر ۶۰ سال سے زیادہ اور بے روزگار ہے۔ اس میں ایسے عمر دراز لوگوں کو مجبور مانا جائے گا جنہیں چھوٹا ناگپور اور سنتھال پرگنہ علاقے میں ڈھائی ایکڑ تک غیر سینچائی والی زمین اور صوبے کے دوسرے علاقے میں ایک ایکڑ تک غیر سینچائی والی زمین ہو اور جن کی ماہانہ آمدنی ۵۰ روپے سے کم ہو لیکن:

(الف) ہر حالت میں پنشن پانے کے حقدار وہ ہی غیر روزگار لوگ ہوں گے جو صوبہ بہار کے شہری ہونے کے ساتھ ساتھ درخواست دینے کی تاریخ سے کم از کم ۱۰ سالوں سے اس صوبہ میں رہ رہے ہوں۔

(ب) ۶۰ سال کے عمر کی حد بیواؤں، اپاہجوں اور بندھوا مزدوروں کے لئے لاگو نہیں ہوگی۔

صوبائی حکومت کے ذریعے پنشن کی منظوری کی حد مقرر کرتے ہوئے یہ حکم دیا گیا ہے کہ نئے پنشن کی منظوری کے لئے درخواست کی جانچ سب ڈویژنل آفسر کسی گزیٹیڈ افسر ہی سے کرائیں گے اور ذاتی طور پر مطمئن ہونے کے بعد پنشن منظور کریں گے۔ منظوری کا حکم میں یہ واضح کر دیا جائے گا کہ پنشن دھاری ضعیف / اپاہج / بیوہ / بندھوا مزدور کس کلاس کے ہیں۔

فیزیکل جانچ کے وقت پچھلے سال چھانٹے گئے بیوہ / اپاہج / کوڑھ / لقوہ جیسے بھیانک امراض میں مبتلا لوگوں کو پنشن کی منظوری اور ادائیگی کی کارروائی فوراً کرنے کا حکم سبھی ضلع افسران [illegible]

حکومت نے [illegible] پانے والوں کی جانچ وقت وقت پر مختلف اعلیٰ افسران سے کرانے کا بھی حکم دیا ہے اور [illegible] غیر مستحق لوگوں کو پنشن کی منظوری کے لئے قصوروار پائے جائیں گے انہیں سزا دینے کا بھی فیصلہ کیا ہے۔

حکومت نے پنشن کی رقم سب ڈویژنل افسر کے ذریعہ نامزد بلاک ڈیولپمنٹ آفیسر، سرکل آفیسر اور دوسرے نامزد گزیٹیڈ آفیسر کے سامنے ادائیگی کا حکم دیا ہے اور ادائیگی کا ایڈوانس پروگرام پہلے ہی تیار کر کے جاری کرنے کا حکم دیا ہے۔ درخواست فارم کی فوٹو کاپی میں اس بلاک ڈیولپمنٹ آفیسر کے دفتر میں دینا ہوگا جہاں درخواست دہندہ رہتے ہیں۔ درخواست مونے کاغذ پر دیوناگری رسم الخط میں بھی دیا جاسکتا ہے۔

(सू० ज० स० नि० - ४६ - ज (क- 77)/85·86)

علیم اللہ حالی

شفیع مشہدی کی ڈرامہ نگاری

ڈرامہ کا فن دوسری ادبی و تخلیقی اصناف کے مقابلے میں زندگی سے زیادہ قریب ہے۔ اس لئے نہیں کہ ڈرامہ میں ہماری جیتی جاگتی زندگی کو موضوع بنایا جاتا ہے۔ ہماری اجتماعی تو دوسری ادبی اصناف کا موضوع بھی زندگی رہتا ہے۔ پھر ایسا بھی نہیں کہ جب سے لیکر اب تک جتنے ڈرامے لکھے گئے ہیں ان میں حقیقی زندگی کے خد و خال ہی دکھائے گئے ہیں۔ ایسے ڈرامے بھی لکھے گئے ہیں۔ جن میں اساطیری اور ماورائی عناصر پیش کئے گئے ہیں۔ ان میں کہیں سے زندگی کو موضوع بنایا گیا؟ ـــــ لیکن اس کے باوجود دوسری اصناف ادب کے مقابلے میں ڈرامہ ہمیں قریب نظر آتا ہے۔ اس کی خاص وجہ اس صنف کی مخصوص ہئیت ہے جس میں کرداروں اور مکالموں کی موجودگی ہمیں اشخاص و افراد کے وجود کا احساس دلاتی ہے۔ یہ صورت کچھ یوں ہو کر ڈرامہ PRASENTAT انسانی معاشرہ کے اثبات کا یقین ہے۔ کردار چاہے کچھ بھی بولتے ہوں مگر ان کے نطق و گویائی سے انسانی معاشرہ کے وجود اور اس کے [illegible] کا اندازہ ہوتا ہے۔ پھر جب ڈرامہ کے فن میں ایسے موضوعات آجائیں جن کا براہ راست تعلق ہمارے ردعمل، ہماری انفرادی و اجتماعی سوچ، ہمارے سانحات و واردات سے ہو تو ایسے ڈرامے بھی ہماری [illegible] کے ترجمان ہو جاتے ہیں۔

ڈرامہ کا فن دوسری اصناف ادب کے مقابلہ میں زیادہ [illegible] باؤ، ہوشمندی اور ہنرکاری کا متقاضی بھی ہے۔ اس صنف میں فن کار اپنے کرداروں کو تخلیقیت کی اس منزل پر پہونچا دیتا ہے جہاں یہ سارے کردار فن کار کے فرائض ادا کرنے لگتے ہیں۔ یہ مضبوط و توانا اور خودکار کردار فن کے مقصد تخلیق کی وضاحت کرتے ہیں۔ ان کے اعمال و اقدام، اشارات و کنایات اور ان کی رفتار و گفتار میں ایسی جامعیت، ایک گٹھاؤ اور اس گٹھاؤ میں ایسا پھیلاؤ ہوتا ہے جن میں ساری زندگی متحرک دکھائی دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بنیادی طور پر اگر دوسری اصناف نثر میں سست روی اور سبک گامی یا ٹھہراؤ سا ہوتا ہے تو ڈرامہ میں متحرک و تفاعل کی فضا ہوتی ہے۔ اس میں بہاؤ بھی، تیزی و سرعت اور برق رفتاری ہوتی ہے۔ افسانہ یا ناول میں فن کار قاری کے سامنے ہوتا ہے، وہ جو کچھ کرتا ہے ہم اسکا براہ راست مشاہدہ کرتے رہتے ہیں۔ فن کار کی شخصیت ان اصناف میں ہر جگہ نمایاں رہتی ہے لیکن ڈرامہ میں فن کار اپنی شخصیت کو سامنے نہیں لاتا۔ کردار اس کی قائم مقامی کرتے ہیں۔ پردہ کے پیچھے رہ کر ڈرامہ کا فن کار جو کچھ کہہ سکتا ہے وہ بلاواسطہ طور پر نہیں کہہ سکتا۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ دوسری اصناف قصہ کا تعلق محض [illegible] سے ہے۔ ڈرامہ میں [illegible] و کردن دونوں امور کو مدنظر رکھنا پڑتا ہے۔ ریڈیو ڈرامہ میں اگرچہ کرنے والی بات پیش نہیں ہوتی مگر پھر بھی فن کار ان تمام اجزا کو سامنے لانے کی کوشش کرتا ہے جنھیں ہم اسٹیج ڈرامہ میں دیکھتے بھی ہیں۔ جب وہ [illegible] پر ڈرامہ اسٹیج کا آرٹ ہے۔ ریڈیو کی اپنی مجبوری [illegible]

ہے اور فن کار کبھی مختلف آوازوں کے ذریعہ اور کبھی خائبانہ کلمات سے اس مجبوری کو سر کر لیتا ہے۔ یہ سارا اہتمام اس بات کی ہے کہ ڈرامہ حقیقتاً اسٹیج کے لئے ہوتا ہے، یہ audio-visual میڈیم ڈھونڈتا ہے۔ اب ٹیلیویژن کے بڑھتے ہوئے رجحان کے بعد پھر ڈرامہ کی صنف اپنی کھوئی ہوئی منزل حاصل کرے گی اور اس کا اسٹیج سے بظاہر ٹوٹا ہوا رشتہ از سر نو استوار ہو جائے گا۔

شفیع مشہدی نے افسانہ لکھتے لکھتے ڈرامہ اور وہ بھی ریڈیو ڈرامہ لکھنے کا سلسلہ شروع کر کے مشکل سے مشکل تر مشغول اپنائی ہے۔ دو پہر کے بعد ان کے ان ڈراموں کا مجموعہ ہے جو انھوں نے ریڈیو کے لئے لکھوائے ہیں۔ اس مجموعہ میں چھ ڈرامے ہیں۔ ان میں "اجنبی دیواریں" یا "دوسرا کینسر" سب سے کامیاب ڈرامے ہیں۔ حیرت ہے کہ ان کی موجودگی میں اس مجموعہ کا نام ایک ایسے ڈرامے کے نام پر کیوں رکھا گیا جو اوسط درجہ کا ہے۔

شفیع مشہدی نے اپنے ڈراموں میں معاشرہ کے ان مسائل کو موضوع بنایا ہے۔ جن سے آج ہم دو چار ہیں۔ ہر ارٹ تضاد سے پیدا ہوتا ہے۔ مشہدی آرٹ کی تخلیق کے اس بنیادی نکتے سے واقف ہیں۔ لیکن اس آرٹ کی پیشکش بھی مختلف فن کاروں نے مختلف انداز میں کی ہے۔ کسی نے چونکانے والے انداز میں کسی نے پند کے انداز میں، کسی نے محض عکاسی کی ہے۔ شفیع مشہدی نے زندگی کے اس تضاد سے ہمیں بصیرت بخشنے کی کوشش کی ہے۔ وہ آج کے بگڑتے ہوئے معاشرہ میں انسانیت کے جوہر زندہ کے قائل ہیں، وہ اچھائیوں پر یقین رکھتے ہیں کہ رشوت ستانی، خند لوگوں، تعصب فریب اور ریاکاری کے اس ماحول میں خود ہمارے معاشرہ سے ایسے افراد سامنے آجاتے ہیں۔ جو ان انسانیت سوز خامیوں سے نفرت کی تلقین کرتے ہیں۔ انسان کتنا ہی ذلیل و پست ہو جائے پھر بھی انسان ہی رہتا ہے۔ مشہدی نے معاشرہ کی اس پستی اور ذلالت کے مقابلے میں انسانیت کے احترام میں فضا بنائی ہے۔ اس طرح انھوں نے تضاد معاشرہ سے ایک تعمیری کام لیا ہے۔ ادب سے تعمیری کام لینا آسان نہیں ہے، اس لئے کہ اکثر اس عمل میں ادب اور تعمیر دونوں کو خطرہ لاحق ہو جاتا ہے۔ ان دونوں کو بیک وقت بچانا بڑی ہنرمندی چاہتا ہے۔ مشہدی نے زندگی کے تعمیری پہلوؤں کو خوبصورت فن پاروں کا روپ دیا ہے۔ پورے سچویشن میں بعض چند کلمات سے مشہدی ایک انقلاب پیدا کر دیتے ہیں۔ ہر انسان حالات اور ماحول کے جو کار نظام میں ایک جزو کی طرح کام کرتا ہے یہ بھی حقیقت ہے کہ ہم ماحول اور حالات سے مجبور رہتے ہیں لیکن ہر انسان کے اندر بھی ایک انسان ہوتا ہے جو خارجی ماحول کا جائزہ لیتا رہتا ہے اور کبھی کبھی ایک بار بیدار ہو کر سبھی سیاہیوں کا پردہ چاک کر دیتا ہے۔ شاہد حامد سے چار ہزار روپے قرض لے کر کس اعصابی تشنج میں گرفتار رہتا ہے۔ خیر و شر کیسے کیسے اتار چڑھاؤ سے گذرتا ہے —— اس کا نقشہ "اجنبی دیواریں" میں دیکھا جا سکتا ہے۔ مشہدی کا کمال یہ ہے کہ وہ ہماری داخلی کیفیات اور احساسات کے لطیف ترین تموجات کو بھی ڈرامائی شکل دے دیتا ہے۔ کبھی شاہد اپنے دوست کی موت پر غم زدہ ہوتا ہے۔ پھر حالات کی ستم ظریفی ان چار ہزار روپوں کی ادائیگی کی یاد دلاتی ہے تو وہ لمحہ بھر کو مطمئن ہوتا ہے کہ چلو اب قرض واپس کرنے کا سوال ہی نہیں ہے مگر پھر اندر سویا ہوا انسان بیدار ہوتا ہے اور وہ یکایک چیخنے لگتا ہے۔

"میں ہنس کہاں رہا ہوں...... حامد مر گیا۔
...... چار ہزار...... میرا دوست مر گیا۔
...... میں ہنسوں گا...... میں کیوں......
حامد مر گیا...... نہیں نہیں میں مر گیا......
حامد نہیں مرا میں مر گیا، میں مر گیا"

(اجنبی دیواریں)

تضاد کی حقیقت سے مشہدی نے کتنا خوبصورت اور کیسا گراں قدر کام نکالا ہے۔ "دوسرا کینسر" عدیقی اور نشاط خصوصاً نشاط تضادات کے درمیان سے

رہیں گی

ایسا حل نکالتے ہیں جس پر حیرت بھی ہوتی ہے اور مسرت بھی۔
. بیمار ہے۔ اسے کینسر ہو گیا ہے۔ اس کے علاج کے لئے روپوں
ضرورت ہے۔ ایسی ضرورت اور صدیقی کی بے مثال ایمانداری
درمیان دیر تک کش مکش رہتی ہے۔ اس کھینچا تانی میں ایمان
کے تانے بانے کا ٹوٹ جانا ایک فطری بات تھی مگر جب
یقی کی بیوی نشاط کو پتہ چلتا ہے کہ شوہر نے یہ روپے دینا محمد
ٹھیکیدار سے بطور رشوت لئے ہیں تو وہ بیٹے کی بیماری اور اپنی
کی پریشانی، عسرت اور بیچارگی نیز اس کے نتائج
دل کر کس طرح ایک ٹھوس حقیقت کا عرفان حاصل کر لیتی
. صدیقی جیسے آدمی کے لئے رشوت لینا اسے کینسر سے زیادہ
ک لگا۔ وہ اس بدحواسی کے عالم اور جنونی کیفیت میں بھی جو
ستہ اختیار کرتی ہے وہ تعمیری اور اثباتی ہے۔ یہاں
کردار حد درجہ مقدس معلوم ہوتا ہے۔ وہ VALUES
حاصل کر لیتی ہے اور کس اعتماد سے کہتی ہے :

"میں جانتی ہوں کہ اس کی بیماری پر کینسر کا شبہ
ہے، گڈو مر بھی سکتا ہے مگر ——— میں یہ
برداشت کر سکتی ہوں کہ گڈو کینسر سے مر جائے
مگر یہ برداشت نہیں کر سکتی ہوں کہ یہ دوسرا
کینسر آپ کو لگ جائے ——— میں آپ کو یہ
کینسر نہیں لگنے دوں گی۔"

(دوسرا کینسر)

[illegible] "مٹھی بھر خاک" اور
[illegible] تاثراتی فنی خوبیوں کے ساتھ
[illegible] مشہدی کے یہاں شدید ترین
[illegible] ابھرتا ہے۔ "مٹھی بھر خاک" میں
[illegible] پتھروں کا شہر" — URBAN
[illegible]

[illegible]

[illegible] کو ایک نیا زاویہ نگاہ بخشنے کی کوشش کی۔
مشہدی کے فن میں وژن (VISION) ایک [illegible]

ڈرامہ نگاروں سے الگ کر کے ایک خاص صف میں رکھنے پر
مجبور کرتا ہے۔

مشہدی کے اس وژن کا سراغ لگاتے ہوئے ہم بہت دور
تک پہنچ سکتے ہیں۔ بصیرت کا انداز مشہدی کے یہاں ماضی بعید
کی تہذیبی روایات سے تعلق کی بنیاد پر قائم ہوتا ہے۔ وہ
جدید دور کی مادی ترقیوں کو روایات کی روشنی میں دیکھتے
ہیں۔ ہماری انسانی اور اخلاقی روایات اور ہمارے تہذیبی
ورثہ کے بہت سے عناصر ایسے ہیں جو لافانی خصوصیات کی
حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔ انہیں ہم VIRTUES کہہ سکتے
ہیں۔ ان تاثر اور قائم بالذات عناصر کے بغیر عہد حاضر کی
ترقی بے معنی بات ہے۔ مشہدی کا یہ انداز فکر ہر جگہ
دیکھا جا سکتا ہے۔ "اجنبی دیواریں" میں شاہد اپنے والد کی
اس عظیم الشان کوٹھی کی زبوں حالی پر تاسف کرتا ہے
جہاں اس کا بچپن گذرا ہے۔ وہ اگرچہ اب ایک بچے ماحول
میں ہے مگر ماضی کی اس فضا کے تحفظ کے لئے کوشاں ہے۔
"دوسرا کینسر" میں مادی زندگی کی آسودہ حالی سے زیادہ
قیمتی وہ شے نظر آتی ہے جس سے ہم روحانی طور پر مسرور
و شادماں رہ سکیں۔ یہ مسرت و شادمانی ہمیں اپنی
قدروں سے اٹوٹ تعلق کی بنا پر ہی حاصل ہو سکتی
ہیں۔ اسی لئے صدیقی کہتے ہیں کہ :

"یہ تمام عیش و عشرت کے سامان، کار، فرج
ٹی وی، یہ دولت PRIVATE'S کی
باتیں ہیں۔ ان تمام چیزوں کے حصول کے بعد
بھی انسان خوشی سے کوسوں دور رہتا ہے
میں نے اپنے لئے جو راستہ منتخب کیا ہے اسی
میں یہ سب کچھ نہیں ہے مگر سکون ہے۔"

(دوسرا کینسر)

[illegible]

[illegible] جانا اور اس کی مفلسی اور بیدردی کا [illegible]
کا احساس بھی [illegible]

ہے "ہتھیلیاں خالی ہیں" میں اختر علی اختر کے بوڑھے اور نادار ڈاکٹر نور کا کردار ہمیں ماضی کی روایات کی طرف لے جاتا ہے۔ "پتھروں کا شہر" میں نئے صنعتی شہر سے مراجعت کی روایات کی فضا میں روحانی سکون کا وسیلہ بن جاتی ہے۔ تجزیہ کیجئے کہ :

"میں واپس جا رہا ہوں ... وہیں اپنے چھوٹے سے شہر میں۔ جہاں لوگ اپنے چہرے جیبوں میں لیکر نہیں گھومتے۔ جس شہر میں جہاں لوگ جھوٹے خلوص اور جھوٹے اخلاق کا ماسک لگا کر نہیں ملتے۔ وہاں انسان اور انسان کے درمیان کا رشتہ ابھی ٹوٹا نہیں ہے۔"

(پتھروں کا شہر)

تمام مشہدی کے ڈراموں کے یہ سارے اقتباسات اور حوالہ جات ایک اور حقیقت تک پہنچاتے ہیں، وہ یہ ہے کہ مشہدی کے تمام ڈراموں میں فکری اور احتسابی کاوش موجود ہے۔ وہ ایک مخصوص نکتۂ نظر کے حامل ہیں۔ نئے واقعات و مسائل سے نتائج اخذ کرنے میں وہ ایک ایسا اصول اپناتے ہیں جس سے معاشرہ میں ذہنی و روحانی بشاشت قائم رہ سکے۔ مشہدی کا فن اپنی انتہا میں ہمیں ایک ابعد الطبیعاتی نظام کی طرف لے جاتا ہے۔ ایک ایسا نظام جہاں مادی خوش حالی اور سکون و اطمینان کے بجائے روحانی و مادی انبساط تلازمہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ مشہدی نے اس طرح اردو ڈرامہ کو ایک نئی سمت دکھانے کی کوشش کی ہے ... مگر اس گہرائی میں اترنے والوں کو ہر آن ایک نئے عمق کا اندازہ ہوتا ہے۔

معلوم نہیں اس منفرد راستہ پر مشہدی کتنی دور تک جا سکیں گے۔ کتنی دور تک ہمیں لے جا سکیں گے۔

از: ڈاکٹر نسیم شعوزی

ڈرامہ "اجنبی دیواریں" کا تجزیاتی مطالعہ

ڈرامہ ایک ایسا فن ہے جس میں انسانی نفسیات اور سماجی مسائل کی زندہ تصویر پیش کرتا ہے۔ [illegible]ت سے انکار ممکن نہیں کہ ایک عرصے تک ڈرامہ ہی تفریح کا ایک موثر ذریعہ رہا ہے۔ اگرچہ فلم کے آغاز [illegible] لوگوں میں ڈرامے سے دلچسپی کم ہوتی گئی۔ لیکن اس کے [illegible] ناظرین اور قارئین کا ایک مخصوص طبقہ ڈرامہ کو پسند [illegible] ہے۔ نتیجۃً عہد حاضر میں مختلف زبانوں میں ڈرامے [illegible] لکھے گئے میں نسبتاً کم ہی سہی برابر لکھے اور اسٹیج کئے [illegible]۔ ڈراموں کی پذیرائی میں ریڈیو اور ٹی وی نے بڑا اہم [illegible] کیا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ ریڈیائی اور ٹی وی [illegible] نے ناظرین بنائے اور لوگوں میں ڈراموں سے [illegible] پیدا کرائی ہے اپنے مکالموں کی وجہ سے تاثریت پیدا [illegible] جب کہ ٹی وی ڈرامے فلم کا احساس دلاتے [illegible]

دوسری زبانوں کے مقابلے میں اردو میں ڈرامے کی ترویج [illegible] نسبتاً کم رہا ہے۔ حالانکہ عہد قدیم [illegible] اور منظوم ڈرامے لکھے گئے تھے۔ ان [illegible] داستانوں اور دیومالائی کہانیوں کو منظوم شکل دی جاتی تھی۔ اس طرح اردو ڈرامہ اپنے [illegible] مختلف مراحل سے گزرا ہے۔

[illegible] کی [illegible] جب سے معاشرہ کو [illegible] مسائل پر توجہ دی۔ [illegible]

جدید ڈرامہ نگاروں کی نمائندگی کرتے ہیں چنانچہ ان کے ڈراموں کے مجموعہ "دوپہر کے بعد" میں شامل ڈرامے

۱۔ اجنبی دیواریں
۲۔ دوسرا کینسر
۳۔ دوپہر کے بعد
۴۔ انگلیاں فگار اپنی
۵۔ پتھروں کا شہر
۶۔ مٹھی بھر خاک وغیرہ

جدید معاشرے کی تہذیبی و اخلاقی قدروں کی جیتی جاگتی تصویر ہیں۔ ان تمام ڈراموں کا پس منظر بیسویں صدی کی آٹھویں دہائی کا متوسط تعلیم یافتہ طبقہ ہے۔

جدید معاشرہ ہر طرح سے تہذیب یافتہ ہونے کا دعویٰ کرتا ہے حالانکہ اس کے برعکس لوگوں کا خیال ہے کہ مغرب کی فرسودہ قدریں ہمارے یہاں بطور فیشن اپنائی جا رہی ہیں۔ نتیجتاً ہماری پرانی قدریں اور تہذیبی روایات پارینہ ہوتے جا رہے ہیں۔ جدت پسندی کے جنون نے اخلاقی پستی، موقع پرستی، ظاہرداری اور مصلحت پسندی کو فروغ دیا ہے۔ [illegible] شدت کے ساتھ دیکھا اور محسوس کیا ہے۔ چنانچہ ان کے ڈراموں میں [illegible] اور مسائل کی [illegible] ہیں۔ "دوپہر کے بعد" کے بیشتر ڈرامے ریڈیو پر نشر ہو چکے ہیں اور پسند بھی کئے گئے ہیں۔ ان ڈراموں کے سلسلے میں ہمارا خیال ہے کہ ان کے موضوعات

اچھوتے نہیں ہیں بلکہ ان موضوعات پر دوسرے ڈھنگ سے دیگر ڈرامہ نگاروں نے بھی نظر ڈالی ہے۔ اگرچہ شفیع مشہدی کے ڈراموں کے مکالموں کی برجستگی اور اس کا معنی خیز انداز دوسروں سے ممتاز اور مقبول بناتا ہے۔ شفیع مشہدی سماج کی دکھتی ہوئی نبض پر انگلی رکھتے ہیں۔ وہ سماج میں پھیلی ہوئی بے ایمانی، تعصب و تنگ نظری، رشوت خوری، ظاہرداری پر طنزیہ انداز میں مکالمے لکھ کر قاری اور سامعین کو سنجیدہ بنا دیتے ہیں۔ ان کا یہی طرزِ فکر ان کی انفرادیت کا ثبوت ہے۔

ڈرامہ "اجنبی دیواریں" میں واقعات اور کردار کی بھرمار ہے۔ لیکن شفیع مشہدی نے اسے بڑی چابکدستی سے تحریر کیا ہے اور تسلسل برقرار رکھنے میں کامیاب رہے ہیں۔

واقعات، ماحول، کردار میں کہیں جھول نظر نہیں آتا ہے۔ ڈرامہ کا ہیرو شاہد حرکی شخصیت (Dynamic personality) کا مالک ہے۔ دفتر میں وہ بااصول آفیسر ہوتے ہوئے بھی گھر میں روائتی شوہر ہے۔ دوستوں اور احبابوں میں چھا جانے کی شخصیت پیدا کرتا ہے۔ وہ ملنسار ہے۔ اس لئے دائرہ احباب وسیع ہے۔ بچپن جاگیردارانہ ماحول میں گذرنے کے باوجود بھی اس کی طبیعت اور مزاج میں سادگی اور ایک عام انسان سی زندگی گذارنے کی تمنا ہے۔ اس کی زندگی کی گاڑی محض تنخواہ پر چل رہی ہے۔ اس لئے وہ مقروض بھی ہے۔ اس کے باوجود بناوٹی شان و شوکت قائم رکھنے پر مجبور ہے۔ اس کے گھر پر دوستوں، احبابوں کی محفلیں برابر روشن ہوا کرتی ہیں۔ دوسری طرف کرسی کو درست کرانے کے لئے والد کے روپیہ منگانے پر ذہنی بیزاری کا اظہار کرتا ہے۔ اپنے عزیز دوست کے اچانک انتقال پر افسوس تو کرتا ہے لیکن دوسرے ہی لمحے اس بات کو سوچ کر چین و سکون کی سانس لیتا ہے کہ اب اسے چار ہزار کا قرض اپنے دوست کو واپس نہیں کرنا ہوگا۔ دفتر کی کامون میں تاخیر اور وہاں کے عملے کی چالبازیاں

دیکھ کر حیران بھی ہوتا ہے۔ ان واقعات میں شفیع مشہدی نے ڈرامے کے ہیرو شاہد کو آج کے معاشرہ کا نمائندہ کردار پیش کرنے میں بڑی محنت کی ہے۔

"اجنبی دیواریں" کے طنزیہ مکالمے بھی کشش کا باعث ہیں۔ چونکہ یہ ریڈیائی ڈرامہ ہے اس لئے مکالمے ہی اس کی جان ہیں۔ شفیع مشہدی نے جہاں طنز کرنا چاہا وہاں بڑی محنت اور برجستگی سے مکالمے لکھے ہیں۔ مثلاً جدید شہر کی فلک بوس اور خوش نما عمارتوں میں رہنے والا تہذیب یافتہ انسان اپنی روائتی قدروں سے کتنا دور ہوگیا ہے۔ اس کی مثال یوں ہے کہ اب لوگ اپنے نام اور پیشے سے نہیں جانے جاتے بلکہ فلیٹ اور مکان نمبر وں سے یاد کئے جاتے ہیں۔ آج ایک ہی محلے کی بات تو دور رہی، لوگ اپنے پڑوسیوں سے لاعلم اور لاتعلق ہیں۔ بڑے شہروں میں اگر آپ کو مکان نمبر، گلی نمبر نہیں معلوم ہے تو آپ کی رہنمائی کرنے والا کوئی نہیں ملے گا۔ اس جدید معاشرہ پر شفیع نے بھرپور طنز کیا ہے۔ یہ مکالمہ آپ بھی ملاحظہ فرمایئے:

شاہد: "کبھی کبھی عام لوگ بھی کس قدر ادبی بات کر جاتے ہیں۔ ڈاکٹر نے اپنا نام تین سو ایک بتایا ہے۔ کیا بھرپور طنز ہے زندگی پر۔ آدمی کتنا ترقی کر گیا۔۔۔ اب کوئی اسے نام سے نہیں جانتا۔ سب ایک دوسرے کو فلیٹ کے نمبروں سے جانتے ہیں تین سو ایک۔۔۔ ۔۔۔ تین سو دو، دو سو گیارہ ۔۔۔۔۔ ٹھیک ہی تو ہے اس پانچ منزلہ کنکریٹ کے جنگل میں انسان رہتے ہی کہاں ہیں۔ میں یہ نہیں جانتا کہ میرے اوپر کے فلیٹ میں کون رہتا ہے۔ حالانکہ اس کا بیڈ روم مجھ سے صرف آٹھ فٹ اونچا ہے۔ مگر یہ آٹھ فٹ کا فاصلہ آٹھ میل سے بھی زیادہ طویل ہے۔"

(اجنبی دیواریں، صفحہ ۔ ۹)

اسی طرح آج کا انسان خود کو بہت ہی وسیع القلب ظاہر کرتا ہے لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے کہ لوگ اپنے فرقے اور قوم کے محدود دائرے میں پہچانے جاتے ہیں۔ مثال اس واقعہ کو آپ بھی سن لیجئے۔

شاہد: بھائی صاحب! یہ جاگنے کی بات نہیں۔ اگر وہ بنگالی ہوتے تو میں سامنے گھوش بابو سے پتہ چلاتا ۔۔۔۔۔۔ کائستھ ہوتے تو پاس کے پرشاد صاحب سے دریافت کرتا اور برہمن ہوتے تو مصرا جی سے پوچھتا ۔۔۔۔۔۔ مشکل ہے نام کے سوا آپ کچھ بھی نہیں جانتے۔

("دوپہر کے بعد" ص ۱۰)

آجکل کچھ لوگوں کے نظریات اور عمل میں بڑا تضاد پایا جاتا ہے۔ ایسے لوگ دوسرے کے سامنے اپنے نظریات اس طرح پیش کریں گے کہ ان سے بڑا اصول پسند اور اپنے نظریات پر قائم رہنے والا کوئی دوسرا شخص نہیں ہے لیکن اس کے برعکس ان کی ذاتی زندگی میں برے عمل کچھ اور ہی انداز سے کیا جاتا ہے۔ شفیع مشہدی نے ایسا ہی موقع پرست کردار راشٹریہ بھاشا بھاگ کے پردھان چترویدی کا دکھایا ہے جو سرکاری دفتروں میں جا کر یہ دیکھتے ہیں کہ راشٹریہ بھاشا (قومی زبان) میں کتنا کام ہو رہا ہے۔ بظاہر انہیں انگریزی سے الرجی ہے لیکن انگریزی میں گفتگو کرنا، خط و کتابت کرنا فخر محسوس کرتے ہیں۔ یہی نہیں، اپنے بچے کو انگریزی میڈیم سے تعلیم دلانا لازمی سمجھتے ہیں۔ اس دوہری پالیسی اور نظریہ پر شفیع مشہدی نے کچھ اس انداز سے طنزیہ مکالمہ تحریر کیا ہے۔

شاہد (خود کلامی)

راشٹریہ بھاشا وبھاگ کے پردھان پرچارک اور اپنے بچے کو انگلش میڈیم سے ہی پڑھانا چاہتے ہیں ۔۔۔۔ واہ ری دنیا۔ راشٹریہ بھاشا دوسرے پڑھیں اور ہم انگریزی۔ double standards۔ مگر ٹھیک ہی ہے شاہد میاں ۔۔۔۔ دنیا اسی کا نام ہے ۔۔۔۔ انسان نہ جانے کتنی شخصیتوں میں بٹا ہوا ہے ۔۔۔۔ چہرے کے لئے کتنی نقاب رکھنے پڑتے ہیں ۔۔۔

(دوپہر کے بعد ص ۲۵)

اس ڈرامہ کا اختتام بڑا ہی معنی خیز اور طنز سے بھرپور ہے۔ اس سین میں شفیع مشہدی نے انسانی نفسیات کو دکھانے کی کوشش کی ہے۔ شفیع نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ جبلتیں انسان کے ضمیر کو بیچنے پر مجبور کر دیتی ہیں۔ ڈرامہ کا ہیرو شاہد اپنے ایک عزیز دوست کا چار ہزار روپیہ کا مقروض ہے۔ دوست نے اپنی زندگی میں کبھی روپیہ کی واپسی کا مطالبہ نہیں کرتا ہے لیکن اچانک دوست کے انتقال کی خبر معلوم ہوتی ہے۔ شاہد کو اس خبر سے بڑا رنج و ملال ہوتا ہے۔ لیکن دوسرے ہی لمحہ یہ سوچ کر چین وسکون کی سانس لیتا ہے کہ اب دوست کی موت کے ساتھ وہ قرض بھی دفن ہو جائے گا۔ لیکن دل ودماغ پر دوستی اور احسان فراموشی کے درمیان ایک شدید جنگ ہوتی رہی ہے۔ کبھی ضمیر مرتا تو کبھی ضمیر دھتکارتا نظر آتا ہے۔ اس منظر کے مکالمے کچھ اس طرح کے ہیں:

شاہد: (خود کلامی ۔۔۔ آہستہ آہستہ) حامد مر گیا ۔۔۔۔۔۔ بیچارہ میرا ہمدم، میرا دوست اور میرا رفیق مجھے چھوڑ کر چلا گیا۔ میرے بچپن کا دوست ۔۔۔۔ میرا محسن۔ چار ہزار اس نے مجھے قرض دیئے تھے اور آج تک کبھی تقاضا نہیں کیا اس نے ۔۔۔۔۔ اور اس کے چار ہزار ۔۔۔۔۔ کیسے واپس کروں گا۔ چار ہزار ۔۔۔۔ مگر اس کی بیوی کو تو اس کا علم ہوگا نہیں ۔۔۔۔ پھر واپس کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے ۔۔۔۔ حامد مر گیا ۔۔۔۔ اور چار ہزار ۔۔۔۔ وہ بھی مر گیا۔ (آواز میں خوشی کا اظہار ہے)۔

[دوپہر کے بعد ص ۳۵]

ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ شفیع مشہدی نے "اجنبی دیار" میں جدید معاشرے کی بھرپور کی بھرپور ترجمانی کی ہے۔ اس کے تمام کردار اپنے ماحول اور واقعات کے ساتھ زندہ جاوید نظر آتے ہیں۔ اس ڈرامہ کے واقعات ہمارے آس پاس کے ہیں۔ اس کے کردار چاہے شاہد ہوں یا چترویدی کا ہر جگہ مل جاتے ہیں۔ یقیناً "دوپہر کے بعد" کے سبھی ڈرامے معاصر مسائل کے زندہ ثبوت ہیں۔

بہار پنچایتی راج فنانس کارپوریشن لمیٹڈ

ایک جھلک

کمپنی ایکٹ ۱۹۵۶ء کے تحت صوبائی حکومت کے ذریعہ بنایا گیا یہ کارپوریشن ایک سرکاری ادارہ ہے۔ اِس کا خاص مقصد پنچایتی راج سنستھاؤں کو انکی ذرائع آمدنی والے پروگراموں کے لئے فنانشیل امداد کے ذریعہ انکی مالی حالت کو مضبوط بنانا ہے۔ اِس کارپوریشن کے ذریعہ گرام پنچایتوں کے ذریعہ سے ذاتی قرض کے ذریعہ انکی یوجناؤں جیسے گوبر گیس پلانٹ، گرامین سوچالئے، کام کرنے والے کمزور کلاس کے لئے اُن کے کاروبار کے لئے مبلغ /1000 (ایک ہزار) روپے تک کا کاروباری قرض بھی دیا جاتا ہے۔

سبھی ضلع پریشدوں اور پنچایت سمیتیوں سے گذارش ہے کہ اس کارپوریشن میں اپنا حصّہ پونجی خرید کر اسے اپنے پاؤں پر کھڑا کرنے کے لئے اپنا بھرپور تعاون دیں۔

فیض اکرم

(مینیجنگ ڈائریکٹر)

بہار پنچایتی راج فنانس کارپوریشن لمیٹڈ پٹنہ

ڈاکٹر عبدالقیوم ابدالی

شفیع مشہدی کے چند افسانے

نوٹ: ـــــ فاضل مضمون نگار کا یہ تاثر صرف پانچ افسانوں پر ہے۔ شفیع مشہدی کی دوسری کہانیاں، جیسے طوطے کا انتظار، گرتی دیواریں، کبوتر، پالکی وغیرہ اگر مضمون نگار کے سامنے ہوتیں تو انہیں افسانہ نگار سے شکایت نہ ہوتی۔ سبز پرندوں کا سفر، کے سلسلے میں علامتوں کی تشریح سے بھی اختلاف ممکن ہے مگر قاری کا تاثر بہر حال اپنی اہمیت کا حامل ہے۔ (ادارہ)

"شروع کرتا ہوں میں خداوندِ ادب کے نام سے جو جاہ و منصب عطا کرنے والا ہے، اور گواہی دیتا ہوں میں کہ نہیں ہے کوئی ادیب مگر تنقید نگار، جو ادب کے سچے رسول ہیں جنہیں ہماری رشد و ہدایت کے لئے بھیجا گیا ہے اور اعلان کرتا ہوں کہ تنقیدی مضمون ادب کی حدیث ہے"

یہ جملے جو "ہدایت نامہ ـ برائے تخلیقی فنکار" سے میں نقل کر رہا ہوں میرے لئے خصوصی دلچسپی کے باعث ہوئے تھے۔ اور پھر میں اسی جملے کے پورے ہدایت نامہ کو پڑھنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ سوال یہ ہے کہ کسی تخلیق میں وہ کونسی ایسی چیز ہوتی ہے جو اپنے قاری کو مجبور کر دیتی ہے کہ وہ اس تخلیق کو پورا پڑھ لے۔ ایسا نہیں ہے کہ تمام تر تخلیقات اپنے پڑھنے والے کو ایک ہی شدت سے متاثر کرتے ہیں۔ اور پڑھنے کے لئے ایک ہی تاثر چھوڑتی ہیں۔ موضوعات اور مشرکی یکسانیت کے باوجود وہ الگ الگ تخلیقات اپنے پڑھنے والے کو الگ الگ طرح سے متاثر کرتی ہیں۔ اور یہی الگ پن دراصل وہ تخلیقی انفرادیت ہے جو اپنے خالق کی الگ پہچان بناتی ہے۔ تنقید نگار خالقین ادب میں اسی انفرادیت کی تلاش کرتا ہے۔ اور جب کسی ادب پارے میں یہ انفرادیت اسے نہیں مل پاتی تو وہ مایوس ہوتا ہے۔ ضروری نہیں کہ ہر تنقید نگار ایمانداری سے اپنے تاثرات کا اظہار کرے۔ لیکن اگر کبھی کوئی تنقید نگار اس کی ہمت کرتا ہے تو اسے منکر کی ناراضگی کا بھی سامنا کرنا پڑتا ہے۔ میں اپنے اندر اتنی ہمت نہیں کر پاتا کہ اپنے آپ کو تنقید نگاروں کی صف میں شامل کر کے اور [illegible] کروں۔ اس لئے میں ایک قاری کی حیثیت سے اپنے تاثرات کا اظہار کرنے

ہی میں اپنی عافیت سمجھتا ہوں ۔

ایک قاری کی حیثیت سے میں کسی کہانی یا افسانے میں ان حساس انگلیوں کی تلاش کرتا ہوں ۔ جو کمال مشاقگی سے میری ان رگوں کو چھو سکیں ۔ جہاں گانٹھیں پڑ گئی ہیں بلکہ گانٹھیں ہی گانٹھیں ہیں ان نگاہوں کی تلاش کرتا ہوں جو میرے اندر ۔ اور اندر گہرائی میں اتر جائیں ۔ اور میرے احساسات و جذبات کی زبان بن جائیں ۔ اس تیر نیم کش کو تلاش کرتا ہوں جو میرے سینے میں ترازو ہو جائے ، اور ایک مستقل خلش کا باعث ہو اس تڑپ کی تلاش کرتا ہوں جو مچھلی کو خشکی میں پیش آتی ہے ۔ اور وہ تلخی تلاش کرتا ہوں جو مجھے ایسی لذت سے ہمکنار کر سکے ایک ایسی لذت جو معصوم بچے کو اس وقت ملتی ہے جو اپنے کلاس ٹیچر کو ہیڈ ماسٹر کو جھڑکتے ہوئے دیکھتا ہے اور مجھے یہ کہنے دیجئے کہ پوری دہائی ہندوستان میں اردو کہانیوں کے لئے منحوس ترین دن ہے ۔ اس پوری دہائی میں جس کے آدھے سے زائد سال اب گذرنے کو ہیں کوئی بھی ایسی شاہکار کہانی سامنے نہیں آئی ۔ جس میں متذکرہ بالا تمام چیزیں مل سکی ہوں ۔ جو مثلاً کہانی مجھے لکھتی ہے ، مالک ، پرندہ پکڑنے والی گاڑی ، صلیب ، ننگی دوپہر کا سپاہی ، کابوس ، گلی میں لٹکا ہوا بلب ، وغیرہ میں مل جاتی تھیں ۔

اور جہاں تک شفیع مشہدی کی افسانہ نگاری کا سوال ہے اس وقت میرے سامنے ان کی پانچ تخلیقات ہیں ۔ پہلی تخلیق وہ ہدایت نامہ ہی ہے جس کا ذکر میں نے اوپر کیا ہے ۔ اسے پڑھتے وقت ایک ایسی لذت کا احساس ہوتا ہے ۔ دل میں کہیں گدگدی سی ہونے لگتی ہے ۔ اور ایک گونہ سکون محسوس کرتا ہوں اسے آپ کہانی کہہ سکیں یا نہیں ، لیکن اس کی زبان اتنی تلخ اور طنزیہ ہے کہ روح و دل میں اترتی محسوس ہوتی ہے ۔ گو کہ اس میں بہت سے ایسے جملے یا خیالات ہیں جن سے میں متفق نہیں ہو سکتا ۔ تاہم اس ادب پارے کو پڑھتے وقت اس بات کا احساس ضرور ہوتا ہے کہ اس کے خالق کے ذہن و دل میں وہ سیال رواں دواں ہے جو نام نہاد ٹھیکیدار کی اس دنیا کو پھونک دینا چاہتا ہے ۔ اور اس کی جگہ ایک ایسے معاشرہ کا خواہش مند ہے ، ایسے حالات کا خواہاں ہے جہاں خالق کی شناخت ٹھیکیداروں کے سرٹیفکٹ سے نہیں ۔ بلکہ اس کے تخلیق کی بنیاد پر ہو ۔ شفیع مشہدی نے اس میں جو زبان استعمال کی ہے وہ "قرآن" کی ہے ۔ قرآن کریم یوں بھی ساری کائنات کو مخاطب کرتا ہے ۔ اور ساری دنیا کے لئے راہ نجات کی رہنمائی کرنے والی کتاب ہے ۔ اور خصوصاً اس کا وہ آہنگ جس کے لہجہ کو شفیع مشہدی نے مستعار لیا ہے ۔ اپنے اندر بے پناہ اپیل رکھتی ہے ۔ اس لہجہ میں جلال بھی ہے ، جمال بھی ، تنبیہہ بھی ہے شفقت بھی ۔ خالق کے بھڑکتے ہوئے جذبات و احساسات کو اس لہجہ نے دو آتشہ بنا دیا ہے ۔

اپنی دوسری کہانی "سبز پرندوں کا سفر" میں بھی شفیع مشہدی نے ایک مذہبی قصہ کو بنیاد بنایا ہے ۔ قصہ یوں ہے کہ جب ابرہا کی فوج نے خانۂ کعبہ پر حملہ کرنا چاہا تو حضرت عبدالمطلب نے خدا کے گھر کو خدا کے حوالے کر دیا ۔ اور عین اس وقت جب ابرہا کی فوج اپنے ہاتھیوں کے ساتھ خانہ کعبہ کی طرف بڑھ رہی تھی خدا تعالیٰ کے حکم سے سبز پرندوں نے کنکریوں سے ان پر حملہ کر دیا ۔ اور اس طرح وہ عظیم لشکر نیست و نابود ہو گیا ۔ شفیع مشہدی کا خیال ہے کہ آج ہندوستانی پارلیامنٹ کو وہی حالت درپیش ہے ۔ ابرہا کے ہاتھیوں کا حملہ مختلف سیاسی جماعتوں کے نمائندوں نے اس پر حملہ کر دیا ہے ۔ لیکن دور دور تک سبز پرندوں کا پتہ نہیں ہے ۔ کہانی کی بنت اچھی ہے اور پڑھنے والا تھوڑی دیر رک کر یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے لیکن یہاں مجھے جیلانی بانو کی کہانی یاد آتی ہے ۔ غالباً اس کا عنوان موسیٰ تھا ۔ اس میں جیلانی بانو نے بھی مذہبی

کو ایک نیا DIMENSION عطا کیا تھا۔ روئی کا ایک ٹکڑا اس کے لئے اس تجلی کے مترادف بن جاتا ہے جس نے طور کو جلا کر رکھ دیا تھا۔ شفیع مشہدی کی اس کہانی میں قاری رک کر یہ سوچتا ہے کہ کیا وہ لمحے اب پرندے نہیں آئیں گے۔ اور پھر مطمئن ہو جاتا ہے کہ میرے ذمہ کرنے کو یہ کام نہیں ہے لیکن موسیقی اپنے سننے والے کو جھنجھوڑ دیتا ہے اسے جامد و ساکت کر دیتا ہے اور اس کے سینے میں ایک تیر نیم کش ترازو ہو جاتا ہے جس کی خلش اس کو بے چین رکھتی ہے اسے محسوس ہوتا ہے کہ اگر آج اس نے کچھ نہیں کیا تو ممکن ہے اس کے اپنے بیٹے کو بھی یہ حالات درپیش ہوں۔ یہ تیر نیم کش شفیع کی کہانیوں میں ناپید ہے۔

شفیع کی اگلی تین کہانیاں متذکرہ بالا دونوں کہانیوں سے اس طرح الگ ہیں کہ ان میں واقعات کے بجائے منتشر خیالات کو مرکزیت حاصل رہتی ہے۔ کسی ایک منظر سے کہانی شروع ہوتی ہے کئی خیالات ایک دوسرے کے متوازی تو کبھی ایک دوسرے کو کاٹتے ہوئے اور کبھی ایک دوسرے میں گڈمڈ ہوتے ہوئے آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ ان تینوں کہانیوں پر 'الم' کی ایک دبیز چادر تنی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ جیسے اس کا ماضی سے زخمی، حال سے مایوس اور مستقبل سے ناامید ہو چکا ہے۔ اس کے ہاتھ اب اس حال میں ذرا سی ٹھیس سے کھرنڈ اکھڑ جاتی ہے۔ اور زخموں سے تازہ تازہ لہو بہنے لگتا ہے۔ کرچیاں کی [illegible] کی کھڑکی سے باہر جھانکتی ہے۔ تو اسے چرچ یارڈ کی بہت سی قبروں کے درمیان سفید سنگ مرمر کی ایک قبر نظر آتی ہے جس پر ایک سیاہ صلیب گڑی ہوئی ہے۔ اور وہ اپنے آپ کو بھی ایک قبر محسوس کرنے لگتی ہے۔ خیالات کے تانے بانے میں سے کہیں کہیں کہانی اپنا چہرہ دکھاتی ہے اور یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ محبوب کی دوری سے ہماری ہیروئین کی یہ حالت ہو گئی ہے۔ مکالمے بڑے دردناک ہیں اس لئے اکتا دیتے ہیں کہ محبت ایک ایسا سامان تعیش ہے جس کے بارے میں سوچ کر قاری اپنا وقت برباد کرنا نہیں چاہتا ہے اسے کہانی میں اور غموں کی تلاش بھی ہوتی ہے۔

"روشنی کی آگ" میں ہیرو 'لینڈ روم' میں سینکڑوں "میں" کی بھیڑ میں تنہا سہما بیٹھا روشنی دیکھتا جا رہا ہے۔ اس کی میز پر بھی چار مل، بیٹھے اجنبیت کی نقابیں کھینچ رہے ہیں۔ ہر طرف روشنی پھولوں کی آہٹ ہے اور آئینہ خانے کی جگمگاہٹ۔ آرکسٹرا کا شیشہ جھناکے کے ساتھ ٹوٹ رہا ہے موسیقی بہت تیز ہے (مگر پھر بھی اندھیرا ہے) سلینگ کی صلیب سے اجالوں کی منجمد زندہ لاشیں رنگ برنگے ملبوس ٹنگی ہیں جن سے قطرہ قطرہ خون رس رس کر فضا میں تحلیل ہو رہا ہے رعنائی کھلکھلا کر ہنس رہی ہے کیبرے کے نقرئی جام چھلک رہے ہیں۔ اور اسٹیٹس مین نے لکھا ہے

SHEFALI TAKES THE CITY BY STORM

شفالی طوفان کی طرح ڈانسنگ فلور پر آئی ہے۔ اور بجلی کی طرح آئینوں پر پھیل رہی ہے دودھیا روشنی میں اس کا سانولا جسم ایسا لگ رہا ہے جیسے ملگجے اندھیرے پر چاندنی کے پاؤں پھسل گئے ہوں۔ چاندنی کا پاؤں پھسلے یا نہیں پھسلے، شفیع مشہدی صاحب کے خیالات پھسل گئے ہیں کبھی وہ لینڈ روم کی دیواروں سے ٹکراتے ہیں تو کبھی ڈانسنگ فلور سے، کبھی تیز آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی روشنی سے شفالی کے جسم سے، کبھی [illegible] روشنی سے تو کبھی [illegible] اور انت

سلنگ کی صلیب سے ٹنگی روشنی کی لاشوں سے سرخ سرخ خون، قطرہ قطرہ رس رہا ہے۔

مگر قمقموں میں لال بتی کس نے لگادی ہے یہ ریڈلائٹ نہیں نہیں ـــــــ یہ ریڈلائٹ نہیں، ریڈلائٹ سوناگاچھی اور دال منڈیوں کو کہتے ہیں اور گوتم بدھا روڈ کو کہتے ہیں۔ یہ تو پوش ریستوران ہے جہاں نیلی شفالی ہے سلیمی جیکن ہے اور میں ہوں ـــــــ ؟

بھائی مشہدی صاحب آپ کا جذبہ صادق، آپ کے خیالات سر آنکھوں پر، واقعی ان پوش ہوٹلوں، اور ریڈلائٹ ایریاز میں کوئی فرق نہیں۔ مغربی تہذیب نے کیا کیا گل بوٹے نہیں کھلائے ہیں لیکن ریڈلائٹ ایریا کی منی بائی ہو یا لیڈ ورو تم کی شفالی ہو یا ہماری جھونپڑ پٹیوں میں رہنے والی معصوم و بے گناہ نیلی روز بکنے والی لڑکیاں ـــــــ کبھی ان کے اندر بھی جھانک کر دیکھئے، ضرورت احمد الجزمی صاحب کی نہیں۔ ضرورت منٹو، بیدی اور غیاث احمد گدی کی ہے۔ اردو کہانی کے آگے کا سفر۔ اس منزل کے آگے کا سفر ہے۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ اردو افسانے کا قاری آپ کو یاد رکھے تو آپ کو سلام بن رزاق کی طرح اس دیہاتی ماسٹر کے جذبات کا اسیر ہونا ہوگا۔ جو سب کچھ جانتے ہوئے بھی قاتل کا نام زبان پر نہیں لا سکتا۔ اور گاؤں چھوڑ کر جاتے وقت مقتول کے بچے کے جھولے پر وہ پیسے رکھ دیتا ہے جو اسے خاموشی کی قیمت کے طور پہ ملتے ہیں۔ شوکت حیات کی طرح اس نوجوان کے دکھ درد کا حصہ دار بننا ہوگا جس کی پرورش ماں کے پیٹ میں وٹامنس کی بجائے آنسوؤں سے ہوئی تھی۔ اور کچھ نہیں تو کم از کم مرحوم بیدی کی طرح اس نوجوان کے جذبات کی خبر رکھنی ہوگی جس نے صرف اس لئے ایک شریف عورت کا قتل کر دیا تھا کیونکہ وہ کسی پاک عورت کا وجود اس زمین پر برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

شونار ہرین، غالباً "شونار ہورین" یعنی سونے کا ہرن ہے۔ اس کہانی کا آغاز بہت ہی اچھا تھا۔ اس کی ہیروئین جب محبت کے بارے میں اپنے خیالات بیان کرتے ہوئے کہتی ہے

" IT IS AN ABSESSIVE PSYCHONEUROSIS "

تو بہت اچھا لگتا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے ایک MATURE لڑکی بہت ٹھہرے ہوئے انداز میں زندگی کو دیکھ اور سمجھ رہی ہے۔ لیکن جب اس کے ہیرو سے ملاقات ہوتی ہے تو بڑی مایوسی ہوتی ہے۔ بے چارہ زندگی کی سرنگ میں پھنس کر تھک گیا تو بے ہوش ہو کر گر پڑا، اور اس کا وہ سیاہ گھوڑا ابھی مر گیا جس پر اس نے بازی لگا رکھی تھی ــ شاید کہانی کا خالق تھک گیا ہے۔ زندگی کی دوڑ میں ہانپنے لگا ہے۔ جس تبدیلی کا وہ خواہش مند تھا اب اس سے مایوس ہو گیا ہے اور مجھے یہ کہانیاں شاید اس لئے متاثر نہیں کر پا رہی ہیں کیونکہ ذہنی طور پر میں اس مقام پر کھڑا ہوں جہاں خاموشی نئے طوفان کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔

ان تمام باتوں کے باوجود شفیع مشہدی کا اسلوب اپنے اندر ایک کشش رکھتا ہے۔ اور ان کی ایسی بہت سی کہانیاں مجھے یاد آ رہی ہیں جہاں ابھی زندگی کا سیال مادہ رواں دواں ہے۔

سید احمد قادری

شفیع مشہدی کی افسانہ نگاری

چھٹی دہائی میں جن افسانہ نگاروں نے اپنے فکر و احساس، سماجی، سیاسی شعور، مطالعہ کی گہرائی ہ کی بار یکی اور رفتی آگہی سے افسانوی ادب میں اپنا امیج اور اپنی پہچان بنائی ہے۔ ان میں شفیع مشہدی یت کا حامل ہے۔

شفیع مشہدی کے سامنے بھی وہی حالات، وہی ماحول، وہی زمانہ، وہی سماج تھا۔ جو ان کے ہم عصر نگاروں کا تھا۔ لیکن شفیع مشہدی نے ان حالات، ماحول، زمانہ اور سماج کو اپنی الگ زاویہ نگاہ سے سمجھا اور پرکھا۔ اور اس عمل کے بعد گہرے مطالعے اور مشاہدے کی روشنی میں جس موضوع کو افسانوی لہ حالا اس سے پورا پورا انصاف کیا۔ اور موضوعات کے TREATMENT اور زبان و بیان اور میں اپنی انفرادیت برقرار رکھی۔

شفیع مشہدی نے افسانے کم لکھے لیکن جو بھی لکھا بہت سوچ سمجھ کر لکھا، اور موضوعات، کردار، ت کی روح میں اتر کر لکھا۔ اور اپنی پوری، فنی فکری بصیرت، عصری حسیت اور احساسات و جذبات ت کا مظاہرہ کیا۔

جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے شفیع مشہدی نے بھی اپنے ابتدائی افسانوں میں حسن و عشق کو اپنے افسانو ع بنایا۔ لیکن جیسے جیسے ان کا سیاسی، سماجی، اور معاشی شعور بیدار ہوتا گیا، حیات و کائنات کے غ اور جستجو و آگہی کا عرفان حاصل ہوتا گیا ویسے ویسے ان کے افسانوں کے موضوعات بدلتے رہے و فن میں وسعت پیدا ہوتی گئی۔

جہاں تک مجھے علم ہے شفیع مشہدی نے اپنی افسانہ نگاری کا سفر "بیسویں صدی" سے شروع زمانے میں شفیع مشہدی کے افسانے بیسویں صدی میں شائع ہوا کرتے تھے اس زمانہ میں صدی کے افسانے ہر خاص و عام میں بے حد مقبول تھے۔ اور اس رسالہ میں آسمان ادب کے تقریباً رخشندہ ستارے نظر آتے تھے۔ ان دنوں بیسویں صدی کا جو مزاج اور معیار تھا۔ وہ اہم تھا۔ حسن و س رسالے کا خاص موضوع ہوا کرتا تھا۔ لیکن حسن و عشق کے واقعات بیان کرتے وقت افسانہ نگار شتوں کی ایسی تصویریں ضرور پیش کرتا تھا جنہیں دیکھ کر متاثر ہوئے بغیر نہیں رہا جا سکتا تھا فسانہ نگار اپنے مضمون اور TREATMENT سے اپنی انفرادیت بھی برقرار رکھ —

ایسے ہی افسانہ نگاروں میں شفیع مشہدی بھی تھے جنھوں نے حسن و عشق کے واقعات اور حادثات بیان کرتے وقت فرد اور سماج کے رشتوں کو فراموش نہیں کیا۔ اور اپنے منفرد اسلوب اور مخصوص زبان و بیان سے اپنی IDENTITY بنائی۔

لیکن پھر یہ ہوا کہ بیسویں صدی ۔ ثانی کے افسانوں کو اچھوت قرار دید یا گیا۔ بیانیہ انداز اور افسانہ سے افسانویت کے خاتمہ کی بات کی جانے لگی۔ علامتی، استعاراتی، تجریدی اور ABSARD افسانے راتوں رات شہرت پانے والے ناقدوں کے منظور نظر ہونے لگے۔ ایسے افسانوں میں کافکا، چیخوف، موپاساں کی روح نظر آنے لگی۔ اس بات سے قطع نظر کہ ایسے افسانے بس افسانہ نگار پڑھتے ہیں یا پھر ان کے ناقد۔ اس لئے کہ ایسے افسانوں کا رشتہ قاری سے ٹوٹ چکا تھا۔ افسانہ کے موضوعات بھی ذات کا کرب تنہائی گھٹن، خوف وغیرہ تک سمٹ گئے تھے، سماج سے تعلق بھی ختم کر دیا گیا ——— اور اس فیشن زدہ تجربہ میں ویسے لوگ بھی شامل ہو گئے جن کے افسانے اردو افسانہ نگاری کے معیار کو بلند کرتے تھے۔

اس گروپ میں شفیع مشہدی بھی تھے اور انہوں نے تیرہم کشی، درد بتہ جام، خون جگر ہونے تک، کرچیاں، سلوٹیں، گرتی دیواریں، طوطے کا انتظار، اور قہر درویش" وغیرہ جیسے بے حد خوب صورت اور معیاری افسانے لکھنے کے بعد عرفان آدم، شونار ہرن، اور روشنی کی آگ وغیرہ جیسے افسانے لکھے۔ لیکن چونکہ شفیع مشہدی کا افسانے کے فن پر گرفت مضبوط ہے اور وہ کہانی بننے کے گر سے بخوبی واقف ہیں اس لئے ان کے یہ افسانوں سے پڑھنے والوں کی بقول ڈاکٹر محمد حسن "کھوپڑیاں تو نہیں چٹخائیں" ہاں وہ تاثر، یا کیفیت اور وہ وابستگی نہیں پیدا ہو سکی۔ جو شفیع مشہدی کے افسانوں کا خاصہ ہے۔ علامت اور استعارے نے ابہام پیدا کر دیا۔ اور وہ بات جو شفیع مشہدی اپنے افسانوں کے ذریعے قاری تک پہونچانا چاہتے تھے وہ پوری طرح COMMUNICATE نہیں ہو سکیں۔

لیکن جب فیشن زدہ افسانہ نگاروں اور ان کے ناقدوں کو اس بات کا احساس ہو گیا کہ وہ اس طرح اپنے آپ کو نہ تو ESTABLISHED کر سکیں گے اور نہ ہی کوئی IDENTITY بنا سکیں گے تو پھر وہی لوگ جو افسانہ میں ANTI HERO، ANTI STORY اور ANTI PLOT کا ڈھنڈورا کی باتیں کرتے تھے وہ افسانہ میں افسانویت اور ماجرا کی باتیں کرنے لگے۔

ایسے حالات پر شفیع مشہدی کی بھی نگاہیں تھیں لہذا انہیں بھی یہ احساس ہو گیا کہ افسانہ کو معمہ بنانے سے کام نہیں چلے گا۔ اس لئے ان کے بعد کے جو افسانے سامنے آئے وہ نہ صرف یہ کہ عصر حاضر کی تمام تر کیفیتوں کی غمازی کرتے ہیں بلکہ زبردست سماجی شعور کا احساس دلاتے ہیں۔

اس ضمن میں شفیع مشہدی کا بڑا اہم افسانہ "جلدی کرو" پیش کیا جا سکتا ہے، جس میں مختلف SITUATION کا PICTURISATION کر کے تاثر کو ابھارا گیا ہے۔

اس افسانہ کا موضوع عصر حاضر کی بربریت، قتل و خون ہے۔ انسان کا لہو ہر جگہ بہہ رہا ہے کبھی بہار شریف میں، کبھی دلی میں، کبھی پنجاب میں، کبھی پرس بنگال میں، کبھی ..... اور ان انسانوں کی لاشوں سے لوگ اپنی، اپنی دکانیں سجا رہے ہیں۔

"...... اس لڑکی کی تصویر کلوز اپ میں لو جس کی گردن کٹی ہوئی ہے، لیس ویریگڈ، دیکھو، اس ننھے بچے کا فوٹو اس طرح لو کہ اس کے چہرے کی ساری AGONY

تصویر میں آ سکے، مگر اس کی آنکھیں تو کھلی ہوئی ہیں؟ YOU STUPID جو میں کہتا ہوں کرو، تمہیں کیا پتہ کہ اس کا DISPLAY میں تمثیل کو ریکارڈ کروں گا۔ اور اس کا CAPTION ..... جلدی کرو، لیس فنڈرفل، ویلی ڈن، مائی بوئے،
("جلدی کرو")

شفیع مشہدی کے افسانوں میں موضوعات کا تنوع ہے اور ہر موضوع کو گہری فکر اور فنی تقاضوں کے ساتھ نبھاتے ہیں۔ خواہ وہ "عروج آدم" ہو جس میں وجود انسانی اور اس کے اعمال پیش کیے گئے ہیں۔ یا "بیان" ہو جس میں داخل اور خارج کی کشمکش ہے۔ "شونار ہرن" ہو جو STREAM OF CONCIUSNESS کی تکنیک پر انسان کی محدودیت اور لامحدودیت کا موضوع ہو۔ "روشنی کی آگ" میں عصر حاضر کی کربناکی، گھٹن، استحصال، قتل اور غارت گری سے بیزاری کا اظہار ہو۔ یا فرقہ وارانہ فسادات کی علامتی اور تجریدی پیکر میں افسانہ "کبوتر" ہو یا پھر "تیرنیم کش" "زخم اور ناخن" اور "خون جگر ہونے تک" ہو، حسن و عشق کی نفسیاتی الجھنیں ہوں۔ سلولیس ہو جس میں تیکن عہد کا نظریہ حیات اور جلبنی کی گھٹی گھٹی فضا زندگی دیواریں" اور "ظلمت کا انتظار" ہو جس میں انسانی قدروں کا زوال سماجی رشتوں کا بکھراؤ ہو۔ ان تمام افسانوں کے موضوعات مختلف، تکنیک ایک دوسرے سے جدا، TREATMENT الگ ہیں۔

ان افسانوں کے علاوہ شفیع مشہدی کا افسانہ "قہر درویش" کا ذکر بھی ناگزیر ہے۔ جس میں بتایا گیا ہے کہ غربت اور افلاس، جنسی آسودگی میں مانع ثابت ہوتا ہے۔ مفلسی بہت ساری خواہشات کے ساتھ ساتھ جنسی خواہش کا بھی گلا گھونٹنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ اور یہ احساس جب دو جاتا ہے وہ بے چین اور بے قرار ہو جاتا ہے یہ افسانہ جنسی نفسیات کی خوب صورت مثال ہے، افسانے کے مرکزی کردار کو بھی بڑے پُر اثر، فنکارانہ، اور فطری انداز میں پیش کیا گیا ہے جس سے افسانہ کا حسن دوبالا ہو جاتا ہے۔

"اس پر اچانک ہی یہ انکشاف ہوا کہ وہ قبل از وقت بوڑھا ہو چکا ہے۔ اور پیار کرنے کے قابل نہیں رہا ہے۔ ایک شدید جھلاہٹ اس پر طاری ہو گئی اور اس نے جھٹکے سے ریحانہ کو پرے دھکیل دیا۔ تاریک کوٹھری میں اس کا دم گھٹنے لگا تھا۔ اس لئے وہ کوٹھری سے باہر چلا آیا۔

کوٹھری سے باہر کلو کی گھوڑی آنگن میں کھڑی تھی۔ اس کے پڑوسی جن تانگے والا کا گھوڑا، کھڑا بیٹھے پیار سے گھوڑی کی گردن چاٹ رہا تھا۔ چند لمحے کلو ان دونوں کو گھورتا رہا اور غصہ سے اس کا خون ابلنے لگا۔ اور وہ چابک لے کر دوڑا۔ گھوڑا اس اچانک حملے کو دیکھ کر بھاگ کھڑا ہوا۔ مگر گھوڑی تو کھونٹے سے بندھی تھی۔ کلو اپنی پوری طاقت سے گھوڑی پر چابک برسانے لگا۔ شراب کی آواز رات کی سناٹے میں گونجتی رہی۔ اور کھونٹے سے بندھی گھوڑی اس اچانک بوچھار سے پریشان ہو کر زور زور سے ہنہنانے لگی۔ اچانک کلو کا ہاتھ رک گیا ...... مگر دوسرے ہی لمحے اس کا چابک خود اس کے جسم پر نشان بنانے لگا۔ اس پر جنون سا طاری ہو گیا تھا۔ اپنے جسم پر چابک مارتے مارتے وہ نڈھال سا ہو گیا، گھوڑی کے سامنے ہی لیٹے ایک عجیب قسم کی آسودگی کا احساس ہوا۔ اور اس نے گھوڑی کی گردن میں بانہیں ڈال کر آنکھیں بند کر لیں ——" (قہر درویش)

[illegible] کیا

افسانہ "سبز پرندوں کا سفر" میں گرچہ علامتی اظہار بیان اپنایا گیا ہے لیکن اس افسانہ کا اور TREATMENT اسے اہم بناتا ہے۔ اور افسانہ کے مطالعہ سے شفیع مشہدی کا سماجی اور سیاسی شعور، فکری بصیرت اور فنی آگہی پوری طرح ابھر کر سامنے آگئی ہے۔ اور اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ فنکار ذہنی پرواز بلندیوں کو چھو رہا ہے۔

مفاد پرستی اور ریاکاری عہد حاضر کے سیاسی دور میں اس طرح رچ بس گئی ہے کہ وہ سماج اور سیاست کا حصہ معلوم ہونے لگی ہے۔ شفیع مشہدی نے ان برائیوں اور خامیوں کو بڑے فنکارانہ انداز میں مذکورہ افسانہ میں پیش کیا ہے۔ آج کا آدمی تھوڑے سے فائدے کے لئے سب کچھ کر گزرتا ہے۔ اقتدار، ہوس، اخلاقیات اور اقتصادیات سب پر اثر انداز ہو رہی ہے۔ اخلاقی قدریں زوال پذیر ہیں۔ انسانی رشتے پامال ہو رہے ہیں۔ لیکن ان سب باتوں سے بے نیاز لوگ اپنے اپنے مفاد میں مشغول ہیں۔

"جگدیش سنگھ نے لفافہ لیتے ہوئے کہا، حضور فکر نہ کریں، ہم پرانے کھلاڑی ہیں۔ کس کی جان بھاری ہے جو ووٹ دینے آئے گا۔ اتنے میں موذن کی اذان سے فضا گونج اٹھی۔ "حی علی الفلاح" کے الفاظ اس کی سماعت سے ٹکرا کر چور چور ہو گئے۔ طاہر حسین نے اٹھتے ہوئے کہا، ہاں بھئی! تمہیں لوگوں پر بھروسہ ہے اب میں چلا، نماز کا وقت ہو گیا ہے، بقیہ باتیں کل ہوں گی۔"

(سبز پرندوں کا سفر)

شفیع مشہدی کسی ازم سے وابستہ نہیں۔ لیکن زندگی کو دیکھنے، سمجھنے، اور برتنے کا اپنا ایک نظریہ رکھتے ہیں۔ اور تخلیقی لمحوں میں وہ کردار، واقعات، حادثات، پلاٹ، اور اپنے داخلی و خارجی احساسات و جذبات کے فطری تقاضوں کو پورا کرتے ہیں۔ وہ خود فرماتے ہیں۔

"میں نے ہمیشہ وہی لکھا ہے جو میں نے محسوس کیا ہے۔ کسی ازم، رجحان یا تحریک کا لبادہ اوڑھ کر مصلحتاً کورانہ تقلید کو فن کار کی بد دیانتی سمجھتا ہوں، مختلف ذہنی کیفیات اور ماحول میں ادیب مختلف رنگوں کی تخلیق کرتا ہے۔"

(شاخ لہو ——— کہانی سے پہلے)

منٹو، اور بیدی کی طرح شفیع مشہدی کے افسانوں میں انسان کی نفسیاتی کشمکش، الجھاؤ، بکھراؤ اور گتھیاں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ "تیر نیم کش" اور "زخم اور ناخن" "خون جگر ہونے تک" اور "دردِ تہہ جام" وغیرہ شفیع مشہدی کے ایسے افسانے ہیں جن میں مختلف انداز سے HUMAN PSYCHOLOGICAL COMPLEXES جیسے MASOCHISM, SADISM, NARCISSISM اور O'EDIPUS COMPLEX, وغیرہ کا بے حد خوبصورتی اور فن کارانہ انداز میں اظہار خیال کیا گیا ہے۔ ان تمام OBSERVATION اور OBSESSION میں کہیں پر بھی بوجھل پن کا احساس نہیں ہوتا۔ بلکہ یہ عنصر افسانہ کے جزو لاینفک کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔ جو میرے خیال سے شفیع مشہدی کے فن کا کمال ہے۔

ان مذکورہ بالا افسانوں کا CHARACTER خواہ وہ "تیر نیم کش" کے پروفیسر کاشانی کا ہو، "زخم اور ناخن" کی، ذکی ہو "خون جگر ہونے تک" کی کلثوم ہو، یا "دردِ تہہ جام" کا راشد ہو۔

ان تمام کرداروں کی تشکیل و ترتیب میں فنکار نے اپنی فکری بصیرت اور فنی آگہی کا زبردست ثبوت پیش کیا ہے حالانکہ ان افسانوں کا موضوع حسن و عشق اور اس کی نفسیاتی الجھنیں ہیں۔ لیکن ان میں جو فنکارانہ رچاؤ، لباؤ ہے وہ ان افسانوں کو اردو میں لکھے گئے چند اچھے نفسیاتی افسانوں کی صف میں لا کھڑا کرتے ہیں۔

"...... اس نے بڑھ کر فریم کو اٹھالیا، اور اپنی ہتھیلیوں اور سینوں کے درمیان اس زور سے بھینچا کہ شیشہ اس کی ہتھیلیوں میں پیوست ہو گیا۔ خون کی لکیریں ابھر آئیں خون رس رس کر اس کے کپڑوں میں جذب ہونے لگا۔ اس نے اپنی جلد پہ خون کے لمس کو محسوس کیا اور اسے ایک عجیب سے سکون کا احساس ہوا۔"

(خون جگر ہونے تک)

"۔ اور اچانک ذکی نے غیر شعوری طور پر کچے زخم میں بے دردی سے ناخن گاڑ کر، اس کی جلد نوچ لیا ——— تکلیف کی شدت سے اس کی چیخ نکل گئی۔ آنکھیں ڈبڈبا آئیں جلد پھٹ کر سرخ خون کی گرم گرم دھار ذکی کی مرمریں کلائی پہ پھیلتی گئی۔ اور ذکی کے چہرے پر آسودگی کے نقوش گہرے ہوتے گئے۔"

(زخم اور ناخن)

شفیع مشہدی نے اپنے شعور و احساس اور فکر و فن سے افسانوی ادب کو کئی اچھے افسانے دیئے ہیں اپنے خاص اسلوب خوب صورت اسٹائیل اور تیکھے انداز و بیان سے اپنی انفرادیت بھی برقرار رکھی ہے۔

بقیہ شفیع مشہدی ——— معصوم آدمی

میں دنگ رہ گیا۔ وقتی طور پر دکھ بھی ہوا۔ مگر چونکہ میں ان کے مزاج سے واقف تھا اس لئے زیادہ دکھ نہ ہوا۔

یہ باتیں بہت معمولی ہیں مگر اس کا تذکرہ صرف لئے ضروری تھا کہ یہ بات ظاہر ہو سکے کہ مشہدی جی اصول نہیں توڑ سکتے۔ وہ رشتے توڑ سکتے ہیں۔ دل توڑ سکتے ہیں، مگر اپنا اصول نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے بہت سے اپنے ان سے خفا رہتے ہیں کہ وہ ان کے لئے کچھ نہیں کرتے، آج جب دنیا میں ہر شخص اپنے اصولوں کو طاق میں رکھ کر اقربا پروری میں لگا ہے، تو اس دور میں مشہدی کی مثال اس چراغ کی سی ہے جسے جلا کر طوفان کی زد میں سر راہ رکھ دیا گیا ہو۔ تاکہ وہ لوگوں کی رہنمائی کر سکے۔

ظہیر صدیقی

شاخِ لہو (مختصر جائزہ)

"شاخِ لہو" شفیع مشہدی کے تیرہ (۱۳) افسانوں کا پہلا مجموعہ ہے۔ موضوع اور ماحول کے اعتبار سے افسانے مختلف النوع ہیں۔ شروع کے کچھ افسانوں کے اسلوب میں شعور کی رو سے کام لیا گیا ہے۔ اور انہیں دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ شفیع مشہدی کا صحیح اسلوب یہی ہے۔ اس کے بعد چار پانچ افسانے نفسیاتی موضوع پر ہیں افسانہ نگار کا وسیع علم جھلکتا ہے۔ اور پھر آخر میں تین افسانے اپنی سادگی میں پرکاری کی دولت رکھتے ہیں۔

سچ ہے افسانوں کے کردار میں افسانہ نگار کی شخصیت چھپی رہتی ہے۔ شفیع مشہدی ایک نیک دل انسان ہیں۔ غالباً اسی لئے شاخِ لہو کے افسانوں میں کوئی کردار بھی ویلن نہیں ہے۔ حالات اور ماحول کو زیادہ اہمیت حاصل ہے اس لئے ان کے افسانوں میں کوئی روایتی ہیرو بھی نہیں۔ شاخِ لہو کے افسانوں کے کردار معصوم مگر ذہین، رومان زدہ مگر حقیقت پسند ہیں۔ وہ خرابیٔ قسمت کے شکار تو ہیں مگر کسی کے شاکی نہیں۔ بیشتر کرداروں کا شیوہ، صبر و رضا اور تحمل و ایثار ہے۔ ایک طرف بجو جیسی جوان شخصیت بھی ہے جو بوڑھی ہونے کی حسرت لئے سوانی سی میں خواب آور گولیاں کھا کر ہمیشہ کے لئے سکون پا جاتی ہے۔ تو دوسری طرف خلیفہ جی اور عزیز ماموں بھی ہیں جن کے عہدِ شباب کی غیرت، حمیت، ہمت اور بہادری، ولولے اور جذبے جسم کی جھریوں میں دفن ہو جاتے ہیں۔ وہ تنا کی مٹی سفید اور خون سرخ ہے۔ اور جو پیکر خاکی ہونے کے باوجود ایک ناقابلِ تسخیر بلندی پر براجمان ہیں پرستش آج بھی ہوتی ہے۔ کچھ مذہبی خانقاہیں غریب اور معصوم عوام کا استحصال آج بھی کر رہی کا فن کارانہ اظہار "عروجِ آدم" میں کیا گیا ہے

"کرچیاں" ایک تاثراتی افسانہ ہے۔ مسرت کا جذ کا دونوں ہی ایک خطرناک نوعیت کی بے کیفی کے ا اور لاتعلقی بھی ممکن نہیں۔

"روشنی کی آگ" میں ایک زبردست Irony/ سے پیش کی گئی ہے۔ اہنسا کی بقا کے لئے ہنسا لاز تلخ سہی لیکن حقیقت پسندانہ خیال ہے۔ گوتم بد عرفان کا مظہر شانتی استوپا ——— شراب، شباب میں غلطاں گیان دھیان کے دعووں پر طنز کرتا نظر آ

"گرتی دیواریں" میں ایک معصوم ان پڑھ کا کردار بظاہراً ایک معمولی کہانی ہے۔ لیکن اعلانیہ پیشکش اور ح نے اس افسانے کو ایک حیثیت دے دی ہے۔ حضور بڑا ہی جان دار ہے۔ اسی طرح "طوطے کا انتظار" فنی میں آپ اپنی مثال ہے۔

جدید افسانوں میں ایک نقص عام ہے۔ و افسانوں کی زبان شاعری کے قریب تر ہوتی جا رہی ہے طرح صنفِ افسانہ کو ایک خطرہ لاحق ہو گیا ہے کہ وہ صنفِ شاعری میں ضم نہ ہو جائے اور اپنا مستقل کھو بیٹھے۔ شاخِ لہو کے افسانوں کو پڑھ کر اس بات کو طمانیت کا احساس ہوتا ہے جو افسانوں میں افسانو

یکہانی میں تلاش کرتے ہیں۔

ذران نفسیاتی افسانوں کا بھی ذکر ہو جائے جن کی طرف "شاخِ لہو" کے پیش لفظ میں خود افسانہ نگار نے ہماری توجہ دلائی ہے۔ افسانہ نگار کے مطابق "تیر نیم کش" "زخم اور ناخن" "خونِ جگر ہونے تک" اور "دردِ تہِ جام" بالترتیب سادیت، مسوریت (Masochism) نرگسیت اور Oedipus Complex کی جھلک پیش کرتے ہیں۔ افسانہ نگار اپنے دعوی میں حق بجانب ہے۔

لیکن مجھے یہ کہنے میں عار نہیں کہ ان افسانوں میں ایک عجیب نمایاں ہے۔ بھی افسانہ نفسیاتی ہو یا غیر نفسیاتی پہلی اور آخری شرط اس کا افسانہ ہونا ہے نہ کہ کوئی تھیوری پیش کرنا۔ ان افسانوں میں ایک بات کھٹکتی ہے وہ یہ کہ افسانہ نگار نے پہلے نفسیاتی نکتے دریافت کئے اور بعد ازاں نکتوں کی وضاحت کے لئے کردار تراشے ہیں۔ سوال کہ ہونا یہ تھا کہ افسانہ نگار کے ذہن میں کردار پہلے ابھرتے اور افسانوں میں ان کرداروں کی حرکات و سکنات سے ہم خود ہی کوئی نفسیاتی نکتہ تلاش کر لیتے۔

در اصل یہ چاروں افسانے نیچر کے قریب ہیں۔

جب نفسیاتی افسانوں کا ذکر چل ہی نکلا ہے تو "شاخِ لہو" کے ایک افسانہ کا ذکر خاصی ناگزیر ہے۔

"سلوٹیں" اگرچہ اس افسانہ کو افسانہ نگار نے نفسیاتی افسانوں کے زمرے میں شامل نہیں کیا ہے اور میں بھی اس پر نفسیاتی افسانے کا لیبل چپکانا نہیں چاہتا لیکن میرے خیال میں "سلوٹیں" معاشرتی قدروں میں بند ایک کامیاب نفسیاتی افسانہ ہے۔ جو ایک لڑکی ہے جس کا حسن و جمال چیچک کی نذر ہو چکا ہے۔ ایسی لڑکی سے کون شادی کرے اور لڑکی زیادہ دنوں تک گھر میں بٹھائی بھی تو نہیں جا سکتی۔ لہٰذا جب اس کے بالوں میں چاندی چمکنے لگتی ہے تو اس کی شادی ایک عمر رسیدہ مقبول شخص سے طے ہو جاتی ہے۔ چیچک کسی کی کا چہرہ تو چھین سکتی ہے لیکن اس کے جنسی ہیجان و ختم نہیں کر سکتی۔ اسی طرح ایک بڑھا، بدصورت جوان لڑکی سے شادی تو کر سکتا ہے لیکن اس کی جنسی تشنگی کو رفع نہیں کر سکتا۔ جو کی زندگی کا یہی المیہ اس کی نفسیات پر کاری ضرب لگاتا ہے۔ اعلیٰ متوسط طبقے کی ایک لڑکی جس کو خاندان اور مذہب کی اعلیٰ قدروں کا پاس ہے اور جو جنسی بے راہ روی پر موت کو ترجیح دیتی ہے جب اپنی جوان بہن کو شدت سے بھینچتی ہے تو اس کی ظاہرانہ شفقت Lesbianism میں تبدیل ہوتی نظر آتی ہے۔

اس گھناؤنے جذبے کو ختم کرنے پر وہ قادر نہیں تو کم از کم اس کی اپنی زندگی تو اس کے ہاتھ میں ہے۔ Homosexuality کی طرف مائل ایک آگ جب تہذیبی قدروں کی برف سے ٹکراتی ہے تو خود ہی پگھل جاتی ہے۔ جذبات کی سرکشی، معاشرتی قدروں کی گوشمالی سے دھیمی پڑ جاتی ہے۔

"شاخِ لہو" کے افسانے پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں اور مجھے یقین ہے کہ اگر آپ ان کامیاب اور منفرد افسانوں کا مطالعہ کریں گے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ آپ میری رائے سے اتفاق نہ کریں۔

بہار میں کمزور لوگوں کو مفت قانونی امداد

بہار حکومت نے کمزور کلاس کے لوگوں کو مفت قانونی امداد دینے کے لئے بہار ریاستی قانونی امدادی بورڈ کی تشکیل عمل میں لایا ہے۔ صوبائی حکومت نے اس سلسلہ میں ایک قانون بنایا ہے جس کا نام بہار ریاستی قانونی امدادی قانون ۱۹۸۳ء ہے۔ اس قانون کے تحت کسی آدمی کو کس طرح قانونی مدد مل سکتی ہے یہ نیچے بتایا گیا ہے:

مفت قانونی امداد کسے مل سکتی ہے

۱۔ ایسے سبھی لوگوں کو مفت قانونی مدد مل سکتی ہے جس کی سالانہ آمدنی پانچ ہزار روپے سے زیادہ نہ ہو۔

۲۔ اپاہج، انوسوچیت ذات، انوسوچیت جن ذات اور بے زمین مزدوروں کو یہ قانونی مدد ہر حالت میں دی جا سکتی ہے۔ بلکہ ان کی سالانہ آمدنی کچھ بھی ہو۔

قانونی امداد کی صورت

۱۔ ایسے وکیلوں کی ایک فہرست رہے گی جو غریبوں کو مفت قانونی مدد دیں گے۔ مقدموں کے سلسلہ میں وکیل قانونی صلاح دیں گے۔

۲۔ قانونی امداد دینے کے لئے ضلعی کمیٹی جھگڑا جھنجھٹ کی صلح سمجھوتہ کرانے کی بھی کوشش کریگی۔

۳۔ مقدمہ ہونے پر قانونی امداد کے لائق لوگوں کو مفت میں وکیل ملے گا۔ کورٹ فیس، گواہوں کا خرچ، دستاویزوں کی نقل کا خرچ وغیرہ بھی حکومت کی جانب سے کیا جائیگا۔

۴۔ اپیل کا بھی سارا خرچ حکومت کی جانب سے کیا جائیگا۔ یہ سارے اخراجات مفت میں کئے جائینگے۔

۵۔ ریل حادثہ، بس، موٹر، ٹرک وغیرہ سے حادثہ، ناؤ یا اسٹیمر وغیرہ سے حادثہ ہونے پر گھائل اور بے سہارا لوگوں کو بھی قانونی مدد دی جائیگی۔

کس طرح قانونی مدد حاصل کی جا سکتی ہے

۱۔ حکومت نے غریبوں کو مفت قانونی مدد دینے کے لئے ہائی کورٹ پٹنہ اور رانچی میں قانونی امدادی کمیٹی بنائی ہے ہر ایک ضلعی ہیڈ کوارٹر میں اور سب ڈویژن میں قانونی امدادی بنی ہے جو بھی قانونی امداد حاصل کرنا چاہتے ہیں وہ اپنے علاقے کی کمیٹی کے پاس جا سکتے ہیں۔

۲۔ قانونی امداد جو حاصل کرنا چاہتے ہیں انھیں اپنے علاقے کی قانونی امدادی کمیٹی کے پاس جانا چاہیئے۔

۳۔ درخواست دہندوں کو درخواست کا فارم دیا جائیگا۔ اس میں مانگی گئی تفصیل درخواست دہندہ دیں گے۔

۴۔ درخواست دہندہ جو انفارمیشن دیں گے اس کی سچائی کے سلسلے میں وہ ممبر سکریٹری کے سامنے حلف لیں گے۔

براہ کرم نزدیکی ضلعی یا ڈویژنل قانونی امدادی کمیٹی سے یا بورڈ کے سکریٹری سے رابطہ قائم کریں

انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشن ڈیپارٹمنٹ بہار

(सू० ज० स० वि०-41-ख (सू-39)/84-85)

ڈاکٹر انجم فاطمی

شفیع مشہدی کی شاعری میری نظر میں

شاعری کا مطالعہ دراصل شاعر کے سارے وجود کا مطالعہ ہے۔ جو اس کے دل کی گہرائیوں سے
ہوئی پکار کی صورت میں ہمارے سامنے آتی ہے۔ شاعر اشاروں اشاروں میں وہ باتیں کہہ جاتا ہے
س کی داستان ہے اور یہ داستان اتنی ہمہ گیر اور ہمہ جہت ہوتی ہے کہ وہ ہر دل کی زبان بن جاتی ہے
اچھی شاعری دل سے نکلی ہوئی ایک صدا ہے۔ جسے سن کر انسان اپنا کلیجہ تھام لیتا ہے۔ اور وہ یہ محسوس
ہے کہ یہ تو اس کے ہی دل کی بات ہے۔ دراصل ایک بڑا شاعر وہ ہے جو آپ بیتی کو جگ بیتی بنا دیتا ہے
شاعری دل کے تاروں کو چھونے کی صلاحیت نہیں رکھتی تو پھر وہ لفظوں کی بازی گری ہے۔ ایک بڑا شاعر
ی کے ہر موڑ پر اور تاریخ کے ہر بہاؤ پر اپنا رشتہ زندگی کی نامیاتی قدروں سے استوار رکھتا ہے شاعری
کلام موزوں نہیں۔ بلکہ کچھ اور ہی ہے۔ اور یہ 'کچھ اور' سمجھانے اور سمجھنے کی چیز نہیں۔ بلکہ محسوس کرنے کی
شاعری جب باعث ننگ اور ذریعہ عزت نہیں تھی، اس وقت بھی شاعر نگری نگری گھوم گھوم کر عشق
ت، دلبری، شجاعت، سیر و تفریح اور ان جانے دیسوں کا نغمہ گایا کرتا تھا۔ اس کی آواز
کے تاروں کو چھوتی تھی۔ اور اس کے نغمے جانی پہچانی دھرتی کے گیت ہوتے تھے۔ اور ہزاروں دلوں
دھڑکنیں اس کے نغموں کے ساتھ ہوتی تھیں۔ وہ دھرتی کا رشتہ آسمانوں سے جا ملاتا تھا۔ اور آفاق
بے پناہ وسعتوں میں اپنے وجود کو گم کر دیتا تھا۔ وہ اپنے خون جگر سے معجزۂ فن کی تخلیق کرتا تھا۔ اس کے فن
نہ کوئی ناقد کرتا، اور نہ اس کی شاعری کے تجزیے یونیورسٹیوں کے ریسرچ اسکالر اور پروفیسر
تے تھے۔ اور نہ اس کی شاعری پر عالمانہ اور فاضلانہ مقالے قلم بند کئے جاتے۔ اور نہ ہی ان پر
پی ایچ ڈی کی ڈگری مرحمت کی جاتی۔ اس کا رشتہ تو ان معصوم دلوں سے ہوتا جو اس کی آواز کو اپنی
از سمجھتے۔

وقت اور زمانہ ایک سیل رواں ہے۔ جس کی موجیں بڑی سے بڑی تہذیب کو بہا کر اتھاہ اور بے
ں دھندلکوں میں لے کر گم ہو گئیں، جہاں تاریخ کی پکار بھی سنائی نہیں دیتی بجز اسے نہیں فرمانروا
ان کے بنائے ہوئے احکام اسی سیل رواں کی نذر ہو گئے۔ لیکن کچھ چیزیں ایسی بھی تھیں جو زمانے
وقت کے دست برد سے محفوظ رہیں۔ اور بعض جبلت انسانی کے وہ گوشے جو ابدی ہیں۔ اور جن کا
ق دل سے ہے شاعری اور اعلیٰ شاعری جبلت انسانی کے ان ہی گوشوں کو منور کرتی ہے، ایک

بڑا شاعر اپنی بصیرت سے ہر دور اور ہر زمانے میں ایک ایک روشن مینار تعمیر کرتا ہے جس کی روشنی دنیا کو منور کرتی ہے۔ چنانچہ ہر دور اور ہر زمانے میں ایسے شاعر ضرور ہوئے ہیں جن کے نغمے ہر دل کی آواز بن گئے ہیں۔ اردو میں قلی قطب شاہ، اور ولی اور پھر میر، مومن اور غالب سے لے کر انیس، جوش، اقبال، جگر، فانی، اصغر، فراق، فیض، ناصر کاظمی اور کشور ناہید تک کے سفر مختلف تہذیب اور اقدار کا سفر ہے۔ اس سفر میں نہ کہیں سنگ میل ہے اور نہ منزل، صرف راستے ہیں اور یہ وہ نقوش ہیں جنھیں ان لوگوں نے اپنے نقوش پا کے راستوں میں اجالے بکھیرے ہیں۔ ان فنکاروں نے جن روایتوں کو جنم دیا اور جو نقوش پا چھوڑے ان پر چلنے والوں کی تعداد کا شمار نہ آسان ہے اور نہ ممکن۔ ایسی بات نہیں کہ ان کے علاوہ سارے شعرا محض تقلید کے سزاوار ہیں بلکہ بہت سے ایسے شعرا بھی ہیں جن کے نام اس فہرست میں نہیں، جن کی اپنی انفرادی حیثیت بھی ہے۔ اور ممکن ہے وہ اپنے دور کے نمائندہ فنکار بھی ہوں۔ یہ نام محض ادوار کے رجحانات کی نمائندگی کے طور پر لئے گئے ہیں۔ بڑا شاعر وہ ہے جو اپنے فن سے زمانے کو متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ جس کی آواز اس وقت اور اس زمانے کی آواز بن جاتی ہے۔ چنانچہ جب شاعری میں کسی نئے نام کو دیکھتا ہوں تو ذہن میں کرید یہ ضرور رہتی ہے کہ اس کی شاعری وقت اور زمانے کے ساز سے ہم آہنگ ہے یا نہیں۔

چنانچہ جب میں شفیع مشہدی کی شاعری سے اچانک متعارف ہوا تو ذہن میں وہ کرید تھی۔ شفیع مشہدی میرے دوست ہیں، اب تک میں انہیں ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے جانتا تھا۔ بڑی پیاری شخصیت ہے ان کی۔ ادب اور شاعری کے عاشق زار بلکہ اگر انہیں دیوانۂ اردو کہوں تو بیجا نہ ہوگا۔ میں اب تک انہیں ایک اچھا نثر نگار سمجھتا تھا۔ چنانچہ جب برادر عزیز جمیل منظر ان کا کلام میرے سامنے لائے اور ان کی شاعری پر کچھ لکھنے کی فرمائش کی۔ تو میں چونک پڑا اور غالباً اسی لئے میں نے کہا میں ان کی شاعری سے اچانک متعارف ہوا۔ ایک اچھے شاعر کی پہچان یہ ہے کہ وہ ایک معصوم طبیعت کا مالک ہو۔ شاعری اور معصومیت کا رشتہ بڑا گہرا ہے جس طرح فن کا دائرہ لامحدود ہے اسی طرح معصومیت بھی بیکراں اور لامحدود ہے۔ معصومیت کی حصار بندی نہیں ہو سکتی، یہ تو ایک ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر ہے، تنگ نظری اور تعصب، جہل اور فرعونیت کی حصار بندی ہو سکتی ہے اس لئے کہ ان کا دائرہ بہت تنگ ہے۔ یہ عارضی اور وقتی چیزیں ہیں۔ وقت کے گزر جانے کے بعد نہ فرعون رہتا ہے اور نہ فرعونیت۔ تنگ نظری رہتی ہے نہ تعصب اور جہل۔ وقت کا سیل انہیں بہا کر ایسی جگہ لے جاتا ہے جہاں ایک بے کراں اور بے پناہ خاموشی مسلط رہتی ہے۔ تاریخ انسانی اور تاریخ ادب اس بات کے گواہ ہیں کہ دنیائے موجودات اور دنیائے ادب نے ایک سے ایک جابر، برسر اقتدار اور فرعون صفت کو دیکھا ہے۔ جن کے جبر و اقتدار اور فرعونیت نے عام زندگی کو اجیرن بنا رکھا تھا۔ اور جنھوں نے امن و سکون سے جینے والوں پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا تھا۔ لیکن وقت نے انہیں گمنامی کے اس اتھاہ سمندر میں غرق کر دیا جہاں سوائے سکوت کے کچھ بھی نہیں۔ دنیائے ادب میں بھی بڑے بڑے فرعون صفت پیدا ہوئے جو اپنے دور کے بڑے عالم اور فاضل مانے گئے، جنھیں ناقدوں، حاشیہ نشینوں، اور اہل ہوس نے ان کے علم کے ایسے ایسے نغمے گائے، ان کی ایسی ایسی تعریفیں کیں اور ان کی شان میں ایسے قصیدہ خوانیاں ہوئیں جنھیں سن کر اہل فہم کے ہوش اڑ گئے۔ لیکن بے پایاں کار وقت نے انہیں اس طرح ٹھکرایا کہ ادب کی دنیا میں ان کی حیثیت کھوٹے

ملے سے زیادہ پسند کی۔ اس لئے کہ شاعری کے لئے بنیادی صفت معصومیت ہے وہ ان میں شامل ہی ہے۔ معصومیت جب انسان کو آفاقی سطح پر لے آتا ہے اور انسانی بلندی تک پہونچا دیتا ہے جہاں فرشتے پر بھی لرزنے لگتے ہیں۔ اس لئے میرے خیال میں سب سے بڑا ناقد، سب سے بڑا معیار وقت ہے۔ وقت ہی کو اس کے صحیح مقام پر پہونچا دیتا ہے۔ یہ کسی انسان کے بس کی بات نہیں کہ وہ اپنے زور قلم سے کسی کو کچھ بنا دے۔ اور وقتی طور پر اگر وہ ایسا کر لیتا ہے۔ (اور لوگوں نے ایسا کیا بھی ہے) تو یہ نہایت ایک عارضی وقتی چیز ہوتی ہے۔ اگر کسی ناقد کے بس میں ہوتا تو آج ہمارے سامنے میر ہوتے نہ سودا، غالب ہوتے نہ انیس ہوتے نہ دبیر، شاد ہوتے نہ اقبال، جوش ہوتے نہ جگر، اور فراق ہوتے نہ فیض۔ تو ہوتا کون؟ اس کا اندازہ خود اہل نظر لگا سکتے ہیں۔ اور اگر ایسا ہوتا تو پھر ہماری شاعری کا کیا ہوتی۔ یہ سوچ کر دل لرز اٹھتا ہے۔ شفیع مشہدی کو بحیثیت انسان جب جب میں نے دیکھا ان کی طبیعت میں فنکار کی معصومیت مجھے ملی۔ میں نہیں جانتا کہ اس دنیا کے بدحواسی میں شفیع مشہدی کس طرح زندگی گزارتے ہیں۔ اور فی الحال ابھی میرا یہ موضوع بھی نہیں۔ مجھے تو ان کی شاعری کا جائزہ لینا ہے۔ فن کے لئے میرے خیال میں معصومیت ایک لازمی شرط ہے اب دیکھنا یہ ہے کہ انہوں نے اپنی شاعری میں اس شرط اولین کو برتا ہے یا نہیں؟ اگر ان کی شاعری تقاضے کے ساتھ سے ہم آہنگ ہے، تو بنا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان میں ایک اچھے شاعر ہونے کی علامات اور امکانات ہیں۔ شفیع مشہدی کی شاعری کے جو نمونے میرے سامنے ہیں وہ اس قدر مختصر ہیں کہ اس پر بھرپور تبصرہ ممکن نہیں۔ پھر بھی اتنا تو کہا جا سکتا ہے کہ ابھی ان کی شاعری ناقد کے ڈسکشن ٹیبل پر لانے کے قابل نہیں ہو پائی ہے۔ ان کی شاعری کے جو کچھ بھی نمونے میرے پیش نظر ہیں۔ انہیں دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے زندگی کے مسائل اور ان کی الجھنوں کو نہایت ایمانداری اور دیانت داری کے ساتھ سمجھا ہے۔ اور سمجھ کر انہیں اپنی شاعری میں پیش کیا ہے۔ شفیع مشہدی کو اس بات کا بخوبی اندازہ ہے کہ عصر حاضر کا انسان بتدریج اپنی شناخت کھوتا جا رہا ہے۔ اور اس دنیا کے بھیڑ بھاڑ میں اس کی اپنی پہچان گم ہو گئی ہے۔ ان کے نزدیک دور حاضر کی سب سے بڑی ٹریجڈی ہے۔ کہ انسان بھیڑ بھاڑ کی دنیا میں مسلسل اپنا چہرہ تلاش کرتا پھر رہا ہے ؎

نگار خانے میں بے چہرگی کا میلا تھا میں زندگی بھر مناظر میں بھی اکیلا تھا!

وہ پڑھتا رہتا ہے مجھ کو کتاب کی صورت خود اپنے چہرے پہ میں نے تو کچھ لکھا بھی نہیں

انسان جب اپنی شناخت کھو دیتا ہے تو تنہائی کا زہر چیونٹیوں کی طرح اس کے رگ و پے میں اترنے لگتا ہے۔ چیونٹیوں کی سرسراہٹ جب اس کے رگ و پے میں رینگنے لگتی ہے تو وہ ایک ایسے اندرونی کرب اور ذہنی عذاب میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ جہاں اس کا سارا وجود، ساری شخصیت اور ساری پہچان پکے پھوڑے کی طرح اذیتناک ہو جاتی ہے ؎

ہماری روح تو پہلے ہی سے لکھ دیا تھا کسی وگرنہ ٹوٹ ہی جاتا یہ پسلیوں کا قفس

شکستہ قبروں کے لاشے بھی مجھ سے بہتر ہیں کم از کم ان کو قیامت کا انتظار تو ہے

تیزروں پہ کبھی اگ دسکا برگ حلاوت　　وہ شخص ببولوں کو، کھڑا چوس رہا ہے

شفیع مشہدی کو اپنی بات بین السطور (BETWEEN THE LINES) میں کہنے کا فن آتا ہے ؎

ہم اپنے قتل کا الزام کس کے سر دیتے　　زمانے بھر کی نگاہوں میں وہ مسیحا تھا

یہ شعر نہیں طنز ہے اور بھرپور طنز ہے، منافقت اور اس دور کے مسیحا بن پرجس کا لبادہ اوڑھ کر ابن الوقت، شرافت ایمانداری اور ایثار و مروت کا سبق دنیا کو پڑھا رہے ہیں اسی تناظر میں ایک اور شعر دیکھئے ؎

ہر ایک ہاتھ میں پتھر تھا میں نشانہ تھا　　گناہ گار وہاں اور کوئی تھا بھی نہیں

غزل گرچہ ایک مشکل ترین صنف سخن ہے اور کامل ریاض اور فن پر مضبوط دسترس کے متقاضی ہے پھر بھی شفیع مشہدی نے اس فن کو بڑی خوب صورتی سے برتا ہے۔ ان کی غزلوں کے بعض اشعار بڑے خوبصورت ہیں ؎

دو گھڑی بھاگتے لمحوں کو منا لیں ہم لوگ　　آؤ سرسوں کو ہتھیلی پہ جما لیں ہم لوگ

زمیں کو چھوڑ کر ہم بھاگ کر کہاں جاتے　　سمندروں کی طرح آسمان بھی نیلا تھا

ہر ایک راہ کے پتھر سے پوچھتا ہوگا　　غبار راہ اب بھی مجھے ڈھونڈتا ہوگا۔

جسم کے زخم ہی سب دیکھے ہیں روح کے گھاؤ دکھائے کون
سب مصلوب کے نوحہ خواں ہیں درد صلیب اٹھائے کون

شفیع مشہدی کی شاعری کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے اپنا رشتہ زمین سے استوار رکھا ہے۔ اور زندگی کی تلخی، ناکامی، اور کرب کو انہوں نے اس طرح محسوس کیا ہے جیسے یہ تمام چیزیں ان کی روح میں رچ بس گئی ہوں۔ انہوں نے تجربات کو شاعری کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے اور اس کے لئے انہوں نے تشبیہوں اور استعاروں کا سہارا لیا ہے۔ تشبیہوں کا کم اور استعاروں کا زیادہ، ان کے کلام کا استعارتی انداز ان کی شاعری کے کینوس کو وسیع کر دیتا ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری میں جن علامتوں کا استعمال کیا ہے۔ اگرچہ وہ نئی نہیں ہیں۔ لیکن نئے تناظر میں ان کا استعمال انہیں معنی آفرینی عطا کرتا ہے۔ ایک اچھی شاعری کی یہ بھی پہچان ہے کہ علامتوں کو نئے انداز دیئے جائیں مثلاً ان کی نظم "ابابیل" میں گرچہ ابابیل کی علامت پرانی اور فرسودہ ہو چکی ہے لیکن شفیع مشہدی نے اس کو اس انداز میں پیش کیا کہ یہ علامت جدید عہد کا استعارہ بن گئی ہے "برگد" بھی ایک علامتی نظم ہے جس میں شاعر اپنے دلی تمنا کا اظہار کرتا ہے۔ کاش ایسا ہوتا۔ اور ایسی تمنا ہر شخص کے دل میں موجزن رہتی ہے۔ اس لئے کہ انسان بنیادی طور پر ایک درد مند دل کا مالک ہوتا ہے۔ اور نیکی اور بھلائی کا احساس اس کے دل کے کسی نہ کسی گوشے میں چھپا ہوتا ہے۔ اور جب بھی موقع ملتا ہے یہ جذبہ شعور کے حصار کو توڑ کر امنڈ پڑتا ہے۔

اس نظم میں برگد اور ریگزار دو ایسی علامتیں ہیں جن سے انسان اچھی طرح واقف ہے اور عصر حاضر میں تو یہ علامتیں خواب نہیں حقیقت بن گئی ہیں۔ اس نظم کا ماخذ گرچہ بہت قدیم ہے لیکن شاعر نے اسے نئے دور کی کامیاب علامت بنا کر پیش کیا ہے۔ اس کے علاوہ زیرو آور (ZERO HOUR) میں انہوں نے ٹوٹتے بکھرتے رشتوں کو بڑی خوبی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ یہاں گھر ایک اندرونی کرب کی علامت ہے جہاں سال نواس کرب کو اور بڑھا دیتا ہے۔ مقتل شہر تمنا کی ترکیب اسی اذیت اور کربناکی کی جانب اشارہ ہے۔ جو اس عہد کا زبردست المیہ بن چکا ہے ایسا المیہ جہاں ہر جانب DISTRUST اور DISILLUSERMENT کی گہری تاریکی چھائی ہوئی ہے، شاعر اس تاریکی میں اعتبار اور اعتماد کی ہلکی سی روشنی تلاش کر رہا ہے۔ روشنی کی تلاش بین السطور میں ہے۔ اور گھر کی خواہش لاشعور کے نہاں خانے میں۔ اس نظم میں حسرت تعمیر کی الم کی شدت سے ابھر آنے کے لئے بے تاب ہے۔ شاعر جو کچھ کہنا چاہتا ہے وہ کہہ نہیں پاتا یا اپنی خواہش کا اظہار بھی نہیں کر پاتا۔ وہ صرف اپنی جھنجلاہٹ بے دلی اور FRUSTRATION کی ہی بات کہہ کر رہ جاتا ہے۔
ان کی ایک اور نظم جس نے متاثر کیا 'انتظار' ہے۔ اس نظم میں انہوں نے استعاروں کے ذریعہ موجودہ دور کے VIOLENCE یعنی تشدد، خون ریزی اور ظلم کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہاں آفتاب ایک ایسا استعارہ ہے جسے وہ لوگ اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں جو اس سرزمین پر ہونے والے تشدد کے چشم دید گواہ رہے ہیں یا اس تشدد یا بربریت کے کسی نہ کسی طور پر شکار ہوئے ہیں۔ آفتاب ان کے لئے، ان کی زندگی کے لئے ایک ایسی علامت ہے جس کا شدت کے ساتھ انہوں نے ان ہولناک مناظر میں انتظار کیا ہوگا۔ اس نظم میں جتنی بھی علامتیں، مثلاً صلیب، مسیحا نفس، فصیل شہر، سیل خوں اور آفتاب استعمال ہوئی ہیں اپنے اندر بڑی معنویت رکھتی ہیں۔ اور کمزور، مجبور اور بے سہارا انسان کی مجبوری، بے چارگی اور بے کسی کو پیش کرتی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ظلم کا بڑھتا ہوا سیلاب کسی کے روکے نہیں رک سکے گا۔ فصیل شہر اب خستہ ہو چکی۔ پرانے اخلاقی اقدار کے باندھ اس سیل تشدد کو نہ روک سکیں گے، سارے سماج میں ظلم اور تشدد کا دار و رہے ہے۔ اور یہ ظلم و تشدد پرانی اخلاقی قدروں کو پامال کرتا جا رہا ہے۔ اس طرح کے خیالات کوئی نئے نہیں ہیں لیکن شاعر نے انہیں بڑے سلیقے سے پیش کیا ہے۔ اور نظم کو استعاراتی لہجہ دیا ہے۔ اور شاید یہی اس نظم کی سب سے بڑی خوبی ہے۔
شفیع مشہدی نے غزلوں میں بھی استعاراتی انداز اپنایا ہے اور علامتوں کے ذریعہ پیکر تراشی کی ہے۔

جلوس نعرے لگاتے ہوئے گذرتے رہے　　　فراز دار پہ لیکن وہی اکیلا تھا

سلیٹ کے دیکھا تھا اتنا تو یاد ہے مجھ کو　　　پھر اس کے بعد وہ پتھر ہی بن گیا ہوگا

ہر ایک ہاتھ میں پتھر تھا میں نشانہ تھا　　　گنہگار وہاں اور کوئی تھا بھی نہیں

تمام جسم ہے شیشے کا مشہدی اپنا　　　وہ بے نیاز ادھر سنگ پھینکتا بھی نہیں

یہ پیکر تراشی معاملاتی حسن لئے ہوئے ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی کہیں کہیں ان کی غزلوں کے اشعار میں ناہمواری بری طرح کھٹکتی ہے۔ ایسا وہاں ہوتا ہے جب تجربات فن سے پوری طرح ہم آہنگ نہیں ہوتے، مثال کے طور پر یہ شعر دیکھئے ؎

ریت کا گھر تھا اگر آج بچا بھی لیتے، کل اسے کالی ہوا نے گرایا ہوتا

اس شعر میں دونوں مصرعے ایک دوسرے کی تکمیل نہیں کرتے یا ایک دوسرے کو CORRESPOND نہیں کر پاتے۔ پڑھنے والے کو یہ احساس تو ہوتا ہے کہ شاعر کیا کہنا چاہتا ہے لیکن شاعر بذات خود اپنے مافی الضمیر کو بلا کم و کاست بیان نہیں کر پاتا۔ اور اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ فن پر شاعر کی گرفت مضبوط نہیں جس کی وجہ سے ناہمواری پیدا ہو گئی ہے۔ بچا بھی لیتے، اور گرایا ہوتا، ایک دوسرے کو خیال کے اعتبار سے CORRESPOND نہیں کر پاتے، اور ایک مکمل IMAGE نہیں بن پاتا۔ اسی طرح اس شعر میں ؎

میرا افسانہ ہی پانی پہ لکھا تھا ورنہ، جانے کس کس کو ہواؤں نے سنایا ہوتا

مفہوم پوری طرح واضح نہیں ہوتا۔ اور اس میں بھی وہ کمی ہے جو پہلے شعر میں تھی۔ غزل کے اشعار میں اگر خیالات پوری طرح واضح نہ ہوں تو یہ اس کا عیب ہے۔ جس سے بڑے بڑے اساتذہ بھی بچے ہوئے نہیں۔ حسین اور بلند پایہ خیالات کو اگر شگفتہ حسن بیان نہ ملے تو خیالات کی رفعت اور بلندی خاک میں مل جائے گی۔ حسن بیان اور بلندی خیال کو الگ الگ نہیں کیا جا سکتا۔ گویا ان کا تال میل DICTION اور THOUGHT کا ہے۔ شفیع مشہدی کی غزلوں کو بچھ اور نکھرنا اور سنورنا ہے غزل ایک کافر صنف سخن ہے۔ اور جس نے اس کافر کو رام کر لیا۔ اس نے گویا عشق کی پہلی منزل پا لی۔ غزل ایک ایسی صنف سخن ہے جس کی وسعت کا اندازہ لگانا دشوار ہی نہیں محال بھی ہے یہ ایک زندہ اور متحرک صنف ادب ہے۔ اور اردو شاعری کی آبرو۔ اس کے کوچے میں قدم رکھنے سے پہلے انتہائی احتیاط اور آداب جنوں کی ضرورت ہے۔ یہاں کی شراب اس قدر تیز و تند ہے جو آبگینے کو بھی پگھلا دیتی ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ کوئی اس کافر کے کوچے میں قدم رکھے ہی نہیں، شرط صرف آداب کوچہ گردی کی ہے —

ظہیر صدیقی

اشارے

ایک ذہین فنکار اپنی شخصیت کے اظہار کے لئے کوئی ایک صنف سخن اختیار کر لیتا ہے لیکن کچھ
وں کے مزاج میں بکھراؤ ہوتا ہے ۔ اور وہ اپنی شخصیت اور فن کے اظہار کے لئے کسی ایک صنف پر
ت نہیں کرتے ۔ وہ شعری اور نثری متعدد اصناف میں طبع آزمائی کرتے ہیں ۔ اردو ادب میں احمد ندیم
طرح بہت کم ایسے قلم کار ہیں جو بیک وقت ایک کامیاب افسانہ نگار اور مستند شاعر ہیں ۔ ورنہ عام طور
ہی ہوا کہ اگر کسی ایک صنف نے ان کے ادبی تجربہ کے اظہار کو کلی اطمینان بخشا تو وہ اسی صنف کے

یہ ایک الگ بحث ہے کہ ایک فنکار کے لئے کسی صنف سخن کا اختیار کرنا شعوری عمل ہے یا لاشعوری
سلسلے میں بہتر فیصلہ خود فن کار ہی کر سکتے ہیں ۔ ہاں ! ایک بات جس پر بیشتر قلم کار متفق ہیں کہ مواد یا
ے اپنے ساتھ ہی مناسب اور حسب ہیئت و اسلوب لیکر صفحۂ قرطاس پر جلوہ گر ہوتا ہے ۔
بہر حال ! اس بکھراؤ سے یہ وقتی اور معمولی فائدہ تو ضرور ہوتا ہے کہ ادب کے تاریخ داں کبھی نہ کبھی
نہ کہیں ایسے فن کاروں کے تذکرے پر مجبور ہو جاتے ہیں ، رسالوں کے افسانہ و ڈرامہ نمبر میں بھی نگارشا
نگاہ ہوتی ہیں اور غزل و نظم نمبر میں بھی ایسے فنکاروں کی تخلیقات قارئین کی آنکھوں کو خیرہ کرتی ہیں ۔
ایسے فن کاروں کو نت نئی شہرت کی دولت حاصل ہوتی ہے ۔ اور وہ خاموش ہوتے ہیں یہ دیکھ کر

چمن میں چار سو بکھری ہوئی ہے داستاں میری

مگر بکھراؤ سے دوسری طرف نقصان بھی ہوتا ہے ۔ ایک شخصیت کئی خانوں میں بٹ جاتی ہے ۔ کئی
ے کے تصویر کی طرح عجیب فن کار کھینچا تانی کا شکار ہو جاتا ہے ظاہر ہے کئی خانوں میں بٹی ہوئی شخصیت
ت طبع کے باوجود کسی ایک حیثیت سے مضبوط و توانا نہیں ہو پاتی ۔ اہل ذوق کے ذہنوں میں
صحیح فنکارانہ حیثیت مسلم نہیں ہوتی ۔ یا یوں کہا جائے کہ باذوق قارئین اس کی فنکارانہ حیثیت
ملک متاثر نہیں ہو پاتے جس کا وہ مستحق ہے ۔
شفیع مشہدی کی شاعرانہ حیثیت کے ساتھ بھی المیہ گذرا ہے ۔ شفیع مشہدی ایک پختہ مشق
شاعر ہیں اور غالباً انہوں نے نئی اظہار کی شروعات غزلوں سے کی ہے ۔ بعد میں انہوں نے
بھی لکھے ۔ اور متعدد ریڈیائی ڈرامے لکھے ۔ اور پھر ان ریڈیائی ڈراموں میں چند ڈراموں کو اسٹیج
کئے جانے کے قابل بنایا اور ان ڈراموں کو کامیابی کے ساتھ اسٹیج بھی کیا ۔

ان کے افسانوں کا مجموعہ بہت پہلے منظر عام پر آچکا ہے ۔ اور پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا گیا ۔ ڈراموں کا ایک مجموعہ بھی کافی مقبول ہوا ہے ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ادب کے قارئین نے ان کو افسانہ نگار اور ڈرامہ نگار سمجھ لیا ۔ اور ان کی فنکارانہ حیثیت کا تیسرا رخ جو میرے خیال میں زیادہ تابناک ہے ۔ پس پشت چلا گیا ۔ اور ان کی شاعرانہ حیثیت ثانوی ہو گئی ۔ اس حقیقت کے باوجود کہ خصوصی نشستوں اور مشاعروں میں ان کی شعری تخلیقات کافی مقبول ثابت ہوتی رہی ہیں ۔ اور وہ اپنے اشعار سنا کر قارئین سے داد تحسین کے ڈونگرے وصول کرتے رہے ہیں ۔ ان کی شاعری عوامی مقبولیت کی حامل رہی ہے ، جی ہاں ! شاعر شفیع مشہدی کو قبولیت عام حاصل ہے ۔ لیکن اس سے آپ یہ نتیجہ نہ اخذ کر لیں کہ ان کی شاعری عوام کے بگڑے ہوئے ذوق کو مطمئن کرتی ہے ۔ اور خدانخواستہ معیار سے گری ہوئی ہے بلکہ مقبولیت کی وجہ ان کی شاعری کا ابہام سے پاک ہونا ہے ۔

آج کل قارئین کی ایک عام شکایت ہے کہ آج کی شاعری ابہام سے پُر ہے ۔ بیشتر جدید شعرا کا کلام فہم و ادراک سے بالاتر ہے ۔ لہٰذا قارئین تلاش کرتے ہیں ایسے شاعر کی شاعری ، جن کی شاعری ان کی قوت فہم سے بڑھ کر نہ ہو ۔ قارئین یا سامعین کو اگر کوئی ایسا شاعر نظر آجاتا ہے جن کے کلام تک ان کی رسائی آسان ہو تو ایسے شاعر کو اس پُر آشوب دور میں ایک غنیمت ہستی سمجھتے ہیں

شفیع مشہدی کا کلام ابہام سے پاک ہے لوگوں کی سمجھ سے باہر نہیں ۔ اس لئے ان کی شاعری بھی قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے ۔

شفیع مشہدی کی شاعری کی پسندیدگی کی دوسری وجہ ان کی مقصدیت اور آئیڈیل ہے ۔

ہر وہ معاشرہ جو اخلاقی زوال کا شکار ہو ۔ اس کے افراد کا کوئی آئیڈیل یا واضح نصب العین نہیں رہ گیا ہو ۔ فنکار یا شاعر کے یہاں آئیڈیل تلاش کرتا ہے ۔ خراب معاشرہ کے افراد اپنی زندگی کا جائزہ نہیں لیتے ۔ اپنے اعمال کو نہیں دیکھتے ، وہ شاعری دیکھتے ہیں ۔ اور جب وہ یہ دیکھتے ہیں کہ کسی شاعر کے یہاں اخلاقی قدروں کا احترام ہے ، صحت مند تعمیری ذہن کی بازی گری ہے تو وہ اس شاعر کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں ۔

خراب معاشرہ کے افراد منافق ہوتے ہیں ۔ ان کا دل گھٹیا اور فحش لٹریچر کی طرف مائل ہوتا ہے ۔ مگر زبان اخلاقیات کے درس و تبلیغ پر رطب اللسان رہتی ہے ۔

شفیع مشہدی اپنی شاعری میں باضابطہ آئیڈیل رکھتے ہیں وہ حسین اخلاقی قدروں کا محض احترام ہی نہیں کرتے بلکہ اسے قابل تقلید بھی سمجھتے ہیں ۔ سنتے ہیں برگد کا پیڑ اپنے سائے میں کسی دوسرے پودے کو پروان چڑھنے نہیں دیتا ۔ ہو سکتا ہے یہ صحیح ہو ، لیکن شفیع مشہدی کی آنکھیں یہ دیکھتی ہیں کہ برگد کے گھنے اور ٹھنڈے سائے دھوپ کی تمازت میں چلتے ہوئے تھکے ، ماندے مسافروں کو آرام پہونچاتے ہیں ۔ شفیع مشہدی کی نگاہ مثبت پہلوؤں پر رہتی ہے ۔ برسوں پہلے برگد بونے کا نیک عمل ایک شاعر کے لئے آج بھی قابل تقلید ہے ۔ اس کی خواہش ہے کہ وہ بھی ایسا ہی ایک پیڑ اگائے جس کے سائے میں خلق خدا کو آرام ہو ۔ شاعر کے دل میں پیڑ بونے کی روایت کا احترام ہے ۔ لیکن چونکہ وہ جدید ذہن بھی رکھتا ہے اس کا اس لئے ایثار بے لوث نہیں ۔ وہ تھکے ماندے مسافروں کو صرف

پہونچانا نہیں چاہتا بلکہ اس کی خواہش یہ ہے کہ آرام کرتے ہوئے مسافر اس نیک عمل کے بدلے میں پیڑ
لگانے والے کو یاد بھی کر لیا کریں۔ (نظم "برگد")

شفیع مشہدی کو انسان اور انسانیت کے دشمنوں سے خدا واسطے کا بیر تھا۔ سیاست کے
...ں نے نیوکلیر ہتھیار بنا کر دنیا کو نیست و نابود کرنے کا تہیہ کر رکھا ہے۔ اور خدا کے کام کو اپنے ہاتھ میں
...یا ہے۔ (قیامت)

ان زمینی خداؤں نے اس دنیا کو بغض و کدورت کا خاکدان بنا رکھا ہے اصلاح کی کوئی صورت
...ہر طرف مایوسی ہے۔ اب کسی مسیح کا انتظار بھی عبث ہے انتظار ہے تو آفتاب کا جو آ کے سوا نیزے
...جلا کر راکھ کر دے اس خاکدان کو۔ (انتظار آفتاب)

انسان کی ازلی معصومیت ایک قابل قدر چیز ہے۔ جس کو ہم اپنی عمروں کے تیز رفتار گاڑی پر
...پیچھے چھوڑتے جا رہے ہیں۔ اور یہ نہیں سمجھتے کہ کتنی قیمتی شئے ہماری دسترس سے دور ہوتی جا
...ہے۔ (بیٹے کے نام)

شفیع مشہدی خدا کو نہیں ڈھونڈتے، شعری جواز یہ دیتے ہیں کہ وہ نایاب نہیں وہ تو ہر
جو رہے اس کا ملنا آسان ہے دشوار ہے تو آدمی کا ملنا، لیکن شاہراہوں، کوچوں، گلیوں،
...ں اور عبادت گاہوں میں جو یہ چلتی پھرتی مخلوق نظر آتی ہے کیا یہ آدمی نہیں ہے۔ پھر یہ کیسی
...ہے۔ ہاں! یہ آدمی ہی ہیں، شاعر کو معلوم ہے۔ لیکن وہ محسوس کرتا ہے کہ مکمل آدمی نہیں
یہ سب لوگ آدھے، ادھورے ہیں۔ معلومات اور محسوسات کا یہ بین فرق شاعر کے آئیڈیل
...حق کاری عطا کرتا ہے۔ (تم کہاں ہو)

شفیع مشہدی اپنی نظموں میں لطیف مگر برجستہ طنز بھی کرتے ہیں۔ ان کا طنزیہ لہجہ بظاہر
...یدہ ہوتا ہے۔ لیکن اس میں کاٹ بلا کی ہوتی ہے۔ اخبارات کو جدید دور میں آسمانی صحیفہ کا درجہ
...ہے۔ چوری، ڈاکہ زنی، عصمت دری، اور قتل و غارت گری کا علم ہمیں اخباروں سے ہوتا ہے۔
...کی اشاعت بند ہے تو آج کے لوگوں کے لئے جرائم بھی بند ہیں۔ اخبارات صحیفۂ آسمانی ہیں۔
(ہڑتال کا دن)

دل کا کعبہ ہی مسمار ہو گیا تو بچا کیا۔ کعبۂ دل کی محافظ کی آنکھیں ابابیلوں کی راہ تکتے تکتے پتھرا گئی ہیں۔
شفیع مشہدی یہ نہیں چاہتے کہ یہ خاکدان سوا نیزے پر آئے ہوئے آفتاب کی زد میں آ جائے
...سیاست کے خدا چاہتے ہیں۔ مشہدی زمینی خداؤں کی خود غرض ظالمانہ حرکتوں پر نوحہ کناں
...ہا شاعر پہ یہ الزام نہیں آ سکتا کہ اُس کا میلان منفی ہے۔ بات دراصل ہے آئیڈیل کی۔ وہ
...ہا جو اس دنیا کے وجود کا ضامن ہے۔ اور جس کی بدولت یہ دنیا حسین ہے۔ جب نہیں ملا تو پھر
...نیا کا رہنا نہ رہنا برابر ہے

مسیح کا انتظار تو ہے اور اس کے نزول کا یقین بھی، لیکن خرابی بسیار نے شاعر کو مایوس کر دیا
...ت کچھ ایسے ہیں کہ محسوس ہوتا ہے کہ اب کوئی مسیح نہیں آئے گا۔ جو دنیا کو اس کے دکھوں سے
دلا سکے۔

شفیع مشہدی اپنی غزلوں میں بھی اپنے آئیڈیل کو نہیں بھولے۔ لیکن ان کی غزلیں نظموں کے مقابلے میں زیادہ رعنائی کی حامل ہیں۔ ان کی غزلیں نئے موضوعات اور بدلتے ہوئے آہنگ کی دولت سے مالا مال ہیں۔ تقریباً ہر شعر سماج کے ناسور پر انگلی ہے۔

ان کی غزلیں روایتی قدروں کا احترام کرتی ہیں۔ اور ساتھ ہی ساتھ جدید حسیت کی دولت سے مالا مال ہیں۔ ان کی غزلوں میں شعری تجربہ کی سچائی زیادہ اجاگر ہے۔ غزلوں میں موضوعات کا تنوع ہے لیکن سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ثقیل سیاسی اور سماجی موضوعات شعری پیکر میں ڈھل کر لطیف اور گوارا ہو جاتے ہیں۔ ان کی غزلوں میں ان کا آئیڈیل زیریں لہروں میں اپنی پوری تابناکی کے ساتھ روشن رہتا ہے۔ لیکن بالائی سطح پر فن کی حکمرانی رہتی ہے۔ غزلوں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ شفیع مشہدی پہلے ایک فنکار ہیں اور بعد میں ایک آئیڈیلسٹ۔

شفیع مشہدی ایک ذمہ دار فنکار ہیں۔ وہ فن کے التزامات کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں اور اپنی اس کوشش میں کامیاب بھی ہیں۔ لیکن وہ ایک ذمہ دار انسان بھی ہیں۔ بلکہ سچ پوچھئے تو بحیثیت انسان اپنی ذمہ داری کے احساس کو مقدم سمجھتے ہیں۔ ان کی معدودے چند غزلوں میں متعدد غزلیں فرقہ وارانہ فسادات کے موضوع پر ہیں۔ فرقہ وارانہ فسادات ہماری قومی زندگی کا بڑے ہی بھیانک اور تاریک پہلو ہیں۔ شفیع مشہدی کی نگاہ جب ان بھیانک پہلوؤں پر پڑتی ہے تو ان کے اندر کا فنکار اس حد تک مضطرب ہو جاتا ہے کہ اس کے قلم کی ساری جولانی سمٹ کر ظالموں کو بے نقاب کرنے کی کوشش میں مصروف ہو جاتی ہے۔ ایسے عالم میں شفیع مشہدی کی تغزل پسندی تلخ لب و لہجہ اختیار کر لیتی ہے۔ اور وہ سماج کے ان رستے ہوئے ناسوروں کی جراحی میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ غم و غصے کے اس طوفان میں ان کی طبعی شرافت ان کو سہارا دیتی ہے۔

وہ چونکہ طبعاً شریف آدمی ہیں۔ اس لئے ان کے اندر کا فنکار بھی شرافت طبع کو ہر لمحہ ملحوظ رکھتا ہے۔ سماج کی ان ناقابل تسخیر برائیوں کو پا کر ان کے اندر جو غم و غصہ کا طوفان اٹھتا ہے وہ طنز کا روپ لے لیتا ہے۔ ان کے طنز میں کاٹ تو ہے لیکن طبعی شرافت اس کو ارتفاع عطا کرتی ہے۔ اور ان کے اندر اٹھتا ہوا طوفان تخریب کے بجائے تعمیر کی طرف لے جاتا ہے۔

میں نے ان سطور میں شفیع مشہدی کی شاعری کا سرسری جائزہ لیا ہے۔ ان کی شاعرانہ حیثیت یا مقام متعین کرنے کی کوشش نہیں کی ہے۔ اس کی وجہ صاف ہے شفیع مشہدی کی شاعری ہنوز کچھ اور اونچائی کی طرف گامزن ہے۔ منزل ابھی دور ہے۔ یوں بھی شاعری راہ ہے منزل نہیں۔ انسانی ذہن تخلیق کی طرف مسلسل رواں دواں ہے۔ یہ تسلسل ازل سے جاری ہے اور ابد تک محو سفر ہے۔ شفیع مشہدی ہوں یا کوئی دوسرا مخلص جدید شاعر محض ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ میری تقاریر فرسائی یعنی ان تجزیاتی اشاروں کے بعد شفیع مشہدی کی نظمیں اور غزلیں شامل اشاعت ہیں۔ یہ نظمیں اور غزلیں کسی قسم کی سفارش یا تنقیدی رائے سے زیادہ اہمیت کی حامل ہیں۔ باذوق قارئین پر میں اپنی رائے تھوپنا نہیں چاہتا اور نہ زیادہ دیر شاعر اور ان کے درمیان حائل رہنا چاہتا ہوں۔ آئیے ہم شاعری سے لطف اندوز ہوں اور اس کے بارے میں اپنی ذاتی رائے قائم کریں۔

شفیع مشہدی

سبز پرندوں کا سفر

اس نے آنکھیں کھولیں تو سیاہ ہیبت ناک پیکر اپنے بھاری پیروں کے ساتھ پتھر کی چوکور عمارت کی جانب جارحانہ انداز سے بڑھ رہے تھے اور ایسا لگ رہا تھا جیسے چند لمحوں میں وہ اس چوکور عمارت کو خاک میں ملا دیں گے کہ اچانک آسمان پر سبز پرندوں کا سیل رواں اپنی چونچ اور پنجوں میں تین تین کنکریاں لے کر نازل ہوا۔ اور دیکھتے دیکھتے سیاہ ہیبت ناک پیکر مانند بھوس کھائے زمین بوس ہو گیا۔

اس نے سیاہ ہیبت ناک پیکروں کے ڈھیر کی طرف اور پھر چھوٹے سبز پرندوں کی طرف حیرت و تشکر سے دیکھا اور آنکھیں بند کر لیں۔

نہ جانے وہ کتنی صدیوں تک سوتا رہا تھا۔ ایک اگر کی خوشبو اور دور سے آتی آوازوں نے اس کی آنکھیں کھول دیں۔

پتھروں کی ایک بلند و بالا پختہ عمارت کے گرد مریدوں کا ہجوم ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ اور عمارت کے اندر سیاہ عبا اور سبز عمامہ پہنے ہوئے سجادہ نشیں ظاہری جاہ و جلال کا غازہ لگائے مریدوں کے سامنے کھڑے تھے۔ اور شیخ خواں فاتحہ خوانی میں مصروف تھا۔

یہ بارگاہ پاک سلطان عالم پناہ کی، در تاج سخی، صاحب فیوض لا متناہی سیدنا حضرت ...... یہ بارگاہ پاک محبت الغربا، فخر الفقراء، سیدنا سلطان ...... یہ بارگاہ پاک تاج الاولیاء سلطان السالکین، معارج العارفین ...... یہ بارگاہ پاک ...... تمام فضا میں ایک عجیب سی لہر پھیل رہی تھی۔ وہ گنبد سے باہر صحن کی طرف چلا گیا، سوکھی ندی کے کنارے بنے صحن میں مریدوں کا بے پناہ ہجوم ہاتھ باندھے سر نیاز خم کئے کھڑا تھا۔ صحن کے بیچ میں ایک سیاہ گول پتھر نصب تھا اس سیاہ پتھر کے گرد آسیب زدہ عورتیں اپنے لمبے سیاہ بال کھولے جھوم رہی تھیں۔ بوڑھے مجاور نے حضرت کے سرہانے جلتے چراغ سے کاجل لے کر ان جوان عورتوں کی سرخ انگارہ جیسی آنکھوں میں لگا دیا تو آنکھیں اور بھی سرخ ہو گئیں۔ اور وہ "بھرنے" لگیں۔ ان کے چہرے سرخ ہو گئے۔

لمبے سیاہ بال کھل گئے۔ کپڑوں کا ہوش باقی نہ رہا وہ مجنونانہ انداز میں چیخ رہی تھیں۔ اور کربناک آواز میں چلا رہی تھیں۔ اب چھوڑ دے ______ دہائی ہے دہائی ہے ______ دہائی ہے حضرت سلطان کی ______ چھوڑ دو کہتی ہیں پیر کا واسطہ ______ چھوڑ دو توبہ کی ______ اب چھوڑ دو

تب مجاور کی کرخت آواز گونجی

بول لونڈیا کس کا سایہ ہے ابھی حضرت تجھے جلا کر خاک کر دیں گے اور اس کی چھڑی شڑاپ سے نوجوان عورت کی ننگی پیٹھ پر نیلا نشان چھوڑ گئی وہ درد

ے وہ بلبلا اٹھی اور بولنے لگی۔

معاف کر دو اب نہیں آؤں گا۔ یہ جمعرات کے دن شام ڈھلے چھت پہ بال کھولے کھڑی تھی۔ اس نے ہار سنگھار کے پھولوں سے رنگی ہوئی ساڑی پہن رکھی تھی میرا کوئی قصور نہیں ہے یہ عاشق ہو گیا۔ دہائی ہے غلطی ہو گئی چھوڑ دو۔ چھوڑ دو۔

اتنے میں سجادہ نشیں سیاہ صبا اور سبز عمامہ پہنے اس خوبصورت عورت کے پاس آ کھڑے ہوئے انہوں نے عورت کی سرخ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کچھ پڑھا اور سارے مجمع کو سانپ سونگھ گیا اور وہ عورت بل کھا کر زمین پر گر گئی۔ ایک سفید چادر اس پر ڈال دی گئی۔ اور چاروں طرف سے جل گئی جل گئی کا شور اٹھا وہ حیرت سے سارا تماشہ دیکھ رہا تھا کہ پاس کھڑے ہوئے ایک نوجوان نے کہا کہ یہ دآتمی جل گئی ہے اس کے انداز میں طنز تھا۔ اس نے سوالیہ نگاہوں سے اس نوجوان کی طرف دیکھا تو اس نے مسکراتے ہوئے کہا یہ کالے لوگ اس مقدس عمارت کو پامال کر رہے ہیں غیر ارادی طور پر اس کی نگاہیں آسمان کی طرف اٹھیں جہاں سبز پرندے ہوائیں اڑ رہے تھے۔ مگر نہ ان کی چونچ میں کوئی کنکر تھا نہ پنجوں میں۔

اس نے گرد و پیش کی طرف دیکھا تو اس کا دم گھٹنے لگا۔ اس کے جسم پر وقت کی کائی دبیز تہوں میں جمی ہوئی تھی۔ جیسے وہ کھرچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس نے ہتھیلی پر جمی ہوئی کائی کو کھرچنا چاہا تو چھل چھل تازہ خون رسنے لگا اور وہ درد کی شدت سے بلبلا اٹھا۔ اس نے پھر آنکھیں بند کر لیں تھوڑی ہی دیر بعد شور سے اس کی آنکھیں کھلیں۔ سامنے بہت بڑا پنڈال لگا ہوا تھا جس پر لوگوں کا ہجوم نعرے لگا رہا تھا اور چھوٹے، بڑے، عورت، مرد سب چلا رہے تھے،

طاہر حسین زندہ باد، سبز پرندہ زندہ باد، جیتے گا بھئی جیتے گا۔ سبز پرندہ جیتے گا۔

وہ حیرت سے ان لوگوں کی طرف دیکھنے لگا۔

جن میں سفید پوش بھی تھے اور میلے کچیلے کپڑوں ملبوس بھی۔ سامنے اسٹیج پر طاہر حسین سیاہ اور سبز عمامہ پہنے ہوئے بڑی شان سے سفید کے درمیان بیٹھے ہوئے تھے۔ اور پنڈت شِ مائیک پر تقریر کر رہے تھے۔

طاہر حسین صاحب انسان نہیں دیـ سماج سیوک اور غریبوں کے مسیحا ہیں۔ ایسے پرش کو ووٹ دے کر سپھل بنانا ہمارا کرتو ہمارا انورودھ ہے کہ شاہ طاہر حسین کے چنـ "سبز پرندہ" پر مہر لگا کر انہیں کامیاب بنا کی سنبھلتا لوک تنتر کی سپھلتا ہے بولئے طاہر کی جے۔

ساری فضا طاہر حسین کی جے، سبز جے سے گونج اٹھی۔

اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا کہ یہ لوگ کیا ہیں۔ مگر پیاس کی شدت سے وہ تڑپ رہا کی تلاش میں گھومنے لگا۔ پنڈال کی پشت پر کمرے کے پاس اسے پانی کا ایک مٹکا دکھائی وہ تیزی سے اس کی طرف بڑھا مگر مٹکے کے اس کی مایوسی اور بڑھ گئی۔ اس لئے کہ مٹکا

کمرے میں طاہر حسین، پنڈت شیو موہن دوسرے لوگ بیٹھے الیکشن کی مہم پر گفتگو کر پنڈت شیو موہن کہہ رہے تھے کہ شاہ صا وشواس کیجئے سارے ہندو آپ کو ووٹ اس لئے کہ انہیں منور علی کو ہرانا ہے منور علی نے پچھلے سال درگا پوجا کے جلوس میں لوگو پتھراؤ کیا تھا اس سے سارے ہندو اس کے

طاہر حسین حیرت سے بولے لیکن و کے آدمی کب تھے؟

پنڈت شیو موہن اور دوسرے لوگ پھر پنڈت جی بولے حضرت وہ آدمی تو یقیناً ہما مگر دنیا تو یہی جانتی ہے کہ وہ منور علی کے آدمی

طاہر حسین بولے تو کیا اتنے ہی سے کام چل جائے گا۔ بہت سے مسلمان بھی تو ہمیں ووٹ نہیں دیں گے وہ منور علی کو دیدیں گے۔

پنڈت جی بولے، اس کا جواب شمشیر خان اور جگدیش سنگھ دیں گے۔ پنڈت جی نے سامنے بیٹھے وہ پہلوانوں کو اشارہ کیا، جگدیش سنگھ بولا! حضور کی دعا چاہیئے ہم دس پندرہ بوتھوں پر قبضہ کرلیں گے۔ تھوڑے روپے مل جائیں تو ہم دس بیس پٹاخے خرید لیں اور شاگردوں کو کچھ کھلا پلا دیں، بس جیت آپ کی ہے۔

شاہ صاحب ہنسنے لگے، روپیوں کی فکر مت کرو کام پکا ہونا چاہیئے۔ یہ کہتے ہوئے انھوں نے ایک بند لفافہ جگدیش سنگھ کی طرف بڑھا دیا۔

جگدیش سنگھ نے لفافہ لیتے ہوئے کہا کہ حضور فکر نہ کریں ہم پرانے کھلاڑی ہیں۔ کس کی جان بھاری ہے جو ووٹ دینے آئے گا اتنے میں موذن کی اذان سے فضا گونج اٹھی۔ "حَیَّ عَلَی الفَلَاح" کے الفاظ اس کی سماعت سے ٹکرا کر چور چور ہو گئے۔

طاہر حسین نے اٹھتے ہوئے کہا ہاں بھئی تمہیں لوگوں پر بھروسہ ہے۔ اب میں چلا نماز کا وقت ہو گیا ہے بقیہ باتیں کل ہوں گی۔

پیاس کی شدت سے اس کا دم نکلا جا رہا تھا مگر دور دور تک کہیں پانی کا نشان نہ تھا۔ وہ نڈھال ہو کر زمین پر گر گیا۔ دوبارہ اس کی آنکھیں کھلیں وہ پتھروں کی ایک بلند و بالا عمارت کے سامنے کھڑا تھا سرخ رنگ کی اس پر وقار عمارت کے سامنے ہزاروں کا ہجوم ٹھاٹھیں مار رہا تھا جسے خاکی وردی میں ملبوس سپاہی قابو میں رکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ جب سامنے کے گیٹ پر کوئی کار آکر رکتی اور کوئی شخص اترتا تو پوری فضا اس کے نام سے جے جے کار سے گونج اٹھتی۔

سیٹھ دھنا مل ! زندہ باد

کامریڈ گپتا : زندہ باد

سوامی جی ! زندہ باد

طاہر حسین زندہ باد ! نعروں سے فضا گونج رہی تھی۔ وہ حیرت سے یہ تماشا دیکھ رہا تھا کہ طاہر حسین زندہ باد کے نعروں پر وہ چونک اٹھا۔ سامنے موٹر سے طاہر حسین سیاہ عبا اور سبز عمامہ پر باندھے بڑی ہی شان سے اتر رہے تھے، مجمع پر جیسے جنون طاری ہو گیا۔

سبز پرندہ زندہ باد، طاہر حسین زندہ باد، طاہر حسین ہاتھوں کی جنبش سے نعروں کا جواب دیتے ہوئے فاتحانہ انداز میں پتھر کی بلند و بالا عمارت کی طرف بڑھنے لگے۔ ان کے آگے پیچھے بے شمار لوگ تیزی سے عمارت کی طرف بڑھتے جا رہے تھے۔ دفعتاً اسے ایسا لگا کہ پتھر کی وہ گول عمارت چکور ہو گئی ہے۔ اور سیاہ عبا میں شاہ طاہر حسین کے بھاری بھرکم جسم نے ہاتھی کی شکل اختیار کر لی ہے۔

بے شمار ہاتھی اپنی سونڈ اٹھائے پتھر کی اس متبرک عمارت کو پامال کرنے کے لئے خوفناک انداز سے بڑھتے جا رہے تھے۔ خوف سے ان کا دل کانپ اٹھا، وہ چیخ اٹھا۔

ابابیلو! کہاں ہو تم! سبز پرندو! کہاں ہو تم! دوڑو، بچاؤ، دیکھو، سیاہ ہیبت ناک پرندوں نے پھر حملہ کیا ہے۔

مگر اس کی آواز حلق سے باہر نہ نکل سکی۔ اس نے مایوس نظروں سے آسمان کی طرف دیکھا مگر دور دور تک سبز پرندوں کے غول کا کہیں پتہ نہ تھا۔ اور سیاہ ہیبت ناک پیکر عمارت کے دروازوں تک پہنچ چکے تھے۔ اس نے حسرت سے دوبارہ عمارت کی طرف دیکھا، سیاہ عبا میں ملبوس شاہ طاہر حسین فاتحانہ انداز میں عمارت کے بلند دروازے میں داخل ہو رہے تھے، اور ان کے سر پر سبز پرندہ تاج کی طرح بیٹھا تھا۔ مگر اس کی چونچ میں سفید کنکریوں کی جگہ ہوتی ہے اور پنجوں میں سرخ خون چمک رہا تھا۔ (بشکریہ ماہنامہ آہنگ گیا گلشن نمبر

جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی

جہاں پر آپ کے محبوب شہر میں مہاتما بدھ کی سرزمین پر

بخشی کی تیار کردہ

محافظ صحت ادویات اور حسن افزا مصنوعات ہر وقت اور ہمیشہ بآسانی دستیاب ہیں

- **اکسیر اعظم ڈراپ** ◄ پیٹ اور معدہ کی شکایتوں کے لئے
- **شربت اکسیر** ◄ اعصابی کمزوری اور مردانہ شکایات کے لئے
- **نسوانی** ◄ خواتین کی تندرستی اور شادمانی کے لئے
- **جگ مگ منجن** ◄ دانتوں کی صفائی اور مضبوطی کے لئے
- **پاک وصاف صابن** ◄ گرمی کے دانے اور پھوڑے پھنسی سے بچنے کے لئے
- **سندری سہاگ** ◄ مانگ کا زور رکھنے بالوں کو بڑھانے کیلئے بہترین ہیئر کنڈیشنر

یہ سب اور بہت کچھ —— ساختہ بخشی

ایس اے بی بخشی اینڈ سنز ۳۲ مولانا شوکت علی اسٹریٹ کلوٹولہ، کلکتہ

اسٹاکسٹ

عبدالغفار اینڈ سنز پرفیومرس اچھتہ مسجد، باری روڈ۔ گیا

شفیع مشہدی

ہدایت نامہ

شروع کرتا ہوں میں خداوندِ ادب کے نام سے جو جاہ و منصب عطا کرنے والا ہے۔ اور گواہی دیتا ہوں میں کہ نہیں ہے کوئی ادیب مگر تنقید نگار جو ادب کے سچے رسول ہیں جنھیں ہماری رشد و ہدایت کے لئے بھیجا گیا ہے اور اعلان کرتا ہوں کہ تنقیدی مضمون ادب کی حدیث ہے۔

یَا اَیُّھَا الْقَلَمُ! بس ڈرو اس کے عتاب سے اور پناہ مانگو اس کے قلم سے کہ وہ بڑا غیض و غضب والا ہے اور پیروی کرو اس کی اور چلو اس کے راستے پر جو ادب کے رسولوں نے دکھائی ہے کہ یہی صراطِ مستقیم ہے اور بھٹکنے والوں کے لئے اس کا قہر بے تاب رہتا ہے۔

کیا تمہاری آنکھوں پر پردہ پڑا ہے؟ کیا تمہارے کانوں کے پردے دبیز ہو گئے ہیں؟ اور کیا تمہارے سر تمہارے کاندھوں پر بھاری ہیں کہ تم اس کے آگے سرِ تسلیم خم نہیں کرتے؟ فَاعْتَبِرُوْا یَا اُولِی الْاَبْصَار! آنکھیں اور عقل کے دروازے کھولو اور منادی سنو کہ اس کا قلم تمہارے سر قلم کرنے کو بے چین ہے۔

کیا تم ان فنکاروں اور قلمکاروں کی اس قوم کا انجام نہیں دیکھا جس نے حکم عدولی کی تھی اور ڈوبتے سورج کی سرخ شعاعوں کو سجدہ کرنے سے انکار کر دیا تھا کیا تم نے اس قوم کو شعلوں میں جل کر خاکستر ہوتے نہیں دیکھا ـــــ بس عبرت حاصل کرو ان کے انجام سے اور وہی کہو جو وہ کہتا ہے، وہی لکھو جو وہ لکھتا ہے اور اسی راہ پر چلو جو اس نے دکھائی ہے کہ اسی میں تمہاری نجات ہے اور یہ کہ تم اس کے سایۂ اقتدار سے نہیں بھاگ سکتے۔ اور بھاگ کر جا بھی کہاں سکتے ہو کہ تمام شعبۂ ادب پر حکمرانی ہے پس اطاعت و پیروی کرو اس کی اور نافرمانی سے بچو، کہ بھٹکنے والوں کے لئے سخت عذاب متعین ہے۔

تم بڑے احسان فراموش ہو کہ تم اس کی عنایتوں کا اعتراف نہیں کرتے تم اس کی فیض رسانی سے فیضیاب بھی ہوتے ہو مگر سجدۂ شکر ادا نہیں کرتے۔ کیا تم انکار کرو گے کہ اس نے تمہاری ہدایت کے لئے موٹی موٹی مجلد کتابیں نازل نہیں کیں جن میں ہر صنفِ ادب کے لئے راہیں متعین کر دی گئی ہیں۔

کیا اس نے تمہاری ہدایت کے لئے جگہ جگہ شعبۂ اردو کی خانقاہیں قائم نہیں کیں؟ اور اس میں تمہارے لئے ہادی مقرر نہیں کئے؟ تم ان کی کن کن عنایتوں سے انکار کرو گے؟ کیا اس نے جگہ جگہ اکاڈمیوں اور انجمنوں کی شکل میں تمہارے لئے لنگر خانے نہیں بنائے کہ تم اس سے فیضیاب ہوتے رہو؟ تم ان کی کن کن عنایتوں سے انکار کرو گے؟

کیا اس نے سمینار، مشاعرے اور محفلوں کا نظم کر دو کے تمہارے لئے جام کوثر کا انتظام نہیں کیا
کی کن کن عنایتوں سے انکار کرو گے ؟

کیا اس نے تمہاری رہنمائی کے لئے دقیق مضامین جو ساری دنیا کے اقتباسات سے لبریز ہوئے
حدیث کی صورت میں بھی نہیں دیا ؟ تم اس کی کن کن عنایتوں سے انکار کرو گے ؟

کیا اس نے تمہاری ان تخلیقات پر جو تم نے اس کی ہدایت کی روشنی میں تمام پابندیوں کے
لکھی ہیں انعام واکرام اور خلعت عطا نہیں کیا ——— ؟ تم اس کی کن کن عنایتوں سے انکار کرو گے

مگر یہ کہ سرکشی تمہارا شیوہ اور نافرمانی تمہارا کردار ہے تمہارے سر تمہارے کاندھوں پر بوجھ
بن چکے ہیں۔ تمہیں یہ تکبر ہو گیا ہے کہ تم تخلیق کے کرب سے گزرتے ہو اور اس لئے تمہیں قلم کی آزادی ہونی چاہئے
مگر تم یہ بھول جاتے ہو کہ تمام تخلیقات اس کی تابع ہیں۔ اور تمہارا کرب بھی اسی کا عطا کردہ ہے۔

بس اس چشمۂ لطف وعنایت کی شان میں قصیدہ پڑھو اور وہی لکھو جو وہ چاہتا ہے اور ہرگز
کشیدہ لکیروں سے باہر نکلنے کی کوشش نہ کرنا تمہیں اپنے ہر لفظ کا حساب دینا ہوگا۔ اس لئے کہ وہ بڑا محتسب ہے
بس پیروی کرو اس کی جو ادب کا رسول ہے اور اطاعت کرو اس کی جس کی تمام شعبۂ ادب پر حکمرانی ہے کہ
تمہاری نجات ہے۔

ساری تعریف اس ناقد کے لئے ہے جو سب سے بڑا تخلیق کار ہے عظمت اس کے ہے جو ہمارے
کا حساب رکھتا ہے۔ سلام اس پر ہے جو انعام واکرام سے قلم کاروں کو نوازتا ہے اس لئے ہم گواہی دیتے ہیں
کہ نہیں ہے کوئی ادیب تخلیق کار مگر ناقد جو ادب کے سچے رسول ہیں اور پناہ مانگتے ہیں ہم اس کے قہر سے
غیظ وغضب والا ہے اور دعا مانگتے ہیں کہ ہمیں اس کی تقلید و پیروی کی توفیق عطا ہو۔ آمین ثم آمین

(بشکریہ ماہنامہ آہنگ گیا، فکشن نمبر)

—— • ——

بقیہ پس منظر پتہ چلا کہ اسٹیج کے تقاضوں کے بارے میں کوئی قطعی حکم لگانا آسان نہیں۔
شفیع مشہدی کی اس کتاب میں چھ ڈرامے شامل ہیں۔ یہ سب کے سب ریڈیو کے لئے
لکھے گئے تھے، ریڈیو ڈرامے اور اسٹیج ڈرامے میں کوئی بنیادی فرق نہیں تھوڑے بہت ردوبدل کے ساتھ
ڈرامے کو ریڈیو پر اور ریڈیو ڈرامے کو اسٹیج پر پیش کیا جا سکتا ہے۔

شفیع مشہدی کے ڈراموں کی نمایاں خوبی مکالموں کی برجستگی ہے ڈرامے کے بعض ایسے طریقے
جو آسانی سے منہیں برتے جا سکتے مثلاً فلیش بیک یا مناظر کی کثرت یا تنوع ان کا استعمال مشہدی نے بڑی خوبی سے کیا ہے
ڈرامے کے فن کا بنیادی عنصر یہ ہے کہ مکالمے کے ذریعے واقعات ظاہر ہوں اور کردار کی تصویر
بھی ابھرے شفیع مشہدی اس نکتہ سے بخوبی آگاہ ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ ان کے ڈراموں کا یہ مجموعہ جو معاصر
زندگی کے کئی پہلوؤں کی نقاب کشائی کرتا ہے بہت کامیاب ثابت ہوگا۔

(بشکریہ دوپہر کے بعد، شفیع مشہدی)

—— • ——

بہار میں اقلیتی فرقہ کی بھلائی کے لئے
سرکار کے ذریعہ اٹھائے گئے نئے قدم

بہار ریاستی حکومت کے اقلیتی فرقوں کی ترقی اور بھلائی کے لئے کوشاں ہے۔ وزیر اعظم ہند شری راجیو گاندھی کی شاندار قیادت میں ریاستی حکومت ایسے مختلف پروگرام تیزی سے چلا رہی ہے جن سے ان اقلیتی طبقوں کو قومی زندگی کے دھارے سے جوڑنے میں مدد ملے گی۔ اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دینے، مدرسوں اور اردو ٹیچروں کو سہولت دینے، بنگلہ پنجابی وغیرہ زبانوں کی ترقی نیز مختلف اکادمیوں کے قیام کے لئے، اردو روزناموں کے لئے موجودہ بجلی پر فرد مشینوں کے لگانے کے رقم کا نصف حصہ امداد کی شکل میں دینے اور پٹنہ میں "اردو بھون" (اردو کمپلکس) کے قیام جیسے مختلف ترقیاتی اقدام کرنے کے سرکار کے ذریعہ فیصلے کئے جا رہے ہیں۔

(الف) مزید دنگا مدروعی پولس فورس میں ۲۰ فیصد عہدوں پر اقلیتی طبقے کی بحالی کی جائے گی۔

(ب) اقلیتی طبقہ کی اقتصادی ترقی کے لئے سرکار کے ذریعہ دس کروڑ روپے کی خصوصی رقم سے "بہار ریاست اقلیتی مالیاتی کارپوریشن لمیٹڈ" کا قیام عمل میں آچکا ہے۔ یہ کارپوریشن آمدنی کے ذرائع مہیا کرنے کے لئے مذہبی اقلیتی فرقہ کے ایسے افراد کو جن کی سالانہ آمدنی (کاشتکاری سے ہونے والی آمدنی سمیت) ۱۲ ہزار روپے سے زیادہ نہیں ہے معاشی اور اقتصادی کارروائیوں کے لئے لاگت یوجنا کا ۴۰ فیصد (زیادہ سے زیادہ دس ہزار روپے) قرض کے طور پر صرف پانچ فیصد سیکڑے سالانہ سود کی شرح پر دیگا۔

یوجنا لاگت کا باقی ۶۰ فیصد قرض کی شکل میں امدادی بینکوں سے دلوانے کا انتظام کیا گیا ہے۔

قرض سے متعلق درخواست ضلع مجسٹریٹ اپنے ذریعے وصول کریں گے اور اس کی جانچ پڑتال اپنے افسران سے کرا کر قرض سے متعلق درخواست کو منظور شدہ بینکوں کے متعلقہ آفیسر کو بھیج دیں گے۔

ریاستی سرکار کے ذریعہ انوسوچیت جاتی، جن جاتی کے لوگوں کی معاشی ترقی کے لئے ایسی دوسری تنظیموں کا قیام پہلے ہی عمل میں آچکا ہے۔

وزیر اعلیٰ شری بندیشوری دوبے کی کامیاب قیادت میں ریاستی سرکار اقلیتی طبقہ کو کل تحفظ دینے کے لئے عہد کر چکی ہے۔ حکومت امید کرتی ہے کہ سبھی فرقوں کے لوگوں دل سے قومی یکجہتی اور یکتا کے ماحول کو برقرار رکھنے میں سبھی قسم کا تعاون دیں گے۔

جاری کردہ:- **محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ بہار**

(सू०ज०सं०नि० 41-स (प-39) 84-85)

شفیع مشہدی

قصہ میرے نقاد بننے کا

مشاعروں اور جلسوں میں ادیبوں اور شاعروں کی خاطر تواضع دیکھ کر اکثر میرے ذہن میں شاعر اور ادیب بننے کا کیڑا کلبلاتا رہتا تھا اور خاص کر اسٹیج پر لوگوں کو عموماً اور طالبات کو خصوصاً شعرا اور ادیبوں کا آٹوگراف لیتے دیکھ کر دل میں گدگدی ہی ہوتی تھی۔ چنانچہ میں نے فیصلہ کر لیا کہ ادب میں اپنا مقام بنا کر رہوں گا۔ ہر چند کہ عقل نے دامن تھاما اور سمجھایا کہ اپنی اہلیت کی طرف متوجہ ہوں۔ مگر اہلیہ کی جلی کٹی باتوں نے فوراً عقل کا سر کچل دیا۔ اور میری نگاہوں کے سامنے مولانا تفضل حسین کی مثال آگئی جو مولانا تفضل حسین سے دیکھتے دیکھتے ڈاکٹر ٹی حسین مشہور ادیب بن گئے تھے۔ دس پندرہ برس پہلے مدرسہ رفیمیہ جو یتیم خانہ بھی تھا کے مدرس کے طور پر مولانا تفضل حسین کو صرف علاقے کے لوگ جانتے تھے اور وہ بھی اس لئے کہ ہر عیدالاضحیٰ کے موقع پر چرم قربانی کی تحصیل کے لئے وہ علاقے کا دورہ کرتے تھے۔ مگر آدمی ذہین تھے اس لئے انہوں نے اردو میں جوابات لکھ کر فارسی میں ایم اے کا امتحان پاس ہی نہیں کر لیا بلکہ سونے کا تمغہ بھی حاصل کیا اور گولڈ میڈلسٹ ہو گئے۔ پھر فارسی شاعری میں اردو میں تحقیق کر کے انہوں نے D. LIT کی ڈگری بھی حاصل کر لی۔ اور مقامی کالج کے صدر شعبہ بن گئے پھر کیا تھا مضامین کا انہوں نے ڈھیر لگا دیا اور آناً فاناً مولانا تفضل حسین، ڈاکٹر ٹی حسین کے نام سے ادب پر چھا گئے ہیں نے ان کی مثال سے فیض حاصل کرتے ہوئے یہ طے کر لیا کہ اب میں زیادہ دنوں تک کس مپرسی اور گمنامی کی زندگی نہیں گزار سکتا چنانچہ ایک دن دوستوں کو چائے پر بلا کر میں نے جب اعلان کیا کہ میں شاعری کرنے والا ہوں تو سارے لوگ حیرت سے میری طرف دیکھنے لگے کچھ دوستوں کے دیکھنے کا انداز تو ایسا تھا کہ جیسے خدانخواستہ میرا ذہنی توازن کھو گیا ہو۔ اور کچھ صرف یہ کہہ کر رہ گئے "تم اب اور شاعری ——————" مگر میں جانتا تھا کہ مستقبل میں میری شہرت اور مقبولیت کے تصور سے یہ حضرات جل رہے تھے اور مجھے حاسدوں کو چائے پلانے کا بے حد افسوس بھی ہوا۔

دوسرے دن سر شام ہی میں مٹھائیوں کا ڈبہ لے کر شہر کے کہنہ مشق شاعر حضرت افسوس کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ موصوف کا نام تو ایسے سیدالاسرار الامرار محمد فتح عالم مفتوح تھا مگر ان کی غزل کے دو تین شعروں میں افسوس کا لفظ ضرور آتا تھا اس لئے تمام لوگ انہیں حضرت افسوس کے نام سے ہی پکارتے تھے بلکہ ایک ماہر نفسیات جو کبھی کبھی تنقیدی مضامین بھی لکھتے ہیں نے افسوس صاحب پر مضمون لکھ کر اس نفسیاتی نقطے کی بھی وضاحت کی تھی اور افسوس کے کثرت استعمال کو لاشعور کی ان گتھیوں کی طرف منسوب کیا تھا جو موصوف کو اپنی شاعری کی عدم مقبولیت سے پیدا شدہ مایوسی کے ردعمل کا مظہر تھیں۔ ویسے عام لوگوں کا خیال تھا کہ چونکہ تمام لوگوں کو موصوف کی شاعری سن کر افسوس ہوتا تھا اس لئے لوگ انہیں حضرت افسوس کہنے لگے تھے۔ میرے ہاتھ میں

مٹھائیوں کا ڈبہ دیکھ کر وہ میری شاعر نوازی کی تعریف کرنے لگے اور فرمایا کہ دراصل جو لوگ شاعری اور شراب لازم و ملزوم قرار دیتے ہیں وہ پلے درجے کے جاہل ہیں۔ واقعتاً شاعری اور مٹھائی کا چولی دامن کا ساتھ ہے جسے مٹھائیوں کا ذوق نہ ہو وہ اچھا شاعر بن ہی نہیں سکتا۔ اس لئے کہ کلام میں لطافت و شیرینی پیدا ہی نہیں ہو سکتی جب تک شیرینی کھائی نہ جائے۔

میں نے موقع غنیمت جانتے ہوئے عرض مدعا کی کہ حضور خاکسار کو بھی مٹھائیاں بے حد پسند ہیں اور یہ حقیر و فقیر سراپا تقصیر حضور کی بارگاہ میں زانوئے ادب تہہ کرنے کی غرض سے حاضر ہوا ہے۔ میری بات سن کر وہ ذرا سنجیدہ ہو گئے، اوپر سے نیچے تک مجھے غور سے دیکھ کر فرمایا "لیکن شکل و صورت سے تو آپ شاعری کے قریب بھی نظر نہیں آتے،" میں نے جواباً عرض کیا "حضور شاعری شروع کروں گا تو چہرے پر وحشت کے آثار خود بخود نمایاں ہو جائیں گے"۔

میرا یہ جملہ شاید انہیں بے حد پسند آیا، بڑی شفقت سے مجھے بٹھایا، ڈبہ کھول کر ایک مٹھائی میری طرف بھی بڑھائی، اور دس بارہ مٹھائیاں خود کھائیں پھر الحمد للہ کہہ کر میری طرف مخاطب ہوئے۔

"بہت خوب، تو آپ شاعری سیکھنا چاہتے ہیں، ٹھیک ہے" پھر انہوں نے بستے کے نیچے سے اپنا دیوان نکالا۔ اور مطلع عرض ہے کہہ کر اپنا کلام سنانے لگے۔ ایک، دو، تین، بارہ .... غزلوں کا سلسلہ تھا جس نے میری سماعت کھو دی اور میں صرف ان کے پھڑکتے ہوئے ہونٹوں کو دیکھ رہا تھا جس سے حسبِ اشعار ابل رہا تھا۔ جب ہونٹ کا پھڑکنا رک جاتا تو میں سمجھ جاتا کہ شعر مکمل ہو گیا۔ اور میکانکی انداز سے 'واہ' کہہ دیتا تھا میری حالت پہ شاید انہیں ترس آ گیا یا ان کا دھیان باقی بچی مٹھائیوں کی طرف چلا گیا کہ انہوں نے دیوان فرش پر رکھ دیا، اور مٹھائیاں کھانے لگے۔ پھر مجھ سے مخاطب ہوئے "فن عروض سے کچھ واقفیت؟"

میری سمجھ میں کچھ نہ آیا تو میں سپاٹ ان کی طرف دیکھتا رہا، میرے سپاٹ چہرے کو دیکھ کر وہ پھر گویا ہوئے "میرا مطلب ہے وزن وغیرہ کا کچھ علم ہے آپ کو"

میں نے فوراً جواب دیا "جی ہاں بالکل ہے، میری دکان پر بھی اس کا اہتمام ہے"

وہ چونکے، "دکان پر؟"

"جی ہاں، دراصل کچھ دنوں پہلے تک تو سیر من اور چھٹانک کا رواج تھا مگر اب تو کلو گرام اور کوئنٹل زمانہ ہے"

حضرت افسوس کے چہرے پر افسوس کے نقوش اور گہرے ہوئے میں نے ہاتھ جوڑ کر استدعا کی کہ بندہ پرور مجھے شاگرد سمجھتے ہوئے شاعری سکھائیے۔ میں ہر خدمت کے لئے تیار ہوں۔ میری گڑگڑاہٹ سے وہ متاثر ہو گئے انہوں نے بحر، وزن، ردیف، قافیہ اور عروض کے نکات پر تقریر شروع کر دی، اور میں حیرت سے ان کا منہ دیکھتا رہا کہ میں شاعری سیکھنے آیا تھا اور یہ نہ جانے علم نجوم کی باتیں کر رہے ہیں یا کلاسیکی، موسیقی کی، حضرت افسوس بحروں کی باتیں کر رہے تھے اور میں بہروں کی طرح ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ بہت جلد میں نے یہ طے کر لیا کہ شاعری اگر عروض کے بغیر ممکن نہیں تو استعفار باحسرت و یاس۔

شاعری سے مایوس ہو کر میں نے نثر نگار بننے کی طرف توجہ دی۔ اور اس سلسلے میں ہفتوں ایک مشہور افسانہ نگار کی خوشامد میں کرتا رہا۔ تین پرتکلف دعوتوں، اور سات افسانے برداشت کرنے کے بعد میری سمجھ میں آیا کہ پلاٹ نگاری، کردار نگاری، عروج اور تقابل عروج اور اس پر جذبۂ انتظار جیسے گورکھ دھندے

…المجنا میرے لئے ممکن نہیں۔ ہاں اتنا ضرور فائدہ ہوا کہ اس افسانہ نگار نے ایک بیش قیمت مشورہ یہ دیا کہ میں تنقید …ار بن جاؤں۔ اس لئے کہ شاعری اور افسانہ نگاری میرے بس کی بات نہیں۔

چنانچہ ایک تعارفی خط کے ساتھ میں اس مشہور تنقید نگار کے دردولت پر حاضر ہوا جن کے نام کا …کا دور دور تک بج رہا تھا۔ تعارفی خط دینے والے نے مجھے پہلے ہی متنبہ کر دیا تھا کہ ناقدین عموماً مٹھائیاں پسند …ہی کرتے اس لئے مٹھائی لے کر ہرگز نہ جاؤں، چنانچہ ان سے مشورہ کرکے میں نے کاغذی لیموں، کھٹے انار، تازہ ہری …مرچیں، کافی کا ڈبہ، سگریٹ کا ایک پیکٹ بڑی خوب صورتی سے ایک بڑے ڈبے میں پیک کر لیا تھا۔ میرے دوست نے …پہلے ہی وارننگ دیدی تھی کہ بہت سنبھل کر جانا اور سمجھ بوجھ کر باتیں کرنا، معاملہ ناقد سے آپڑا ہے اور وہ بھی …بڑے ناقد سے، ورنہ آخری امید بھی جاتی رہے گی، اور تم ادب کی الف کو بھی نہ پا سکو گے۔ میں جیسے ہی موصوف …دردولت پر سہما سہما سا پہونچا، سامنے بائیں ہاتھ میں ایک خونخوار کتے کو ٹہلتے دیکھ کر میری روح فنا ہو گئی۔ اللہ …اپنے دوست کی نیت پر شک کرنے لگا، کہ سامنے سے کتے کو پکارتا ہوا ایک ملازم کتے کے ساتھ میرے پاس آیا، …میری جان میں جان آئی، اور میں نے تعارفی خط اور پیکٹ اس کے حوالے کر دیا، ملازم چلا گیا مگر کتا وہیں کھڑا مجھے …دیکھتا رہا۔ میرے چاروں طرف گھوم کے اس انہماک سے جائزہ لے رہا تھا کہ میں بے بس و بے حرکت، اپنے اس …پہلے کو بددعائیں دیتا رہا جس نے تنقید نگاری پر مجھے اکسایا تھا، اگر تنقید نگاری کے لئے اس خوفناک کتے کے …سامنے سے گزرنا ہوگا تو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں باز آیا۔ خدا کا شکر کہ ملازم جلد ہی واپس آگیا۔ اور مجھے لے جا کر ڈرائنگ روم …میں بٹھا دیا۔ جس میں چاروں طرف مجلد کتابیں بڑے سلیقے سے رکھی ہوئی تھیں۔ مگر ان کی حالت سے یہ اندازہ …لگانا مشکل نہ تھا کہ کبھی ان کا استعمال نہیں کیا گیا تھا۔ میں دل ہی دل میں موصوف کی اس خوش سلیقگی کی …داد دیتا ہوا دیوار پر لگی ایک عجیب سی بھیانک تصویر کو نزدیک سے دیکھ رہا تھا کہ دفعتاً مجھے اپنے قریب کسی ذی روح کا …احساس ہوا اور غیر شعوری میں تقریباً چیخ کر بھاگنے ہی والا تھا کہ ایک خوفناک آواز گونجی "تشریف رکھئے" …میری جان میں جان آئی، اور میں نے مڑ کر دیکھا تو موصوف سامنے کھڑے تھے۔ میں ان کی بارعب شخصیت اور …جاہ و جلال سے اس قدر مرعوب ہوا کہ بغیر سلام کے کرسی پر بیٹھ گیا وہ بغیر کسی تمہید کے گویا ہوئے،

"تو آپ تنقید نگاری کرنی چاہتے ہیں؟" پھر انہوں نے سگار کا کش لیا اور بولے "کیسی تنقید …بننا چاہتے ہیں آپ"

جی میں تنقید نگار بننا چاہتا ہوں، میں نے گھبرا کر کہا۔

"وہ تو ٹھیک ہے، میں نے سینکڑوں تنقید نگار بنائے ہیں، مگر تنقید کی مختلف اقسام ہوتی ہیں۔ آپ …کیسی تنقید سیکھنا چاہتے ہیں؟"

"حضور اس خاکسار کو کچھ علم نہیں، میری تو HARD WARE کی دوکان ہے"

"بہت خوب HARD WARE کا بزنس ہے آپ کا، تب آپ تنقید نگار بن سکتے ہیں"

"جی بہت بہت شکریہ عزت افزائی کا" میں نے لجاجت سے کہا، پھر وہ عالمانہ انداز میں گویا ہوئے

"دراصل تنقید کی بہت سی قسمیں ہیں۔ جیسے عالمانہ تنقید، محققانہ تنقید، جارحانہ تنقید، اور فلسفیانہ …تنقید" میں نے وضاحت طلب کی تو وہ پھر بولے،

دیکھئے عالمانہ تنقید وہ ہے جس کا ستر فیصد حصہ اقتباسات پر مشتمل ہوتا ہے بقیہ تیس فیصد حصے …میں ان اقتباسات کا سہل زبان میں ترجمہ ہوتا ہے۔ … فیصد اقتباسات میں کم سے کم پچاس فیصد اقتباسات

ین حیا -

غیر ملکی مصنفوں سے منسوب ہوتے ہیں۔ ایسے مضمون کو عالمانہ تنقید کہتے ہیں۔

میں دست بستہ ہمہ تن گوش علم و آگہی کے چشمے سے فیضیاب ہو رہا تھا۔

محققانہ تنقید وہ ہوتی ہے جس میں FACTS کی تحقیق ہو مثال کے طور پر ایسے سنئیے، یہ کہہ کر وہ ایک کتاب کا ایک اقتباس پڑھنے لگے،

اس دیوان میں کل ۱۰۶ غزلیں ہیں۔ جن میں ۸۷۸ اشعار اور ۱۷۵۶ مصرعے ہیں۔ جو ۱۱۲ صفحات بذریعہ آفسیٹ لیبل لیتھو آرٹ پریس میں چھپی ہے۔ غزلوں میں اشعار کا اوسط ۷ اشعار ہیں۔ سب سے لمبی غزل ۱۷ اشعار کی اور سب سے چھوٹی پانچ اشعار کی ہے، "دیماگی ساگر کی اس کتاب میں ۱۱۶ پوائنٹ کا سفید کاغذ استعمال کیا گیا ہے۔ کتابت مرزا خوشنویس نے کی ہے۔ جن کی عمر ۷۵ کے قریب ہے۔ اور جن کے ہاتھوں میں رعشہ آجانے کے باعث ۲۳۹ جگہوں پر "ن" اور "م" کی کتابت مجروح ہو گئی ہے

شاعر نے اپنے اشعار میں جن الفاظ کا کثرت سے استعمال کیا ہے ان کی تعداد اس طرح ہے۔

محبت	۲۲۶	بار	جلوہ	۱۸۳	بار
عشق	۱۱۲	"	غم	۲۲۷	"
کرب	۳۴۸	"	موت	۱۰۳	"
ہجر	۲۰۳	"	مسرت	۳	"
اذیت	۱۹۹	"	خوشی	۱۷	"
حسن	۳۵۱	"	طرب	۵۱	"

الفاظ کے ان اعداد و شمار سے اندازہ ہوگا کہ محبت، عشق، جلوہ، اور حسن کی مجموعی تعداد ۸۷۲ ہے جس سے شاعر کے رومانی شاعر ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ مگر کرب، ہجر، اذیت، موت اور غم کی کل تعداد ۱۰۸۰ ہے جبکہ مسرت اور خوشی اور طرب کے الفاظ صرف ۷۱ بار آئے ہیں جس سے یہ ثابت ہے کہ شاعر قنوطیت پسند تھا۔

موصوف نے کتاب بند کر کے میری طرف دیکھا تو میں کراہ اٹھا۔ اور پھر ہاتھ جوڑ کر بولا۔

"حضور میں حساب میں شروع ہی سے کمزور تھا، یہ اعداد و شمار ؟"

"موصوف پہلی بار ہنسے، مگر بے حد محتاط ہنسی سے" اب اس میں کوئی دشواری نہیں، سو ڈیڑھ سو میں پاکٹ CALCULATOR ملتے ہیں بس چند منٹوں میں کام ہو جائے گا"

پھر وہ رعب دار انداز میں بولے، دراصل میں اسی سے تنقید کی ایک نئی صنف ایجاد کرنے جا رہا ہوں جسے کمپیوٹرانہ تنقید کہا جائے گا۔ پھر وہ موضوع کی طرف واپس آگئے، ہاں تو یہ محققانہ تنقید تھی، اب رہی جارحانہ تنقید،

جارحانہ تنقید کو آپ یوں سمجھ لیجیے کہ ناقد دونوں ہاتھ میں ننگی تلواریں لے کر فنکاروں کی بھیڑ میں بے دریغ گھس جاتا ہے۔ اور حملے کرتا، بھیڑ کو چیرتا، دوسری طرف نکل کر فاتحانہ انداز سے کھڑا ہو کر مسکراتا ہے ادیب و شاعر کی صف میں خاصی بھگدڑ مچ جاتی ہے۔ کچھ خوش نصیب دامن کترا کر بچ جاتے ہیں کسی کے دست و بازو زخمی ہوتے ہیں۔ کسی کے کان کٹتے ہیں۔ ناک تک متاثر ہو جاتی ہے چاروں طرف خوف و ہراس طاری ہو جاتا ہے۔ زیادہ تر لوگ اس ناقد کے سامنے گھٹنے ٹیک دیتے ہیں۔ کچھ سر پھرے پیچھے سے چھپ کر اس پر ڈھیلا اور

پھینکتے ہیں۔ مگر تلواروں کے سامنے کسی کی مجال جو سر اٹھائے۔ ویسے ایسی تنقید نگاری میں اندیشہ یہ ہے کہ اکثر کا ناصحانہ ترپ رہتا ہے اور خطرہ بھی لاحق رہتا ہے۔ اسی لئے میں نے اب تک جارحانہ تنقید سے احتراز کیا ہے میں نے عرض کی۔ "اور حضور یہ خلیفانہ تنقید ؟"

موصوف زور سے ہنسے اور بولے "ہاں بھئی سب سے شاندار، محفوظ اور خوشگوار، یہی خلیفانہ تنقید ہے۔ آپ خلیفانہ سمجھتے ہیں ؟"

"خلیفہ تو سمجھتا ہوں۔ محرم کے اکھاڑوں میں دیکھا ہے" میں نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"بس بس آپ اس تنقید کی روح تک پہنچ گئے"

محرم، خلیفہ اور تنقید، ان میں حضور کیا نسبت ہے ؟

"محرم اور تنقید میں گہرا رشتہ ہے" وہ فلسفیانہ انداز میں بولے "آپ نے محرم کا اکھاڑہ دیکھا ہوگا ؟" وں کا مجمع ہے۔ خلیفہ جست پا جامہ، سبز کرتا، سبز عمامہ، اور کمر میں پٹکا باندھے کھڑے ہیں۔ پھر وہ ہاتھ میں تے ہوئی سبک تلوار اور ڈھال لے کر میدان میں آئے۔ چلے سے سکرا کر پینترے کی تمہید دکھائی۔ پھر تیزی سے باندھتے ہوئے بائیں صف پر تلوار سے کر لپکے، تلوار کوندی، مجمع سہم گیا، مگر صف کے قریب جا کر استاد اکر تھم گئے۔ پھر دائیں صف پر جھپٹے، اچھلے، کودے، پینترے بدلے، سرعت سے تلوار گھمائی۔ ادھر اچھلے ادھر ے، ہوا میں ہاتھ دکھلایا۔ ادا سے ہاتھ گھمایا، اور پھر درمیان میں تیزی سے تلوار چلانے لگے مجمع جوش سے یا علی، یا حسین کے نعروں سے آسمان گونج اٹھا۔ پھر استاد نے تلوار اور ڈھال زمین پر رکھ دی۔ چاروں سے داد و تحسین کا نعرہ بلند ہوا۔ اور شاگردوں نے استاد کے گرد گھیرا ڈال دیئے۔

نہ مجمعے میں کسی کو چوٹ آئی، نہ استاد زخمی ہوئے، سب کو لطف آیا مگر نتیجہ کچھ نہیں نکلا۔

اسے خلیفانہ تنقید کہتے ہیں۔ سب سے خوب صورت، شاندار اور پرشکوہ تنقید یہی ہے۔ اور اس میں خطرہ نہیں اسے آپ ......

میں نے بڑھ کر استاد کے پاؤں پکڑ لئے اور پھر استاد نے مجھے کچھ دنوں بعد مضمون کے چار پانچ خاکے عطا ن میں شاعر و ادیب کا نام لکھنے کی جگہیں خالی تھیں۔ اور فرمایا "جس شاعر یا ادیب پر مضمون لکھنا ہو اس کا نام جگہوں میں بھر دیجئے گا، اشعار کے لئے بھی جگہیں خالی ہیں۔ وہاں اشعار لکھ دیجئے گا۔ اور دوبارہ مضمون لکھیں تو اس پیراگراف کی ترتیب کو بدل کر کچھ حصے حذف کر دیں اور کچھ نئے حصے جوڑ دیں"

بحمد للہ اب میں مستند ناقد ہوں۔ بلکہ مستند ہے میرا فرمایا ہوا۔ ملک کا کوئی بھی سمینار یا سمپوزیم بغیر مکمل نہیں ہوتا۔ اور میں نے ڈاکٹر نبی حسین سے فیض اٹھاتے ہوئے ایک پرائیوٹ ہومیو میڈیکل کا تج سرٹیفکیٹ خرید کر اپنے نام کے آگے بھی ڈاکٹر لگا دیا ہے۔ اس لئے کہ بقول استاد بغیر ڈاکٹر لگائے تنقید زان نہیں آتا۔

خدا استاد کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے کہ جارحانہ تنقید کا تجربہ کرنے میں موصوف نے جان سے دھو لئے۔ اور داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ قالوا انا للہ و انا الیہ راجعون۔

"سیاحوں کی توجہ کا مرکز بہار"

پاٹلی پتر اکے پرانے راج نگر، نالندہ کی مشہور یونیورسٹی اور راجگیر کی خوبصورت دیواروں کی جھلک، سہسرام میں شیر شاہ کا مقبرہ، ویشالی، ارے راج اور لوریا نند گڑھ کے اشوک استوپ، بودھ گیا، دیوگھر، پارس ناتھ کے پرانے مندر اور پٹنہ سیٹی کے سکھ گرودوارہ کو ضرور دیکھیں۔

راجگیر کے گرم پانی کے جھرنوں نہانا اور چھوٹا ناگپور کے جھرنوں، پہاڑوں، جھیلوں اور جنگلوں کی قدرتی خوبصورتی کو دیکھنا نہ بھولیں۔

راجگیر میں آسمانی لفٹ کے ذریعہ رتنا گری پر تعمیر عالمی امن استوپ کا بھی درشن کریں۔

جمشید پور، مہیا، رانچی، سندری، دھنباد، پنچیت، میتھن، تلیا اور برونی کے مشہور و معروف صنعتی مرکزوں کو ضرور دیکھیں۔

پٹنہ، راجگیر، گیا، رانچی، نیترہاٹ، ڈالٹین گنج، دیوگھر اور مظفر پور میں ٹورسٹ وین اور اعلیٰ درجہ کی آرام دہ موٹر گاڑیاں بھی دستیاب ہیں۔

راجگیر، بودھ گیا، ویشالی، نیترہاٹ، دیوگھر، ڈالٹین گنج اور ہزاری باغ میں سیاحوں کے رہنے کے لئے اعلیٰ درجہ کی رہائش کا انتظام ٹورسٹ ڈیپارٹمنٹ کے ذریعہ کی گئی ہے۔

مزید معلومات کے لئے پٹنہ اور مختلف جگہوں کے ٹورسٹ انفارمیشن سینٹر سے رابطہ قائم کریں

ٹورسٹ ڈیپارٹمنٹ بہار

सू०ज०स०नि-41-स (सू-39)/84-85

شفیع مشہدی

(ڈرامہ)

دوسرا کینسر

پہلا منظر

وقت: آفس سے لوٹنے کا وقت لگ بھگ ۵ بجے

[چوک کا منظر۔ پان کی دکان پر پان کھاتے ہوئے ایک آدمی کھڑا ہے۔ چائے کی دکان پر ایک آدمی چائے پی رہا ہے۔ کچھ لوگ آ جا رہے ہیں۔ تب ہی دو دوست پان کی دکان پر آتے ہیں' جو انجینئر احمد اور دنیش ہیں۔]

(پان والے سے) بھیا! دو پان لگانا۔

پہلے سے کھڑا آدمی: یار! ذرا جلدی سے مجھے دے دو۔ گاڑی کا وقت ہے۔

پان والا: کیا کھائیں گے صاحب! کتھی لگائیں یا میٹھا پتا؟ سادہ لگائیں یا زردہ والا؟

احمد: کتھی لگاؤ بھائی۔ ایک پان میں پان بہار اور ہیرا موتی' دوسرے میں تین سو نمبر۔ یار دنیش! تم تو سادہ ہی کھاتے ہو نا؟

دنیش: ہاں بھائی! مجھے پان کا کوئی خاص شوق نہیں ہے۔ بس کوئی کھلا دیتا ہے تو کھا لیتا ہوں۔

احمد: کمال ہے یار! لکھنؤ کے رہنے والے ہو۔ اور پان کا شوق نہیں؟ اس دکان کا پان دو چار ہی دن کھا لو بس' پان کا شوق پیدا ہو جائے گا۔

دنیش: چھوڑو بھی یار! اتنے شوق پہلے ہی لگ چکے ہیں کہ اب اور کیا بڑھاؤں۔ ویسے بھی مہنگائی نے حالت خراب کر رکھی ہے۔

احمد: اللہ چھوڑو بھی یار! ابھی ڈیزائن میں پوسٹنگ ہوئے کچھ مہینے ہی ہوئے ہیں اور تم رونا رونے لگے۔ رکسی کا بھلا ہوا کب کام آئے گا (ہنستے ہوئے)

دنیش: (ہنستے ہوئے) بھائی صاحب! تم تو چاندی کاٹ رہے ہو۔ اس لئے ہری ہری سوجھ رہی ہے۔ یہاں تو ایسا سوکھا پڑا ہے کہ مت پوچھو۔ بس کچھ مہینے اور کاٹ لوں پھر ہاتھ پیر مار کر کسی اچھے دفتر میں جاؤں گا۔

(تبھی ایک فقیر آواز لگاتا ہوا آتا ہے)

فقیر: بابا! جو دے اس کا بھی بھلا' جو نہ دے اس کا بھی بھلا۔ بابا پانچ پیسے کا سوال ہے۔

احمد: یار! یہاں تو کھڑا رہنا بھی مشکل ہے۔ یہ بھیک مانگنے والے تنگ کر دیتے ہیں۔

(فقیر سے) بابا آگے بڑھو۔

فقیر: خدا بھلا کریگا! ایک ہی پیسہ دے دو صاحب!

احمد: (غصے سے) کہدیا نا آگے بڑھو' پیچھے پڑ گئے۔ جاتے ہو یا بلاؤں پولس کو؟ کوئی کام کیوں نہیں کرتے؟

فقیر: کام کہاں ملتا ہے؟ بابو جی! اب بڑھاپے میں کام بھی کیا کریں گے؟ کچھ دے دو صاحب! خدا بھلا کریگا۔

احمد: (بگڑ کر) تم بھیا نہیں چھوڑو گے؟ جانتے نہیں' بھیک مانگنا جرم ہے؟ بھاگو نہیں تو تھانے بھجوا دونگا۔ قانون توڑتے شرم نہیں آتی؟

فقیر: ہم قانون وانون کیا جانیں صاحب! ہم تو صرف پیٹ کا ایک قانون جانتے ہیں اور یہ ظالم پیٹ کچھ نہیں سنتا۔ کچھ دے دو صاحب۔

احمد: اچھا! تو تم خاصے لیڈر بھی ہو۔ بھیک مانگنا چھوڑو اور لیڈری کرو۔ سمجھے۔

دنیش: چھوڑو بھی یار! کیا الجھ پڑے؟ (فقیر سے) لو بابا! یہ دس پیسے اور راستہ ناپو۔

فقیر: (جاتے ہوئے) خدا خوش رکھے! جو دے اس کا بھی بھلا جو نہ دے اس کا بھی بھلا۔

دنیش: (ہنستے ہوئے) کتنی غلط بات کہہ رہا ہے؟ ہمارے یہاں تو جو دے اُس کا بھلا اور جو لے اس کا بھی بھلا ہوتا ہے۔ اور جو نہ دے اور نہ لے، اُس کا تو ستیاناس ہے یہاں۔ (دونوں ہنستے ہیں)۔

احمد: یار بڑا خراب زمانہ آگیا ہے۔ اب تو کسی سے بات کرنے کا بھی نہیں رہا۔ سالے بھیک مانگنے والے بھی بحث کرنے لگے تھے۔

پان والا: (پان بڑھاتے ہوئے) لیجیے صاحب! پان کھائیے!!

دنیش: چلو یار! پان کھاؤ اور زمانے کا رونا چھوڑو۔ سب ٹھیک ہے۔

احمد: (پان کھاتے ہوئے) لو! یہ الائچی تو...... نہیں یار! واقعی زمانہ خراب ہوگیا ہے۔ ویلیوز بالکل ختم ہو رہے ہیں۔ پتہ نہیں کیا ہوگا آگے؟

ارے یار! کیوں رونا رو رہے ہو ویلیوز کا؟ زمانے کا یہی چلن ہے۔ اپنی سناؤ، آج کل کیسا چل رہا ہے؟ آمدنی ٹھیک ہے نا؟ گھوش تو کہہ رہا تھا کہ تم روپے کی تین اٹھنیاں بنا رہے ہو۔ بہت اچھی پوسٹنگ ہوگئی ہے تمہاری۔

احمد: ہاں بھائی! خدا کی مہربانی ہے۔ میں تمہاری طرح ناشکرا نہیں ہوں۔ اچھی جگہ مل گئی ہے۔ میں نے مکان بھی بنا لیا ہے اور کار بھی خرید لی۔ بڑے لڑکے کو میڈیکل میں دے دیا ہے۔ اللہ کا بڑا کرم ہے ورنہ تنخواہ سے تو دو وقت کی روٹی بھی نہیں چلے گی۔

دنیش: چلو اچھا ہے میاں! موج اڑالو۔ اپنے پھر یاگے۔

احمد: یلو! تم شبابی کو پکڑو، کچھ خرچا کرو، اچھا؟ بیٹا جب تک خرچا نہیں کروگے کام نہیں بنے گا۔ no win without investment

[اچانک بیک گراؤنڈ سے کچھ ہنگامے اور لڑائی جھگڑے کی آواز آتی ہے۔

ایک آواز: کیا ہوا؟ کیا ہوا؟ مارو۔ مارو۔ پکڑو........

دوسری آواز: ارے کیا ہوا ہے؟ یار پیٹے اسٹوڈنٹس کے دو گروپ ہیں۔ آپس میں لڑ پڑے ہیں۔

احمد: حیرت ہے! کسی کو کچھ خیال ہی نہیں۔ سڑک پر مار پیٹ کرتے رہتے ہیں۔ نہ پولس کا ڈر، نہ قانون۔ اس قدر لوگ نڈر ہوگئے ہیں کہ...... میں کہتا ہوں سوسائٹی کہاں جائے گی۔

دنیش: (ہنستے ہوئے) جہاں تم لے جا رہے ہو۔

احمد: نہیں یار! میں مذاق نہیں کر رہا ہوں۔ سارے ویلیوز ختم ہوگئے۔ کوئی سوچتا ہی نہیں ملک کہاں جا رہا ہے؟ سماج، سوسائٹی، کسی کا کوئی لحاظ نہیں ہے۔ اس ملک کا خدا حافظ ہے۔

دنیش: (ہنستے ہوئے) میاں! روپے کی تین اٹھنی، خدا کا شکر کرو اور اصول کی بات کرتے یہی آج کا فیشن ہے، کیوں؟

احمد: نہیں یار! یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ میرے تو میں ویلیوز سارے ہوئے ہیں۔ میں کیسے انہیں [illegible] سکتا ہوں۔

دنیش: اچھا بھائی! تم اپنے ویلیوز کا راگ الاپتے رہو۔ ہیپوکریسی چھوڑو۔ سب ٹھیک ہے اور اصول صرف دوسروں کے لئے ہوتے ہیں۔ یہ تو جو دے اس کا بھی بھلا اور جو لے اس کا بھی

باقی سب کا ستیاناش ہے (ہنستا ہے) میں چلا۔
بائی بائی !

احمد: (ذرا دور سے) اچھا بائی! بائی! مگر دیکھو! شرباجی کو مزید بگڑنا۔ ہزار پانچ سو میں کام بن جائیگا۔ بھابھی کو منستے کہنا۔

(دونوں ہنستے ہوئے چلے جاتے ہیں)

دوسرا منظر

[وقت: کچھ دنوں بعد، دوپہر کا وقت
احمد کا گھر۔ احمد کہیں جانے کی تیاری کر رہا ہوتا ہے]

احمد: ارے بھئی کہاں ہو رشو؟ پتہ نہیں کہاں چلی گئی؟
رشو! رشو!! (چلاتا ہے)

رشو: (آتے ہوئے) آ رہی ہوں بھئی! میں ذرا باتھ روم کیا گئی آپ نے تو سارا گھر ہی سر پر اٹھا لیا۔ کیا بات ہے؟ کون سی آفت آگئی؟ گلا پھاڑ پھاڑ کر چیخ رہے ہیں۔ منا ابھی ابھی سویا ہے، اگر اٹھ گیا تو غضب ہی ہوگا۔
(چپ ہو کر دیکھتی ہے) لیجئے کہاں تو چلا رہے تھے، کہاں بالکل ہی چپ ہو گئے۔ کچھ بولئے بھی!

احمد: تم چپ ہو جاؤ تو بولوں۔ میں نے صرف آواز دی تھی۔ تم لیکچر دینے لگیں۔

رشو: کہئے کیا بات تھی؟

احمد: تمہارے لیکچر کے بعد مجھے کیا خاک یاد رہے گا کہ کس لئے بلا رہا تھا۔ ہاں یاد آیا، میں پوچھ رہا تھا کہ رات جو پانچ ہزار روپے تمہیں رکھنے کو دیئے تھے، وہ کہاں رکھ دیئے؟

رشو: ارے کیا میں کھا گئی؟ الماری میں جو ڈبہ ہے، اسی میں رکھے ہیں۔ مگر اچانک روپے کی کیا ضرورت آ پڑی؟

احمد: ضرورت کیا پڑ گئی؟ یہ روپے گھر میں رکھنے کے نہیں ہوتے۔ بیگم صاحبہ! دس دوست ہوتے ہیں تو دس دشمن بھی ہوتے ہیں۔ ویسے ہی پڑوس کے لوگ جلتے رہتے ہیں۔ کہیں جو یہ پڑ گیا تو پھر مصیبت ہی ہوگی۔ اس لئے روپے مجھے دے دو۔ میں جا کر لاکر میں رکھ آؤں۔

رشو: لیکن! لاکر پرچھاپا نہیں پڑ سکتا کیا؟

احمد: یا اللہ! عورتوں کو حسن کے ساتھ تھوڑی عقل بھی کیوں نہیں دی تو نے؟ ارے بھاگوان لاکر میرے نام تھوڑے ہی ہے۔ وہ تو تمہارے بھائی صاحب یعنی میرے سالے صاحب کے نام پر ہے۔ کسی کو کیا پتہ؟ تم روپے نکال دو۔ میں بینک میں جا کر رکھ دوں گا اور اُدھر سے جمعہ کی نماز میں چلا جاؤں گا۔ آج کچھ دیر سے لوٹوں گا۔ تم کھانا کھا لینا۔

رشو: دیر سے کیوں لوٹئے گا؟ پھر کہیں تاش کی بازی جمے گی کیا؟

احمد: توبہ ہے! جب سوچو گی! الٹا ہی سوچو گی۔ نماز کے بعد مولانا رشید کی تقریر ہے۔ واللہ کیا شاندار تقریر کرتے ہیں۔ روح کو فرحت اور ایمان کو تازگی ملتی ہے۔ اسی میں دیر ہو جائے گی لوٹنے میں۔

رشو: اور وہ مسجد میں چندہ دینے کی جو بات تھی اس کا کیا ہوا؟

احمد: ہونا کیا تھا؟ میں نے پچھلے جمعہ کو پانچ سو ایک روپے دینے کا اعلان کیا تھا۔ خوب واہ واہ ہوئی۔ میری سخاوت کی دھاک تو پہلے ہی سے جمی ہوئی تھی۔

رشو: ہاں بھئی مسجد میں تو دینا ہی چاہیئے۔

احمد: کیوں نہیں! آخر جو کچھ ہے، وہ اللہ ہی کا دیا ہوا تو ہے اور پھر اوپر (آسمان کا) کا سامان بھی تو کرنا ہے۔ جب تک مسجد رہے گی، ثواب ملتا رہے گا۔

رشو: بے شک! مگر اتنا نہ ہوا کہ کچھ میرے نام سے بھی دے دیتے۔ آخر میرا کیا ہوگا۔ مجھے بھی تو وہاں جانا ہے۔

احمد: ارے بھئی! جب میں جنت میں جاؤں گا تو تمہیں کیا چھوڑ دوں گا؟ جنت کے دروازے پر رک کر اللہ میاں سے کہوں گا کہ جب تک مجھے رشو نہیں ملے گی، میں جنت میں نہیں جاؤں گا۔ بس! اللہ میاں تمہیں بھی بھیج دیں گے۔ کیوں!

رشو: (روہانسی ہو کر) دیکھئے! مذہب کے معاملے میں مذاق مجھے بالکل پسند نہیں ہے۔

احمد: (ہنستے ہوئے) اچھا بھائی! یتیم خانہ میں جو پیسے مجھے دینا ہے وہ تمہارے نام پر دے دوں گا۔ فرشتے

اُسے تمہارے اکاؤنٹ میں جمع کر دیں گے۔ بس! اب تو
خوش ہیں نہ میری بنّو!

رشّو: (شرماتے ہوئے) دھت! مذاق کرنا تو کوئی آپ سے سیکھے۔

[اسی وقت ہاتھ پونچھتا ہوا گھر کا نوکر شرفو
آتا ہے]

شرفو: سرکار کچھ پیسہ ہمکا بھی چاہیے۔

احمد: لیجئے! ان کی سنئے۔ آپ کو کس لئے پیسہ چاہیے؟ آپ
نہ تو مسجد ہیں نہ یتیم خانہ۔

شرفو: سرکار چھوٹی بیٹی کا شادی اب کی جیٹھ میں ضروری
ہے اور پیسہ کوڑی کا انتظام نہیں ہو سکا ہے۔

رشّو: فکر مت کرو۔ سو پچاس ہم سے لے لینا۔

شرفو: بیگم صاحبہ! سو پچاس سے کیا ہوگا اس گرانی میں۔

رشّو: تو اور کیا ہزار چاہیے؟ (بگڑتی ہے)

احمد: اوہو! چھوڑو بھی (شرفو سے) جاؤ تم میرے جوتے
پالش کر کے لاؤ اور فضول باتیں مت کیا کرو۔ سمجھے!

شرفو: ناہیں صاحب! فضول بات کاہے کریں گے۔ سرکار کی
سخاوت کی تو محلے میں شہرت ہے۔ سب لوگن کہتے ہیں
کہ سخی ہو تو احمد صاحب جیسا۔ انگریزی
پڑھتے ہیں مگر ہمیشہ نماز پڑھتے ہیں اور جی کھول کر چندہ
بھی دیتے ہیں۔ سرکار کی تو دین دنیا دونوں اچھے
ہیں۔ ہم غریب پر تو نظر رکھئے۔ خدا بھلا کریگا۔

احمد: اچھا بابا! سن لیا۔ جاؤ کام کرو۔ (شرفو چلا جاتا
ہے)۔ اُف تنگ آگیا ہوں میں۔ مسجد کے لئے چندہ
یتیم خانے کے لئے چندہ، لڑکی کی شادی کے لئے چندہ۔
ایسے میں کیا انہیں لوگوں کے لئے کماتا ہوں۔ جسے دیکھو
ہاتھ پھیلائے ہوئے چلا آرہا ہے۔

رشّو: آپ خود اپنا روپیہ لٹاتے ہیں تو دوسرے کیا کریں۔
میں تو کہتے کہتے تھک گئی کہ ہاتھ روکئے۔

احمد: ارے بھائی! تو کیا کریں؟ عزت بچانے کے لئے بھی
تو دینا پڑتا ہے۔ اب حامد خلیل نے جب مسجد کے لئے
تین سو روپے دیے تو مجھے پانچ سو روپے دینے ہی
پڑے۔ آخر لوگ کیا کہتے؟ سماج میں عزت بنائے
رکھنے کے لئے کچھ تو کرنا ہی پڑتا ہے۔

رشّو: وہ تو ٹھیک ہے مگر........

احمد: (بگڑ کر) کیا اگر مگر لگا رکھی ہے۔ نماز کا وقت ہوا
ہے اور تم کھڑی ہو! ٹوپی کہاں ہے ہماری؟

شرفو: (کھانستے ہوئے آتے ہوئے) سرکار جوتا!

احمد: (بگڑ کر) میرے سر پر دے مارو!

شرفو: (گھبرا کر) سرکار ہمری کیا مجال۔ کوئی قصور
ہو تو معاف کر دیجئے۔

احمد: بحث مت کرو۔ دفع ہو جاؤ۔

شرفو: خدا آپ کا بھلا کرے۔ آپ بڑے دیالو ہیں سرکار۔

احمد: اچھا اچھا ٹھیک ہے۔ (شرفو جاتا ہے)

(رشّو ٹوپی اور روپے لیکر آتی ہے)

رشّو: ٹوپی لیجئے۔

احمد: اور روپے۔

رشّو: (روپے دیتے ہوئے) یہ رہے روپے۔

احمد: (روپے رکھتے ہوئے) شام کو ذرا چائے وغیرہ کا انتظام
کر لینا۔ کچھ لوگ آنے والے ہیں۔

رشّو: اب پھر کون لوگ آ رہے ہیں؟ روز کا یہی قصہ ہے۔

احمد: ارے بھئی! مولانا صاحب کو چائے پر بلایا ہے
ان کے ساتھ سماج سدھار کمیٹی کے کچھ لوگ بھی
آئیں گے۔ آخر اپنی عزت بنائے رکھنے کے لئے کچھ تو کرنا
ہی پڑتا ہے۔ اور ہاں دیکھو! شاید صدیقی بھی آئے گا
اس نے فون کیا تھا۔

رشّو: صدیقی؟ کون صدیقی؟

احمد: (ذرا بگڑ کر) کون صدیقی؟ ارے تو کیا دس بیس صدیقی
ہیں؟ وہی اپنا بچپن کا دوست صدیقی۔ فون پر
کچھ پریشان لگ رہا تھا۔ کہہ رہا تھا کہ شام کو آؤں گا
کچھ کام ہے۔

رشّو: سمجھ گئی! کیسا کام ہوگا؟ روپوں کی ضرورت ہوگی۔
آخر وہ کالے چندہ کیا ہو جاتا ہے؟ ہمیشہ [illegible]

احمد: (تیز لہجے میں) رشّو! یہ تم کیا کہہ رہی ہو! ہوش میں آؤ۔
میں آج جو کچھ ہوں اسی کی بدولت ہوں۔ اگر صدیقی

کے ابا مجھے نہیں پڑھاتے تو شاید میں ہائی اسکول بھی نہیں کرپاتا۔ میں احسان فراموش نہیں ہوں۔ خان بہادر کا احسان میری کئی پشتیں بھی نہیں اتار سکتیں ہیں۔ اور پھر صدیقی نے کب روپے واپس نہیں کئے؟ بچے ایمان دار اور شریف آدمی ہیں۔

میں کب کہہ رہی ہوں وہ شریف آدمی نہیں ہیں۔ مگر وہ بھی تو گزیٹیڈ پوسٹ پر ہیں۔ انجینیر ہیں، ہزار دو ہزار ملتے ہی ہونگے۔ پھر کیا مجبوری ہے؟

اری پگلی! ہزار دو ہزار میں کیا ہوتا ہے۔ پانچ بچے ہیں۔ کھلانا پلانا، پھر لڑکی کی شادی سر پر ہے۔ ایمان دار ایسا کر بھی کیا سکتا ہے، گر غلط کام نہیں کر سکتا۔ پریشان تو رہنا ہی ہے ایسے آدمی کو۔

تو پھر پریشان رہیں۔ ہمیں کیوں پریشان کر رکھا ہے انہوں نے؟

تم کبھی عقل سے کام لوگی بھی یا نہیں؟ دو ہزار روپے تو مجھے بھی ملتے ہیں۔ تنخواہ سے گذارہ ممکن ہے کیا؟ یہ موٹر، یہ فرنیچر، یہ سخاوت کے چندے۔ کیا تنخواہ سے یہ سب ہو جاتا؟ تنخواہ سے تو صرف کار کا پٹرول ہی پورا ہوتا ہے۔ وہ تو اللہ کی مہربانی ہے اوپر کی آمدنی ہے۔ نہیں تو، تمہارے لئے ہر ماہ یہ قیمتی ساڑیاں کہاں سے آتیں۔

بس۔ بس! آپکو میری ساڑی کی ہی جلن آتی ہے۔

تو اور کیا؟ میں اکثر سوچتا ہوں کہ انسان بیوی بچوں کے لئے ہی اپنا ایمان خراب کرتا ہے۔

کیوں نہیں؟ آپکی ساری آمدنی تو ہم ہی لوگ کھا جاتے ہیں۔

(جھلاکر) میں یہ کب کہہ رہا ہوں؟ مگر کبھی کبھی ضمیر ڈسنے لگتا ہے کہ کس قدر ہیپوکریسی کی زندگی ہے۔ پر کیا کروں؟ ایمان داری کو کاندھے پر لئے پھرتا تو پھر یہ عیش کی زندگی کہاں نصیب ہو؟ سماج میں عزت کیسے ملے؟

(ہانپتے ہوئے) سرکار! چپراسی یہ خط لیکر آیا ہے دنیش بابو کے یہاں سے۔ (ایک خط احمد کو دیکر واپس چلا جاتا ہے)۔

احمد: (خط پڑھتا ہے)......

رشو: کیسا خط ہے؟

احمد (خط پڑھ کر ہنستا ہے)

رشو: کیا بات ہے؟

احمد: ارے، اسی دنیش کا خط ہے۔ بڑا خوش قسمت ہے۔ پانچ ہزار خرچ کرکے ایسے ڈیپارٹمنٹ میں پوسٹنگ کرالی ہے کہ ہر مہینے پانچ ہزار کمانے لگا۔ اسی خوشی میں ستیہ نارائن بھگوان کی پوجا ہے آج رات اس کے یہاں۔ تمہیں بھی بلایا ہے۔

رشو: میں پوجا میں جاکر کیا کروں گی؟

احمد: ارے کرنا کیا ہے؟ پوجا تو ایک بہانہ ہے۔ پوجا کے بعد تگڑی سی پارٹی ہوگی۔ تمہیں بھی مزا آجائے گا۔

رشو: پارٹی تو وہی شراب کی پارٹی ہوگی؟ "نابابا نا" میں نہیں جاؤں گی۔ اس حرام چیز سے تو مجھے نفرت ہے۔ میں تو اسے دیکھنا بھی نہیں چاہتی۔ اللہ حرام چیز سے دور رکھے۔

احمد: حرام چیز سے دور رکھے اور یہ جو روز تم ہزار دو ہزار کے زیور بنواتی ہو، ساڑیاں خریدتی ہو، وہ سب حلال ہے کیا؟

رشو: میں کیا جانوں؟ روپے آپ لاتے ہیں، تو آپ جانیں۔ مجھے روپوں سے مطلب ہے، حرام ہے یا حلال یہ آپ جانیں۔ (جھنکتے ہوئے) نماز پڑھنے جانا ہے یا نہیں؟

احمد: ارے ہاں! تمہاری باتوں میں تو نماز ہی چھوٹ جاتی۔ میں چلا...... (چلا جاتا ہے)

[رشو بھی گھر کے اندر چلی جاتی ہے]

تیسرا منظر

[وقت: اسی دن شام کا وقت
احمد کے ڈرائنگ روم میں مولانا رشید صاحب
رحمان صاحب اور احمد بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے ہیں]

احمد: مولانا رشید صاحب! آج مسجد میں آپکی شاندار تقریر نے تو ایمان تازہ کر دیا۔ سبحان اللہ! کس قدر پُراثر بیان تھا آپ کا، کیوں رحمان صاحب؟

رحمان: کیا کہتے ہیں صاحب! سالوں بعد ایسی تقریر سننے کا موقع ملا۔ اللہ نے مولانا کی زبان میں تاثیر دی ہے۔ اور کیوں نہ ہو؟ ایمان تو مولانا کی زندگی ہے۔

مولانا: شکریہ! شکریہ!! مگر آپ حضرات مجھے کانٹوں میں کیوں گھسیٹ رہے ہیں؟ سب اللہ کا کرم ہے۔ دراصل احمد صاحب خود ہی اس قدر نیک اور صاف زندگی گذارنے والے ہیں۔ ایمان کا بھرم تو آپ جیسوں سے ہی قائم ہے۔

رحمان: ہاں صاحب! یہ بات تو ہے۔ اعلیٰ تعلیم، اعلیٰ عہدہ مگر اس کے باوجود اس قدر مذہبی ہیں احمد صاحب اور اس قدر بااصول اور دیندار ہیں کہ کیا کہیے!

احمد: شکریہ! مگر میں تو خود گنہگار ہوں۔ اپنی طرف سے کوشش کرتا ہوں کہ خدا مجھ سے خوش رہے۔ ورنہ اس چار دن کی زندگی میں رکھا کیا ہے۔ انسان کو آخرت کی فکر کرنی چاہیئے۔ اس چھوٹی سی زندگی کے لئے ایمان کو خراب کرنا بے وقوفی ہے۔

مولانا: سبحان اللہ! سبحان اللہ! کیا پاکیزہ خیالات ہیں آپ کے۔

(احمد کی لڑکی شینو داخل ہوتی ہے)

شینو: آداب! (مولانا کو آداب کرتی ہے)

احمد: (مولانا سے تعارف کراتے ہوئے) میری بیٹی ہے شینو! بڑی نٹ کھٹ ہے بالکل اپنی ماں کی طرح۔

(سبھی ہنستے ہیں)

مولانا: بڑی پیاری بیٹی ہے! جیتی رہو! خوش رہو!!

شینو: انکل چلئے! میں آپ کو ویڈیو فلم دکھاؤں۔ ٹارزن کی بڑی اچھی انگریزی فلم ہے۔

مولانا: کچھ نہیں بیٹی! پھر کبھی دیکھوں گا۔

احمد: جاؤ بیٹی! جلدی سے چائے وائے بھیجو۔

شینو: (جاتے ہوئے) ابھی لاتے ہیں۔ چائے بھی اور اس کے ساتھ وائے بھی۔

(سبھی ہنسنے لگتے ہیں۔ اسی وقت دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز آتی ہے)

احمد: شرفو! شرفو!!

شرفو: (آتے ہوئے) جی سرکار!

احمد: دیکھو بھئی کون ہے؟

شرفو: (دیکھ کر) صدیقی صاحب ہیں۔ آپ سے ملنے آئے ہیں۔

احمد: (آواز دیتے ہوئے) ارے بھائی صدیقی! آ جاؤ۔ (گرمجوشی سے ہاتھ ملاتے ہوئے) آؤ آؤ! تمہیں ان لوگوں سے ملاؤں۔ یہ ہیں مولانا رشید صاحب! مشہور عالم۔ اور یہ ہیں رحمان صاحب! سماج سدھار کمیٹی کے چیرمین۔ ویسے میکینیکل ڈپارٹمنٹ کے بہت بڑے کنٹریکٹر ہیں۔ اور یہ ہیں میرے بچپن کے دوست صدیقی۔ یہ بھی انجینیئر ہیں۔ ویسے سمن پور کے خان بہادر فرید صدیقی صاحب کے صاحبزادے ہیں۔

مولانا+رحمان: اچھا۔ اچھا! (ایک ساتھ بولتے ہیں)

مولانا: بھلا مرحوم خان بہادر کو کون نہیں جانتا تھا۔

رحمان: سمن پور کے نامی رئیس تھے۔

مولانا: آئیے آئیے! تشریف رکھیئے۔

صدیقی: (ہنستے ہوئے) احمد صاحب نے تو میرا اتنا لمبا چوڑا تعارف کروایا کہ مجھے ندامت ہو رہی ہے۔ میں ایک معمولی انسان ہوں۔ آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی مولانا۔ آپ کی بہت تعریف سنی ہے۔

احمد: ارے بھائی! تم تو جمعہ کی نماز میں آتے ہی نہیں۔ آج مولانا کی تقریر سنی ہوتی تم نے۔ واللہ ایمان تازہ ہو گیا ہم لوگوں کا۔

صدیقی: (ہنستے ہوئے) ارے بھائی! میرے پاس ایمان ہوتا تبھی تو تازہ ہوتا۔ میں محروم ہی رہ گیا۔

مولانا: صدیقی صاحب! نماز نہیں چھوڑنی چاہیئے۔ آپ احمد صاحب سے سبق لیجئے۔ کبھی نماز نہیں چھوڑتے۔

صدیقی: ہاں صاحب! میں واقعی گمراہ ہوں۔ احمد صاحب سے مزید سبق لینا چاہیئے۔

: دیکھو یار صدیقی! تمہارا یہ انداز میری سمجھ میں نہیں آتا۔ تم نماز سے بھاگتے ہو۔ آخرت کا سامان تو کرنا ہی چاہیے۔

یقی: (ہنستے ہوئے) ارے بھئی! میں نے کب کہا کہ نماز بری چیز ہے (سنجیدگی سے) میں تو سمجھتا ہوں کہ زندگی بجائے خود ایک عبادت ہے۔ بشرطیکہ اسے عبادت سمجھا جائے۔ میں تو اکثر عبادت کی پہلی ہی منزل سے گذر رہا ہوں۔

: یہ کہہ کر تم بھاگ نہیں سکتے۔

یقی: (ہنستے ہوئے) میں بھاگ کب رہا ہوں۔ مجھے اپنی کمزوریوں کا پورا احساس ہے۔

ا: پھر آپ آتے کیوں نہیں صدیقی صاحب! انشاء اللہ ....

یا: (مولانا کی بات کاٹتے ہوئے) مولانا بڑا ذاتی سوال کر رہے ہیں آپ۔ مجھے مسجد آنے سے انکار کب ہے؟ میں تو ابھی اپنی شخصیت اور کردار کو ویسا بنانے کی کوشش میں لگا ہوں جہاں پہنچ کر میں مسجد میں آنے کے قابل ہو جاؤں۔

: دیکھئے صدیقی صاحب! احمد صاحب آپکے دوست ہیں۔ آپ ان سے سبق لیجئے۔ دین اور دنیا دونوں میں سرخرو ہونے کا راز ان سے پوچھئے۔

یا: بہت خوب! (ہنستا ہے) ٹھیک ہے! ضرور سیکھونگا۔ کیا اچھا ہو کہ ہم لوگ دوسری باتیں کرتے۔

: لیکن کیوں؟ تم مذہب سے اتنا گھبراتے کیوں ہو؟

قی: اس لئے کہ کچھ بھی نہیں آتی مجھے۔ اس لئے کہ مذہب، عبادت اور زندگی کا مطلب میں سمجھتا ہوں۔

: (بیچ میں آتے ہوئے) صاحب ناشتہ!

: رکھ دو۔ دیکھو چائے بھی لاؤ۔

: (جلدی سے) تیار ہے صاحب! لا رہے ہیں، فوراً لا رہے ہیں۔

مولانا رشید صاحب: (جھجکتے ہوئے) اور شرفو چائے کے ساتھ کچھ ...۔

مولانا: (کھاتے ہوئے) جی! فرمائیے۔

احمد: میں اکثر سوچتا ہوں کہ انسان چار دنوں کی زندگی کے لئے وہ کیا کچھ نہیں کرتا۔ ایمان اور انسانیت سب کچھ بیچ دیتا ہے۔

(درمیان میں اچانک احمد کے لڑکے ارشد کی آمد)

ارشد: ہائے پاپا! ہیلو ایوری باڈی۔

احمد: (چونک کر) ارشد! ارے تم کب آئے؟ کالج بند ہو گیا کیا؟

ارشد: اوہ نو! آئی ایم گوئنگ ٹو اٹینڈ اے پاپ میوزک کانسرٹ۔

احمد: (بات کاٹتے ہوئے کچھ گھبرا کر) بیٹا! تم نے مولانا کو سلام بھی نہیں کیا؟ یہ مولانا رشید ہیں اور یہ صدیقی انکل۔

ارشد: گڈ ایوننگ ایوری باڈی۔

احمد: (ذرا بگڑتے ہوئے) یہ کیا بات ہوئی؟ تمہیں سلام علیکم کہنا چاہیے۔ تم بالکل.....

ارشد: اوہ! ڈونٹ بی سلی ڈیڈی۔

صدیقی: ارے بھائی! جانے بھی دو۔ تہذیب اور روایتیں بگڑنے کے لئے ہی ہوتی ہیں۔ (ارشد سے) بھائی ڈونٹ یو تھنک۔ اے سینٹ مائی بوائے۔

ارشد: ٹھیک ہے انکل۔ میں تو بچپن ہی سے ہاسٹل میں رہا ہوں اور ہمیشہ فادر کو گڈ ایوننگ کہا۔ وہ تو برا نہیں مانتے۔ کیا فرق پڑتا ہے؟ وش کرنے کے کئی ڈھنگ ہوتے ہیں۔

احمد: (بگڑ کر) خاموش رہو! غلطی تمہاری نہیں میری ہے۔

مولانا: جانے بھی دیجئے احمد صاحب! بچہ ہے۔ ارشد بیٹے!! ہماری تہذیب ہمارا مذہب ہمیں سکھاتا ہے کہ ہم سلام علیکم کہیں۔

ارشد: (تعجب سے) ارے مولانا (ہنستے ہوئے) آپ بھی بہت پیچھے رہ جائیں گے۔

صدیقی: (ہنس کر) مولانا تو کافی بدل چکے ہیں بھائی ورنہ احمد تم کیسے بدلتے؟

احمد: (غصے سے) ارشد! تم ہوش میں رہو۔ کیا تمہارا یہ شعور نہیں کہ جب چاہو بولتے ہو۔

ارشد: (سنجیدگی سے) مگر ڈیڈی! یہ کلچر کوئی کینسر بھی تو نہیں، جس سے چھٹکارہ ہی ممکن نہ ہو۔

صدیقی: (ہنستا ہے) بہت خوب! تہذیب اور روایتیں کینسر ہوں تو نہیں ہیں۔ بہت ہی خوبصورت جملہ کہا۔ خدا کی قسم لطف آ گیا۔ شاباش ارشد بیٹے! تم اپنے باپ سے زیادہ ذہین ہو۔

(احمد سے) ارے احمد بھائی! چھوڑو، کیا بچوں سے الجھتے ہو؟ زیادہ الجھو گے تو ایسے ہی جملے سنو گے۔ جاؤ ارشد۔ امی سے مل لو۔ وہ تمہارا انتظار کر رہی ہوں گی۔ (احمد سے) اچھا بھئی میں چلا، پھر ملوں گا۔

احمد: مگر تم تو کہہ رہے تھے کہ کچھ کام ہے۔ کیا کام ہے؟ بتاؤ نا۔

صدیقی: کل فون پر باتیں کروں گا۔ اب موڈ نہیں رہا۔ اچھا مولانا تسلیم!

مولانا: وعلیکم السلام!

صدیقی: میرے حق میں دعا کیجیے گا۔

مولانا: دیکھیے! میری باتوں کا برا مت مانیے گا۔ مگر آپ کو عبادت کا خیال رکھنا چاہیے۔

صدیقی: (ہنستے ہوئے) شکریہ! میں عبادت ہی تو کرتا رہا ہوں مولانا۔ ایمانداری سے گزاری زندگی بھی عبادتوں سے کہیں زیادہ مشکل ہے حضور! ابھی میں پہلی منزل میں ہوں۔ اچھا خدا حافظ (چلا جاتا ہے)۔

رحمان: اچھا میں بھی چل رہا ہوں۔

احمد: ارے ایسی بھی کیا جلدی ہے؟

رحمان: ارے! کچھ بھی نہیں، ذرا دنیش بابو کے یہاں جانا ہے۔

احمد: ارے ہاں وہاں تو مجھے بھی ابھی جانا ہے۔

(رحمان جاتا ہے)

مولانا: اچھا احمد صاحب! اب میں بھی چلوں گا۔

احمد: ذرا ٹھہر جائیے۔ (احمد اندر جاتا ہے۔ مولانا پان کھاتے ہیں۔ شرنو کپ پلیٹ وغیرہ ہٹاتا ہے۔ احمد آتا ہے اور مولانا کو سو سو کے نوٹ دیتا ہوا بولتا ہے) معاف کیجیے گا۔ ابھی ۵۰۰ روپے ہی دے رہا ہوں۔ پھر خدمت کروں گا۔

مولانا: (روپے رکھتے ہوئے) ارے اس کی کیا ضرورت۔ خدا آپ کو ترقی دے گا۔

احمد: مولانا میرے لیے دعا کیجیے۔ کچھ لوگ اس آمدنی پوسٹ سے مجھے ہٹانا چاہتے ہیں۔ دعا کیجیے ابھی بدلی نہ ہو۔ تو آپکی اور خدمت کر سکوں گا۔

مولانا: آپ فکر نہ کیجیے۔ میں آج ہی سے چالیس دن شروع کر دوں گا۔ آپکی بدلی نہیں ہوگی۔

احمد: شکریہ! شکریہ۔ (مولانا ہاتھ ملا کر چلے جاتے ہیں)

چوتھا منظر

[وقت: رات کا منظر۔ دنیش کے گھر میں بہت سے لوگ جمع ہیں۔ احمد بھی ہے۔ ستیہ نرائن بھگوان کی آرتی چل رہی ہے]

دنیش: (پنڈت جی سے) پنڈت جی ذرا جلدی کیجیے۔ دیر ہو گئی ہے۔

پنڈت: ابھی ختم کرتا ہوں ججمان (پوجا کا کام ختم کر کے دنیش کو آشیرواد دیتا ہے) بھگوان سے پرارتھنا ہے کہ دنیش بابو جیسے مہان … کی ترقی ہو۔ لکشمی اور سرسوتی کی سدا مہربانی … (آشیرواد دے کر چلا جاتا ہے)

دنیش: بس بس! صرف لکشمی جی کی مہربانی رہے۔ ابھی … جی کو تکلیف کرنے کی ضرورت نہیں۔

احمد: تم نے پنڈت جی کو خوش کر دیا؟

دنیش: ارے بھائی میرا تو اصول ہی یہ ہے کہ جو دے … بھی بھلا جو نہ دے اس کا بھی بھلا۔

احمد: اور جو نہ لے؟

دنیش: اس کا تو ستیہ ناش ہے یہاں (دونوں ہنستے ہیں)

احمد: جی کھول کر ثواب کما رہے ہو بیٹا!

دنیش: یار یہ تو معمولی حساب ہے۔ مان لو کہ زندگی ایک پلڑے میں ایک ٹن پاپ ہے تو دوسرے میں کیا … دان دکھشنا کا ثواب ڈال دو۔ دونوں پلڑے برابر ہو جا…

ساب بولو ہے۔ ایک دو گرام بھی ثواب کا پلڑا بھاری ہو گیا تو جنت میں جگہ بک ہے۔

: تو تم نے جنت میں جگہ بک کرا لیا؟

یش: بک کرا لیا؟ ارے یہ سمجھو کہ میں نے فلیٹ خرید لیا ہے۔ بس دو چار کتھا اور کچھ تیرتھ یاترا کر کے اس فلیٹ کو ایئر کنڈیشن کرانے کی دیر ہے۔ (دونوں ہنستے ہیں)

ار: یار تم مذہب کا خوب مذاق اڑاتے ہو۔ یہ بات ٹھیک نہیں ہے۔

بش: دیکھو! میں تمہاری طرح ہپوکریٹ نہیں ہوں۔ تم سمجھتے ہو کہ نماز پڑھ کر اور رشوت کے پیسے سے مسجد اور یتیم خانہ میں چندہ دے کر یا مندر بنوا کر ہم اپنے پاپ دھو دیتے ہیں؟ نہیں ہرگز نہیں۔ ہم اپنے آپ کو، سماج کو، بلکہ بھگوان کو بھی دھوکا دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ (تھوڑا رک کر) اچھا چھوڑو ان باتوں کو۔ چلو اب پارٹی شروع کی جائے۔

(سارے لوگ بیٹھے ہیں۔ کھانے پینے کا دور چلتا ہے۔ بھی بجایا جاتا ہے گروہ سماں [illegible] ہے۔)

بش: تم پینا بھی نہیں چھوڑ سکتے؟

: نہیں یار میں کھانے میں ساتھ دوں گا۔

: اچھا تمہیں ان سے ملاؤں۔ یہ ہیں پرکاش جی۔ بے حد اچھی آواز ہے۔ غزل تو ایسی گاتے ہیں کہ محفل پر چھا جاتے ہیں۔ ہاں تو پرکاش جی! ہو جائے پھر کوئی پیاری سی غزل۔ بلائیے پھر اپنے ساتھیوں کو۔

: ہاں ہاں! ہو جائے اس خوشی کے موقع پر اچھی سی غزل۔

ش جی: کیوں نہیں؟ (پرکاش جی اور اس کے ساتھی غزل شروع کرتے ہیں۔ واہ واہ ہوتی رہتی ہے)

پانچواں منظر

وقت: اسی دن رات کا منظر

[صدیقی اپنے گھر میں اکیلا صوفے پر بیٹھتا ہے۔ نشاط اندر آتی ہے۔]

اط: کیا احمد بھائی نے روپے دیئے؟

صدیقی: نہیں بھائی! میں جھک ہی نہیں سکا۔

نشاط: لیکن کیوں؟

صدیقی: وہاں کچھ اور لوگ بھی تھے۔ مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ ان کے آگے ہاتھ پھیلاتا۔

نشاط: پھر کام کیسے چلے گا؟ مکان کا کرایہ دینا ہے اور پھر گڈو کو ڈاکٹر کے پاس بھی لے جانا ہے۔ اس کی حالت دن بدن بگڑتی جا رہی ہے۔ اور میرے پاس بالکل پیسے نہیں ہیں۔

صدیقی: ہوں! بات تو ٹھیک ہے۔ مگر! مگر میں کیا کروں؟

نشاط: (تیز ہو کر) میں کیا کروں؟ آپ نہیں کریں گے تو کیا میں کروں گی؟ ہوں! بہتر ہوتا ہے آپ پر۔ پڑوس میں شرما جی ہیں۔ ان کی تنخواہ آپ سے آدھی ہو گی۔ مگر کیسی خوش حال زندگی ہے۔ اور ایک ہم ہیں۔ نہ فریج نہ ٹی وی، نہ کار! یہاں تک کہ بچے کے علاج کے لئے بھی پیسے نہیں ہیں۔ کہنے کو آپ انجینئر ہیں گزیٹیڈ آفیسر ہیں۔

صدیقی: تم ٹھیک کہہ رہی ہو! مگر......

نشاط: مگر وگر کچھ نہیں۔ آپ کو کچھ کرنا ہوگا۔ میں انسان ہو کر میں سب کچھ برداشت کر سکتی ہوں مگر اپنے بچے کو گھٹ گھٹ کر مرتا نہیں دیکھ سکتی۔ اسے علاج کے لئے دہلی لے جانا ہوگا۔ آپ میرے زیور بیچ دیجئے۔

صدیقی: کتنے زیور ہیں تمہارے پاس؟ وہ تو پہلے ہی بک چکے ہیں۔ ایک جوڑا کنگن بچا ہے، جو میں نے تمہیں شادی میں دیا تھا۔ انہیں میں نہیں بیچ سکتا۔ ہرگز نہیں۔

نشاط: تو پھر میرا گلا گھونٹ دیجئے۔ میں اس جہنم میں کب تک جی سکتی ہوں گی۔

صدیقی: (زور سے) تم کیا کہہ رہی ہو نشاط! تم اس زندگی کو جہنم کہہ رہی ہو؟ کیا واقعی تم اس قدر اکتا گئی ہو مجھ سے؟ (نشاط کی ہچکیوں کو سن کر پیار کی آواز میں بولتا ہے) دیکھو! چپ ہو جاؤ۔ رونے سے کیا فائدہ؟ تم نے تو میرا ساتھ کا [illegible]

کی قسم کھائی تھی نشاط! میرا سارا اثاثہ چھا تو
بڑا اٹھی؟ میں نے اس کانٹے دار راستے کو اس
لئے چنا تھا کہ اگر کہیں میرے پاؤں تھکے تو تمہارے
پیار کی گھنی چھاؤں میں آرام کروں گا۔ تم تو
میرا سہارا ہو نشاط! بیچ راستے میں ساتھ
چھوڑنے کی بات کرتی ہو۔

نشاط: (روتے ہوئے) مگر میں کیا کروں؟ میں ماں ہوں۔

صدیقی: ٹھیک ہے۔ مگر میرا بھی تو خیال کرو۔ میں بھی تو تمہاری
باہوں کا سہارا [illegible] ہوں۔ ایک بات سنو نشاط! یہ
تمام عیش کے سامان، کار، فرنیچر، ٹی وی۔ یہ
دولت، یہ سب ظاہری باتیں ہیں۔ ان تمام چیزوں
کو پا کر بھی انسان خوشی سے کوسوں دور
رہ سکتا ہے۔ میں نے اپنے لئے جو راستہ چنا ہے اس
میں یہ سب کچھ نہیں ہے مگر سکون ہے، چین ہے،
جو دوسروں کو میسر نہیں۔ رہا گڈو کی بیماری، گھبرانے
کی کوئی بات نہیں۔ سب ٹھیک ہو جائیگا۔ خدا
ہمیں آزمائش میں ڈال رہا ہے نشاط۔ گھبرا جانے
دو، یہ۔ وہ لوگ نہیں تھے کہ صدیقی کا آدرش
بھی ڈھونگ تھا۔ صدیقی اور احمد میں فرق ہونا چاہئے۔

نشاط: لیکن صدیقی مر جائے گا۔ واقعی ابھی کہیں
زندہ رہ سکتی ہے! لوگوں کو معلوم ہے کہ گڈو
بیمار ہے اس [illegible] کی سے پہلا کی کی ہے۔ ابھی
پچھلے ہفتے بہت خوشی سے [illegible] پاس پرسوں
پچیس ہزار روپے لیکر آیا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ روپے
لے لوں اور اس کی انکوائری میں جان چاہی رپورٹ
دے دوں۔ اسے سیمنٹ جو بہت بڑا کر کے پل
بنانا ہے اسے پاس کر دوں۔ اور پھر کبھی وہ پل
گر جاتا تو اور دبا جاتے کتنے لوگ بیچارے ملبے میں دب کر
مر جاتے۔ کتنے گھر برباد ہو جاتے۔ کتنے یتیم ہو جاتے۔
(آواز بھرا جاتی ہے) نہیں، نہیں! ہرگز نہیں! میں
ایک گڈو کو بچانے کے لئے سینکڑوں گڈوؤں کو نہیں مار
سکتا۔ میں اپنا ضمیر نہیں بیچ سکتا نشاط۔ میں اپنا
ضمیر نہیں بیچ سکتا۔ گڈو کی موت آتی ہے تو
.... (آواز بھرا جاتی ہے)

نشاط: آپ گڈو کی حالت دیکھ رہے ہیں۔ وہ بار
بار پوچھ رہی ہے۔

صدیقی: ہاں! میرا گڈو، میرا ننھا دھیرے دھیرے
موت کی طرف بڑھ رہا ہے اور میں اس کا علاج بھی نہ
کرا سکتا (نشاط چلی جاتی ہے) نشاط
ٹھیک کہتی ہے۔ مجھے کچھ انتظام کرنا ہی ہوگا۔ مگر کیسے
اب تو جی۔ پی۔ ایف سے قرض بھی نہیں مل سکتا۔
کیا زمانہ تھا! ابا جان کیسی سالگرہ پر
روپے خرچ کئے گئے تھے۔ دعوتیں، قوالی کیا کچھ
تھا؟ خان بہادر صاحب کے اکلوتے بیٹے کی سالگرہ
جو تھی...... کیسی شان تھی......

(فلیش بیک شروع ہوتا ہے)

[خان بہادر کے گھر میں شہنائی اور ہنگامے کی
آوازیں ہیں۔ سالگرہ کا جشن ہے]

مرزا: مبارک ہو! مبارک ہو! خان بہادر! واہ بھئی
کیا محفل سجائی ہے۔

خان بہادر: شکریہ! مرزا صاحب۔ شکریہ!

مرزا: اُگ رہا ہے در و دیوار پہ سبزہ غالبؔ
ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے
[ہاتھ پکڑ کر ہنستے ہوئے]
حضور آپ نے تو چھوٹے میاں کی سالگرہ پر ایسی محفل
سجائی ہے کہ لوگوں نے کبھی شادی میں بھی ایسی
دھوم نہیں دیکھی ہوگی۔

خان: (ہنستے ہوئے) مرزا صاحب! کیوں شرمندہ کرتے ہیں۔
سب اللہ کا کرم ہے۔ ایک ہی تو بیٹا ہے اس۔
جو کچھ ہے اسی کا تو ہے۔

مرزا: کیوں نہیں! کیوں نہیں؟ اس بہانے ہم جیسے غریبوں
کا بھی بھلا ہو جائے گا۔ کم از کم بیچارے دو آنکھ
سیک کر کھانا تو لے گا۔

خان: ارے میاں روزی کا ضامن تو اللہ ہے۔ میں کون

ہوتا ہوں ، نہیں کھانے والا ؟

مرزا : ماشاء اللہ کس قدر بلند خیال ہیں آپ کے۔

خان : ارے مرزا کیا یہ روز روز کی بات ہے۔ سال کی تقریب میں اتنا کرنے سے بھی گیا۔

مرزا : میاں آپ کو تو بہانہ چاہیے۔ اللہ نے دولت کے ساتھ دل بھی دیا ہے اسی بندوں پر یوں ہی خرچ کرتے ہیں۔ سبحان اللہ!

خان : میں تو فدیہ ہوں مرزا۔ بس! چلو آؤ۔

مرزا : سنا ہے قوال وغیرہ وغیرہ ......

خان : ہاں ہاں! تم جو آنے والے تھے۔ تمہارا خیال رکھنا

مرزا : ہاں! یہ ہوئی نا بات۔ تب تو آج محفل جمے گی ؎

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

خان : اچھا! ذرا بیٹھیے! میں حویلی سے آتا ہوں۔ بلاوا آیا ہے۔

مرزا : ضرور جائیے بندہ پرور۔ بیگم صاحبہ کی آنکھیں ترس رہی ہوں گی۔

خان : ارے مرزا! کیوں بڑھاپے کا مذاق اڑاتے ہو!

مرزا : توبہ۔ توبہ! بڈھے ہوں آپ کے دشمن حضور۔ اس بڑھاپے پر تو جانے کتنی جوانیاں نچھاور کی جا سکتی ہیں۔

خان : اچھا مرزا صاحب بیٹھو میں ابھی آتا ہوں۔ (چلا جاتا ہے)

مرزا : (خان کو مخاطب کر کے) حضور بیگم صاحبہ کو اس خاکسار کی طرف سے مبارکباد کہہ دیجئے گا۔ اور کہہ دیجئے گا کہ یہ نمک خوار بھی ان کے کرم کا امیدوار ہے (آہستہ سے) واہ۔ بھئی واہ! رئیس ہو تو ایسا۔ سخی ہو تو ایسا۔ کیا شان دار انتظام کیا ہے اللہ یتیم خانے کے بچوں اور غریبوں کو بھی دعوت دے دی۔ اس انتظام کے آگے تو دعوت شیراز بھی پھیکی ہے۔ (چھوٹے میاں کو آتے دیکھ کر پکارتے ہیں) ارے چھوٹے میاں! چھوٹے میاں! ذرا سنئے تو۔

چھوٹے میاں : چچا جان! تسلیم!!

مرزا : ادھر تو آئیے میاں! آج تو خوب سج رہے ہیں۔ چشم بد دور! بالکل دولہا لگ رہے ہیں۔

چھوٹے میاں : میں ابھی آتا ہوں۔ امی بلا رہی ہیں۔

مرزا : امی جان کو میرا آداب کہئے گا۔ اور کہئے گا کہ مجھے بھی پان بھجوا دیں۔ شہزادہ ہے! شہزادہ!

[اس بیچ خان بہادر دوسرے مہمانوں میں مصروف رہتے ہیں اور زنان خانے پر بیگم کو دیکھ کر کہتے ہیں]

خان : بیگم! آپ نے مجھے بلایا تھا؟

بیگم : بندہ پرور! آپ کی راہ دیکھتے دیکھتے تو آنکھیں پتھرا گئیں۔

خان : خدا خیر کرے! آج میری خیر نہیں۔ بہت اچھی لگ رہی ہیں آپ۔

بیگم : (شرما کر مسکراتی) ہٹئے بھی! یہ کون سا موقع ہے؟ گھر میں مہمان بھرے ہیں اور آپ کو مذاق سوجھ رہا ہے۔

خان : حقیقت کو مذاق کہہ رہی ہیں آپ؟

بیگم : اچھا! میں نے آپ کو اس لئے بلایا تھا کہ سالگرہ کی رسم شروع کرا دیجئے۔ پھر قوالی بھی ہوتی ہے۔ اتنے لوگوں کو کھانا کھلانا ہے۔ دیر ہو جائے گی۔ مولانا تشریف لائے یا نہیں؟

خان : مولانا تو بہت پہلے ہی آ گئے۔ وہ تو اپنا کام بھی ختم کر چکے ہیں۔ اب تو قوالی شروع ہونے جا رہی ہے۔

بیگم : (چھوٹے میاں کو آتے دیکھ کر پکارتی ہیں) چھوٹے میاں، چھوٹے میاں! ادھر آؤ۔

چھوٹے میاں : امی جان!

بیگم : ادھر اُدھر مت جانا بچے۔ میرا دل دھڑکتا ہے۔ آؤ تمہیں کالا ٹیکہ لگا دوں۔ کسی کی نظر نہ لگ جائے تمہیں۔

خان : (ہنستے ہوئے) ہاں تمہارا بیٹا ہے بھی اتنا خوبصورت۔ کیوں؟

بیگم : اور نہیں تو کیا؟ شہزادہ ہے! شہزادہ۔

خان : (چھوٹے میاں سے) چلو اب قوالی شروع کی جائے۔ (قوالی شروع ہوتی ہے۔ قوالی کے ختم ہونے کے ساتھ محفل بھی ختم ہوتی ہے)

(درمیان میں صدا کی آواز ابھرتی ہے)

شہزادہ! چھوٹے میاں! صدیقی اور شہزادہ! آج اگر زندہ ہوتیں تو دیکھتیں کہ ان کا شہزادہ اپنے شہزادے کے لئے دوا بھی نہیں خرید سکتا۔ جس کی سالگرہ پر دس ہزار روپے خرچ کئے گئے تھے، وہ ....

(صدیقی کی آواز قوالی کے شور میں دب جاتی ہے)

صدیقی: (زور سے بول اٹھتا ہے) بند کرو یہ قوالی۔ بند کرو۔

نشاط: (آتے ہوئے گھبرائی ہوئی آواز میں بولتی ہے) ارے کیا ہو گیا آپ کو؟ کس پر چلا رہے ہیں؟

صدیقی: (چونکتے ہوئے) ایں! ہاں! اوہ! کچھ بھی نہیں۔ بس! ذرا کچھ سوچ رہا تھا۔

نشاط: طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟ اور آپ کچھ گھبرائے گھبرائے سے ہیں۔

صدیقی: نہیں نہیں! وہی گڈو کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اسے دلی لے جانا ہے جب تک ایک کے لئے روپے ہوں۔

نشاط: وہ تو ٹھیک ہے مگر آئیے کھانا کھا لیجئے۔

صدیقی: بھوک نہیں ہے۔ مگر چلو۔

(دونوں چلے جاتے ہیں)

چھٹا منظر

وقت: دوسرے دن شام کا وقت

[صدیقی اپنے گھر میں آتا ہے۔ نشاط بے چینی سے اس کا انتظار کر رہی ہے]

نشاط: آ گئے آپ! روپوں کا انتظام ہو گیا؟ آج گڈو کی طبیعت بہت خراب ہے۔

صدیقی: (گھبرا کر) کیا ہوا گڈو کو؟

نشاط: (بھرائی ہوئی آواز میں) ہونا کیا ہے! دن بدن صحت گرتی جا رہی ہے اس کی۔ آج تو کچھ کھایا بھی نہیں۔ ڈاکٹر صاحب کہہ رہے تھے کہ تم لوگ جان بوجھ کر دیر کر رہے ہو۔ اسے فوراً دلی لے جانا چاہئے۔ ورنہ اگر یہ کینسر تھا اور بڑھ گیا تو جان کے لالے پڑ جائیں گے۔

صدیقی: (تھکی تھکی آواز میں) ہاں لے جانے کے ہی ہیں۔ (گہری سانس لیتا ہے)

نشاط: روپوں کا انتظام ہوا؟

صدیقی: (بہت ہی مدھم آواز میں) ہاں، ہو گیا۔

نشاط: (خوش ہو کر) شکر ہے خدا کا۔ تو ہم کو دلی چلیں۔ کیا کہہ رہے تھے احمد بھائی؟ کیا ہے کہ انھوں نے وقت پر مدد کر دی۔ اب جائیگا۔ (جذباتی آواز میں بولتی ہے) میرا ٹھیک ہو جائیگا۔

صدیقی: احمد نے روپے نہیں دیئے۔

نشاط: (چونک کر) کیوں؟

صدیقی: (گہری سانس لیتے ہوئے) کہہ رہے تھے کہ سارے روپے نئے مکان کے ڈیکوریشن پر لگا دیئے۔ اس لئے ان کا ہاتھ خالی ہے۔

نشاط: لیکن ابھی تو آپ نے کہا کہ روپے کا انتظام

صدیقی: (آہستہ سے) ہوں!

نشاط: انتظام ہو گیا؟ احمد بھائی نے نہیں دیئے تو کہاں سے آئے؟ کس نے دیئے؟

(صدیقی چپ رہتا ہے۔ صرف گہری سانس لیتا ہے)

نشاط: آپ چپ کیوں ہیں؟ بولتے کیوں نہیں؟ روپے کس نے دیئے آپ کو؟

صدیقی: (گہری سانس کھینچتے ہوئے، بھرائی آواز میں) ٹھیکیدار نے۔

نشاط: (چیخ کر) کیا کہا؟ (تیز موسیقی کی آواز) کیا کہا؟ ٹھیکیدار نے روپے دیئے؟ وہی محمد حسین جس نے سیمنٹ کے بجائے ریت سے پل بنایا ہے اور جس کی جانچ کر رہے ہیں! (جذباتی آواز میں) آپ نے اس کے روپے قبول کر لئے! (بھرائے ہوئے روپے لئے، جھکی آواز میں) آپ نے رشوت لے لی! یہ کیا کیا ..... آپ نے ......؟

صدیقی: (جذباتی آواز میں) تو کیا گڈو کو گھٹ گھٹ کر مرنے دیتا! (روہانسی آواز میں)

انتخاب کلام

○

بھاگتے لمحوں کو منائیں ہم لوگ
آؤ سورج کو ہتھیلی پہ جمائیں ہم لوگ

یادِ رفتہ کے در و بام کو چپکے چپکے
چند سوکھے ہوئے پھولوں سے سجائیں ہم لوگ

بے سپر تند ہواؤں سے لڑیں گے کب تک
ریت کا چھوٹا سا اک گھر ہی بنا لیں ہم لوگ

جانتے ہیں کہ اندھیرا نہیں مٹنے والا
پھر بھی اک شمع سرِ راہ جلا لیں ہم لوگ

کون جانے وہ ستم کیش ملے یا نہ ملے
شہر ہی خود ہی کوئی زخم لگا لیں ہم لوگ

○

ہاتھ کے بدلے اگر سر کو کٹایا ہوتا
کوئی الزام مرے سر تو نہ آیا ہوتا

ریت کا گھر تھا اگر آج بچا بھی لیتے
کل اسے کالی ہواؤں نے گرایا ہوتا

راستے سو گئے سب راستہ تکتے تکتے
قریۂ جاں کی طرف کوئی تو آیا ہوتا

آرزوؤں کی تو لے لی گئی قیمت مجھ سے
حسرتوں کا بھی تو کچھ دام لگایا ہوتا

میرا افسانہ ہی پانی پہ لکھا تھا ورنہ
جانے کس کس کو ہواؤں نے سنایا ہوتا

تتلیاں چھوڑ گئی تھیں جو مری انگلی پر
ان ہی رنگوں سے کوئی خواب سجایا ہوتا

○

نگار خانے میں بے چہرگی کا میلہ تھا
میں زرق برق مناظر میں بھی اکیلا تھا

تمام رات ستاروں نے سازشیں کی تھیں
قریبِ صبح بھی چاند پیلا پیلا تھا

زمیں کو چھوڑ کے ہم بھاگ کر کہاں جاتے
سمندروں کی طرح آسماں بھی نیلا تھا

جلوس نعرے لگاتے ہوئے گزرتے رہے
فراز دار پہ لیکن وہی اکیلا تھا

بھٹک رہا تھا لئے کاسۂ گدائی کو
میں خواہشات کے جنگل میں آبلہ پا تھا

ہم اپنے قتل کا الزام کس کے سر دیتے
زمانے بھر کی نگاہوں میں مسیحا تھا

○

تم ہی شکیب کہتے ہو یہ لہو لہو منظر
سب گلے کی شوخی ہے بے قصور تھا خنجر

جانے چاہتی کیا ہیں یہ سپاہی سی موجیں
خود ہی لوٹ جاتی ہیں پتھروں سے ٹکرا کر

قتل و خون کی بارش کو ہم تو کاٹ ہی لیں گے
تم سنبھال کر رکھنا اپنا کاغذی پیکر

○

○

تمہارا حق تھا جہاں چاہے وار کر لیتے
ترے ہی [illegible] کی جھیلیں [illegible]
[illegible]
ہزار بار کٹا دیتے سر [illegible]

ہمارے زخموں کا بیکس شمار کر لیتے
تم ان کے مرنے کا تو انتظار کر لیتے
مرے لہو سے اُسے آب دار کر لیتے
تم ایک بار اگر اعتبار کر لیتے

گزر گئے وہ سبھی لوگ معصوم کے سینہ [illegible]
جو جیتے تو سمت حصار کر لیتے

○

ہماری ڈوبتی سانسوں نے کہہ دیا تھا کہ بس
وگرنہ ٹوٹ ہی جاتا یہ پسلیوں کا قفس

ہر ایک موڑ پہ تھی گمرہی شریکِ سفر
میں کوہ و دشت میں پیتا رہا سرابِ جرس

عجیب موڑ پہ آکر ٹھہر گئی ہے حیات
نہ کوئی سمت نہ جادہ نہ کوئی پیش نہ پس

مسیحِ وقت ہی مصلوب ہے جہاں یارو
کسے ہے فرصتِ چارہ گری کہ کھائے ترس

یہ شہر ہی ہے کہ مشہد ہے آرزوؤں کا
کبھی تو اے نگہِ لطفِ یار کھل کے برس

○

وہ ایک شخص جو کچھ مجھ سے بولتا بھی نہیں
مرے ہی جسم میں ہے مجھ کو جانتا بھی نہیں

وہ پڑھتا رہتا ہے مجھ کو کتاب کی صورت
خود اپنے چہرے پہ میں نے تو کچھ لکھا بھی نہیں

کچھ اس طرح سے نچوڑا حیات نے مجھ کو
مری زباں پہ مرے خوں کا ذائقہ بھی نہیں

ہم اک جزیرۂ بے نام کی طرح چپ ہیں
کوئی ہمارے لبوں کو بھگوتا بھی نہیں

ہر ایک سانس ہے خنجر بکف سی سینے میں
یہ پسلیوں کا قفس آج ٹوٹتا بھی نہیں

ہر ایک ہاتھ میں پتھر تھا میں نشانہ تھا
گناہ گار وہاں اور کوئی تھا بھی نہیں

تمام جسم ہے شیشے کا شہر ہی اپنا
وہ بے نیاز اِدھر سنگ پھینکتا بھی نہیں

○

خوشی کے واسطے یوں تو ہر آدمی ترسے
کچھ ایسے غم بھی ہیں جن کے لئے خوشی ترسے
رہینِ جادہ و منزل نہیں ہمارا سفر
ہمارے نقشِ کفِ پا کو رہبری ترسے

ہنسی کی چاہ میں ترسا کئے ہیں لب کتنے
کچھ ایسے لب بھی ہیں جن کے لئے ہنسی ترسے
حدودِ عرش سے بچ کر نکل گئے آگے
وہ تیز گام کہ جن کو سبک [illegible]

جبیں کی زد میں تو کعبہ بھی ہے کلیسا بھی
شعورِ سجدہ کو لیکن یہ بندگی ترسے
گلی گلی لئے پھرتے ہیں سر ہتھیلی پر
ستم ہے خوب کہ قاتل کو مشہدی ترسے

○

○

پی کے سورج کی ہر شام جو گھر جاؤں گا
اوڑھ کے دھند کی چادر میں بکھر جاؤں گا

وہ بچھائیں گے اگر راہ میں کانٹوں کی بساط
ننگے پاؤں کی خوابیدہ نظر جاؤں گا

اس بلندی پہ بھی احساس کی پستی نہ گئی
میں پہاڑوں سے سمندر میں اتر جاؤں گا

تھک گیا ہوں رخِ امواج پہ بہتے بہتے
اب کے سوچا ہے تہِ آب اتر جاؤں گا

شہرِ طوفاں میں بھی دست نہ کھینچے کوئی
میں ہتھیلی پہ لئے آتش کا گھر جاؤں گا

تیرگی آگئی ہے سرِ تمم نظر سے یارو!
میں اندھیرے لئے آنکھوں میں کدھر جاؤں گا

تم سے سیکھوں گا ہر اک وعدۂ فردا کا مآل
میں تمہاری ہی طرح صاف مکر جاؤں گا

کاسۂ وقت نے مانگی ہے مرے ضبط سے بھیک
میں جو زندہ ہوں تو یہ کام بھی کر جاؤں گا

○

○

جسم کے زخم ہی سب دیکھے ہیں، روح کے گھاؤ دکھائے کون!
سب مصلوب کے نوحہ خواں ہیں، دردِ صلیب اٹھائے کون؟
آنکھ میں تتلی ناچ رہی ہے، ہاتھ نہ آئے رنگیں سپنا
بھاگ رہا آہوئے طلائی، مشک کی خوشبو پائے کون
برگد پر بیٹھی خاموشی، شطرنجی سایوں پر خنداں!
سناٹا سب پی جائے گا، پاگل کو سمجھائے کون؟
گل مہروں پر آگ لگی ہے، جلتا ہے رعنائی کا ایندھن
دشتِ وفا کے اس شعلے کی بھڑکی پیاس بجھائے کون
ماضی کی گہری کھائی میں اس کو جب آواز لگائی
چکنا چور ہوئیں آوازیں، پھر آواز لگائے کون!
اس سے سب نفرت کرتے ہیں، شاید خائف بھی رہتے ہیں
آئینہ تو آئینہ ہے، جھوٹ اسے سکھلائے کون؟

○

ابابیل

وہ ہیبت ناک پیکر دیو قامت
زمیں کو روندتے، چنگھاڑتے طوفاں کی صورت
بڑھے آتے تھے کعبہ کو گرانے
وہ اچانک آسماں کی وسعتوں سے
ابابیلوں کا اک طوفان اٹھا
ہوئی تھی پتھروں کی ایسی بارش
کہ دیو پیکر سیہ ہاتھی کے لشکر
ہوئے مانند بھس کھائے زمیں بوس
خوشا وہ طائرانِ سبز پوشاک
جو کعبہ کے تقدس کے امیں تھے
وہ ہیبت ناک پیکر دیو قامت
بڑھے آتے ہیں پھر کعبے کی جانب
کہ دیو پیکر سیہ کاروں کے لشکر
ہزاروں کعبۂ دل ڈھا رہے ہیں
زمیں پھر سنگ باری چاہتی ہے
مگر اب آسماں کی وسعتوں سے
پرندہ کوئی بھی آتا نہیں ہے
ابابیلوں کا رستہ تکتے تکتے
نگاہِ وقت بھی پتھرا گئی ہے۔

برگد

سلگتی دھوپ میں برگد کا یہ عظیم شجر
مسافروں کی تھکن چن رہا ہے برسوں سے
شفیق ماں کی طرح اپنے سبز آنچل میں
تھپک کے ان کو سلاتا رہا ہے برسوں سے
پرانا سیکڑوں برسوں کا یہ شجر
سلونی چھاؤں میں بیٹھا میں سوچتا ہوں
زمیں کا چیر کے سینہ لرزتے ہاتھوں سے
زمیں کی کوکھ کو جس نے دیا تھا سبز لہو
وہ جس نے بیج لگایا تھا نہ جانے کہاں ہو گا
بطورِ نذرِ عقیدت میں اس کی خدمت میں
لے چلوں گا کسی سنگِ مزار کی جانب
زمیں کا چیر کے سینہ لرزتے ہاتھوں سے
زمیں کی کوکھ کو دیدوں گا میں بھی سبز لہو
کہ صدیوں بعد کبھی اس کی ٹھنڈی چھاؤں
کوئی مسافر خستہ کبھی تو بیٹھے گا
تو شاید اس کو میرا بھی خیال آ جائے۔

انتظار

ہر ایک موڑ پہ تاریکیاں ہیں خیمہ زن
اداسیوں کی طنابیں تنی ہیں ہر جانب
گلی میں کوچوں میں، بازار میں مکانوں میں
تمام خوف نے پہرے بٹھائے رکھے ہیں
عناد، بغض، کدورت، فساد، خوں ریزی
ستمگروں نے دکانیں سجا کے رکھی ہیں
اب اپنے سائے سے ڈرنے کا وقت آیا ہے
ہر ایک سر کسی قاتل کی زد میں ہے یارو
رگوں سے پھوٹ کے، پھر شاہ راہ سے بہہ کر
فصیلِ شہر اب سیلِ خون آ پہنچا
نہ روک پائے گی سیلِ بلا کو خستہ فصیل
کوئی مسیحا نفس کاش اب بھی آ جاتا
ہمارے کالے گناہوں کا بوجھ اٹھائے ہوئے
فرازِ دار پہ ہنستے ہوئے چلا جاتا
صلیبِ وقت لہو چاہتی ہے پھر اس کا
ہمارے شہر میں لیکن اب ایسا کوئی نہیں
جو بے گناہ ہو، معصوم ہو، مسیحا ہو
صلیبِ وقت کی پیاس کو بجھائے کون!
فصیلِ شہر تک اب سیلِ خون آ پہنچا
نہ روک پائے گی سیلِ بلا کو خستہ فصیل
فصیلِ شہر کی اونچائی کچھ سوا نیزہ
اب آفتاب قریبِ فصیل آئے گا
نہ جانے آفتاب کا ہی انتظار ہے سب کو

ہوائیں اندھی ہیں

ہر ایک سمت چمن میں سفید تختی پہ
جلی حروف میں لکھی ہے یہ ہدایتِ خاص
کہ اس چمن میں کوئی پھول توڑنا ہے منع
ہر ایک پھول ہے نازاں، گلاب ہنستے ہیں
کہ دستِ گلچیں سے اب ان کو مل گئی ہے اماں
مگر یہ بات ذرا سی انہیں نہیں معلوم
جلی حروف میں لکھی تو ہے ہدایتِ خاص
کہ اس چمن میں کوئی پھول توڑنا ہے منع
پڑھیں گی کیسے مگر یہ ہدایتِ دستور
ہوائیں اندھی ہیں پڑھنا تو جانتی ہی نہیں

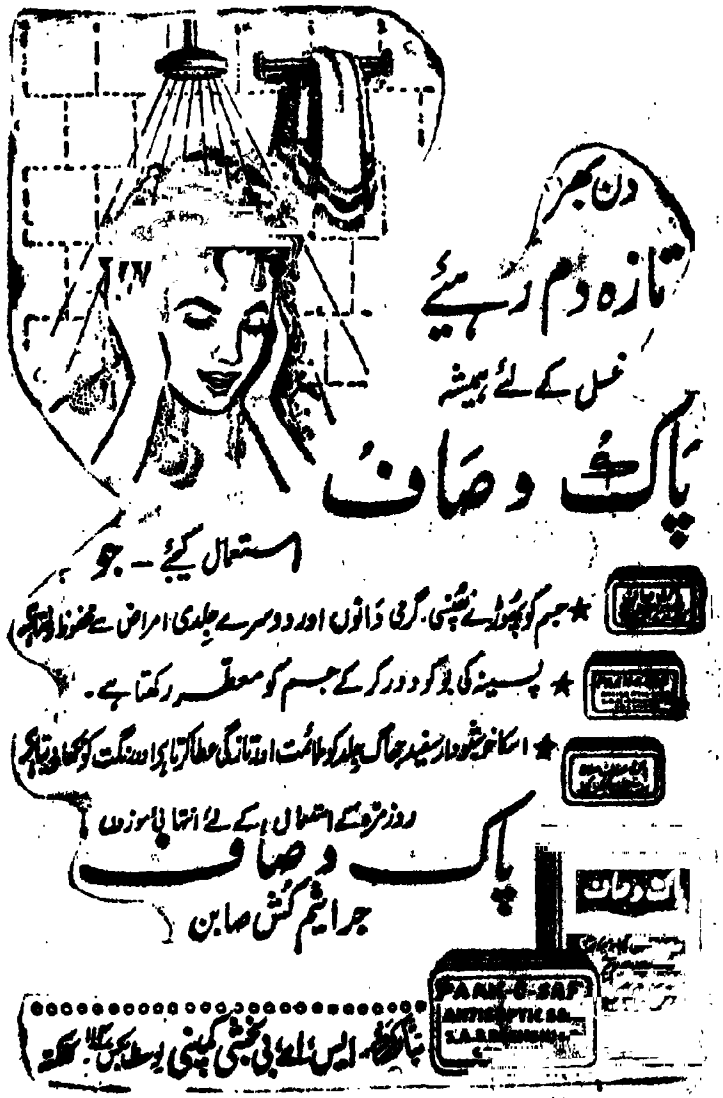
دعائے عرفات

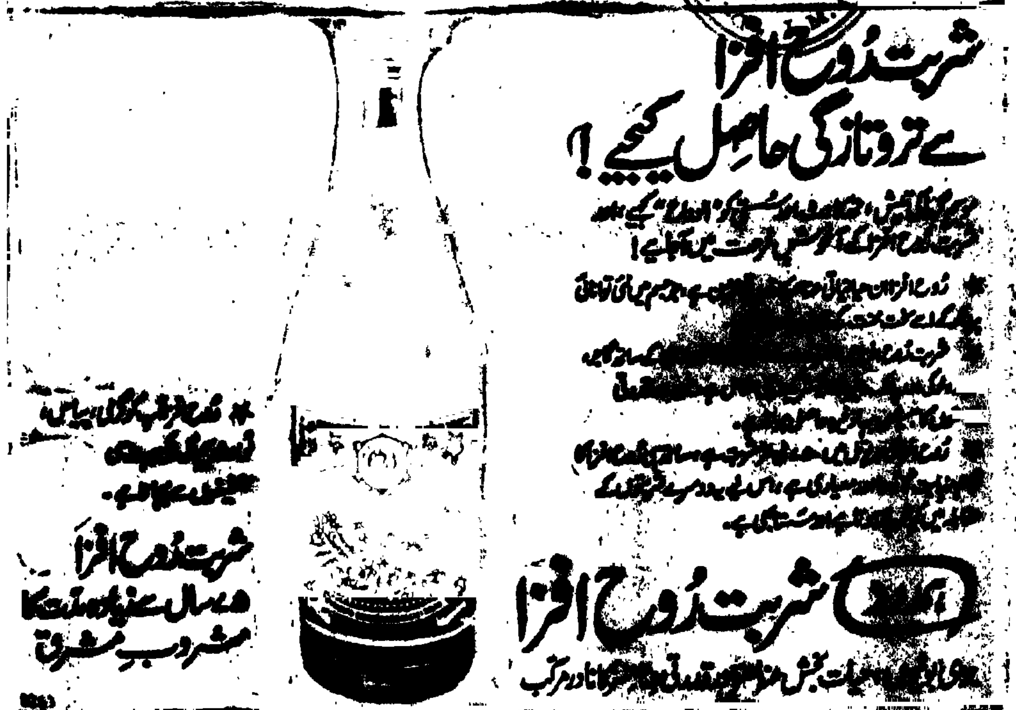
تیرگیاں جب بے بس ہو جائیں
نطق جب خوشی کا لبادہ اوڑھ لے
صدائیں بے رنگ اور بینائی بے قدر ہو جائے
پیچھے جب چالیس قدم ختم ہو جائیں
اور زیرِ زمیں زندگی کا انبار
جب پیر کا ہڈیوں کے نمک کا ذائقہ محسوس کرے
تب میں دو انگلیوں کی زد میں ہوں گا
ایک مردہ بے بس کیڑے کی طرح
اور تب تم مجھے اپنے ہاتھوں میں سنبھال لینا
کہ تمہارے اس جہانِ رنگ و بو میں
میں ایک اجنبی بن کر رہا ہوں

زیرو آور

(ZERO HOUR)

اینٹ کی دیواروں میں محبوس کمرے کا سکوت
دودھیا مصنوعی اجالے میں تنہا —
تین سو پینسٹھ دنوں کا کرب ایک نقطے!
منجمد سا ہو گیا ہے —
وقت اور ہندسوں کے سب مفہوم گم ہو گئے
وقت کی سولی پہ لٹکے سال کو میں دیکھتا
سوچتا ہوں — اور پھر
سالِ نو کی آہٹوں میں ڈوب کر میں سوچتا
سالِ نو میں اختلاطِ خوش تو ہونا چاہیے تھا
بند ہیں سارے دفاتر شہر کے
دوست سب گھر جا چکے ہیں
میں کبھی جاتا تھا گھر — لیکن وہ گھر
اینٹ کی دیوار، چھت، محراب و طاق
بند دروازے، مقفل کھڑکیاں
مقفل شہر تھا، مرقدِ کرب سکوت
آسمانوں کی حسین تر خواب گاہ
کیا انہیں کا گھر نام ہے؟
گھر میں اور قبر میں کچھ تو فرق ہونا چاہیے
میں کہاں جاؤں کہ میرا گھر نہیں ہے۔


دن بھر
تازہ دم رہیئے
غسل کے لئے ہمیشہ
پاک و صاف
استعمال کیجئے ۔ جو
★ جسم کو پھوڑے پھنسی، گرمی دانوں اور دوسرے جلدی امراض سے محفوظ
★ پسینہ کی بو کو دور کر کے جسم کو معطر رکھتا ہے۔
★ اسکا خوشبودار سفید جھاگ جلد کو ملائمت اور تازگی عطا کرتا ہے اور رنگت کو نکھار دیتا ہے
روزمرہ کے استعمال کے لئے انتہائی موزوں
پاک و صاف
جراثیم کش صابن
ایس اے بی بخشی کمپنی


شربت روح افزا
سے تروتازگی حاصل کیجیے!
شربت روح افزا
شربت روح افزا
مشروبِ مشرق


دلپسند ○ سُبک ○ تیز رفتار ○ ملائم ○ پائیدار
Baba
cushion
AND
Air India
cushion
کیولا ربر انڈسٹریز
مسجد باری لین۔ کلکتہ ۷۰۰۰۳۹

ماہنامہ سہیل کے چار گرانقدر خصوصی پیشکش

علامہ جمیل مظہری نمبر

صفحات : ۳۰۰

قیمت : -/۲۵ روپے

ایک شمارہ

کلیم الدین احمد کے نام

صفحات : ۸۲

قیمت : -/۵ روپے

ایک شمارہ

علیم اللہ حالی کے نام

صفحات : ۸۰

قیمت : -/۳ روپے

ایک شمارہ

منور رانا کے نام

صفحات : ۱۴۴

قیمت : -/۱۰ روپے

کاپیاں کم تعداد میں بچ رہی ہیں۔

دفتر ماہنامہ سہیل۔ ریور سائیڈ روڈ۔ گیا سے حاصل کیجیے!

* * *



دانتوں کی
حفاظت
اور تازگی کے لئے
استعمال کیجئے
لاکھوں
کا
پسند



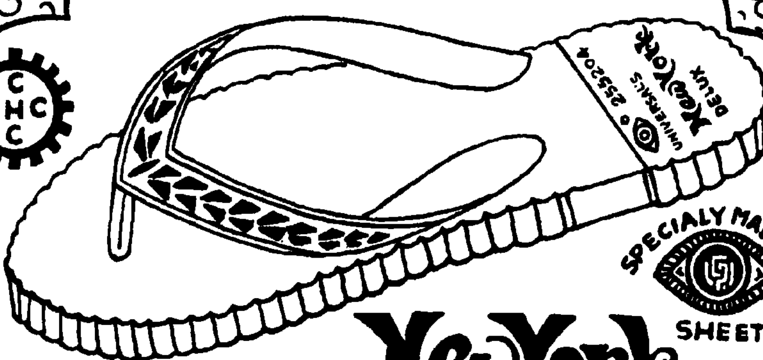


دیکھنے میں خوبصورت، چلنے میں آرام دہ، اور پہننے میں مضبوط

ایسی خاص خوبیاں ہیں جو آپ کے بجٹ کو غیر محفوظ ہونے سے بچاتی ہیں

REGD. No. 255204

C
CHC
C



SPECIALY MADE FROM
SHEETS

New York

AND ALSO

GET THE LATEST FULLY FASHIONED

X 3 X Cushion	**Evaflex** EXTRA THICKNESS Cushion

CALCUTTA HAWAI CENTR

CALCUTTA-700039.

ıgd. No. 3520/57   P & T Regd. No. GA.

47 YEARS OF PUBLICATION

THE SOHAIL MONTHLY

RIVER SIDE ROAD, GAYA – 823001

With best Compliments from

EMAT ENTERPRISES

BOMBAY – 400008

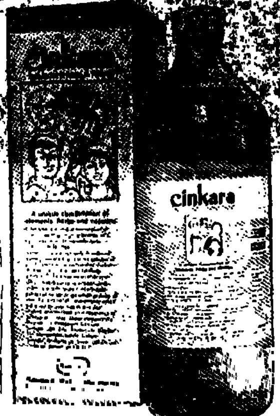
Makers of :

ATAR MAJMUA – 96

PRINTERS, LANGERTOLI, PATNA – 4

21 JAN 1986




cinkara

ترقی پسند ادب کا ترجمان

سہیل

اگست ۱۹۸۵ء

بیں: ادریس سنبھاروی ○ مجلسِ مشاورت ○ جلد نمبر: ۴۷ شمارہ نمبر: ۸

ایڈیٹر: مسعود منظر سنبھاروی ○ ڈاکٹر تارا چرن رستوگی ○ بدل اشتراک: فی شمارہ ۲ روپے

یٹر: جمیل منظر سنبھاروی ○ ڈاکٹر قمر رئیس ○ زر سالانہ: ۲۴ روپے، لائف ممبری ۲۵۱ روپے

ین: شکیل احمد جالی، عبدالقیوم ابدالی ○ اصغر علی انجینئر ○ خط و کتابت و ترسیلِ زر کا پتہ: ماہنامہ سہیل ریڈ سائیڈ

فون نمبر: ۱۵۷۳

۱۵ راگست ؟

۱۵ راگست ہندوستان کی تاریخ کا ایک اہم دن ہے۔ ۱۵ راگست ۱۹۴۷ء کو ہندوستان کے لیڈروں نے اپنے ملک کی باگ ڈور سنبھالی تھی۔ برطانوی سامراج واد کا سورج اس ملک پر ڈوب گیا تھا۔ اس دن آزاد شہری ہونے کی ہم نے خوشیاں منائیں، چراغاں کیا اور مستقبل کے سنہرے خواب کو اپنے سینے میں سجایا۔

ہم ہر سال ۱۵ راگست کو تہوار کی طرح خوشی مناتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ اپنی کمزوریوں اور کامیابیوں کا حساب کتاب بھی کرتے ہیں تاکہ ان کو مدنظر رکھ کر مستقبل کو اور خوبصورتی سے سجا سنوار سکیں ـــــ اس کی ضرورت اس لئے اور زیادہ ہے کہ جنہوں نے آزادی کا نعرہ دیا انھوں نے بھی ملک کے معاشی، سماجی و سیاسی ترقی کا نقشہ تیار نہیں کیا تھا۔ ہاں جب ملک کی آزادی کی لڑائی میں عوام نے بھی حصہ لینا شروع کیا تو انھیں زیادہ سے زیادہ گول بند کرنے کے لئے غریبوں، کسانوں، مزدوروں کو حقوق دینے کی بات کہی گئی۔ پھر بھی ملک کی خوش قسمتی تھی کہ پنڈت نہرو جیسا ترقی پسند، بین الاقوامی سیاست داں ہندوستان کی حکومت کی باگ ڈور سنبھالی اور سماج وادی ڈھانچے کا نعرہ دیا۔ اسی سمجھ کا نتیجہ تھا کہ ملک میں بڑی صنعتوں کی بنیاد رکھی گئی جو ملک کو اقتصادی طور پر خودکفیل ہونے کی جانب بڑھانے میں مددگار ہو سکتی ہے اور ہو رہی بھی ہے۔ یہ تو ماننا ہی پڑے گا کہ آزادی کے بعد ہندوستان نے کافی ترقی کی ہے اور یہ بھی کہنا پڑتا ہے کہ جو امیدیں تھیں وہ قطعی پوری نہیں ہوئیں بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ہم ان کی چھوٹی سے چھوٹی ضرورتیں بھی پوری نہیں کر پائے ـــــ پنڈت نہرو نے اپنی شخصیت کے بل پر اقتصادی، سماجی اور بین الاقوامی سطح پر آگے بڑھایا لیکن اقتدار کے اندر فرقہ پرست طاقتیں ہی مضبوط رہیں جس کی وجہ کر ملک زیادہ ترقی نہیں ہو پائی۔ یہ حالت آج بھی ہے یہی وجہ ہے کہ غریبی کی سطح سے نیچے زندگی گزارنے والوں کی تعداد دن بدن بڑھتی جا رہی ہے۔ کھیت مزدوروں پر زمین مالکوں کا ظلم ڈھاتا جا رہا ہے، ہریجنوں، آدی باسیوں کو ان کی زمین اور جھونپڑیوں سے بے دخل کیا جا رہا ہے۔ روز مرہ کے استعمال کی چیزوں میں ملک کے خودکفیل ہو جانے کے باوجود بھوک سے مرنے والوں کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ ـــــ ۱۹۸۵ء میں جب ہم آزادی کا ۳۸ واں جشن منا رہے ہیں تو ایک نیا نعرہ، جو نے وزیر اعظم نے دیا ہے، اچھالا جا رہا ہے "ملک کو اکیسویں صدی میں لے جانا ہے" ویسے تو کوئی کچھ کرے یا نہیں ملک ۱۵ سالوں کے بعد ۲۱ ویں صدی میں تو پہنچ ہی جائے گا۔ پھر بھی غور کرنا ہے کہ اس نعرے کا کیا مطلب ہے! ـــــ غریبی ہٹاؤ کے نعرے کو تو ہم دیکھ چکے اگر ۲۱ ویں صدی میں جانے کا مطلب یہ ہے کہ کچھ دولت والوں کے گھروں میں ٹیلی ویژن لگ جائیں گے۔ دفتروں میں کمپیوٹروں اور روبوٹوں سے بیروزگاری میں اضافہ ہو سکتا ہے ۲۰۰۰ء کے ۱۵ راگست کو سب سے اہم غور و فکر کی بات دوسری ہے۔ ملک اگر آزاد ہو گیا تو جو سو برس بعد ہو گیا ہی کیوں کہ وقت کے دھارے کو کوئی روک نہیں سکتا۔ تشویش کی بات تو یہ ہے کہ ملک آزاد بھی رہ سکے گا یا نہیں ؟ ۔۔۔ پہ دنیا انسانی وجود میں قائم رہ سکے گی یا نہیں ! آج جن صورت حال سے ہم گزر رہے ہیں اس میں ۔۔۔ حقوق ۔۔۔ ہو گیا ہے ـــــ ۴۰ سال قبل فاشسٹ، انتہا پسند ہٹلر ۔۔۔ نے ساری ۔۔۔ انسانیت ۔۔۔ خطرہ پیدا ہو گیا تھا اور پوری دنیا پر اپنا قبضہ جمانے کی کوشش کیا تھا

...ہزاروں لوگ موت کے منہ میں ... ہو گئے تھے۔ آج اس سے بھی بھیانک انتہا پسند طاقتیں دنیا کو جنگ کے منہ میں ڈھکیلنا چاہتی ہیں ... حکومت ... اور پوری انسانی زندگی کو ختم کرنے کی سازش کر رہی ہے۔

اس وقت اپنے ملک میں ترقی کے لئے کوشش اور جنگ کے خلاف امن کی کوشش لازمی ہے۔ اس لڑائی میں جیت کے لئے انسانی زندگی کو تباہی سے بچانے کے لئے قومی ایکتا کی ضرورت ہے۔

آتنک واد، الگاؤ واد، سامراج واد، انسانیت کا سب سے بڑا دشمن ہے جسے شکست دینا ہی پڑے گا دنیا کے کسی بھی حصے میں اگر انتہا پسند، الگاؤ واد کی جیت ہوتی ہے تو وہ سامراج واد کا مددگار ہوگا اور جنگ کا خطرہ اور بڑھ جائے گا۔ آج ساری دنیا کی ترقی پسند طاقتوں کو سر جوڑ کر اس مسئلے پر غور و فکر کرنا چاہئے ورنہ ہم بہت جلد جنگ کے منہ میں ڈھکیل دیئے جائیں گے۔

(بسمل سنسہاروی)

روزنامہ "جنگ" کراچی کے لئے

ڈاکٹر قمر رئیس کا انٹرویو

اُردو کے مشہور محقق اور نقاد ڈاکٹر قمر رئیس صاحب کا ایک بصیرت افروز انٹرویو پاکستان کے روزنامہ "جنگ" کراچی میں شائع ہوا تھا اُس انٹرویو کے کچھ حصے قارئین "سہیل" کی خدمت میں پیش کئے جارہے ہیں۔ (مدیر)

سوال: کیا بھارت میں رابطہ کی زبان اُردو رہے گی؟

قمر رئیس: اس میں کوئی شبہ نہیں کہ رابطے کی جو ملی جلی زبان تھی ہم اس کو اُردو ہی کہتے ہیں۔ اور آج بھی ہم سمجھتے ہیں کہ جو عوام رابطے کی زبان ہے جو ہم دکانوں میں بولتے ہیں، دفتروں میں بولتے ہیں۔ وہ بنیادی طور پر اردو ہے لیکن اب اس کا پیٹرن بدلتا جارہا ہے اور اس میں ہندی کے الفاظ کثرت سے شامل ہورہے ہیں اور ہندی کا اپنا جو کینڈا ہے وہ پھیلتا جارہا ہے اور اب وہ اُردو ہی ہے جو پہلے تھی یعنی ہم نے پہلے کی اُردو میں اور اب کی اُردو میں فرق پیدا ہوا ہے۔

سوال: آپ کی مراد یہ ہے کہ ایسی اُردو جو فارسی اور عربی آمیز ہوتی تھی اب وہ تبدیل ہورہی ہے؟

قمر رئیس: ... کے ... اس ... تک کہ علاوہ ... میرا خیال ہے کہ یہ تبدیلی کا عمل پاکستان میں بھی ہورہا ہے حالانکہ اب اس کا رخ دوسرا ہے۔ یہاں عربی فارسی کے ساتھ مقامی محاورے اور الفاظ بھی شامل ہورہے ہیں

سوال: آپ دہلی یونیورسٹی کے شعبہ ... ہیں۔ وہاں کے تحقیقی کام اور ... ہندوستان کے تحقیقی کام کا ... میں جو تحقیقی کام ہورہا ہے۔ کتابیں لکھی جارہی ہیں، مقالات لکھے جاتے ہیں وہ سب آپ کی نظر ... ہوگا۔ کیا آپ بتائیں گے کہ تحقیقی کام پاکستان میں کس نوعیت کا ہے اور ہندوستان میں اس کی نوعیت کیا ہے؟ دونوں میں کس کا پلہ بھاری ہے؟

قمر رئیس: آپ نے اچھا سوال کیا ہے لیکن مسئلہ یہ ہے کہ پاکستان کی کتب بڑی مشکل سے دستیاب ہوتی ہیں ... ان کتب کے ... بھی کرتے ہیں لہٰذا وثوق کے ساتھ ...

> "جدیدیت کی تحریک نے ادب سے عوام کا جو تھوڑا بہت رشتہ تھا وہ بھی ختم کردیا۔"

> ہندوستان میں جو تحقیقی کام ہورہا ہے وہ پاکستان سے نسبتاً بہتر ہے

کی تحقیق کے بارے میں کچھ نہیں کہوں گا البتہ ہندوستان میں جو تحقیقی کام ہو رہا ہے وہ پاکستان سے نسبتاً بہتر ہے۔ حالانکہ تخلیقی صورت حال اس سے بہتر ہے۔ میرا اپنا خیال یہ ہے کہ حالانکہ میرے سب ہندوستانی دوست بھی اس سے اختلاف کریں گے، میں معذرت کے ساتھ کہوں گا کہ ہندوستان میں تحقیقی کاموں کے لئے طلبہ اور اسکالرز کو پاکستان کے مقابلے میں زیادہ سہولتیں حاصل ہیں۔ اب وہاں اتنے سارے ادارے بن گئے ہیں خاص طور پر اردو اکیڈمیز جو ریاست میں قائم ہوئی ہیں اور جن کا مقصد تحقیق، تنقید اور کتابوں کی اشاعت ہے، اس کام میں مدد دیتی ہیں۔ ہمارے یہاں یونیورسٹی گرانٹ کمیشن جو یونیورسٹی کے طلبہ کے لئے مراعات اور سہولتوں کا اہتمام کرتی ہے مثلاً دہلی یونیورسٹی میں میرے شعبے میں جو اسکالرز ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کو ۸۰۰ روپے ماہوار کا وظیفہ مل رہا ہے اور یہ تین سال تک ملے گا۔ جب کہ کتابوں کا خرچ دیگر اداروں میں ان طلبہ کے آنے جانے کے اخراجات وغیرہ اس کے علاوہ ہیں۔ اس طرح یونیورسٹی میں تحقیقی کام کرنے والوں کو اتنی سہولتیں دے دی جاتی ہیں کہ انہیں تحقیقات کرنے میں کوئی دقت پیش نہیں آتی اس کے نتیجے میں اتنا کام اچھا ہو رہا ہے پھر اس کام کی اشاعت کا اہتمام اکیڈمیاں کرتی ہیں۔ تحقیقی کاموں کو ہم دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ ایک کلاسیکی ادب اور ایک جدید ادب۔ طلبہ

> **اردو اکیڈمیوں کے مالی تعاون سے شائع ہونے والی بیشتر کتابیں [illegible] اور غیر معیاری ہوتی ہیں۔**

کا عام رجحان آج کل یہ ہے کہ وہ کلاسیک کی طرف جانا نہیں چاہتے۔ اس کے کئی اسباب ہیں مثلاً وہ فارسی و عربی پس منظر نہیں رکھتے۔ پرانی چیزیں پڑھنے کے لئے فارسی اور عربی سے واقفیت ضروری ہے جب کہ تعلیم

ادب متروک ہوتی جا رہی ہے۔ لہٰذا وہ جدید کی طرف آتے ہیں اور خاص طور سے افسانوی

سوال: ابھی آپ نے کہا ہے کہ تخلیقی ادب کے متعلق آپ کا خیال ہے کہ ہندوستان کی نسبت پاکستان میں ادب بہتر ہے۔ تخلیقی ادب سے آپ کی مراد شاعری افسانہ ہے، ناول ہے یا مجموعی طور پر آپ کوئی موازنہ کرنا چاہیں گے؟ پھر یہ کہ وہاں تخلیقی کام کم کیوں ہے؟ کچھ اس سلسلے میں تفصیل سے روشنی ڈالیں۔

قمر رئیس: شیخ عقیل صاحب! میرا خیال یہ ہے کہ پچھلے ۴۰ سال میں صورت حال یہ ہوئی ہے کہ ہندوستان میں اتر پردیش اور دوسرے علاقے میں اردو کے جو سلوک روا رکھا گیا ہے اس کے نتیجے میں اردو زبان کی تعلیم کا جو نظام رائج تھا وہ ٹوٹ گیا۔ جو طلبہ آرہے ہیں ان کا کلاسیکی ادب پر مطالعہ جو ادب کا سرچشمہ ہے بہت کم ہو گیا ہے اس کے ساتھ ایک خاص بات یہ ہے کہ جہاں حکومت کی سرپرستی تحقیقی کاموں کے لئے سہولتیں بہم پہنچاتی ہیں وہاں سرپرستی کا میرا خیال ہے کہ ایک طرح نقصان دہ بھی جاتی ہے، یعنی ہر اس آدمی کو جو تیسرے یا چوتھے درجے کے افسانے لکھتا ہے اور شاعری کرتا ہے اس کی کتاب شائع ہو جاتی ہے کیونکہ اکیڈمی ہر ادیب کو ۵۰ فیصد امداد دے دیتی ہے۔

سوال: کیا اس کے لئے وہاں کوئی معیار نہیں ہے؟

قمر رئیس: معیار ہے۔ وہاں ایک کمیٹی ہے جو اس کو منظور کرتی ہے لیکن پیسہ اتنا زیادہ ہے مثلاً بہار کی اردو اکیڈمی ۱۲ لاکھ روپیہ، یوپی اردو اکیڈمی ۱۰ لاکھ روپیہ، کسی بھی ایک شہر کی اکیڈمی کو ۱۰ لاکھ روپیہ ملتا ہے اسے روپیہ خرچ کرنا ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہاں ہر [illegible] کتابیں معمولی اور غیر معیاری ہیں [illegible] پاکستان اور ہندوستان کے جدید ادب [illegible] اس سلسلے میں میرا خیال ہے کہ پچھلے ۲۰، ۲۵ سال میں جدیدیت کی

جو تحریک ہمارے یہاں آئی اور اس نے جس طرح تجریدی اور علامتی ادب ہندوستان میں پیدا کیا۔ وہ ادب ایسا تھا کہ اس نے ہندوستان کی حد تک جو تھوڑا بہت رشتہ جو عام پڑھنے والوں کا ادب سے تھا اُردو افسانے یا شاعری سے اس کو بھی اس نے توڑ دیا ہے۔

سوال: یعنی آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ جو علامتی تحریک کسی حد تک شاعری میں پھیلی، اور افسانے میں بہت زیادہ پھر ناول میں بھی آئی اس سے اس رابطے کو نقصان پہونچا۔ دوسرے لفظوں میں ابلاغ کم ہو گیا۔

قمر رئیس: جی ہاں! اور دوسری بات یہ ہے کہ انفرادی جدید دور کی حقیقتوں اور سچائیوں کو جو ہمارے ہندوستان کی قومی صورت حال میں یعنی ان قومی مسائل سے جن سے ہم گزر رہے ہیں جدیدیت پسندانہ ادب میں اس صورتِ حال کا انعکاس افسانوں اور شاعری میں بہت کم نظر آتا ہے چند مستثنیات کو چھوڑ کر باقی تکنیک پر نظر رکھتے ہیں، بعض اسلوب پر نظر رکھتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ کوئی نیا جمالیاتی تجربہ اپنے پڑھنے والوں تک پہونچائیں بجائے اس کے کہ وہ نئی حقیقتوں، صداقتوں اور نئی بصیرتوں کو پڑھنے والوں تک پہونچائیں، ان کو ایک ایسا جذبہ دیں کہ وہ موجودہ صورت حال کو بدلیں جو ہمارے ملک میں ہے، یا ادب ہمارے ملک میں کم پیدا ہو رہا ہے۔ اس کے برعکس پاکستان میں جو ادب پیدا ہو رہا ہے اس میں زیادہ توجہ ہے، زیادہ طاقت ہے اور یہاں زندگی کی بصیرت افسانے میں بھی اور شاعری میں بھی کہیں زیادہ ہے۔ یہاں پر دو چار افسانہ نگاروں اور شاعروں کو چھوڑ کر تجریدی یا علامتی اظہار کا رواج [illegible] ہے۔ ہمارے یہاں زیادہ تر ابہام کی صورت

ہو جاتا ہے۔ یہاں اکثر تخلیقات پڑھنے اور سمجھی جاتی ہیں۔

سوال: ڈاکٹر آپ نے ابھی گفتگو میں ایک چیز کہی کہ ادیبوں کا وہ گروہ جو اب بزرگوں میں شامل ہو رہا ہے جیسے عصمت چغتائی، جذبی اور سردار جعفری وغیرہ اس گروپ کا ایک حصّہ ہمارے یہاں بھی موجود ہے یعنی اس طرح کے لوگ لیکن ایسا نہیں ہے کہ آپ کے یہاں یہ لوگ ایسے ہیں جیسے ریٹائرڈ زندگی گزار رہے ہوں اس کے برعکس ہمارے یہاں اب بھی ہیں میں کئی نام بتا سکتا ہوں مثلاً فیض صاحب اگرچہ وہ اب ہمارے درمیان نہیں رہے ہیں لیکن وہ موجودہ عہد میں آ گئے ہیں، شوکت صدیقی ہیں، احمد ندیم قاسمی ہیں اور دوسرے لوگ ہیں۔ یہ اسی طرح لکھ رہے ہیں مگر ہندوستان کے لوگ جو اس گروپ کے تھے وہ جیسے تھک کر بیٹھ گئے ہوں۔ میں نہیں سمجھتا کہ وہ سستانے کے لئے بیٹھے ہیں یا اب ان کا لکھنے کا ارادہ نہیں ہے۔ اس سلسلے میں کچھ بتائیے۔ میں غلط کہہ رہا ہوں یا صحیح؟

قمر رئیس: شفیع صاحب آپ کا یہ تجزیہ بڑی حد تک صحیح ہے کہ ہندوستان میں ترقی پسند گروپ والوں میں سے بیشتر نہیں لکھ رہے ہیں اور جو لکھ رہے ہیں ان میں تھکن کا احساس ہے یا یہ وہ اپنے آپ کو دہرا رہے ہیں جیسے ان میں وہ ابھی سفر نہیں ہے۔ یہ جو ایک خاص قسم کا تعطل یا جمود ہمارے یہاں نظر آتا ہے وہ پاکستان کے لکھنے والوں میں نہیں ہے۔ [illegible] یا شوکت صدیقی ہیں یا [illegible] ہیں ان کا [illegible] گیا ہے انھوں نے [illegible]۔ ہاجرہ مسرور، ممتاز [illegible] اور سبط حسن وغیرہ ہیں یہ سب پاکستان [illegible] لکھنے والے لوگ ہیں۔ [illegible] ہے۔ [illegible] ہیں [illegible] پڑھتا ہے۔

نقادوں کا نظریاتی حلقوں میں بٹ جانا کوئی بات نہیں ہے لیکن دوسرے مفادات کے تحت گروہوں میں بٹ جانا اور تعصب پیدا کرنا اچھا نہیں ہے۔

سوال: قرۃ العین حیدر کا بھی ہوتی ہے ڈاکٹر صاحب بیدی کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ انھوں نے اپنی زندگی میں کم لکھا اور اچھا لکھا۔
جیسا کہ غالب نے کم لکھا اور اچھا لکھا۔

قمر رئیس: میں آپ سے اتفاق کرتا ہوں۔ اس میں ان کی انتخابی نظر بھی تھی اور دوسرا وہ جو لکھتے تھے اس میں سب کو سامنے نہیں لاتے تھے۔ ان کے اندر جو نقاد بیٹھا ہوا ہے وہ انہیں مشورہ دیتا رہتا ہے اور وہ اتنا باشعور ہے کہ انھیں بتا دیتا ہے کہ بھئی آپ کی کون سی تخلیق صحیح ہے۔

سوال: ڈاکٹر صاحب ہندوستان میں بہت سے نقاد ہیں۔ اور پاکستان میں بھی ہیں۔ تنقید سے متعلق یہ بتایئے کہ کیا ہمارے اردو ادب کی تنقید اپنا وہ کردار ادا کر رہی ہے جو اس کو کرنا چاہیئے۔ یعنی کیا نقاد اپنے منصب کو پورا کر رہے ہیں۔ ہمارے یہاں بھی اور آپ کے یہاں بھی نقادوں کا ایک ایسا طریقہ ہو گیا ہے جو چند مخصوص جملوں اور الفاظ کے سہارے ہر قسم کی تنقید پر تنقید کرنا شروع کر دیتا ہے تو میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا ہمارے نقاد اپنے فرائض سے عہدہ برآں ہو رہے ہیں یا نہیں؟

قمر رئیس: آپ نے بہت اچھا سوال کیا ہے۔ میرے خیال میں اردو کی جگہ پاک و ہند میں تنقید بہت پیچھے رہ گئی ہے۔ آپ نے نقاد کے جس بلند مقصد کی طرف اشارہ کیا ہے اور یورپ اور دیگر ممالک کے نقاد جو متحرک کردار ادا کر رہے ہیں وہ پاک و ہند میں نظر نہیں آتا۔ اس کے بہت سے اسباب بھی ہیں لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ ہماری تنقید پچھلے ۲۰، ۲۵ سال میں کمزور ہوئی ہے۔ تنقید یعنی نقاد جو منصب ہونا چاہئے یہ وہ ادا نہیں کر پا رہا ہے بلکہ وہ ہر طرح

کی سہل پسندی کا شکار ہو گیا ہے۔ ایک خاص قسم کی دوست نوازی کا، ایک خاص طرح کی ... کا، یہ چیز پاکستان اور ہندوستان دونوں نقادوں کا نظریاتی حلقوں میں بٹ جانا نہیں ہے لیکن دوسرے مفادات گروہوں میں بٹ جانا اور تعصب پیدا کر ... نہیں ہے۔

سوال: ڈاکٹر صاحب! کیا ادب کے لئے تنقید ... ہے؟ کیا لکھنے والا خود اپنا نقاد نہیں ہو ...

قمر رئیس: یہ بنیادی سوال ہے۔ بات یہ ... جتنا اچھا تخلیق کار ہوگا اتنا ہی اچھا ... بھی ہوگا کیوں کہ وہ اپنی تخلیق کا خود ہی ... لیتا ہے۔ یہ سوال پچھلے ۱۰۰ سال سے ا... ہے کہ شعر و ادب کے لئے نقاد کا ہونا ضرو... اور اس سے متعلق ہمارے جوش ملیح آبادی ا... تخلیق کاروں نے نہایت تحقیق کے بعد اس... کیا ہے۔ لیکن میرا خیال یہ ہے کہ نقاد ... ہوتا ہے اور آج کے دور میں تو خاص طور ... ہے۔ جس طرح کہ باغوں میں پودے اُگ ر... اور وہ ان ... چھانٹ کر رہا ... بگڑے ہوئے ... سنوارتا ہے۔ ... ذاری نقاد ... ہوتی ہے۔

> مشاعروں سے کسی بھی دور میں شاعری کو فائدہ نہیں پہونچا لیکن شعر و ادب سے شوق و ذوق رکھنے والوں کو فائدہ پہنچتا ہے۔ اور مشاعرہ ابلاغ کی صورت رکھتا ہے۔

سوال: مشاعرے ہمارے یہاں ایک ادارے کی حیثیت ر... آپ یہ بتایئے کہ ان مشاعروں سے کچھ فائدہ ہوتا ہے۔

قمر رئیس: مشاعروں سے کسی بھی دور میں شاعری کو ... پہونچا لیکن شعر و ادب سے شوق و ذوق رکھنے ... فائدہ پہنچتا ہے اور مشاعرہ ابلاغ کی صورت ...

سوال: یہاں ابلاغ کی بات آ گئی ہے اور ابلاغ کی جہاں تک ... ہے تو گانے والوں اور گانے والیوں نے شاعری کا ...

اصغر علی انجینئر

قرآن کی روشنی میں

ہم اس بار قرآن مجید کی آخری دو سورتوں کی تفسیر پیش کریں گے۔ یہ سورتیں ہیں سورۂ فلق اور سورۂ الناس ۔ یہ دونوں سورتیں نہ صرف اس لئے اہم ہیں کہ ان پر قرآن مجید ختم ہوتا ہے بلکہ اپنے الفاظ و معنی کے لحاظ سے بھی ان کی اہمیت مسلّم ہے۔ ان دو سورتوں کو حضرت عبداللہ بن مسعود قرآن شریف میں شامل نہیں کرتے تھے۔ مسند احمد میں یہ روایت ہے۔ علامہ ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں یہ روایت کی ہے۔ لیکن آئمہ کے قرآن میں یہ دونوں سورتیں شامل کی گئیں ۔ اور پھر نسخے چاروں طرف پھیلے۔

ان دونوں سورتوں کی اہمیت کا اندازہ صحیح مسلم کی اس روایت سے لگایا جا سکتا جو عقبہ بن عامر سے کی گئی ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا: کیا تم نے نہیں دیکھا کہ چند آیتیں مجھ پر اس رات ایسی نازل ہوئی ہیں کہ ان جیسی کبھی نہیں دیکھی گئیں ۔ پھر آپ نے دونوں سورتوں کی تلاوت فرمائی۔

حسب سابق ہم پہلے ان دونوں سورتوں کے لفظی معنی پیش کریں گے پھر ان کی تفسیر۔

سورۂ فلق :

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ ۝ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ ۝ وَمِنْ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ ۝ وَمِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِی الْعُقَدِ ۝ وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ ۝

[آپ کہئے استعاذہ کے لئے کہئے کہ میں صبح کے مالک کی پناہ لیتا ہوں تمام مخلوقات کے شر سے اور (بالخصوص) اندھیری رات کے شر سے جب وہ رات آجاوے اور گانٹھوں پر پھونکنے والیوں کے شر سے اور حسد کرنے والے کے شر سے جب وہ حسد کرے۔]

سورۃ الناس :

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۝ مَلِكِ النَّاسِ ۝ اِلٰهِ النَّاسِ ۝ مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ ۝ الَّذِیْ یُوَسْوِسُ فِیْ صُدُوْرِ النَّاسِ ۝ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ ۝

[کہہ دیجئے میں لوگوں کے رب کی پناہ مانگتا ہوں، لوگوں کے بادشاہ کی، لوگوں کے معبود کی، وسوسہ ڈالنے پیچھے ہٹ جانے والے کے شر سے، جو لوگوں کے سینوں میں وسوسے ڈالتا ہے۔ خواہ وہ (وسوسہ ڈالنے والے) جن ہوں یا آدمی]

ان دونوں سورتوں کی تفسیر میں بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ علامہ ابن کثیر اور ابن قیم جوزی نے ان کی تفسیر میں کئی کئی صفحات لکھے ہیں۔ اور ایک ایک لفظ کی مفصل تشریح کی ہے۔ ان سورتوں کے سلسلے میں بعض حدیثیں ایسی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ یہ سورتیں اس وقت نازل ہوئیں جب رسول اللہ صلعم پر کسی یہودی نے جادو کر دیا اور خاص طور سے من شر النفّٰثٰت فی العقد سے یہی مراد لیا جاتا ہے۔ لیکن ہمارے نزدیک یہ بات مشکوک معلوم ہوتی ہے۔ رسول کریم صلعم کا جادو ٹونے سے متاثر ہونا خلاف عقل بات

علم و ہنر کے محرک تھے اور آپ پر جو باتیں اللہ تعالیٰ نے
وحی کیں وہ [illegible] کے اعتبار سے کائناتی اہمیت کی
حامل تھیں۔ اپنے کلام کو جادو، ٹونوں تک محدود کرنا اس کی کائناتی
اہمیت اور افادیت سے انکار کرنا ہے۔ اس قسم کی تفسیر
قرآن مجید کو تعویذ گنڈے کے لئے استعمال کرنے کی جانب پہلا
قدم ہے۔

کلام اللہ جیسا کہ ہم پہلے بھی اس جانب اشارہ کر چکے ہیں، اپنے اندر معنی کی کئی پرتیں رکھتا ہے۔ زمانے کے مرور کے ساتھ معنی کی یہ پرتیں اور پرتیں ہم پر کھلتی چلی جا رہی ہیں بشرطیکہ ہم اپنے دور کے تجربات کی روشنی میں ان پر غور کریں اور انہیں بعض روایتی معنی تک محدود نہ کر دیں۔ اللہ کا کلام ہر دور میں ہماری رہنمائی اسی صورت میں کر سکتا ہے جب ہم اپنے دور کے تجربات اور مسائل کی روشنی میں اس پر غور کریں اور اس سے ہدایت حاصل کریں۔ قرآن مجید میں عقل اور ایمان کے توازن پر اسی لئے زور دیا گیا ہے کہ ہم تقلید کی اندھی وادیوں میں گم نہ ہو جائیں۔ یہاں ایمان کا مستحکم اور مضبوط ہونا ضروری ہے (اس کے بغیر ہم کسی شئے سے کہیں اطمینان، تحریک یا انسپریشن حاصل کر سکتے ہیں!) وہیں نئے حالات میں پیدا شدہ حقائق پر غور و خوض کرنے کے لئے اپنے تجربات کا معقول تجزیہ کرنے کے لئے عقل کا استعمال بھی ضروری ہے۔ اقدار و مقاصد ایمان سے طے ہوتے ہیں تو ان کے حصول کا طریقہ عقل سے طے ہوتا ہے۔

آیئے ہم اپنے دور کے شعور کی روشنی میں ان اہم سورتوں معنی پر غور و خوض کریں تاکہ حتی الامکان ان سے صحیح ہدایت حاصل ہو سکے۔

ایران کے عالم اور دانشور علی شریعتی نے اپنی کتاب حج میں دونوں سورتوں کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے ہمارے اپنے دور کی روشنی میں ان کے معنی بیان کئے ہیں۔ پہلے تو ہمیں اپنے دور کی اہم خصوصیتوں کو سمجھ لینا چاہیئے۔ ہم صنعتی اور سرمایہ دارانہ دور میں جی رہے ہیں۔ ہمارے دور میں سائنس اور ٹیکنالوجی نے حیران کن ترقی کی ہے۔ کل تک ہمیں ان ترقیوں پر اس قدر ناز تھا کہ ہم اسے انسان کی معراج شعور سمجھ بیٹھے تھے۔ لیکن کچھ چند دہائیوں کے تجربات نے ہمیں دوبارہ سوچنے پر مجبور کر دیا ہے۔ سائنس و صنعت ترقی نے استحصال کے امکانات کو کئی گنا بڑھا دیا ہے، ظلم اور تشدد کو عام کر دیا ہے۔ سرمایہ دارانہ ڈھانچے؛ صنعت کاری کا واحد مقصد منافع خوری اور ذخیرہ اندوزی ہے۔ منافع کی خواہش پوری کرنے کے لئے سائنس اور ٹیکنالوجی کو تباہ کن طاقت کے طور پر استعمال کیا جا رہا ہے۔

ان ترقیوں کے اثرات اتنے مضر ثابت ہو رہے ہیں بعض مفکروں نے سائنس اور ٹیکنالوجی کو بذاتہ انسانیت کے لئے لعنت قرار دینا شروع کر دیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ انتہا پسندانہ رویہ ہے اور ہم اس کے [illegible] نہیں ہیں لیکن ہمیں اس ترقی کے بعض پہلوؤں پر غور کرنے کی یقیناً ضرورت ہے۔

ایک مفکر شان ڈیل (SHANDEL) نے یہاں تک کہا ہے کہ آج انسانیت کو زبردست خطرہ دنیا کے [illegible] سے نہیں بلکہ انسانی فطرت کے مسخ ہو جانے سے ہے۔ انسانیت کا عنصر ہم میں سے اتنی تیزی سے ختم ہوتا جا رہا [illegible] ایک غیر انسانی نسل وجود میں آ رہی ہے۔ دیکھنے میں انسان لیکن حقیقت میں ایک مشین۔ انسان ایک ایسا غلام بنتا ہے جو نہ اپنے آقا کو دیکھتا ہے نہ پہچانتا ہے۔ اس کو اتنی آزادی ہے کہ وہ بہتر سے بہتر غلام بننے کی کوشش کرتا رہے اور وہ ایسا غلام بن کر رہ گیا ہے جو اپنے بکنے کی قیمت بھی ادا کرتا ہے۔ وہ گھنٹوں قطار میں کھڑا رہتا ہے تاکہ اسے لوٹا جا سکے۔ وہ اپنی زندگی خود نہیں جی سکتا بلکہ سرمایہ [illegible] نظام کے تفویض کردہ فرائض پورے کرتا رہتا ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان سب باتوں کا ان [illegible] سے کیا تعلق ہے؟ ہے، اور اگر ہم غور کریں تو یقیناً [illegible] دونوں سورتوں میں خاص طور سے شر سے پناہ مانگنے کی تاکید کی گئی ہے۔ پہلی سورۃ میں شَرِّ مَا خَلَقَ اور شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِي الْعُقَدِ کا ذکر کیا گیا ہے اور دوسری یعنی سورۃ الناس میں مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ پر زور دیا گیا ہے۔ بہر حال دونوں سورتوں میں شر کلیدی لفظ ہے اور اس شر سے پناہ لینا ضروری ہے اور یہ بھی [illegible]

ہے کہ پناہ کس کی ذات سے لی جانی چاہیئے۔

پہلے ہم شر سے متعلق گفتگو کریں گے جیسا کہ ہم نے بتایا دونوں سورتوں میں نہ صرف قدر مشترک ہے بلکہ کلیدی لفظ ہے۔ ہر دور کا اپنا شر ہوتا ہے جس کے خلاف انسانیت کے لئے جہاد کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اگر ہر دور میں اس حاوی اس شر کے خلاف جدوجہد نہ کی جائے تو انسانیت کے بقا کی کوئی ضمانت نہ رہے۔ اپنے دور کے شر کی نشاندہی کرنا بڑا ہی اہم فریضہ ہے۔ دورِ اوّل اور قرونِ وسطیٰ کے مفسرین نے اپنی عقل اور اپنے تجربات کی روشنی میں شر کی نشاندہی کی اور ان سورتوں کے مفہوم سمجھنے کی کوشش کی۔

ہمیں بھی چاہیئے کہ ہم اپنے دور کے شر کو پہچانیں اور اس شر سے پناہ مانگیں تاکہ انسانی اقدار قائم رہ سکیں۔ ہمارے دور کا شر کیا ہے؟ اس کا جواب دینے سے پہلے ہمیں شر سے کیا مراد ہے یہ سمجھ لینا چاہیئے۔ شر دراصل ایک منفی شیطانی قوت ہے جو ہر اس شے کو تباہ و برباد کرتی ہے جو انسانیت کے پھلنے پھولنے کی ضامن ہو۔ شر انسان کو اس منتہائے حقیقی کی طرف بڑھنے سے روکتا ہے جو خالقِ حقیقی نے اس کے لئے طے کیا ہے۔

شر کی اس وضاحت کے بعد اگر ہم اپنے دور کے شر کی نشاندہی کرنے کی کوشش کریں تو ہم دیکھیں گے کہ اس دور کا سب سے بڑا شر مغربی دنیا کا معاشی اور استعماری نظام ہے جو اپنے منافع خوری کی ہوس میں انسانی فطرت کو بدلنے پر تلی ہوئی ہے۔ اس نے انسان کو اس کی انسانیت سے محروم کر کے اس نظام کا غلام بنا کر رکھ دیا ہے۔ اس نظام کا پیدا کردہ مغربی حکمرانوں نے ایشیا اور افریقہ میں استعماری اور پھر نو استعماری نظام قائم کیا۔ اس نظام کی جڑیں مضبوط کرنے کے لئے انہوں نے ایشیا کے ملک میں اپنا محکوم حکمران طبقہ پیدا کیا جنہیں ہم نو استعماری ایجنٹ کہہ سکتے ہیں۔ مغربی نو استعماریت کے یہ ایجنٹ، وہ شاہ ایران کی شکل میں ہوں یا کسی اور شکل میں، ہمارے معاشرے میں نو استعماریت

کی خبیث روح پھونک کر ہمارے سینوں میں مغربی اقدار کی گانٹھ باندھتے رہتے ہیں۔ غور کیجئے ان الفاظ پر: مِن شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِي الْعُقَدِ کا ترجمہ لگا کر پھونکنے والیوں کے شر سے۔ نفث کے معنی دم کرنا منتر پڑھ کر پھونکنا بھی ہیں۔ مغربی نو استعمار کا منتر ہمارے حکمران طبقوں اور سماجی منتخب افراد (Social elites) کو سحر زدہ کر چکا ہے اور یہ جادو ہماری تہذیب، ہمارے تشخص اور ہماری صحت مند روایتوں کو مسخ کر رہا ہے۔ اس سے متاثر ہو کر ہماری قومی پہچان مسخ ہو چکی ہے۔ اور ہم اپنی جڑوں سے کٹ چکے ہیں۔

مغربی تہذیب کے یہ خناس ہمارے سینوں میں وسوسے ڈالتے رہتے ہیں۔ خناس کے معنی امام ابن تیمیہ نے اپنی تفسیر میں پیچھے ہٹنے اور چھپنے والے کے بتائے ہیں۔ وسوسے ڈالنے والے شیاطین، ایجنٹ، اس طرح سے ہمارے سینوں میں وسوسے پیدا کرتے ہیں کہ ہمیں محسوس بھی نہیں ہو پاتا یا انسان ان خناس کو اپنے رگ و پے میں داخل کر لیتا ہے انہیں internalise کر لیتا ہے۔ لیکن خناس کی ایک خاصیت یہ ہے کہ مقاومت اور محاسبہ کرنے پر پیچھے ہٹ جاتے ہیں اور ہمارے کمزور لمحوں میں ہم پر سوار ہو جاتے ہیں۔ استعاذہ کا عمل ایک طرح سے محاسبہ اور مقاومت کا عمل ہے تاکہ ہم مغربی اقدار کو تھوپنے والے ان ایجنٹوں کو جو ہمارے قومی اور تہذیبی تشخص کو ہمارے معاشرے کو، ہماری انسانیت کو اور بشریت کے عناصر کو ہی تہس نہس نہیں کر رہے ہیں، پیچھے ہٹنے پر مجبور کر سکیں۔

یہاں یہ بات واضح کر دینا ضروری ہے کہ سوال سائنس اور ٹیکنالوجی کی برکتوں اور نعمتوں کے انکار کا نہیں ان کے استعمال کا ہے۔ بذاتِ خود ان میں کوئی برائی نہیں لیکن انہیں شر پیدا کرنے کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے اور کیا جا رہا ہے۔ مِن شَرِّ مَا خَلَقَ سے بحث کرتے ہوئے مفسرین نے [illegible] بذاتِ خود شر نہیں ہے۔ جیسے چاقو اگر [illegible] کے لئے ضروری ہے وہاں آدمی کو تباہ [illegible] کے کام آ سکتی [illegible]

ہے تو ملاکر خاتمہ تک بھی کر سکتی ہے۔

سائنس اور ٹیکنالوجی سرمایہ دارانہ اور نو استعماریت کے نظام میں استحصال اور انسان دشمن اغراض کے لئے استعمال ہو رہے ہیں۔

آج پس ماندہ ملکوں پر جدید ترین ٹیکنالوجی تھوپی جا رہی ہے جس سے غریب عوام کا استحصال بڑھتا جا رہا ہے۔ صرف سوشل ایلیٹ اس کا شکار اٹھاتے ہیں اور اپنے ذاتی مفاد کے لئے ہی وہ نو استعماریت کے ایجنٹ بن کر اس ٹیکنالوجی کو درآمد کرتے ہیں۔ اس کے شر سے عوام محفوظ نہیں رہ سکتے۔ اعلیٰ طبقوں کی صارفیت Consumarism آج پس ماندہ ملکوں کے لئے بڑا شر ثابت ہو رہی ہے۔ اور اس شر سے انسانیت مسخ ہوتی جا رہی ہے۔ اس لئے اس شر سے پناہ حاصل کرنا بے حد ضروری ہے۔

پناہ کہاں حاصل کی جائے؟ پہلی سورت میں کہا گیا ہے قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ۔ فلق کے معنی ہوتے ہیں پھاڑنے کے۔ اللہ تعالیٰ رات کے اندھیرے کو پھاڑ کر صبح کی روشنی پیدا کرتا ہے اور بیج کو پھاڑ کر درخت۔ انسانیت کو موجودہ دور کے شر سے ایک ایسی ذات میں پناہ لینا ضروری ہے جو اندھیرے کو روشنی میں تبدیل کرتی ہے۔ یعنی استحصال کے اندھیرے کو مٹا کر ظلم کے اندھیرے کو پھاڑ کر عدل و انصاف، خیر و مساوات کی روشنی پیدا کر سکے۔ سورۃ الناس میں کہا گیا ہے کہ میں پناہ مانگتا ہوں لوگوں کے رب سے۔ ربّ الناس سے۔ رب، امام راغب کہتے ہیں، وہ ہے جو کسی چیز کو ایک سطح سے کمال کی اگلی سطح تک لے جائے۔ یہاں تک کہ وہ مختلف مراحل سے گذر کر کمال کے درجے تک پہنچ سکے۔ دراصل آج انسانیت کو جو ٹیکنالوجی اور سائنس کی ترقی کے باوجود تباہی کی طرف جا رہی ہے انسانی اقدار سے غیر انسانی اقدار کی طرف اور اپنائیت سے اجنبیت کی طرف بڑھ رہی ہے، ایسی ہستی میں ہی پناہ لینے کی ضرورت ہے جو مذکورہ معنی میں ربوبیت کے فرائض انجام دیتی ہو۔ اس سورت میں اس ذات کی تین صفات یعنی ربوبیت، ملوکیت اور الوہیت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ یہ تینوں صفات مل کر ایسی کامل ہستی کا آئیڈیل

ہمارے سامنے پیش کرتی ہیں جو ہمیں آج کے سرمایہ دار دور کے ہر شر سے محفوظ رکھ سکتی ہے بشرطیکہ اس پر ایمان ہو اور عقل سائنس اور ٹیکنالوجی کے صحیح است[عمال] کے لئے ہماری رہنمائی کرتی ہو۔

عقل کا کام اس مقصود کو چیلنج کرنا نہیں اس میں ہماری مدد کرنا ہے۔ عقل اور ایمان کا یہی توازن ہ[میں] شر سے محفوظ رکھ سکتا ہے۔

بقیہ: نئی کتابوں کا تعارف

بے رحم واقعات کی داستان پیش کرتا ہے اور ان واقعا[ت] [کو] صحیح تناظر میں سمجھ کر ان سے پیدا ہونے والی داخلی کیفیات کا شاعری میں محاکمہ کرنا کم از کم میری نظر میں ضروری ہے۔

شاعری نہ نیک خواہشات کا نام ہے نہ محض مثبت اقدار کو پیش کرنے کا۔ انسان بھی بڑی پیچیدہ وحد[ت] ہے اور سماج بھی جس کا ایک سالم حصہ ہے۔ اچھی ش[اعری] کے لئے ضروری ہے کہ انسانی کردار اور سماجی حقائ[ق] پیچیدگی اپنی پوری ہمہ گیریت کے ساتھ اس میں م[نعکس] ہو، انسانی جذبات کی تمام کیفیات، مختلف موڈز میں جھلکیں اور زندگی کے سارے تیور ابھر کر آئیں۔ منتخب [الفاظ] کا استعمال بھی شاعری کی پائیداری میں اضافہ کر[تا ہے]۔ زبان و بیان کے اعتبار سے آسی صاحب کی ش[اعری] بے شک نکھری ہوئی شاعری ہے لیکن ہمیں اس میں ح[قیقی] ہندوستان کی جھلک کہیں نظر نہیں آتی نہ فکر کی پیچیدگی اور بلندی اس میں دکھائی دیتی ہے۔ مثبت قدروں کے قائل ہیں۔ اور بلند حوصلگی کے ب[ا]... زندگی کرنے کے لئے یہ دونوں باتیں بہت ضروری ورنہ مایوسی کے گہرے اندھیرے میں گم ہو کر رہ جائے۔ ہمیں [آسی صاحب] کے ان جذبات کی پوری قدر کرنی چاہیے۔ لیکن اصل [بات یہ] ہے کہ یہ اقدار اور جذبات زندگی کے ساتھ ساتھ لپٹے نظر نہ آئیں تو محض بیان بن کر رہ جائیں گے۔ [آسی] صاحب کی شاعری میں یہ اقدار زندگی کے ساتھ ارتق[اء] اور گتھم گتھا نظر نہیں آتیں، ان اقدار پر زور ضرور ملت[ا ہے]

مشتاق شبنم

ہندی دوہے کی مروّجہ بحر اور اُردو دوہے

یہ ایک بدیہی امر ہے کہ دُنیا کی تمام زبانیں اپنا ایک الگ مزاج، منفرد ساخت اور مخصوص آہنگ لے کر جنم لیتی ہیں اور جب زبانیں اپنے ارتقائی عمل سے گذر کر مکمل طور پر ترقی پذیر ہو جاتی ہیں تو ان میں انفرادیت کا شعور اور پختہ ہو جاتا ہے۔ ماہرینِ لسانیات اس نکتے سے بخوبی واقف ہیں کہ زبانوں کا ارتقائی عمل اور لفظوں کا سفر کتنا دلچسپ ہوتا ہے۔ جب دوسری زبانوں کے الفاظ کسی زبان میں داخل ہوتے ہیں تو وہ لفظ اس زبان کے سانچے میں ڈھل کر اس کے مزاج اور ساخت سے اس درجہ ہم آہنگ ہو جاتے ہیں کہ اسی زبان کا جزو بن جاتے ہیں۔ غیر زبانوں کے الفاظ اپنے اندر سمو لینے اور جذب کر لینے کی صلاحیت ترقی یافتہ زبانوں میں نسبتاً زیادہ ہوتی ہے اور اس صلاحیت کو نہ پہلے معیوب سمجھا گیا اور نہ اب بلکہ ترقی پذیر زبانوں کا اسے وصف قرار دیا گیا۔ بلکہ اس زبان کے الفاظ کے ذخیروں میں اضافہ ہوتا ہے۔ اگر جذب و اخذ کا یہ عمل رک جائے تو زبانوں میں ایک قسم کا جمود پیدا ہو جائے اور اس زبان میں ترقی کے امکانات مفقود ہو جائیں گے۔

انگریزی زبان جو دُنیا کی سب سے زیادہ ترقی یافتہ زبان ہے اس نے دوسری زبانوں کے الفاظ لینے میں کبھی تامل نہیں کیا مگر یہ مشہود ہوا کہ ان الفاظ کو اس نے کلی طور پر اپنی ساخت میں ڈھال لیا ہے۔ "انکار" کے برطانیہ میں اردو ایڈیشن میں عبدالقادر سروری لکھتے ہیں:

انگریزی زبان کے قدیم و جدید علوم میں ہمہ گیری کا جو اس کے بولنے والوں کا حقیقت پسند شعور نئے تصورات کے ساتھ ساتھ ان کے حامل لفظوں کو لے لینے میں کبھی نہیں ہچکچایا۔ انگریزی کی ہمہ گیری اور قوت کا شاید یہ ایک بڑا سبب ہے۔ یہ خیال غلط ہے کہ اس سے زبان کی کوتاہی ظاہر ہوتی ہے بلکہ اس کے خلاف اسی زبان کے بولنے والوں کے عملی اور صحت بخش شعور کا پتہ چلتا ہے۔ بعض زبانوں کے بڑھنے اور ترقی کرنے میں یہی راز مضمر ہے۔"

یہ ایک دلچسپ بات ہے کہ انگریزی زبان میں سب سے زیادہ اردو، فارسی اور عربی کے الفاظ شامل ہیں اور عربی و فارسی کے الفاظ انگریزی زبان میں اردو کے وسیلے سے داخل ہوئے ہیں۔ موصوف اسی مضمون میں لکھتے ہیں کہ لندن یونیورسٹی کی انگریزی کی لیکچرر ڈاکٹر میری سارجنٹ سن اپنی تصنیف "انگریزی میں اجنبی الفاظ کی تاریخ" میں لکھتی ہیں:

انگریزی میں ہندوستان کے لفظوں کی سب سے بڑی جو تعداد آئی وہ ہندوستان سے آئی جو قدیم سنسکرت سے ارتقا پائی ہوئی زبان ہے (اور اس طرح ایک ہند جرمانی بولی ہے) لیکن اس کی لغت میں عربی و فارسی کے لفظوں کی قابلِ لحاظ آمیزش ہے۔

"انکار" کے برطانیہ میں اردو ایڈیشن میں ایسے الفاظ کی ایک فہرست ہے جو انگریزی زبان کے سانچے میں اس طرح ڈھل چکے ہیں کہ ان کی اصل ہیئت اور ماخذ کی شناخت ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہے۔ ایسے الفاظ کی تفصیلی فہرست تو ممکن نہیں ہے مگر ایسے اُردو الفاظ کی چند مثالیں کافی ہوں گی

جو انگریزی زبان کا جزو بن چکے ہیں اور عام طور پر مستعمل ہیں:
جیسے۔ جلیبی (جلیبی)
نفوذ (انفیوز)
ارض (ارتھ)
علیل (ایل)
عبث (ایب لوز)
عجلت (دے جلیٹی)
عندیہ (آئیڈیا)
جنات (جائنٹ)
زعفران (سیفران)
شریف (شیرف)
قال (کال)
کفن (کافن)
اقلیم (کلائم)
قیاس (گیس)

طرح ہر زبان کی خاصیت ہے کہ جب دوسری زبانوں کے الفاظ اندر قبول کرتی ہے تو پہلے ان کا انداز ڈھنگ سے اپنے مزاج ساخت سے ہم آہنگ کر لیتی ہے۔ اردو عروض پر عظمت اللہ خاں سے اب تک مختلف قسم کے اعتراضات ہوتے آئے۔ عظمت اللہ خاں نے "سریلے بول" میں اردو عروض کو ناقص بتاتے ہوئے رد دیا ہے کہ اردو عروض کی بنیاد پنگل پر ہونی چاہئے۔ "سریلے بول" کی اشاعت کے بعد کچھ لوگوں کے ذہنوں کو بدلنے میں عظمت اللہ خاں ضرور کامیاب رہے مگر ان کی کوشش کے باوجود وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ انہیں ہونا بھی نہیں چاہیے تھا مگر دلچسپ بات یہ ہے کہ عظمت اللہ خاں نے خود اپنے بنائے ہوئے اصولوں پر عمل نہیں کیا مگر اتنا ضرور ہوا کہ ان کے باغیانہ اقدام سے عروض پر اعتراضات ہوتے رہے۔ حیرت ہے کہ ڈاکٹر محمد حسین خاں، نظم طباطبائی جیسے سنجیدہ لوگ بھی اس شکار ہوئے۔ نظم "شرح دیوان غالب" میں لکھتے ہیں "عروض کو فارسی اردو والوں نے عربی سے ماخذ علم سمجھ کر اختیار کیا ہے وہ عروض عربی زبان کے واسطے خاص ہے۔ اردو کے لئے والوں کو پنگل کے اوزان میں کہنا چاہیے"۔ یہ کس قدر مضحکہ خیز بات ہے کہ نظم طباطبائی نے ایک ایسے شاعر کی شرح کے دیباچہ میں یہ بات لکھی ہے جسے ہندی یا ہندی عروض سے کوئی علاقہ نہیں تھا۔ گیان چند جین لکھتے ہیں:

"عربی فارسی سے درآمد کیا ہوا عروض اردو کے لئے آسمانی صحیفہ ہے جس میں ایک حرف کی ترمیم کی اجازت نہیں۔ آٹھویں صدی کا عروض بیسویں صدی کی شاعری سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔ مکان کے اعتبار سے یہ عروض عرب و ایران کا ہے ہماری موسیقی عرب و عجم سے مختلف ہے اس لئے وہاں کا عروض ہمارے لئے بکم و کاست کافی نہیں ہو سکتا"۔

اس قسم کے تمام مباحث بیکار محض ہیں۔ ہمیں ان اعتراضات سے صرف نظر کر کے صرف اس پر غور کرنا چاہیے کہ اردو میں جو عروض رائج ہے وہ ہماری شعری تقاضوں پر پورا اترتا ہے یا نہیں۔ تمام زبانوں کے اندر اتنی وسعت ہونی چاہیے کہ اپنی لفظیات سے ہم آہنگ ہو اور دنیا میں شاید ہی کوئی زبان ایسی ہو جس کے عروض کی بنیاد اس زبان کی لفظیات کے آہنگ پر نہ ہو۔ جس طرح شاعری پہلے وجود میں آئی اور پھر اس کی تنقید، اصول و نظریات وضع کئے گئے۔ اسی طرح شعر کی تخلیق کے بعد ہی علم عروض کی ایجاد ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ زبان کے آہنگ کو ہمیشہ مدنظر رکھا گیا۔ گیان چند کا اعتراض بھی بے بنیاد ہے کہ ہماری موسیقی عرب و عجم سے مختلف ہے اس لئے وہاں کا عروض ہمارے لئے کافی نہیں ہے۔ ہماری شاعری کا خمیر اسی مٹی سے اٹھا ہے اور اس کی جڑیں اسی دھرتی کی گہرائیوں تک اتری ہوئی ہیں۔ لہٰذا ہمارے شعراء نے زیادہ تر انہیں بحروں کو اردو میں اختیار کیا جو ہماری فضا اور زمین سے میل کھاتی تھیں۔ عربی کی وہ ثقیل اور غیر مانوس بحریں جنہیں کچھ اساتذہ نے استعمال کیں، کبھی مستحسن نہیں رہیں۔ جہاں تک ہماری موسیقی کا سوال ہے ہمارے اردو شعرا کی غزلیں اس پر پوری اترتی ہیں۔ آج تک کسی موسیقار نے اس بات کی شکایت نہیں کی کہ اردو غزلوں کی دھنیں بناتے وقت ہمیں کسی دقت کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اور نہ کسی مغنی نے یہ دقت محسوس کی۔ موجودہ دور خصوصاً غزلوں کا دور کہا جاتا ہے۔ آج ہمارے قدیم شعراء کے کلام

بل کی غزلیں کے ریکارڈس اور کیسٹ بھاری تعداد میں
بکے ہیں اگر گیان چند پھر بھی مصر ہیں کہ اُردو غزل
ہماری موسیقی سے میل نہیں کھاتا تو ہمیں بہر حال حیرت
ہے۔

اُردو میں دوہے کی صنف بہت پرانی ہے مگر اس پر بہت زیادہ توجہ نہیں دی گئی۔ اس کی ایک خاص وجہ تو یہ ہو سکتی ہے کہ اردو میں غزل کی صنف اس سے بہت قریب رہی ہے۔ ہیئت اور موضوع کے لحاظ سے دونوں اصناف میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ چونکہ غزل صدیوں سے ہمارے مزاج میں رچی بسی ہے اس لئے ہم ذہنی طور پر غزل سے زیادہ قریب ہیں۔ کچھ پاکستانی شعراء نے اس صنف پر خاص توجہ دی ہے اور اچھے دوہے لکھے ہیں۔ جمیل الدین عالی، جلیل عشقی اور مومن سعید خاص شہرت رکھتے ہیں مگر ان لوگوں نے ہندی دوہے کی مروجہ بحر سے انحراف کیا اور اُردو دوہوں کے لئے سرسی چھند کو موزوں سمجھا جس میں اُردو عروض کے مطابق دو بار فعلن اور ایک بار فاع آسکے گا۔ یہ بحر ہندی دوہے کی مروجہ بحر سے زیادہ رواں ہے اور اُردو کے مزاج سے نسبتاً زیادہ مطابقت رکھتی ہے مگر ڈاکٹر عنوان چشتی نے "اُردو شاعری میں جدیدیت کی روایت" میں جمیل الدین عالی کے دوہوں کو سرسی چھند میں اچھے مطلع سے تعبیر کیا ہے۔ حیرت ہے کہ عنوان صاحب کو جلیل عشقی کا نام یاد نہیں رہا جو صنف میں عالی سے زیادہ بلند مقام اور اہمیت کے حامل ہیں۔ عنوان چشتی صاحب نے اپنی کتاب "اُردو شاعری میں ہیئت کے تجربے" میں ہندی چھندوں پر بڑی تفصیل سے لکھا ہے اور اس بات پر زور دیتے ہیں کہ اُردو دوہے کی بحر کیسی ہونا چاہیئے۔ موصوف اس کا جواز پیش کرتے ہیں کہ چونکہ یہ صنف ہندی سے آئی ہے اس لئے اُردو میں بھی اسی بحر کا استعمال کرنا چاہیے۔ موصوف نے دوہے کے سلسلے میں تو حکم صادر کر دیا مگر لیکن [illegible] نہیں۔

اُردو میں نظم معریٰ نے ایک دور کی ایک خصوصیت کو اپنایا اور دوسرے سے انحراف کیا یعنی خصوصیت کو اپنایا اور قافیے سے انحراف ہے جس کو نہیں اپنایا وہ ایک بحر کی پابندی ہے

....

میرے خیال میں نظم معریٰ کا یہ انحراف نیک شگون ہے۔ کسی ایک بحر کی پابندی سے معریٰ نظم روایتی بندشوں کا شکار ہو جاتی ہے اور ہر قسم کے تجربوں کو ایک ہی بحر میں بیان کرنے سے نظم کے تخلیقی اور جمالیاتی پہلو کو نقصان پہنچتا ہے۔"

شوق کی مثنوی "عالم خیال" پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "اس مثنوی کی مختلف بحروں پر ڈاکٹر گیان چند جین کو اعتراض ہے" لکھتے ہیں: "عورت کی زبان سے سیدھی سادی باتیں، سیدھی سادی پیرائے میں نکلتی ہیں اس کے لئے بحر متقارب یا متدارک کے اوزان بڑے موزوں رہتے۔" مجھے اس بات سے اتفاق نہیں ہے۔ دراصل بحور کو عورتوں اور مردوں سے اس طرح متعلق نہیں کیا جاسکتا کیونکہ بحر و وزن جذبے کی بنیادی خصوصیت کے تابع ہوتے ہیں اور شعری تجربے کے بطن سے نمودار ہوتے ہیں۔ چونکہ جذبے کی ترسیل میں بحر و آہنگ کو خصوصی اہمیت حاصل ہے اس لئے بحر و وزن کو خیال، جذبہ یا جمالیاتی تجربے سے الگ کرکے نہیں دیکھا جاسکتا۔" اردو شاعری میں جدیدیت کی روایت میں لکھتے ہیں: "گیت کے لئے کوئی ایک بحر مخصوص نہیں کی جاسکتی کیونکہ جذبہ اور خیال اپنا آہنگ خود تلاش کر لیتا ہے۔" سجاد حیدر یلدرم کی نظم "آہ یاس" جس میں اُردو قوافی کے مسلمہ اصولوں سے انحراف کیا گیا۔ اس میں یلدرم نے "یاس، خاص، آہ، باج، حیات، ساتھ" اور "باس" وغیرہ قوافی کو صوتی مماثلت پر برتا ہے۔ چشتی صاحب فرماتے ہیں "اُردو کی منظوم شاعری میں یہ ایک اضافہ ہے مگر اُردو شاعری نے اُردو قوافی کی آزادی اور اس کے امکانات سے زیادہ کام نہیں لیا۔ جدید اور روایت اُردو قوافی کے نظام جبر کا شکار ہو گئی۔" عنوان چشتی صاحب کے تجزیے [illegible] محسوس کریں گے۔ انہیں [illegible] نیک شگون ہے [illegible] ترسیل و ابلاغ کے بحر و آہنگ

کر وہ اہم سمجھتے ہیں اور گیت سکے لئے وہ کوئی مفروض بحر اسلئے پسند نہیں کرتے کہ جذبہ خود اپنا آہنگ تراش لیتا ہے اور مدد قوافی میں صوتی تغیر انھیں دلکش نظر آتا ہے مگر دوہے کو صنف اس قدر نازک ہے کہ اس میں کسی قسم کی تبدیلی کو جائز نہیں سمجھتے۔

ادب جدلیاتی ارتقا کا حامل ہے۔ اپنے عہد اور ماحول کے ساتھ ساتھ زبان و ادب میں تبدیلی ایک ناگزیر عمل ہے۔ اگر ہم اردو شاعری کی ابتدا سے موجودہ دور تک کی شاعری کا مطالعہ کریں تو زمانے اور ماحول کے اقتضا کے مطابق اس میں بتدریج تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں اور یہ تبدیلیاں زندہ زبانوں کی علامت ہیں۔ ہماری تمام اصناف سخن میں اب تک مستقل طور سے نمایاں تبدیلیاں ہو رہی ہیں اور ابھی تبدیلی کے بڑے امکانات موجود ہیں۔ غزل جو صدیوں سے ہمارا غزل کو محبوب رہی ہے اس کی ہیئت میں چند آزاد غزلوں کے کوئی تبدیلی نہیں آئی مگر اپنے بنیادی موضوع سے بہر لحاظ دور ہوتی جا رہی اور آج اپنے اندر زندگی کے تمام مسائل کو سمیٹ لینے کی صلاحیت پیدا کر چکی ہے۔ پابند نظموں سے آزاد نظموں تک کا سفر اور موضوع کا تنوع اس بات کا شاہد ہے کہ اردو ایک زندہ اور ترقی یافتہ زبان ہے اور اس کے اندر بھی جذب و قبول کی وہی صلاحیت ہے جو انگریزی زبان میں ہے مگر یہ ضروری نہیں ہے کہ جو اصناف یا الفاظ دوسری زبانوں سے اردو میں آئیں تو ہم نے بعینہٖ قبول کر لیں بلکہ جتنی اصناف اردو میں انگریزی کے وسیلے سے آئیں ہم نے انھیں اپنی زبان کی ساخت اور مزاج سے ہم آہنگ کرنے کے لئے مناسب تبدیلیاں کر لیں خواہ بلینک ورس کی صنف ہو یا سانیٹ کی، ہم نے اپنے مزاج کے مطابق اس میں تبدیلیاں کر لیں۔

ہمارے شعرا نے جب پابند نظموں سے آزاد نظموں کی طرف مراجعت کی تو اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ خیال اور جذبے کی ترسیل و ابلاغ کے لئے یہ ہیئت موزوں معلوم ہوئی۔ ہندی دوہے کی جو مروجہ بحر ہے اس میں کڑی پابندیاں ہیں۔ دوہے کے دونوں مصرعوں کا مقفیٰ ہونا ضروری ہے اور ہر مصرع دو حصوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ پہلا حصہ جو کہلاتا ہے،

اس میں ۱۳ ماتراؤں کی شرط ہوتی ہے۔ دوسرے حصے کو وشرام کہتے ہیں جس میں ۱۱ ماترائیں ہوتی ہیں۔ پہلے اور دوسرے مصرعے کے شروع میں جگن نہیں ہونا چاہیئے۔ اور پہلے اور دوسرے مصرعے کے آخر میں لگھو ماترا کا ہونا ضروری ہے اور وشرام کے ابتدا میں بھی جگن نہیں ہونا چاہیئے۔ اس کڑی پابندی کے بعد بھی عنوان چشتی صاحب مصر ہیں کہ یہی التزام اردو دوہوں میں بھی ہونا چاہیئے۔

یہ عجیب بات ہے کہ عظمت اللہ خاں سے لیکر ہندی پنگل کے تمام موافقین اردو اشعار کی تقطیع ماترائی سسٹم سے کرنے پر زور دیتے ہیں حالانکہ میرے تجربے کے مطابق اگر ایک ہی وزن کے ہر شعر یا دوہے کو ہندی اور اردو رسم الخط میں لکھا جائے تو ماتراؤں کی تعداد میں فرق پڑ جائے گا پھر ہم ہندی عروض کے مطابق اردو اشعار کی تقطیع کیوں کریں۔ یہ بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ اردو اور ہندی کے بعض اشعار میں ماتراؤں کی تعداد یکساں رہتے ہوئے بھی دونوں کی روانی میں نمایاں فرق رہتا ہے۔ مثال کے لئے دو۔ دو مصرعوں کو لیجئے۔ میر کا ایک مصرع جس میں ہندی عروض کی رو سے ۳۲ ماترائیں ہیں:

"اک ہوک سی دل میں اٹھتی ہے اک درد جگر میں ہوتا ہے"

ماتراؤں کی یہی تعداد اس ہندی مصرعے میں بھی ہے مگر دونوں کی روانی بھی دیکھیں:

"[illegible]"

میر ہی کے ایک مصرع کی مثال پیش ملاحظہ کریں جس میں ۳۰ ماترائیں ہیں:

"الٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا"

اب ہندی کا یہ مصرع دیکھیں جس میں بھی ۳۰ ماترائیں ہیں:

"جو کچھ بھی ہے یہی پاس ہے اسے میں پڑھانے آئی ہوں"

اب قارئین ان حقائق کی روشنی میں خود فیصلہ کریں کہ اردو دوہوں میں بھی ہندی دوہوں کی وہی مروجہ بحر برقرار رکھی جائے یا مذکورہ بحر میں جو زیادہ رواں اور اردو کے مزاج سے ہم آہنگ ہے۔

علی عباس عزل

جوابِ گریزاں

زبان کی ابتداء کے مسئلے کا ایک تاریخی پسِ منظر

زبان کی نطرت اور ابتدا کے بارے میں کہانیوں اور روایتوں
یل بھنڈار مختلف قدیم تہذیبوں میں موجود ہے۔ ایسا
تا ہے کہ زبان کی حیرت انگیز قوت کو انسان نے بہت
ہی محسوس کر لیا تھا۔ تمدنی بشریات (Cultural
Anthropology) کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے
اچین سنسکرت میں زبان کی ابتدا کے ساتھ ہمیشہ کسی
یر آسمانی طاقت، دیوی یا دیوتا کا تعلق ضرور رہا ہے۔
ا قدسی اور الوہی سمجھی گئی ہے جیسے بابل والے اپنے دیوتا
کلام کا موجد مانتے ہیں۔ مصریوں نے یہ عزت ایک دیوتا
ث کو دے رکھی تھی۔ قدیم سامی روایات جب توریت
ھنے والوں تک پہونچیں تو کسی نے کتابِ تخلیق (2-19)
کو طرح لکھا "اور خدا زمین کے تمام جان داروں کو اور
ے تمام پرندوں کو مٹی سے بنانے کے بعد آدم کے سامنے
، انھیں وہ کس نام سے پکارتا ہے کیوں جس نام سے آدم
نے انکو پکارے گا وہی اس کا نام ہوگا" ہمارے ملک
ا سنسکرت کو "دیوانی" اور "دیو بھاشا" سمجھا گیا۔
یونانیاں یعنی قدیم یونانی لوگوں نے زبان کی ابتدا
ال کو سمجھنے کے لئے کوئی سائنسی تحقیقی طریقہ تو اختیار
لیا ایک عمومی فلسفیانہ بنیاد ضرور قائم کر لی اور تخلیق
کی تشریح اسی زاویے سے کی۔ فلاطون (ق م ۳۴۷
۴) نے اپنے مقالات میں کریٹی لس (CRAT-
YL) کے باب میں الفاظ کی ابتدا اور خاصیت

سے اس سوال سے بحث کی ہے کہ اشیاء اور الفاظ میں کہ ان اشیاء
کو نام دیتے ہیں کوئی رشتہ ہے یا نہیں۔ کیا یہ رشتہ قدرتی اور
لازمی ہے یا صرف انسانی رواج کی پیداوار ہے؟ یہاں ہمیں
اس بحث کی پہلی جھلک دکھائی دیتی ہے جو قدیم یونان کے
مختلف تصور پرست (IDEALIST) اور مادہ پرست
(MATERIALIST) رجحانوں میں تقریباً سو سال سے چلی
آ رہی تھی۔ مثلاً لذت پرستوں (EPICUREANS) اور
تکلیف اور مسرت سے بے نیازوں (STOICS) کے درمیان
اس سوال پر بحث تھی کہ آیا زبان کی ابتدا ان قدیم فطری
آوازوں سے ہوئی جو بتدریج مخصوص مادی چیزوں کے
ساتھ منسوب ہو گئیں یا جو خود اشیاء کی نقل کرنے میں کم و
بیش شعوری کوششوں سے پیدا ہوئی یا تو لفظ کے ایک
قدرتی معنی ہونا چاہئیں یا پھر رواجی مطلب ہونا چاہیئے۔ پہلے
نظریے والے فیثاغورث (ق م 571 - 491) اور
افلاطون یہ سمجھتے ہیں کہ زبان "پیدائشی ضرورت" یا قدرت سے
وجود میں آئی جسے افلاطون "صوتی" کہتا ہے۔ دمقراطیس
(DEMOCRITUS: 430 - 370) جو عہد قدیم میں
مادیت کا بہترین نمائندہ تھا اور ارسطو (ق م 384 - 322)
دونوں کا خیال تھا کہ زبان 'رواج' یا 'قول و قرار' سے
پیدا ہوتی ہے اور الفاظ محض علامتیں ہیں۔ کوئی نام بالذات
موجود نہیں بجز علامت جو کہ وجود میں ہے۔ یہ خیال کہ الفاظ
بنا کسی قاعدے کے بس یونہی بنا لئے جاتے ہیں۔ زیادہ مادی

تھا کیوں کہ اس میں انسان کسی شے کا نام رکھنے کے رواج پر اتفاق و اقرار کرتے دکھائی دیتے ہیں کوئی تصور شدہ رواج انھیں یہ نام عطا نہیں کر رہی ہے۔

ہمارے ملک کا حال کہ اس زمانے میں بڑے داغوں کی کی زندگی تھی کیونکہ یہاں یہ مذہبی، سماجی اور سیاسی انتشار کا دور ہے۔ مہابھارت کی جنگ اور ویدک مذہب و معاشرہ کے خلاف برھ اور بدھ مت کی بغاوت کا زمانہ ہے۔ پانینی (ق م ۴۰۰) سنسکرت کی بگڑتی ہوئی صورت سے گھبرا کر اس کی قواعد تو مرتب کرتا نظر آتا ہے (جو بذاتِ خود بہت اہم کام تھا اور جس کے اصول آج تک کام آ رہے ہیں) اگر ہمارے رشی منی زبان کے جنم پر غور کرتے نہیں ملتے۔

رومیوں نے یونانی تہذیب کے مذہبی اور سماجی عناصر کو تو اپنایا لیکن فلسفہ و منطق اور اس طرح کے سوالات ان لوگوں کے لئے بالکل بے معنی تھے جو اپنا سارا زور حکومت و سلطنت کی توسیع و استحکام اور قانون سازی پر صرف کر رہے تھے۔ لاطینی میں سی سیرو جیسے جادو بیان مقرر تو پیدا ہوئے مگر زبان کی ابتدا کی بحث جہاں یونانی چھوڑ کر سدھارے تھے وہیں رہی۔

رومن انحطاط کے بعد عیسائیت حالاں کہ یورپ اور مغربی ایشیا کے بڑے حصے پر پھیل چکی تھی مگر ایک تو عیسائی فکر اس مسئلے کا حل پہلے ہی سے عہد نامۂ عتیق میں ڈھونڈے بیٹھی تھی پھر پادریت نے اس تاریک دور میں اس سے انحراف کرنا اور دوسرے جواب تلاش کرنا اپنے پیچھے بلا لگا لینے سے کم نہ تھا۔

اسلام نے جب اپنے سماج میں علم کے پیاسے پیدا کئے تو جہاں یونانی سائنس اور طب وغیرہ سے انھوں نے استفادہ کیا وہاں منطق و فلسفے میں بھی اثر قبول کیا جیسا کہ معتزلہ کی فکر میں نظر آتا ہے۔ دوسری صدی ہجری سے زبان و محاورات کی تحقیق و جستجو کا شوق بڑھا۔ عربی زبان کے صرف و نحو پر بڑا کام ہوا۔ علم قراۃ اور لغت سازی وغیرہ میں نمایاں ترقی ہوئی۔ الرقاشی، زبیدی، ابن قتیبہ، ابن السکیت، ابن مالک جیسے ماہرین زبان پیدا ہوئے۔

مگر تخلیق زبان کے متعلق ایسی کوئی بحث نہیں ملتی … علم البیان (سورۂ رحمٰن) سکھایا۔ اس کو بولنا … اکتشافی کی ہو۔ پھر بھی اسلامی تہذیب و فکر نے … کا جو چراغ روشن کیا تھا وہ بجھتے بجھتے یورپ کو ایک ایسی سمت دکھایا گیا جدھر چل کر وہ ا… تک پہنچے۔

اس نشاۃ ثانیہ کی دو تین صدیوں میں ا… زبان کے مسئلے سے زیادہ خیال آرائی اس سوال پر رہی اولین زبان کون سی ہے۔ بہت دنوں تک عبرانی (… ہی کے متعلق یہ خیال رہا پھر جرمن آدمی کی … ہو گئی۔ ویسے یہ سوال بھی بہت قدیم زمانے سے چلا … مشہور یونانی سیاح اور مورخ ہیرو دوتس (ق … نے مصر کے ایک فرعون پش میتیک (ق م ۱۵ … لکھا ہے کہ اس نے دو نوزائیدہ بچوں کو با… تھلگ ایک گڈریئے کی نگرانی میں رکھ کے یہ جا… کی تھی کہ یہ بچے کون سی زبان بولے…

یہ کہانی یورپ کے بعض بادشاہوں سے لیکر آ… کے متعلق کہی گئی۔ گویا اب سے چند صدیوں پہلے بڑی سادہ لوحی سے یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ … کون سی ہے۔ وقت کے ساتھ اس سادہ لوحی … انداز نظر نے لی۔

اٹھارویں صدی کے یورپ میں رومانیت … روسو (ROUSSEAU) اور کونڈی لاک (…AC) کے خیالات نے اس میں اور شدت پیدا کی یہ … انیسویں صدی میں آدمی کی اولین زبان اور … کا موضوع ایسی بحثا بحثی اور تناتنی والا معا… کئی علمی انجمنوں اداروں نے تو اپنے جلسوں میں … پر مقالات کا داخلہ ہی بند کر دیا۔ لیکن اب … جمع ہو چکا تھا کہ جرمنی میں لسانیات کے ا… ونٹ (M WUNDT 1832-1920) نے زبان کی پیدائش کے مختلف نظریات کی در… کرنے کے لئے زمین تیار کی۔ اس نے ایجادی

معجزاتی اور ارتقائی نظریوں میں امتیاز و فرق دکھانے کی کوشش کی۔ وُنٹ کے وقت سے زبان کی صوتیاتی اور اشاراتی دونوں شکلوں کی زمانی ترتیب کا مسئلہ ابتدائے زبان کے نظریات میں ایک خاص اہمیت رکھنے لگا ہے۔

پچھلے تقریباً دو سو سال میں اس سوال کا جواب ڈھونڈنے کی جو کوششیں ہوئیں ان سے دس بارہ نظریے وضع ہوئے مثلاً بادوادُ، پوہ پوہ، ڈِنگ ڈانگ، حیاحو، محنتی، اشاراتی، سنگیتی، اطفالی، اتصال وغیرہ ان میں سے کچھ تو بالکل ہی غیر تسلی بخش رہے۔ بعض کسی حد تک زبان کی ابتدا پر روشنی ڈالتے ہیں مگر زیادہ دور نہیں چل پاتے اور ماہرینِ لسانیات کو مطمئن نہیں کرتے۔ یہ روایتی نظریہ کہ قدرت نے ابتدا سے ہی انسان کو زبان سکھا دی تھی پہلے ہی بے وقعت ہو چکا تھا کیونکہ کوئی آدمی کوئی زبان اپنے ساتھ لیکر پیدا ہوتا جسطرح گوشت کی زبان لیکر آتا ہے۔ اسے جس زبان کے ماحول میں رکھا جائے وہی اس کی زبان ہو جاتی ہے اور اگر ایک بے زبان ماحول میں پرورش پائے تو گونگا بن جائے یعنی اس میں زبان سیکھنے اور بولنے کی فطری صلاحیت تو موجود ہے جس کا اظہار بغیر لسانی ماحول کے نہیں ہو سکتا مگر وہ کوئی فطری زبان جیسی چیز لے کر پیدا نہیں ہوتا۔ اس طرح ودیعت زبان کا مذہبی تصور زبان کی ابتدا سمجھنے میں کام نہیں دیتا۔

صرف ارتقائے آدم کا نظریہ ہمیں کسی حد تک راہ دکھاتا ہے۔ فی الحال صورت یہ ہے کہ ہم آدم کی ابتدا کے سلسلے میں جتنا جانتے ہیں اس کی زبان کی شروعات کے متعلق اس سے بھی کم جانتے ہیں۔ انسانی ارتقا کی مختلف منزلیں مختلف ادوار میں تحجر (FOSSIL) کی شکل میں اس طرح مل جاتی ہیں جنھیں جوڑ کر نسناس (APE) سے آدم نما (HOMININE) اور پھر استادہ آدم (HOMO ERECTUS) سے فکری آدم (HOMO SAPIEN) تک ایک کٹا پھٹا شجرا بن جاتا ہے مگر زبان چوں کہ بنیادی طور پر ایک فکری عمل ہے اور اس کا

اظہار اگر کسی واضح ریکارڈ کی شکل میں باقی نہ رہ سکے آواز کی طرح فضا میں ہمیشہ کے لئے گم ہو جاتی ہے ماہرینِ لسانیات اب تقابلی حیاتیات (RITIVE BIOLOGY) اور زبان کی نفسی حیاتیاتی (OBIOLOGICAL) بنیادوں کے مطالعے اور مشا مسئلے کو حل کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ یہ ابتدائی منزلوں میں ہے۔ دیکھیں انسان اور حیوان ترسیل اور افہام و تفہیم کے طریقوں کے تقا اور مشاہدوں سے کیا نتائج سامنے آتے ہیں اور ایک دن اپنے آپ کو کاغذ پر لکھتا ہے یا نہیں؟

بقیہ قمر رئیس سے انٹ

بہتر طور پر کیا ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

قمر رئیس: اس کی یہ سطح بھی ہے، دوسرا اس حسن بھی شامل ہوتا ہے تو شعر اچھا جا

شفیع مشہدی نمبر کا شاندار جشنِ اجراء

جناب ہدایت اللہ صاحب، وزیر تعمیرات عامہ و اوقاف حکومت بہار

کا ورودِ مسعود اور مشاہیرِ اردو کا باوقار اجتماع

۱۲ راگست کو ۲ بجے دن میں ادارہ سہیل کی جانب سے ایک شمارہ "شفیع مشہدی کے نام" کا جشنِ اجرا فاروقی منزل، باری روڈ، گیا میں منعقد کیا گیا۔ جلسہ میں شہر کے شائقینِ علم و ادب کی اچھی تعداد موجود تھی۔ جناب ہدایت اللہ خان صاحب وزیر تعمیرات عامہ و اوقات حکومت بہار مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے آغازِ تقریب سے لیکر اختتام تک شریک جشن رہکر محفل کی زینت بڑھاتے رہے۔ انہوں نے اپنے دستِ خاص سے ماہنامہ سہیل کے اس خصوصی نمبر کی کاپی جناب شفیع مشہدی کو پیش کی۔ جلسہ کی صدارت جناب شکیل احمد صاحب پرنسپل مرزا غالب کالج گیا نے فرمائی۔ ابتدائی کارروائیوں کے بعد خطیبِ جلسہ ڈاکٹر انجم فاطمی نے شفیع مشہدی کی علمی و ادبی شخصیت کے تفصیلی تعارف کے بعد ڈاکٹر علیم اللہ حالی صاحب کو زحمت دی۔ ڈاکٹر صاحب نے شفیع مشہدی کی تخلیقی شخصیت کے تنوع کا ذکر کیا اور یہ بتایا کہ مشہدی نے شعر و ادب کے مختلف فارم میں اپنی شخصیت کو پھیلا دیا ہے لیکن اس پھیلاؤ میں بکھراؤ نہیں بلکہ ہر نئی جہت مشہدی کی تخلیقیت کو کچھ اور نمایاں کرتی ہے۔ انہوں نے یہ بھی فرمایا کہ مشہدی نے اپنی داخلی شخصیت کو اپنے فن میں لاشعوری طور پر پیش کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں اور ڈراموں میں تعمیرِ حیات کے گوشے نظر آتے ہیں جو اخلاقی اور انسانی خوبیوں کے حامل خود مشہدی ہیں انکی تخلیقات بھی ایسی ہی فضا تعمیر کرتی ہیں۔ — جناب شفیع مشہدی کے سلسلے میں جن دوسرے افراد نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ان میں خورشید حیات، سید احمد قادری، معین شاہد اور جناب کلام حیدری صاحبان کے نام خاص طور پر لئے جا سکتے ہیں۔ جناب خورشید حیات نے جناب مشہدی کے فن کے بارے میں اپنا مختصر مقالہ پیش کیا۔ جناب معین شاہد مدیر آدرش دیپک گیا نے انکے افسانوی مجموعہ پر بحث کی اور ان کی کہانی "سبز پرندوں کا سفر" کو مشہدی کا ایک نمائندہ افسانہ بتایا۔ سید احمد قادری نے اپنی مختصر تقریر میں جناب مشہدی کی ہمہ جہت ادبی شخصیت کا جائزہ لیا۔ جناب کلام حیدری نے اپنی تقریر میں یہ فرمایا کہ اس مردہ پرستی کے دور میں ماہنامہ سہیل نے زندہ ادیبوں پر خصوصی شمارے شائع کرنے کی ایک صحت مند روش بنائی ہے۔ انہوں نے شفیع مشہدی کے فکر و فن اور اسلوب کا مختصر جائزہ بھی لیا اور یہ بتایا کہ مشہدی کے لب و لہجہ میں ایک ایسی کاٹ اور تیزی ہے جس نے ان کے موضوعات کی پیش کش کو کامیاب بنا دیا ہے۔ اہلِ قلم حضرات کے ان تاثرات اور خیالات کے بعد خود جناب شفیع مشہدی سے گزارش کی گئی کہ وہ اپنے فن اور محرکات کا جائزہ لیں، اس کے بعد جناب ہدایت اللہ خان نے مختصر سی تقریر میں اپنی مسرت کا اظہار کیا اور جناب مشہدی کی غیر معمولی دفتری و ادبی صلاحیتوں کی ستائش کی۔ اپنی صدارتی تقریر میں پرنسپل شکیل احمد نے اس کامیاب ادبی جلسہ کے انعقاد پر جناب شفیع مشہدی اور ادارہ سہیل کو مبارکباد دی۔ آخیر میں ایک شعری نشست بھی منعقد ہوئی جس میں خاص طور پر شفیع مشہدی سے ان کی شعری تخلیقات سنی گئیں۔ جلسے کا اختتام مدیر اعلیٰ "سہیل" گیا کے اظہارِ تشکر پر ہوا۔ (ادارہ)

ہجر کا نغمہ

وحید اختر

طلوعِ ماہ میں باقی ہیں کتنے روز و شب
زمانہ گذرا مرے ماہتاب کو چمکے
نہیں ہیں نور کے آثار بام و در پہ کہیں
افق پہ عرصہ ہوا آفتاب کو چمکے
ستارے پلکوں پہ کہتے ہیں مدتیں گذریں
کسی ستارہ کجِ نقاب کو چمکے
خزاں زدہ شجر و برگ و بر کی ہے فریاد
رتیں گذر گئیں کتنی گلاب کو چمکے
یہ ایک ماہ بقیدِ رُخِ مہ خنداں
کچھ ایسے بیتا کہ بیتی ہوں جس طرح صدیاں

◆

کسی کے طرزِ تکلم سے اجنبی ہو کر
صبا کو بھی نہیں شاید دماغ نامہ بری
پیام بھیجا نہیں اس نے جو بہت دن سے
ہوا کے جھونکوں کی تقدیر بھی ہے دربدری
نظر نے اسکی اٹھائے نہیں جو گوہر اشک
ہے شبنم اب بھی کفِ دستِ برگِ گل پہ دھری
نہیں جو پرتو رخسارِ یار میرے لئے
نہ ماہ نیمۂ شب ہے نہ نیرِ سحری
صلہ بھی کچھ نہیں شمعوں کی جانگدازی کا
سلیقہ بھی نہیں فطرت کو دلنوازی کا

◆

تمہاری نظروں کی نرمی کرن کو سکھلا دے
کہ جلتی آنکھوں سے چنتے ہیں کیسے گوہرِ جاں
تمہارے ہاتھوں کے اعجاز سے صبا سیکھے
کہ ہوں گے کیسے رفو چاک زخمِ دل زدگاں
تمہارے رخ سے کریں کسبِ نور مہر و ماہ
تو صبح کیا ہے شبِ برشگال ہو رخشاں
تمہارے ہونٹوں سے مانگیں تبسم اور سخن
تو ہوں ہوائیں بھی رقصاں، غزل سرا، خنداں
جو تم چلے گئے فطرت کا ہے دبستاں بند
خفا ہیں نیندیں کہ اُن پر ہوا شبستاں بند

◆

جو تم نے لی نہ خبر میری ایک مدت سے
نظارے بھی مری فطرت سے باخبر نہ ہوئے
گواہ میری نہیں کیوں یہ کائنات وحیات
مرے وجود پہ شاہد تمہیں اگر نہ ہوئے
تمام عمر سفر جیسے رائیگاں ٹھہری
قریبِ ختمِ سفر تم جو ہمسفر نہ ہوئے
حسابِ عمر میں کیا جانے کس طرح ہوں شمار
تمہارے قرب میں جو روز و شب بسر نہ ہوئے
سکھا دو جینا ہمیں ہجر میں سلیقے سے
گذر ہی جائیگی عمر اک نہ اک طریقے سے

ہولناک جنگ

رباب جعفری

بے گناہوں پہ گراتا ہے بموں کو گر عراق
ساتھ اس کا چھوڑ دیں گے ساری دنیا کے عوام
بے خطا انسانوں پہ برسے ہیں ایران کے
سخت حیران ہوں کہ ایران نے کیا کیسے یہ ظلم
اس کے رہبر کا یقیں ہے فاطمہؑ کے لال پر
کس طرح اس نے بھلا دی دل سے تعلیم امامؑ
جنگ کی بھٹی میں جھونکے جا رہے ہیں نوجواں
ماں کی جاں، بہنوں کے پیارے اور کسی دل کے سرور
قوم کا سرمایہ ہیں، دولت ہیں یہ اقوام کی
آگ برسا کر گئے ہیں جنگی طیارے جہاں
اس جگہ بچے بھی تھے بوڑھے بھی تھے اور ناتواں
خاک جل کر ہو گئے ڈھونڈیں کہاں بیکس عزیز
باپ کو ملتی نہیں اس آگ میں بیٹے کی لاش
ننھے بچے جو ابھی دنیا میں آئے بھی نہ تھے
پیٹ میں ماؤں کے تھے اور ہو گئے بم کے شکار
ایسی بربریت کہ ملتی ہے جہاں میں کم مثال
زندگی خطرے میں ہے ہر سمت حشر کا رزار
سخت ایذا سہہ رہے ہیں ان ممالک کے عوام
ہیں در و دیوار دونوں ملکوں کے نوحہ کناں
ہر گلی کوچے سے آتی ہے صدائے الاماں
مجلسِ انصاف ہے انسانیت کی پاسباں
ان مظالم کی دہنیں پہونچی وہاں فریاد کیا
یہ مناظر دیکھ کر ہے حسنِ عالم سوگوار

یاد

ننھے ننھے ستارے فلک پر
جگمگاتے رہے مسکراتے رہے
چاند ہنستا رہا
کہکشاں مانگ بھرتی رہی
نیلگوں آسماں کی
حسنِ عالم سجاتی رہی
رات کی سیاہ زلفیں
خم بہ خم نرم گیتی کے
شانوں پہ بکھری ہوئی
ندیاں کوہساروں سے بہتی رہیں
آبشار اپنے نغمے سناتے رہے
اور سمندر کی سیماب موجیں
سینۂ آب پر کھلکھلاتی رہیں
یادِ گذشتہ اب پھولوں کی مانند
اپنی خوشبو سے
دل کے چمن کو بساتی رہی

دوسری سمت کا سفر

انیس انصاری

اجنبی شہر میں اب اور کہاں جاؤ گے؟
کوئی دروازہ کھلے گا نہ اماں پاؤ گے!

عشق کے شہر سے لوٹے ہو تہی دست ابھی
دل وہ ایک جنس کہ قیمت نہ خریدار کوئی
سود کس طرح ادا ہوگا، گزر کیا ہوگی!
زندگی سخت مہاجن ہے نہ بچ پاؤ گے
اجنبی شہر ہے یہ، اور کہاں جاؤ گے؟

بس اِس موڑ سے ایک راہ گزرتی ہے اُدھر
شہر کے وسط سے جاتی ہے جو دل کے اندر
راہ محفوظ ہے لیکن ہے بہت سخت سفر
تم کو عادت نہیں تنہائی سے گھبراؤ گے
کوئی دروازہ کھلے گا نہ اماں پاؤ گے

اور اس موڑ سے ایک راہ گزرتی ہے اُدھر
جہاں خندقیں ہیں صلیبیں ہیں بپا ہے محشر
ایک غازی پہ لگے ہوں گے ہزاروں لشکر
زخم ایک ساتھ لگیں گے تو نہ سہ پاؤ گے
اجنبی شہر ہے یہ اور کہاں جاؤ گے

تیسری راہ نکلتی ہے رہِ عام کی سمت
جس پہ مقبول ہر راہی جہاں دلداری وقت
ذہن و دل سوئیں گے آرام سے اور جاگے گا بخت
راہ آسان کو چھوڑو گے تو پچھتاؤ گے
کوئی دروازہ کھلے گا نہ اماں پاؤ گے

ماہنامہ سہیل گیا

ہندوستان کے مشہور و معروف افسانہ نگار و ڈرامہ نویس نیز مقبول ستار

جناب شفیع مشہدی کی ادبی خدمات کا اعتراف

ماہنامہ سہیل گیا کی ایک اور عظیم پیشکش

ایک شمارہ: شفیع مشہدی کے نام

مندرجہ ذیل اہل قلم حضرات کی نگارشات سے مزین

شمس الرحمٰن فاروقی، کلام حیدری، رضا نقوی واہی، یوسف ناظم، مجتبیٰ حسین
ڈاکٹر علیم اللہ حالی، ڈاکٹر قمر اعظم ہاشمی، ڈاکٹر انجم فاطمی، ڈاکٹر نسیم شہزوی، ڈاکٹر عبد
القیوم ابدالی، مشتاق احمد نوری، ذکیہ مشہدی، سید احمد قادری، ظہیر صدیقی وغیرہ۔

شفیع مشہدی کی شاہکار تخلیقات کا انتخاب

صفحات: ۱۲۰ قیمت: ۶ روپے

سالانہ خریداروں کو خصوصی رعایت۔ نمبر صرف ایک روپے میں دیا جائے گا
کاپیاں کم تعداد میں چھپی ہوئی ہیں۔
آج ہی سالانہ چندہ مبلغ ۲۴ روپے مع نمبر کی قیمت ایک روپے کل ۲۵ روپے ارسال فرما کر
موقع سے فائدہ اٹھائیں اور گھر بیٹھے نمبر حاصل کریں۔

منیجر ماہنامہ سہیل نیو سائیڈ روڈ، گیا ۳۰۰۱

غزلیں

نشتر خانقاہی

بے نوائی چھین لے بے چینیاں دے جا مجھے
پیڑ کہتا ہے ہوا سے' آندھیاں دے جا مجھے

سر پہ کوئی چھت تو ہو مجھ جیسے بے گھر کے لئے
اے خلائے بیکراں' اِک آسماں دے جا مجھے

تو نہیں تو درد میرا سننے والا کون ہے؟
عمر بھر کے واسطے خاموشیاں دے جا مجھے

ہر طرف انجان آنکھیں' ہر قدم پر حادثے
اے جہانِ گم شدہ! نام و نشاں دے جا مجھے

رات کی جانب رواں ہے لمحۂ شامِ زوال
کچھ نہیں ممکن تو احساسِ زیاں دے جا مجھے

اب گوارا ہو چکا ہر ذائقہ زہراب کا
اپنی ساری تلخیاں' عمرِ رواں دے جا مجھے

مٹ چکا ہے دل سے اک یاد آور واقعہ
صحبتِ شامِ گذشتہ' ہچکیاں دے جا مجھے

گلشن بہاری نور

بڑا سکون ہے' دن چین سے گذرتے ہیں
ہم اب کسی سے نہیں بس خدا سے ڈرتے ہیں

بچھڑ کے اس سے نہ جیتے ہیں اور نہ مرتے ہیں
عجیب طرح کے بس حادثے گذرتے ہیں

کچھ ایسے راستے جن کی نہیں کوئی منزل
ہمارا راستہ بس کاٹ کر گذرتے ہیں

کبھی نگاہ' کبھی پیرہن' ادائیں کبھی
کئی زبانوں میں اکثر وہ بات کرتے ہیں

حیات دیتی ہیں سانسیں بس اک مقام تلک
پھر اس کے بعد تو بس سانس سانس مرتے ہیں

زمیں چھوڑ نہ پاؤں گا انتظار یہ ہے
وہ آسمان سے دھرتی پہ کب اترتے ہیں

یہ کس نے کھینچ دی سانسوں کی لکشمن ریکھا
کہ جسم جلتا ہے باہر جو پاؤں دھرتے ہیں

فضا ابن فیضی

اچھا ہوا میں وقت کے محور سے کٹ گیا
قطرہ گہر بنا جو سمندر سے کٹ گیا

زندہ جو بچ گئے ہیں ہمیں نفرتوں کے دکھ
اپنا گلا تو پیار کے خنجر سے کٹ گیا

موسم بھی مشتعل ہے بہت کیا بھروں اُڑان
رشتہ ہواؤں کا مرے شہپر سے کٹ گیا

پلکوں پہ اپنی کون مجھے اب سجائے گا
میں ہوں وہ رنگ جو ترے پیکر سے کٹ گیا

میں دھوپ کا حصار ہوں تو چھاؤں کی فصیل
تیرا مرا حساب برابر سے کٹ گیا

وہ میل جول حسن و بصیرت میں اب کہاں
جو سلسلہ تھا پھول کا پتھر سے کٹ گیا

کتنا بڑا عذاب ہے باطن کی کشمکش!
آئینہ سب کا گرمیِ جوہر سے کٹ گیا

سب اپنی اپنی ذات کے زنداں میں بند ہیں
مدت ہوئی کہ رابطہ باہر سے کٹ گیا

دیکھا گیا نہ مجھ سے معانی کا قتلِ عام
چپ چاپ میں ہی لفظوں کے لشکر سے کٹ گیا

خود سر سے تا قدم ابھی آئینہ خانہ ہوں
نقصان ہی کیا جو میں ترے منظر سے کٹ گیا

اس کے انا کی وضع تھی سب سے الگ فضا
کیا شخص تھا کہ اپنے ہی تیور سے کٹ گیا

○

آسی رامنگری

قفس نصیبوں کا اُف حالِ زار کیا ہوگا
پھر آ رہی ہے چمن میں بہار کیا ہوگا

دل و جگر پہ لئے ہوں گے زخم کتنوں نے
کوئی ہماری طرح دلفگار کیا ہوگا

اسی خیال سے میں عرضِ شوق کر نہ سکا
حیا سے رنگِ رخِ تابدار کیا ہوگا

بہار دے نہ سکی ایک پھول کو بھی نکھار
خزاں کے ساتھ ہے رنگِ بہار کیا ہوگا

جو بیج بوتے ہیں نفرت کے سوچتے ہی نہیں
دلوں میں بھر گئی نفرت تو پیار کیا ہوگا

فسردہ لالہ و گل ہیں روش روش ہے اُداس
چمن میں ایسے میں جشنِ بہار کیا ہوگا

خدنگِ ناز نے کچھ اس طرح کیا زخمی
جو دل کے زخم ہیں انکا شمار کیا ہوگا

کبھی کی ٹوٹ گئی آس رات بھیگ گئی
کسی کے آنے کا اب انتظار کیا ہوگا

○

غزلیں

یعقوب حاذق

سب زبان سے اترا
اسکا دھیان سے اترا
یں عکس لمحۂ بے رنگ
جو آسمان سے اترا
میں رہا وہ کب اپنا
لب میاں سے اترا
دی میں نے بھی زباں اپنی
آخر نشان سے اترا
سب لوگ ہی ہوئے تھے کلیم
اونچے مکان سے اترا

راز اعظمی

شبِ الم کا سویرا تلاش کرتا ہوں
وطن سے دور بسیرا تلاش کرتا ہوں
کچھ اس طرح سے اجالوں نے قتل عام کیا
کہ تنگ آکے اندھیرا تلاش کرتا ہوں
جنوں کے پاؤں مسلسل سفر سے لرزاں ہیں
وفا کا پیڑ گھنیرا تلاش کرتا ہوں
جو لوٹ لے گیا آرام زندگی بھر کا
وہی حسین لٹیرا تلاش کرتا ہوں
بدل دیا تھا زمانے کا راز جس نے مزاج
نقشِ پا وہی تیرا تلاش کرتا ہوں

اظہر نیّر

شانۂ ہستی پہ تھا جو بوجھ وہ ہلکا نہ تھا
تم کو کیا اندازہ ہوتا تم نے تو دیکھا نہ تھا
غم بھی تھا منزل بمنزل ہر خوشی کے ساتھ ساتھ
شاہراہِ زندگی کا راہرو تنہا نہ تھا
عکس کے پیچھے ہزاروں عکس کی ترسیل تھی
یعنی پیشِ آئینہ چہرا کوئی دھندلا نہ تھا
بن بلائے روشنی بھی میرے کمرے میں نہ تھی
کھڑکیاں کھولی نہ تھیں جب تک اسے چاہا نہ تھا
غم شناسی جاں نوازی کی ردائیں اوڑھ کر
نیّر اپنی طرح کوئی در بدر بھٹکا نہ تھا

دوس گیاوی

تو ہے مرے تشنہ خیالوں کی طرح
باتوں میں ہے خوشبو بھی گلابوں کی طرح
بھڑکتے ہوئے شعلوں میں ہوا ختم تو کیا
پھر آ گئی بستے ہوئے زخموں کی طرح
کیسی ہوا کرتی ہے میں کیا جانوں
کی اپنی تو ہے اندھی گھپاؤں کی طرح
دیکھو بیٹھو گے تم میرا تعاقب نہ کرو
ہستی تو ہے گمنام جزیروں کی طرح
[illegible]

محمود نفسی

سونا سونا گھر آنگن ہے سونی سونی محفل ہے
قاتل کے ہاتھوں میں خنجر رقص میں مرغ بسمل ہے
خوف اندھیرا مایوسی ہے جنوں کی راہوں میں اب
راہی تنہا سنبھل کے چلنا دور بہت ہی منزل ہے
لمحوں کے نشتر سے زخمی سب کے سب ہیں دنیا میں
وقت بڑا سفاک ہے یارو وقت بڑا ہی قاتل ہے
سولی پر چڑھتے دیکھا ہے میں نے تو معصوموں کو
کیسے کہہ دوں منصف ہے تو لاچاروں کا عادل ہے
نگری نگری بھٹک رہی ہوں نفسی ایک زمانے سے
کوئی بتانے کون دشا میں آخر اپنی منزل ہے

یونس عارف

ہمارے جینے کی اک تو آس چھوڑ گیا
مزاجِ دل میں عجب وہ مٹھاس چھوڑ گیا
مرا وجود مجھے بدحواس چھوڑ گیا
چرا کے مجھ کو بعید از قیاس چھوڑ گیا
سمیٹ لے گیا ساتھ اپنے وہ مے ہستی
کرم کے طور پہ خالی گلاس چھوڑ گیا
اسی بہانے گزر جائیگی کہ دل میں مرے
وہ شخص وعدۂ فردا کی آس چھوڑ گیا
بڑے خلوص سے عارف ملا تھا وہ مجھ سے
پہ جاتے جاتے مجھے [illegible] اداس چھوڑ گیا

غزلیں

نہال عثمانی

شدید درد کے احساس نے رُلایا ہے
یہ کیسا زخم مرے دوستوں نے لگایا ہے
امیدیں جن سے تھیں مجھ کو شگفتہ پھولوں کی
انھی نے خار مری راہ میں بچھایا ہے
یہ سوچنا تھا نشیمن جلانے والوں کو
کسی نے کتنی امیدوں سے گھر سجایا ہے
قریب آ نہ سکوں تجھ سے دور رہ نہ سکوں
مرے وجود میں اس طرح تو سمایا ہے
جہاں پہ جلتے تھے پاؤں وہیں پہ آج نہال
نہ سائباں نہ شجر ہے نہ کوئی سایا ہے

عاصم شعنوان شبلی

ہوا میں بسی سوندھی مٹی کی باس
سفر میں ہوں پھر بھی وطن آس پاس
ہر اک شخص عریاں ہے اس دور کا
نہیں گرچہ ہم میں کوئی بے لباس
سمندر بھی پی لوں تو جاتی نہیں
بڑھی ہے مری آج اتنی پیاس
سر شام بجھنے چلے آئیں گے
مگر اب کہانی کہاں میرے پاس
مجھے علم ہے وہ بھی ڈس جائے گا
بظاہر ہے لہجے میں از حد مٹھاس

منّت ظہیر

ترے فریب وفا کو وفا سمجھتا رہا
میں اپنی ذات کو بھی دوسرا سمجھتا رہا
وہ دور ہی نہ رہا غیر کو جو اپنا کہوں
میں آشناؤں کو نا آشنا سمجھتا رہا
مرا خلوص ہی مانع ہے ورنہ میں کہہ دوں
ترے خلوص و محبت کو کیا سمجھتا رہا
مزاحمت سے نکھرتا ہے زندگی کا شعور
ہر امتحاں کو میں اپنے روا سمجھتا رہا
شکایتوں کو جو از راہِ رسم اے منّت
تعلقات کا اِک مرحلہ سمجھتا رہا

مشورہ

جمال احمد خاں

تو جا کے رہ وہیں جہاں تجھے سکون مل سکے
جہاں صلیب و دار کا نہ کوئی خوف ہو تجھے
تو جا کے رہ وہیں جہاں امان ہی امن ہو
جہاں نہ شر ہے خیر کے تصادمات ہو سکیں
جہاں لہو کی دھار پر نہ رقص ہو نہ گیت ہو
تو جا کے رہ وہیں جہاں کسی کا سر قلم نہ ہو
ستم نہ ہو الم نہ ہو شر نہ ہو دھواں نہ ہو
تو ڈھونڈ لے پناہ اِک جہاں کوئی بھی غم نہ ہو

شالم خورشید

دیوار بھی دیکھی پسِ دیوار بھی دیکھا
چہرہ ہی نہیں ہم نے تو کردار بھی دیکھا
قاتل ہی نہیں دیکھے محافظ کے بھرم میں
مقتول کے وارث کو گرفتار بھی دیکھا
بیٹھے ہوئے بڑے چین سے صوفے کی تہوں پر
ملبوں میں جو بدلے ہیں وہ گھر بار بھی دیکھا
بستی کے بھی جلنے کا اثر کیوں نہیں ہوتا
خبریں بھی سنیں ہم نے اخبار بھی دیکھا
گاتے ہو سدا گیت محبت کے ہی خورشید
سچ بولو! کبھی تم نے وفادار بھی دیکھا

مجاز نوری

کشمکش میں آدمی ہے آج کل
قیمت کتنا قیمتی ہے آج کل
آئینہ بھی عکس سا لگنے لگا
دل کچھ ایسا حیرتی ہے آج کل
کوئی بھی دل خوش نظر آتا نہیں
کتنی مشکل زندگی ہے آج کل
داستانِ درد و غم سنتا ہے کون
بے حسی ہی بے حسی ہے آج کل
راہ نہیں پڑتی کسی پہلو مجاز
نے کیسی بے کلی ہے آج کل

ویریندر پٹواری

بھیمو دی گریٹ

(طنزیہ)

ارے واہ صاحب! آپ سمجھ رہے ہونگے کہ بھیمو دی گریٹ
تعلق زمانہ شجاعت سے ہوگا۔ مگر نہیں۔ بھیمو اسی دور کا
ایسا کردار ہے جو ہر محلے، ہر شہر میں نظر آتا ہے۔ آپ نے
دیکھا ہوگا شاید۔ اڑوس پڑوس میں یا پھر بس کے ساتھ۔
جی ہاں! وہ میرا ہم شکل ہے۔ اور میں اسے بہت ہی
رسے بھیمو کہتا ہوں۔ ہاں کسی کا نام بگاڑنا تو سراسر بیہودگی
مگر کیا کروں "بھیم چند" میں اسکو اجنبیت کی بو آتی ہے۔
ب کہ بھیمو اس کو اپنائیت کا احساس دلاتا ہے۔ ہاں گریٹ
کا اضافہ میں نے کر دیا ہے کیوں کہ وہ ہے ہی گریٹ۔ اور جب
میں اس کو ایک مخصوص ڈرامائی انداز میں بھیمو دی گریٹ
دیتا ہوں تو وہ یوں سامنے کھڑا ہو جاتا ہے جیسے کہہ رہا
۔ فریادی فریاد سناؤ۔ ہم انصاف کریں گے۔ میں اسکا
و دیکھا رہتا ہوں۔ چہرے پہ چھائے اداسی کے بادلوں کو چیرتی
مصنوعی خوشی دیکھتا رہتا ہوں اور پھر جانے کیوں میرے
سم میں لرزش پیدا ہوتی ہے۔ جی نہیں یہ وہ لرزش نہیں
جو ایک قیدی بادشاہ کو اپنے آقا بادشاہ کے سامنے
پیدا ہو جاتی ہے۔ دراصل بات یہ ہے کہ بھیمو کا چہرہ ایک
سے بورڈ کے مانند ہے۔ جس پہ روز نت نئی تحریریں لکھی
ہیں اور مٹائی جاتی ہیں۔ پھر رہ جاتی ہیں چند بے شکل
بالا پھر دھبے ــــــ ان نشانات میں جھانک کر
ھنے کی کوشش کرتا ہوں تو مجھے ایک کبھی نہ ختم ہونے
ایسا سلسلے دار ڈرامہ نظر آتا ہے جس کی شروعات مختلف
روں سے ہوتی ہے مگر ہر کردار وہیں رک جاتا ہے جہاں
ھڑا ہوں۔ پچھلے کئی برس سے! (یا خدا! اب تو بھیمو کے
ارد ہم شکل لوگوں کا ایک ہجوم ہے۔ جب وہ غلہ دکھنے جاتا

یا ریسٹورانٹ میں چائے پینے جاتا ہے تو پیچھے پیچھے ایک کاروان
نظر آتا ہے)۔
کبھی کبھی مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے بھیمو نیند میں چل
رہا ہے۔ یا پھر وہ لوگ (بلکہ ہم لوگ) اس کو گھسیٹ کر
کہیں لے رہے ہیں (کندھے پر بھی لے جائیں تو میں سمجھتا ہوں
کہ قصاب نے اگر بکرے کو کندھے پہ اٹھایا تو بھی یہ نہ مہربانی ہے
نہ ثواب) بھیمو کون ہے؟ جاننا چاہیں گے آپ؟ (یہ جانکاری
حاصل کریں تو بہتر، شاید آپ کو بھیمو کی ہی تلاش ہو)۔
بھیمو ایک کلرک ہے۔ وہ اپنے افسر کی طرح سفید بالوں پر کالا
رنگ لگانے کے بجائے دوسروں کے ماتھے پہ لگے کالک کو اپنے
سفید آستین کو صاف کرتا ہے۔ بے تابے وقوف ہے
مگر اس کی یہ ادا ہی تو اس کی شخصیت کا اہم حصہ ہے۔ اتنا ہی
اہم جتنا کار میں انجن۔ کار کی بات ہو رہی ہے تو چلئے یہ بھی بتا
دوں کہ اس کی اسٹیرنگ خلوص کی گراریوں پر چلتی ہے۔
جی ہاں دائیں موڑ لیجئے یا بائیں۔ اس کے گھر چلیں یا ہوٹل میں۔
اور اگر آپ واقعی چالاک ہیں (ویسے آج کل اس چالاکی کو
ڈپلومیسی کہا جاتا ہے) تو کار کو کچی سڑکوں پر چلائیں یا
نوکیلے پتھروں پر۔ ہاں تیل تو آپ ہی کو ڈالنا پڑے گا
مہربان! ــ جی نہیں۔ جی نہیں۔ ڈیزل یا پٹرول میں آج
کے دور گرانی میں یہ مشورہ کوئی دشمن ہی دے سکتا ہے۔ میں
تو آپ لوگوں کا دوست ہوں ہم عصر ہوں)۔ ارے صاحب میں
سولہ آنے کی بات بھی کہاں کر رہا ہوں۔ آپ یوں کیجئے زباں
اگر کار چلانا چاہتے ہوں تب) ہمدردی کے جذبے میں
پریشانی کے چند قطرے کر ڈال دیں۔ پھر دونوں کے اوپر قصیدہ
گوئی کا جھاگ ڈال دیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے بھیمو ... جاتے

طبیعت کا مالک ہے (شاعری سے لگاؤ ہے شاید اس لئے)
اس لئے آپ اس کے جذبات کو چھو لیں۔ کار کا سوئچ آن
ہو گیا اور کار چل پڑی۔ پھر آپ ان کی مہمان نوازی
سے لطف اندوز ہو جائیے یا پھر دفتر میں ان سے
دس کام کروا لیجئے (جی ہاں وہ قرضے دلاتا ہے اور خود ہی
ضمانت بھی دے دیتا ہے۔ ہے نا بہت اچھا آدمی) قرضے
ہی کیوں۔ آپ یوں سمجھ لیجئے کہ انہوں نے ایک مینا بازار
سجا رکھا ہے۔ جو جی چاہے مانگ لیجئے۔ جی ہاں اُدھار
پر۔ صاحبو! جو کچھ میں کہہ رہا ہوں' سچ کہہ رہا ہوں' اور سچ
کے سوا کچھ بھی نہیں کہہ رہا ہوں۔ لیجئے آپ کہہ رہے
ہیں تو قسم کھا لیتا ہوں۔ بھیمو کی قسم! - اب تو آپ
کو یقین آ گیا نا۔ جی ہاں! بھیمو میرا بہت ہی پیارا دوست
ہے۔ بہت ہی پیار کرتا ہوں بھیمو سے۔ (بھیمو! کہاں
ہو تم۔ ذرا آواز دو۔ فریاد کرتے ہیں)۔ ہاں آواز آ
لئے دی۔ ہاں ہاں ترنم میں دی۔ فقط اس لئے کہ بھیمو
صاحب ذوق ہے۔ جانے کہاں ہوگا اس وقت۔ اور
کون کون اس کے قرب کا فائدہ اٹھا کر ٹھنڈی ٹھنڈی بیر
پی رہا ہوگا۔ ان کے دوستوں کے بارے میں پوچھ رہے ہیں آپ؟
ارے صاحب ایک دو کا ذکر کیا سینکڑوں ہیں۔ اُن میں لال چند
بھی ہیں' لال سنگھ بھی ہے اور لال محمد بھی۔ اور جب کبھی وہ کسی
بھی لال کے ساتھ نظر آتا ہے تب یوں محسوس ہوتا رہتا ہے
جیسے وہ دہکتے ہوئے انگاروں کی گرمی کے بارے میں ذکر تو کرنا
چاہتا ہو مگر مصلحتاً اپنے رخساروں پر اُبھرتی ہوئی لالی کی
نمائش کر رہا ہو۔ بلکہ نمائش کرنے میں زیادہ خوشی محسوس کر رہا
ہو ——— (حالانکہ ہوٹل کا بل چکانے کے لئے اس نے
اس بار بھی اپنی بیمہ پالیسی کو دوسری (Priority) میں
رکھا ہے یا اپنے بچوں کی وردی کو نظر انداز کیا ہو)۔
ارے صاحب! بھیمو جیسے لوگ ہمارے معاشرے کا زیور ہیں۔
جو اپنی چمک دمک سے دوسروں کے جسم کو سجا دیتے ہیں۔
اور ان کے گھروں کو چار چاند لگا دیتے ہیں۔
بھیمو میرا پڑوسی ہے۔ اس لئے صبح سے شام تک جہاں
مجھے اس کی بیوی کی آہ و زاریاں سننی پڑتی ہیں۔ وہاں رات

کو میاں بیوی کا سنگرام عارضی طور پر بند کروا
کروانے کے بعد بھیمو کی سرگزشت بھی سننی پڑتی
میرے لئے بہت ہی سازگار حالات پیدا کر د
سے مانگتا ہوں کہ یہ لڑائی جھگڑے کبھی بند نہ
صاحب اور نہیں تو کیا۔ دیکھئے۔ اگر دنیا میں ا
تو ہتھیار بنانے والی فیکٹریاں بھوکی مر جائیں
بھوکا مروں۔ مرے میرا دشمن۔ نہیں نہیں۔ یہ
نہیں دوست ہے۔ اس لئے سودا مہنگا نہیں
سب گر کھانا کھا کر ہی گھر چلا جاتا ہوں۔ کبھی تو
مجھے میری خود غرضی یا مطلب پرستی کا ڈرا
دیتی ہے تب میں یہ سوچ کر کہ "میں نہیں تو اور
تو اور سہی" فوراً بھیمو کی اسٹیئرنگ کو مضبو
مکمل کنٹرول اپنے ہاتھ میں لیکر دوسرے
جائے سے لیکر ڈنر تک کا ایک فول پروف
ہوں۔ یعنی پہلے بھابھی کی پسندیدہ نمکین
ہوں۔ پھر بچوں کے ساتھ دودھ کا گلاس
ہوں۔ پھر بھیمو کی پسندیدہ لیٹن کی دو چار
پی لیتا ہوں (یہ نہایت ضروری ہے ورنہ د
جیسا ایک دانشور قبول نہیں کریگا بلکہ
بھی نہیں ڈالتا ہوں) اور پھر کبھی کبھی یہ
اپنائیت کا احساس دلا کر، تکلف کو بھا
انٹرنیشنل برادر ہوڈ (TIONAL BRO
THER HOOD) کے پاؤں سے بندھ کر اپنا
بھی بنوا لیتا ہوں۔ (جی ہاں! ایسے پکوان کر
فقط میرے لئے بنائے جاتے ہیں۔ بچوں کو
جاتے ہیں۔ نہیں۔ نہیں وہ مانگ بھی نہیں
ماں باپ کے سلیقے دار بچے ہیں۔ جب گھر میں
ہوں تو بیچارے پڑھائی کی خاطر اپنے
چلے جاتے ہیں اور چاچی وہاں اُن سے گھر
ہے۔ آخر ٹریننگ تو دیتی ہے۔ لڑکیاں
کے گھروں میں جا رہی ہیں۔ آخر کیو
- نہیں۔ بھیمو کی بڑی لڑکی کپڑے دھو بھی لیتی

سرف (SURF) کی ایڈورٹائیزمنٹ کی طرح۔ بیٹا سبھی کبھار بلکہ امتحان کے دنوں میں کبھی میرا کرتہ پاجامہ دھولیتی ہے۔ پریس بھی کر دیتی ہے۔ اور وہ یہ کیوں نہ کرے۔ بھیمو کی بیٹی ہے آخر۔ دراصل یہ گھر ہے خالص مخلوق کا) ہاں تو بات کھانے پینے کی ہو رہی تھی۔ کبھی کبھار یا چلئے اکثر سہی، اگر بھابھی کے میٹھے پکوان کے ساتھ ان کی کوئی کڑوی بات بھی سننی پڑتی ہے تو میں اپنے لب سی کر اپنی فراخ دلی کا ثبوت دیتا ہوں۔ دراصل میں ہوں ہی پیدائشی (BROAD MINDED) اور اپنی اس عمل سے میں بھیمو کی اسٹیرنگ یوں گھما لیتا ہوں کہ اگلے ہی لمحے اس کے اندر ہی اندر ایسی لہریں اٹھتی ہیں جو سمٹ جانے کے بعد جوار بھاٹا بن کر بھابھی پر گرتی ہیں۔ تھرتھرا کر۔ اور اس کے ساتھ ہی ایک نئے سنگرام کا آغاز۔ گویا مجھے ایک دم لائف مل جاتی ہے بالکل ویسے ہی جیسے کسی بلے باز کو کیچ چھوٹنے کی وجہ سے لائف مل جاتی ہے (ضرورت مند حضرات یہ فارمولا نوٹ کرلیں۔ ویسے مفید فارمولے اگر کتابی شکل میں پیش کئے جائیں تو بھوک میں زندگی گذارنے والے لوگ یقیناً خوش حالی کی طرف تیز گامی کریں گے۔ اور ملک کو فقط خوش حالی کی ضرورت ہے۔ بھیمو واقعی ایک کتاب کے مانند ہے۔ الجبرا کہوں تو بہتر۔ کوئی بھی سوال حل کرنے کے لئے کتاب میں سے کوئی فارمولا تلاش کیجئے۔ بس سمجھ لیجئے آپکے ہاتھ میں الہ دین کا چراغ آگیا۔ یا یوں سمجھ لیجئے۔ کمپیوٹر کا سوئچ آن کیا اور حل آپکے سامنے ہے۔ لیجئے آپ کو یقین نہیں آتا تو ایک مثال پیش کرتا ہوں۔ چلئے آپ بھی کیا یاد کریں گے میں فارمولے ہی بتا دیتا ہوں (مگر بھیمو کو یہ مت سنائیں۔ ورنہ پرچہ آؤٹ کرنے والا جیل جا کر جیل میں اور پرچہ خریدنے والے پاس ہو کر یونیورسٹی میں جو مجھے کسی قیمت پر منظور نہیں ہے۔ وجہ جاننا چاہتے ہیں آپ۔ ہاں تو صاحبانِ قدردان بھیمو مہربان تو ہیں پہلوان۔ ورنہ وہ روٹھ گیا، منہ موڑ گیا۔ طوطے کی طرح آنکھیں پھیر گیا۔ لومڑی کی طرح چالاک بن گیا تو میری کھڑی کھڑی فصل پہ اولے

پڑیں گے۔ خیر آپ بھی کیا یاد کریں گے فارمولے تو دونگا مگر قسم دے رہا ہوں کہ اگر آپنے راز فاش کر دیا تو آپ کے جسم میں۔ نہیں۔ نہیں۔ بھیمو کے جسم میں کیڑے پڑجائیں تو لیجئے صاحب۔ فارمولے حاضر خدمت ہیں۔

فارمولہ نمبر ۱ صبح سویرے بوجھل آنکھوں پر پانی چھڑکتے ہوئے اور یوں ظاہر کرتے ہوئے کہ آپکا سر درد سے پھٹا جا رہا ہے۔ آپ بھیمو کے بیڈ روم میں داخل ہو جائیے۔ سر درد کی گولی مانگ کر باتھ روم میں چلے جائیے۔ اور برش پر اُن کا پیسٹ لے کر دانت صاف کیجئے اور اپنی بھابھی کے غصے کو نظر انداز کرکے بھیمو کے ہاتھ میں جلتے سگریٹ کو دیکھ کر یوں احساس دلایئے جیسے آپ کسی بستی کو جلتے ہوئے دیکھا ہو۔ کچھ کہتے کہتے یوں رک جائیے جیسے الفاظ حلق میں اٹک گئے ہوں۔ پھر اپنے حوصلے بلند رکھ کر یوں چھلانگ لگائیے جیسے چھلانگ کی نمائش ہو رہی ہو۔ اور پھر بھیمو کے ہاتھ سے سگریٹ چھین کر باہر پھینک دیجئے۔ (مگر پیکٹ اپنی جیب میں رکھئے ورنہ آپ دن بھر کیا پئیں گے؟ سگریٹ کل بہت مہنگے پڑیں گے) اس سے پہلے کہ بھیمو کچھ کہے آپ چیخ کر کہیئے۔ رات بھر کھانستے رہتے ہو۔ اور کیا نہیں دیکھ رہے ہو کیا لکھا ہے اس پیکٹ پر — ہے یہ۔ اپنے آپ پر نہ سہی، اپنی بیوی بچوں پر تو کرو — دوسروں پر کرم کرنے والے بھیمو! — آپ کا ڈائی لاگ ختم ہو گیا۔ اور اس کے ساتھ کا غصہ بھی۔ باقی مکالمے وہ سنا دے گی۔ جی ہاں مردانی، اس قلعے کی رانی۔ بھیمو کی بولتی بند ہو جائے آپ خاموشی سے ہاتھ منہ دھو کر چلے جائے کا وہ کب لیں گے جو رخ بدل کر (جی ہاں ہواؤں کا رخ جو بدل) بھیمو کی بجائے آپکے ہاتھ میں آجائیگا۔ اُرلن طشتری کی طرح۔ بس آپکا سر درد سے پہلے ہی پھٹا جا اس لئے آپ چکو رام سے فوراً بھائی صاحب بنا دیجئے آپ کے ارد گرد بیٹھ جائیں گے۔ چاچا تو آپ نے اب آپ ابا بھی بن جائیں گے۔ یعنی آپ رام کھ

شام بھی گھر فارمولا کے مطابق آپ بھی ظاہر کرنے کی کوشش کریں گے کہ بھیو کا کیا کریں گے کہ بھیو کا کیا ہوگا۔ بھابھی ناشتہ کھلانے کے بعد آپ کی اداسی کا سبب پوچھے گی تو کسی دوست (چاہے وہ کبھی پیدا ہی نہ ہوا ہو) کا ذکر کیجئے جو کینسر کا شکار ہو کر اپنی بیوی بچوں کو ایک ڈراؤنی تاریک غار میں دھکیل کر چلا گیا۔ ظاہر ہے کہ وہ بھی بہت سگریٹ پی لیتا تھا۔ بس اب آپ کا اس گھر پر مکمل کنٹرول ہے۔ اس کے بعد آپ کیوں بھیو سے ڈریں گے۔ ارے صاحب! اب وہ آپ سے نظریں چرائے گا۔ کیوں کہ چوری چھپے بھی سگریٹ کے دو چار کش ضرور لگائے ہیں۔ اور اگر وہ پکڑا گیا تو بھابھی فریادی ہے۔ بھیو ملزم اور آپ جج۔ کہیے کچھ آیا خیالِ شریف میں۔؟

فارمولا نمبر ۲ — دفتر جانے سے پہلے اور ناشتہ کرنے کے بعد۔ جی ہاں آپ کو معلوم ہے کہ میاں بیوی کا جھگڑا ایران عراق جنگ سے کم نہیں! اسلئے آپ دونوں کو سمجھاتے رہیے کہ خبردار صلح نہ ہونے پائے۔ روٹھی بیوی پریشان بچے اور بدحال بچوں کو یوں معنی خیز نظروں سے دیکھتے رہیے جیسے U.N.O کا کوئی OBSERVER جنگ کی تباہی دیکھ رہا ہو۔ پھر اپنا شعبہ تبدیل کرکے ریڈ کراس کا لیبل ماتھے پر لگا کر بچوں کے آنسو پونچھ ڈالیے۔ کوئی روکے تو فکر نہ کیجئے۔ کوئی ٹوکے تو ذکر مت کیجئے۔ بس کچن میں جا کر نصف درجن انڈوں کا آملیٹ بنا کر آدھا اپنے کومل کومل ہاتھوں سے بچوں کو کھلائیں اور آدھا لنچ بکس میں ڈال دیں۔ ہاں تو میاں بیوی بھوک ہڑتال پر بیٹھے ہیں۔ بیوی آخری دم تک لڑنے کے موڈ میں ہے (کیوں کہ آپ نے باتوں باتوں میں یہ بھی احساس دلایا ہے کہ بھیو جتنی رقم دوستوں پر برباد کر رہا ہے اس کو بنک میں بند کروایا جا سکتا ہے اسٹیٹیا کے لئے جہیز وغیرہ خریدا جا سکتا ہے) اور شوہر ایک ہارے ہوئے MLA کی طرح چپ ہے۔ نہیں نہیں آپ نے کچھ بھی نہیں کیا۔ ہار گیا ہے تو اصول کی خاطر۔ آپ نے بھی اصول کو ترجیح

دی ہے۔ اور ہاں آملیٹ کی بات ہو رہی تھی تو آپ اس دورِ گرانی میں نقصان نہیں ہونے دیں گے نا۔ اسلئے آپ نے بچا ہوا آملیٹ اپنے لنچ بکس میں ڈال دیا۔ ہاں یہ فارمولہ تب سودمند ثابت ہوگا اگر آپ آملیٹ بناتے بناتے۔ گھی کا ڈبہ ختم کرتے کرتے۔ ٹوتھ پیسٹ یا صابن ختم کرتے کرتے آہیں بھرتے رہیں۔ ورنہ فارمولہ کے فیل ہونے کے ساتھ ساتھ ریئکشن (Reaction) کا زبردست خطرہ ہے۔ اور ہاں دفتر جاتے وقت اگر آپ کو شام کے کھانے کا پروگرام فٹ کرنا ہے تو نہایت دکھ اور افسردگی کا اظہار کرتے ہوئے یہ ضرور دیکھ لیں کہ بھابھی کے ہاتھ میں بغاوت کا جھنڈا ہے یا نہیں۔ بچے ان کے ساتھ ہیں یا نہیں؟ ہاں آپ چونکہ اس گھر کے ہمدرد ہیں اس لئے

کا پیغام یعنی جیو اور جینے دو کا پیغام سنا کر سب کے God Father بن جایئے گا گھر میں کیا موجود ہے کیا نہیں ہے یہ آپ ہی کو بتا دینا ہوگا۔ جی ہاں بھیو کو۔ یا پھر اس سے ایک سو کا نوٹ لیکر سامان خرید لایئے۔ بچوں کو خوش کرنے کی خاطر روسٹڈ مرغا بھی لایئے۔ نہیں نہیں کوئی آپ کو چیپ نہیں کہے گا۔ اور پھر ایسی باتوں پر وقت برباد کرنا فضول ہے۔ آپ یہ جانتے ہیں کہ گھر کی مالی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ بھابھی مرغا کھاتی نہیں تو کیا ہوا۔ بچے تو کیا کھائیں گے آپ خود تو کھائیں گے۔ رہی بات آپ کے سگریٹ پی لینے کی تو فقط بھابھی کو یہ کہدیں کہ آپ کی بیوی نے آپ کی زندگی میں تلخیاں بھر دی ہیں۔ کاش! آپ بھی اس معاملے میں بھیو کی طرح خوش نصیب ہوتے۔ (یہ کہنے سے فارمولا کا اثر چار گنا ہو جاتا ہے) اور یوں آپ کا کھانا پینا فٹ ہوگیا۔ آپ کے کپڑے بھی بھابھی دھوئے گی۔ آپ کے سگریٹ بھی بھیو کے ہوں گے، اور شام کو چونکہ آپ فقط بھیو کو مشغول رکھنے کی خاطر تاش کھیلیں گے اس لئے آپ کا جیب خرچ بھی لِیا جائیگا۔ اور چونکہ آپ بھیو کو ہوٹل یا بار میں دوستوں کے ساتھ بیر پینے کے لئے روک لیں گے (عارضی طور پر ہی) اس لئے

بھابھی بھیرو کے ساتھ ان کے بیڈ روم میں پہر پیئے بھرو ہرگز آرام نہیں ہو گی۔ مگر یہ فارمولہ دیا نہیں بکہ صرف وارننگ نوٹ کر لیں۔ جونہی گھر کا سامان اور بھیرو کی رقم ختم ہو جائے گی۔ یا گھر کے برتن بکنے لگیں گے۔ تو میاں بیوی کی بے ہوشی بھی ٹوٹ جائے گی اور ان کو یوں محسوس ہو گا کہ آپ نے دونوں کو گمراہ کر کے کسی کھائی میں ڈال دیا ہے تب بھابھی بھیرو کی شیرنی کی طرح آپ کا تعاقب کرتی رہے گی۔ بالکل ویسے ہی جیسے سراغرساں کے شاہی خزانہ لوٹنے والے چور کا تعاقب کرتے رہتے ہوں لیکن گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس دوران کوئی اور ہمدرد گھر میں گھس گیا ہو گا۔ مگر بات چونکہ آپ کی چوری تھی اس لئے ایک دو ہفتے کا وقفہ دیکر فارمولہ نمبر ۲ کا استعمال کریں۔ لیکن وقفے کے دوران آپ بھیرو کو نہایت ادب و احترام سے نمسکار کہتے رہیں۔ جب بھابھی کو سیڑھیاں چڑھتے وقت ہانپتے ہوئے دیکھ لیں تو یوں ظاہر کریں جیسے آپ سے یہ حال دیکھا نہیں جاتا۔ بچوں کو دور سے دیکھ کر یوں محسوس ہونے دیں کہ آپ ایک زخمی پرندے کی طرح تڑپ رہے ہیں۔ تین تین۔ تین کوئی چاکلیٹ وغیرہ دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ تو تب دیتا ہے جب آپ کو پکے اس گھر میں جانے کا پاس (PASS) مل جاتا۔ یعنی جب فلم دیکھنے کے لئے ٹکٹ نہیں بلکہ خط تفریح ٹیکس دینے کی ضرورت محسوس ہو۔ سمجھے کیا۔

فارمولہ نمبر ۲۔ کسی چھٹی کے دن۔ آپ چند چاکلیٹ جیب میں ڈال کر بچوں کو دیجئے اور ان کی مدد سے بھیرو کے کمرے کے قریب بکھرا کر دیجئے۔ وہ آپکے دل ہی دل میں اس پر غور کرنے لگے گا کیوں کہ مار کھاؤ بہت بے ہوشی ٹوٹ گئی ہے۔ آپ خود آتا ہے۔

[illegible]

کمروں میں ڈال دیں، سب لے گیا۔ آپ کے گھر کا نمک کھایا اپنے محسن پر کسی قسم کی آنچ نہیں آنے دوں گا۔ اور اگر آپ کو کچھ ہو گیا تا، تو میں آگ لگا دوں گا [illegible] کر۔ ویسے میں کوشش کروں گا کہ چاچا پر روکا جائے یوں سمجھ لو کہ ۰ ۰ فیصدی کامیابی حاصل بھی کر چکا ہوں یہ کہہ کر آپ بھیرو کا جواب سنے بغیر چلے جائیے۔ اور کم از کم دو تین دن تک بھیرو کو ملنے کی کوشش نہ کریں۔ بیچارا بھیرو چند راتیں جاگ جاگ کر گزارے گا اور پھر آپ کے خلوص اور ہمدردی کے بارے میں از سر نو [illegible] ہو جائے گا۔ وہ آپ کو کھانے پر بلائیں گے تو [illegible] جائیے گا۔ بیشک اسی روز بھی آپ کو ڈبل روٹی پر ہی قناعت کرنا پڑے۔ بلکہ آپ ہی ان کو دعوت [illegible] کے لئے فلم دیکھنے کے لئے مدعو کریں۔ فکر کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ بھیرو کسی کو ٹکٹ خریدنے دیتا ہی نہیں اس لئے پیسے تو ہوں گی نا۔ بے شک آپ کی طرف سے [illegible] بیوی کو خود کہہ دیگا کہ آپ خود غرض نہیں ہیں [illegible] جب آپ بھی تو نہیں بیٹھا تھا۔ ہاں چوں کہ اب [illegible] بیوی پھونک پھونک کر قدم اٹھا رہی ہے اس لئے [illegible] دوسرے تیسرے دن وہاں جا کر اپنے فارمولے میں [illegible] SUPPLEMENT ڈال دیجئے۔ یہ [illegible] بالکل ویسے ہی جیسے کسی ہارٹ کے پورے [illegible] کے تناؤ زراعت ضروری ہے۔ بھیرو کی اسٹیرنگ پکڑ [illegible] خیال رہے نہایت ضروری ہے کہ بھیرو چوکس نہ ہو [illegible] اور بچوں کی بیوی ٹوٹنے نہ پائے۔ اور یہ سب جب [illegible] ہے جب آپ ان سے پکے ہو کر۔

[illegible]

[illegible]

کی پاشی منہ ہونی چاہئے ورنہ وہ بے ہوشی کی نیند گولیاں کھانے سے انکار کر دے گا۔ ہاں!
میرے پاس اور بھی فارمولے ہیں لیکن بتا دوں تو بہت سارے لوگ expose ہو جائیں گے۔ خاص طور پر وہ لوگ جو بھیو کو فلم کا ہیرو بنانا چاہتے ہیں۔ کچھ اسے کا ڈائریکٹر بنانا چاہتے ہیں۔ پریم کی بنسی بجا کر اس کو لوٹنا چاہتے ہیں۔ اس کو لوگ پہ نیتہ یعنی ہر دل عزیزی کی وجہ سے الیکشن میں ٹکٹ دلانا چاہتے ہیں۔ اس کو "مدلہ مخلص کانفرنس" میں بحیثیت مہارت کا نمائندہ بھیجنا چاہتے ہیں۔ ہاں اتنا ضرور بتا دوں کہ اس کا افسر دی ہاں جو اپنے سفید بال کالے کرتا ہے اور اپنے کالے کالے غندوں پر بھیو کا صاف و شفاف رومال رکھتا ہے، اس کو زبردست لگن اور بے لوث کارکردگی کی بنا پر پرموٹ کروانے کا وعدہ کر چکا ہے۔ اور اس لئے کہ اسے اس بار بھی اپنی بیمے کی قسط ادا نہیں

کی اور اپنے بیٹے عینکیں اور سوٹ نہ... دیکھئے میں جانتا ہوں کہ آپ کو بھیو پر ترس آنے لگا ہے مگر دنیا والوں کو اس کو روکنے یا ٹوکنے کی ہمت مت کرنا۔ اس نے خود اپنے سر پر کفن باندھ لیا ہے۔ وہ اگر آگے بڑھتا ہے تو دیس والوں کے قدم بھی تیز ہو جاتے ہیں۔ وہ کیسی بھی چال چلیں مجھے ذاتی طور پر بھیو کی چال بہت پسند ہے۔ شاید اس لئے کہ میں غرض مند نہیں، خود غرض ہوں مگر آپ تو جانتے ہیں کہ خود غرضی اس دور کا وہ زیور ہے جس کو پہن کر بدصورت چہرے بھی خوبصورت نظر آتے ہیں۔

اس لحاظ سے میں خوبصورت ہوں اور بھیو کا چہرہ نہایت بدصورت ہے۔ ارے آپ کیا دیکھ رہے ہیں! آئینے میں اپنا چہرہ ——؟ آپ کچھ بھی کہہ دیں میں فقط اتنا کہہ دوں گا کہ زندہ باد بھیو دادا گری...

شام بارک پوری
(بنگلہ دیش)

ڈارلنگ

کل تک اس کی صورت چاند سے ملتی جلتی تھی، آج سراپا ماہ پیکر ہو گئی تھی۔ وہ دل آزار ہونے کے باوجود میری دلبر تھی۔ شوخ اور چنچل۔ اس کی ہر ادا سے مستی ٹپکتی تھی۔ اس کی مخمور آنکھوں میں ایسی غضب کی مستی تھی کہ جب بھی دیکھتا سرشار ہو جاتا۔ اس کے خرامِ ناز کی دلفریبی سے دل میں جذبۂ عشق بیدار ہو جاتا۔ وہ اپنی تمام آفرینیوں کے ساتھ میرے حواس پر چھائی ہوئی تھی، میں اسے دل و جان سے پیار کرتا تھا۔ جسے جنونِ عشق بھی کہا جا سکتا تھا۔ یہ جنون میرے تصور اور محبت کی دین تھا۔ میں اسے حالِ دل سنانے کو بیقرار ہوتا تو وہ اسے چھیڑ خانی سمجھتی۔ سنا تھا کہ دل سے دل کو راہ ہوتی ہے مگر یہاں عجب حالت تھی۔ میں جتنا مشتاق تھا۔ وہ مجھ سے اتنی ہی بیزار تھی۔

وہ بستر پر میرے پہلو میں لیٹی ہوئی تھی۔ اسے میرے عجز و نیاز کی پرواہ نہیں تھی۔ بے نیازی اُس کی عادت تھی۔ لیکن میں اس سے بددل نہیں ہوا۔ کاش وہ مجھ سے ملا پوچھتی تو پھر میں اپنا حالِ دل بیان کرتا۔ وہ کشیدگی اختیار کرنا چاہتی تھی۔ میرا دل اسے اپنی طرف کھینچتا تھا آخر یہ کشاکش کب تک!

میری دلبر کو میری دلی کیفیت کا اندازہ نہیں ہوا۔ اسے شبہ ہوا کہ وہ مجھ سے روٹھ گئی ہے۔ اس لئے اس کی توجہ اپنی طرف ملتفت کرنے کے لئے اسے گدگدایا، منایا، محبت کا اظہار نہیں کرتی تو کیا مضائقہ۔ کم از کم مجھ سے قطع تعلق تو نہ کرے۔ پھر بھی میری چاہت کا کوئی اثر نہیں۔ جبینِ ناز پہ شکنیں بکھیرے بستر سے اٹھ کر صوفے پر جا بیٹھی۔

آخر میرا دل اینٹ یا پتھر تو نہیں کہ وہ مجھ سے عارفانہ سے کام لیتی جائے اور میں عشق کی آگ میں جلتا۔ میں ساری رات بستر پر کروٹیں بدلتا رہا۔ فراق میں تڑپتا رہا۔ آخر رات کے پچھلے پہر مجھے نیند کی دیوی نے آغوش میں لے لیا۔

صبح جب میں خوابِ شیریں سے بیدار ہوا تو وہ صوفے پر محوِ خواب تھی۔ اس کے سراپے میں اتنی رعنائیاں اور تھیں کہ میں مبہوت ہو گیا، دبے قدموں چلتا ہوا اس کے سرہانے بیٹھ گیا۔ دل پر قابو نہ رہا، آہستہ آہستہ اس کے پر انگلیاں پھیرنے لگا۔ وہ دھیرے سے کسمسائی، پھر غلافی آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔ وہ تیر جو اس نے کمالِ بے پروائی سے میرے جگر پر مارا تھا، اس کی کیفیت میرے دل سے پوچھے۔ میں اس سے لطف اندوز ہو رہا تھا میں نے اسے اپنی باہوں میں سمو لینا چاہا مگر وہ بجلی کی طرح نکل گئی۔ وہ میرے عشق کو وحشت اور دیوانگی سمجھی۔

میں نے جلدی جلدی غسل کیا، کپڑے تبدیل کئے۔ آفس جانے کی تیاری کر رہا تھا وہ ناشتے کی میز پر میرے سامنے بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے پر ایسی کشش تھی جو دل کو اپنی طرف کھینچتا تھا۔ نظارۂ جمال کا ذوق دل میں چٹکیاں لینے لگا۔ میں نے اپنی انگلی سے اس کی ٹھوڑی اٹھائی۔ اس نے خشمگیں نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ اس کے تمتماتے چہرے سے بھی ناراضگی ظاہر ہو رہی تھی۔ اسے اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے گلاس کا دودھ پلانا چاہا۔ اس نے نیم رضامند

سے بہت گھٹن سی ہے۔ میرے لئے یہ خوشی کا باعث تھا کہ اس کے غصّہ کی آگ سوم رہی تھی۔ اس کے غمزے اور عشوے نے میرے جنونِ عشق پر تازیانے کا کام کیا۔ عشق نام ہے تڑپ کا۔ مجھ سے صبر نہ ہو سکا اور بے قابو ہو کر اسے چوم لیا۔ اتنا کرنا تھا کہ وہ شیرنی کی طرح بپھر گئی۔ آنکھوں سے چنگاریاں نکلنے لگیں۔ غصّے میں تیر کی طرح کمرے سے باہر نکل گئی۔

میں نے اس سے کوئی توہین آمیز سلوک نہیں کیا تھا۔ اپنی محبوبہ کی پرستش اور عشق کیسے ترک کر سکتا تھا ــــ میں آوازیں دیتا ہوا اس کے پیچھے پیچھے آیا۔ لیکن اس پر میری کسی بات کا کوئی اثر نہ ہوا۔ اس پر ہیجانی کیفیت طاری تھی۔ تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی گھر سے باہر نکل گئی۔ میرے فرشتے کو بھی خبر نہ تھی کہ برہم ہو کر وہ گھر سے باہر قدم نکالے گی۔ وہ صدر دروازہ عبور کر کے باہر سڑک پر نکل چکی تھی۔ میری آواز کی پرواہ کئے بغیر برق رفتاری سے چلی جا رہی تھی۔

میں سراسیمگی کے عالم میں اس کے تعاقب میں بھاگا۔ ویسی آندھی تھی جو رکنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ میں پیچھے مسلسل پکارے جا رہا تھا مگر وہ سنی ان سنی کئے چلی جا رہی تھی۔ اس پر بے حسی کی کیفیت طاری تھی۔ میں تقریباً اس کے پیچھے پیچھے دوڑ رہا تھا

اچانک کولتار کی چکنی سڑک پر ایک کار کے پہیے چرچرائے، میری ڈارلنگ کار کی زد میں آ چکی تھی میں حواس باختہ اس کی طرف بڑھا، جو خون سے لت پت سڑک پر پڑی۔ میں نے اسے اپنے لرزتے ہوئے ہاتھوں اٹھایا۔ اس نے آخری بار ڈوبتی ہوئی کربی آنکھوں میری طرف دیکھا اور کہا۔ "میاؤں"!

خورشید ملک

صلہ

ساری کی نے نینی تال سرکاری میڈیکل کالج کلکتے سے
ایم بی بی ایس کرنے کے بعد ایم ایس بھی کر لیا۔ سرجری میں مہارت
حاصل کرنے کے بعد اس نے سوچا کہ اپنے علاقے میں جا کر وہاں
کے غریب عوام کی خدمت کرے گا لیکن وہاں پہنچ کر اس نے
محسوس کیا کہ وہاں کے عوام کو اس کی ایم ایس کی ڈگری اور اس
کے خدمت کرنے کے جذبہ کی نہیں بلکہ کسی اور چیز کی اشد
ضرورت ہے۔

ساری کا تعلق ایک ایسے پسماندہ علاقے سے تھا جس کی
آبادی کا بیشتر حصہ بھوک اور افلاس میں مبتلا تھا۔ پورے علاقے
میں صرف چند بڑے خاندان حاوی تھے۔ وہاں کے غریب
عوام انھیں بڑے لوگوں کے سہارے اپنی زندگی گزارتے
تھے۔ بچپن ہی سے وہ لوگ ان کے یہاں بیگار کرنا شروع
کر دیتے اور مرتے دم تک کرتے رہتے تھے۔ بڑے لوگ ان پر
طرح طرح کے مظالم ڈھاتے مگر وہ اُف تک نہ کرتے۔ اس کے
برعکس وہ احسان مانتے کہ ان کے طفیل میں ان کو دو وقت
کی روکھی سوکھی روٹی میسر ہو جاتی ہے۔ ان کی عورتوں کو وہ
اپنے بستر کی زینت بناتے مگر اس میں وہ اپنی عزت [illegible]
بہو بیٹی کو اس لائق سمجھا گیا۔ یہ سلسلہ نامعلوم کب سے چلا
آ رہا تھا۔ وہ لوگ اس طرح کی زندگی کے عادی ہو چکے [illegible]
[illegible] اپنے خیالات اور جذبات [illegible]
اپنی اہمیت کی قدر و قیمت [illegible]

دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ [illegible]
[illegible] آزاد ہو چکی [illegible]
[illegible] انسان [illegible]

اور دنیا میں نہ معلوم کتنے انقلابات آئے مگر وہ علاقہ [illegible]
کا ویسا ہی رہا۔ عوام کو کچھ بھی پتہ نہ چل سکا۔ البتہ بڑے
لوگوں کو پوری واقفیت تھی مگر انھوں نے جاہل عوام کو بے خبر
رکھا۔ ان کو خدشہ تھا کہ باہری دنیا کے بارے میں [illegible]
ہو جانے کی صورت میں ان کی اجارہ داری کا جنازہ [illegible]
دیں۔

وقت کی رفتار میں یکسانیت نہیں ہے۔ اس کے [illegible]
میں تبدیلی آتی رہتی ہے۔ اس علاقے کے تئیں بھی اس کا
رویہ بدلا۔ رفتہ رفتہ ان کے ذہنوں پر [illegible]
و غبار صاف ہوا۔ ان کو اپنے وجود کی اہمیت کا اندازہ
لگا۔ انھوں نے بڑے لوگوں کی اجارہ داری کے خلاف آہستہ
آہستہ آواز بلند کرنا شروع کی اور اپنے اندر اتحاد [illegible]
پیدا کرنے لگے۔ اس طرح رفتہ رفتہ ایک خفیہ تنظیم [illegible]
[illegible] عظیم ترقی کرنے لگی۔ [illegible]
[illegible] زمانہ کروٹیں بدلتا رہا۔ تنظیم [illegible]
[illegible] بڑے لوگوں [illegible]
[illegible] حکومتوں کی توجہ اس علاقے کی طرف [illegible]
[illegible]

کر چکے تھے کیونکہ وہ مفت کام لیتے لیتے اس کے عادی ہو چکے
تھے۔ تنظیم نے عوام کو بڑے لوگوں کے یہاں کام کرنے کے لئے جانے
سے روکا۔ پہلے تو بڑے لوگوں نے ان لوگوں کو لاٹھیوں سے زدوکوب
کیا مگر جب وہ لوگ اپنی ضد پر ڈٹے رہے تو ان لوگوں نے بندوقیں
اٹھالیں۔ اور نہتے لوگوں پر گولیاں برسانا شروع کر دیں۔ بہت
سے بے گناہ اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے اور نہ معلوم کتنے زخمی
ہوئے مگر پھر بھی ان لوگوں نے پیچھے ہٹنے کا نام نہیں لیا۔
لاچار ہو کر بڑے لوگوں کو واپس جانا پڑا۔ یہ تنظیم کی پہلی
فتح تھی۔

انھیں دنوں سارگی کے غریب والدین ہر قسم کی صعوبت
برداشت کر کے اسے تعلیم دلا رہے تھے۔ وہ پڑھنے میں تیز تھا
اس لئے آگے بڑھتے گئے اور وہ پڑھتا رہا حتیٰ کہ وہ رتن سرکار
میڈیکل کالج کلکتہ میں داخل ہو گیا۔ وہ پہلا نوجوان تھا
جو تعلیم کے سلسلے میں اس پسماندہ علاقے سے نکل کر باہر پڑھنے
گیا تھا۔ جب سارگی ایم ایس کر کے واپس آیا تو اس نے دیکھا
کہ تنظیم تخریبی کارروائیاں کر کے بڑے لوگوں میں دہشت
پھیلا رہی ہے، ان کے یہاں ڈاکے پڑتے ہیں اور ان کی دولت
لوٹ کر عوام میں تقسیم کر دی جاتی ہے۔ تنظیم بڑے لوگوں پر
کچھ اس طرح حاوی ہو گئی تھی کہ ان کا گھر سے باہر نکلنا بھی
دوبھر ہو گیا تھا۔ سارگی نے محسوس کیا کہ اس وقت لوہا تپا
ہوا ہے اسے بس چند چوٹوں کی ضرورت ہے۔ اگر ایسے
میں عوام کا باہمی اتفاق اور تعاون ذرا سا زور پکڑ جائے۔
تو [illegible] کو اپنے مطالبات پورے کرانے میں کوئی دقت پیش نہیں
آئے گی۔ لہٰذا سارگی نے اپنی میڈیکل پریکٹس کو بالائے
طاق رکھ کر تنظیم سے منسلک ہو گیا۔

بڑے لوگوں نے مجبور ہو کر تنظیم کی شکایات حکومت کو
بھیجیں۔ ابھی تک اس علاقہ کا ایم ایل اے بڑے لوگوں
میں سے ہی چنا جاتا تھا مگر اب کے الیکشن میں ان کو کوئی کامیابی
[illegible] نہیں تھی کیونکہ عوام کافی حد تک سیاسی طور
[illegible] ہو چکے تھے اور تنظیم اپنے امیدواروں کو الیکشن
[illegible] کر چکی تھی۔ [illegible] شکست پر [illegible]
[illegible] حکومت سے ان کو بھرپور تعاون دینے

کا مطالبہ کیا۔ اس علاقہ میں پولیس فورس بڑھا دی گئی، نئی چوکیاں
قائم کی گئیں۔ فوج کا ایک دستہ بھی تعینات کر دیا گیا اور پرانی
حویلی کو جیل میں منتقل کر دیا گیا۔ حکومت نے اس تنظیم کو
غیر قانونی قرار دے دیا۔ اس کے اراکین کو گرفتار کیا جانے لگا۔
جیل میں ان پر سختیاں کی جانے لگیں۔ مگر ان سب کے باوجود
تنظیم میں جوش و خروش پہلے ہی جیسا قائم رہا۔ ان کو گولیوں
سے اڑایا جانے لگا۔ وہ ہنسی خوشی اپنے آپ کو ایک خوشگوار
مستقبل کے لئے موت کے حوالے کرتے رہے۔ آخرکار ایک ایسا
وقت آ گیا کہ تنظیم کے تمام پرانے ساتھی موت کے گھاٹ
اتار دیئے گئے۔ سارگی نے تنظیم کی قیادت اپنے ہاتھ میں لے لی۔

انہیں دنوں سارگی نے شردا سے شادی کر لی۔ شردا
اس کے قبیلہ کی ایک خوبصورت دوشیزہ تھی۔ بچپن ہی سے
دونوں ایک دوسرے کو چاہتے تھے۔ سہاگ رات کو شردا
نے سارگی سے تنظیم چھوڑ دینے کی درخواست کی۔ سارگی
نے سختی سے اس کے مشورہ کو مسترد کر دیا۔ اس نے شردا کو سمجھاتے
ہوئے کہا:

"تنظیم اب اس حالت کو پہنچ گئی ہے کہ میں اس کو
نہیں چھوڑ سکتا۔ ہمارے بزرگوں کی قربانیوں
کا صلہ ملنے کا وقت قریب آ گیا ہے۔ میرے الگ
ہو جانے سے ممکن ہے کہ کامیابی ایک بار پھر ہم سے
دور ہو جائے۔ اس کے علاوہ اگر میں نے تنظیم کو
چھوڑ دیا تو آنے والی نسلیں میرے اوپر تھوکیں
گی اور میرے اوپر لعنت بھیجیں گی۔"

شردا خاموش ہو جانے کے علاوہ کر بھی کیا سکتی تھی۔
چند روز بعد سارگی گرفتار کر لیا گیا۔ اس کے اوپر
متعدد قسم کے الزامات عائد کر کے مقدمہ قائم کر دیا
چند ہی پیشیوں میں ملک کا خطرناک دشمن قرار دے
کر اسے پھانسی کی سزا دے دی گئی۔ اس نے ہائی کورٹ
اور پھر سپریم کورٹ میں اپیل کی مگر ناکامی کے سوا کچھ ہاتھ
نہیں آیا۔ [illegible] گھنٹوں کے بعد اسے پھانسی پر لٹکا دیئے
کے احکامات جاری ہو گئے۔ [illegible] آخری بار اس سے
ملنے جیل پہنچی [illegible] سارگی زنجیروں میں جکڑا

شرودا کے پاس آیا۔ شرودا کی آنکھوں میں آنسو تھے۔
اس کی زبان خاموش تھی مگر لب تھرتھرا رہے تھے۔ سارگی قہقہہ
مار کر ہنسا اور بولا۔ ارے اداس کیوں ہو؟ میں اپنے ان
زیورات میں تم کو خوب رونق [illegible] دکھائی دے رہا ہوں؟
شرودا نے دونوں ہاتھوں سے [illegible] منہ چھپا لیا اور
پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

پورے علاقہ میں زبردست سناٹا تھا۔ خدشہ تھا کہ
سارگی کی موت کے بعد تنظیم کی تخریبی کارروائیاں شدت
اختیار کر لیں گی۔ انہیں قائم رکھنے کے لئے سخت
تدابیر اختیار کر لی گئی تھیں۔ علاقے سے باہر جانے اور اندر
آنے پر پابندی لگا دی گئی تھی۔

گھڑی کی سوئیاں ٹک ٹک کرکے آگے بڑھتی رہیں۔
حتیٰ کہ سارگی کی زندگی کے صرف آٹھ گھنٹے باقی رہ گئے۔
وہ جیل کی تنگ و تاریک [illegible] تھا کہ
تنظیم کی قربانیاں ایک دن ضرور رنگ لائیں گی [illegible]
صبح ضرور [illegible] آئے گی جو خوشیوں اور شادمانیوں سے
روشن ہوگی اور وہ روشنی ہر دہلیز کو پار کرے گی، ہر چہار
دیواری سے گزرے گی اور عوام کی نس نس میں رچ جائے گی۔

وہ سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک ایک کھٹکا ہوا۔ سارگی
نے گردن اٹھا کر دیکھا۔ جیل سپرنٹنڈنٹ اس کے سر پر
کھڑا تھا۔ سارگی نے پوچھا "کیا [illegible] پھانسی
[illegible]

[illegible] میرے ساتھ چلو۔" سپرنٹنڈنٹ نے دھیمی
آواز میں کہا۔

"کہاں؟" سارگی نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف [illegible]

[illegible]

"فضول باتوں سے [illegible] بس تم میرے
ساتھ چلو۔" اس نے سارگی کا کندھا پکڑ کر [illegible]
انداز میں [illegible]

[illegible] صاحب [illegible] اس کو
اپنے کوارٹر میں [illegible] سارگی [illegible]
[illegible]

ایک جوان لڑکی بستر پر پڑی تھی۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی
سپرنٹنڈنٹ نے اپنی کیپ اتار کر سارگی کے قدموں میں
[illegible] اس کے پاؤں پکڑ کر گڑگڑایا۔

"میری اکلوتی بیٹی کے پیٹ میں السر ہے۔ اس علاقہ میں
کوئی ایسا ڈاکٹر نہیں [illegible] جو اس کا آپریشن کر سکے۔ باہر کا
ڈاکٹر خوف کے [illegible] اور پھر پابندی لگی ہونے کی وجہ
سے یہاں آنے کو تیار نہیں۔ مرض اتنا بڑھ گیا ہے کہ میں
اس کو باہر کہیں لے جا بھی نہیں سکتا۔ میں نے کل ہی آپریشن
کا سب سامان منگوا لیا ہے۔ تم میری بیٹی کا آپریشن
کر دو۔ میں زندگی بھر تمہارا احسان نہیں بھولوں گا۔"

سارگی نے دل میں سوچا کہ اپنی زندگی ختم ہونے سے
پہلے ایک زندگی کو ختم ہونے سے بچا ہی لے۔

چنانچہ دو گھنٹے کی سخت محنت کے بعد سارگی
اس لڑکی کو [illegible]
[illegible] اس نے سارگی کو بہت دعائیں
دیں۔ سارگی مسکرا کر بولا۔ "چند گھنٹوں کی زندگی کے لئے
میں ان دعاؤں کا کیا فائدہ اٹھا سکتا ہوں؟"

سپرنٹنڈنٹ اس کو پھر [illegible] کوٹھری میں چھوڑنے آیا مگر اندر
داخل ہونے سے قبل ایک دھماکہ ہوا۔ سارگی چیخ مار کر گر پڑا اور
زمین پر لوٹنے لگا۔ سپرنٹنڈنٹ اس کے پاس بیٹھ کر بولا۔
"مجھے معاف [illegible] جو احسان کیا ہے
اس کے صلہ میں میں نے تم کو [illegible]
سے بچا لیا۔ میں نے تم کو عزت کی موت [illegible]
موت سب کو [illegible] کہ تم مجھے معاف
کر دو گے۔"

سارگی کے ساکت [illegible]
پیدا ہوئی [illegible] نیم وا آنکھوں نے بمشکل تمام
[illegible] کی طرف دیکھا اور نہایت ہی مدھم آواز میں
بولا: "اس موت کا بہت بہت شکریہ! آنے والی
موت کا [illegible]
[illegible]
[illegible] دل سے معاف کیا [illegible]

نئی کتابوں کا تعارف

تبصرہ کے لئے ہر کتاب کی دو جلد کا آنا ضروری ہے۔ (مدیر)

کتاب کا نام: جاڑے کی دھوپ
مصنف: آسی رام نگری
ناشر: فروغِ ادب، مغل سرائے، وارانسی
قیمت: ۲۵ روپے
مبصر: اصغر علی انجینئر

آسی رام نگری افسانہ نگار کی حیثیت سے زیادہ مشہور [illegible] کم لوگ ہی اس بات سے واقف ہیں کہ وہ ایک خوش گو [illegible] مشق شاعر بھی ہیں۔ "جاڑے کی دھوپ" آسی صاحب کا [illegible] مجموعہ کلام ہے جو ۱۹۸۴ء میں چھپا ہے۔

اچھی شاعری بھی مشکل کام ہے۔ عظیم شاعری تو چند [illegible] ہی کے حصے میں آتی ہے۔ اچھی شاعری کے فنی پہلو بھی [illegible] فکری بھی۔ دونوں کا بدل امتزاج بہت ضروری ہے۔ [illegible] بیان، ندرتِ فکر، تخیل اور پیکر تراشی فنی لوازمات [illegible] سے ہیں اور فکر کی گہرائی اور گیرائی، نفسیاتی شعور، [illegible] احساس کے ساتھ مسائل کا مطالعہ [illegible] [illegible] کا صحیح تناظر میں علم وغیرہ فکری عناصر ہیں۔ [illegible] بڑی مشکل سے پیدا ہوتے ہیں جن کا شمار اکثر [illegible] [illegible] ہوتا ہے۔ وہ بھی مشکل سے [illegible] [illegible] کلام میں بیٹھ کر پاتے ہیں [illegible] [illegible] اور [illegible] کی بلندی سے [illegible] [illegible] کو حسن [illegible] [illegible] [illegible] نہ [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] اور [illegible] [illegible] والی حرکت [illegible]

مسائل پیدا کرتی ہے۔ اچھی اور پختہ شاعری کے لئے صحیح سیاسی اور سماجی شعور بے حد ضروری ہو جاتا ہے اس لئے نہیں کہ شاعر کے لئے فعال (ACTIVIST) ہونا ضروری ہے۔ قطعاً نہیں نہ ہی اسے کسی جماعت یا پروگرام سے وابستہ ہونا لازمی ہے، یہ بھی نہیں لیکن ان مسائل کا عرفان اس لئے ضروری ہے کہ اس کے بغیر وہ ان مسائل سے پیدا ہونے والے داخلی احساسات کو نہیں سمجھ سکتا۔

اس کی مثال میں آسی صاحب کی ایک نظم "گاؤں" (ص ۶۹) سے دینا چاہوں گا۔ آسی صاحب نے اس نظم میں گاؤں کا ایک رومانی نظر نامہ پیش کر دیا ہے۔ اس میں آج کے گاؤں کی حقیقت کہیں بھی جھلکتی نظر نہیں آتی۔ زبان و بیان کے اعتبار سے نظم بے شک اچھی ہے لیکن جدید ہندوستان کے سماجی حقائق کی کسوٹی پر یہ کہیں پوری اترتی نظر نہیں آتی۔ آج کا دیہات نہ میل کچیلے سے خالی ہے نہ ہی سیاسی کشمکش سے۔ ان دیہاتوں میں ہریجنوں کا قتل عام کیا جاتا ہے اور پچھڑی ذاتوں کی [illegible] ہیں۔ گاؤں کی اکثر جھونپڑیاں نہ فلاکت میں [illegible] کی پڑی ہیں۔ ان میں سے اکثر رات دن خون پسینہ بہا کر بھی اطمینان کا سانس نہیں لے سکتیں۔ وہ [illegible] ذات کے افراد کی غلامی بھی کرتی ہیں اور ان کی ہوس کا نشانہ بھی بنتی ہیں۔ اس ہوس اور ان مظالم کی شکار دوشیزائیں۔۔۔ جو کیفیتیں گزرتی ہوں گی اس کی عکاسی [illegible] حقیقت سے آنکھیں چرانا ہے۔ اصلی کا دیہات [illegible] [illegible] جدید ہندوستان کا دیہات [illegible]

(بقیہ صفحہ [illegible])

شہرِ خیال

(قارئین - خطوط)

میرے مضمون "اقبال ہو، اقبال ہو کے علمبردار کے نام" میں ذیل تصحیح قارئین کرام نوٹ فرمالیں۔ (سہیل بابت مئی ۵ صفحہ

غلط :-	صحیح :-
ورف	صرف
ودیعقفا	ید بہ قفا
چہ گمنت چہ شنیدی۔۔۔	چہ گفتمت چہ شنیدی۔۔
جن کا واشگاف باستدلال	جن کا واشگاف و باستدلال
میں نے	جواب میں نے
درج ذیل خط میں لفظ شوقیانہ	مدح فوق خط میں۔۔۔۔

سہوہائے کتابت کے لئے قارئین کرام سے معذرت خواہ ۔ مزید براں یہاں یہ بھی عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ اقبال خیال کے اعتبار سے بنایت غیر مقلد تھے ؛ ملاحظہ ہوے

کھلے جاتے ہیں اسرارِ نہانی
گیا دورِ حدیث لن ترانی
خودی جس کی چوٹی پہلے نمودار
وہی مہدی وہی آخر زمانی

(بالِ جبریل)

یہ تنقید ہوتی ہے ، تعمیری یا تخریبی نہیں ہوتی۔

تارا چرن رستوگی۔ گورکھپور

پسندیدگی کی نظر سے دیکھا جاتا ہے کیوں کہ یہ ایک ایسا ثبت طرزِ عمل ہے جس سے ایک طرف ادب میں اجارہ داری کی جڑیں کٹتی ہیں تو دوسری جانب نئے خون کی آمیزش سے چمن اُردو کی آبیاری میں مدد ملتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو زبان و ادب کو فروغ کیسے حاصل ہوگا !

پہلے کسی مضمون سے متعلق ڈاکٹر مغنی صاحب کے اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے عظیم فیروز آبادی نے نہایت مناسب اور سلجھے ہوئے انداز میں معقول باتیں کہی ہیں۔ ۔ میں اپنے کو ان سے متفق پاتا ہوں۔ بہر حال موضوع کی اہمیت کے پیش نظر ضرورت اس بات کی ہے کہ ماہرین اقبالیات اس پر خاطر خواہ توجہ دیں اور اظہارِ خیال کی زحمت گوارا فرمائیں۔

مجروح سلطان پوری کی شخصیت اور شاعری سے متعلق ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کا مضمون ایک سرسری جائزہ ہے۔ پھر بھی کافی دلچسپ اور معلومات افزا ہے۔

نظمیں "پانیوں کی تحریر" اور "اندھیروں کے قیدی" خاص طور سے پسند آئیں۔ غزلیں سبھی اچھی ہیں اور انفرادی عکس و رنگ لئے ہوئے ہیں۔ خاص طور سے ڈاکٹر رستوگی، جناب سجاد راہی، مشتاق جاوید اور عقیل گیاوی کے اشعار بہت متاثر کن ہیں۔ اس کے علاوہ تبسم فاطمہ کا افسانہ "حصار شب کا طلسم" جو تیرہ انداز فکر کی ایک صحت مند علامت ہے، پسند آیا۔ شہر خیال میں جناب حسن نجمی سکندر پوری کے مراسلے پر نظر پڑی۔ جب وہ کاشی نگری میں رہتے تھے تو آئے دن ملاقاتیں ہوتی تھیں اب دلی والوں میں شامل ہیں تو ہم ان سے دور ہو گئے۔ اگر کبھی خط لکھنے کا اتفاق ہو تو میرا سلام پہنچا دیں۔

جنید حزیں لاری (بنارس)

ایک طویل مدت کے بعد سہیل کا تازہ شمارہ بابت ۔۔۔ موصول ہوا۔ زیر نظر شمارہ اپنے مشمولات کے اعتبار سے جاذب نظر اور جاندار ہے۔ معروف قلمکاروں کی نگارشات کے علاوہ نئے لکھنے والوں کی تخلیقات سے مزین یہ شمارہ ۔۔۔ کا ثبوت ہے۔ فراخ دلی کے ساتھ نئے قلمکاروں کو ۔۔۔ سہیل واقعتاً خاص ہے جسے ادبی حلقوں میں ۔۔۔ ہے۔

سہیل اپریل اور مئی کا شمارہ نظر نواز ہوا۔ مندرجات اہم اور معیاری ہیں۔ سہیل کا ہر شمارہ بلندی کی طرف گامزن ہے ۔

۔۔۔ بہر و شوق وابستگی در راہ نیست
کاروان شوق کے ساتھ ہم بھی ہیں۔ ہمارا قافلہ آپ کے ساتھ ہے۔

نسیم ابن آسی اعظمی ۔۔۔

[illegible] ہے ہر طرف سے بلکہ قرۃ العین [illegible] قابلِ تعریف ہیں صرف ایک خامی ہے کہ کتابت [illegible] ہیں۔ میری غزل کے مطلع میں "[illegible]" کی جگہ "[illegible]" اور اسی غزل کے چھٹے شعر میں "[illegible]" کی جگہ "[illegible]" چھپ گیا ہے۔ اگر آپ تھوڑا سا دھیان ادھر بھی دے دیں تو یہ خامیاں بھی دور ہو سکتی ہیں۔ اس کے علاوہ [illegible] ہندوستان میں اردو کے بہت سے رسالے ہیں مگر چند رسالے ہی ایسے ہیں جو معیاری کہے جا سکتے ہیں۔ یہ بات میں دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ سہیل انہیں میں سے ایک رہے گا۔

ملک زادہ جاوید احمد (لکھنؤ)

آج [illegible] ایک دوست کے ذریعہ ماہنامہ "سہیل" کا [illegible] کا شمارہ دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ اتنی کم قیمت میں اتنا خوبصورت اور معیاری رسالہ واقعی آپ کی دیانت داری کا ثبوت ہے۔ یوں تو سبھی نظم و نثر کافی معیاری ہیں مگر جناب ڈاکٹر اشفاق عجیل مظہری کی غزل نے کافی متاثر کیا۔ انہوں نے زیرِ نظر غزل میں آج کے ماحول کی بھرپور عکاسی کی ہے۔ خاص طور سے یہ دو شعر بے حد پسند آئے

جو بظاہر مرا ہمدرد نظر آتا ہے
میں اسے خوب سمجھتا ہوں مگر کیسے کہوں
اجنبی جس طرح ٹھہرے ہوں کسی ہوٹل میں
ایسا ماحول جہاں ہو اسے گھر کیسے کہوں

محمد شعیب۔ [illegible]۔ فیض آباد (یوپی)

کرمی جمیل صاحب! آداب۔ مارچ کا شمارہ ملا۔ فضا ابن فیضی کی غزل اور کرنیوں پر نظم دونوں بہت خوب ہیں۔ آپ نے یہ اچھا سلسلہ شروع کیا ہے کہ ہر شمارے میں کسی شاعر یا ادیب پر مضمون ہوں لیکن شمارہ [illegible] میں علامہ جمیل مظہری کی شاعری پر تینوں مقالوں سے مایوسی ہوئی۔ ناظر نقوی صاحب تو یہ کہہ کر دامن چھڑا لیتے ہیں کہ علامہ تمام اصنافِ سخن پر قادر تھے کہ [illegible] علامہ [illegible] یگانہ روزگار

ملے اور اسلوب میں ادب کے تاجدار تھی عہد ساز شخصیت لیکن یہ کوئی نہیں بتاتے کہ موصوف ادب میں کس اعتبار سے یاد کئے جائیں گے۔ سید اختر الاسلام صاحب نے ان کی منزہ [illegible] کا اچھا تجزیہ کیا ہے لیکن وہ بھی انہیں دبستانِ غالب آخری نمائندہ شاعر کہہ کر خاموش ہو جاتے ہیں یعنی علامہ جمیل مظہری کا اپنا کچھ نہیں۔ عظیم امروہی صاحب کا مضمون بعنوان جمیل میں عصری آگہی بہت اچھا ہے مگر وہ یہ بتانے سے گریز کرتے ہیں کہ مرثیے کا عصری آگہی سے کیا تعلق ہے؟

"اس بحث" پر جناب ڈاکٹر علیم اللہ صاحب حالی کا ہاتھ بھی تنقید سے گزرا۔ میں انہیں یقین دلاتا ہوں کہ میں ان سے بالکل متفق ہوں کہ شاعر کا فن کار کی ذات سے باہر نکل کر جس قدر دوسروں کی کہانی بننے کی صلاحیت رکھتی ہے وہ اسی قدر کامیاب ہوتی ہے۔ البتہ یہ ضروری ہے کہ ترجمہ پڑھنے کے بعد دل میں یہ شک گھر کر گیا کہ شاید یہ خوبی میرے کلام میں نہیں ہے۔ دعا کیجئے کہ یہ شک دور ہو جائے۔

سراج حیدر (دہلی)

مزاجِ گرامی!

سہیل کا تازہ شمارہ (مئی ۱۹۸۵ء) نظر نواز ہوا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جدید ادب کا علمبردار ہے اور روایت پرستوں سے نبرد آزما ہے۔ اس کی ایک ایک سطر ذہن میں محفوظ کرنے اور آنکھوں سے لگانے کے لائق ہے۔ اس زمانے میں اردو کا رسالہ (ادبی) نکالنا جوئے شیر لانے سے زیادہ مشکل کام ہے۔ اللہ اسے عمر خضر عطا فرمائے۔

اختر شاہجہاں پوری

ایڈیٹر، پبلشر، پرنٹر [illegible] نے [illegible] پریس [illegible] سے چھپوا کر دفتر ماہنامہ سہیل [illegible] سے شائع کیا۔ (ادارہ)

عائشہ علوی کا ایک کھلا خط

جمیل منظر سنہاروی کے نام

محترم جمیل صاحب! سلام و نیاز

آج مورخہ ۹ مئی کو بڑی تاخیر کے بعد سہیل کے شمارے ملے۔ میں آپ کی مشکور ہوں کہ آپ نے مجھ ناچیز کو سہیل کے صفحات پر جگہ دیکر حوصلہ افزائی فرمائی اور پھر یاد بھی رکھا۔

فہرست مضامین اور "نمود" کے تحت آپکے خیالات ہی نظروں سے گذرے تھے کہ مجھے مجبوراً قلم اٹھانا پڑا۔ میں اپریل کے شمارے کی بات کر رہی ہوں اور کچھ بھی کہنے سے پیشتر معذرت خواہ ہوں کیوں کہ میرا یہ خط آپ کے عقائد و نظریات [illegible] ہو۔ بہر حال میں آپ کی توجہ چاہوں گی ماہ اپریل کے شمارے میں نمود کے تحت نقل کئے گئے "اصلاح الدین اویسی صاحب" کے [illegible] جس میں موصوف نے اسلامیات کو اپنی لاعلمی کا شکار بنا کر کم از کم مجھ جیسے بہت سے افراد کو زبان کھولنے پر مجبور کر دیا [illegible] عبارت سے یہ مقصد اسلامیات میں اپنی قابلیت اور علمیت کا اظہار کرنا نہیں ہے بلکہ اسلام کے [illegible] اسلامی معاشرے کی تشکیل کی گئی ہے" اللہ کو انکار کرتا ہے۔ میں اویسی صاحب سے پوچھنا چاہتی ہوں کہ کیا وہ [illegible] معاشرے میں عورت پر کس طور پر ظلم ہو رہا ہے؟ ——— جہاں تک طلاق کا معاملہ ہے تو کیا [illegible] عورت یہ مرد کو حق طلاق کے استعمال کی اجازت دیتا ہے؟ اگر اویسی صاحب یہ سب جانتے ہوتے تو [illegible] معاشرے میں [illegible] اسلام نے انسانیت کے لئے جو بہترین اصول و ضوابط دئیے ہیں ۱۴۰۰ سال پہلے [illegible] مسلمان [illegible] و ضابطوں کو اپنا کر سفر زندگی طے کرتے تو آج یہ نوبت نہ آتی کہ ایک ایسا شخص کہ جو خود کو [illegible] فرد [illegible] [illegible] اسلام جیسے عظیم اور دیگر تمام مذاہب سے بالاتر دین کے لئے ہرگز [illegible]

[illegible] اسلام سے قبل اس کی [illegible] بیٹیوں کو زندہ دفن کر دیا کرتے تھے۔ [illegible] ہے۔ انسانیت کی [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]

> میں اویسی صاحب سے پوچھنا چاہتی ہوں کہ کیا وہ بتا سکتے کہ اسلامی معاشرہ میں عورت پر کس طور پر ظلم ہو رہا ہے!

[illegible] اپنی [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] اسلام کے بعد [illegible] [illegible] حقوق [illegible] [illegible] ان کے قدم [illegible] [illegible] نیک اور صالح لڑکیاں حاصل ہو جائے۔ [illegible]

گیا کیوں کہ بحیثیت شوہر مرد کو عورت کا محافظ، نگہبان، کفیل و مربی، ہمدرد و غم گسار بنایا گیا۔ گویا عورت کو شوہر کی پناہ میں دے کے مکمل طور پر محفوظ کر دیا گیا۔ اگر عورت کو حکم دیا کہ وہ مرد کی اطاعت، فرمانبرداری، دلجوئی کا سامان فراہم کرے تو وہیں مرد سے بھی کہا گیا کہ وہ عورت کے تعلق سے تمام حقوق و فرائض کو خوش اسلوبی سے ادا کرے۔ اس کی جائز ضروریات کو پورا کرے۔ اہم معاملات میں مشورہ طلب کرے نیز ہر وہ بات کہ جس سے کسی طور بھی عورت کو اذیت پہونچے اس سے اجتناب کرے بلکہ کبھی بھول کر بھی ایسا فعل نہ کرے کہ جو بحیثیت بیوی عورت کی دل شکنی کا سبب بنے۔ چنانچہ طلاق کے سلسلے میں بھی جو اہم بات قابل غور و فکر ہے وہ یہ کہ عورت کو کس صورت میں طلاق دینی چاہیئے! اس صورت میں کبھی نہیں کہ وہ حسب خوبصورت و حسین نہ ہو! یا وہ زر و جواہر والی نہ ہو۔ یا وہ غیر تعلیم یافتہ ہو، یا پھر زبان درازی، بدسلیقگی، آرام طلبی، فضول خرچی جیسی بیشمار فطری کمزوریوں کو طلاق کا موجب کبھی نہیں بنایا جا سکتا، جیسا کہ آجکل ہوتا ہے۔ بلکہ اسلام نے اسی صورت میں طلاق دینے کی اجازت دی ہے کہ جب مرد اپنی تمام فرائض کو بخوبی ادا کرتا ہے بحیثیت شوہر عورت کی تمام تر ضروریات و خواہشات کا احترام بھی کرتا ہے لیکن عورت پھر بھی اس کے حکم سے باہر ہے۔ وہ حد سے زیادہ بدکردار و بدچلن ہے، جہاں تک کہ اس کی بدچلنی ثابت ہو جائے اور اس کی بدچلنی انتہائی درجے کو پہنچ جائے کہ جہاں سے اس کی واپسی ناممکن ہو جائے اور باوجود ہزار کوشش کے امید نہ ہو کہ وہ راہ راست پر آ جائیگی تب مجبوری یا مایوسی کی حالت میں عورت کا جرم ثابت ہو جانے کے بعد مرد کو اختیار ہے کہ وہ ایسی عورت کو آزاد کر دے کہ جس کو شریعت کے علاوہ معاشرہ بھی مجرم قرار دے چکا ہے۔ یہاں بھی عورت کے گنہگار ہونے کے باوجود اتنی نرمی و مہربانی کی گئی کہ مدت طلاق یعنی چار ماہ سے زیادہ عرصے تک اسے نان و نفقہ کا حقدار بنایا گیا۔ اب آپ ہی سوچئے کہ ظلم کا کوئی شائبہ بھی یہاں باقی رہ گیا؟ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ آج جہالت

کم علمی کے سبب اسلامی معاشرے کو برا کہتے ہیں ح
مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہم کبھی اپنا سر بے
جھکانا پسند نہیں کرتے۔ حرام و حلال میں فرق نہ
کرتے، رشوت، چور بازاری، جھوٹ، ذخیرہ اند
چغلی و بدکاری سے پرہیز نہیں کرتے۔ ہاں خود کو کر
کہلوانا چاہتے ہیں۔

بحث بے حد طویل ہو گئی ہے آپ کو کتنی گراں گذ
مشکل ہے۔ شاید آپ اس خط کو سہیل میں جگہ نہ
پھر بھی میں چاہوں گی کہ کسی طور آپ کی رائے سے
مطلع کریں۔ آخر میں تمام علمائے اسلام سے درخوا
کہ اگر مذکورہ وجہ کو چھوڑ کر مرد کسی بھی دوسری و
چھوڑ کر مرد کسی بھی دوسری وجہ کو طلاق کا موجب بنا لے
ان کو چاہیئے کہ تمام عمر عورت کو نان و نفقہ دیں اور و
کے حق میں فتویٰ جاری فرمائیں۔ اس میں کوئی مضائقہ نہ

بہار کے بڑھتے قدم

بہار کی موجودہ حکومت نے ۱۲ مارچ ۱۹۸۵ء کو اقتدار کی باگ ڈور سنبھالا۔ شری بندیشوری دوبے کی وزارت اعلیٰ اور نوجوان وزیر اعظم شری راجیو گاندھی کی قابل تقلید اور ترقی یافتہ قیادت میں یہ حکومت کام کرنے میں مصروف ہوئی۔ ریاست کی ہمہ جہت اور تیز رفتار ترقی کے لئے ضروری اصول تیار کرنے کے پیش نظر شروع ہی میں ترجیحات کی فہرست تیار کرلی گئی ہے اس کا خاص مقصد یہ تھا کہ ریاست کے ہر حصہ کو ترقیاتی کاموں کے بارآور نتائج جلد از جلد مہیا کرائے جاسکیں۔ ساتویں پنجسالہ منصوبہ کی مدت کے لئے ریاست کو ۵۱۰۰ کروڑ روپے کی رقم مختص کی گئی ہے جب کہ چھٹے پنج سالہ منصوبہ کے لئے محض ۳۲۲۵ کروڑ روپے کی منظوری مل سکی تھی۔ ۸۶-۱۹۸۵ء کے موجودہ مالی سال کے لئے ۱۰۵۸ کروڑ روپے کی منظوری ملی ہے۔ سب سے پیچیدہ سوال رہا نظم و نسق کا جسے ترجیحات کی فہرست میں سب سے اوپر رکھا گیا۔ فہرست میں دوسری جگہ ملی بجلی، آبپاشی، صنعت، انتظامی مشینری کو مستحکم کرنے اور اقتصادی نقطہ نظر سے کمزور لوگوں کو اوپر اٹھانے کے لئے کام کو۔ نظم و نسق: تقریباً پانچ مہینے کی مدت میں نظم و نسق کی صورت حال میں سدھار نظر آنے لگا۔ جرائم پر قابو پانے سے متعلق اعداد و شمار اور مونگیر، رہتاس، چمپارن وغیرہ اضلاع کے بارے میں سرکاری اور غیر سرکاری ذرائع سے موصول اطلاعات اور جائزے سے اس حقیقت کی تصدیق ہوتی ہے۔ مغربی چمپارن کے "بلیک پینتھر" مہم کا اچھا نتیجہ برآمد ہوا۔ اس کی وجہ سے روہتاس کے ڈاکو میدان چھوڑ گئے ہیں۔ یہی حال دھنباد، جھریا اور کول والے علاقوں کے مافیا گروہ کا بھی ہے۔ دہشت گردوں سے نمٹنے کے لئے خصوصی مہم چلائی گئی ہے جو نظم و نسق کے علاوہ سماجی اقتصادی [illegible] کا بھی مسئلہ ہے۔ ریل گاڑیوں میں ہونے والی ڈکیتیوں کی روک تھام اور خاتمہ کے لئے خصوصی مہم چلائی گئی ہے۔ بجلی: ۸۶-۱۹۸۵ء میں ۳۰۰۰ گاؤں اور ۳۰۰۰ ہریجن بستیوں کو بجلی کی لائن دینے اور ۲۰۰۰۵ [illegible] ٹیوب ویل کو بجلی دینے کا نشانہ رکھا گیا ہے۔ مظفرپور ضلع کے کانٹی پاور پلانٹ کی ۱۱۰ میگاواٹ صلاحیت والی پہلی یونٹ اور برونی پاور پلانٹ کی ۱۱۰ میگاواٹ صلاحیت والی دوسری یونٹ اس سال کمرشیل صنعت کے لئے چالو ہو جائے گی۔ ۸۶-۱۹۸۵ء میں ٹرانسمیشن لائن کا کام پورا ہو جائیگا۔ [illegible] سنٹرل ہائیڈرو پاور پروجیکٹ اور فرخہ کے سوپر پاور پلانٹ سے بھی ریاست کو بجلی سپلائی ہونے لگے گی۔ ریاستی حکومت نے کوئیل کاروتیہ جبلی پن بجلی کا کام شروع کرنے کے لئے پختہ ارادہ کر رکھا ہے۔ ۸۶-۱۹۸۵ء کے اپریل جون کی مدت میں ۳۵ ڈسٹری بیوشن ٹرانسفارمر بدلے گئے جب کہ گذشتہ سال اسی مدت میں ۲۰۶ ٹرانسفارمر بدلے گئے تھے۔ اس سال ۸۶-۸۵ء میں کل ۳۰۰۰ ٹرانسفارمر بدلنے کا نشانہ ہے۔ ساتھ ہی دس ہزار کلومیٹر لمبا [illegible] غائب ہوئے کنڈکٹر [illegible] لگائے گئے ہیں۔ صنعت: صنعتی شعبہ میں ریاست کی ترقی کے لئے جہاں ایک طرف بیمار ملوں کو ایک بار پھر سے زندہ کیا جارہا ہے وہیں دوسری طرف زیادہ سے زیادہ تعداد میں صنعتی یونٹیں کھڑی کی جارہی ہیں۔ بیمار ملوں کو پھر سے چالو کرنے کے لئے ٹھوس قدم اٹھائے جارہے ہیں۔ پچھلے مالی سال میں صنعتی ترقی کی مد میں جہاں محض ۲۸ کروڑ روپیہ کی خرچ ہونے والی رقم کا انتظام کیا گیا ہے وہیں اس سال ۴۱ کروڑ روپے کا نظم کیا گیا ہے۔ [illegible] روزگار پروگرام کے تحت اس سال ۲۹۶۰۰ تعلیم یافتہ بے روزگاروں کو بینک سے قرض دلانے کی سہولت کا نشانہ رکھا گیا ہے۔ پچھلے سال صرف ۵۰۰۰ [illegible] افراد کو مذکورہ سہولت دینے کا نشانہ رکھا گیا تھا۔ [illegible] ۳۳ صنعتی یونٹ [illegible] سپرد کی جاچکی ہیں۔ آبپاشی: ۸۶-۱۹۸۵ء میں ایک لاکھ ہیکٹیئر [illegible] آبپاشی کی صلاحیت فراہم ہو جائے گی۔ [illegible] مقررہ نشانہ کو حاصل کرنے کے لئے بڑے زور و شور سے کام [illegible]

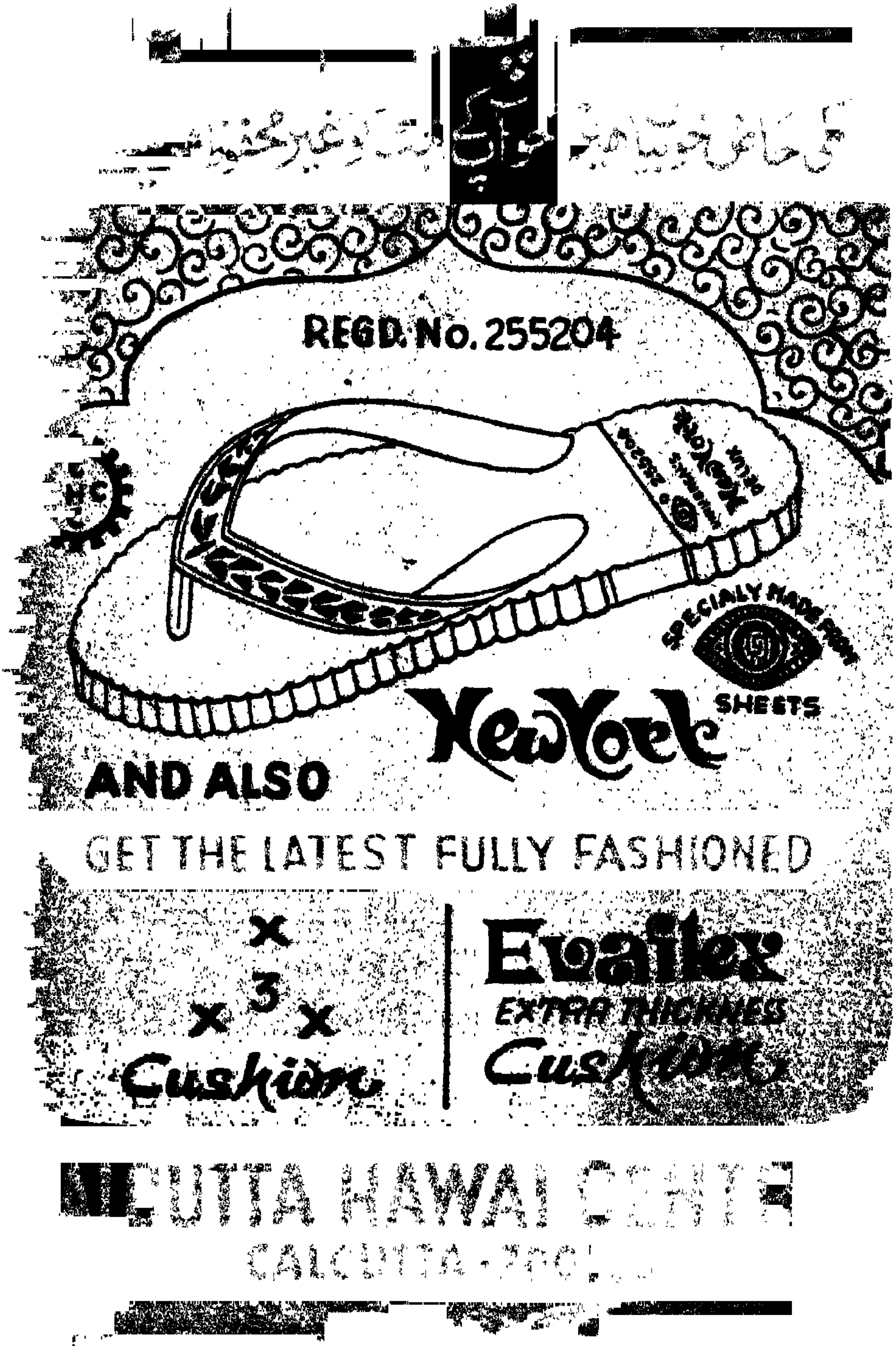
ویں منصوبہ میں چھوٹے آب پاشی منصوبے کے تحت ۱۱٫۲ لاکھ ہیکٹر زمین میں اضافی آبپاشی کی سہولت فراہم کرنے کا نشانہ ہے۔ اس اسکیم کی اہم ترین اسکیمیں ہیں:

۱۔ سون جدید کاری اسکیم، جس کے لئے ساتویں پنچسالہ اسکیم میں کل ۲ کروڑ روپئے اور پہلے برس ۸۶-۱۹۸۵ء کے لئے ۳۰ لاکھ روپئے کا نشانہ ہے۔

۲۔ شمالی کوئل اسکیم، جو ۱۹۸۸ء تک مکمل ہو جائے گی۔ اور

۳۔ سوبرن ریکھا اسکیم۔ سون منصوبہ کے مکمل ہو جانے پر کل ۹٫۶ لاکھ ہیکٹر زمین کی آبپاشی ہو سکے گی جبکہ عام طور پر اس سے ۵٫۸۶ لاکھ ہیکٹر زمین کی آبپاشی ہوئی ہے۔ عوامی کام: رواں مالی برس ایک ہزار یا اس سے زیادہ آبادی والے ۴۵۵ گاؤں کو پکی سڑکوں سے جوڑا جائے گا۔ دیہی علاقوں میں .. کیلومیٹر لمبی سڑکوں کی تعمیر کا مقررہ نشانہ ہے۔ مربوط دیہی ترقیاتی پروگرام: رواں سال کے لئے مقررہ ۶۶٫۵۰۱٫۱۴ خاندانوں میں سے جون ۱۹۸۵ء تک ۲۳٬۶۲ خاندانوں کو فائدہ ہوا ہے۔ فاضل اراضی کی تقسیم: ۸۶-۱۹۸۵ء کے لئے مقررہ ۲۰٬۰۰۰ ایکڑ فاضل اراضی میں سے جون ۸۵ء تک [illegible] ایکڑ اراضی زمین بے زمین افراد کے بیچ تقسیم کی جا چکی ہے۔ دیہی علاقوں میں مکان کے لئے جگہ کی تقسیم: ۱۹ ہزار مقررہ نشانہ تھا لیکن اس کے برخلاف جون ۱۹۸۵ء تک ۲٬۷۲۶ مکان بنانے کے لئے جگہ تقسیم کیا جا چکا ہے۔ سیڈول کاسٹ اور سیڈول ٹرائبس کی فلاح: سیڈول کاسٹ اور سیڈول ٹرائبس کے لئے ۸۶-۱۹۸۵ء کے مقررہ نشانہ کے بالترتیب ۲٬۰۰ ،۳۰۰ اور ۱٬۲۵٬۴۷۰ خاندانوں کے لئے ۴٬۷۶۹ سیڈول کاسٹ کے خاندانوں اور ۸٫۴۹ ،۷ سیڈول ٹرائبس کے خاندانوں کو جون تک غریبی کی سطح کو عبور کرنے کے لئے اقتصادی امداد دی گئی ہے۔ سیڈول کاسٹ اور سیڈول ٹرائبس کے طلبا کو وظیفہ: اس برس سیڈول کاسٹ کے ۲٫۴ لاکھ طلبا کو ۴٫۳۹۰ [illegible] لاکھ اور سیڈول ٹرائبس کے ۲٫۱۱ لاکھ طلبا کو ۲۶٫۶۲٫۶۳ لاکھ روپے کی رقم بطور وظیفہ کے دی جا چکی ہے۔ جبکہ ۷۱ ہزار طلبا کو بھی بطور وظیفہ کے کل ۱۵٫۴۸٫۲ لاکھ روپے دئے جائیں گے۔ شجر کاری اور بائیو گیس پلانٹ: شجرکاری اور سماجی ترقی کے لئے ایک اہم منصوبہ بنایا گیا ہے۔ دیہی بے زمین روزگار گارنٹی پروگرام کے تحت شجر کاری کا ایک دیہی پروگرام بنایا گیا ہے۔ اس سال ۱۲٫۵ کروڑ درخت لگائے جائیں گے۔ گیس کے ۱۰۰۰ پلانٹ بھی اس سال لگائے جائیں گے۔

IRRD-110D (INF-101) 85-86


REGD. No. 255204
SPECIALY MADE FROM
SHEETS
New York
AND ALSO
GET THE LATEST FULLY FASHIONED
X 3 X
Cushion
Evaflex
EXTRA THICKNES
Cushion

Nothing in Vain

Elena A. Serdiouk

Moscow (U. S. S. R)

Here in India I realize that I live,
That I can take and surprisingly that I can give
I realize there was nothing in vain in my life
Being a sister and being a daughter and wife.

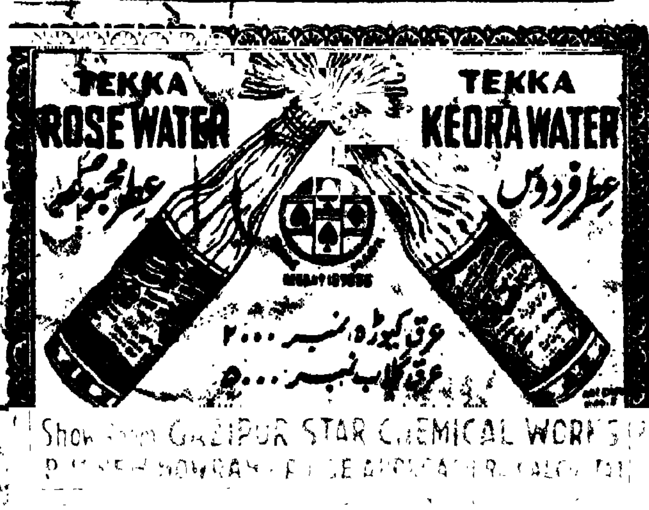
All Music lessons,
All student sessions,
All I could gain
Sanskrit and Spain,
Nothing in vain,
Nothing in vain

Here in India I realize that I can
Feel like a woman and write like a man,
I realize that I everthing can understand
Thanks to my thirty two years I have ardously spent

Opened and coy,
In sorrow and joy,
Labour and strain,
Depression and pain,
Nothing in vain,
Nothing in vain.



مئو کے نورانی تیل کی خاص پہچان
لیبل پر مینوفیکچرنگ لائسنس
نمبر U18/77 ضرور دیکھیں
کیپشول پر مارکہ دیکھیں
اگر لیبل پر مذکورہ لائسنس نمبر نہ
اور این ٹی مارکہ نہ ہو یا دوسرا مارکہ ہو تو
ہرگز نہ خریدیں۔
نورانی تیل
درد، زخم، چوٹ
کی مشہور دوا
انڈین کیمیکل کمپنی، مئوناتھ بھنجن، یوپی



TEKKA
ROSE WATER
TEKKA
KEORA WATER
عطر فردوس
عرق کیوڑہ نمبر ۲۰۰۰



روغن بینظیر
قبل از وقت بالوں کا گرنا
اور سفید ہو جانا، نیز درد سر اور
دماغی کمزوری کیلئے بہترین تیل
ہے، بالوں کی جڑوں کو
مضبوط کرتا ہے اور نئے
بال نکلنے اور بڑھنے لگتے
ہیں، اس کے استعمال سے اچھی اور گہری
نیند آتی ہے اور دماغ کو تر و تازگی بخشتا ہے۔
روغن بینظیر، دیسی جڑی بوٹیوں
سے طبی اصول پر تیار کیا گیا ہے۔
دوا خانہ طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
مٹھائیاں
اور
ٹافیاں
SOHAIL/81

ادسہیل گیا
(نمو)

ترقی پسند ادب کا ترجمان

سہیل

ستمبر و اکتوبر ۱۹۸۵

سرپرست: ادریس سنبھاروی • مجلس مشاورت • جلد نمبر ۴ شمارہ ۹-۱۰
نائب ایڈیٹر: سعید منظر سنبھاروی • ڈاکٹر تارا چرن رستوگی • بدل اشتراک: فی شمارہ ۲ روپے
ایڈیٹر: جمیل منظر سنبھاروی • ڈاکٹر قمر رئیس • زر سالانہ: ۲۴ روپے، لائف ممبری: ۲۵۱ روپے
معاونین: شکیل احمد جمالی، عبدالقیوم ابدالی • اصغر علی انجینیر • خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ: ماہنامہ سہیل، ریور سائیڈ روڈ، گیا
فون نمبر ۲۳۰۱۵

تابندہ اور پائندہ مشعل



ہنا رسہیل گیا
(نمونہ)

کیا اسلام میں اجتہاد کی گنجائش ہے؟

شاہ بانو اور محمد احمد خاں کے سلسلے میں سپریم کورٹ کے فیصلے سے متعلق پہلے بھی لکھ چکا ہوں۔ اس معاملے میں ایک طرف تو پرانے خیال کے اور دقیانوسی لوگ ہیں جن کا کہنا ہے کہ مسلم پرسنل لا ایک طرح سے قرآن پاک اور حدیث پاک کا جز ہے۔ اور اس میں تبدیلی کرنے کا مطلب قرآن اور حدیث میں تبدیلی کرنے کے برابر ہے۔ ــــ دوسری طرف ایسے بھی لوگ ہیں جن کا یہ کہنا ہے کہ مسلم پرسنل لا کوئی ہم اسی سو سال پرانا حضور کے زمانے کا آسمانی کتاب ہے بلکہ انگریزی حکومت میں ۷ اکتوبر ۱۹۳۶ء کو پورے ہندوستانی مسلمانوں پر لاگو کیا گیا ایک قانون ہے۔ یہ بنیادی قانون ہے اس لئے اس میں تبدیلی کی گنجائش ہے۔

اس موضوع پر بحث چلی تو لوگوں نے سمجھا کہ بحث مباحثے کے بعد کوئی اچھی بات نکل کر سامنے آئے گی۔ لیکن پہلے خیال کے لوگوں نے اپنی حمایت میں زیادہ سے زیادہ جواز اور ثبوت پیش کرنے کے بجائے آسان یہی سمجھا کہ اپنے مخالفوں کو کافر قرار دے دیا جائے۔ اور وہ اب ایسا ہی کر رہے ہیں۔ وہ مسلمانوں کو یہ نہیں بتاتے کہ سی۔ آر۔ پی۔ سی کی دھارا ۱۲۵ کیا ہے اور اس میں کس طرح کی عورتوں کے لئے گزارے کی رقم دینے کا انتظام ہے۔ وہ مسلمانوں کو اس بات کی بھی معلومات نہیں دیتے کہ حضور کے اس دنیا سے پردہ کر جانے کے بعد کیا اسلامی قانونوں میں کہیں کوئی تبدیلی کی گئی۔ وہ مسلمانوں کو یہ بھی نہیں بتانا چاہتے کہ ابھی دنیا میں مختلف مسلم ممالک میں جو اسلامی قانون ہے وہ ایک دوسرے سے پوری طرح نہیں ملتے۔ ــــ وہ مسلمانوں کو بتا رہے ہیں تو صرف یہ کہ "اسلام خطرے میں ہے" اور مسلمانوں کے ایمان سے کھیلنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ وہ مسلمانوں کو اس بات کے لئے بھی اکسا رہے ہیں کہ جب اسلام ہی نہیں رہے گا تو وہ زندہ رہ کر کیا کریں گے؟ بعضوں نے سرکار کو یہ بھی دھمکی دی ہے کہ اگر سپریم کورٹ کے فیصلے کو رد نہیں کیا گیا اور سی آر۔ پی۔ سی کی دھارا ۱۲۵ سے مسلمانوں کو الگ نہیں کیا گیا تو وہ تحریک چلائیں گے۔

دوسرے خیال کے لوگوں کا جو پرسنل لا میں ترمیم اور تبدیلی کی وکالت کر رہے ہیں ان کا کہنا ہے کہ مسلم عالموں اور دانشوروں نے جو قرآن اور حدیث کی تفسیر کی ہے اس میں کئی معاملے میں یہ ایک دوسرے سے مختلف رائے رکھتے ہیں۔ سوال اٹھتا ہے کہ کیا اس کے لئے انھیں کافر قرار دیا جاتا ہے اور ایسا کرنا کیا صحیح ہوگا؟

اسلام جو مساوات، رحم دلی اور پڑوسیوں کے گھروں میں بھی چولہا جلے کی فکر کر کے چلنے والا مذہب ہے تو کیا اس کے قانون میں اتنی بھی تبدیلی کی گنجائش نہیں ہے کہ ان طلاق شدہ بے سہارا عورتوں کے لئے جن کے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ طلاق دینے والے مرد کو جو کچھ رقم دینے کے لائق ہے اس سے نان و نفقہ کے نام پر کچھ دینے کے لئے کہا جائے۔

سعودی عربیہ کے شاہ فہد نے بھی کچھ دنوں پہلے کہا تھا کہ دنیا کے تمام مسلم عالموں اور دانشوروں کو جمع ہو کر بدلے ہوئے حالات میں اسلامی قوانین پر غور کرنا چاہیئے۔

سپریم کورٹ کا فیصلہ تو صرف ایک تاکید ہے۔ اگر مسلم معاشرے میں طلاق شدہ لڑکیوں کے درد کو نہیں سمجھا گیا۔ اگر ان کی والدین کی پریشانیوں کا مسلم معاشرہ حصہ دار نہیں بنا تو اس معاشرے کو بکھرنے سے کوئی نہیں بچا سکتا۔ ــــ اسلام میں اجتہاد کی گنجائش ہے۔ اس لئے مسلم عالم اور دانشور اس مسئلے پر سر جوڑ کر بیٹھیں اور کوئی حل تلاش کریں۔ [illegible] مسلم معاشرے کو بکھرنے سے برباد ہونے سے بچایا جا سکے۔

جمیل منظر سنسہاروی

اصغر علی انجینیر۔ بمبئی

قرآن کی روشنی میں

سورۃ العصر

سورۂ عصر قرآن مجید میں بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ ابن کثیر امام شافعی سے روایت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

"سورۂ عصر قرآن کریم کی بہت مختصر سی سورۃ ہے لیکن اہمیت بڑی ہے کہ بقول حضرت امام شافعی اگر لوگ اس سورۃ کو غور و تدبر کے ساتھ پڑھ لیں تو دین و دنیا کی درستی کے لئے کافی ہو جائے":

پہلے ہم اس سورت کے لفظی معنیٰ بیان کریں گے:—

وَالْعَصْرِ ۝ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ۝ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝ (ترجمہ: اور قسم ہے عصر کی انسان ٹوٹے میں ہے مگر جو لوگ کہ ایمان لائے اور اچھے کام کئے اور جو آپس میں حق کی اور صبر کی ایک دوسرے کو تاکید کرتے رہے۔)

تفسیر:

اب ہم اس سورت کی تفسیر کی طرف آتے ہیں کیونکہ قرآن مجید کی آیتوں کی اہمیت محض لفظی معنیٰ سے ظاہر نہیں ہوتی بلکہ اس کے حقیقی معنیٰ سے ظاہر ہوتی ہے جو تاویل و تفسیر سے ہی ہمارے سامنے آتے ہیں۔ یہ بات بھی ظاہر ہے کہ الگ الگ مفسر اپنی اپنی سمجھ اور معلومات اور نظریاتی میلان کے اعتبار سے تفسیر کرتے ہیں اور نظریاتی میلان جگہ پر ان تمام تفسیروں میں کچھ نہ کچھ صداقت کا جزو موجود ہوتا ہے۔ زمان و مکان کی تبدیلی بھی متاثر کرتی ہے۔ مثال کے طور پر اسی سورۃ کو لے لیجئے۔ ازمنۂ وسطیٰ کے مشہور و معروف معتزلی مفسر زمخشری الخوارزمی اس سورت کی تفسیر میں الکشاف میں رقم طراز ہیں کہ عصر سے مراد نماز عصر ہے۔ اور اللہ تعالےٰ نے عصر کی نماز کی قسم کھائی ہے کیونکہ اس وقت کے نماز کی خاص فضیلت ہے اور اسے قرآن مجید میں صلوٰۃ الوسطیٰ بھی کہا گیا ہے۔ اس کے برخلاف مولانا آزاد عصر کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"قسم ہے اس عصر انقلاب اور دور تغیرات کی جو پچھلے دور کو ختم کرتا اور نئے دور کی بنیاد رکھتا ہے"

مولانا سید سلیمان ندوی کے نزدیک "عصر" کا لفظ پوری انسانی تاریخ پر محیط ہے اور خدا نے تاریخی شعور کو گواہ بنایا ہے۔

ظاہر ہے اس مختلف معنیٰ و تشریح پر نظریاتی میلان کے علاوہ زمان و مکان کا بھی فرق کام کر رہا ہے۔ زمخشری کا زمانہ اور تھا اور مولانا آزاد اور سید سلیمان ندوی کا اور۔ لہٰذا ہمیں بھی مولانا آزاد اور سید سلیمان ندوی کی تفسیر اور تشریح جو انھوں نے لفظ "عصر" کی کی ہے زیادہ گلے اترتی ہے۔

اگر اس معنیٰ کی روشنی میں دیکھا جائے تو ہمارے دور میں بھی اس مختصر سی سورۃ کی اہمیت اچھی طرح واضح

ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے عصر کا زمانے کی قسم کھا کر عام آدمی میں ایک طرف تاریخی شعور پیدا کرنے کی کوشش کی ہے تو دوسری جانب ہمارے اپنے دَور کی جس دَور میں ہم جیتے ہیں اہمیت جتائی گئی ہے۔ ہر دور اپنے مسائل لیکر ابھرتا ہے اور ہمیں اپنے تاریخی شعور اور ان مسائل کی روشنی میں اپنے عمل کا واضح خاکہ تیار کرنا ہوتا ہے۔ لفظ عصر میں تاریخی شعور بھی شامل ہے اور ہمارے اپنے دور کا بھی۔ اس لئے مولانا آزاد کی یہ تشریح بڑی بامعنیٰ ہو جاتی ہے کہ قسم ہے اس عصر انقلاب اور دور تغیرات کی جو پچھلے دور کو ختم کرتا اور نئے دور کی بنیاد رکھتا ہے۔

تمانہ حرکی ہے اور تغیر اور انقلاب اس کی بنیادی خصوصیت ہے جہاں قرآن کے ماننے والوں میں ماضی کا شعور ہونا ضروری ہے (اور اُس پر فخر اس کے تشخص کو طے کرنے اور اس کی نفسیاتی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے ضروری ہے) وہاں اور اس کی اہمیت سمجھنا بے حد ضروری ہے۔ ہمارے اپنے دور کا صحیح شعور پیدا کرنا خالق کی تخلیق کا صحیح تناظر میں اعتراف کرنا ہے۔ تغیر اور حرکت خالق کا منشا ہے۔ اور تغیر اور حرکت سے نئے مسائل وجود میں آتے ہیں۔ ہر دَور میں ان مسائل سے عصری تقاضوں کی روشنی میں نمٹنا ہمارا فرض ہو جاتا ہے۔ اگر ہم محض ماضی کا شعور رکھتے ہیں اور اپنے دور کا نہیں تو نہ صرف ہم اپنے دور کے مسائل سے ٹھیک طور پر نمٹ نہیں سکیں گے بلکہ ہم خالق کی تخلیق کا بھی صحیح منشا نہیں سمجھ سکیں گے۔ قرآن مجید نے اسی لئے ماضی کی اندھی تقلید اور اسلاف پرستی کی مذمت کی ہے اور انقلاب اور تغیر پذیر شعور کی اہمیت واضح کی ہے لیکن افسوس تو اس بات کا ہے کہ آج مسلمان ماضی پرستی ہی کو اپنے ایمان کا جزو سمجھتا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہمارا انقلابی اور تغیر پذیر شعور کیسے ہمارے اپنے دَور میں متوازن رول ادا کر سکتا ہے! یہ بڑا بنیادی اور اہم سوال ہے۔ انقلابی شعور بذاتِ خود کوئی اہمیت نہیں رکھتا اگر کی صحیح سمت اور معینہ راستہ نہ ہو۔ شعور محفوظ نہیں ہو سکتا اس کی اہمیت ایک ذریعے سے زیادہ اس کا جواب بھی اس سورۃ میں موجود ہے۔

اللہ تعالیٰ عصر کی قسم کھا کر کہتا ہے کہ انسان میں ہے ان لوگوں کے سوا جو ایمان لائے، صالح عمل اور ایک دوسرے کو حق اور صبر کی تلقین کی۔ یہاں تین باتوں پر خاص طور سے زور دیا گیا ہے:

(۱) ایمان (۲) عمل صالح اور (۳) حق اور صبر کی تلقین۔ ہم اس صورت کی اہمیت واضح کرنے کے لئے ان تینوں عناصر کی اہمیت پر روشنی ڈالیں گے۔ اور ان کی وضاحت کریں گے۔

ایمان: یہ بات نوٹ کرنی بیحد ضروری ہے۔ عقل کی بنیاد بھی ہے اور روح بھی۔ عقل اور ایمان کا بھی بڑا گہرا اور متوازن ہونا چاہیئے۔ ایمان وجدانی کیفیت حال ہے اور اعتبار کا حامل ہے اور منزلِ مقصود متعین کرنے والا ہے۔ عقل اس منزل کو حاصل کرنے کا راستہ طے کرتی ہے اور عمل ہمیں اس راستے پر گامزن رکھتا ہے۔ قرآن مجید نے اسی لئے ایمان اور عقل کے رشتے کو واضح کیا ہے اور دونوں عناصر پر متوازن طور پر زور دیا۔

ایمان جہاں خدا اور رسول، حشر و نشر پر ہے وہیں صالح معاشرے پر بھی۔ جو انسانی قویٰ اور صلاحیتوں کو مساوی طور پر بڑھاوا دیتا ہے ضروری ہے۔ ہر دَور میں ان قویٰ اور صلاحیتوں کو پروان چڑھانے کے نئے ذرائع پیدا ہوتے ہیں۔ اسی لئے قرآن مجید عصر کی قسم کھا کر انسانوں میں نئے دَور کا صحیح شعور پیدا کرنا چاہتا ہے۔ ایمان جو منزلِ مقصود کی رہنمائی کرتا ہے کو مستحکم رکھتے ہوئے ہمیں اپنے دَور میں نئے ذرائع کو اپنانے کے لئے ہمیشہ مستعد رہنا چاہیئے چاہے اس کی نظیر ماضی میں ملتی ہو یا نہ ملتی ہو۔ اگر ہم نے ایسا کیا تو ہم نہ صرف ترقی کے دوڑ میں پیچھے رہ جائیں گے۔ ہم خالقِ حقیقی کی تخلیق کا صحیح منشا بھی پورا نہیں کر سکیں گے

دوسرے لفظوں میں ہم خسران میں رہیں گے۔ قرآن مجید میں بھی یہی خسر (نقصان) کا لفظ استعمال ہوا۔

ایمان کے ساتھ ساتھ دوسری بات عمل صالح ہے۔ ایمان انسان میں منزلِ مقصود کی طرف تیقن کی کیفیت پیدا کرتا ہے۔ اور عمل اسے حاصل کرنے کا ذریعہ ہوتا ہے۔ عمل صالح (عمل کو صفت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے) کا استعمال اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ عمل بھی مقصود بالذات نہیں ہے۔ عمل بھی محض ایک ذریعہ ہے خالق کی صحیح منشا حاصل کرنے کا اور خالق کا ایک منشا یہ اعتبار سے انسان کی صلاحیتوں کو پروان چڑھانا ہے۔ ان قوتوں کو مثبت طور پر پروان چڑھانے کے لئے جہاں ایمان کی ضرورت ہے وہاں عمل صالح کی بھی اتنی ہی ضرورت ہے۔ تیقن کی کیفیت بذاتِ خود اس مقصد کو حاصل نہیں کر سکتی۔ اس کے لئے عمل صالح کی ضرورت ہے۔

اس سورت میں تیسری اہم بات یہ کہی گئی ہے کہ وہ لوگ خسارے میں نہیں ہیں جو ایک دوسرے کو حق اور صبر کی تلقین کرتے رہتے ہیں۔ اس سے دو باتیں ظاہر ہوتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ عمل صالح محض انفرادی نہیں اس کی اجتماعی حیثیت ہی کارآمد ہے۔ انفرادی عمل سے ذاتی نجات حاصل ہو سکتی ہے لیکن اسلام میں ذاتی نجات کی حیثیت ثانوی ہے۔ عمل صالح اجتماعی ہو کر ہی معاشرے کے لئے رحمت اور نعمت ثابت ہو سکتے ہیں۔

دوسرے یہ کہ جب تاریخی دور بدلتا ہے اور نئی حقیقتیں ابھرتی ہیں تو ہمت شکن مسائل ابھرتے ہیں۔ ایسے حالات میں ثابت قدم رہنا، عزم و ہمت کے ساتھ ان مسائل کا سامنا کرنا، حق پرستی اور صبر جیسی صفات کا مطالبہ کرتے ہیں۔ اسی لئے سورۃ العصر میں ایک دوسرے کو حق اور صبر کی تلقین کرنے کی بات کہی گئی ہے۔ حق پرستی اور صبر جیسی صفات کے بغیر نئی ابھرتی ہوئی حقیقتوں کا سامنا کرنا دشوار ہو جائیگا۔ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھیوں کو بھی مکہ میں ان نئی ابھرتی ہوئی حقیقتوں سے پیدا شدہ تلخ حالات کا سامنا تھا۔ اس نئے دور کے نئے شعور کے ساتھ ان حالات کو صحیح سمت میں موڑ دینا تھا۔ اصحاب رسولِ اکرم نے ہمت شکن حالات کا بڑے صبر سے مقابلہ کیا اور ایک نئے صحت مند سماج کی بنیاد ڈالی جو بڑا متحرک (DYNAMIC) اور انقلابی سماج تھا۔

اس طرح سورۂ عصر ہر نئے دور میں ہماری رہنمائی کرتی ہے اور ہمیں صبر اور حق پرستی کے ساتھ زمانے کے انقلاب کا صحیح سمت میں رخ موڑنے کا درس دیتی ہے۔ ایک مسلسل انقلاب جو نئے تقاضوں کے پیش نظر عادلانہ و مساویانہ سماج قائم کرنے میں مددگار ثابت ہو۔ یہ نئے تقاضے چاہے علمی سطح پر سائنس اور ٹکنالوجی کے ہوں یا نظریاتی سطح پر نئے معاشی پیداواری رشتوں اور قوتوں کو عادلانہ سماج کی تشکیل کرنے کے ہوں۔

امام شافعی نے اس سورت کے متعلق بالکل سچ فرمایا کہ اگر لوگ اسے غور و تدبر سے پڑھیں تو دین و دنیا درستی کے لئے کافی ہو جائے گی۔



دن بھر
تازہ دم رہیئے
غسل کے لئے ہمیشہ
پاک و صاف
استعمال کیجئے ـ جو
★ جسم کو پھوڑے پھنسی. گرمی دانوں اور دوسرے جلدی امراض سے محفوظ رکھتا ہے
★ پسینہ کی بو کو دور کر کے جسم کو معطر رکھتا ہے.
★ اسکا خوشبودار سفید جھاگ جلد کو ملائمت اور تازگی عطا کرتا ہے اور رنگت کو نکھار دیتا ہے
روزمرہ کے استعمال کے لئے انتہائی موزوں
پاک و صاف
جراثیم کش صابن
PAAK-O-SAF
ANTISEPTIC SOAP
پاک و صاف
نارتھ. ایس. اے. بی. بخشی کمپنی پوسٹ بکس ۲۲۳ کلکتہ

رضیہ سجاد ظہیر، سوانحی خاکہ
(تحقیق کی روشنی میں)

مظہر زماں فیض، مولانا آزاد چوک گریڈیہہ (بہار)

رضیہ سجاد ظہیر کا گھریلو نام ''رضیہ دلشاد'' تھا۔ خان بہادر سید رضا حسین کی پانچ اولادیں ہوئیں۔ رضیہ دلشاد انکی منجھلی اولاد تھیں، رضیہ دلشاد کی پیدائش ۱۵ فروری ۱۹۱۸ء کو اجمیر صوبہ راجستھان میں ہوئی۔ ان کی والدہ محترمہ کا نام ''رقیہ بیگم'' تھا۔ رقیہ بیگم کا وطن سنبھل ضلع مرادآباد تھا۔ دلشاد کا ددیہال شہر حسن درحقیقت بنارس ہے۔ اب تک جو معلومات فراہم ہیں ان سے یہ اندازہ لگانے مشکل نہیں کہ رضیہ دلشاد کو خاندان اور معاشرتی ماحول خالص علمی اور ادبی ملا تھا۔ والد خان بہادر سید رضا حسین اجمیر اسلامیہ ہائی اسکول میں ہیڈ مدرس تھے اور انہوں نے اسلامیہ کالج میں بھی درس و تدریس کے فرائض انجام دیئے۔ دادا سید امداد حسین آنجہانی رام نگر اسٹیٹ میں ملازم تھے۔ سید امداد حسین آنجہانی علمی و ادبی سرگرمیوں میں ہمہ وقت مشغول رہا کرتے تھے اور شعر و ادب سے اچھا خاصا شغف رکھتے تھے، موصوف صاحب دیوان شاعر بھی تھے، ان کی پسندیدہ صنف غزل تھی، لیکن مرثیے اور ان کے ولادت کی تاریخیں بھی کہی ہیں۔ رضیہ دلشاد کی پیدائش پر بھی انہوں نے قطعہ تاریخ کہا تھا۔

رضیہ دلشاد کے اس گھریلو پس منظر میں رضیہ سجاد ظہیر کا عکس نمایاں طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے گھریلو تعلیم و تربیت روایتی طریقے پر ہوئی اور زمانداری کا شدید بدرضیہ کو اپنی گھر کی ہنستی کھیلتی زندگی میں ہی مل گئی تھی۔ اپنی ابتدائی تعلیم کے متعلق خود لکھتی ہیں کہ۔

> "میری تعلیم کا قصہ بڑا عجیب و غریب ہے ہمارا ہمارا خاندان کٹر مذہبی قسم کا تھا۔ لڑکیوں کو پردے میں بٹھایا جاتا تھا اور انہیں اسکول میں قطعاً نہیں بھیجا جاتا تھا، چنانچہ میرے ابا نے مجھے گھر میں ہی

پڑھایا۔ میرے دادا کے پاس بہت بڑی لائبریری تھی وہ شعر بھی کہتے تھے اور آثم تخلص کرتے تھے۔ دراصل تو میں نے اس لائبریری ہی سے پڑھنا لکھنا سیکھا۔ دس برس کی عمر ہی میں "آب حیات" اور "شبلی کے خطوط" وغیرہ پڑھ چکی تھی۔ ویسے بی۔ اے تک پرائیوٹ ہی کیا۔" ۲؎

اپنی روایتی جکڑبندیوں کے باوجود تعلیم کا شغف بچپن سے ہی بہت زیادہ تھا، لہذا انہوں نے اپنی تعلیمی سلسلہ ہی روایتی ماحول میں بھی جاری رکھا اور میٹرک کے بعد ایف۔ اے کیا اور بی۔ اے تک امتیاز کامیابی حاصل کرتی رہیں۔ رضیہ کی تعلیمی دلچسپی کا ذکر کرتے ہوئے صالحہ عابد حسین لکھتی ہیں۔

" ایک مرتبہ رضیہ کا خط آیا کہ انہوں نے ایف۔ اے میں درجہ اوّل میں امتحان پاس کیا ہے۔ میں نے بہت خوش ہو کر اپنے شوہر ڈاکٹر عابد حسین کو یہ خبر سنائی وہ اعلیٰ درجے کے تاریخ گو تھے۔ انہوں نے فی البدیہہ تاریخ کہی ؎

ایف۔ اے میں درجہ اوّل پایا	اقربا خوش ہیں اعزا دل شاد
پوچھا مصداق نے سال ہجری	کہا ہاتف نے رضیہ : ایف۔ اے شاد

اور پھر شادی کے بعد الٰہ آباد یونیورسٹی سے ایم۔ اے کا امتحان بھی درجہ اوّل میں پاس کیا۔

رضیہ دلشاد کی شادی سید سجاد ظہیر کے ساتھ دسمبر ۱۹۳۶ء میں ہوئی۔ سید سجاد ظہیر ۵ نومبر ۱۹۰۵ء کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے تھے، ان کے والد کا نام سر وزیر حسین تھا۔ سجاد ظہیر کی شخصیت سے صرف اردو ادب کے لوگ ہی واقف نہیں بلکہ عالمی سطح پر اپنی سیاسی اور ادبی سرگرمیوں کی وجہ سے جانے جاتے ہیں۔ انہوں نے دنیائے ادب کا یہ درخشندہ ستارہ بہت سی یادیں، حکایتیں اور زمزمے کو چھوڑ کر بزم کی سرگرمیوں سے سبکدوش ہو گیا اور ہمہ تن گوش محفلوں کو چھوڑ کر خود ہی شہر خموشاں جا بسا، ۱۳ ستمبر ۱۹۷۳ء کو سید سجاد ظہیر کا انتقال ہوا اور ایک سنہری داستان اختتام کو پہنچی۔

رضیہ سجاد ظہیر کی شادی اور ان کی نسبت کے محرکین پروفیسر نورالحسن کے والد سید عبدالحیٔ (مرحوم) قرۃ العین حیدر کی والدہ اور مولانا ممتاز علی (مشہور ڈرامہ نگار امتیاز علی تاج کے والد) وغیرہ تھے۔ اس کا تذکرہ قرۃ العین حیدر نے اپنے ناول "کار جہاں دراز" میں کیا ہے۔

" اماں حسب عادت ہندوستان بھر میں پھیلے ہوئے دوستوں کی اولاد کی شادی کرانے میں مشغول ہو گئیں، ایک منہ بولے بھائی سید رضا حسین ہیڈ ماسٹر اسلامیہ ہائی اسکول اجمیر سنبھل ضلع مراد آباد کے رہنے والے تھے، ان کی لڑکی رضیہ دلشاد کے نام سے "تہذیب النسواں" میں مضمون لکھتی تھیں اور فرسٹ ڈویژن میں بی۔ اے پاس کیا تھا، اماں سے خط و کتابت تھی۔ اماں نے کہا کہ یہ لڑکی بنے کے لئے عین مناسب ہے، لیڈی وزیر حسن اور اماں کا نظریہ تھا کہ لڑکا کمیونسٹ ہو گیا ہے، جیل جانے پر تلا رہتا ہے، شادی ہو گئی راہ راست پر آ جائے گا۔" ۱؎

۱؎ آجکل، شمارہ ۷، فروری ۱۹۸۰ء صفحہ ۶۷
۲؎ جان پہچان، آتش کی اشاد، صفحہ ۸۳
۳؎ تعزیتی رپورٹ صفحہ ۱۴

سید سجاد ظہیر نے "روشنائی" میں اس تاریخی اور ادبی شادی کی دلہن اور دلہا کے حالات پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"ہماری شادی پرانی وضع سے اور بڑے دھوم دھام سے ہوئی تھی، شاید اس بدعت کا کفارہ ادا کرنے کے لئے ہم دونوں نے شادی کی بہت سی رسموں کو اور تقریبوں کو ادھورا چھوڑ کر بزرگوں کو کافی حیران اور ناراض کر کے ایک ہی ہفتہ کے بعد کلکتے (کانفرنس کے سلسلے میں) بھاگ جانے کا فیصلہ کیا۔ رضیہ کو ان کے میکے سے لے جانے کے لئے ان کے بھائی اجمیر سے چل کر جب لکھنؤ اسٹیشن پر پہنچے تو انہوں نے یکایک دیکھا کہ ان کی بہن سرخ کپڑوں میں لپٹی ہوئی کلکتہ جانے والی گاڑی کے ایک ڈیوڑھے درجہ کے ڈبے میں سوار ہو رہی ہیں اور گاڑی آہستہ آہستہ پلیٹ فارم سے سرک رہی ہے" ۲

اس سلسلے میں یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہیں جس کا ذکر صالحہ عابد حسین نے "زرد گلاب" کے دیباچے میں کیا ہے۔

"ایک دن عابد حسین نے بتایا کہ رضا حسین سے ملاقات ہوئی، انہوں نے بتایا کہ رضیہ کی بات بنے (سجاد ظہیر) سے چل رہی ہے۔ عابد حسین کے رضا حسین صاحب کے گھرانے سے بہت پرانے اور گہرے تعلقات تھے اور وہ بنے بھائی کو چھوٹے بھائی کی طرح چاہتے تھے ان کے سیاسی خیالات اور مشغولیتوں سے بھی واقف تھے اور سید صاحب کے خیالات سے بھی، انہوں نے کہا "سید صاحب آپ تو کسی آئی سی ایس کے تلاش میں تھے بنے (سجاد ظہیر) میرا عزیز بھائی ہے، مگر وہ تو پکا کمیونسٹ ہے آپ کیسے اس رشتے پر آمادہ ہو گئے" سید صاحب مسکرائے۔ عابد صاحب میری لڑکی اسے ٹھیک کر لے گی" ۳

رضیہ دلشاد شادی کے بعد رضیہ سجاد ظہیر (اپنے شوہر سجاد ظہیر کے مناسبت سے) ہو گئیں۔ یہ بات محتاج تعارف نہیں کہ سجاد ظہیر انقلابی شخصیت کے مالک تھے اور ان نوجوانوں میں سے تھے جنہوں نے سماج کے طور طریقے بدلنے کا عہد کیا تھا۔ ایسے شخص کی زندگی میں سکون بھی ازدواجی زندگی کی راحتیں خوابوں کے سوا کچھ نہیں ہوتے، یہاں تو طوق و سلاسل سے ہر وقت شیر آزمائی کا مرحلہ درپیش رہتا ہے۔ سجاد ظہیر اپنے کاموں میں اس قدر مشغول رہتے کہ ان کی رفیقہ حیات رفیقہ حرمان دیاس قدم بہ قدم ان کے ساتھ چلتی رہیں، سجاد ظہیر پہلی مرتبہ دسمبر ۱۹۳۹ء میں گرفتار ہوئے۔ اگست ۱۹۴۰ء میں رضیہ سجاد ظہیر کے گھر میں بچہ کی پیدائش ہوئی، اس وقت سجاد ظہیر جیل میں تھے۔ دوسری نسیمہ کی پیدائش اجمیر میں ہوئی۔ ۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۷ء تک رضیہ سجاد ظہیر اپنی دونوں بچیوں اور سجاد ظہیر کے ساتھ بمبئی میں مقیم رہیں۔ بمبئی میں وہ ۹۶ والکیشور روڈ مالابار ہلز میں رہتی تھیں، یہاں سجاد ظہیر اور رضیہ کا سارا وقت شاعروں، ادیبوں اور صحافیوں کے درمیان گذرتے، بمبئی کے قیام کے دوران ترقی پسند مصنفین میں شریک ہو گئیں۔ رضیہ والدہ کے انتقال کے بعد ایک سال تک اجمیر میں رہیں اور صوفیہ کالج میں ۱۹۴۵ء تک درس و تدریس میں مشغول رہیں۔ بمبئی کے اقامت کے زمانے میں مسلم گرلز اسکول میں بحیثیت استاذ درس و تدریس کے فرائض انجام دیتی رہیں ۱۹۴۹ء میں اپنے خسر سر وزیر حسین کے وفات کے بعد لکھنؤ واپس گئیں۔ ۱۹۴۸ء میں سید سجاد ظہیر پاکستان چلے گئے

۱۔ کاروان جہاں دراز، صفحہ ۳۰۸، (حصہ اول)
۲۔ روشنائی، سجاد ظہیر، صفحہ ۲۷۳
۳۔ زرد گلاب (رضیہ سجاد ظہیر کے افسانوں کا مجموعہ) صفحہ ۱۴، ۱۵

ماہنامہ سہیل

جون ۱۹۵۲ء میں رضیہ اپنی دونوں بچیوں کو لے کر پاکستان چلی گئیں۔ پاکستان سے واپس آکر کرامت حسین گرلز کالج کے شعبۂ اردو سے وابستہ ہوگئیں۔ ۱۹۵۵ء میں سید سجاد ظہیر کو پاکستان جیل سے رہائی حاصل ہوئی اور لکھنؤ واپس ہوئے۔ ۱۹۵۷ء میں چوتھی بیٹی نور کی پیدائش لکھنؤ میں ہوئی۔ رضیہ ۱۹۶۲ء میں پاکستان چھوٹی بیٹی نور کے ساتھ گئیں۔ ۱۹۶۵ء میں مشرقی جرمنی اور ماسکو کا سفر اپنے شوہر سجاد ظہیر کے ساتھ کیا، وہاں سے واپس آنے کے بعد ۱۹۶۵ء ہی میں سوویت انفارمیشن سنٹر دہلی میں بحیثیت مترجم ملازمت اختیار کی۔ ۱۹۷۱ء میں روس اور انگلستان کا سفر بھی کیا۔ ۱۹۷۳ء میں اپنے شوہر سجاد ظہیر کے انتقال کے بعد ۱۹۷۲ء میں اتحاد ماسکو اور لندن کا سفر کیا۔ ۱۸ دسمبر ۱۹۷۹ء کو صبح پونے پانچ بجے آل انڈیا انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنسز میں رضیہ کا انتقال ہوگیا۔

"رضیہ سجاد ظہیر ذیابیطس کی مریضہ تھیں اور انہیں گردے کی تکلیف بھی رہنے لگی تھی ۴ دسمبر ۱۹۷۹ء کو انہیں علاج کے لئے ہسپتال میں داخل کیا گیا ان کی طبیعت سنبھلنے لگی تھی ۱۵ دسمبر کو انہیں دل کا دورہ پڑا، ۱۸ دسمبر کی رات میں انہیں دل کا ایک اور شدید دورہ پڑا جس سے وہ جانبر نہ ہوسکیں۔ ان کی وصیت کے مطابق جامعہ ملیہ کے قبرستان میں انہیں سجاد ظہیر کے قبر کے پہلو میں سپرد خاک کیا گیا" [1]

یہ تھی مختصر روداد حیات رضیہ دلشاد کی جسے قدرت نے رضیہ سجاد ظہیر بنایا، جس نے اپنی حیات مستعار میں زندگی کو نے گوں قدروں کو پرکھا سمجھا اور تخلیق کے کرب کو محسوس کیا۔ اپنی زندگی مستعار کی پونجی اس تمنا میں خرچ کر دی کہ شاید کوئی خوش آواز پھر سے نغمہ سنج ہو جائے اور سماج کی ڈوبتی ہوئی نبض پھر زندگی کے اشارے کرنے لگے۔ رضیہ کی ذہنی حسیت نے ان کے فن کو جنم دیا گرچہ اس کا جسمانی وجود پیوند خاک ہو چکا ہے لیکن ان کا فن اور ان کی تخلیق آج بھی زندہ ہے۔ رضیہ کے فن اور شخصیت پر مختلف جرائد و رسائل میں جو مضامین شائع ہوچکے ہیں جن کا مطالعہ رضیہ کی شخصیت کو سمجھنے میں معاون بنتا ہے ذہن میں چند اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں تاکہ ان کی شخصیت کے نقوش پورے طور پر نمایاں ہوسکے۔ کیفی اعظمی رضیہ کی وفات کے بعد ان کے متعلق ذکر کرتے ہیں کہ

"رضیہ آپا کی زندگی ایک مسلسل جہاد تھی اور مسلسل جہاد کسی کو بھی تھکا سکتا ہے، رضیہ آپا بھی تھک گئیں لیکن انہوں نے اپنا جہاد نہیں چھوڑا" [1]

ڈاکٹر ابو اللیث سحر اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

"ایک عورت کے روپ میں رضیہ سجاد ظہیر ایک مستقل مزاج اور جرأت مند خاتون تھیں ایک شریک حیات کی حیثیت سے ایک مثالی شریک حیات تھیں، ایک ماں کی حیثیت سے بھی ایک بلند حوصلہ، نہایت شفیق اور جی جان سے چاہنے والی ماں بن کے دکھایا۔" [2]

صالحہ عابد حسین کے خیالات میں

"اپنی زندگی میں رضیہ بے حد کٹھنایاں جھیلیں یہ کٹھنایاں اوپر سے لادی نہیں گئی تھیں بنّے بھائی نے رضیہ کو کبھی مجبور نہیں کیا لیکن رضیہ کو خود ترقی پسند تحریک سے کمیونزم سے غریبوں اور

---

[1] بیسویں صدی

پسماندہ طبقوں سے بے انتہا لگاؤ تھا، وہ خود ہی بنے بھائی کا ہم خیال بن گئیں۔ ان کا دست راست بن گئیں، شادی کے فوراً بعد ہی سے رضیہ کی تکالیف کا آغاز ہو گیا تھا اور بنے بھائی پاکستان چلے گئے تھے تو انہوں نے بہت دکھ اٹھائے، پریشانیاں اٹھائیں۔ بچوں کو پالا، نوکری کی۔ رضیہ کی خصوصیت جس نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ یہ تھا کہ کبھی ان سے میں نے کسی کا شکوہ نہیں سنا............ ہائے افسوس خوشیاں رضیہ کو راس نہ آئی تھیں۔ ایک دن بنے بھائی ماسکو کے سفر میں چپکے سے ان کا ساتھ چھوڑ گئے۔ میں پہنچی تو رضیہ کو پتھر بنا دیکھا، آنکھ میں آنسو نہیں، چہرہ سپاٹ، آنکھیں ویران ہاتھ میں سگریٹ۔ میں تڑپ تڑپ کر کہتی رہی رو لو رضیہ رو لو مگر وہ رو نہ سکی بولی مجھے کچھ نہ ہو گا تم پریشان نہ ہو"۔ ۳؎

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ فرماتے ہیں کہ

" رضیہ آپا نے جس طرح تحریک میں، زندگی میں بنے بھائی کا ساتھ دیا وہ بہت اہم ہے۔ سجاد ظہیر کے انتقال کے بعد رضیہ آپا ٹوٹ کر رہ گئی تھیں ان پر ایک بے تعلقی کا عالم چھا گیا تھا، رضیہ آپا اور بنے بھائی دونوں کی شخصیتوں کے ملنے سے جو سانچا بنا تھا وہ شخصی بھی، سماجی بھی، نظریاتی بھی اور انقلابی بھی تھا، اس سانچا کو ایسی چوٹ لگی تھی کہ ٹوٹ سا گیا تھا ان دونوں نے صرف ایک دوسرے کو نیا سہارا دیا بلکہ ایک نئی اور کامل شخصیت وجود میں آگئی تھی جس نے تقریباً نصف صدی تک ایک بہت بڑی تحریک کو چلایا تھا اس لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ رضیہ نہ صرف سجاد ظہیر کی شریک زندگی تھیں بلکہ شاہراہ ادب میں بھی ان کی سچی ساتھی ثابت ہوئیں، چونکہ ان دونوں کے مزاج میں شائستگی تھی، رچاؤ تھا، نرمی تھی، نفاست تھی اور وضعداری تھی، اس کا ہمارے تمدن اور ثقافت سے بڑا گہرا تعلق اور ربط ہے۔ ان ممتاز ترقی پسند ادیب سجاد ظہیر کی حیثیت سے انہوں نے ترقی پسند تحریک کو آگے بڑھانے میں قدم قدم پر ان کا ساتھ دیا۔ ۴؎

ڈاکٹر شمیم حنفی کے

" رضیہ آپا سے میرے ذاتی کوئی مراسم نہیں تھے۔ میں کبھی ان سے نہیں ملا۔ جہاں تک ان کے نظریات کا تعلق ہے ہمیں اس سے بھی اختلاف رہا ہے، میرا ان کا ایک عجیب سا رشتہ رہا ہے، یعنی الٰہ آباد یونیورسٹی سے جن اساتذہ نے انہوں نے پڑھا، انہیں سے مجھے بھی کچھ سیکھنے کا موقع ملا، مرحوم سید اعجاز حسین صاحب رضیہ آپا کے استاذ تھے۔ جب میں طالب علم کی حیثیت سے وہاں پہنچا تو وہاں جن پرانے طلباء کا احترام سے ذکر ہوتا تھا، ان میں احتشام حسین صاحب تھے، حسین، بلونت سنگھ، وقار عظیم اور رضیہ آپا تھیں، رضیہ آپا کا ذکر اعجاز حسین صاحب اس طرح کرتے جیسے کسی کا ذکر کر رہے ہوں، اس وقت ایسا محسوس ہوتا تھا کہ رضیہ آپا ان لوگوں میں سے تھیں جنہوں نے ادب اور علم کو مستقل بنا لیا تھا، ان دونوں کو الگ نہیں کیا جا سکتا تھا، ایک کو دوسرے کے ذریعے پہچانے جا سکتا تھا..........

۳؎ تعزیتی رپورٹ صفحہ ۶

۴؎ ایضاً ۵؎ "زرد گلاب" دیباچہ صالحہ عابد حسین صفحہ ۸-۱

۶؎ تعزیتی رپورٹ صفحہ ۲۰

رضیہ آپا کا بہت بڑا کارنامہ ہے کہ انہوں نے ہمارے زمانے کے ایک نہایت متوازن، انتہائی روشن خیال، انتہائی فکر انگیز ادیب کی رفاقت کا قرض ادا کیا، سجاد ظہیر کی پوری شخصیت کو بنانے میں، اس کے اظہار میں مدد دینے میں رضیہ آپا کی رفاقت کا بڑا حصہ ہے اور یہ ایک کارنامہ ہے۔ سید سجاد ظہیر کی موت کے بعد میں نے ایک خاص وقت رضیہ آپا کے ساتھ گزارا ہے، رضیہ آپا اس دور کا ایک اہم حصہ تھیں۔ [1]

ڈاکٹر محمد حسن نے بھی اپنے تاثرات کو ان الفاظ میں پیش کیا ہے

"میرا اور رضیہ آپا کا ایک رشتہ مراد آباد کا ہے، دوسرا رشتہ پارٹی کا ہے، جب کوئی انسان مرتا ہے تو اس سے پہلی ملاقات کا نقش اس سے آخری ملاقات کا نقش اور اس کے ساتھ آزمائش کے لمحات کا نقش ذہن پر ابھرتا ہے۔ پہلی ملاقات رضیہ سجاد ظہیر سے آزادی سے پہلے کمیونسٹ پارٹی کی ایک میٹنگ میں ہوئی تھی، جو گولا گنج کے امام باڑے میں منعقد ہوئی تھی، رضیہ آپا سے آخری ملاقات ان کی وفات سے چند ماہ پہلے ان کے گھر میں ہوئی وہ کہہ رہی تھیں کہ ترقی پسند مصنفین کے جلسے اب صرف تعزیت کے لئے ہوتے ہیں۔ ہم لوگ جلسے اس لئے رکھتے تھے کہ افسانے پڑھتے تھے۔ نظمیں پڑھتے تھے ان پر تنقید کرتے تھے، بحث کرتے تھے، لڑتے تھے، جب ہماری تخلیق کمزور ہے تو کیا ہوگا۔ ایسا کیوں نہیں ہوتا کہ ہم لوگ بیٹھیں افسانے پڑھیں، نظمیں پڑھیں، اس پر بحث کریں۔ میں نے ان سے کہا ضرور ایسا ہوگا اور یہ کام بنیادی ہے اس کو رضیہ سجاد ظہیر کے نام سے شروع کرنا چاہیے۔

۱۹۵۰ء سے دو سال تک میں اور رضیہ سجاد ظہیر لکھنؤ یونیورسٹی کی ایک ہی پوسٹ حاصل کرنا چاہتے تھے ان دنوں میں نے محسوس کیا کہ اختلاف آدمی کے کردار کی سب سے بڑی کسوٹی ہے، اس اختلاف میں بھی رضیہ نے اپنے کردار، شائستگی کھرے پن اور نفاست کو برقرار رکھا، اس کسوٹی پر وہ سچی انسان ثابت ہوئیں، ان کا دل آئینے کی طرح صاف تھا، محبت رفاقت، ہمدردی، اور اپنے پن کے جذبات کے اظہار میں میں نے کبھی کمی نہیں پائی۔ سجاد ظہیر کے تعزیتی جلسے میں رضیہ آپا بول رہی تھیں۔ ان کی آواز میں لرزش نہیں تھی۔ رضیہ آپا نے کتنا جھیلا ہے، ایسے جلسے میں تو تقریر کرنے کی ہمت رکھنا بہت بڑی بات تھی۔" [2]

رفعت سروش نے "رضیہ آپا" کے عنوان سے عصری آگہی میں رضیہ کی شخصیت کا ذکر کچھ اس انداز میں کیا ہے جو پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

"رضیہ آپا نے پہلی ملاقات میں اپنی شخصیت کا جو نقش میرے ذہن و دل پر ثبت کیا ہے وہ وقت کے ساتھ اور گہرا ہوتا چلا گیا ہے، ان کی ملائم شخصیت مجھے ہی کیا ہر ادیب کو مسحور کر لیتی تھی، ۹۶، رواں کیشور روڈ کی یادیں، ان کے مسکراتے ہوئے اور سادہ مگر لطیف انداز گفتگو کے بغیر نامکمل ہے وہ زمانے انجمن ترقی پسند مصنفین کے عروج کا زمانہ تھا۔ بنے بھائی کے ساحرانہ شخصیت نے ہر طبقہ خیال کے ادیبوں اور شاعروں کو اپنے ارد گرد جمع کر لیا تھا، صرف ترقی پسند ادیبوں کے علاوہ یگانہ، جگر، نخشب، اور ذوالفقار بخاری، جیسے ادیب و شاعر بھی ہمارے انجمن کے جلسوں میں آتے تھے اور کھل کر بحثیں ہوتی تھیں مگر مجھے یاد نہیں کہ کبھی بحث میں تلخی آئی ہو، دراصل بنے بھائی کی مگر فولادی شخصیت کسی کی انانیت پنپنے نہیں دیتی تھی، ان ادبی بحثوں میں رضیہ آپا بھی حصہ لیتی تھیں، انہیں اپنی بات کو نہایت بے باکی مگر نرمی سے کہنے

---

[1] تعزیتی جلسے کی رپورٹ صفحہ ۱۹،
[2] ایضاً ایضاً صفحہ ۲۲،

سکہ حاصل تھا۔ وہ نہ کسی کو مرعوب کرنے کی کوشش کرتی تھیں۔ نہ کسی سے مرعوب ہوتی تھیں۔ مگر ہم سب پر رعب ایسا ہی تھا جیسا گھر میں بڑی کا رعب ہوتا ہے ہم میں سے بہت سے ادیب ان میں عمر میں بڑے تھے۔ مثلاً کرشن چندر، علی سردار جعفری لیکن سب ان کو رضیہ آپا ہی کہتے تھے اور احترام کرتے تھے اور وہ بھی بڑی بہن ہونے کا پورا حق ادا کرتی تھیں۔ کیفی عظمی اور شوکت کی شادی انہیں کے سائے میں ہوئی، انہیں کے گھر، دولہا دولہن دونوں کا گھر تھا۔ اختر حسین، شوکت کو حیدرآباد سے بمبئی لے آئے تھے سیدھے رضیہ آپا کے گھر، وہیں نکاح ہوا اور وہیں رخصتی اور پھر ایک مرحلے تک شوکت رضیہ آپا کے گھر میں رہیں ان کے بہو کی طرح، اس شادی کے موقع پر وہ اس طرح خوش تھیں، جیسے واقعی ان کے لڑکے کا بیاہ ہو رہا ہو۔ جہاں تک مجھے یاد ہے بنے بھائی (سید سجاد ظہیر) نکاح میں باپ بنے تھے۔

"بنے بھائی کی عارضی جدائی نے رضیہ آپا کی مخلص صلاحیتوں پر تعزیانے کا کام کیا اور وہ بہت تیزی سے لکھنے لگیں۔ افسانے، ناول، ناٹک، مضامین اور انشائیے وغیرہ، انہوں نے بہت جلد صفِ اوّل کے افسانہ نگاروں میں اپنا منفرد مقام حاصل کر لیا اور آج رضیہ سجاد ظہیر اردو افسانے اور ناول کی ابرو کا نام ہے۔" [1]

نجمہ شہریار نے اپنے ایک مضمون میں رضیہ سجاد ظہیر کی شخصیت پر اظہار خیال کرتے ہوئے بڑی عقیدت سے رقمطراز ہیں،

" کتنا عجیب ہوتا ہے شخصیت کا جادو بھی اور وہ شخصیت بھی ایک فن کار کی شخصیت، ایک ادیب کی شخصیت، ایک بہت پیارے انسان کی شخصیت۔ بہت مشکل ہے ایسے شخص کے بارے میں لکھنا یا کچھ کہنا جس سے اتنی محبت اور عقیدت ہو کہ سمجھ میں نہ آسکے کہ اپنے جذبات کا اظہار کن الفاظ میں کیا جائے۔ کسی فن کار سے مل کر جو بھی خوشی حاصل ہوتی ہے اس کا احساس ہر اس شخص کو ہوا ہوگا جو ان سے ایک بار بھی ملا ہے، فن کار انسان پہلے ہوتا ہے اور فن کار بعد میں......
...... رضیہ آپا کی شخصیت نے ایک بہت پیارے انسان کی روح چھپی ہوئی تھی، ان کی ذات محبت اور خلوص کا ایک ایسا دریا تھا جس میں ہم خود کو ڈوبتا ہوا محسوس کرتے تھے، ذہن و دل کے ایک ایک گوشے کو سمجھنے والی شفیق ہستی .... میں رضیہ آپا کو محض اس لئے پسند نہیں کرتی تھی کہ وہ مجھ سے خصوصی طور سے خلوص برتتی تھیں وہ اتنی محدود ہو ہی نہیں سکتی تھیں ان کی ذات ایک سمندر تھی جس میں ہر کوئی ڈوب سکتا تھا" [2]

ان تمام باتوں کے علاوہ مختصر طور پر دونوں میاں بیوی کے تعلقات اور رفاقت و جدائی کی رو داد پیش کر دوں تاکہ ان کے حالات و کوائف اور زندگی پر بھرپور روشنی پڑ سکے، اور ان سے ان کی تخلیقات سمجھنے میں معاون ہو۔ ذیل میں چند اقتباسات نقل کیے جاتے ہیں جن سے ان کے ازدواجی زندگی کے واضح نقوش ابھرتے ہیں۔ ظہیر کیفی امروہوی جنہیں رضیہ آپا کا قرب حاصل تھا ان کی شخصیت کا تفصیل کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔

" رضیہ آپا نے واقعی اپنے شوہر کے بھرپور رفاقت رکھی، ان کے دکھ سکھ میں ہمہ وقت شریک رہیں،

---

[1] " رضیہ آپا" رفعت سروش، عصری آگہی شمارہ ۹، صفحہ ۱۰۔
[2] " رضیہ آپا کی شخصیت کے چند نقوش، نجمہ شہریار، عصری آگہی شمارہ ۳، صفحہ ۷ تا ۱۹۔

" زنداں کے خطوط اس کے گواہ ہیں جو کہ ان کے شوہر سجاد ظہیر (بنّے بھائی) نے اپنے قید و بند کی زندگی میں ان کے نام لکھے تھے اور جن سے ان دونوں زن و شو کے خوشگوار تعلقات کا ثبوت ملتا ہے، واقعی رضیہ آپا نے تن من دھن سے شوہر کی آخری لمحوں تک رفاقت کی۔ دل دہی اور دلگیری، دل سوزی ہمدمی، اور دلجوئی کو اپنا شعار بنائے رکھا وہ خود اسکول کے بچوں کو پڑھا کر اپنی روزی کماتی رہیں لکھنؤ میں وہ کالج کی ہیڈ مسٹریس اور پرنسپل بنی اور جب لکھنؤ چھوڑ کر دہلی مستقل آگئیں تب انہوں نے اپنی تخلیقات اور ترجموں کی اجرت سے زندگی کی نہ صرف گاڑی چلائی بلکہ اپنی بچیوں کو پڑھایا لکھایا اعلیٰ تعلیم یافتہ بنایا۔ ان کی شادیاں کیں" [۱]

مذکورہ اقتباسات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی زندگی کس قدر محنت اور جفاکش ہونے علامت تھی، بحیثیت عورت انہوں نے اپنی شرافت کو برقرار رکھا اور ان نامساعد حالات میں اپنے شوہر کی۔ اپنے بچوں کو کفالت کرتی رہیں۔ ایسی شخصیت بہت کم ہوتی ہیں جو کسی نامساعد حالات میں نظم و ضبط کے ساتھ زندگی گذار سکے، عورت ہو کر بھی مرد کے فرض کو فرض سمجھنے ان دونوں کے تعلقات اور انتہائی محبت کا اندازہ واقعی "نقوش زنداں" کے خطوط کے مطالعے سے بخوبی ہوتا ہے جو سجاد ظہیر نے ایام اسیری میں رضیہ کے نام بھیجتے رہے تھے، طوالت کی خاطر نقوش زنداں کے اس دیباچے کا ذکر کر رہا ہوں جسے جوش ملیح آبادی نے لکھا ہے۔

" سجاد ظہیر کے ان خطوط میں سب کچھ ہے جو عاشق اور معشوق کے خطوط میں ہوا کرتا ہے، ان میں وہ حرارت، ہلچل ہماہمی اور حیات پائی جاتی ہے جو ازدواج کے مرغوب صحن میں نہیں، وہ عشق کے مہکتے سبزہ زاروں میں پائے جاتے ہیں..................
سجاد ظہیر کو پیار سے بنّے کہتے ہیں ان خطوط میں بنّے اپنی تشدید کو چھوڑ کر بنّے کی حیثیت اپنی بنی سے باتیں کرتے نظر آتے ہیں، ہرچند یہ خطوط یہ خلوت ہے راز و نیاز ہے مگر آئیے ہم بھی سن لیں اور چپکے چپکے لطف اندوز ہوں" [۲]

جوش ملیح آبادی کے مذکورہ الفاظ کو پڑھ کر ان کی ازدواجی زندگی واضح اور نمایاں ہو کر سامنے آتی ہے۔ "نقوش زنداں" کے خطوط کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ دوران قید ان پر کیا کیا گذرتی رہیں اور رضیہ کن کن حوصلوں اور محنتوں سے بچیوں کی پرداخت، ان کی تعلیم اور گھر کی ذمہ داری سنبھالتی رہیں "نقوش زنداں" سجاد ظہیر کی قربت اور محبت کی ایسی روداد ہے جو اپنے اندر بے پناہ غم و الم چھپائے ہوئے ہے، میاں بیوی کے اپنی تعلقات سے متعلق ذکر کرتے ہوئے نجمہ شہریار لکھتی ہیں کہ

سجاد ظہیر کو یاد کرنے کا (انتقال کے بعد) ایک انتہائی خوبصورت اور علامتی انداز میں سگریٹ کو دو حصوں میں تقسیم کر کے پینے کی عادت تھی جو بعد میں بھی ویسی ہی رہی، مجتبیٰ حسین صاحب نے اسے سگریٹوں کا سوشلزم کہا ہے .... بنّے بھائی کے انتقال کے بعد میں سگریٹوں کا توڑنے ان کی یاد کو مستقل تازہ رکھنے کا علامتی مظہر ہے۔ وہ آدھی سگریٹ اس لئے توڑتی تھیں، جو ان کی زندگی کا ساتھی تھا ہمسفر تھا، ان کا رفیق اور محبوب تھا جس کے ساتھ اور

---

[۱] عصری آگہی، شمارہ ۱۱، صفحہ ۲۵
[۲] نقوش زنداں، مرتبہ رضیہ سجاد ظہیر، دیباچہ جوش ملیح آبادی ۱۹۵۱ء
[۳] عصری آگہی، شمارہ ۳، صفحہ ۱۹، عصری آگہی شمارہ ۳، صفحہ ۱۹

جس کے قرب کے لئے وہ عرصہ دراز تک تڑپتی رہی۔ اور وہ " زنداں کی سیر" کرتے رکھا آدھی سگریٹ علامت ہے۔ سجاد ظہیر کے پورے وجود کی " [۱]

دوسری جگہ ایک واقعہ نجمہ شہریار نے یوں بیان کیا ہے جو دوران قید رضیہ سجاد ظہیر نے ان کی رہائی کے لئے جواہر لعل نہرو کے سامنے دھرنے دے بیٹھی تھیں اور کہہ رہی تھیں۔

" میں اس زینے سے اس وقت تک نہ ہٹوں گی جب تک آپ سجاد ظہیر کی رہائی نہ دلوا دیں گے۔ [۲]

یہ تھی اپنے شوہر کے لئے رضیہ کی محبت، تنہائی سے عاجز آ کر شوہر کی رفاقت حاصل کرنے کی کوشش اور ان کی پر عزم شخصیت، استقلال، جرأت اور ہمت جس کی غمازی مذکورہ اقتباس کرتا ہے۔

رضیہ سجاد ظہیر ادبی ماحول کی پروردہ خاتون ہونے کی وجہ سے انہیں عمر کی آخری لمحوں تک لکھتی رہیں خواتین افسانہ نگاروں میں رضیہ بسیار نویس خاتون افسانہ نگار تھیں۔ لہذا ہم انکی تخلیقات کا ایک خاکہ ممکن حد تک تاریخی تقدیم و تاخیر کا لحاظ کرتے ہوئے پیش کرتے ہیں، ان کی پہلی تخلیق جو انہوں نے کم عمری کے زمانے میں لکھی تھی اس کے متعلق وہ از خود ایک انٹرویو میں کہا ہے۔

" آٹھ سال کی تھی جب میں نے پہلی کہانی لکھی تھی نام تھا اس کا " فتح مند چیونٹیاں " اس وقت میرا نام رضیہ سجاد ظہیر نہیں تھا بلکہ میرا رضیہ دلشاد تھی اور میرے اسی نام سے یہ کہانی " پھول " اخبار میں شائع ہوئی " [۳]

اسی ضمن میں انہوں نے ایک دلچسپ بات کہی ہے کہ وہ افسانہ کیوں لکھتی ہیں

" اس لئے لکھتی ہوں کہ افسانہ نگاری میری فطرت ہے یہ تو میرے خون میں رچا ہوا ہے اسی سلسلے میں ایک بتا دوں کہ ہر افسانہ ختم کرنے کے بعد سوچتی ہوں کہ اب شاید کوئی افسانہ نہ لکھ سکوں گی لیکن کچھ دنوں کے بعد پھر کوئی افسانہ اپنے آپ دماغ میں کلبلانے لگتا ہے، اسی لئے تو میں نے کہا تھا نہ کہ افسانہ نگاری میری فطرت ہے " [illegible]

رضیہ کا یہ بیان اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ وہ بنیادی طور پر افسانہ نگار رہیں نہ کہ قصداً لکھتی تھیں اس سلسلے میں بہت سارے واقعات لوگوں نے ان کی افسانہ نگاری اور افسانہ پڑھنے سے متعلق لکھا ہے، آگے کہہ چکا ہوں کہ خواتین افسانہ نگاری کے باب میں رضیہ بسیار نویس افسانہ نگار تھیں۔ انہوں نے تقریباً ڈھائی سو افسانے لکھے اس میں ان کا ایک افسانہ بعنوان " واپس نہ آئے " بین الاقوامی انعام یافتہ ہے جو شاہراہ کے شمارہ ۵، ۶ میں شائع ہو چکا۔ ان کی شروع کی کہانیاں " تہذیب النسواں " پھول اور عصمت وغیرہ میں شائع ہوئی تھی لیکن باضابطہ طور پر انہوں نے آزادی کے بعد لکھنا شروع کیا اور کچھ ہی دنوں میں خواتین افسانہ نگاروں میں اپنا ایک نمایاں مقام حاصل کر لیا، اپنی افسانہ نگاری سے متعلق رضیہ سجاد ظہیر نے ماجدہ اسرسے ایک ملاقات میں اظہار خیال کرتے ہوئے کہا تھا کہ۔

لکھنا میں نے بمبئی سے شروع کیا تھا، ویسے میں شادی سے پہلے بھی لکھتی تھی لیکن اس وقت

---

[۱] جانی پہچانی، مرتبہ نریش کمار شاد، صفحہ ۸۳، ۸۴
[۲] ایضاً ایضاً صفحہ ۸۴
[۳] آجکل، فروری ۱۹۸۱ء، صفحہ ۴۲

> صرف عورتوں کی میگزین کے لئے لکھنے کی اجازت ملی ہوئی تھی۔ میں چھوٹے چھوٹے مضامین لکھتی تھی اور نفسیاتی چیزیں بھی۔ بمبئی میں ۱۹۴۳ء میں ایک افسانہ لکھا جناح صاحب نے ۱۹۴۶ء میں سیدھا ایکشن شروع کیا تو میں نے قومی یکجہتی کو لیکر لکھا، زیادہ تر میں نے افسانے ہی لکھے ہیں۔ ویسے بھی میں کم ہی لکھنا پسند کرتی ہوں، خود بھی کم لکھتی ہوں اور سوچتی ہوں کہ زیادہ نہیں لکھنا چاہیئے.................. لکھنے کے لیے اچھا لکھنا بہت ضروری ہے۔ اس زمانے میں میں نے ہندی بھی پڑھی الہ آباد میں یہ قاعدہ تھا کہ اردو ایم۔ اے کے ساتھ ایک پرچہ ہندی کا بھی دینا پڑتا تھا، مجھے ہندی پڑھنے کا شوق تھا۔ اس لئے لکھنؤ میں میں نے ایک ماسٹر رکھکر ہندی پڑھی۔ ؎

ابھی حال ہی میں ان کے افسانوں کا ایک مجموعہ "زرد گلاب" کے نام سے سجاد ظہیر اور رضیہ سجاد ظہیر میموریل کمیٹی والوں نے ہاؤس کشنا پورم۔ جواہر لعل نہرو یونیورسٹی سے شائع کیا۔ اس کتاب پر مغربی بنگال اردو اکادمی نے ہزار روپے کا ایوارڈ دیا۔ اور اتر پردیش اکادمی نے ۱۹۸۱ء میں بہترین افسانوی مجموعہ کے لئے ڈیڑھ ہزار روپے انعام دیا۔ اس کے علاوہ بھی کئی مجموعے طباعت کے مراحل سے گذر رہے ہیں جن میں (۱) اللہ دے بندہ لے (۲) راون جلا نہیں (۳) یہ شریف لوگ، (۴) اللہ دے کا ذکر خصوصیت سے کیا جا سکتا ہے۔

ان کی تخلیقات میں افسانوں کے علاوہ ناول اور ترجمے بھی شامل ہیں۔ ۱۹۵۲ء میں ان کا ادیبوں اور فن کاروں کی کانفرنس رپورٹ لکھیں۔ ۱۹۵۳ء میں "سر شام" نام ناولٹ شائع ہوا۔ ۱۹۵۹ء میں "کانٹے" کے نام سے ایک ناول شائع ہوا اور اسی سال "نقوش زنداں" بھی مرتب کیا۔ ۱۹۶۳ء میں "سمن" عنوان سے ایک ناول شائع ہوا۔ ان کے علاوہ بچوں کی کہانیاں مختلف زبانوں کے ادبیات کا ترجمہ ہندی کے معیاری ناولوں کے ترجموں کی ایک طویل فہرست ہے جو حسب ذیل ہیں اور ان میں مطبوعہ اور غیر مطبوعہ دونوں شامل ہیں۔

(۱) "پھول اور سموم" (۲) "کھڑیا کا گھیرا" (بریخت) (۳) "گیلیلیو" (بریخت) (۴) گورکی کی سوانح حیات (۵) "بنتی بگڑتی تصویریں" (بھگوتی چرن ورما) (۶) "عورت" (سیا رام چرن گپت) (۷) "گنگا چیل کے پنکھ" (مولک نندن سہائے) (۸) "بوند اور سمندر" (امرت لعل ناگر) (۹) "اسود لاع گیسری جمیلہ" چنگیز زموی (۱۰) صدرالدین عینی سوانح حیات (۱۱) "دیوانہ مر گیا" (مجاز کی زندگی پر ایک مکمل ناول) (۱۲) ان کے علاوہ "یہودی کا بیٹا" (۱۳) اسلا زین العابدین (۱۴) "چیل کے پنکھ" (۱۵) "ہمارے ناولوں کی کہانی" (۱۶) "بہت دن ہوئے" (۱۷) "اردو بہت دنیا" ان کی ایک کتاب "روس کی بہترین کہانیاں" کے نام سے بھی شائع ہوا، رضیہ نے قومی دار الاشاعت کے لئے "انسان ارتقاء" پورے شمس کی ایک روسی کتاب کا بڑا سلیس اور شگفتہ ترجمہ کیا ہے "انسان کے عروج" کے عنوان سے لاہور سے طبع ہو چکا اس کے بعد انہوں نے ایک طویل روسی ناول "چنگیز خان" کا ترجمہ بھی کیا۔ ملک راج آنند کی ناول "قلی" کا بھی ترجمہ کیا۔

رعنا دلشاد سے رضیہ سجاد ظہیر تک کہانی کی زندگی اپنے اندر بہت سارے صفات اور نقوش لئے ہوئے ہے۔ ان کی ۶۲، باسٹھ سالہ زندگی کا بغور مطالعہ کرنے سے پتا چلتا ہے کہ اپنی زندگی میں انہیں خاردار جھاڑیوں سے بھی گذرنا پڑا۔

؎ "زرد گلاب" افسانوی مجموعہ، دیباچہ صالحہ عابد حسین صفحہ ۱۷

بھی مغلی کی زندگی گزارنی پڑی اور کچھی مترجمی کی۔ دراصل رضیہ شروع ہی سے ترقی پسند اور انسان دوستی کے خیالات سے معمور تھیں، اس کے بعد انہوں نے سجاد ظہیر کے عقیدوں اور خیالوں کو اس طرح اپنایا کہ دونوں میں تمیز مشکل ہو گیا اندان کی بے حد پیاری، نازو نعم میں پرورش پائی رضیہ کے چند سالوں کے بعد ہی ایسی سخت مصیبت اور امتحان سے گذری جو کم ہی عورتوں کو درپیش ہوتے ہیں۔ سجاد ظہیر اور ان میں صرف جزباتی محبت نہیں تھی بلکہ ذہنی اور دلی قرب بھی تھا۔ صالحہ عابد حسین "زرد گلاب" کے دیباچے میں لکھتی ہیں کہ

"رضیہ سجاد ظہیر ترقی پسند تھیں۔ کمیونسٹ خیالات رکھتی تھیں۔ شوہر کی ہمنوا تھیں، نوجوانوں کی رہنمائی بھی کرتی تھیں، مگر ان میں قدرتی طور پر ایک عجیب ان کی شخصیت کا جزو بھی تھی اور لہجے میں بھی گھلتی ہوتی تھی۔ انداز میں ملائمت کی گرمی ہوتی تھی، وہ دوسروں کے خیالات کا عزت بھی کرتی تھیں اور ایک حد تک اپنی مذہبی اور معاشرتی روایت کا احترام بھی ان کی سیرت کی خصوصیت تھی وہ کٹر نہ تھیں، انتہا پسند نہ تھیں"[1]

اپنی صفات کے وجہ کر رضیہ کی شخصیت ہفت صفت معلوم ہوتی ہے ان کی ترقی پسندی میں انتہا پسندی کا عنصر قطعی نہیں، تمام چیزوں پر ان کی انسان دوستی مقدم تھی۔ حالات کے جائزے بتاتے ہیں کہ سخت سے سخت ترین حالات میں بھی انہوں نے کسی کا سہارا نہیں لیا بلکہ اپنی ہمت اور شجاعت کی بدولت پوری ذمہ داری کو خوش اسلوبی سے نبھایا، انہوں نے ساری عمر اپنی آدرشوں کی خدمت کی اور نامساعد حالات میں بھی زمانے سے سمجھوتہ نہیں کیا، ایک انسان کی حیثیت سے انکی شخصیت میں بے پناہ کشش تھی، شفقت، محبت، رواداری، دردمندی اور ہمدردی کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر تھا اسی وجہ سے ان کی شخصیت اتنی عظیم اور پروقار لگتی ہے۔ رضیہ سجاد ظہیر ایسی خاتون تھیں جنہوں نے نہ صرف اپنے قلم سے زبان و ادب کی خدمت کی بلکہ عملی طور پر بھی اس کی ترویج و ترقی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور ایک پوری نسل کی رہنمائی کی۔ انہوں نے عورتوں کی فلاح اور بہبودی کے لئے نمایاں خدمات انجام دیں اور تادم آخر اپنی تحریروں کے ذریعے سماجی استحصال اور برائیوں کے خلاف جدوجہد کرتی رہیں۔

سجاد ظہیر کی زندگی صرف ایک فرد کی زندگی نہیں تھی بلکہ ایک دور کے طرز فکر کا تعین کا اعلان بھی تھا اور رضیہ سجاد ظہیر اس دور کا ایک اہم حصہ ثابت ہوئیں۔ ان دونوں نے نہ صرف ایک دوسرے کو سہارا دیا بلکہ ان دونوں کے متزاج سے ایک نئی اور کامل شخصیت وجود میں آئی جس نے ایک صدی تک بہت بڑی ادبی تحریک کو چلایا۔

رضیہ کے انہیں کارناموں اور پرخلوص خدمات کے صلے میں ادبی دنیا نے انہیں سنہ ۱۹۶۶ء میں "نہرو ایوارڈ" [illegible] میں "یوپی اردو اکادمی ایوارڈ" اور [illegible] میں "اکھل بھارتیہ سکھیہ کا سنگم" ایوارڈ سے نوازا۔ رضیہ سجاد ظہیر جیسی شخصیت ایک دور کی پیداوار تھی اس لئے عہد ساز شخصیتوں میں انہیں بھی شمار کرنا عین مناسب ہوگا۔

پرنٹر، پبلیشر، ایڈیٹر مسعود منظر نے ملت آرٹ پریس، پٹنہ میں چھپوا کر دفتر ماہنامہ سہیل ریڈ سائیڈ روڈ، گیا سے شائع کیا۔

ترقی اُردو بیورو کی نئی مطبوعات

کتاب کا نام	مصنف / مترجم	قیمت
۱۔ پریم چند	پروفیسر قمر رئیس	۱۱—۵۰ روپے
۲۔ میر تقی میر	ڈاکٹر نثار احمد فاروقی	۱۰—۰۰ روپے
۳۔ ہندوستانی عہد وسطیٰ کے مورخین	محب الحسن / مسرور علی ہاشمی	۲۵—۰۰ روپے
۴۔ فرہنگ سیاسیات	محمد محمود فیض / محسن علی جعفری	۳۸—۰۰ روپے
۵۔ کلیات سودا جلد اوّل	پروفیسر محمد حسن	۲۹—۰۰ روپے
۶۔ محدد جیومیٹری	ایچ سی گپتا / رگھبیر پرشاد	۳۵—۰۰ روپے
۷۔ اُردو صرف و نحو	ڈاکٹر اقتدار حسین خان	۱۶—۰۰ روپے
۸۔ جدید ہندوستان کے سیاسی اور سماجی افکار	ڈاکٹر [illegible]	۳۷—۰۰ روپے
۹۔ کلاسیکی برق و مقناطیسیت	[illegible]	۵۰—۰۰ روپے
۱۰۔ علم الادویہ	[illegible]	۲۲—۰۰ روپے
۱۱۔ ابنارمل نفسیات	[illegible] / ذکیہ [illegible]	۴۰—۰۰ روپے
۱۲۔ تجارت و بین الاقوامی معاملات خارجہ	[illegible] کتاب	۱۶—۰۰ روپے
۱۳۔ گھریلو سائنس	لیڈی اروِن کالج / طاہرہ عابدین	۳۵—۰۰ روپے
۱۴۔ تعلیم کی نفسیاتی اساس	[illegible] بخش قادری	۶۵—۰۰ روپے
۱۵۔ اورنگ زیب کے عہد میں مغل امرا	محمد اطہر علی	۲۸—۰۰ روپے
۱۶۔ ہندوستانی سیاست میں مسلمانوں کا عروج	رفیق زکریا	۳۶—۰۰ روپے

ان کے علاوہ مندرجہ ذیل کتابیں دوبارہ شائع ہو گئی ہیں

کتاب کا نام	مصنف / مترجم	قیمت
۱۔ ادب کیسے پڑھیں	[illegible]	۱—۸۵ روپے
۲۔ تاریخ شاہجہاں	[illegible]	۱۴—۰۰ روپے
۳۔ تاریخ جہانگیر	بینی پرشاد / [illegible] علی الہاشمی	۱۸—۷۵ روپے
۴۔ تعلیمی تشکیل نو کے مسائل	[illegible]	۱۳—۷۵ روپے
۵۔ تعلیم ہندوستان کے مسلم عہد حکومت میں	[illegible] جعفر / سعید انصاری	۱—۲۵ روپے
۶۔ انعام کی کہانی	[illegible]	۲—۵۰ روپے
۷۔ قومی تہذیب کا مسئلہ	ڈاکٹر عابد حسین	۹—۶۰ روپے
۸۔ اصول معاشیات	[illegible] نظامی	۱—۷۰ روپے
۹۔ شعریات	ارسطو / شمس الرحمٰن فاروقی	۵—۲۵ روپے
۱۰۔ [illegible]	[illegible] فاروقی	۱۰—۰۵ روپے

بیورو کی کارکردگی اور کتابوں سے متعلق ضروری معلومات بیورو کے سہ ماہی خبرنامے "اُردو دنیا" میں دی جاتی ہیں جسے مفت حاصل کیا جا سکتا ہے

بیورو کی تمام کتابیں اُردو کے تمام کتب فروشوں سے حاصل کی جا سکتی ہیں۔

شعبۂ فروخت و نمائش، ترقی اُردو بیورو، ویسٹ بلاک ۸، آر۔ کے۔ پورم نئی دہلی ۱۱۰۰۶۶

پروین شاکر

ن کے موسم بے اختیاری میں

ی دن زندگی میں ایسا آئے
یرے دھیان میں کھو کر
، شہریاری بھول جائے
اس شدت سے یاد آؤں
کلومعہ کلاہی بھول جائے
ے بھی سارے رشتے ، رے ناتے
فراموشی بہالے جائے
دنیا سمٹ کر تیری باہوں میں سما جائے
کے موسم بے اختیاری میں

، پل
بل شہر سے باہر
ار چادر و دستار کی حد سے نکل کر
لمحے کو ــــ بس ایک لمحے کو
پنے مقدر آزمالیں ـــــ
ب ممنوع سے اک پل چرالیں !

افتخار عارف

ایک رخ

وہ فرات کے ساحل پر ہوں یا کسی اور کنارے پر
سارے لشکر ایک طرح کے ہوتے ہیں
سارے خنجر ایک طرح کے ہوتے ہیں
گھوڑوں کی ٹاپوں میں روندی ہوئی روشنی
مقتل سے دریا تک پھیلی ہوئی روشنی
جلے ہوئے خیموں میں سہمی ہوئی روشنی
سارے منظر ایک طرح کے ہوتے ہیں
ایسے ہر منظر کے بعد ایک سناٹا چھا جاتا ہے
یہ سناٹا طبل و علم کی دہشت کو کھا جاتا ہے
سناٹا فریاد کی لے ہے احتجاج کا لہجہ ہے
یہ کوئی آج کی بات نہیں ہے بہت پرانا قصہ ہے۔
ہر قصے میں صبر کے تیور ایک طرح کے ہوتے ہیں۔
وہ فرات کے ساحل پر ہوں یا کسی اور کنارے پر
سارے لشکر ایک طرح کے ہوتے ہیں۔

الیاس انصاری

میرے خدا اس عذاب سے اب نکال دے تو
میں جل رہا ہوں مجھے سمندر میں ڈال دے تو

میں جس پرندہ کے ساتھ اُڑنے کو مضطرب ہوں
اُسے سبک پیر کر ہوا میں اُچھال دے تو

کوئی ندی بہتے بہتے سینے میں رک گئی ہے
نوکیلے پتھر سے مار اس کو کھنگال دے تو

پسند ہوں تو جلا بدن میں چراغ جیسا
جچا نہیں ہوں تو شہرِ جاں سے نکال دے تو

تو ساتھ چل کائنات کے پار لے چلوں میں
جو خود کو محدود دائروں سے نکال دے تو

میرے دریچوں پہ سبز منظر کرم ہیں اس کے
حسد سے باتیں نہ کر دعا حسبِ حال دے تو

تو اپنے جوہر کو سرخ پھولوں میں ڈھلتا دیکھے
جھلستے موسم کو گل مہر کا جمال دے تو

میں چاہتا ہوں کہ خوش لباسوں میں لوگ گھومیں
برہنہ نظروں کو بھول جا خاک ڈال دے تو

نشتر خانقاہی

کود کر طوفان میں دریا کے پار آتے نہیں
اہلِ حق اب سر کٹانے سوئے دار آتے نہیں

بوڑھی آنکھیں دیکھتی ہیں پھول مرجھاتے ہوئے
اب گرو دہلیز پہ امیدوار آتے نہیں

آخری صف کٹ رہی ہے مورچہ پر جنگ کے
چھاؤنی سے اب کمک لیکر سوار آتے نہیں

اب بھی ہیں سنگِ لحد پر کتنے سائل سرنگوں
دستگیری کو مگر اہلِ مزار آتے نہیں

کر سکو تو قید کر لو ہم نشینی کے یہ پل
زندگی میں ایسے لمحے بار بار آتے نہیں

غزلیں

اختر شاہجہانپوری

ہیں چہرے پہ کچھ لکھا نہیں ہے
سی کا ہو مرا چہرا نہیں ہے

نہر کی کشتیاں چلتی ہیں اب بھی
دریا ۔۔ کا اترا نہیں ہے

ے پیروں میں زنجیریں نہ ڈالو
نوں کا قافلہ رکتا نہیں ہے

صداقت ہے ابھی معتوبِ دنیا
سی باعث وہ سچ بولا نہیں ہے

مارت پر نہ اتراؤ کہ اب تک
بلندی پر کوئی ٹھہرا نہیں ہے

سبھی شکوہ گزارِ تیرگی ہیں
دیا میری طرح جلتا نہیں ہے

اکیلے پن کو سب روتے ہیں اختر
بظاہر کوئی بھی تنہا نہیں ہے

جنید حزیں لاری

جو یوں ہی بدلا کیا عالمِ اسباب کا رنگ
اڑ نہ جائے مری آنکھوں سے کہیں خواب کا رنگ

رات بھر جیسے کہ انگاروں پہ تھی رقص کناں
صاف کہتا ہے یہی شبنمِ شاداب کا رنگ

رنگ اور نور کا اک سیلِ رواں ہو جیسے
قابلِ دید ہے یارو! شبِ مہتاب کا رنگ

شوخ جتنا بھی ہو یہ زندگی پائے گا کہاں؟
دل کے آگے نہ کبھی جم سکا سیماب کا رنگ

اب نہ پہلی سی محبت، نہ مروت، نہ وفا
کتنا بے کیف ہوا محفلِ احباب کا رنگ

اے حزیں! کون بھلا دام لگائے اُن کا
کس نے دیکھا ہے مرے گوہرِ نایاب کا رنگ

ایم۔ آر قاسمی

بُجھا چکی ہے ہوا جس کو وہ دیا بھی میں
مگر یہ دیکھ! بہت دیر تک جلا بھی میں

طویل دھوپ کی شدت، ہواؤں کی یورش
سہی بھی میں نے سرِ دشتِ غم، کھِلا بھی میں

ملے قیام کے احکام بھی مجھی کو یہاں
مسافتوں کا پرستار ایک تھا بھی میں

مجھی سے آئی تھی ملنے اداس چاندنی رات
اگر یہ جانتا ہوتا تو جاگتا بھی میں

مرے نصیب میں پت جھڑ کے راستوں کا سفر
سدا بہار دیاروں سے آشنا بھی میں

مری طرف سے کبھی بارشیں بھی پھولوں کی
حصارِ سنگ و صدا میں گھرا ہوا بھی میں

یہ سوچتا ہوں کہوں خود کو قاسمی میں کیا؟
سکوت بھی مرے اندر بہت صدا بھی میں

انتخاب سہیل گیا

نعمان شوق

یاد جمیلہ کبھی جناب آئے
جب سفر میں مرے سراب آئے

جن پہ تاریخ بھی ہے شرمندہ
زندگی میں وہ انقلاب آئے

آستیں پر نظر رکھو اسکی
لے کے ہاتھوں میں جو گلاب آئے

میرے آنگن میں بھی اجالا ہو
میرے گھر میں بھی آفتاب آئے

تیری آنکھوں پہ میں نثار کروں
میرے لب تک اگر شراب آئے

تاج پیامی

خواب آنکھوں میں کیا ثبات کریں
زندگی میں تغیرات کریں

لطف جینے کا راحتوں میں نہیں
زندگی نذر حادثات کریں

خوف لگتا ہے اپنے سائے سے
دورِ حاضر میں کیا حیات کریں

شاعری کا زمانہ ختم ہوا
آؤ تسخیرِ کائنات کریں

کوئی سنتا نہیں ہے دل کی بات
کس سے اے تاج دل کی بات کریں

ملک زادہ جاوید احمد

نئی ہے پر یہ عبادت بہت ضرو
اداس لوگوں سے شفقت بہت ضر

کہاں کا نام و نسب اب کہاں کی خود
ہمارے عہد میں دولت بہت ضرو

پرانی قدروں کا منکر نہیں ہوں لیکن
غزل میں لہجے کی ندرت بہت ضر

وہ جھوٹ بولے تو سب کو یقین
میں سچ کہوں تو شہادت بہت ضر

فرشتے روزی تری لیکے لوٹ جائ
سویرے اٹھنے کی عادت بہت ضرو

کلیم حاذق

آنکھ جس کی تھی بجلیاں پکڑے
اس کو دیکھا سلائیاں پکڑے

زیست کی راہ کتنی آساں ہے
کون گھڑیوں کی سوئیاں پکڑے

جہاں شاعری کچھ ایسی تھی اس کی
ڈوبتا بھی تو رسیاں پکڑے

پھر وہ بے نام سی خلش دل کی
باغ میں جائے تتلیاں پکڑے

سانحہ ہر گھڑی نیا ہے کلیم
کون بیٹھے نشانیاں پکڑے

ڈاکٹر تسخیر فہمی

مایوسیوں کی بولتی تصویر ہو گئے
یعنی ہم اپنے خوابوں کی تعبیر ہو گئے

وا ماندگی کا اپنی گلہ کس سے کیجئے
ہم خود ہی اپنے پاؤں کی زنجیر ہو گئے

دیوانہ جن کو کہتے تھے بستی کے کور ذوق
وہ اہلِ دل پیمبرِ تنزیر ہو گئے

مجھ سے کوئی تعلق خاطر نہیں اگر
کیوں آپ مجھ کو دیکھ کے دلگیر ہو گئے

یہ بھی یہ تیرے نام کی تاثیر ہی تو ہے
کچھ مہوشانِ شہر جو تسخیر ہو گئے

عقیل گیاوی

وسعتِ حرف و صوت میں بحرِ معانی لوگ
میں تو اک کردار تھا روشن کہانی لوگ

سرد موسم کی خراشیں اپنے جسموں پر لئے
دھوپ اگلتے ہوئے صحرا میں دھانی لوگ

وہ چراغوں میں مقید روح کے قائل
تھے بہت معصوم لیکن داستانی لوگ تھے

جب جدھر چاہا سفر کا دیپ روشن کر دی
ہم مکاں والوں سے بہتر لامکانی لوگ تھے

عمر بھر لڑتے رہے تھے جو ہواؤں سے عقیل
اب کھلا یہ مجھ پہ وہ سب بادبانی لوگ تھے

سہیل اگیا

یعقوب سرونجی

ما بھے قریب سے تو زرد ہو گیا
ہے کہ کوئی چور اچانک پکڑا گیا

ب خون جس پہ مارنے نکلا تھا گھر سے وہ
ں ہاتھ خود اسی دشمن کے پڑ گیا

کا ہر ایک زخم تو اس نے چھپا لیا
ن غموں کی باڑھ سے چہرہ بگڑ گیا

تھا راہ میں ہر شخص کو مگر
ے چلی ہوا کہ شجر وہ اکھڑ گیا

سنا ہے اس کو یاد نہ رونا مرا اسکو یاد
جانے کس عذاب میں بستی جکڑ گیا

شانتی

خوابوں سے کبھی خالی نہیں جاتی
ب کے سر زندگی ٹالی نہیں جاتی

ی ہے بھور کا تن اور بھیگا من
لمے میں اب پیاس یوں ٹالی نہیں جاتی

نہیں اتنی لگی ہیں ان زبانوں پر
ت میں کبھی اب خلش ٹالی نہیں جاتی

سورج اب کریں پیدا سویرا گھروں میں
ی کی بات یوں ٹالی نہیں جاتی

م تسلیم جو ایسا نہیں ہوتا
کھر پر بھی نگاہ ڈالی نہیں جاتی

عزیز الرحمٰن بھاگل پوری

جل گیا دور تک آسماں دھوپ میں
سایہ بھی مانگتا ہے اماں دھوپ میں

ساحلوں پر جلا ڈالیں سب کشتیاں
ریت کی فرش پر دی اذاں دھوپ میں

ہر تمازت کا نقشِ حسیں مٹ گیا
ہر تعلق ہوا بے نشاں دھوپ میں

لٹ گئی ہر متاعِ سکونِ نظر
مٹ گیا رنگِ احساسِ جاں دھوپ میں

خاک بن کر اڑیں آرزوئیں عزیز
زندگی ہو گئی رائیگاں دھوپ میں

اصغر راز فاطمی

آنکھوں کی گہرائی ناپ
ساگر کی پہنائی ناپ

کرنوں کی پیمائش چھوڑ
سورج کی گہرائی ناپ

میرے دل کی دھڑکن تول
موسم کی انگڑائی ناپ

ہنستے لمحوں کے ساتھی اب
آ میری تنہائی ناپ

جیون کا ہر سکھ ہر دکھ
کہتا ہے ہرجائی ناپ

حسن نظامی

مدت سے بھی در و دیوار نہ سجائے ہوں گے
پلکوں پہ مگر ہی حسیں خواب سجائے ہوں گے

وقت کے ساتھ بدل جاتے ہیں جیسے سارے
آج اپنے ہی رہے لوگ پرائے ہوں گے

لوگ پتھراؤ ابھی جس پہ کرتے ہوں گے
آپ شیشے کی دکانوں کو سجائے ہوں گے

اتنا آساں بھی نہیں تھا یہ حصولِ منزل
حوصلے ہم نے بہت اپنے گنوائے ہوں گے

یونہی احساسِ ندامت نہیں انکو ہے حسن
اپنے ہاتھوں سے ہی گھر اپنے جلائے ہوں گے

نیاز سلطانپوری

لحظہ لحظہ خانۂ دل کو زخموں سے آباد کروں
کس کس کو مجرم ٹھہراؤں کس کس سے فریاد کروں

اک اک کر کے سارے رشتے میرے اسکے ٹوٹ گئے
اس پر بھی دل کی یہ ضد ہے پیہم اسکو یاد کروں

جس سے نامِ محبت چمکے اور وقارِ عشق بڑھے
شہرِ وفا میں کم سے کم اک ایسی رسم ایجاد کروں

شاعر کا معیارِ ادب جب ہو جائے عریانی تک
فکر و نظر کو میں بھی بدلوں لفظوں کو آزاد کروں

قید میں رہ جاتا ہے انساں اک حد تک تب نیاز
لفظوں کے پنجرے کو توڑوں معنی کو آزاد کروں

"میری زندگی ہی میرا پیغام ہے"

صداقت
عدم تشدد
امن
محبت
رواداری
بے خوفی
مساوات
سادگی
سودیشی

گاندھی جی کے لئے، یہ صرف کھوکھلے الفاظ یا علامتیں نہیں تھیں۔ یہ ان کے ہر عمل، ہر قدم کی کسوٹی تھی، انہیں خوبیوں نے ان کی زندگی کو انسانی قدروں کا بہترین نمونہ بنا دیا۔ ان کے ہر قول کو ایک پیغام کی حیثیت دے دی۔

ایک پیغام، جو ہمارے ہمیشہ مشعل راہ ہے



افسانہ

ڈاکٹر ادے سرن اداس
(بلاروی)

اترا ہوا چہرہ

دوپہر کو سکھیا جب اپنے شوہر کو کام پر کھانا پہنچانے جاتی تھی تو بہت سی عورتوں کو اینٹ گارا لاتے لیجاتے دیکھتی اور سوچتی تھی کہ اگر ان عورتوں کے شوہر بھی اس کے شوہر کی طرح محنتی ہوتے تو یہ بیچاری عورتیں یہاں اتنی محنت کرنے نہیں آتیں۔ سوچتے سوچتے اس کی تنی ہوئی بھویں پھر ڈھیلی ہو جاتیں جیسے وہ سوچ رہی ہو کہ کیا پتہ ان کے شوہر ہوں کوئی مجبوری ہی ہو۔ وہ کھانا کھلا کر چلی آتی مگر ان کے بارے میں طرح طرح کے خیالات ابھرتے رہتے۔ اس کو کیا پتہ تھا کہ کبھی یہی حالت اس کے سامنے کبھی آجائے گی۔ ایک دن زیر تعمیر اسکول کی چھت سیمنٹ کی کمی سے ڈھیلا ہونے کے سبب الدر پدر نیچے گر گئی اور چار مزدور اس کے ملبے میں دب گئے جن میں سکھیا کا شوہر بھی تھا۔ ابھی وہ ایک ہی بچے کی ماں بنی تھی بہت جلد ہی قدرت کے ظالم ہاتھوں نے اس کا سہاگ چھین لیا۔ سسرال میں بھی ٹھیک ٹھکانہ نہیں تھا۔ مائکے والے غربت کے شکار تھے۔ وہ بھی کسی پر بوجھ بننا نہیں چاہتی تھی اس کے شوہر کی اچانک موت نے اس کو اس کے استقلال کی جانچ لینے کے لئے غم حیات کی وادی میں ڈھکیل دیا۔ غریب اور مجبور حالات سے سمجھوتہ کرنا سیکھ جاتا ہے۔

شوہر کی موت کے بعد سکھیا نے سب ہمت ہار کر انہیں عورتوں کے ساتھ کام کرنا شروع کردیا۔ بچے کو ڈگر سے [illegible] کے حوالے کر دیا اور کام میں لگ جاتی جب بچہ روتا تو جلدی جلدی دودھ پلا جاتی۔ ایک عمارت پوری ہوتی تو اسی ٹھیکیدار کی دوسری بلڈنگ پر دوسرے مزدوروں کے ساتھ کام کرنے لگتی غرض پڑھے لکھے بے روزگار نوجوانوں کی طرح اسے نوکری کے فراق میں روزگار دفتروں کے چکر لگانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔

ہاری تھکی سکھیا جب شام کو گھر آتی اور چارپائی پکڑتی تو دلہن کی طرح اس کو گھنٹوں نیند نہیں آتی طرح طرح کی باتیں اسکے دل و دماغ میں چکر کاٹتی رہتیں۔ کبھی شوہر کے ساتھ بتائی ہوئی سکھ کی گھڑیاں یاد آتیں کبھی تنہائی کی کرب انگیز زندگی۔ کبھی حسین گداز جسم کے بھوکے بھیڑیوں کا خوف دامن گیر ہوتا کبھی چھوٹے بچے کے تاریک مستقبل کو منور بنانے کا غم۔ کبھی شدت یاس و حرماں سے روتی جھلکتی تو کبھی نیک نفیس خواتین کی زندگیوں سے سبق حاصل کرکے ہمت کے ساتھ باعزت زندگی گذارنے کے طریقے سوچتی۔ اسی طرح روز شام کو تین چار گھنٹے گذر جاتے۔ دھیرے دھیرے اس کو اس طرح سوچنے اور پچھتانے سے چڑ ہو گئی اور وہ کچھ کام کرنے کی سوچنے لگی۔ بہت سی بے سہارا عورتیں اپنے گھروں میں خالی وقت میں انیکوں کام کرتی ہیں جیسے کاغذ کی تھیلیں بنانا سوئٹر بننا خربوزے کے بیج چھیلنا سوت کاتنا بچوں کے کپڑے سینا۔ کپڑے دھونا، ان پر پریس کرنا کھلونے بنانا وغیرہ وغیرہ مگر اس کو ان میں سے کوئی کام ٹھیک نہیں جچا اور اس نے چند محلوں کی [illegible] طے کر لیا۔ لہذا

شام کو سب کی دکانوں سے دال لے آتی اور اگلے دن پیس کر پہنچا دیتی، شام تک مزدوری کرتی اور کافی رات تک پھٹی پیستی رہتی، اب اس کے پاس اتنا کام آنے لگا کہ زندگی کی پریشانیوں کے بارے میں سوچنے کا وقت ہی نہیں ملتا تھا۔ بیاہ شادیوں کا کام بھی اس کے پاس آنے لگا۔ کچھ حلوائی تو اس پر ترس کھا کر دانستہ اس کے پاس دال بھجواتے تھے

کافی رات تک اس کے گھر میں سل کھٹکنے کی آواز آتی رہتی تھی۔ چند حساس اور بھلے پڑوسیوں نے مل کر چندہ ڈال کر اس کو پھٹی پیسنے کی مشین ہی لا کر دیدی جس سے اس کا وقت اور دقت گھٹ گئی۔ آرام کی گھڑیاں اور آمدنی بڑھ گئی سارے پڑوسی اس کی حفاظت کرتے تھے اور سکھ دکھ کا دھیان رکھتے تھے۔

میں بھی اپنی بیٹی کی شادی میں حلوائیوں کے کہنے سے پھٹی پسوانے کے لئے دال سکھیا کے گھر ہی دینے آیا اس وقت شام کے چھ بجے تھے۔ اور وہ روٹیاں بنا رہی تھی "کیا ہو رہا ہے سکھیا بیٹی"؟ میں نے اسکو متوجہ کرتے ہوئے کہا۔ "روٹی بنا رہی ہوں کاکا" سر پر پلو رکھتے ہوئے سکھیا نے جواب دیا۔ "ساگ سبزی بن گئی ہے؟" میں نے یونہی بے ضرورت پوچھا وہ مسکراتے ہوئے بولی "کاکا نمک اجوائن ملا کر روٹیاں بنا رہی ہوں ایک پیٹ کو کون اتنی طوالت اٹھائے۔ پھر اب کھانوں کی کچھ ٹیچ کھا کر کام پر چلی جاؤنگی کیسے آنا ہوا؟" میں نے دال کی بالٹی آگے بڑھا دی "بیٹی پھٹیوں کے لئے دال پسنی ہے" وہ بولی "پس جائے گی۔ یہیں رکھ دیجئے" لڑکا ایک طرف بیٹھا بیٹھا رو رہا تھا میں نے اس سے کہا "بیٹی اس کو گود میں لیکر کھانا نہیں بنا سکتی کیا؟ اس طرح روتے ہوئے بچے پر تجھکو ترس نہیں آتا؟" یہ سنتے ہی سکھیا نے کہا "کاکا یہ چنچل بہت ہے۔ اس کا دور ہی رہنا ٹھیک ہے گود میں لے لیا تو ہاتھ پیر توڑے پھرا دیگا۔ میں روز اسی طرح کھانا بناتی ہوں۔ ایک لکڑی کی نوک پر روٹی لگا کر آٹے کی گٹی میں کھڑی کر کے اس کے سامنے رکھ دیتی ہوں۔ یہ روٹی ہوا کے جھونکے سے بار بار ہلتی ہے اور یہ اس کو دیکھتا رہتا ہے اور ڈرتا رہتا ہے۔"

مجھے اس کی ترکیب پر ہنسی بھی آئی اور دکھ بھی ہوا۔ میرے دل میں آیا کہ اس کو سمجھاؤں بچوں کو ڈرانا نہیں چاہیئے اس طرح وہ بزدل بن جاتے ہیں مگر پھر بھی مجھے میرے دل نے روکا اور کہا وہ اپنے حالات کے مطابق جو کچھ کر رہی ہے وہ ٹھیک ہی ہے۔ میں نے جب گھر میں قدم رکھا تھا تو سکھیا کے منہ میں بیڑی لگی ہوئی تھی۔ میں یہ بخوبی دیکھ لیا تھا مگر سکھیا نے میری بات سنتے ہی بیڑی اس طرح چولہے میں پھینک دی جیسے کہ میں نے اس کو دیکھا ہی نہیں تھا۔ اس نے میرا اتنا لحاظ کیا اس پر تو مجھے خوشی ہوئی مگر یہ سوچ کر دکھ ہوا کہ بڑا ہو کر اس کا لڑکا بھی اس بری لت کو اپنا لیگا۔ میں نے ہمدردی کے ساتھ بڑے ڈرامائی ڈھنگ سے کہا، "بیٹی سکھیا تیرے گھر میں بیڑی کے دھوئیں کی بدبو کہاں سے آ رہی ہے کیا مجھ سے پہلے یہاں کوئی اور بیڑی پی کر گیا ہے"؟ یہ سنتے ہی وہ چپ ہو گئی۔ یہ بھی اقرار کا ایک طریقہ ہے لیکن کچھ دیر کے بعد اس نے کہا "میں ہی پیتی ہوں"

اس نے جھوٹ نہیں بولا۔ کمال بات ہے۔ میں نے اس کو سمجھایا بیٹی یہ آدمی کی عمر سے آٹھ فیصدی عمر کم کر دیتی ہے تو نے کیوں پینا شروع کر دیا؟" سکھیا لمبا سانس لیکر کہنے لگی "کاکا ایک بار میں ایک عمارت پر کام کر رہی تھی جب کام کرتے کرتے تھک گئی تو سستانے کے لئے چونے کے پیپے پہ بیٹھ گئی مجھے کیا معلوم تھی کہ اسی وقت ٹھیکیدار بھی آ جائے گا۔ اس نے پیچھے سے آ کر بوٹ کی ٹھوکر سے میری پیٹھ میں ٹھوکے دیئے۔ اور بولا "یہاں کام کرنے آئی ہے یا آرام کرنے؟" میں چونک کر کھڑی ہو گئی جی میں تو آیا کہ پاس پڑی ہوئی اینٹ اس موٹے کے سر میں دے ماروں۔ میری طرف سے اس کی نیت پہلے ہی سے خراب تھی۔ میں بہت دنوں سے دیکھتی آ رہی تھی۔ مگر میں نے روٹی روزی کی وجہ سے اپنا منہ سی لیا تھا۔ میں کام کرتے کرتے بیٹھ گئی تھی یہ میری غلطی بھی تو تھی۔ مزدور کے نصیب میں آرام کہاں

ہے میں نے کام کرنا شروع کردیا وہ آگے بڑھ گیا۔ اسس
بہ ردیہ مجھ ہی کو نہیں وہاں کام کر رہے سبھی مزدوروں
را لگا ایک نوجوان مزدور احمد نے تو مجھ سے یہاں تک کہا
ہن جی مزدور کو تھک کر آرام کرنے کیلئے کوئی بہانا چاہیئے
ی سے اچھا کوئی بہانا نہیں ہے۔ تم بیڑی پینی شروع کردو
ہ کام کرتے کرتے ہی مر جاؤگی۔ بیڑی پیتے وقت کوئی کسی
ہیں تک تکاتا۔" وہ کہہ رہا تھا اور میں چھت پر اینٹیں
جانے کے لیے سر پر ترتیب سے رکھ رہی تھی۔ اب میں
می کہ وہاں کام کرنے والی عورتیں بیڑی کیوں پیتی تھیں۔ اگلے
ن میں نے ایک بنڈل اور ایک ماچس خرید لی شروع شروع
یں حلق سے دھنواں کھینچ کر باہر نکال دیتی تھی۔ دھنواں
ا بدبودار لگتا تھا مگر دھیرے دھیرے سب گوارہ ہوگیا
، اس کو پھیپھڑوں میں اتارنے لگی۔" اسی طرح کہتے کہتے
نیدہ ہوگئی اور رونی بنانے لگی۔

میں ٹھہر ٹھہر کر سوچ رہا تھا کہ احمد صحیح کہہ رہا تھا مزدور کو
کرنے کا کوئی بہانا چاہئے۔ جبکہ سرکاری کرمچاری
یں صرف آٹھ ہی مہینے کام کرتے ہیں اور پورے سال
راہ اینٹھ لیتے ہیں ابھی میں سال بھر کے تیوہاروں اور
دن کا حساب لگا رہا تھا کہ ایک ہیلتھ وزیٹر آگئی۔
نے سمجھا وہ چٹھی بھجوانے آئی ہوگی مگر اس کے دونوں
خالی تھے۔ میں چلتے چلتے رک گیا میرے دل میں آیا کہ
ں یہ یہاں کیوں آئی ہے۔

اس نے آتے ہی بلا تکلف بات چیت شروع کردی
ہ جی تم شادی کرنا چاہتی ہو؟" سکھیا ہونٹ بسور کر
تمہیں معلوم ہے کہ میں بدھوا ہوں" یہ سنتے ہی اس نے بتایا کہ
، وہ تو مجھے معلوم ہے مگر بدھوا کیا شادی نہیں کر
آدمی بھی تو بیوی آنے کے بعد اپنا گھر بسا لیتا ہے پھر
ت اپنے سکھ کا انتظام کیوں نہیں کرسکتی ہو؟"

بہن جی اگر میرے نصیب میں مرد کا سکھ ہوتا تو وہی
مرتا اب تو مجھے یوں ہی رہنا ہے تم کیسے آئی ہو اپنا
بتاؤ؟"

ہیلتھ وزیٹر اس کے دقیانوسی خیالات کو سدھارنے کا کوئی
ارادہ نہیں رکھتی تھی وہ فوراً اپنے مطلب پر آگئی۔ "تو بہن
نس بندی کروالو ایک سو پچاس روپئے ملیں گے اور
کبھی کوئی بھول ہوجائے تو سماج میں بے داغ بھی بنی
رہو گی۔"

"بھول کیوں ہوجائے گی ہماری مرضی کے بنا کوئی ہمارے
جسم سے ہاتھ بھی نہیں لگا سکتا عورت کے اشارہ کے بغیر
کچھ بھی نہیں ہوتا ہے" سکھیا نے تن کر کہا۔

"بہن جی آپ کا خیال صحیح ہے مگر آج ہم جس سماج
میں رہ رہے ہیں یہ بڑا بھیانک ہے۔ یہاں معصوم
انسانوں کے بھیس میں انیکوں بھیڑیے گھومتے پھرتے رہتے
ہیں۔ یہاں کتنے کام اپنی مرضی کے خلاف بھی ہوجاتے ہیں
یہاں تم اکیلی ہو اور اگر رات برات میں کوئی گھر میں......"
ہیلتھ وزیٹر کہے چلی جارہی تھی میرا بھی کوئی ادب لحاظ نہیں
کررہی تھی اس کی باتوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ سب کچھ
کہہ ڈالیگی اس لیے میں باہر چلا آیا۔ میرا خیال ہے کہ اس نے
ہر طرح سمجھا بجھا کر سکھیا کو نس بندی کے لیے تیار کرلیا
ہوگا عورت عورت کی باتوں میں جلدی آجاتی ہے۔

میں گھر پہنچا تو داروغہ جی کھڑے تھے۔ پتہ چلا کہ ہندو
مسلم فساد ہونے کے امکانات ہیں اس لیے امن آشتی
کے خیال نے لائسنس والوں کے ہتھیار جمع کیے جارہے
ہیں۔ مجھے یہ بات بڑی بے معنی اور اٹ پٹی سی لگی میں نے
داروغہ جی سے کہا" داروغہ جی لائسنس ہولڈرس تو اپنے
ہتھیاروں کا کبھی بھی ناجائز استعمال نہیں کرتے ہیں اور نہ
ان سے کسی بھی طرح کا امن امان کو خطرہ ہو سکتا ہے بلکہ
ہمارے ہتھیار جمع ہوجانے سے بلا لائسنس کے ہتھیار
والوں کو اور کھلی چھوٹ مل جائے گی۔ جو کچھ شانتی ہے
وہ بھی ختم ہوجائے گی۔ غنڈا ایلیمنٹ اور بھی غنڈا گردی
کرنے لگے گا۔ ہماری جان مال کی حفاظت کا یہ سہارا بھی
ہم سے چھن گیا تو کیا ہوگا؟" داروغہ جی میری باتیں یہ تو
سن رہے تھے۔ میرے چپ چاپ ہوتے ہی وہ بولے۔"

"چودھری صاحب یہ سرکاری قانون ہے۔ خلاف ورزی کی تو جیل میں کر دیا جائے گا اور لائسنس بھی ضبط ہو جائے گا!" یہ سنتے ہی میں نے بحث نہیں کی گھر شادی کا ماحول تھا جہاں لوگ جمع تھے۔ فوراً راشن سونپ دی۔ اور شادی کے کاموں میں لگ گیا۔

دن نکلتے ہی میں پیشی لینے سکھیا کے گھر گیا راستے بھر میرے دماغ میں سکھیا کا محنتی جیون گھومتا رہا اور پہلے وزیر کی باتیں یاد آتی رہیں۔ اصل میں وہ کہتی بھی ٹھیک تھی سکھیا شادی کر لیتی تو اس کی یہ ساری پریشانیاں ختم ہو جاتیں اور اس کی حفاظت بھی ہو نے لگتی عورت کو مرد کے زیر سایہ ہونا بہت ہی ضروری ہے۔ دن بھر بچے کو ٹھکانے لگا کے کام کرتی ہے روکھی سوکھی روٹی کھاتی ہے رات کو چکی پیسنے سے جو وقت بچتا ہے اس میں آرام کرتی ہے کیا اتنی بڑی قربانی صرف اسی لئے ہے کہ اس کے شوہر کی شان بڑھ رہی ہے اور اپنے خاندان کا مان سمان بنا رہے صرف اتنی سی واہ واہی سننے کے لئے کہ فلاں کی بیوی فلاں کی بیٹی بڑی نیک نفیس نکلی تمام زندگی بے عزت بسر کر لی۔ یہ تو کوئی بات نہیں ہوتی۔ آدمی اپنی کئی شادیاں کر سکتا ہے مگر عورت کو یہ آزادی حاصل نہیں ہے سماج کا خود پیدا کردہ یہ بندھن میری سمجھ میں نہیں آتا بلکہ عورت ذات کے ساتھ مردوں کا یہ ایک طرح کا ظلم ہے اس طرح تو سماج میں اور بھی مسائل اور گناہوں کا جنم ہوتا ہے۔ اس طرح سوچتا بچارتا میں سکھیا کے گھر پہنچ گیا۔

"سکھیا بیٹی میں آگیا ہوں پیشی اٹھا دو" ادھر کھلے دروازے کی زنجیر کھٹکھٹاتے ہوئے میں نے کہا۔ کوئی جواب نہیں آیا میں نے پھر آواز لگائی۔ جواب پھر بھی ندارد میں سمجھ گیا کہ وہ کافی رات تک کام کرتے کرتے تھک کر سو گئی ہے۔ تھکن کی حالت میں گہری نیند آتی ہے شاید نکلنے میں دیر ہے وہ پٹ بند کرنا بھی بھول گئی ہے۔ اب میں زیادہ دیر تک انتظار نہیں کر سکتا تھا اس لئے کنڈی

کھول کر اندر چلا گیا۔ دیکھا تو آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں اس کا جسم نیم عریاں پڑا تھا اور بچہ اس کے سینے پر پڑا ہوا چھاتیوں کو پچوڑ رہا تھا میں نے اپنا ڈنڈا زمین پر پٹکا مگر وہ بالکل بے حرکت پڑی رہی۔ آگے بڑھ کر دیکھا تو اس کا جسم گھائل بھی تھا پر کپڑا ابھی بندھا تھا۔ وہ سچ مردہ تھی "اُف" میرے منہ سے نکلا۔

وہ کسی بدچلن آدمی کی ہوس کا شکار ہو گئی تھی۔ "اس کے بچہ کا کیا ہوگا" میرے دماغ میں سوال ابھرا ابھی اس کا جواب ہی ڈھونڈھ رہا تھا کہ دوسرے سوال نے سر اٹھایا "اگر کسی نے مجھے یہاں دیکھ لیا تو تیرا کیا ہوگا" یہ سوچتے ہی میرے ہاتھ پیر کانپنے لگے۔ میں نے ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ صحن میں ایک طرف میری بالٹی ڈھکی ہوئی رکھی تھی۔ میں اس کو اٹھا کر فوراً باہر نکل آیا۔ اور کنڈی باہر سے بند کر دی تاکہ کوئی کتا داخل نہ ہو شادی میں موجود لوگ میرے اترے ہوئے چہرے کی وجہ جہیز دیئے جانے والے سامان کا ناقابل برداشت بوجھ سمجھ رہے تھے۔

گردِ ملال

قمرالہدیٰ فریدی

صبح ہو چکی تھی۔ سامنے ٹیبل پر رکھا لیمپ جل رہا تھا ـــــ تنہا! خاموش! اداس اور بے جان!! رات میں اس کے گرد پروانوں کا کتنا ہجوم تھا ـ اور اب...؟؟

اس نے سوچا ـــــ

چراغ تو اب بھی جل رہا ہے ـ روشنی تو اب بھی ہو رہی ہے، لو تو اب بھی تھرتھرا رہی ہے...... مگر پروانے..... !!؟؟

کوئی پروانوں سے کہہ دے، یہ بے رخی اچھی نہیں۔

یہ ٹھیک ہے کہ وقت بدل گیا ہے۔ وقت کا تقاضا بدل گیا ہے ـ

لیکن......!!

کہیں دور بہت دور، ایک طوفان اٹھنے کے لئے پر تول رہا تھا ـ اسے اپنا وجود ڈولتا ہوا محسوس ہوا۔ اس نے چارپائی سے اتر کر ہاتھ بڑھا کر لیمپ کو بجھا دینا چاہا۔ لیکن برا ہو ضعیفی کا! ہاتھ تو اٹھ سکتا تھا مگر جسم بغیر سہارے کے کیوں کر اٹھے!!

اف! میرے خدا! اتنی بے بسی!!! وہ لرز کر رہ گیا ـــــ

جمال میاں کو تو اب میرا ذرا بھی خیال نہیں ـ اور جمال بھی تو ـــــ کتنے دن ہو گئے شکل تک نہیں دیکھی۔ اب کسی کو میری فکر نہیں ـــــ کوئی مجھے نہیں پوچھتا ـــــ دکھ کی ایک گہری لکیر اس کے ماتھے پر پھیل گئی ـــــ کاش موت ہی آ جاتی ـــــ ان حالات میں جینے سے تو یہی اچھا تھا۔ مگر آہ یہ بھی تو نہیں اختیار میں

ادھر کچھ دنوں سے اس کے دونوں بیٹوں کے درمیان کافی تناؤ پیدا ہو گیا تھا ـــــ جھگڑوں کی آوازیں اکثر اس کے کانوں سے ٹکراتی رہتیں ـــــ

"میرے بچو! کم از کم میری زندگی میں تو تم لوگ یوں لڑا نہ کرو ـ میں نے ہزاروں گتھیاں سلجھائی ہیں میرے پاس آؤ ـ میں تمہارے معاملات بھی سلجھا دوں گا ـ"

اس نے بارہا کہنا چاہا۔ لیکن کہہ نہ سکا۔ آخر وہ کہتا بھی کس سے؟ بیٹے سے؟ بہو سے؟ یا دس سال کے اس چھوٹے سے بچے ناصر سے، جو اس کا پوتا اور اس کی تنہائیوں کا مونس تھا ـ

گھر میں بچے تو اور بھی تھے ـ لیکن ناصر کی بات ہی جدا تھی ـــــ شام ہوتے ہی دادا کے کمرے میں لیمپ لا کر رکھنا وقت پر کھانا کھلانا، ناصر ہی کا کام تھا ـ

"کاش! ناصر ذرا سیانا ہوتا ـ" تب اس نے اپنے کمرہ کی کھلی ہوئی کھڑکی سے باہر کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا ـــــ تیز چمکیلی دھوپ پوری طرح پھیل چکی تھی۔ گاؤں کے کچھ لوگ اس کے بنگلے کی طرف آپس میں سرگوشیاں کرتے ہوئے چلے آ رہے تھے ـ

وہ چونک اٹھا ـــــ ماضی اپنی تمام تر خوشگوار یادوں کے ساتھ اس کی نگاہوں میں بکھر گیا ـــــ

"کیا بات ہے؟ کوئی ایسا مسئلہ ابھر آیا ہے جس میں لوگوں کو ایک بار پھر میرے مشورے کی ضرورت آن پڑی ـــــ

پہلے بھی تو.......

اس نے ایک نظر اپنے کمرہ کو دیکھا ـــــ یہ وہی کمرہ تھا جو کبھی ہر وقت دوستوں سے بھرا رہتا تھا۔ محتاجوں، ضرورت مندوں کی بھی ایک بھیڑ سی لگی ہوتی تھی رات دن! اور آج.......؟!! ایک تلخ مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر پھیل گئی ـــــ

کیا دن تھے وہ بھی، گاؤں میں کسی کا کسی سے جھگڑا ہو جاتا کسی کے گھر جائیداد وغیرہ کے بٹوارے کا معاملہ ہوتا یا کوئی سماجی کام ـــــ ہر معاملے میں لوگ مجھے ہی گھسیٹتے۔ خود مجھے بھی تو ہر کام میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے کی عادت سی پڑ گئی تھی۔ رکتنی خوشی ہوتی تھی ـــ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ یہ خوشی کم ہوتی گئی ـــ یہاں تک کہ میں خود ہی ہنگاموں سے دور رہنے لگا۔ لوگوں سے معذرت چاہنے لگا ـــ سچ تو یہ ہے کہ یہ سب جوانی میں ہی اچھا لگتا ہے جب خون گرم ہو اور حوصلے تازہ ـــ لیکن اپنا گھر تو اپنا گھر ہوتا ہے خاندان کے دکھ سکھ سے بھلا کیونکر لاتعلق ممکن ہے ـــ میں کتنا چاہتا ہوں، کیا میں گھر کا بزرگ نہیں ہوں۔ لیکن کسی کو میری فکر ہے۔ جب اپنے ہی غیریت برتیں تو دوسروں سے کیا شکوہ! ـــــ ایک ناصر ہے۔ مگر ناصر کی بساط ہی کیا ہے ـــــ لوگ کتنی جلد بدل جاتے ہیں ـــ اس نے بڑے دکھ سے سوچا باہر برآمدہ میں بحث ومباحثے ہو رہے تھے ـ بوڑھے کو سمجھتے دیر نہ لگی کہ یہ لوگ میرے گھر جائیداد کا بٹوارہ کرنے آئے ہیں ـــــ تھوڑی دیر بعد، ٹھیک اسی انداز میں جس انداز میں خود وہ فیصلے سنایا کرتا تھا، اس نے سنا، کوئی کہہ رہا تھا ـــــ

"اس فیصلہ پر نہ تو جمال میاں کو اعتراض ہونا چاہیے اور نہ کمال میاں کو، کیونکہ یہ حق اور برابری کا بٹوارہ ہے!"

ٹیبل پر رکھا لیمپ ایک بار بہت زور سے پھڑ پھڑایا ایک لمحہ کے لیے لو تیز ہوئی اور پھر ہمیشہ کے لیے ڈوب گیا۔

ناصر! میرے ناصر کیا آج تم بھی! تم بھی...... مجھے بھول گئے.......

ـــــ ایک خاموش اتہاس گلے کی رہ گزر میں بھٹک کر رہ گیا۔

ٹھیک اسی لمحہ ناصر نے دروازے میں قدم رکھا ـــــ بوڑھے کی آنکھوں میں ایک چمک سی ابھری۔ اور پھر آنکھ کے آئینے دھندلے ہو گئے ـــــ خاندان کے افراد بدحواس ہو گئے ـــ کمال میاں اور جمال میاں کی رو۔ رو تے ہچکی بندھ گئی۔

چشم زدن میں یہ خبر سارے گاؤں میں پھیل گئی۔ اور تھوڑی ہی دیر بعد وہ کمرہ لوگوں سے کھچا کھچ بھر چکا تھا۔

خورشید ملک
تاریک گلی۔ شاہجہاں پور (یوپی)

تعفّن

فضا میں یہ کیسا تعفن پھیل رہا ہے؟ میری ناک کے نتھنے اس تعفن کو برداشت کرنے سے قاصر ہیں۔ میرا دم گھٹ رہا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ میں اس تعفن سے کیونکر نجات حاصل کروں۔ کیا یہ میرے اپنے جسم کا تعفن ہے؟ لیکن میرے جسم سے اتنی کریہہ بو کہاں خارج ہوتی ہے؟ حالانکہ یہ حقیقت ہے کہ میرا پورا جسم کوڑھ جیسے موذی مرض میں مبتلا ہے، میرے ہاتھوں اور پیروں کی سب انگلیاں گل چکی ہیں۔ ان کے کناروں پر ان کی مبہم سی نشانیاں باقی رہ گئی ہیں۔ ان کناروں پر اور جسم کے مختلف حصوں پر ایسے زخم ہو گئے ہیں جن میں پیپ بھری رہتی ہے اور کیڑے رینگتے رہتے ہیں۔ غرضیکہ میرے جسم کا کوئی ایسا حصہ نہیں ہے جو اس مرض کی لپیٹ میں آنے سے بچ گیا ہو۔ میرے جسم سے ہر وقت بدبو خارج ہوتی رہتی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میرے جسم کے اندر کسی سرمایہ دار نے نہایت بدبودار گیس بنانے کی کوئی فیکٹری قائم کر رکھی ہے اور میرے زخم اس گیس کو خارج کرنے کے لئے چمنیوں کا کام کر رہے ہیں۔ مگر میں جس تعفن کو محسوس کر رہا ہوں وہ میرے جسم سے نکلنے والی بدبو سے کہیں زیادہ بدبودار ہے اور اس سے قطعی مختلف بھی۔ لہذا یہ تعفن میرے اپنے جسم کا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ پھر یہ تعفن کہاں سے پیدا ہو رہا ہے؟

میرے سامنے مدقوق چاند اپنی پھیکی روشنی سے فضا میں اجالا پھیلانے کی ناکام کوشش کر رہا ہے۔ کہیں یہ چاند ہی تو اس تعفن کا ذمہ دار نہیں ہے؟ مگر چاند خود ویران ہے اور اسے اپنی ویرانی کا شدت سے احساس ہے ورنہ وہ اپنی مضمحل روشنی کے ساتھ رات کے ویران سناٹے میں ہی کیوں آتا۔ لہذا اس تعفن کے لئے چاند پر شک کرنا فضول ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ یہ تعفن کس طرف سے آ رہا ہے؟

میں اپنے بچے ہاتھوں اور پیروں کی طرف نظر ڈالتا ہوں۔ میرے نامکمل اعضاؤں کی مانند یہ ساری کائنات ہی نامکمل ہے۔ انسان کو قدرت کی سب سے سمجھدار اور ہوشمند تخلیق سمجھا جاتا ہے مگر غور سے دیکھنے پر وہ بھی نامکمل لگتی ہے۔ اس کو آنکھ، ہاتھ، پیر اور کان دو دو کی تعداد میں عطا ہوئے مگر ناک، منہ اور سر وغیرہ ایک ہی کیوں دی گئیں؟ اسی لئے اس کے جسم میں یکسانیت نام کی کوئی چیز نظر نہیں آتی ہے۔ اس نامکمل انسان کی تمام خواہشیں کبھی پوری نہیں ہو پاتیں۔ اسی لئے اسے زندگی بھر سکون میسر نہیں ہوتا۔ اس نے سائنس اور ٹیکنالوجی میں از حد ترقی حاصل کر لی ہے مگر قدرت کے ایک معمولی حصہ پر بھی مکمل فتح حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا ہے۔ کرۂ ارض پر مکمل سکون ہے نہ مکمل امن۔ انسان ایک مکمل نظام قائم کرنے میں معلوم نہیں کب سے کوشاں ہے۔ اس کوشش میں نہ جانے کتنے سیاسی رجحانات کا جنم ہوا۔ سامراجیت، کمیونزم، سوشلزم، جمہوریت وغیرہ مگر انسان ابھی تک اپنے مقصد کے حصول میں ناکام ہے۔ لہذا دنیا میں کوئی چیز مکمل نہیں ہے۔ ایسی صورت

...میں پھیل گیا

جیسا اگر میرا جسم نامکمل ہے تو میرا تعفن کیا ہے؟

پھر وہی ———— یہ تعفن!

یکایک پھر سے جسم میں کھجلی ہونے لگتی ہے۔ میں اپنے ننھے ہاتھوں سے جسم کو کھجلا کر کھجلی ختم کرنے کی کوشش میں لگ جاتا ہوں۔ لیکن یہ تعفن مجھے بہت پریشان کر رہا ہے۔ آخر یہ کس طرف سے آ رہا ہے؟ کیا یہ جدید طرز سے بنے ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے، اسپرے سینٹ سے معطر اور میک اپ کئے ہوئے کھوکھلے جسموں کا تعفن ہے؟ یا ان جسموں کے ذہنوں میں پرورش پلنے والی گندی ذہنیت کا تعفن ہے؟ کیا یہ بڑھتی ہوئی آبادی کی تنگ تاریک گلیوں کی سیلن کا تعفن ہے؟ سڑے ہوئے پھلوں اور ترکاریوں کی سڑاند کا تعفن ہے؟ صابن سے نا بلدوں کا تعفن ہے یا پھر رات کے اندھیرے اور ویران سناٹوں میں جنم لینے والے گناہوں کا تعفن ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ ایر کنڈیشنڈ کمروں میں بیٹھ کر غریب عوام کو بساط کے مہروں کی طرح استعمال کرنے والے لوگوں کی سیاست کی گندی تجارت کا یہ تعفن ہو؟

اچانک میری نگاہ پیروں پر پڑتی ہے۔ جہاں انگلیاں ہونا چاہئے تھیں وہاں کی زمین پسیج کر نرم ہو گئی ہے۔ مکھیاں ان پر بھنبھنا رہی ہیں۔ میں مکھیوں کو اڑا دیتا ہوں۔ اپنے پیر ہٹا کر زمین کو دیکھنے لگتا ہوں۔ نامکمل پیروں کے نامکمل بوجھ سے زمین پر عجیب و غریب خاکے ابھر آتے ہیں۔ میں ان خاکوں کو تعریفی نگاہ سے دیکھنے لگتا ہوں۔ ایسے خوبصورت خاکے کوئی عظیم مصور اپنے لافانی شاہکار میں بھی نہیں سمو سکتا ہے۔ اپیروں کی ورم زدہ، پیپ اور کیڑوں سے بھری انگلیوں کی خالی جگہوں سے خود بخود ایسی حسین تخلیق مرجانے میں اپنے اوپر فخر کرنے لگتا ہوں۔

یکایک پھر تعفن کا شدید جھونکا آتا ہے اور میری طبیعت مالش کرنے لگتی ہے۔ میں تعفن آنے والی سمت کی طرف دیکھ کر سوچنے لگتا ہوں کہ آخر تعفن کی وجہ کیا ہے؟

اسی وقت قریب کی مسجد سے موذن کی اذان اور شوالے سے گھنٹیوں کی آواز میرے کانوں کے پردوں سے ٹکراتی ہے اور میرا ذہن تعفن کی طرف سے ہٹ کر دوسری طرف مبذول ہو جاتا ہے۔ میں سوچنے لگتا ہوں کہ ان آوازوں پر کتنے لوگ لبیک کہنے کو تیار رہوں گے؟ مسجد، مندر، چرچ، گرودوارا جیسے نام انسان محض اپنے ذہنی سکون کے لئے دے رکھے ہیں۔ آج کا انسان یا تو اتنا ہوشیار ہو گیا ہے۔ یا اتنا بے دین کہ وہ مذہبی ڈھکوسلوں میں اپنے آپ کو قطعی پھنسانا پسند نہیں کرتا ہے۔ اس کے پاس فرصت بھی کہاں ہے؟ کی خواہشات کے جال میں اتنے ہی سوراخ ہیں جتنے ایک غریب دہقانی دوشیزہ کے پھٹے ہوئے دامن ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ خود اس کے دماغی فتور کا لامتناہی سلسلہ بھی اس کی خواہشات کی طرح ہے۔

میں جوش میں آ جاتا ہوں ساتھ ہی میرے جسم کے کیڑے بھی جوش میں آ جاتے ہیں اور تیزی سے حرکت کرنے لگتے ہیں۔ یہ کیڑے میرے جسم کا آماجگاہ ہیں اور میرے جسم کا اہم جز۔ یہ مجھے ہر وقت زندگی کا احساس دلاتے رہتے ہیں۔ مجھے جب بھی سونے کی کوشش کرتا ہوں یہ کیڑے مجھے بیدار رکھنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں تاکہ اپنے گرد و پیش سے بے خبر نہ ہو جاؤں۔ جب پوری طرح سے بیدار مکمل انسان کو دوسرا انسان دھوکا دے سکتا ہے تو مجھ جیسے نامکمل اور سوئے ہوئے انسان کو فریب دینا کیا مشکل ہے؟ اسی لئے میں [illegible]

ن سندریوں اور ان کو اپنے جسم سے جدا نہیں ہونے دیتا ہوں۔ اگر کوئی کیڑا ٹپک جاتا ہے تو میں کوشش کرکے اٹھا
ہوں اور پھر اس کی جگہ پر پہونچا دیتا ہوں۔
لیکن یہ تعفن مجھے برابر اذیت پہنچائے جا رہا ہے۔
شہروں کی بھیڑ، ملوں کے دھوئیں، ذہنی علاقوں کی دھول اور اونچی عمارتوں کی کثافت نے فضاء مکدر کر رکھی
اس کے ساتھ ہی تعصب، قومیت، نسلی تفریق اور عدم مساوات کی بو نے فضاء کو مزید پراگندہ کر رکھا ہے
ہر طرف افراتفری ہے، الجھن ہے، لاقانونیت ہے اور لامذہبیت ہے۔ ہتھیاروں پر بالادستی جتانے
کشمکش میں سرد جنگ سے مکمل جنگ شروع ہو جانے سے امن و امان کے ختم ہو جانے کا مسلسل
ہے۔ ایسے ذہنی تناؤ اور مکدر فضاء میں کوئی سکون سے سانس لے کر جینے کی کوشش کیوں کر کر سکتا ہے؟
تعفن کی وجہ تو معلوم ہو گئی مگر اس کا ذمہ دار ہے کون؟
بہرحال میں اپنے کوڑھی جسم کے ساتھ بہت خوش ہوں کیونکہ میرے اندر کم از کم ایک اہلیت ابھی باقی
وہ یہ کہ میں اپنے جسم پر بھنبھنانے والی مکھیوں کو اپنے ہاتھوں سے اڑا سکتا ہوں۔ اسی لئے مجھے
کوڑھی ہونے پر قطعی ندامت نہیں ہے۔
ویسے، بائی دی وے، آپ کا کیا خیال ہے؟

(غیر مطبوعہ)

بہار میں سینچائی

(۱) جنرل ایریگیشن سسٹم ـ (الف) چالو یوجناؤں کو سہولت دے کر پورا کرنا۔
(ب) موجودہ نہر سسٹم سے زیادہ سے زیادہ سینچائی۔
(۲) ساتویں پانچ سالہ منصوبہ میں سینچائی [illegible] میں کل خرچ ۱۲۸۵ [illegible] سینچائی کرنے کا پروگرام ۹۲ء۴ لاکھ ہیکٹر۔
(۳) سالانہ منصوبہ ۸۶-۱۹۸۵: کل خرچ ۲۰۰ کروڑ روپئے۔ سینچائی کرنے کا پروگرام ۷۶۰۰۰ ہیکٹر
(۴) مہیا کرائی جانے والی سینچائی
۸۶-۱۹۸۵ تک کل سینچائی ۲۸۰۷۹ لاکھ ہیکٹر۔ ۸۶-۱۹۸۵ میں سینچائی دینے کا ٹارگیٹ ۲۱ء۷۹ لاکھ ہیکٹر۔ منصوبہ کا استعمال ۷۶ فیصد۔ پچھلے سال استعمال [illegible] فیصد۔
(۵) باڑھ سے حفاظت کا کام: صوبہ میں پشتوں کی لمبائی ۳۳۰۹۶ کیلومیٹر
(۶) سنہ ۱۹۸۵ء کے جولائی تک کا بیان۔
مہانندہ بائیں تٹ بندھ، کوشی پوربی تٹ بندھ [illegible] پیرا ۲ پیرا اسی میں سبھی خالی جگہیں اس سال بند کر دی گئی ہیں۔ بوڑھی گنڈک تٹ بندھ چوڑائی، اونچائی [illegible] تیراہی۔ چنپورا [illegible] پر حفاظت کا کام تیزی سے کیا جا رہا ہے۔ [illegible] شہر کی حفاظت کے لئے [illegible] بھگوا [illegible] کو بند کر دیئے گئے ہیں۔
[illegible] بلان وکیا پر بھیانک خطرہ کو ٹال دیا گیا ہے۔
باگمتی پچھلے سال باگمتی ندی دھارا کو چھوڑ کر دوسری طرف بہنے لگی تھی جس سے ایک بڑا علاقہ باڑھ کی چپیٹ میں تھا۔ اب ندی کا پانی پرانی دھارا میں موڑ دیا گیا ہے۔
(۷) گنڈک یوجنا میں ۴۵ ہزار ہیکٹر اور کوشی یوجنا میں ۶۵ ہزار ہیکٹر زمین کو پانی کے جماؤ سے الگ کیا جا چکا ہے۔
(۸) لگ بھگ ۲۲ لاکھ ہیکٹر زمین سینچیت کی جا رہی ہے جس سے ۱۶ کروڑ روپئے کی آمدنی ہونی چاہئے جس میں ۶ کروڑ آ رہا ہے۔ آمدنی قائم کرنے پر خرچ لگ بھگ ۸ کروڑ ہے۔
(۹) چھٹی پانچ سالہ منصوبہ میں سینچائی پروگراموں پر کل خرچ ۱۳۸۰ کروڑ روپئے۔ پچھڑے علاقے میں مارچ ۸۵ء تک کیا گیا خرچ ۱۹۳ کروڑ (۱۴ فیصد) ساتویں یوجنا میں ۱۲۸۵ کروڑ یوجنا میں ۵۲۸ کروڑ روپئے پچھڑے علاقہ کے لئے جو ۴۲ فیصد ہے۔ ۸۶-۱۹۸۵ میں ۲۰۰ کروڑ کے خرچ میں سے ۷۴ کروڑ روپئے پچھڑے علاقے میں خرچ کئے جائیں گے۔ جو ۳۶ فیصد ہے۔ زیادہ تر نئی سینچائی یوجنائیں پچھڑے علاقوں میں لی جا رہی ہیں۔
(۱۰) خاص کام کا بیان:
پچھم کوشی نہر سے پہلی بار پانی اس سال دیا گیا۔ ۱۰،۰۰۰ ہیکٹر ۲۵۰۰۰ ایکڑ ہندوستانی حصہ ۰۰۰ ۳۰ ہیکٹر نیپالی حصہ۔ (۲) اتری کوئل یوجنا میں ۱۰۰۰۰ ایکڑ زمین پٹانے کے کام پورا کر لیا گیا ہے اور اسی سال پہلی بار پانی دیا گیا۔

[illegible] - 187 - [illegible] ([illegible]-165) / 85-86.

یہ بھی ایک فن ہے
خودستائی

علی حماد عباسی

آج کل فن کے متعلق باتیں کرنا گویا ایک فیشن سا ہو گیا ہے۔ جس کو دیکھئے وہی فن کے بارے میں باتیں کرتا نظر آتا ہے۔ کوئی فن برائے فن کی حمایت میں بول رہا ہے تو کوئی فن برائے زندگی کی بحث میں الجھا ہوا ہے۔ کوئی فن کو توازن کا نام دے رہا ہے تو کوئی خود زندگی کو سب سے بڑے فن کا لقب دے رہا ہے۔ ہمیں یہ دیکھ کر عجیب سا لگتا ہے اور جی میں آتا ہے کہ ہم فن کے سارے پرستاروں سے چیسٹرٹن کے لفظوں میں صاف صاف کہہ دیں:

FOR GOD'S SAKE NO ART PLEASE!

لیکن کیا کریں بدقسمتی سے ہم خود بھی اپنا شمار فن کے شیدائیوں میں کرتے ہیں کیوں کہ ہمارے نزدیک کچھ فنون ایسے بھی ہیں جن کے بغیر زندگی بے مزہ ہو کر رہ جائے گی مثلاً باتیں بنانے کا فن، یا [illegible] رکھنے کا فن، روٹھی ہوئی محبوبہ کو منانے کا فن۔ خودستائی بھی اسی طرح کا ایک فن ہے۔

خودستائی کا فن وہ فن شریف ہے جس سے ایک شخص دوسرے شخص کو متاثر کرتا ہے۔ اپنی صلاحیتوں سے لوگوں کو آگاہ کرتا ہے اور ان پر اپنی اہمیت جتاتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اگر خودستائی کے فن کا وجود نہ ہوتا تو شاید یہ دنیا بھی وجود میں نہ آتی۔ آخر اللہ میاں کو یہ دنیا بنا کر اتنا بکھیڑا اپنے سر مول لینے کی کیا پڑی تھی۔ اصل میں اللہ میاں کا مقصد تھا اپنے آپ کو پہچنوانا اس لئے یہ دنیا تخلیق ہوئی اور انسان پیدا ہوا۔ اور انسان نے اپنے رب کی طرح اپنے آپ کو پہچنوانے کے لئے خودستائی کے جذبے سے عاری ہوتا تو کیا ہوتا۔ مگر عمل کی کتنی ہی چنگاریاں بے عملی کی راکھ میں دبی رہ جاتیں کتنے ہی جینیس (GENIUS) جینئس بے مایہ ہو کر رہ جاتے اگر انسان کو خودستائی کا جذبہ نہ اکساتا تو وہ غاروں پر کمندیں کیوں پھینکتا۔ چاند پر شب خون کیوں مارتا۔ وہ جو شیکسپیئر نے کہا ہے تو ٹھیک ہی کہا ہے کہ ہر بمشکل آدمیوں میں سے مشکل سے ایک آدمی ایسا ملے گا جس کے دل میں خودستائی کا جذبہ موجزن نہ ہو۔ خودستائی انسان کی ضرورت ہے اور عجز و انکسار اس کی مجبوری۔ آخر لوگ قیمتی لباس کیوں پہنتے ہیں عورتیں میک اپ کیوں کرتی ہیں۔ شاعر شعر کیوں کہتا ہے۔ اور شعر کہہ کر میر نے "مستند ہے میرا فرمایا ہوا" کیوں کہا اور وہ جو غالب نے کہا تھا "نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا" تھا سچ مچ ان کو ستائش کی کوئی تمنا تھی نہ صلے کی ذرا بھی پروا نہ تھی۔ اگر وہ واقعی ہر طرح کی ستائش اور صلے سے بے نیاز تھے تو انھوں نے اپنے اشعار میں ایسی مشکل پسندی کا مظاہرہ کیوں کیا کہ ان کے عہد کے سخن داں "ل" کو ان سے آسان کہنے کی فرمائش کرنی پڑی۔ اس مشکل پسندی اور مبہم گوئی کے پیچھے کون سا جذبہ کارفرما تھا۔ یہ خود ہی سوچیے۔ ہم کیا بتائیں۔ "گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل"!

ہر فن کے کچھ بنیادی اصول ہوتے ہیں۔ خودستائی کا فن بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ اس فن کے بھی بنیادی

اصول تھیلے ان میں اولیت خود اعتمادی کو حاصل ہے۔ ہر وہ شخص جس کو اپنے آپ پر بھروسہ ہو اپنی ذہانت برائے بجروسہ خود ستائی کے فن کو اپنا سکتا ہے۔ اس فن کا دوسرا بنیادی اصول ہے موقع شناسی یعنی خود ستائی موقع محل دیکھ کر کرنی چاہیے۔ بے موقع خود ستائی سے اکثر بنا بنایا کام بگڑ جاتا ہے اور خود ستائی کرنے والے کی عزت خاک میں مل جاتی ہے۔ خود ستائی کا آخری اصول ہے حاضر دماغی۔ خود ستائی کے فن کو پورے طور سے برتنے کے لئے حاضر دماغی نہایت ہی ضروری ہے۔ خود اعتمادی اور موقع شناسی کو حاضر دماغی کا سہارا نہ ملنے کی صورت میں خود ستائی کا فن الٹی سیفی کا کام کر جاتا ہے۔

آئیے اب ذرا خود ستائی کے فن کی کچھ عملی مثالیں لیں۔

● سڑک پر دو شاعر باتیں کرتے جا رہے تھے۔ دوران گفتگو ان کے شعری مرتبے کا ذکر آ گیا۔ پہلے شاعر نے کہا اس شہر میں صرف دو بڑے شاعر ہیں، ایک تو خود میں اور دوسرے تم۔ پھر ذرا توقف کے بعد بڑی خود اعتمادی سے گویا ہوا اور تم بھی کیا؟ اور یہ کہہ کر فوراً ہی ایک گلی میں مڑ گیا۔ دوسرا شاعر اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔ پہلا شاعر خود ستائی کے فن سے آگاہ تھا، دوسرا ناواقف۔ اگر دوسرا شاعر بھی فن کا دانا ہوتا تو بجائے منہ بیک کرنے کے پہلے شاعر کو جا لیتا اور اس کا گریبان پکڑ کر کہتا تم کہاں کے بڑے شاعر ہو۔ اپنے الفاظ واپس لو اور کان کھول کر سن لو کہ بڑا شاعر اس شہر میں بس ایک ہی ہے اور وہ بڑا شاعر کوئی اور نہیں۔ میں خود ہوں۔

● ابھی کچھ ہی دن پہلے کی بات ہے۔ ہمارے یہاں ایک دوست تشریف لائے۔ تشریف آوری کا مقصد بظاہر سوشل کال کے علاوہ کچھ اور نہ تھا۔ پہلے بیوی بچوں کی خیریت پوچھی اور پھر بڑے ہی دوستانہ ماحول میں ادھر ادھر کی باتیں ہونے لگیں۔ ہم نے ملازم سے چائے لانے کو کہا۔ پھر نہ جانے اچانک کیا ہوا کہ انھوں نے اپنی ٹائی کی ناٹ پہلے ڈھیلی کی اور پھر کسنے لگے۔ ناٹ کس گئی تو پھر ڈھیلی کر دی۔ یہ سلسلہ کچھ دیر جاری رہا تو ہمیں تشویش ہوئی اور ہم نے پوچھا کہ خدانخواستہ ان کے گلے میں کوئی تکلیف تو نہیں۔ انھوں نے قدرے اطمینان کے ساتھ کہا نہیں، ایسی تو کوئی بات نہیں۔ اصل میں یہ ٹائی ذرا نئی ہے۔ آپ بھی دیکھئے۔ یہ ہے تو اصل میں میڈ ان انگلینڈ لیکن اس میں جو سلک استعمال ہوا ہے وہ فرانس کا ہے اور یہ سوٹ بھی کل ہی لندن سے آیا ہے۔ ہم نے ٹائی کو دیکھا واقعی بہت ہی عمدہ اور قیمتی ٹائی تھی اور سوٹ بھی نہایت ہی ٹاپ کلاس کا تھا۔ ہم نے بھی جی کھول کر داد دی۔ ان کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں۔ پھر جیسے انہیں کوئی ضروری کام یاد آ گیا ہو۔ یکایک اٹھ کھڑے ہوئے، ہم سے بڑے فاتحانہ انداز میں ہاتھ ملایا اور چائے نہ پی سکنے کی معذرت کی اور چلے گئے۔ لیکن اس کے تھوڑی ہی دیر کے بعد اب ہم کیا کہیں، ان حضرت کو پڑوس میں اپنی ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کرتے اور کستے دیکھا گیا۔

● ہمارے پڑوس میں ایک خاں صاحب رہتے تھے۔ انھوں نے ایک کتا پال رکھا تھا۔ بڑا ہی خوب صورت اور پیارا پیارا سفید رنگ کا تھا۔ کان کھڑے کھڑے اور پیٹھ کی طرف مڑی ہوئی دم کے آخری سرے پر بالوں کا ایک ایسا خوش نما گچھا تھا کہ جیسے کسی نے سفید پھول کی پنکھڑیوں کو اکٹھا کر کے اس کی دم میں باندھ دیا ہو۔ ہر شام خاں صاحب ہاتھوں میں اس کی زنجیر پکڑے "ٹائیگر ٹائیگر" پکارتے اس کو ٹہلانے نکلتے۔ ایک دن ہم نے اس کتے کی ذات پات اور نسل کے متعلق پوچھا تو خاں صاحب نے بڑے فخر کے ساتھ کہا کہ یہ کوئی ایرے غیرے نتھو خیرے قسم کا کتا نہیں ہے۔ یہ ایک بہت ہی نایاب اور اعلیٰ نسل کا ولایتی کتا

شیر کے شکار میں کام آتا ہے اور وہ یوں کہ شیر کے شکار میں شکاری تو مچان پر بیٹھا رہتا ہے لیکن اس نسل کے کتے بلی کی طرح لپک کر شیر کی گردن کو پکڑ لیتے ہیں۔ یہ سن کر ہم نے اور وہاں پر کھڑے سبھی لوگوں نے اس کتے کو تحسین آمیز نظروں سے دیکھا اور اس کی جی بھر کے تعریف بھی کی۔ خان صاحب نے کتے کی تعریف کو اپنی تعریف سمجھا اور بہت خوش ہوئے۔ لیکن اس کو بس اتفاق ہی کہیے کہ اسی دوران محلے کے ایک وکیل صاحب کا دیسی نسل کا کتا "موتی" ادھر آ نکلا۔ ٹائیگر کو دیکھ کر وہ غرایا اور اس سے پہلے کہ خان صاحب کا ولایتی جواب میں غراتا اور پھر دونوں میں جواب الجواب شروع ہو جاتا اور ہمیں انگلش کی تقریر دانی کا مزا آتا کہ موتی نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اچانک ٹائیگر پر پل پڑا اور دیکھتے دیکھتے ہی ہمسائل میں ٹائیگر کو پچھاڑ کر اس کی نسلی برتری خاک میں ملا دی۔ ٹائیگر زنجیر تڑا کر وہاں سے بے تحاشہ بھاگا۔ خان صاحب کی جگہ پر کوئی اور ہوتا تو شرم سے پانی پانی ہو جاتا وہ الٹے پٹھان ہونے کے باوجود غضب کے حاضر دماغ آدمی تھے۔ فوراً بول اٹھے! کہاں شیر کی گردن مروڑنے والا ٹائیگر اور کہاں وکیل صاحب کا یہ کم ذات اور دوغلا کتا۔ جانتے ہیں ٹائیگر نے موتی سے مقابلے کو اپنی توہین سمجھا اور اسی لیے احتجاج کے طور پر زنجیر تڑا کر غصے میں بھرا ہوا یہاں چلا گیا۔ خان صاحب کی شان کا کیا کہنا ہی رہی۔ ہم البتہ حیران تھے۔ کہ ؎ "خامہ انگشت بدنداں کہ اسے کیا کہیے!"

ویسے تو ہندوستانی کرکٹ کا زندگی سے بڑا گہرا اور اٹوٹ رشتہ ہے لیکن اس کے استعمال میں بڑی ہوشیاری اور احتیاط درکار ہوتی ہے۔ اس فن کے ساتھ لاپرواہی برتنے والوں کا انجام بڑا ہی عبرت ناک ہوتا ہے۔ بالکل ان صاحب کا جو وقت بے وقت اپنے بچوں سے فرمایا کرتے تھے کہ یونیورسٹی میں وہ ہمیشہ فرسٹ ڈویژن میں پاس ہوا کرتے تھے۔ سنتے سنتے جب ان کے بچے تنگ آ گئے تو انہوں نے اخبار میں یہ اشتہار دے دیا: "ضرورت ہے ایک ایسے شخص کی جو .... (نام) یونیورسٹی میں فلاں سنہ سے فلاں سنہ تک زیر تعلیم رہا ہو اور جو ہمیں یہ بتا سکے کہ ہمارے ابا .... (نام) کیا واقعی وہ ہمیشہ فرسٹ ڈویژن میں پاس ہوا کرتے تھے۔"

ایک ہفتے بعد ان بچوں کو اس یونیورسٹی کے ایک اولڈ بوائے کا خط ملا۔ لکھا تھا: پیارے بچو! میں یونیورسٹی میں تمہارے ابا جان کا ہم سبق رہ چکا ہوں۔ شاید تمہیں اس بات کا پتا نہیں کہ یونیورسٹی میں تمہارے ابا مسٹر ڈینگی کے نام سے مشہور تھے۔ ایسا لگتا ہے کہ ریٹائرمنٹ کے بعد بھی ان کی ڈینگنے کی عادت نہیں گئی۔ اور پیارے بچو! تمہیں شاید یہ بھی نہیں معلوم اس زمانے میں کسی بھی امتحان میں فرسٹ ڈویژن پانا اتنا آسان نہ تھا جتنا کہ آج۔ تمہارے ابا جان نے خیر فرسٹ کیا، سیکنڈ بھی نہیں بلکہ ہمیشہ اس کے بعد والے ڈویژن میں ہوتے تھے اور شاید اس لئے کہ ہندوستانی یونیورسٹی میں صرف ڈگری کی حد تک فورتھ ڈویژن کا کبھی چلن نہیں رہا ہے۔ ہاں قابلیت کی بات دوسری ہے۔ یونیورسٹیاں صرف ڈگری تقسیم کرتی ہیں لیاقت نہیں۔

بچے خط پڑھ کر بیک وقت روئے بھی اور ہنسے بھی۔ روئے اپنے ابا جان کے دوست کے خلوص پر اور ہنسے ابا جان کی خود ستائی پر۔ اور ابا جان کے بارے میں کیا کہا جائے بجز اس کے ؎

شمع طفلاں میں میاں جی کی رہی کیا آبرو!

نئی کتابوں کا تعارف

تبصرہ کے لئے ہر کتاب کی دو جلدوں کا آنا ضروری ہے (مدیر)

کتاب کا نام: مارکسی جمالیات
مصنف: اصغر علی انجینئر
مبصر: ڈاکٹر محمد شفیع
قیمت: ۲۵ روپے
پبلیشن: نصرت پبلیشرز۔ امین آباد۔ لکھنؤ

اصغر علی انجینئر کے مجموعہ مضامین "مارکسی جمالیات" کے شائع ہونے کی خبر ملی تو مجھے بڑی خوشی ہوئی اور اطمنان احساس ہوا کیونکہ اردو میں اس موضوع پر چند بکھرے ہوئے مضامین کے علاوہ کوئی مستقل تصنیف نہیں تھی۔ سردار جعفری نے اپنی کتاب "ترقی پسند ادب" کے دیباچے میں وعدہ کیا تھا کہ وہ مارکسی جمالیات پر ایک مستقل کتاب لکھیں گے مگر آج تک ان کا ارادہ عملی جامہ نہ پہن سکا۔ ایک دفعہ کسی ملاقات میں جب میں نے انہیں ان کا وعدہ یاد دلایا تو بڑی دیر تک معذرت کرتے رہے۔ صحیح ہے کہ شعری تخلیقات کی طرف مخصوص توجہ کے ساتھ ساتھ ادھر انھوں نے 'میر' 'غالب' اور کبیر پر کافی اہم کام کیا ہے اور مختلف سیمیناروں اور جلسوں میں بڑی سرگرمی کے ساتھ شرکت کرتے رہے ہیں۔ لیکن اس مصروفیت کے ساتھ ترقی پسند ادب کے اہم رہنما اور ایک ممتاز مارکسی دانشور کی حیثیت سے مارکسی جمالیات پر قلم اٹھانا ان کی ذمہ داری میں شامل تھا۔ بہرحال جو فرض وہ انجام نہ دے سکے وہ ایک دوسرے مارکسی دانشور اور سماجی علوم کے ماہر اصغر علی انجینئر کے ہاتھوں پورا ہوا۔

اصغر علی انجینئر نے شروع شروع میں انگریزی زبان کے متعدد روزناموں اور رسالوں میں مارکسی نقطۂ نظر سے سماجی مسائل پر مضامین لکھ کر سنجیدہ اور ذہین قارئین کی توجہ اپنی طرف فوراً مبذول کرالی اور آگے چل کر انھوں نے مسلمانوں کے تہذیبی اور مذہبی مسائل پر کتابوں کی شکل میں بڑے گہرے تجزیئے مطالعے پیش کئے اور ان کا شمار بجا طور پر ملک کے ممتاز عالموں اور دانشوروں میں ہونے لگا۔ ایک اچھی اور دلچسپ بات یہ ہوئی کہ انھوں نے ادب کے بنیادی مسائل سے متعلق مضامین اردو میں سپرد قلم کئے۔ انھوں نے پیشہ ور نقادوں کی طرح سکہ بند مضامین لکھنے سے سخت پرہیز کیا اور جو کچھ لکھا۔ اس میں ذہنی ایمانداری، گہری بصیرت، عالمانہ نکتہ سنجی اور بڑی تازگی ملتی ہے۔

"مارکسی جمالیات" ابھی کوئی مستقل اور مبسوط تصنیف نہیں ہے بلکہ مارکسی جمالیات کے مختلف پہلوؤں پر لکھے ہوئے مضامین کا مجموعہ ہے۔ لیکن یہ مضامین پھر ایک ایسی تصویر ضرور پیش کرتے ہیں۔ جس سے مارکسی جمالیات کی بنیادی خصوصیات اور حقیقی مسائل کا کسی قدر اندازہ ہو جاتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ مضامین کا یہ مجموعہ صحیح معنوں میں ایک مستقل تصنیف کا بدل نہیں بن سکتا مگر اس نے آئندہ کے لئے اس موضوع پر مستقل تصنیفات کے لئے راہ تو ہموار کر دی ہے۔ دوسرے لکھنے والے اور خود اصغر علی انجینئر فرصت کے لمحات میں اس موضوع پر کوئی مبسوط اور مفصل کتاب پیش کر سکتے ہیں۔ اس کتاب کے جواز میں اتنا ہی کہہ دینا کافی ہے لیکن آیئے ذرا اسی میں شامل مضامین پر بھی ایک نگاہ ڈال جائے ان مضامین کے مطالعے سے ایک بات نہایت واضح طور پر ہمارے سامنے آتی ہے اور وہ یہ کہ اصغر علی انجینئر نے مارکسزم کو کسی کٹر کلیہ کی طرح نہیں تسلیم کیا ہے بلکہ ایک زندہ اور متحرک نظریہ کی طرح جس میں سماجی تبدیلی

اور تہذیبی مظاہر کو، اُن کی مختلف جہتوں کے تناظر میں کلی طور پر سمجھنے اور صحیح نتائج نکالنے کی صفت اور صلاحیت موجود ہے۔ برکینت، کافکا اور لوکاچ کی تخلیقات اور تنقیدی نگارشات کے حوالے سے اور مارکسی مکتب فکر میں پائے جانے جدید میلانات کی روشنی میں انھوں نے مارکسی جمالیات کے ان پہلوؤں کو اُجاگر کرنے کی کوشش کی ہے جن کی طرف اُردو کے بہت کم ادیبوں کی نگاہ گئی ہے۔ مارکسی جمالیات کے نئے میلانات اور جدید کوششوں سے عدم واقفیت کی بنا پر ایک طرف ترقی پسند ادبی تنقید جمود کا شکار ہو گئی تو دوسری طرف ترقی پسندوں کے مخالف اپنے طنز و تعریض کا نشانہ جمالیات کے اس تصور کو بناتے گئے جس کا تعلق مارکسی جمالیات سے بہرحال نہیں ہے۔ لوکاچ اور برکینت میں ادبی پرکھ کے سلسلے میں جو زبردست بحث ہوئی تھی اس سے سماجی حقیقت نگاری کے کئی اہم پہلو سامنے آئے۔ اس ادبی تنازعہ پر جو مضمون اس مجموعے میں شامل ہے اس سے مارکسی جمالیات کے حرکی اور تہ دار تصور پر روشنی پڑتی ہے۔ ان مضامین کے مطالعے سے حقیقت نگاری، کمٹ منٹ، بیگانگی اور محنت جیسے تصورات کے متعلق مارکسی نقطۂ نظر کی صحیح تعبیر ہمارے سامنے آتی ہے اور اُن غلط فہمیوں کا ازالہ ہو جاتا ہے جو بہت سے نئے ادیبوں کے ذہن میں مارکسی تنقید اور مارکسی جمالیات کے غلط تصور کی وجہ سے پیدا ہو گئی تھیں۔

بات ختم کرنے سے پہلے اصغر علی انجینیئر کی جراُت فکر اور ندرتِ خیال کی ایک مثال پیش کرنا چاہتا ہوں۔ کافکا کی تخلیقات جس کرب، بے چینی اور اضطراب کو جنم دیتی ہیں اس کے متعلق لوکاچ کا یہ خیال کہ داخلی احساس اور موضوعی ویژن (vision) خارجی دُنیا کو فنکار کے سامنے ٹوٹتے اور بکھرتے ہوئے پیش کرتے تھے۔ انجینیئر کو صحیح نہیں معلوم ہوتا اور وہ اس سے اختلاف کرتے ہوئے یوں اظہارِ خیال کرتے ہیں کہ ان دونوں کے درمیان جدلیاتی رشتہ ہے اور دونوں ایک دوسرے پر اثرانداز ہوتے ہیں۔ تنقید کو دراصل اسی نوع کی جراُتِ فکر اور ندرتِ خیال کی ضرورت ہے۔

کتابت، طباعت اور کتابوں کے اعتبار سے تسلی بخش کہی جا سکتی ہے مگر اتنی نہیں جتنی اس کا اہم اور وقیع مطالعہ کرتا ہے۔ قیمت ۲۵ روپے ہے اور نصرت پبلشرز امین آباد سے مل سکتی ہے۔

بقیہ: دہلی کی ادبی سرگرمیاں

اس اجلاس میں کے۔ ایم خاں (حیدرآباد) نے مولانا آزاد آزاد کی سیاسی بصیرت پر ایک مقالہ پڑھا جس میں مولانا کے دورِ طفولیت سے لے کر ان کے آخری سفر تک کے کارناموں کا تجزیہ کیا گیا تھا۔

دوسرا اور آخری مقالہ "ابوالکلام کا شعری ذوق" ڈاکٹر جگن ناتھ آزاد نے پیش کیا۔ مقالے میں کہا گیا ہے شعری ذوق تو مبدءِ فیاض سے ملتا ہے۔ شعر کہنے کے لیے صوتی آہنگ ضروری ہے جو مولانا کو اپنے گھریلو ادبی ماحول سے حاصل ہوا۔

اس آخری مقالے کے ساتھ اس سہ روزہ سیمینار کا بحسن و خوبی، بہت ہی خوشگوار ماحول میں خاتمہ ہوا۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے مہمانوں کے ساتھ ساتھ اُن تمام لوگوں کا شکریہ ادا کیا جنھوں نے اس سیمینار کو کامیاب بنایا۔ سیمینار میں کئی "تجویزیں" بھی پاس ہوئیں جن میں سب سے اہم تجویز راجہ سعید ملیح آبادی صاحب کی تھی۔ اس تجویز میں حکومت سے کہا گیا تھا کہ کلکتے میں مولانا آزاد کی رہائش گاہ کو قومی ملکیت قرار دے کر اسے ایشیاٹک سوسائٹی کے زیر انتظام دے دیا جائے جو اس کے لیے ایک موزوں ادارہ ہے۔

شہرِ خیال

(قارئین کے خطوط)

اپریل کا شمارہ فیض نمبر ہو گیا ہے۔ اچھا ہے اس طرح فیض پر بہت سی تخلیق جمع ہو گئی ہے۔ اور فیض کے ماحول سے لئے یہ گوشہ اہم ہے۔ منظوم حصہ آپ کے اعلیٰ ذوق کی نشاندہی کرتا ہے۔ پہلا شمارہ ایک پوری کی کہانی " ادھوری کہانی کا المیہ " ہو شکار ہو گئی ہے اور آپ نے اسے ادھورا ہی شائع کیا ہے ... دھیان دینے کی ضرورت ہے۔

مئی کا شمارہ اقبال نمبر ہے۔ اقبال کی شخصیت ہر بار ناقدوں کے لئے ایک چیلنج بن کر نمودار ہوئی ہے۔ ادب کے قارئین کو اس سے بہت فائدہ ہوگا۔ بہت سے سوال حل ہو جاتے ہیں۔

عظیم فیروز آبادی کا خط مغنی صاحب کے نام پڑھ کر ہنسی آ رہا تھا۔ اب آپ اس پر بیشمار رائیں پڑھنے کو ملیں۔ تاہم جین رستوگی کی علمی بصیرت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ انہوں نے مغنی صاحب کے خط کا ایک جملہ نقل کرنے کے بعد تحریر کیا ہے کہ: "لفظ حرکت" کیا شوقیانہ ہے؟" بجا ارشاد ۔۔۔ ضرور شوقیانہ ہے۔ مگر ان کے ... کو کس خانے میں رکھا جائے ۔۔۔ " ارے عالی جناب مغنی صاحب آپ تو اس کی تشریح بھی نہیں ...

دونوں انگریزی کے استاد ہیں اور تنقید و تحقیق میں بھی دونوں کا نام لیا جاتا ہے۔ پھر بزرگوں سے اگر ایسی ... ہو اور وہ اسے "عزت ذات" کو بھی گھسیٹ لائیں۔ ... کیا سوچیں گے۔

ویسے بحث خوب ہے۔ اس سے اقبال کی شخصیت ناقدوں کے بہت سے گوشے سامنے آئیں گے۔ جو یقیناً بات میں اضافہ کریں گے۔

ایک بات اور ۔۔۔ محترم رستوگی نے اقبال اور اقبالیات پر اعلیٰ سطح کا کام کرنے والوں میں صرف چھ شخصیتوں کا نام گنوایا ہے۔ کیا میں محترم رستوگی سے یہ درخواست کروں کہ وہ لسٹ میں چند اہم نام اور جوڑنے کی زحمت گوارہ کریں گے تاکہ ان کی یہ لسٹ مکمل ہو جائے۔

انھوں نے اپنے مضمون کے آخر میں چند سوالات اٹھائے ہیں وہ واقعی اہم ہیں اور فوق نظر کو دعوت دیتے ہیں۔ ویریندر پٹواری کی کہانی "جوگن" پسند آئی۔ یہ کہانی "شاہو دلال" سے اچھی ہے۔ اس بار کی نظمیں کافی پسند آئیں۔

اصغر علی انجینئر بھی خوب ہیں اور خوب لکھتے ہیں۔ جس موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں اس کا حق ادا کر دیتے ہیں۔ "تامل مسلمان اور علاقائی تشخص کا مسئلہ" بہت نازک موضوع ہے مگر انھوں نے پوری دیانتداری سے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔

مشتاق احمد نوری، سہسرام

جناب فیروز آبادی کے خط بابت "پرخاش علامہ اقبال کی" ہفتہ وار ہماری زبان دہلی میں بعنوان "علامہ اقبال کا ذہنیت نامہ" کی اشاعت کے بعد ہی مقامی ادبی حلقے میں بہت شور تھا کہ فیروز آبادی صاحب نے ایک عظیم کارنامہ انجام دیا ہے۔ روز ان کے ہم نواؤں کی زبانی خبریں سننے میں آتی تھیں۔ ان کے کارنامے کے انجام پر آج پاکستان سے خط آیا ہے۔ آج بمبئی سے ظ انصاری صاحب نے خط لکھا ہے یہ کام آپ کو بہت پہلے کرنا چاہئے تھا۔ آج فلاں جگہ سے خط آیا ہے اور آج فلاں جگہ سے۔ اس کا اتنا شور مچا رکھا تھا کہ فیروز آبادی صاحب کو ان کے اس کارنامے پر ہند و پاک کا عظیم نقاد بنا دیا گیا۔ لیکن اس کا بھرم سہیل مئی ۸۵ء کا شمارہ پڑھ کر کھلا۔ آپ نے یہ جرأت مندانہ اقدام کیا ہے۔ لیکن کوئی ... کی مانند فیروز آبادی بدنام ہو گئے تو کیا نام نہ ہوگا کے مصداق پر جیسا جانتے کہ علم ایک سمندر ہے۔ بقول شمس الرحمٰن فاروقی ... ہو گیا بھر میں اپنی زمین کی کشش کی

عقیدت کے جذبات مجروح ہوتے ہیں، اس نے علم کے سمندر کے کنارے سے صرف گھونگھے سیپے اٹھائے ہیں۔ یہاں تک اس کی انکساری نے اس کے عظیم کارنامے کے باوجود اس کی شخصیت کو وہ عظیم بنانے کے لئے مجبور ہونا پڑتا ہے۔ بہتر تھا جناب فیروز آبادی تھوڑا سا ہی پڑھ کر علامہ اقبال کی ذات پر کیچڑ اچھالنے سے اچھلے پانی میں جا کر مینڈک کی طرح ٹرٹر نہ شروع کرتے۔

اس سے پیشتر بھی روزنامہ قومی آواز (نئی دہلی) میں فیروز آبادی کے ان بہکے قدموں کو روکنے کے لئے ڈاکٹر انوار الہدیٰ فردوسی (علیگڑھ) نے ایک مضمون لکھ کر لگام دی ہے۔

صد افسوس کہ فیروز آبادی ایک چکنے گھڑے ہی ثابت ہوئے اور اردو کے عظیم شاعر علامہ اقبال کی ذات پر دشنام طرازیاں جاری رکھیں۔ ان کی عقل غیر احساس ہو گئی مگر عمر کے ساتھ اعصاب پر بھی ضعف طاری ہو گیا جو خود کو کچھ سمجھانے والی کوئی بات تسلیم ہی نہیں کرتی۔ فیروز آبادی صاحب نے علامہ اقبال کی ذات پر کیچڑ اچھالتے وقت یہ بھی محسوس نہ کیا کہ کسی قائد، تخلیق کار، عظیم ہستی کے کردار یا خاندان میں کچھ خامی ہونے سے اس کی ادبی، علمی یا تحقیقی خدمات کو جھٹلایا نہیں جا سکتا۔

فیروز آبادی کے اس کارنامے نے باذوق اُردو داں اور ملت کے جذبات کو ٹھیس پہونچا کر بری طرح مجروح کر دیا ہے۔ اہلِ اردو کو اس بات کو بھی ملحوظ رکھنا چاہیے کہ فیروز آباد میں بھی چند سرے پائے جاتے ہیں جو فیروز آباد کے عوام کے جذبات کو بھی ٹھیس پہونچاتے رہتے ہیں۔ لیکن یاد رہے فیروز آبادی کی طرح دوسرے فیروز آبادی بھی بدنام نہ ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا کے مصداق نہیں۔ جناب فیروز آبادی کے ان کارناموں سے یہاں کے لوگوں میں بھی غم و غصہ کے جذبات پائے جاتے ہیں۔

انوار انصاری، سفیر فیروز آبادی

سہیل اپریل اور مئی ایک ساتھ مل گیا تھا۔ دونوں شمارے پسند آئے لیکن مئی ۸۸ء کا شمارہ کچھ زیادہ دلچسپ ہے۔ جناب اصغر علی انجینیر کا مضمون معلوماتی ہے اور فکر انگیز بھی۔ بدیع الزماں خاور، قمر ساحری، انور ظہیر اور نعیم کی نظمیں بہت متاثر کرتی ہیں۔ عائشہ عالیہ کی غزل اچھی ہے اور رویندر پٹواری کی کہانی "جوگن" بے حد پسند آئی۔ دوسری تخلیقات بھی اچھی لگیں۔ طرف سے تمام فن کاروں کو مبارک باد پیش کر دیں۔

"خطوط اعظم فیروز آبادی کے نام" میں بولیاں بہت کی بولی گئی ہیں۔ لیکن ایک بھی بولی واضح نہیں ہے۔ ایک اچھا ناقد وہی ہے، جو کسی فن کار کا چہرہ اس کے تلاش کرے۔ شراب و کباب کی عادت بلانوشی بھی ہو سکتی اذیت ناک کرب … شیشے کا سہارا یا ذریعہ بھی یا چھپانے کا بہانہ۔ ایک فن کار اپنی ذاتی زندگی میں کس قدر کرب زدہ ہے، اس کا اندازہ اس کی تخلیق ہی سے لگایا جا سکتا ہے۔ میرا اپنا خیال ہے کہ شراب و کباب کا یا تلاوتِ قرآن یا نماز کا پابند، فن کار بلند قد یا اچھا یا برا نہیں کہا جا سکتا۔ لہذا ایک فن کار کو اس کے فن کی روشنی میں پرکھنا انصاف کی بات ہوگی اور نتیجہ بھی نکلے گا۔

رحمان شاہی (پٹنہ)

ڈاکٹر عبد القیوم ابدالی کا انتخاب

یونیورسٹی گرانٹ کمیشن نے "قومی یکجہتی اور اردو" پر تحقیق کے لئے ڈاکٹر عبد القیوم ابدالی صاحب کی خدمات حاصل کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ ڈاکٹر ابدالی انجمن ترقی پسند مصنفین (اردو) بہار کے جنرل سکریٹری ہونے کے علاوہ انجمن ترقی پسند مصنفین و ہند سوویت کلچرل سوسائٹی کی مرکزی کمیٹی کے رکن، انجمن ترقی پسند مصنفین بہار کے سکریٹری، ہند سوویت کلچرل سوسائٹی کی صوبائی مجلس عاملہ کے رکن، انجمن (صرف ممبروں کے لئے) کے مدیر، سہیل گیا کے معاون مدیر نیز بہت ساری ادبی، سماجی و ثقافتی انجمنوں کے عہدوں سے وابستہ ہیں۔ انہوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۸۰ء کے آس پاس کیا لیکن بہت جلد ہی نوجوان ناقدین کی ا

حسن مثنیٰ سکندرپوری

دہلی کی ادبی سرگرمیاں

مولانا ابوالکلام آزاد پر سہ روزہ سیمینار

"کفر ٹوٹا خدا خدا کرکے" اور زیادہ نہیں صرف تیس سال بعد (۱۹۵۸ میں دہلی میں مولانا آزاد پر سیمینار ہوا تھا) دہلی اردو اکادمی کی جانب سے ۲۶-۲۷ اکتوبر ۱۹۸۵ء کو غالب اکیڈمی نئی دہلی میں سہ روزہ سیمینار کا بعنوان مولانا ابوالکلام آزاد (حیات اور کارنامے) انعقاد کیا گیا جو توقع سے زیادہ کامیاب رہا۔ اس کے لئے اکادمی قابل مبارکباد ہے۔ سیمینار میں ستائیس مقالے پڑھے گئے۔ ان مقالوں پر بحث نہیں ہوسکی اس لئے کہ پروگرام کچھ اس طرح کا بنایا گیا تھا۔ یہ مقالے دہلی اردو اکادمی جلد ہی کتابی شکل میں شائع کرے گی۔ اس رپورٹ میں مقالہ نگاروں کے اسمائے گرامی اور ان کے ذریعہ پیش کی گئیں کچھ خاص خاص باتیں قارئین کی نذر کی جارہی ہیں۔

مہمان خصوصی وائس چانسلر، دہلی یونیورسٹی پروفیسر مونس رضا نے ۲۵ اکتوبر کو اس سیمینار کا افتتاح کرتے ہوئے فرمایا کہ مولانا آزاد کی قدر اور شخصیت پر خاطر خواہ کام نہیں ہوا۔ وہ نہ تو مصلحت پسند تھے اور نہ سچی بات کہنے میں جھجکتے تھے۔ چنانچہ کچھ سیاستداں ہمیشہ ان کو اپنے دلوں کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتے رہے اور انھیں نظر انداز کرنے کی رسم چل پڑی ہے۔

پروفیسر مونس رضا نے بتایا کہ انھوں نے مولانا کو پہلی بار علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے اسٹیشن پر دیکھا تھا جب یونیورسٹی کے کچھ طلباء اور بعض اساتذہ نے مولانا کے خلاف مظاہرہ کیا تھا۔ مولانا کے چہرے پر بے چینی کے آثار نمایاں تھے لیکن غصے کا نام و نشان نہیں تھا۔ شاید وہ دل ہی دل میں بائبل کے یہ الفاظ دہرا رہے ہونگے "اے میرے مقدس باپ انھیں معاف کردے یہ نہیں جانتے کہ یہ کیا کررہے ہیں۔"

دوسری بار موصوف نے جامع مسجد دہلی میں دیکھا جہاں سے وہ خوف زدہ، پریشان حال لئے ہوئے مسلمانوں سے خطاب کررہے تھے (یہ تاریخی خطبہ دہلی اردو اکادمی نے شائع کرکے اپنے اسی سیمینار میں تقسیم کروایا۔)

تیسری بار مونس صاحب نے مولانا کو وزیر تعلیم کی حیثیت سے علی گڑھ یونیورسٹی میں دیکھا۔ ان کی کمر جھک گئی تھی لیکن ان کی دوربین نظروں نے دلوں کو ٹٹولا اور وہ یہ کہنے پر مجبور ہوئے "باڑھ گزر گئی ہے لیکن کہیں کہیں گڑھوں میں پانی موجود ہے۔"

پروفیسر مونس رضا نے یہ کہہ کر اپنی تقریر ختم کی کہ مولانا ایک ایسے مذہبی انسان تھے جن کو ان کے مذہب نے فرقہ پرست نہیں، انسان دوست اور انسانیت کا قدرداں بنایا۔

اس سیمینار کے ڈائرکٹر ڈاکٹر خلیق انجم تھے۔ دہلی اردو اکادمی کے سکریٹری جناب شریف الحسن نقوی مشہور قومی کارکن جناب انور دہلوی اور صدر جلسہ جناب مالک رام صاحب نے بھی جلسے سے خطاب کیا۔ حضرات اس بات پر متفق نظر آئے کہ قومی، ادبی اور سرکاری حلقوں نے مولانا کو بھلا دیا ہے۔ شریف الحسن نقوی نے اعلان کیا کہ دہلی اردو اکادمی ۸۸-۱۹۸۷ میں مولانا کا صد

سالہ جشن ولادت منائے گی۔ یہ فیصلہ کیا جا چکا ہے۔ موجودہ سیمنار اسی کا ایک حصہ ہے۔ حاضرین نے اس اعلان کا پرجوش انداز میں خیر مقدم کیا۔

۲۶ اکتوبر — پہلا اجلاس

صدارت : جوہن دیرینہ، نا تھ ظفر پیامی
نظامت : ڈاکٹر صلاح الدین

اس جلسے کا پہلا مقالہ پروفیسر ظہیر احمد صدیقی نے "سحبت جمال مولانا ابوالکلام آزاد" کے عنوان سے پیش کیا۔ مقالے میں مولانا کے اطوار و عادات، تحریر و تقریر، خبر و نغمے سے دلچسپی، اشعار کا انتخاب اور نجی محفلوں میں ان کے افکار و خیالات کا بھرپور جائزہ لیا گیا۔

ڈاکٹر شام لال کالرا عابد پشاوری نے "مولانا آزاد کی سیاسی بصیرت" کے عنوان سے اپنا مقالہ پیش کیا۔ مقالہ میں کہا گیا ہے کہ مولانا نے اخبار نکالا تو یادگار، مذہب کی طرف رجوع کیا تو منفرد۔ سیاست میں حصہ لو میر کارواں۔

تیسرا مقالہ جناب محمود انصاری، ایڈیٹر "منصف" حیدرآباد نے "تحریک آزادی میں الہلال والبلاغ کا حصہ" کے عنوان سے پیش کیا۔

پروفیسر عبدالمغنی (پٹنہ) نے اس اجلاس کا چوتھا مقالہ پیش کیا جس میں مولانا اور پنڈت نہرو دونوں کا تقابلی مطالعہ کیا گیا تھا۔

دوسرا اجلاس

مہمان خصوصی : آنند نرائن ملا
صدارت : محمود انصاری
نظامت : ڈاکٹر شارب ردولوی

اس اجلاس کا پہلا مقالہ "مولانا آزاد کی صحافت" کے عنوان سے ردولوی نے پیش کیا۔

دوسرا مقالہ ڈاکٹر صلاح الدین کا تھا "میں نے مولانا آزاد کو دیکھا تھا"۔ اس مقالے میں مقالہ نگار نے مولانا آزاد کے اطوار و عادات پر مبنی ان لوگوں کے بیانات قلم بند کئے ہیں جنھوں نے مولانا کو قریب سے دیکھا ہے۔

"مولانا آزاد کی صحافت" کے عنوان سے اس اجلاس کا تیسرا مقالہ جناب علی جواد زیدی نے پیش کیا۔ زیدی صاحب نے الہلال والبلاغ کے علاوہ ان تمام اخبارات و رسائل کے حوالے اپنے مقالے میں دیے ہیں جن سے مولانا آزاد وابستہ رہے یا جن میں ان کے مضامین شائع ہوئے۔

علی جواد زیدی صاحب نے اپنے مقالے میں یہ تجویز بھی پیش کی ہے کہ ایک ادارہ "مولانا ابوالکلام آزاد انسٹی ٹیوٹ فار ماس کمیونی کیشن" قائم ہونا چاہئے۔

تیسرا اجلاس

مہمان خصوصی : احمد سعید ملیح آبادی ایڈیٹر آزاد ہند کلکتہ
صدارت : ڈاکٹر جگن ناتھ آزاد
نظامت : ڈاکٹر خلیق انجم

اس اجلاس کا پہلا مقالہ بعنوان "مولانا آزاد کی سیاسی حیثیت" ڈاکٹر محمد حکم حیدر نے پیش کیا۔ اس مقالے میں موصوف نے مولانا آزاد کا ایک جملہ "جو قدیم ہے وہ ورثے میں ملا ہے اور جو جدید ہے وہ اپنا لیا ہے" کو ذکر کرتے ہوئے مولانا کی شخصیت کا ایک نفسیاتی جائزہ لیا ہے۔

اس اجلاس کا دوسرا مقالہ ڈاکٹر اعجاز علی ارشد نے پیش کیا۔

تیسرا مقالہ مشہور محقق کاظم علی خان نے پیش کیا جس کا عنوان تھا "مولانا آزاد اور ترجمان القرآن"۔ مقالہ میں موصوف نے اس بات کی وضاحت کی ہے کہ عربی الفاظ کے مفہوم و مطالب کے پردے میں حقیقت

پردہ ڈال دیا گیا تھا۔ مولانا آزاد نے ترجمان القرآن کے ذریعے ان تیز چیزوں کی دھجیاں اڑا دی ہیں اور سلیس اور صاف ستھری زبان میں اپنے خیالات پیش کرکے قرآن حکیم کے صحیح مفہوم کو عوام تک پہنچایا ہے۔

" آزاد کی شعلہ نوائیاں " کے عنوان سے اس جلاس کا چوتھا مقالہ ڈاکٹر ضمیر حسن دہلوی نے پیش کیا۔

مقالہ ختم ہونے کے بعد مہمان خصوصی احمد سعید یح آبادی مائک پر آئے اور موصوف نے چند چونکا دینے والی باتیں بتائیں جن کے تحت ہال میں ایک سناٹا چھا گیا۔ احمد سعید صاحب نے بڑے پر اعتماد لہجے میں کہا کہ تقسیم کے بعد علی گڑھ یونیورسٹی کو بند کرنے کا فیصلہ ہو چکا تھا۔ مولانا کی ذات تھی جس نے اس یونیورسٹی کو بچا لیا۔

دوسری خاص بات احمد سعید صاحب نے یہ بتائی کہ ۱۹۴۷ء میں دہلی میں فسادیوں کے ساتھ فوج بھی شامل ہو گئی تھی مسلمانوں کا قتل عام ہو رہا تھا لیکن ... جی خاموش تھے۔ فائرنگ کا آرڈر ہونے پر بھی ... ن کے دست و بازو حرکت نہیں کرتے تھے۔ اُدھر الہ ... ربھرت پور ریاستوں کی فوجیں کانگریسی رہنماؤں کو ... قتل کرکے دہلی پر قبضہ کرنے کے لئے تیار کھڑی تھیں ... ہرو کے ہاتھ پاؤں اس وقت ایک دم شل ہو گئے جب ... یک جگہ قتل اور غارتگری کرتی ہوئی ایک بھیڑ پر انھوں نے فوجیوں کو گولی چلانے کے لئے کہا لیکن فوجی ٹس سے مس نہیں ہوئے۔ ایسے نازک موقع پر مولانا آزاد سامنے آئے۔ انھوں نے پنڈت جی کو رائے دی کہ وہ جلد سے جلد مدراس رجمنٹ کو بلائیں جو فرقہ پرستی کی لعنت سے پاک ہے۔ مولانا کی تجویز کارگر ہوئی۔ جنوبی ہند کے فوجیوں نے دہلی کو راکھ ہونے سے بچا لیا۔

دوران تقریر احمد سعید صاحب نے یہ بھی بتایا کہ مولانا [illegible]

اور صحافتی زندگی کا آغاز دہلی سے کیا تھا لہٰذا یہ بہت جلد وہاں بھی مولانا آزاد پر ایک سیمینار کا بندوبست کریں گے۔ موصوف کے اس اعلان کا گرمجوشی سے خیر مقدم کیا گیا۔

چوتھا اجلاس

مہمان خصوصی : پروفیسر عبدالمغنی
صدر : صلاح الدین عمر
نظامت : محترمہ ڈاکٹر شمیم نکہت

اس اجلاس کا پہلا مقالہ ایم حبیب خان لائبریرین انجمن ترقی اردو ہند دہلی نے پیش کیا جس کا عنوان تھا " آزاد کی تصنیفات "۔

دوسرے دن کے اس آخری اجلاس کا آخری مقالہ " سرسید اور مولانا ابوالکلام آزاد " ڈاکٹر ضیاء الدین انصاری نے پیش کیا۔

۲۸ اکتوبر پانچواں اجلاس

مہمان خصوصی : ضیاء الرحمٰن انصاری وزیر جنگلات
صدارت : پروفیسر حکم چند نیر
نظامت : ڈاکٹر اسلم پرویز

" انشائیات ابوالکلام آزاد " کے تحت پروفیسر رضی الدین نے اپنا وقیع مقالہ پیش کیا جس میں مختلف زاویوں سے مولانا آزاد کی شخصیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

دوسرا مقالہ ڈاکٹر نثار احمد فاروقی نے " مولانا آزاد کا خاندانی پس منظر " پیش کیا جس میں مولانا کی مشہور و معروف کتاب " آزاد کی کہانی آزاد کی زبانی " میں درج کچھ واقعات اور مولانا کے والد صاحب کے بارے میں لکھے گئے کچھ حالات کو غلط ثابت کرتے ہوئے یہ کہہ کر اپنا مقالہ ختم کیا ہے " دروغ گو را حافظہ نباشد " ... [illegible]

جانا بھی تھا ساتھ ہی مولانا کے اوپر یہ پھبتی "دوغلگی ..... کے تعین بہت ناگوار گزرتی اور ناٹک پیدا کر انھوں نے اس کا ان لفظوں میں اظہار کیا:

"ہماری عادت ہو گئی ہے کہ ہم اہم شخصیتوں کو ان کے خاندانی پس منظر میں تلاش کرتے ہیں۔ حالانکہ مولانا آزاد کا تعلق ایک گھٹیا خاندان سے تھا، ان کی تحریریں ناقص ان کے حوالے ناقص لیکن پچاس سال تک انھوں نے مسلمانوں کے ذہن پر حکمرانی کی۔ قحط الرجال کے اس دور میں شاید ہی ایسا کوئی انسان پیدا ہو۔"

اس اجلاس کا آخری مقالہ "مولانا کی شخصیت کا ایک تاثر" آنند موہن زتشی گلزار دہلوی نے پیش کیا جس میں ۱۹۴۰ء سے لے کر ۱۹۵۰ء تک مولانا کی خدمت میں حاضر ہونے اور ان سے فیض حاصل کرنے کا ذکر تھا۔

چھٹواں اجلاس

مہمان خصوصی : سرور تونسوی
صدارت : پروفیسر ریاض الرحمٰن شروانی
نظامت : ڈاکٹر شریف احمد

مقالہ نگار ڈاکٹر کامل قریشی نے اپنے مقالے میں سر سید احمد کی انگریز دوستی اور مولانا آزاد کی انگریز دشمنی کا پس منظر بہت خوبصورت انداز میں پیش کیا۔

اس اجلاس کا دوسرا مقالہ "اردو نثر کی تاریخ میں مولانا آزاد کا عہد" ڈاکٹر صدیق الرحمٰن قدوائی نے پیش کیا۔

"ابوالکلام کی تفسیری نثر" کے عنوان سے اپنا مقالہ سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب کے پیش کرنے کیلئے وقت ایک مختصر تقریر کی اور کہا کہ سید سلیمان ندوی ترجمان القرآن کی اکثر تعریف کیا کرتے تھے۔ مولانا شبلی

متعلق کا حوالہ دیتے ہوئے سید صاحب نے کہا کہ شبلی کو اس بات کا اعتراف تھا کہ وہ پھیلے ہوئے مضمون کو سمیٹنے کے ماہر ہیں اور ابوالکلام کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ سمٹی ہوئی بات کو پھیلا کر کہنے کے ماہر ہیں۔

ساتواں اجلاس

مہمان خصوصی : ڈاکٹر نثار احمد فاروقی
صدارت : ڈاکٹر تنویر احمد
نظامت : ڈاکٹر اسلم پرویز

مقالہ نگار ناز انصاری نے پندرہ منٹ کا وقت جو انھیں دیا گیا تھا، اپنے مقالے کا پس منظر سمجھانے میں صرف کر دیا۔ سامعین میں کھسر پھسر شروع ہو گئی ناز انصاری کی مدھم آواز سنی نہیں جا سکی اور وقت ختم ہو گیا۔

"ابوالکلام بحیثیت شاعر" یہ مقالہ سیدہ شاہین نے پیش کیا جو مختصر ہونے کے باوجود جامع تھا۔ اوائل عمری میں مولانا نے غزلیں کہیں حضرت امیر مینائی سے اصلاح لی اور متعدد مشاعروں میں شریک ہوئے۔

جناب رضوان احمد ایڈیٹر "عظیم آباد ایکسپریس" کا "مولانا آزاد کا نظریۂ صحافت" کافی جاندار تھا۔

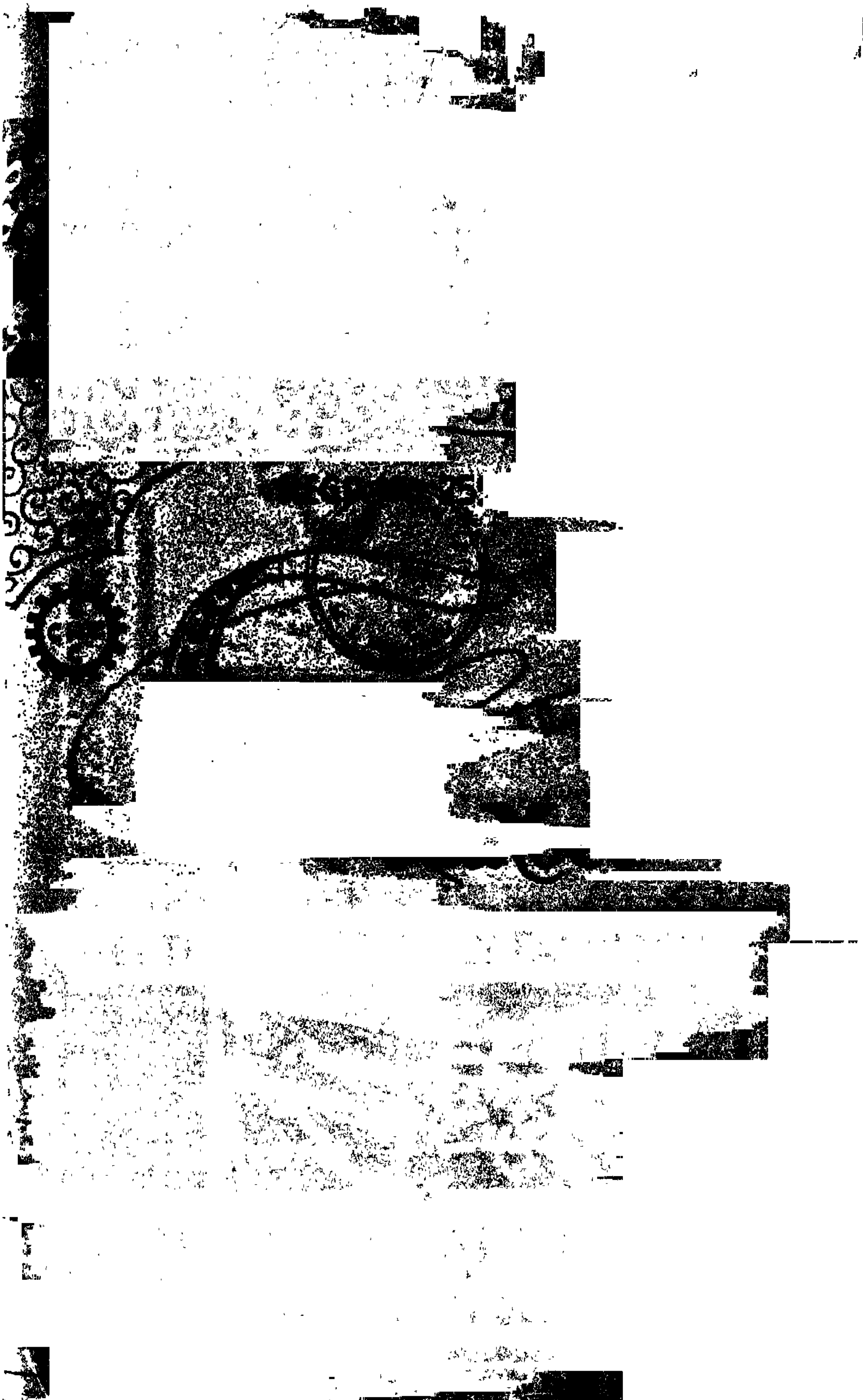
مقبول و معروف شاعر جناب محمود سعیدی کا مقالہ "مولانا آزاد کا سیکولرزم" اپنے دامن میں اس عہد کو بھی سمیٹے ہوئے تھا جس میں بھارت کے صوفیوں اور سنتوں نے اتحاد اور ہم آہنگی کو فروغ دیا ہے۔ مقالہ نگار نے اس بات کی خاص طور پر وضاحت کی تھی کہ مولانا آزاد اور گاندھی جی سے ملنے سے پہلے ہی متحدہ قومیت اور ہندو مسلم اتحاد کو اپنا نصب العین بنا چکے تھے۔

آٹھواں اور آخری اجلاس

مہمان خصوصی : کاظم علی خاں
صدارت : رضی الحسن۔ نظامت : ذہین نقوی

(باقی صفحہ ... پر)


ہمیشہ استعمال کیجیے



THE CREATORS OF CHANDRAPRABHA

Elena A. Serdiouk

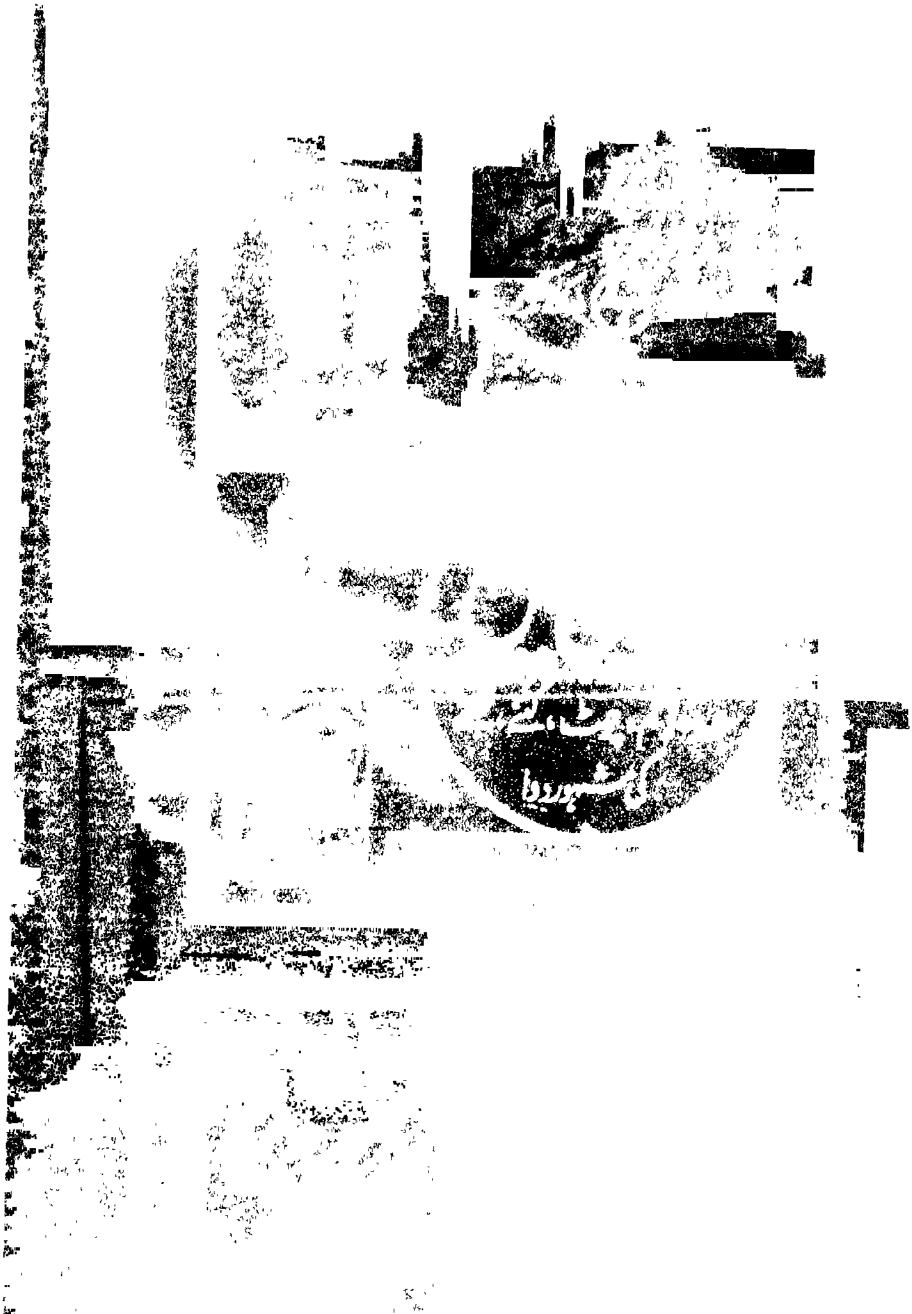
Moscow (U. S. S. R.)

Who said that he has no fear and awe
The one who knew the fear of mistake
The one who knew that cognition is slow
And the false wisdom cannot but break.

The gave him the title of Pure Knowledge,
Which is impossible, and worshipped him ?
We graduated from the same college
College of meekness, department of dream.

Who carved his garlands and precious crown
And gave him this tendar and arrogant smile ?
We spend the youth in the same town
We are the thinkers of the same style.

They are alive in the fine image
Somewhere on the hight and cannot yet climb,
I hope in the end of my pilgerimage
To join them somewhere in the twilights of time.



ترقی پسند ادب کا ترجمان

سہیل

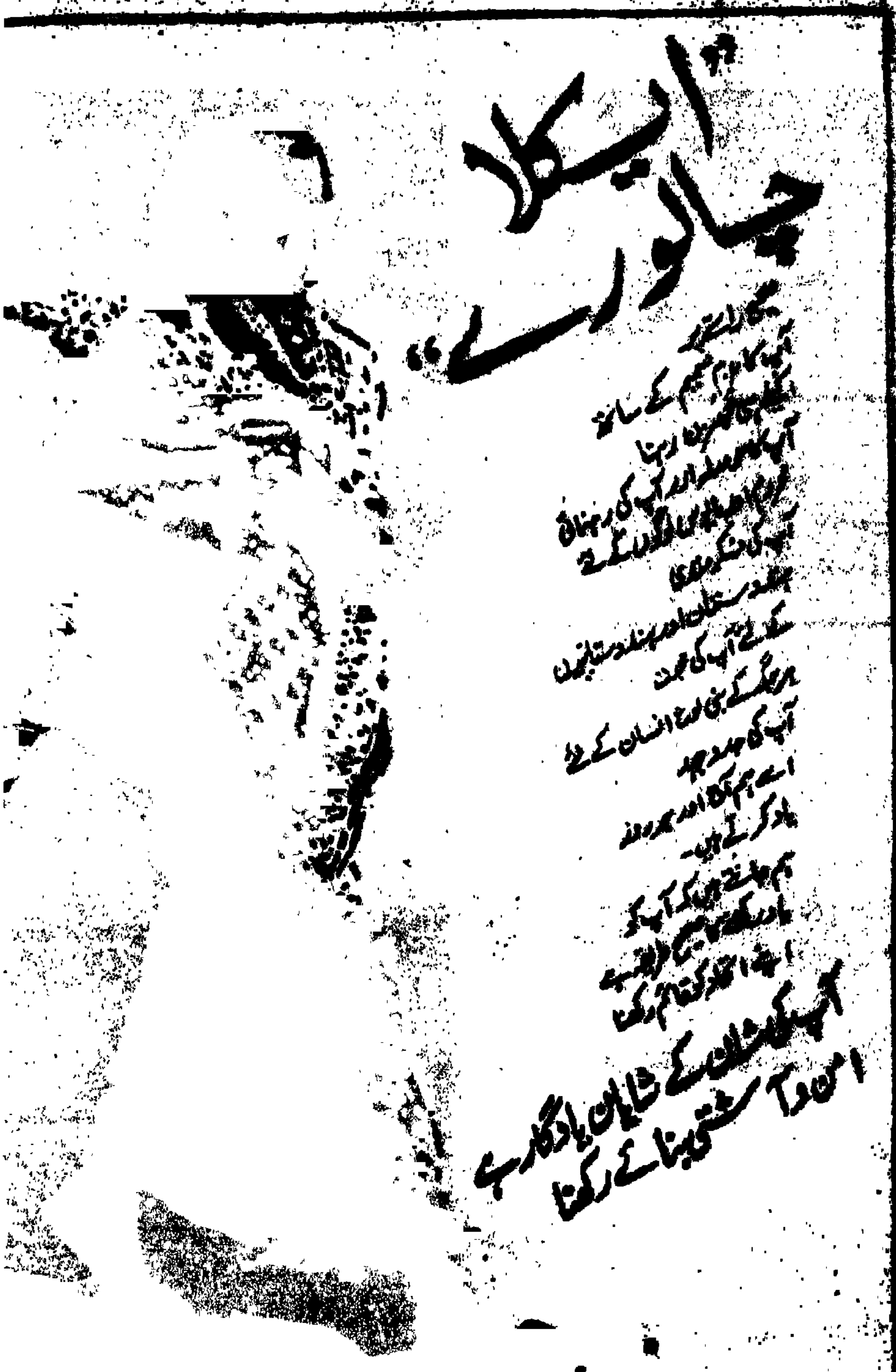
نومبر ۱۹۸۹ء

مدیر: ادریس شہسارامی
... : مسعود منظر شہسارامی
... : جمیل منظر شہسارامی
... : ... عبد القیوم ابدالی

مجلس مشاورت
ڈاکٹر تارا چرن رستوگی
ڈاکٹر قمر رئیس
اصغر علی انجینیئر

جلد نمبر ۴ : شمارہ نمبر ۱۱
بدل اشتراک : فی شمارہ ۲ روپے
زر سالانہ : ۲۴ روپے، لائف ممبری : ۲۵۱ روپے
خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ : ماہنامہ سہیل، دو سرائے ... گیا

فون نمبر ۵۰۲



ایک چادر سے
[illegible]
آپ کا [illegible] عزم صمیم کے ساتھ
[illegible]
[illegible] رہنا
[illegible]
[illegible] آپ کی رہنمائی
[illegible]
[illegible]
ہندوستان اور ہندوستانیوں
کے لئے آپ کی محبت
[illegible]
بنی نوع انسان کے لئے
آپ کی جدوجہد
[illegible]
یاد کرتے ہیں۔
ہم جانتے ہیں کہ آپ کو
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] کے شایان یادگار ہے
[illegible] بنائے رکھتا

(نمونہ)

عظیم اکتوبر انقلاب

آج سے ۶۰ سال پہلے، ۷ نومبر ۱۹۱۷ء کو روس میں ایک بھاری دھماکہ ہوا تھا۔ حکومت اجارہ داروں کے ہاتھ سے نکل محنت کشوں کے ہاتھ میں آگئی تھی۔ پونجی پتیوں اور زمینداروں کی حکومت کی جگہ مزدوروں اور کسانوں کی حکومت قائم ہوئی تھی۔ انسان کے ذریعے انسان کا استحصال ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا گیا تھا۔ عظیم لینن کی رہنمائی میں ہونے والی یہ انقلابی تبدیلی انسانی تاریخ میں ایک سنگ میل ثابت ہوئی۔ اور آج قریب ایک تہائی دنیا میں پھیل کر سماج واد ایک مثال بن چکا ہے۔ باقی حصوں میں بھی سماج واد کے لئے لڑائی جاری ہے۔ اب تو یہ دن دنیا کے محنت کشوں کے لئے عظیم تہوار بن گیا ہے۔

انسانی سماج کی تاریخ میں تبدیلی پہلے بھی ہوئی تھی۔ انقلاب پہلے بھی آیا تھا۔ لیکن اکتوبر انقلاب اپنے آپ میں ایک عظیم حادثہ ہے۔ یہ پہلا انقلاب تھا جو پہلے سے بنائی گئی روپ ریکھا کے مطابق انجام پذیر ہوا۔ مارکس اور انگلس نے دنیا کے محنت کشوں کو سائنسی کمیونزم کا عظیم فارمولا دیا۔ لینن نے اپنے دور کے مطابق مارکسواد کو اور پھیلایا اور روس کی موجودہ حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے اسے صحیح طریقے سے لاگو کیا۔ اس طرح پہلی جیت سماج وادی انقلاب کے ساتھ دنیا میں پونجی واد سے سماج واد میں تبدیلی کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ مارکسواد لینن واد دنیا کو بدلنے کے لئے مشعل راہ بن گیا۔ پچھلے انقلابوں میں حکومت ایک استحصال کرنے والے کے ہاتھ سے نکل کر دوسرے استحصال کرنے والوں کے ہاتھ میں [illegible] گئی تھی۔ لیکن اکتوبر انقلاب میں نہ صرف حکومت بدلی بلکہ آدمی کے ذریعے آدمی کے استحصال کے طریقے کو ہمیشہ کے لئے ختم کر کے استحصال کے بغیر سماج وادی نظام کی بنیاد ڈالی گئی۔

کمیونسٹ مینی فیسٹو میں مارکس نے نعرہ دیا "دنیا کے مزدور ایک ہو" پہلے سماج وادی انقلاب کی دنیا کے مزدوروں نے اپنی آزادی کی شکل میں اس کا استقبال کیا۔ اور جب نئے سماج وادی انقلاب کا گلا گھونٹنے دینے کے لئے چاروں طرف سے ۱۴ ملکوں کی پونجی وادی حکومتوں نے ایک ساتھ حملہ بول دیا تب دنیا کے مزدوروں نے کھلے طور پر حملہ آور ملکوں کے مزدوروں نے حملہ کے خلاف آواز اٹھائی اور اپنی قربانیاں دیں۔ عظیم اکتوبر انقلاب کے اثر سے دنیا میں بھونچال سا آگیا۔ غلامی کی زنجیریں ٹوٹنے لگیں اور اب دنیا میں چاروں طرف سماج واد کا راستہ ہموار ہوتا جا رہا ہے۔

پونجی واد سے سماج واد میں تبدیلی کا دور ایک ایسے دور میں پہنچ چکا ہے جہاں ایک طرف اکتوبر انقلاب کا ملک سوویت یونین اور دنیا کا سماج واد امن ترقی اور زندگی کے محافظ کی شکل میں کھڑا ہے۔ دوسری طرف امریکی حکومت اور سامراج واد دنیا کو جنگ اور موت میں تبدیل کر دینے کے لئے آمادہ ہے ایسے وقت میں اکتوبر انقلاب کی سالگرہ جنگ کی مخالفت اور امن کی حفاظت کے لئے مضبوط کرنے کا دن ہے۔

ہماری آزادی کی حفاظت اور معاشی ترقی کی لڑائی میں اکتوبر انقلاب کے ملک کی مدد خاص اہمیت رکھتی ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہندوستان سوویت یونین کی دوستی اور مضبوط ہو۔ آئیے ہم اکتوبر انقلاب کی سالگرہ پر عہد کریں کہ ہم اپنی آزادی کی حفاظت اور اکتوبر انقلاب کے مقاصد کو آگے بڑھانے کے لئے جد و جہد کرتے رہیں گے۔

[illegible]

عظیم فیروز آبادی

میری سنو جو گوشِ حقیقت نیوش ہے

مئی ۲۰۰۰ء کے ہمکیل میں جمیل نظر صاحب نے مخطوط بنام عظیم فیروز آبادی کے نام سے چند خطوط مرتب کر کے ان پر اظہارِ خیال کی دعوت دی ہے۔ بحث و مناظرہ کا سلسلہ دلچسپ ہوتا ہے اس سے فکر کے نئے دریچے کھلتے ہیں اور ایک دوسرے کے نقطۂ نظر کو سمجھنے اور سمجھانے کا موقع ملتا ہے۔ لیکن اس کا ایک خراب پہلو یہ بھی ہوتا ہے کہ اکثر بحثیں سنجیدگی اور معقولیت کی بجائے کج بحثی پر ختم ہوتی ہیں۔ آپ ناراض نہ ہوں تو عرض کروں کہ ہر شخص کی طرح میں بھی اپنے آپ کو بہت معقول آدمی سمجھتا ہوں اور سلیقے سے اپنی بات کہنے اور دوسرے کے نقطۂ نظر سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ مجھے اقبالیات سے دلچسپی ہے میں چاہتا ہوں اقبال کے متعلق اپنے انداز نظر کا آپ کو بھی معترف بنا لوں۔ اس لئے میں نے اس بحث میں شریک ہونا منظور کر لیا ہے۔ نامہ نگار ہر مکتوب نگار کے بارے میں اظہارِ خیال کرنا میرے لئے ممکن نہیں اس لئے نامور کو نظر انداز کر کے میں صرف اعتراضات کا یا مراسلہ نگار کی فکر رسائی کا جائزہ لوں گا۔ اعتراضات سلسلہ وار اس طرح ہیں:

۱۔ اس مراسلہ کو "قومی آواز" یا "ہماری زبان" میں چھپنا تھا کہ ان اخباروں کے قاری عظیم فیروز آبادی کے مضامین سے لطف اندوز ہو چکے ہیں۔
۲۔ عظیم فیروز آبادی نے ڈاکٹر عبدالمغنی صاحب کے اصل سوال کا جواب نہیں دیا ہے۔
۳۔ علامہ اقبال فرقہ وارانہ نہیں کیسے ہو سکتے تھے۔ یہ پہلو فیروز آبادی کے ذہن سے محو ہو گیا۔
۴۔ اس بہانے ایک کیٹیلاگ سے اپنی آنے والی تالیف کی پبلسٹی کر دی۔ یہ سودا گھاٹے کا نہیں رہا۔
۵۔ فیروز آبادی پڑھے لکھے آدمی ہیں، مزاج تحقیقی ہونے کے باوجود تعمیری کم تخریبی زیادہ ہے۔ اس کے پیچھے دل آزاری، تعصب اور جذباتیت ملتی ہے۔ انہوں نے اقبال کے والد کی شان میں یہ ہتک آمیز کلمے کہے ہیں۔
۶۔ فیروز آبادی کی ضد اور الجھانے کا سبب اقبال کی شاعرانہ عظمت سے لطف اندوزی نہیں بلکہ کوئی اعصابی کمزوری ہے کیونکہ وہ اقبال کے بامحاورہ صحیح اردو لکھنے کا قائل نہیں۔
۷۔ آپ کے مضامین اقبال پر تحقیقی مضامین لکھنے سے اتنی شہرت حاصل نہیں ہوتی جتنی اُن پر معاندانہ مضامین لکھنے سے ہوتی ہے۔
۸۔ فیروز آبادی شاید جوش کی "یادوں کی بارات" کو سوانح نگاری کا اعلیٰ نمونہ سمجھتے ہیں۔ اس میں جوش نے ایک ایک لمحہ پروفیسری اہل سیاست کے الفاظ میں بڑے بڑوں کے اصل اور حسب و نسب کو عیاں کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

۹ فیروز آبادی کا یہ اعتراض لغو ہے کہ مفتی صاحب نے جہاں اقبال کی شاعری کے متعلق ہزار ہا صفحات سیاہ کئے ہیں، وہاں انکی سوانح حیات کیوں نہیں مرتب کی۔
۱۰ فیروز آبادی اقبال کے مقابلے میں جوش کی قادر الکلامی کا معترف ہے۔
۱۱ فیروز آبادی نے چالاکی سے اقبال کے کردار کشی کی کوشش کی ہے۔ خالد نظیر صوفی کا مضمون "بے داغ ہے مانند سحر میری جوانی" جو طاہر تونسوی کی مرتب کردہ کتاب "حیاتِ اقبال" میں شائع ہوا ہے اس کی نظر سے نہیں گزرا۔
۱۲ علامہ اقبال کا یہ کہنا کہ میری مذہبی معلومات کا دائرہ بہت محدود ہے محض انکسار کی بنا پر تھا۔
۱۳ فیروز آبادی کا یہ استدلال درست نہیں کہ Reconstruction of Religious thoughts in Islam اقبال نے انگریزی میں اس لئے لکھا کہ ان کو صحیح اردو لکھنا نہیں آتی تھی۔
۱۴ فیروز آبادی کو تنقیص اور تعصب کی عینک اتار کر دوسرے اہلِ نظر کی آرا کا احترام کرنا چاہیئے۔
۱۵ نقطۂ ذوق نیروز آبادی نے غلط استعمال کیا ہے۔
۱۶ اقبال نے کبھی انکار نہیں کیا کہ وہ نتھو کا بیٹا ہے جس کا پیشہ درزی کا تھا۔
۱۷ اقبال ایک عظیم شاعر تھے اور ایک عظیم انسان بھی۔ عربی زبان و ادب میں ایم۔ اے میں اول آنے کے باوجود ایک مولوی سے ابن عربی کی فصوص الحکم پڑھی۔ انھیں اسلام پر عبور حاصل تھا۔ سید سلیمان ندوی کے اعتراضات کا مسکت جواب دیا ہے۔
۱۸ پروفیسری سے صرف فرنگیوں کے خلاف لکھنے کی وجہ سے استعفیٰ دے دیا۔ اور سر کا خطاب اپنے استاد کے لئے شمس العلماء کا خطاب دیئے جانے کی شرط پر قبول کیا۔ حیدر آباد کا وظیفہ لینے سے انکار کر دیا۔
۱۹ آرہ کے مقدمے میں صرف ایک ہزار روپے لیکر چلے گئے جبکہ پانچ ہزار روپے ملنے کا امکان تھا۔
۲۰ اقبال کا سلسلہ آگے چل کر سر تیج بہادر سپرو سے مل جاتا ہے۔
۲۱ فیروز آبادی اگر ایسا ہی ماہر اقبالیات ہوتا تو جگن ناتھ آزاد اور جاوید اقبال کی جگہ اقبال شناسی کی مجلسوں میں اسے مدعو کیا جاتا۔
۲۲ فضیل بن ایاض دن میں مسافروں کو لوٹتے تھے، رات بھر عبادت کرتے تھے۔ میں اقبال کو بھی اس مقام پر جلوہ افروز دیکھتا ہوں۔ جہاں اس کا ظاہر و باطن ایک ہو گیا ہے اور دونوں مل کر وہ فلسفۂ خودی بن گیا جو پوری ایک قوم کے لئے مشعلِ راہ ثابت ہوئی۔
۲۳ مفتی صاحب نے اقبال کا فلسفہ بھلے ہی پڑھا ہو، اقبال سے انھیں جیسی عقیدت رہی ہو مگر ان کا دل صاف نہیں ہے۔ اقبال سے عقیدت مندی کا دم بھرنے کی وجہ سے مجھے مفتی صاحب سے ہمدردی ہے لیکن ان کے مذاقِ حسن پر افسوس بھی آتا ہے۔
۲۴ جہاں تک عظیم صاحب کے اردو کے نوعمر ہونے کا تعلق ہے مفتی صاحب شبہ بالکل صحیح ہے کیوں کہ عظیم صاحب کو شاعر، ناقد یا محقق ہونے کی حیثیت سے کوئی نہیں جانتا۔

اعتراضات کا سلسلہ وار جائزہ لینے سے پہلے، چند معروضات پیش کرنا چاہوں گا۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ علامہ اقبال کے صحیح حالات جاننے کے لئے پاکستان جانا اور وہاں قیام کرکے تحقیق کرنا بہت ضروری ہے۔ چونکہ ملک کے سیاسی ماحول میں اقبال ہی کا ایک مخصوص اطلاعیہ اور ملنے کی وجہ سے کسی پاکستانی ادیب کا اقبال کے بارے میں مخلصانہ

اظہارِ خیال ممکن نہیں رہ گیا ہے۔ ہندوستان میں ایسی کوئی بات نہیں لیکن یہاں پاکستانی مطبوعات نہیں ملتیں اقبال سے عام اخبار و رسائل نہیں ملتے۔ وہ لوگ نہیں ملتے جنھوں نے اقبال کو دیکھا تھا۔ ایسی صورت میں اقبال کے بارے میں سنی سنائی باتوں اور غیر مصدقہ روایات پر بھروسہ کرنا پڑتا ہے۔ اگر یہاں اقبال سے متعلق ساری کتابیں ملتی ہوتیں تو اقبال کا بے لاگ مطالعہ کرنا آسان ہوتا۔

اقبال بڑا شاعر تھا' اس میں کلام نہیں۔ لیکن وہ اعلیٰ مفکر تھا اور نہ بڑا انسان تھا۔ وہ دُنیا کے دوسرے فنکار شیکسپیئر، والٹیئر، روسو، بالزاک، دوستووسکی، غالب کی طرح معمولی انسان تھا۔ لیکن اقبال پرستوں نے اس کی عظمت کے اتنے گن گائے ہیں، ان کے نام کی ایسی مالاجپی ہے کہ یہ مردِ معقول، یہ زندہ دل شاعر پیغمبر نظر آنے لگا ہے۔ ایک سے خانہ، معبد اور بت خانے میں تبدیل ہو گیا ہے۔

ہم ہندوستانی اور پاکستانیوں کی یہ عادت رہی ہے کہ ہم جس فن کار سے محبت کرتے ہیں' اس کے احترام میں جب تک ماورائی عقیدت شامل نہیں کر لیتے، ہماری تسکین نہیں ہوتی۔ اقبال کے ساتھ بھی یہی ہوا ہے۔ بڑا فن کار ماننے کے ساتھ ہم اسے بڑا انسان بھی سمجھنے لگے ہیں۔ جب کوئی اس آسمانی دیوتا کے چہرے پر انسانی [illegible] دیتا ہے تو ہم اسے غیظ آلود نظروں سے دیکھنے لگتے ہیں۔

ایک دشواری اور ہے؛ حقیقت اکثر تلخ ہوتی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ اس کے شائستہ اظہار سے اس کی [illegible] میں کمی آجاتی ہے لیکن منھ کا مزا بگاڑنے کے لئے تھوڑی ہی کافی ہوتی ہے۔ ایک کانے آدمی کے کانے پن کو ظاہر کرنے کے لئے کتنا ہی دلآویز پیرایۂ بیان استعمال کیجئے، ناممکن ہے یہ اشارہ اس کی طبیعت پر گراں نہ گزرے۔ مجھے اعتراف ہے کہ اقبال اور ان کے والد کے متعلق' میرے گزشتہ مضامین میں میرا لہجہ شائستہ نہیں رہا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اقبال کے سیرت نگاروں نے ان کے متعلق بڑا بھونڈا جھوٹ بولا ہے مثلاً اقبال کی دعا سے بانجھ عورتوں کے اولاد ہو جایا کرتی تھی اور لاعلاج مریض اقبال کے مرقد کی خاک چاٹنے سے شفایاب ہو جاتے تھے (اقبال درون خانہ) اسی طرح اقبال کے والد کی ناخواندگی کو باعظمت بنانے کے لئے کہا گیا کہ وہ نبیؐ اُمّی کی طرح اُمّی تھے (ذکرِ اقبال)، تو مسلمان ہونے کی وجہ سے میں بھی [illegible] ہو جاتا ہوں۔ اس کے علاوہ مجھے کھلے دل سے اعتراف کر لینا چاہیئے کہ اقبال سے متعلق لوگوں کی عقیدت مندی کو ٹھیس پہنچانے کے لئے مجھے اکثر تلخ نوائی کا سہارا لینا پڑا ہے۔

اب میں سلسلہ وار' مراسلہ نگاروں کے اعتراضات کا جائزہ لوں گا۔

۱۔ مراسلہ نگار کا یہ خیال درست ہے کہ میرے خط کو ہماری زبان میں چھپنا چاہیئے تھا۔ لیکن ہماری زبان میں میرے مضامین کی اشاعت پر جو ہنگامہ کھڑا ہوا' ہماری زبان کے مدیر کے سامنے اس کی بنا پر اندیشوں کا ایک پہاڑ کھڑا ہو گیا۔ اسے اسی میں اپنی عافیت نظر آئی کہ وہ آئندہ اقبال پر میرا یا کسی اور کا کوئی مضمون شائع نہ کرے۔ میں نے بھی اسے اس خارزار میں گھسیٹنا مناسب نہیں سمجھا۔ تو نہیں اور سہی' اور نہیں اور سہی۔

۲۔ یہ صحیح ہے کہ حنفی صاحب کے اٹھائے ہوئے بعض سوالات کے جوابات میرے خط میں نہیں دیئے گئے ہیں۔ میرے اصل مضامین میں ان کے جواب موجود تھے۔ حنفی صاحب نے دانستہ ان سے صرفِ نظر کر کے کبھی آدھی عبارت کو پیش نظر رکھ کر کبھی عبارت کا مطلب توڑ مروڑ کر غلط بحث پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ پہلے کے آئندہ شمارے آزاد نظم میں ان پر سیر حاصل بحث شائع ہو گئی ہے۔

۳۔ علامہ اقبال فرقہ ملامتیہ سے تعلق رکھتے ہیں لیکن صرف شاعری کی حد تک۔ شاعری میں عموماً شاعر اپنے متعلق جن بات کا اظہار کرتا ہے اسے ہم سنجیدگی سے نہیں لیتے۔ اقبال کی نثری تحریروں میں ایک جگہ بھی ایسا نہیں ملتا جے انھوں نے اپنے

ملامت کرنے کے لئے لکھا ہو۔ اس سلسلے میں میں پھر صاف گوئی سے کام لوں تو قارئین کو تکلیف ہوگی۔ لیکن یہ کرنے کے لئے کہ علامہ فرقہ ملامتیہ سے تعلق نہیں رکھتے تھے۔ یہ واقعہ منظر عام پر لانے کے لئے مجبور ہوں کہ ج گاندھی جی اپنے جاں بلب باپ کے پاؤں دباتا چھوڑ کر شہوانی جذبہ کے تحت اپنی بیوی کے کمرے میں چلے گئے اور بعد میں پرائسچت کے طور پر انھوں نے اپنی کمزوری کو بھی ظاہر کر دیا۔ اسی طرح اگر اقبال نرگا ملامتیہ ہوتے تو اپنی پندرہ سالہ بیوی سردار بیگم کی خلد بریں سے لطف اندوز ہونے کی خاطر اپنی مرگ بیٹی معراج بیگم کو پدرانہ تیمارداری سے محروم کر کے جو بے کسی کی موت مرنے کے لئے چھوڑ دیا تھا ملامت کرنے کے لئے اس کا برملا اظہار کرتے۔

غریب مراسلہ نگار کبھی ٹلسٹ کے مفہوم سے واقف نہیں۔ ہندوستانی مسلمانوں میں اسکالر تو ہیں کوئی کیتھولک ہے مجھے نہیں معلوم۔

مفتی صاحب کے برعکس، مراسلہ نگار نے مجھے پڑھا لکھا محقق شمار کیا ہے۔ انکی رائے میں میرے لہجہ میں دل آزاری اور جذباتیت ملتی ہے۔ مجھے ان کا یہ اعتراض تسلیم ہے لیکن ان کی یہ بات میرے گزشتہ مضامین کی حد تک درست ہے۔ موجودہ خط میں میرا لہجہ انتہائی شائستہ، معقول اور احترام آمیز ہے۔ اس میں علامہ اقبال اور مفتی صاحب کے لئے کچھ زیادہ ہی مبالغہ آمیز احترام سے کام لیا گیا ہے۔

میں اقبال کی شاعری سے لطف اندوز ہوتا ہوں، ان کی شاعرانہ عظمت کا بھی قائل ہوں۔ لیکن اگر آپ پڑھے لکھے آدمی ہیں تو اقبال کی نثر میں جو زبان و بیان کی غلطیاں ملتی ہیں، ناممکن ہے ان پر آپ کی نظر نہ پڑے۔ مولانا حسرت موہانی اور جوش ملیح آبادی نے اقبال کی نثر اور نظم اور غزلوں میں جن غلطیوں کی نشاندہی کی ہے، اسے یہاں دہرانا ناممکن ہے۔ ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ اقبال کی مادری زبان اردو نہیں پنجابی تھی۔ انھوں نے ابتدائی سے لیکر ایم اے تک انھوں نے اردو مضمون کی حیثیت سے کبھی نہیں پڑھی۔ اردو داں دوست احباب اور دوستوں کی معیت میں جتنی اردو وہ سیکھ سکتے تھے، انھوں نے سیکھ لی۔ اس کے علاوہ اس زمانے میں برصغیر میں اردو کا عام رواج تھا۔ پھر شاعرانہ ضرورت کے تحت بھی انھیں اردو سیکھنی پڑی۔ ایسی صورت میں انھیں اردو پر قدرت حاصل نہیں ہو سکی۔ یہی وجہ ہے کہ انکی اردو نثر میں جابجا زبان کی غلطیاں بکھری نظر آتی ہیں۔ چند غلطیاں نمونتاً پیش کی جاتی ہیں :

(الف) آپ کے خاندانی تعزز کا حال معلوم کر کے مجھے مسرت ہوئی۔
(ب) یہ خط جوش کی معرفت کے لئے لکھ رہا ہوں۔
(پ) کئی دنوں کی بیماری کے بعد کل بستر بیماری سے اٹھا ہوں۔
(ت) بجلی کے علاج سے استفادہ حاصل کروں گا۔
(ٹ) میرے بے گناہ اشعار کو جو حضرت نے تیغ قلم سے مجروح کیا ہے۔
(ث) ہندوستان کے مسلمان کئی صدیوں سے ایرانی تاثرات کے اثر میں ہیں۔
(ج) مجھے اچار شلغم سے بہت محبت ہے۔
(چ) طالب علموں نے گفتگو میں کیا کریں .... گر اس کا کچھ مضائقہ نہیں۔
(ح) پوری عبارت فن کے بعد اگر آپ نے جاوید نامہ پر خامہ فرسائی کی تو ہمیشہ زندہ رہو گے۔

مراسلہ نگار کے اس خیال سے مجھے اتفاق نہیں کہ آج کے دور میں اقبال پر توصیفی مضامین لکھنے سے شہرت ملتی

اچھا ہوا جل گیا

نہیں ہوتی۔ اگر ان کے اس قول میں صداقت ہوتی تو بقول ایک دوسرے مراسلہ نگار (اعتراض نمبر ۲) جگن ناتھ آزاد نہ اقبال کی آنکھوں میں دھول کیا جاتا نہ انھیں پاکستان میں علامہ اقبال گولڈ میڈل ملتا اور نہ اقبال منزل میں منعقد الاقوامی مشاعرہ میں صدارت کرنے کا شرف حاصل ہوتا۔

۸۔ جوش کی یادوں کی بارات "سوانح نگاری کا مکمل نمونہ نہیں ہے۔ اس میں وہ مثالی صداقت نگاری جو ایک اچھی سوانح عمری کا نصب العین ہوتی ہے۔ اس میں دروغ گوئی ملتی ہے لیکن راست مانند دشو دروغ مصلحت کو راست مانند راست است)۔ اس کے برعکس جوش نے جس بے جگری سے اپنی گزری ہوئی بیان کی ہے، اقبال تو کیا کسی دوسرے اردو سوانح نگار کو بھی اس کی توفیق نہیں ہوئی۔ بایوگرافی چیسٹرفیلڈ کی شاہکار مطمح نظر ہمیشہ اردو والوں کے سامنے رہا ہے اور رہتا ہے۔ لٹن اسٹریچی، ہنری ٹرود برٹرینڈ رسل کی معیاری صداقت نگاری کو کاش ہم اپنے لئے مشعل راہ بنا سکتے۔

۹۔ مراسلہ نگار نے "پوری عبارت پڑھنے کی بجائے" ادھوری عبارت سے نتیجہ اخذ کر لیا ہے۔ میں نے لکھا صاحب نے اقبال کے شاعرانہ کمالات کو اجاگر کرنے کے لئے ہزارہا صفحات سیاہ کرنے کے لئے زحمت اٹھا اخلاقی حیثیت سے بھی اقبال کا مرتبہ انکی نظر میں بلند ہوتا تو یقیناً اس کو نمایاں کرنے کی بھی انھوں نے کوشش ہوتی۔

۱۰۔ جی ہاں! قادر الکلامی کے لحاظ سے اقبال، جوش کے ہم پلہ نہیں ہیں۔

۱۱۔ مراسلہ نگار اقبال سے واقف نہیں اور نہ اقبال کے متعلق کافی سوانحی لٹریچر ان کی نظر سے گزرا ہے۔ خالد نظر صوفی کی "اقبال درونِ خانہ" ان کی نظر سے نہیں گزری جس میں سے مذکورہ مضمون "بے داغ سحر شیری جوانی"، طاہر تونسوی کی مرتبہ کتاب "حیاتِ اقبال" میں نقل کیا گیا ہے۔ اقبال کے مزاج اور ان کے عادات و خصائل کو اجاگر کرنے کے لئے ہندوستانی مطبوعات کے چند اقتباسات ذیل میں دیئے جا

"اقبال شراب پیتے تھے۔ حسن فروشوں کے یہاں گانا سننے کے لئے جایا کرتے تھے۔ ابا جان کہتے تھے کہ اقبال کو وائس چانسلر یا کسی اور نے بلوا کر کہا "تمہاری شکایت آئی ہے کہ تم طوائفوں کے یہاں جایا کرتے ہو۔" انھوں نے اقرار کیا اور کہا کہ آخر تفریح کی بھی تو کوئی صورت ہونا چاہیے۔

("اپنی تلاش میں" کلیم الدین احمد ص ۱۲۱-۱۲۰)

اقبال نے اس طرح کا سرور حاصل کرنے کے لئے بھنگ سے لیکر افیون تک کون سا نشہ نہیں کیا۔

("شعر غیر شعر اور نثر" شمس الرحمن فاروقی صفحہ ۱۰۲)

ہوتا کیا تھا۔ بس آج ایک مولوی صاحب کو ہم نے پکڑ لیا۔ جس طوائف کے یہاں ہم (اقبال علیہ الرحمۃ) گانا سننے گئے تھے وہیں ایک مولوی صاحب ہمارے جانے سے پہلے دل بہلا رہے تھے۔

(ملفوظات نظامی صفحہ ۱۰۰)

تم سال بھر کے بعد وطن واپس آئے ہو۔ استاد سچ کہو اب کے جال میں کیا کیا لگا۔ میں نے کہا یہاں جو کچھ لگا وہ آپ (اقبال) کے راؤنڈ ٹیبل والے سفر سے کم ہی ہوگا۔ خدا اپنی مار دھاڑ کو بھی یاد کر لیجئے۔

(ملفوظات نظامی صفحہ ۹۰)

ناقد کلیم الدین احمد کے والد عظیم الدین احمد صاحب نے ایک بار اقبال کی سرخ آنکھیں اور شکن آلود دیکھ کر انھیں چھیڑا تھا کہ آج کل آپ کی راتیں کہاں گزر رہی ہیں۔ ("جواز" دسمبر تا مئی ۲۰۰۰ء ص ۱۰ باقر مہدی)

(اقبال)

اقبال سنگھ کا ایک مضمون ہفتہ وار "آرگنائزر" ۱۹۶۹ء کے شمارے میں نکلا تھا جس میں لکھا تھا کہ اقبال نے لاہور کی ایک طوائف کا گلا گھونٹ کر ہلاک کر دیا تھا۔ یہ شمارہ میرے پاس نہیں ہے۔ سپرو ہاؤس دہلی میں دیکھا جا سکتا ہے۔ اس واقعہ کی صفائی خالد نظیر صوفی نے اپنی کتاب "اقبال درونِ خانہ" میں صفحہ ۲۳-۱۳۲ پر کی ہے ـــــ کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے۔

میں (اقبال) نے جوا کبھی نہیں کھیلا مگر جب انہوں نے مجھے دعوت دی تو تیار ہو گیا۔ چنانچہ میں کھیلا اور لندن پہنچتے پہنچتے آپ سے ۲۰ پونڈ جیت لئے۔ (ملفوظاتِ نظامی ص ۲۲۹)

تو یہ ہے ایک مختصر سی جھلک اس جوانی کی جو مانند سحر بے داغ تھی۔

۱۲۔ اقبال کی مذہبی معلومات کا علم سید سلیمان ندوی کے نام ان کے خطوط سے بخوبی ہو جاتا ہے۔ صوفی تبسم کے خط میں جہاں سے یہ جملہ لیا گیا ہے، انکسار کا کوئی محل نہ تھا۔

۱۳۔ اردو میں اقبال کو کمال دسترس حاصل ہوتی تو بھی اس کا امکان کم تھا کہ انھوں نے اپنے خطبات کو اردو میں لکھا ہوتا۔ اردو میں لکھے جانے پر انھیں وہ اہمیت حاصل نہ ہوتی جو آج ہے۔ لیکن اس میں شبہ نہیں کیا جا سکتا کہ اردو میں اپنے خیالات کا کماحقہ اظہار کرنے کی ان میں صلاحیت نہیں تھی۔ صوفی غلام مصطفےٰ تبسم کو لکھتے ہیں: "مجھ کو بارہا اس کا تجربہ ہوا ہے کہ اردو میں گفتگو کرتے ہوئے میں اپنے مافی الضمیر کو اچھی طرح ادا نہیں کر سکتا۔" (اقبالنامہ حصہ اوّل)۔

۱۴۔ مراسلہ نگار فیروز آبادی کو جو مشورہ دے رہے ہیں، کاش وہ خود بھی اس پر عمل کریں۔

۱۵۔ لفظ وثوق کے غلط یا صحیح استعمال کی تصدیق اب مفتی صاحب نے کر لی ہوگی۔ مجھے مسرت ہوگی اگر اخلاقی جرات سے کام لیکر وہ مجھے مطلع فرما دیں۔ مراسلہ نگار کی خدمت میں عرض ہے ؎

تجھ سے تو کچھ کلام نہیں لیکن اے ندیم میرا سلام کہیو اگر نامہ بر ملے

۱۶۔ مراسلہ نگار کا یہ دعویٰ صحیح نہیں کہ اقبال نے اپنے باپ کا نام نتھو بتانے سے انکار نہیں کیا۔ اگر انھیں اپنے والد کے اس نام میں قباحت نظر نہیں آتی تو وہ کبھی اپنے باپ کا نام نور محمد اور کبھی میر محمد بتانے کی کوشش نہ کرتے، نہ وہ جعلی اسناد گڑھے جاتے جن میں ایم اے کی ڈگریوں میں اقبال کی ولدیت درج ہے۔ مرقع اقبال میں ان جعلی اسناد کا فوٹو جگن ناتھ آزاد کا کارنامہ نہیں ہے۔

۱۷۔ اقبال ایک عظیم شاعر تو تھے، عظیم انسان نہیں تھے۔ اس کا ثبوت اعتراض نمبر ۱۱ کے ضمن میں دیا جا چکا ہے۔ مراسلہ نگار کی بے اعتنائی کا یہ عالم ہے کہ لکھتے ہیں "اقبال نے ایم اے عربی میں کیا تھا اوّل درجہ میں"۔ اقبال نے ایم اے فلسفہ میں کیا تھا اور تیسری ڈویژن آئی تھی۔

۱۸۔ اقبال نے فرنگیوں کے خلاف لکھنے کے لئے استعفا نہیں دیا تھا۔ ہائی کورٹ نے، عدالت کے ٹائم میں کالج میں پڑھانے کی اجازت منسوخ کر دی تھی۔ اس لئے اقبال کو استعفیٰ دینا پڑا۔ یہ بھی صحیح نہیں ہے کہ خطاب قبول کرتے وقت انھوں نے اپنے استاد کو خطاب دلوانے کی شرط لگائی تھی۔ اس دروغ بیانی کا شرف پروفیسر جگن ناتھ آزاد کو پہنچتا ہے۔ اس زمانے میں اقبال کا سر کا خطاب قبول کر لینا بڑی نازیبا حرکت تھی۔

۱۹۔ آرہ کے مقدمہ کے بارے میں مراسلہ نگار نے آزاد صاحب کی کتاب محمد اقبال سے یہ معلومات اخذ کی ہے۔ انتہائی لغو داستان ہے یہ۔ اقبال کبھی بھی کامیاب وکیل نہیں رہے۔ اس پر تفصیلی بحث میں نے جگن ناتھ آزاد نمبر میں کی ہے۔

۲۰۔ اقبال کا سلسلہ آگے چل کر سر تیج بہادر سپرو سے مل جاتا ہے۔ یہ بے بنیاد دعویٰ بھی آزاد صاحب نے کیا ہے۔
۲۱۔ مراسلہ نگار کو معلوم نہیں کہ آزاد صاحب کے لئے یہ خطرہ کبھی لاحق نہیں ہوگا۔
۲۲۔ تفصیل میرا ایمان کے بارے میں اگر یہ روایت ہے تو ان کی عبادت گاہ کو تڑوا کر کھاد بنوا دیتا تھا۔ ویسے مراسلہ نگار کو علم نہیں، ریاکاری میں اقبال کسی ہندوستانی لیڈر سے پیچھے نہیں تھے۔ تفصیلات کے لئے سہیل کا آزاد نمبر میں میرا مضمون دیکھئے۔
۲۳۔ مفتی صاحب سے میں واقف نہیں۔ مراسلہ نگار پڑوسی ہونے کے ناطے انھیں مجھ سے بہتر جانتے ہوں گے۔ ان کا حق نہیں پہنچتا۔
۲۴۔ مفتی صاحب کی طرح مراسلہ نگار میرے وجود کو تسلیم نہ کریں تو میں ان کا ممنون ہوں گا۔ مشہور ہونا تو حوصلہ کی دلیل نہیں ہے۔ ویسے "نگار" جیسے موقر علمی اور ادبی رسالے میں ۱۹۴۶ء سے میرے مضامین چھپتے ہیں۔ مراسلہ نگار بڑے مذہبی آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ بے محل نہ ہوگا اگر میں انھیں حضرت علی کا مقولہ یاد دلا دوں: انظر الی ما قال، لا تنظر من قال۔ منسوبات کو مت دیکھو کہنے والے کو۔

آخر میں مراسلہ نگار حضرات[1] سے درخواست کروں گا کہ سہیل کا جگن ناتھ آزاد نمبر میں پروفیسر موصوف کا مضمون پڑھنے کی زحمت گوارا کریں۔ اس میں علامہ اقبال کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر بحث کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ پاکستان سے یا جہاں سے اقبال کی حیات سے متعلق جتنی کتابیں فراہم ہو سکیں فراہم کر کے پڑھیں، تب انھیں اندازہ ہوگا اقبال پر جو کچھ میں نے لکھا ہے اس میں کہاں تک صداقت اور معقولیت ہے۔

---

[1] سہیل کے مطبوعہ خطوط میں زیادہ تر غیر متعلق باتیں کہی گئی ہیں۔ اکثر مراسلہ نگاروں کو احساس ہی نہیں انھیں کیا کہنا چاہیے، کیا کہہ رہے ہیں۔ مطالعہ کی کمی ہر مکتوب نگار کے یہاں کھٹکتی ہے۔ اس میں ان کا دوش بھی نہیں۔ پاکستانی مطبوعات ہندوستان میں دستیاب نہیں ہوتیں۔ مظہر

ریگِ نم پہ قدموں کے نشاں کا شاعر

شاذ تمکنت

سیدہ شان معراج

ملوں گا خاک میں اک روز بیج کی مانند
فنا پکار رہی ہے مجھے بقا کے لئے

شاذ

شاذ صاحب کے انتقال کی خبر سنکر دل و دماغ پر جو گذری اس کا اظہار لفظوں میں ممکن نہیں شاذ تمکنت پہ لکھتے ہوئے اگر زبان میں لرزش ہے تو مرحوم لکھتے ہوئے قلم بھی کانپتا ہے۔ اردو ادب کا یہ جواں سال شاعر دنیائے فانی سے تو رحلت کر گیا لیکن دنیائے شعر و ادب میں ایک لافانی پیکر چھوڑ گیا۔ یقین نہیں آتا کہ ایسی ہستی جس نے اردو غزل میں ناقابل تسخیر طاقت کا مظاہرہ کیا جو خود ہمارے درمیان موجود نہیں۔ شاذ کی ناگہانی اور بے وقت موت سے ساری ادبی دنیا پر سکتے کا عالم طاری ہو گیا۔ ان کے انتقال سے ادبی نہیں ہوا بلکہ ان عام قدروں کو بھی نقصان پہنچا ہے جس سے انسانیت کی عظمت قائم ہوتی ہے۔

شاذ تمکنت کی وفات پر ملک بھر میں ادبی حلقوں، فنون لطیفہ کے ماہروں اور دانشوروں نے انہیں خراج عقیدت پیش کیا۔ حیدرآباد کے عوام نے جس جذبۂ محبت سے با چشم نم اپنے محبوب شاعر کو آخری منزل پہنچایا وہ اس بات کا غماز ہے کہ شاذ صاحب ان کے لئے ایک عظیم اور پسندیدہ شاعر تھے جو ہر دلعزیز بھی تھے ــــــ میرا یہ یقین ہے کہ شاذ صاحب نے اپنے اوصاف حمیدہ سے ہمدردی اور غم بانٹ لینے کے جذبے سے لوگوں کے دلوں کو مسخر کیا ہوگا۔ در اصل شاذ تمکنت صرف انسان ہی نہیں اور نہ اپنی ذات سے ایک ادارہ تھے بلکہ وہ ایک عہد تھے۔ شاذ صاحب کی وفات سے ایک عہد کا خاتمہ ہو گیا ــــــ ادب کا سفر تمام ہوا۔

شاذ صاحب چلے گئے اور نہ جانے والی یادوں کی ایک کائنات عطا کر گئے اور آج ان یادوں کے سہارے ان کا ذہن میں ابھر رہا ہے ــــــ

تلاش کر اسے دیار وفا کے چہروں میں
عجب نہیں تری محفل سے وہ اٹھا بھی نہ ہو

شاذ ان پر کچھ لکھتے ہوئے ذہن یہ باور کرنے کو تیار نہیں کہ وہ شہرت یافتہ شیریں دہن شاعر اب ماضی کا سرمایہ ہو گیا ہے۔

جیو تشنہ کام شاذ سر آب کھو گیا
جیسے ریگ نم پہ قدم کا جیسے نشاں ہو یہاں

میں نے کہا تھا ــــ یادیں تو چاند کی مانند گھٹتی اور بڑھتی رہتی ہیں لیکن آج شاذ صاحب کی یادوں کا چاند

چودھویں کے چاند کی آب و تاب کے ساتھ ذہن کے افق پر جگمگا رہا ہے۔ شاذ صاحب سے خط و کتابت تو بہت پہلے سے تھی ان سے پہلی ملاقات حیدرآباد میں مرحوم شری عابد علی خان صاحب "مدیر سیاست" کے دفتر میں ہوئی۔ زندگی کے اس سفر میں بہت سے لوگ ملے ہیں ملتے رہتے ہیں لیکن ایسے لوگ جو پہلی ہی ملاقات میں اپنا نقش چھوڑ جائیں کم ہی ہوتے ہیں۔ شاذ تمکنت ایسی ہی شخصیتوں میں تھے ——

میں ۲ جون ۱۹۷۸ء کو حیدرآباد جشن خواجہ شوق کے مشاعرے میں گئی تھی وہاں پہنچنے پر اس کا علم ہوا کہ مشاعرہ میں فساد ہو جانے کی وجہ سے ملتوی ہو گیا ہے۔ صبح کو عابد علی خان صاحب کے دفتر میں شاذ صاحب سے ملنے آئے۔ تعارف کے مراحل سے پہلے ہی میں نے انھیں پہچان لیا۔ ان کے خطوط کی روشنی میں —— شاذ خطوط نگاری میں نہ تو موجد کہے جا سکتے ہیں اور ان کے خطوط سے اُن کی جو شخصیت سامنے آتی ہے اس میں تبسم کی بہار، شیرینی، تازگی، اور شوخی، نہ جانے کیا کیا شامل نظر آتا ہے۔ وہ اپنے خط سے بھی تو اپنے سے بھی زیادہ دلکش معلوم ہوتے تھے۔ یہ فن اور شخصیت دونوں کا کمال ہے ——

شاذ صاحب اپنے اشعار کی طرح گفتگو بھی بہت پر لطف کرتے تھے جس موضوع پر گفتگو کرتے سننے والوں کو گرویدہ بنا لیتے تھے۔ اُن کے ساتھ عثمانیہ یونیورسٹی دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ راستے میں مجھ سے کہنے لگے شاہجہاں پور میں کیا چیز مشہور ہے؟ میں جواب میں صرف مسکرا کر رہ گئی۔ کچھ دیر بعد میں نے ان سے دریافت کیا آپ کے حیدرآباد میں کیا چیز مشہور ہے؟ برجستہ بولے میں آپ کی طرح مسکرا دوں گا نہیں نسرینہ بولیے "شاذ تمکنت" ——

حیدرآباد —— جو شعر و ادب کا گہوارہ رہ چکا ہے اپنے اخلاقی آداب کی وجہ سے بھی یاد رہے گا۔ مشاعرے کے منتظمین نے قیام کا انتظام ہوٹل ایمرالڈ EMERALD میں کروایا تھا۔ مشاعرہ ملتوی ہو گیا باوجود دوستوں کے پیہم اصرار پر مجھے وہاں ایک ہفتہ رکنا پڑ گیا۔ روز ہی کوئی نہ کوئی شعری نشست منعقد ہوتی تھی۔ ایک دن میں مشاعرے کے کنوینر کے۔ ایم خان صاحب کے پاس گاندھی بھون میں بیٹھی تھی کہ شاذ صاحب کا فون آیا —— انھوں نے کہا کہ میں نے آپ کے ہوٹل فون کیا تھا معلوم ہوا کہ آپ گاندھی بھون گئی ہوئی ہیں۔ کہنے لگے کہ جس مشاعرے میں آپ تشریف لائی تھیں وہ تو حالات کی نذر ہو گیا۔ میں چاہتا ہوں آپ کا نقصان نہ ہونے پائے۔ میرے دوست بیدر میں ایک مشاعرہ کر رہے ہیں۔ میں نے آپ کا نام تجویز کیا ہے آپ وہاں چلیں —— اُن کی اس کوشش میں اُن کے اخلاص کو بڑی حد تک دخل تھا لیکن میں نے یہ مناسب نہیں سمجھا کہ اس مشاعرے میں شریک ہوں۔ کیونکہ ایک طرف تو میرا اصول ٹوٹتا اور دوسرے میرے فیصلے سے منتظمین کو شرمندہ بھی ہونا پڑتا —— میرے انکار پر شاذ صاحب کا اصرار بڑھتا گیا اور وہ ناراض ہو گئے مگر وہ غصہ بھی بالکل بچوں جیسا کرتے تھے۔ فوراً ہی اُن کا دل شل آئینہ صاف ہو جایا کرتا تھا۔ بہت کم لوگ شاذ صاحب کی اس مسکراہٹ اور زندہ دلی کو بھول سکیں گے جو ان کے چہرے پر ہر وقت محبت اور شاعری کے جان بنتی تھی ——

ہوٹل ایمرالڈ کے قیام کے دوران ایک رات تقریباً بارہ بجے ہم لوگ ایک نشست سے لوٹ رہے تھے میرے ساتھ حیدرآباد کی شاعرہ ثریا میر اُن کے شوہر امتیاز صاحب کے۔ ایم خان خواجہ شوق وغیرہ تھے ثریا ہمیں سے آگے چل رہی تھی۔ ہوٹل میں داخل ہونے کے ساتھ ہی ثریا میر گھبرائی ہوئی سے پلٹیں اور مجھ سے کہنے

RECEPTION میں شاذ صاحب سو رہے ہیں۔ ہم لوگ جب اندر پہنچے اور شاذ صاحب کو جگایا۔ کہنے لگے میں تو دس بجے آگیا تھا آپ حضرات کے انتظار میں یہاں سو گیا۔ اس وقت شاذ صاحب نشے کے عالم میں تھے۔ اس کے باوجود ہوٹل کے منیجر سے اصرار کر رہے تھے کہ "بار" کھلوایئے۔ میرا خیال ہے کہ زندگی کے معاملے میں وہ پابند پیمانہ کبھی نہیں رہے ہوں گے بلکہ اکثر و بیشتر افراط کی سرحدوں کو چھو آتے ہوں گے۔ جب ہوٹل میں شاذ صاحب کو شراب نہ مل سکی تو ثریا میر کے شوہر سے کہنے لگے کہ آیئے شہر چلیں شان صاحبہ نے یاد کی زحمت کی ہے وہ میرے حیدرآباد کی مہمان ہیں۔ میں سوچتی ہوں کہ یہ تو صرف بہانہ تھا۔ دراصل انھیں شراب کی طلب نے مجبور کیا تھا۔ فساد زدہ علاقے میں اس طرح رات کے ۱۲ بجے نکل جانا بہت بڑے دل گردے کا کام ہے یا پھر مجذوبیت کا ——— واپسی میں ایک بوتل خرید کر لے آئے۔ جب اسکوٹر رکشا سے اترے تو پہلے ۱۲ روپیہ دیئے پھر ایک سیڑھی چڑھے نشے کے عالم میں تو تھے ہی پھر کہنے لگے کم ہیں تو دس روپیہ اور لو اس طرح دو ہی سیڑھی چڑھنے پر جب سکوٹر والے کے پاس ۵۵ روپئے پہنچ گئے تو لوگوں نے ہاتھ پکڑ لیا کہ آپ کیا کر رہے ہیں۔ بہت ہو گئے ——— کہ یہ سکوٹر والا مجھے پان کی دکان پر لے گیا تھا۔ میں نے پان والے سے فی پان پانچ روپیہ دینے کو کہا کہ میری عزت کا سوال ہے مگر بد قسمتی سے پان اس کی دکان پر ختم ہو چکے تھے اور دوسری کوئی دکان کھلی نہ تھی ——— یہ تھا شاذ صاحب کی مہمان نوازی کا عالم ———

شراب کی بوتل لانے کے بعد شاذ صاحب نے سب سے پہلے اپنے گھر فون کیا اپنی بیوی سے کہنے لگے ——— مُحلی! تم ابھی تک جاگ رہی ہو سو جاؤ کھانا کھا لیا۔ اگر میرے انتظار میں نہ کھایا ہو تو کھا لو اور بچوں کو بھی کھلا دینا۔ میرا انتظار نہ کرنا۔ آج عزیز میاں کے یہاں بہت مشہور قوال تشریف لائے ہیں۔ انھوں نے مجھے بزدستی روک لیا ہے۔ میں صبح ۵ بجے آجاؤں گا۔ فون رکھنے کے بعد میں نے ان سے کہا ——— شاذ صاحب جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی آپ نے اپنی بیوی سے سچ کیوں نہیں کہا۔ ہم لوگ کیا قوال ہیں؟ کہنے لگے شان صاحبہ آپ بھی کمال کرتی ہیں۔ آپ کو پتہ نہیں کہ یہ شریف آدمی اپنی بیوی سے ڈرتا ہے۔ دوسرے میری بیوی میرے شاعر دوستوں سے بہت ناراض رہتی ہیں۔ میرے شراب پینے کی وجہ وہ میرے دوستوں کو قرار دیتی ہیں۔ میں بحیثیت شوہر اپنی عافیت میں خلل اور ان کی دل شکنی کرنا نہیں چاہتا اور شعر و شاعری کی محفلوں کے بغیر بھی نہیں رہ سکتا۔ میں سوچتی ہوں کہ ایسا جھوٹ جس میں کسی کو نقصان نہ پہنچے۔ برائی کی صف میں نہیں آتا۔ برائی بھی اچھائی کی طرح اضافی ہے اور جسے ایک شخص ایک مخصوص ماحول میں برائی سمجھتا ہے وہ دوسرے کے لئے اس سے مختلف ماحول میں اچھائی بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن اس کے علاوہ کسی ادیب و شاعر کی زندگی میں کوئی برائی اسی وقت قابل تذکرہ ہے جب اس سے شاعر کے کردار کو سمجھنے میں مدد ملتی ہو۔

اس رات ہوٹل کے RECEPTION میں ۵ بجے تک شعری محفل تھی۔ شاذ صاحب نے بھی کئی غزلیں سنائیں میں نے اور ثریا میر نے بھی اپنا کلام سنایا ——— ہوٹل کا منیجر بھی آکر بیٹھ گیا ——— اور کہنے لگا کہ اتنے بڑے بڑے شاعر ہمارے ہوٹل میں آئے ہیں۔ یہاں بیٹھ کر شراب پینا منع ہے۔ مگر مجھے آپ لوگوں کی شاعری بہت اچھی لگ رہی ہے ——— اور کسی اچھی چیز کے لئے اگر اصول ٹوٹتا ہے تو ایسا برا بھی نہیں ——— جب صبح ۵ بجے شاذ صاحب جانے لگے تو ثریا میر سے بولے۔ ثریا تم ۸ بجے میرے گھر آجانا۔ آج میں نے شان صاحبہ کو ناشتہ پر مدعو کیا ہے تم ناشتہ بنانے میں میری بیوی کا ہاتھ بٹا لینا ——— ہم لوگوں نے جب انھیں رکشہ پر بٹھایا تو اس وقت ان کا یہ حال تھا

سہو ہو جائیں گے لوگوں سے بھرا پڑا تھا کہ رحیم خان کہنے لگے اس طرح ان کا جانا ٹھیک نہیں ہے۔ شاذ صاحب
کسی اور ہی عالم میں تھے۔ کہیں راستہ میں کوئی نقصان نہ پہنچا دے۔ مگر وہ صحیح و سلامت اپنے گھر پہنچ گئے
جب ان کا فون آیا ——— جب دو بجے دن تک شاذ صاحب مجھے لینے نہ آئے اور ثریا میری ان کے گھر جانے
تو مجھے بہت غصہ آیا میں ابھی سوچ رہی تھی کہ ہوٹل کے منیجر نے انٹرکام پر مجھے اطلاع دی کہ نیچے شاذ صاحب
میرا انتظار کر رہے ہیں۔ جب میں اور ثریا میرے نیچے پہنچے تو شاذ صاحب بہت گھبرائے ہوئے بیٹھے تھے کہنے
میرے رشتے کے دو سالے کینیڈا سے آ رہے تھے۔ ان کا پلین کریش ہو گیا۔ میری بیوی بہت رو رہی تھی ایسے میں
نے مناسب نہ سمجھا کہ اس سے دعوت کے لئے کہوں حالانکہ وہ میری بات ٹالتی نہیں!

در اصل صبح ۵ بجے تک شاذ صاحب گھر سے باہر رہے اور جاتے ہی اپنی بیوی سے دوپہر کی دعوت کی!
کہنے اس لئے وہ فرمائش کی جرأت نہ کر سکے ہوں گے۔ بیوی چاہے کتنی ہی عظیم کیوں نہ ہو ——— اپنے شوہر
فرمان بردار ہو ایسا ممکن ہی نہیں۔ مجبوراً انھیں جھوٹ کا دامن پکڑنا پڑا ——— ہم لوگوں کو لے کر وہ ہوٹل "نیاگرا"
اس دعوت میں خواجہ شوق صاحب ـ کے۔ ایم خان ثریا میرے چچا اور دو حضرات اور شریک ہوئے۔ بیخودی
کے عالم میں شاذ صاحب نے اتنا کھانا منگوا لیا کہ باقی کھانا پیک کروا کے ان کے گھر بھجوانا پڑا ———
شاعروں کے ساتھ بیخودی اور بے پروائی کا تصور بڑی حد تک وابستہ ہو گیا ہے۔ شاذ صاحب پر بھی ہر وقت
ایک محویت کا سا عالم طاری رہتا تھا جسے ہم نزولِ شعر کی کیفیت کہہ سکتے ہیں۔ " جس طرح شاعری عطیۂ فطرت
اسی طرح یہ بے پروائی اور محویت کسبی نہیں وہبی ہے۔

یہ تو تھی میری شاذ صاحب سے پہلی ملاقات چلتے وقت شاذ صاحب بڑی لمحاتی ملاقات رہی۔ البتہ
میری دوسری ملاقات بھی حیدر آباد ہی کے مشاعرے میں ایک سال بعد ہوئی۔ اس وقت شاذ صاحب مجھ سے
کبیدہ خاطر تھے۔ وجہ وہ ایک کتابچہ شائع کر رہے تھے جس کے لئے انھوں نے مجھ سے اشتہار دلوانے کو کہا
تھا۔ میں اس وقت توجہ نہ دے سکی ـ جو ان کی ناراضگی کا سبب بنی ——— مشاعرے کے اسٹیج پر شاذ
صاحب سے ملاقات ہوئی وہ ایک سال میں اتنے کمزور ہو چکے تھے کہ دو لوگوں نے انھیں پکڑ کر مائک پر پہنچ
اور پڑھوا کر نیچے لیا دست۔ میں نے قریب جا کر سلام کیا۔ کچھ سرد مہری کے انداز میں جواب ملا ——— دو
دن بعد میں نے فون کیا۔ انھوں نے کہا کہ اب میں بیماری کی وجہ سے نظام کالج میں پڑھا رہا ہوں۔ آپ وہاں دو
بجے آ ملیے۔ میں ٹھیک ۱۲ بجے عرفان کے ساتھ پہنچی۔ شاذ صاحب تو نہیں ملے مگر ان کی ہینڈ آف دی ڈپارٹ
منٹ ڈاکٹر زینت ساجدہ سے میری ملاقات ہوئی۔ انھوں نے بہت ہی خلوص کے ساتھ ہم لوگوں کو اسٹاف
روم میں بٹھایا۔ ہندی کے ایک پروفیسر جو شاعر بھی تھے ان سے ملوایا ——— جب انھیں معلوم ہوا کہ شاذ
صاحب میں یہی کمی ہے کہ لوگوں کو ٹائم دینے کے بعد لیٹ ہو جاتے ہیں لیکن آج کل شاذ صاحب کی طبیعت
خراب چل رہی ہے۔ انھوں نے شراب بھی چھوڑ رکھی ہے ——— میں نے کہا یہ غلط ہے: رات مشاعرے میں شاذ
صاحب انتہائی نشے میں تھے اور دو لوگوں کے سہارے مائک پر پہنچے تھے۔ وہ پہلے تو خاموش رہیں پھر کہنے لگیں
شاذ کے سامنے ایسا کہہ دینا ـ اتنے میں شاذ صاحب تشریف لائے ——— ڈاکٹر صاحبہ کہنے لگیں شاذ
صاحب تشریف لے آئے ——— ڈاکٹر صاحبہ کہنے لگیں شاذ صاحب آپ اپنے مہمانوں کو ٹائم دے کر انتظار
کیوں کراتے ہیں۔ میں نے ان سے کہا بھی کہ تمہاری طبیعت خراب ہے تم نے شراب بھی ترک کر دی ہے ———

بے ساختہ کہا شاذ صاحب تو رات مشاعرے میں نشے میں دھت تھے اور لوگوں کے سہارے سے مائک پہنچے تھے۔ شاذ صاحب نے لال آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور برگشتہ ہو کر بولے۔ شاؔن صاحبہ آپ ڈ میں بیٹھ کر مجھ پر بہتان تراش رہی ہیں۔ میں ان کے اس جملے سے حیرت زدہ سی رہ گئی تبھی ڈاکٹر صاحب نے کہا ـــــ ارے بھئی تم کو نقاہت کی وجہ سے لوگوں نے پکڑ کر مائک تک پہنچایا تھا۔ اور یہ بی تمہارے پرانے ریکارڈ کو دیکھتے ہوئے یہ سمجھے کہ تم نشہ میں ہو۔ تم ان کے پیچھے بیٹھ کر گئے ـــــ ب کالج کمپاؤنڈ سے باہر نکلے۔ شاذ صاحب کو بینک میں کچھ کام تھا۔

ور مجھے بھی اپنے ہوٹل پہنچنا تھا ـــــ راستے میں مجھ سے کہا کہ آپ نے ڈاکٹر صاحبہ کے سامنے ایسا کیوں ـــــ میں نے کہا کہ مجھے خود تعجب ہے شاذ صاحب آپ تو اس وقت بھی بیٹھے ہوئے ہیں اور رات بھی تو نشے میں تھے انھوں نے مجھے جھوٹا ثابت کرنا کیوں چاہا۔ بولے میں ڈاکٹر صاحبہ کا بہت احترام کرتا ہوں اور جذبات کو ٹھیس پہنچانا نہیں چاہتا تھا ـــــ آپ میری برادری کی ہیں۔ آپ کے سامنے تو جھوٹ بول ہوں ـــــ مجھے بے ساختہ ایک سال پہلے کی وہ رات یاد آ گئی جب شاذ نے اپنی بیوی سے کوئی بزم کو قوال بنا یا تھا یہ تو تھے شاذ صاحب اُن کو شراب پی کر اچھلتے کودتے شور مچاتے کسی دیکھا ہو گا وہ تو کچھ اور بجھ جاتے تھے اُن کی اسی کیفیت سے اُن کے دوست نما دشمن پورا فائدہ تے تھے۔ پلا پلا کے خوب شعر سنتے تھے۔ "یہ زندگی حافظ و خیام کی زندگی نہیں تھی یہ تو زندگی کا نوحہ اور کا ماتم تھی۔"

"ہم کہ مجنوں بھی تھے فرہاد بھی شاذ
شہر میں پھرتے تھے وحشت کے بغیر"

شاذ تمکنت غزل کے محبوب شاعر تھے۔ اس کی وجہ ان کی غزل کا صحت مند لہجہ تھا وہ ایک طرز خاص تھے اُن کی شاعری پر کہیں بھی تقلید کا رنگ نہیں آنے پایا۔ اردو شاعری میں یہ انفرادیت بہت کم شاعروں میں آئی ہے۔ جب وہ بیخودی کے عالم میں شعر سناتے تھے۔ جذبات میں سموئی ہوئی آواز سامعین کو مسحور کر لیتی ان کے پڑھنے کا انداز مجمع میں ایک برقی لہر سی دوڑا دیتا تھا ـــــ

نہ دوڑتا تھا نہ ملتا پھر بھی نم دیدہ رہے برسوں
ترے غم کا تقاضا تھا کہ سنجیدہ رہے برسوں

ویسے تو شاذ تمکنت کی شہرت اچھے شاعر ہونے کی وجہ سے تھی لیکن اس میں اُن کی رندی اور سرمستی کو بھی دخل ہے ـــ

تری نظر سبب تشنگی نہ بن جائے
کہیں خراب مری زندگی نہ بن جائے

شاذ صاحب ایک عظیم شاعر بلند پایہ معلم اور اچھے انسان تھے۔ ان کے اس طرح چلے جانے سے ہندستان میں بلکہ پاکستان کی دنیائے ادب میں صف ماتم بچھ گئی۔

شاذ تمکنت کو جو ہونا چاہئے تھا وہ نہیں ہو سکے ان کا جو حق تھا ایک نامکمل کہانی ہے لیکن اس کے باوجود بلندیوں تک پہنچ پائے وہاں تک پہنچنا بھی اس عہد میں بہتوں کو نصیب ہو سکا ـــــ ایسا ہر دور میں ہوا

(انٹر...)

مقالہ

محمد قیصر زماں قیس
مولانا آزاد ... [illegible]

اردو کی خواتین افسانہ نگار: "ایک پس منظر"
(تحقیق کی روشنی میں)

شعوری یا لاشعوری طور پر انسان ابتدائے آفرینش سے ہی احساس اور اظہار و بیان کا عادی رہا ہے یہی وجہ ہے کہ قدیم [illegible] اور یونانی علماء منطق نے کائنات کی اشیاء کو جب سمتوں اور مختلف خانوں میں تقسیم کیا تو انسانی صفت نطق اور اظہار و بیان [illegible] کو دیکھتے ہوئے انسان کا نام حیوان ناطق رکھا۔ مناطقہ کی زبان میں انسان کا امتیاز چونکہ شعوری نطق و اظہار میں تھا اس [illegible] دوسرے حیوانات سے ممتاز کرنے کے لئے انسان کی اسی صفت کو بنیاد بنایا۔ آج کی سائنسی، نفسیاتی، عمرانیاتی تفتیش و جستجو نے [illegible] کے ذہن اور اس کی فطرت کے بہت سے راز دارون خانہ منکشف کر دیئے ان بنیادوں پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ حکایت دل یا داستان [illegible] کا بیان انسان میں اس کے ابتدا ہی سے موجود تھا، ہاں یہ ضرور ہے کہ شروع میں نطق و بیان کی کارفرمائی کا دائرہ فنی یا تخلیقی [illegible] تک نہیں پہنچا ہوگا اور فنکارانہ نکتہ سنجیوں کے لئے ممکن ہے کوئی گنجائش نہ ہو لیکن جذبوں کا اظہار، احساسات کی ترجمانی اور داستان طرازی کا عمل انسان کے [illegible] انسان کے ساتھ رہا ہوگا ۔ یہ صحیح ہے کہ شروع شروع میں انسان کی قوت [illegible] اس کے احساس و جمال کی ترجمانی مکمل طور پر نہ کر پاتی ہوگی، مگر [illegible] طرازی بہرحال اس مشغلہ رہا ہوگا۔ قدیم تاریخ کے [illegible] میں حور و تصور اور حسن و شباب کی جو تصویریں مصری تہذیب یا چینی قدیم تہذیب سے برآمد ہوئی ہیں ان سے بات طور پر [illegible] کہا جا سکتا ہے کہ آدمی انگنت صدیوں سے اپنا عکس خیال آئینہ ایام پر منعکس کرتا رہا ہوگا۔ اور اس لئے شاید آج بھی انسان [illegible] بننے اور کہانیاں بن جانے کے دلچسپ عمل میں مشغول ہے۔ کہانی اور آدمی کے اسی رشتے کو دیکھتے ہوئے [illegible] نے [illegible] میں ان خیالات کا اظہار کیا ہے

"کہانی سے انسان کی دلچسپی اور اس مشغلے سے اس کا لگاؤ اس کی اجتماعی زندگی کی ایسی حقیقت ہے جسے تاریخ کے ہر دور کے فکر کے منطق نے پورے وثوق کے ساتھ تسلیم کیا ہے، انسان اپنی حیات اجتماعی کے بالکل ابتدائی دور میں فطرت کی [illegible] قوتوں سے [illegible] آزما اور برسر پیکار رہتا، اس پیکار اور کشمکش میں اسے سختی کی جن منزلوں سے گذر کر فتح و ظفر [illegible] دیکھنے کی مسرت حاصل [illegible] کے لئے قدر شکر کی چاشنی کام و دہن کو اس کا [illegible] کرنے کی خواہش نے [illegible] کہانی کہی اور داستان سرائی کا آغاز ہے ...... اس مشغلے میں ایک [illegible] کہانیاں ایک دوسرے کے [illegible] ایک دوسرے سے قریب آنے کا وسیلہ بنیں۔" [1]

---

[1] داستان سے افسانے تک۔ صفحہ ۲۰۵

لیکن انسان نے جب ارتقاء کی طرف قدم بڑھانے شروع کئے تو دماغی صلاحیتوں اور جسمانی قوت سے اپنے گرد و پیش کے نفسیاتی تغیرات، حادثات اور واقعات سے جدوجہد کی اور برسرپیکار ہو کر ان پر فتح حاصل کی اور کشمکش حیات کے مسلسل جدوجہد میں مشغول رہا لیکن جب تک باقاعدہ قوت گویائی اس کو نصیب نہیں ہوئی وہ اپنے آپ کو [illegible] محسوس کرتا رہا، جیسے ہی اظہار خیال کو دوسرے کے سامنے رکھنے کی طاقت حاصل ہوئی اس نے اپنی بیتی کو بیان کرنا شروع کیا۔ جہاں تک جسمانی اور دماغی ارتقاء نے ان کو حقائق اور واقعات سے ہمکنار کیا، زبان چلانے لگی، یہی باتیں رفتہ رفتہ کہانیاں بنتی گئیں اور داستان سرائی کا آغاز ہوا۔ بقول ڈاکٹر رشی اختر،

"افسانہ کا لفظ افسوں سے گہرا تعلق رکھتا ہے، انسان نے غالباً سب سے پہلی کہانی "آدم" کی سنی ہوگی۔ اس میں تین مرکزی کردار تھے، آدم، حوا اور شیطان۔ آدم بے خبر تھے لیکن زندگی کی حرکت، شیطان نے پیدا کی، حوا اپنی ذہانت سے آدم کا غم غلط کیا کرتی تھی۔ اس طرح خیر و شر کی یہ کہانی انسان کی ابتداء کا مسئلہ بھی ہے۔ لہٰذا اس سوال کا حل عمرانی اور تاریخی پس منظر میں تلاش کیا جا سکتا ہے" ۱؎

اس کے پیش نظر یہ کہا جا سکتا ہے کہ کہانی اور انسان دونوں لازم اور ملزوم چیزیں ہیں اور جب انسان ہمارے ذہن میں پیدا ہوتا ہے تو اسی وقت سماجی زندگی کا بھی احساس ہوتا ہے۔ لہٰذا کہانیوں کی پیدائش اور ارتقاء کی حیثیت سماجی کہی جا سکتی ہے۔ سماج میں مختلف واقعات رونما ہوتے ہیں مثلاً زندگی اور موت، عشق و رقابت، محبت و نفرت، حسد وغیرہ اور جذبات شعوری اور لاشعوری عوامل کے ذریعے کہانیاں بنتے جاتے ہیں اور اس کا کینوس پھیلتا جاتا ہے۔ کہانی مادی اور مرئی حقائق اور واقعات کا سفر طے کرتی ہے، کہانی کا وجود محض ذہنی نہیں ہوتا لیکن یہ ایک ایسا سچ ہوتا ہے جس پر جھوٹ کا گمان ہو یا پھر ایسا جھوٹ جسے سچ سمجھنے پر قاری مجبور ہو، داستان میں دوسرا رخ زیادہ پایا جاتا ہے، ہماری اردو داستانیں اس کی زندہ مثالیں ہیں۔ اس سفر میں قومی، مقامی اور سماجی مزاج کی نفسیات بہت کچھ اس پر اپنا اثر ڈال دیتی ہے۔

داستانیں کہنے اور داستانیں لکھنے میں ہمیشہ سے گہرا ربط رہا ہے۔ قدیم قومی تہذیب میں داستان گویوں کی ایک سماجی حیثیت ہوتی تھی اور جب وہ داستان کہنا شروع کرتے تو پہلے اپنے عصا کو پھر اگر کہانی کا آغاز کرتے اور جب کہانی نقطۂ عروج کو پہنچ جاتی تو داستان گو اپنی مراد میں سامعین کے درمیان پیش کرتے اور پھر کہانی نقطۂ عروج سے انجام کی طرف بڑھتی۔ گویا قصر کی تہذیب میں داستان سامعین کے لئے لطف مزاح کا سامان تھیں اور داستان گو کے لئے ذریعۂ معاش کا۔ لیکن قصہ مختلف ہند کی تہذیب و معاشرت میں داستان سے مطلب دل لگی کا کام کیا جاتا۔ یہاں داستان گوئی دراصل ادبی اور فنی شکل کی حیثیت سے مقبول تھی۔ چنانچہ خاص طور پر عہد نے دلی داستان گوئی بڑی دلچسپی کے ساتھ سنی جاتی تھی، غدر سے پہلے غدر کے بعد تک دہلی، لکھنؤ، رام پور، بنارس، اور حیدرآباد کے درباروں میں اس طرح کا رواج رہا ہے ۱۹۲۹ء تک سید باقر علی داستان گو کی محفل مرجع خاص و عام تھی اور ان کے ساتھ میر [illegible] کا نام بھی کافی مقبول تھا۔ وقار عظیم نے ایک واقعہ یوں بیان کیا ہے

"جمعرات کا دن ہے شام ہو چلی ہے ہیں غالب کے ہاں آنے والے گھر میں بچوں اور بوڑھوں کی ایک محفل جمی ہوئی ہے داستان پڑھی جا رہی ہے اور سب شوق سے سن رہے ہیں، غالب بھی محفل میں داستان سنتے ہیں اور جب کوئی داستان گو مطلب کو اچھی طرح ادا نہیں کر سکتا داستان کا سلسلہ اچھی جگہ سے ملتے ہیں اور مکمل کرتے اور خوش ہو ہو کر کہتے ہیں کہ زبان داستان کہنے والوں کے ہاتھ میں ہے" ۲؎

۱؎ فنافت۔ ڈاکٹر رشی اختر

۲؎ داستان سے افسانے تک۔ سید وقار عظیم

میں اقتباس سے درج ذیل نتائج اخذ ہوتے ہیں۔ داستان گوئی اس عہد میں عوامی مزاج میں داخل تھی، عام لوگوں سے قطع نظر ادب و فن کے ممتاز ماہرین بھی اس سے دلچسپی لیتے تھے، داستان کی زبان معیاری ہوتی تھی اور ثقافتی ادب کی عکاسی کرتی تھی۔ داستانوں کا عمومی مزاج محض تفریح طبع تھا، کبھی کبھی اس سے کچھ اخلاقی پہلو بھی شکل آتے تھے، داستان سرائی کی محفل درس و تدریس کا کام بھی کرتی تھی اور اس سے ادبی ذوق کی نشو و نما کا ماحول بنتا تھا۔

داستان لکھنے اور لکھنے کے بیان کے ساتھ اب یہ بہتر ہو گا کہ داستان کی پہلی کتاب اور کچھ خاص خاص داستانوں کا ذکر کرتا چلوں۔ ڈاکٹر تصور حسین خان نے جدید تحقیق سے یہ ثابت کیا ہے کہ اردو کی پہلی نثری داستان "تحفۃ میر اثر در دلبر" ہے جو اٹھارویں صدی کی تصنیف ہے۔ اس کے بعد جو داستانیں اردو ادب میں اہمیت رکھتی ہیں وہ مرزا تحسین کی "نوطرز مرصع"، انشاء کی "رانی کیتکی"، میر امن کی "باغ و بہار" اور "امیر حمزہ"، "سنگھاسن بتیسی" وغیرہ ہیں یہ داستانیں فورٹ ولیم کالج کی یادگار ہیں۔

مذکورہ داستانوں کے علاوہ رجب علی بیگ سرور کی "فسانہ عجائب" اور "طلسم ہوش ربا" وغیرہ بھی اپنے عہد میں کافی مقبول ہوئیں اور اب بھی یہ داستانیں اپنی صفت زبان و بیان کے اعتبار سے قابل مطالعہ ہیں۔

داستان گوئی کے عہد سے ہی ناول نگاری کی ابتداء ہوتی ہے، بقول شمس اختر۔

"ناول اپنی حیثیت، تکنیک اور دوسری خوبیوں کی وجہ سے افسانے کی ایک الگ صنف ضرور ہے، لیکن اس کو داستان کے وجود سے بالکل الگ کر کے دیکھا نہیں جا سکتا" [1]

رتن ناتھ سرشار اور عبدالحلیم شرر دونوں کے ناولوں میں داستان کا مزاج یا امتزاج دکھائی دیتا ہے جس میں ناول اور داستانوں کی ملی جلی خصوصیات ملتی ہیں خصوصاً "فسانہ آزاد" میں۔

ہندوستان میں انگریزوں کی آمد اور اس کے قیام کے سبب مقامی ادیبوں کو نئے موضوعات اور مغربی اصناف ادب سے واقفیت ہوئی، ہندوستانی ادیبوں نے بعض نئے تجربے ادب میں کئے، چنانچہ نذیر احمد نے بعض معاشرتی مسائل پر مبنی ناول لکھنے کی کوشش کی۔ ان کی ناولوں میں گرچہ کردار نگاری کا سائنسی اور نفسیاتی تحلیل کا عمل دخل نہیں، لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ نذیر احمد نے اردو ناول کا بڑا اہم اور کارآمد تجربہ کیا، بعضوں کے خیال میں "فسانہ آزاد" بھی اسی قلم کا ایک تجربہ ہے لیکن اس میں ناول کی آنچ بہت دھیمی ہے اور داستانی مزاج حاوی ہیں پھر بھی سرشار کی اس کوشش کو سراہا جاتا ہے۔ "فسانہ آزاد" کو آل احمد سرور نے PICUTRESQUE کہا ہے اور اردو میں "فسانہ آزاد" اس کی بہترین مثال ہے۔ نذیر احمد اور سرشار کے علاوہ شرر کا نام بھی اس سلسلے میں لیا جانا ضروری ہے۔ شرر نے تاریخی موضوعات پر ناولیں لکھیں۔ ان کے ناولوں میں بھی کردار نگاری کا مرقع کم سے کم نظر آتا ہے، تاریخ کی وابستگی کی وجہ سے ان میں کہانی کی فطری اور تخلیقی صورت حال کم ہے یا پھر بھی سرور صاحب نے ان کو اردو کا والٹر اسکاٹ کہا ہے۔ یہاں پھر یہ اعتراف لازمی ہے کہ شرر نے اردو ناول کو ایک قدم آگے بڑھانے میں کامیابی حاصل کی۔

ان ناول نگاروں کے بعد مرزا رسوا، محمد سعید، منشی سجاد حسین، راشد الخیری اور محمد علی طبیب وغیرہ ہمارے سامنے آتے ہیں مرزا رسوا کی شہرہ آفاق ناول "امراؤ جان ادا" خلعت کی چیز ہے جو اردو ناول نگاری میں اپنا نمایاں مقام رکھتی ہے۔ اس کا موضوع کا انتخاب ہی بڑا پرکشش ہے اور ان کے چھوٹے چھوٹے کردار زندہ جاوید ہیں جنہیں زندگی کی شکست و ریخت نے آگے بڑھنے کا موقع نہیں دیا ہے۔ ناول کے اس پس منظر میں جو رنگینیاں ہیں وہ گذشتہ لکھنؤ کی جیتی جاگتی تصویر اور ناول کی عکاسی ہے

[1] صحافت، ڈاکٹر شمس اختر

رسوا اور ان کے پہلے کے لکھے ناولوں میں سب سے بڑا فرق احساس توازن کا ہے تو ازن کا یہی احساس رسوا کے فن کی عظمت کا سبب بنا۔ رسوا نے کافی حد تک اُن تمام ناول کے مطالبات یعنی کردار نگاری، منظر نگاری کا بہتر مظاہرہ کیا ہے اور یہی چیز انہیں دوسروں سے ممتاز کرتی ہیں۔ رسوا کا ناول اردو کا سب سے پہلا اردو کا میاب ناول ہے۔

اس کے بعد پریم چند کا عہد آتا ہے اور انہیں کے ساتھ ساتھ خواتین افسانہ نگاروں سے بھی ہماری واقفیت ہوتی ہے صغرا ہمایوں، نذر سجاد حیدر، عشرت آرا بیگم، اسرار محمدی بیگم، نذر سجاد حیدر اور ظفر جہاں بیگم اس عہد کی خواتین ناول نگار ہیں۔ یہ خواتین تو سند یافتہ نہیں تھیں لیکن اپنی مادری زبان سے گہرا تعلق رکھتی تھیں، ان میں اپنے قوم اور ہم جنسوں کا درد تھا۔ تعلیم کے ذریعہ عورتوں میں بیداری پیدا کرنے اور ان کے حقوق کی حفاظت کرنے کو اپنا فرض سمجھتی تھیں۔ ان کے ناولوں میں عورتوں کے مسائل گھریلو مشکلات، اور عام معاشرتی الجھنوں کی عکاسی اور ساتھ ہی ان کی مخلصانہ رہنمائی، یہ ایسی چیز ہیں جو ان کی بھولی بھالی ذہنوں کو سوچنے پر مجبور کرتیں اور آنکھوں کو ایک نئی روشنی دیتی تھیں۔ ان کے بعد آنے والی خواتین ناول نگاروں اور افسانہ نویسوں نے ان سے بہت کچھ سیکھا اسی کے بعد جدید ناول کا آغاز ہوتا ہے۔

اردو میں مختصر افسانوں سے قبل افسانوں کی دو قسمیں ملتی ہیں۔ ایک تو وہ داستانیں ہیں جن میں مختصر اور طویل کہانیاں ملتی ہیں دوسری تمثیلیں ہیں۔ افسانے کی تاریخ گرچہ مختصر ہے پھر بھی ان کی چھاپ داستانی دور سے ہی پائی جاتی ہے۔ داستان کے اسی پس منظر میں حیدر بخش حیدری دہلوی کی سینکڑوں چھوٹی چھوٹی کہانیوں نے جنم لیا، ان کی اہمیت اردو کے مختصر افسانوں میں زیادہ ہے، ان میں مختصر افسانے کے فن کی اکثر خصوصیات مل جاتی ہیں۔ ان کے کردار زمیندار، امیر، طوائف، بادشاہ اور مسخرے ہیں۔ ان کہانیوں میں داستانوں کی تخیلاتی فضا سے آگے بڑھ کر حقیقت نگاری کی غیر رومانی فضا میں سانس لینے کی کوشش کی گئی ہے اس لحاظ سے ان کی کہانیاں اردو افسانوں کی تاریخ میں نئے باب کا اضافہ ہیں۔ اس بات کی تصدیق ہو جانے کے بعد کہ اردو افسانے کی شروعات حیدر بخش حیدری کی کہانیوں سے ہوتی ہے بہتر معلوم ہوتا ہے کہ افسانے کی صنفی حیثیت اور تعریف، حدود سے بھی واقفیت حاصل کر لیں اس کے بعد اپنے موضوع پر گفتگو کریں گے۔ ۔۔۔

بقیہ:۔ "ریگ نم پہ قدموں کے نشاں کا شاعر شاذ تمکنت"

مگر سچ یہ ہے وہ دیکھنے میں نہیں آئے گا ــــــ

شاذ صاحب کے خطوط اور شاذ صاحب سے ملاقاتیں میری ادبی زندگی کا بہت بڑا سرمایہ ہیں۔ ان کے ہم سے جدا ہو جانے پر اگر میں یہ کہوں کہ مجھے اس سے دلی تکلیف ہوئی ہے تو یہ اُن کے معیار کی بات نہ ہوگی ــــــ اپنے ان تاثرات کو ان ہی کے ایک شعر پر ختم کرتی ہوں۔

مجھے زمانہ زود فراموش ہے بہت لیکن
تجھے بھلانے میں کافی پڑے گا برسوں تک

جمنا پرشاد راہی

ورثہ

یہ کون لوگ ہیں
آخر کہاں سے آئے ہیں
ٹپک رہا ہے لہو ان کی آنکھوں سے کیوں
یہ ان کے ہاتھوں میں شمشیر و سنگ کیسے ہیں
سب اجنبی ہیں!
مگر
مجھ کو ایسا لگتا ہے
کہ جیسے ان سے ہو پہچان میری صدیوں سے
کہ جیسے وہ بھی انھیں وحشیوں کے وارث ہوں
ملی ہے جن سے وراثت میں مجھ کو خونریزی
ہیں جن کے نام پہ خود اپنا خون پیتا ہوں
بجا کہ وقت نے سب کچھ بدل دیا
لیکن
لہو کا ذائقہ اب بھی مری زبان میں ہے!

ڈاکٹر اسیر عارفی

کرنوں کا قیدی

میں نے تم کو
زندگی کے موڑ پر
دیکھا
بُلایا
اور پکارا
تیری دیواروں سے ٹکرا کر
مری آواز لوٹ آئی
وہ آوازیں میرے لب سے نکل کر
دور بحرِ بیکراں میں
کھو گئی ہیں!
اے مجھے آواز دینے والے آ
اور دیکھ
میں ڈوبتے سورج کی صورت
ذرہ ذرہ ہر طرف بکھرا ہوا ہوں
اور میں یہ دیکھتا ہوں
ہے میری آواز ہی چاروں طرف حلقے کئے
اور میں
اب اپنی ہی کرنوں کا قیدی بن گیا ہوں!

منصور اعجاز

میراث

تیس سال کی عمر ہے میری
آج سے پانچ برس پہلے بھی تیس سال کی عمر تھی میری
جب میں نے اپنے مستقبل کے بارے میں سوچا تھا
کیا ہوگا میرا مستقبل!
گندی سیاست؟
فرقہ بندی؟
رشوت خوری؟
استحصال!
تیس برس کو تکتے کھڑا ہوں
آگے بڑھنا بس میں نہیں ہے
شاید میراث یہیں ہے

●

کس قدر پیار ہے مجھے تم سے
اور اُن سے بھی جو دکھی ہیں بہت
کیا گنتاؤں میں نام ان سب کے
جبکہ کثرت ہے ایسے لوگوں کی
اتنی تو اب بھی میری عمر نہیں

میں تمہارے حضور اُن سب کے
نام گن کر بتاؤں بس اتنی
عمر مل جائے یہ دعا کرتا!

بیزارگی

ادھوری کہانی
کبھی ادھوری لوری

میں سو جاتا بچپن میں جس سے بہل کر
مگر آج ——
جب موت میرے قریں ہے
کہانی ادھوری ہے
لوری ادھوری

میں کب آدھی لوری کو پوری کروں گا
ادھوری کہانی مکمل کروں گا
میں کب تک جنم لیتا مرتا رہوں گا۔

خورشید حیات

ایک نظم

دفن کردو ان لمحوں کو جو بیت چکے ہیں
ہم نے بھی سیر ہو کر پی ہے
سرخ دیوی کے ہاتھوں سے

پھر
ہمیں قتل ہونا پڑا
کہ
اس بیکدے کا دستور یہی تھا
مگر ——
جب پاگل ہوا اٹھی
تو ہم اور قاتل ایک ہی اسٹیج پر کھیل رہے تھے
آندھی اور طوفان سے
بستیاں دفن ہو رہی تھیں
سہاگ اجڑ رہا تھا
بلو بلک رہا تھا

اور
دور کہیں دور
سیاست کے اسٹیج پر
مداری اپنا کرتب دکھا رہے تھے۔

غزلیں

فضا ابن فیضی

ے کب رنگ نیا، شعر و ادب میں نہ کھلا
یضہ ہوں، جو دستِ جد و اَب میں نہ کھلا

حوالے سے کتنی مطلوب درون بینی حسن
سی سے، ہوسِ عارض و لب میں نہ کھلا

ہی ذات رہی مرکز و محور میرا
وہ ا... کبھی اسکی طلب میں نہ کھلا

ی ہے ایک ادا سب سے تعلق رکھولا
بی ایک وحشتی اپنی گرہ میں سب میں نہ کھلا

ہی کچھ اس کی طرف سے رہا مایوس بہت
سے کچھ وہ بھی مرے پاسِ ادب میں نہ کھلا

ز چاک بھی قیامت سے، غنیمت یہ ہوئی
الیسا، تری دیوارِ طلب میں نہ کھلا

ر کا دو گھڑی دن میں چمکنے والے
تو اک پل کو کبھی پیشِ نظرِ شب میں نہ کھلا

ا کس ہاتھ لگے خوش ہنری کی یہ کلید
کیا کیا ہیں تہ حرف عجب میں نہ کھلا

یں وسعتِ فضا وقت کے لفظ تمام
ہ دروازہ معانی کے عقب میں نہ کھلا

آسی رامنگری

خواب میں آؤ مرے رنگین خوابوں کی طرح
پڑھ سکوں تم کو میں رنگین کتابوں کی طرح

دیکھئے تشبیہ کیا ان کو مہ و خورشید سے
ایک چہرہ اُن کا ہے، سو آفتابوں کی طرح

چاہے اگر انساں تو بن سکتی ہے لافانی حیات
زندگی انسان کی، گو ہے حبابوں کی طرح

جیسے مفہوم و معانی سے ہوں عاری سارے ہی
پڑھتا ہوں اک ایک چہرے کو کتابوں کی طرح

تشنگی سب کی بجھائیں گے یہ بے پایاں ہیں
بن کے دنیا میں رہیں ہم کیوں سرابوں کی طرح

نعمان شوقی

چھپائے رکھا زمانے سے آسمان میرا
عجیب [illegible] تھا قدردان میرا

[illegible] خاندان میرا
جھکا ہے غم کے کہاسوں سے آسمان میرا

میں جانتا ہوں کوئی کشش نہیں لیکن
[illegible] کو ملا دے گا پھر گمان میرا

چھتوں سے پھول برسنے لگے [illegible]
بہت دنوں سے ہے خالی پڑا مکان میرا

اسی کے سوچ میں میں عمر بھر اداس رہا
مری زمیں نہ نگل جائے آسمان مرا

ممتاز آتش

تیری یادوں نے مجھ کو دیوانہ بنا دیا
[illegible] بنا دیا

کل تک تو بھٹکا کرتی تھی گلیوں میں
تیرے رہنے کے لئے میں خانۂ دل میں ٹھکانا بنا دیا

کھایا کرتی تھی تم قسمیں ساتھ نبھانے کی
آج وہ منہ موڑ کر الفت کو [illegible] بہانہ بنا دیا

تیری یادوں کی بارش میں بھیگتا آج بھی ہوں
بے وفا نے پیار کو بھی اک دل فسانہ بنا دیا

الفت کی زنجیروں میں گرفتار ہیں آتش
خود تو شمع بنی مجھ کو پروانہ بنا دیا

منظر اعجاز

حقیقت زار سے گھبرا چکا ہوں
میں پھر خوابوں کی دنیا چاہتا ہوں

دعا کس کی ہوں، کس کا مدعا ہوں
میں اپنی ذات کی ٹوٹی صدا ہوں

کسے میں جانتا پہچانتا ہوں
ابھی تو خود سے بھی نا آشنا ہوں

میں شہرِ سنگ میں شیشہ گری تک
عروجِ عکسِ آئینہ رہا ہوں

میں خالق ہوں جہانِ فکر و فن کا
بعنوانِ دیگر میں بھی خدا ہوں

غزلیں

اظہر نیر [illegible]

پرچھائیں کو پاس لکھ دوں
خوابوں کے موسم کو اداس لکھ دوں

تصویر شب کا بدل کے چہرا
روشنی کا آج اقتباس لکھ دوں

یہ شہر [illegible] ستم گزیدہ ہے
ہر ایک بستی کو پیاسی لکھ دوں

سوال آنکھوں کے پڑھ کر بھی
گلاب چہرہ کو پاس لکھ دوں

اگر حقیقت کو مان لو تو
زمیں کا چہرہ اداس لکھ دوں

اعجاز طالب

تھے جو مٹیوں کے تھے معبود ہو گئے
رستے تمام رزق کے مسدود ہو گئے

[illegible]
جو بھی کھلونے لائے تھے بے سود ہو گئے

ہر گھر میں اک فصیل کھڑی کر کے
سب اپنے ہی مکان میں محدود ہو گئے

جب بھی کہیں [illegible]
جب چاپ تیرے [illegible] ہو گئے

جب بھی کسی [illegible]
طالب ہم اپنا سر لئے موجود ہو گئے

نصرت ادیب پاکستانی

بہت بچائی نظر میں نے ماہ پاروں سے
مگر جلا ہے مرا دل انہیں شراروں سے

یہ زندگی بھی عجب الجھنوں کی بستی ہے
فریب کھاتا ہر انسان حسین سہاروں سے

تبسم لب لعلیں و جنبش ابرو
فریب کھاتے رہے لوگ ان اشاروں سے

رسائی میری بھی تھی بزم ناز میں پہلے
[illegible]

[illegible]
[illegible] ہر گام خار زاروں سے

زمانہ گزرا مگر یاد اب بھی باقی ہے
[illegible]

فاطمہ حسن
۹۴ گلستان کالونی [illegible]

ایک موت کے بعد

میجر صاحب ایک مانے ہوئے جیوتشی تھے۔ علم نجوم
جیوتش کے ایسے ماہر شاید ہی کوئی گذرے ہوں
کوئی بھی پیشن گوئی غلط نہ ثابت ہوئی تھی یہ بات
تھی کہ میجر صاحب نے جب بھی کچھ بتایا وہ اس وقت تو اکثر
[illegible] لگتا مگر وقت گذرنے پر حالات کچھ ایسے ہو جاتے
کہ ہی ہوتا جو پہلے میجر صاحب کہہ چکے ہوتے یہ علم انھوں نے
اپنے مطالعہ سے حاصل کیا تھا۔ اور زمانۂ طالب علمی
ہی سے ان کا رجحان اس طرف تھا۔ ابتدا میں کافی مذاق
بنا مگر جلد ہی حقیقت تسلیم کرلی گئی۔

اوائل عمری میں ہی انھوں نے خود اپنی آنے والی
زندگی کا ایک مکمل زائچہ تیار کر رکھا تھا جس کے مطابق وہ
ڈگری اور اپنی خواہش کے باوجود سول سروس میں آنے
کے بجائے فوج کے عہدے دار بنیں گے۔ بچپن سے طے
ہونے کے باوجود ان کی شادی اس لڑکی سے نہ ہو کر فوج
کے ایک اعلیٰ عہدیدار کی بیٹی سے ہوگی۔ خوشحال زندگی
[illegible] بیٹے اور تین بیٹیاں ہوں گی [illegible]
[illegible] کے ساتھ وقت بھی انھوں نے لکھ رکھا تھا [illegible]
[illegible] کے مستقبل ان کی تعلیم اور [illegible] کے بارے
میں بڑی تفصیل سے لکھنے کے بعد خود اپنی شادی کی
تاریخ اور سن کے ساتھ اپنی موت کے بارے میں لکھا تھا
کہ [illegible]
[illegible]

پڑھ کر سارے گھر نے بات ہنسی میں اڑا دی تھی۔

چند مہینے بعد ایکسیڈنٹ کا شکار ہو کر ان کے والد
چل بسے۔ چھوٹے بھائیوں اور بہن کی ذمہ داری خود
ان پر آگئی۔ تعلیم ادھوری چھوڑ کر آرمی میں آگئے اور
ان کی منگیتر کی شادی چند برسوں میں ایک سول سروس
کے آفیسر سے ہوگئی خود ان کی اپنی شادی آرمی کے ایک
اعلیٰ عہدیدار کی بیٹی سے ہوئی اور وقت کے ساتھ وہ
چھ اولادوں کے والدین بن گئے۔ اور یہ سب کچھ ان کی برسوں
قبل کی تحریری پیشن گوئی کے عین مطابق ہوا [illegible]
فوج کی سخت [illegible] اصولوں کی کسوٹی
حقیقت پر مبنی ان کی زندگی [illegible] اور
سوسائٹی کے مختلف دائروں میں [illegible] جیوتشی اور
علم نجوم کا ماہر کہلانے لگا [illegible] کے عہدے تک لے
آیا۔ گو کہ کچھ واقعات [illegible]
[illegible] جیوتش [illegible] ثابت ہوتا گیا۔ اپنے [illegible]
خاندان اور برادری کے باہر بھی میجر صاحب [illegible]
مانے جاتے [illegible]
حضرات بھی انھیں [illegible]
پیچھے گھومتے اپنا وقت خراب کرتے [illegible]
ان کا مشغلہ [illegible]
وقت [illegible]
[illegible]

کرنا چاہتے ہیں۔ وہ آنکھ زندگی کے دوش بدوش مزدوری وغیرہ مزدوری تک بتا دیتے جو صحیح ثابت ہو کر انہیں شہرت بخشتا۔ وہ میجر کے عہدے کے آگے بڑھنے سے پہلے ریٹائر ہو گئے اور اب اپنی زمینوں کو ایک بڑے فارم کی شکل دیکر فارمنگ کی آمدنی اور فوج کی پنشن سے خاصہ آسائش کی زندگی گزار رہے تھے۔ اپنی وصیت وہ وکیل کو دے چکے تھے۔ جس کی رو سے ان کے بعد ان کی بیوی اس آبائی شاندار کوٹھی سے لیکر فارم کی زمینوں اور ان کے چھوٹے تمام کیش اور دوسرے لوازمات کی مالک ہونگی اور ان کے مرنے کے بعد سب کچھ ان کے چھ بچوں میں تقسیم کر دیا جائیگا۔

کئی برس قبل ہی میجر صاحب اپنے تینوں بیٹوں اور تینوں بیٹیوں کی تعلیم اور شادی کی ذمہ داریاں پوری کر چکے تھے اور یقیناً وہ سب کے سب اپنے بچوں، بیویوں اور شوہروں کے ساتھ خوشحال اور مطمئن زندگی گزار رہے تھے [illegible] وہ سب اس فارم پہ آتے رہتے اپنے بچوں کی آئندہ زندگی کے زائچے بنوائے جاتے۔ اپنی چھوٹی بڑی باتوں کا بھی مستقبل جاننے کیلئے میجر صاحب سے کھل کر باتیں کرتے۔ بڑے حوصلے اور کھلے دل سے میجر صاحب اپنا سارا علم نچوڑ کر ان کے سامنے رکھ دیتے۔ یہی شغل میجر صاحب کو ان کے دوست احباب کے دائرے سے باہر کافی دور دور تک مقبول و مشغول بنائے تھا۔ اگر موڈ میں آ جاتے تو معلومات بہم پہنچا دیتے ورنہ کورا جواب دے دیتے لیکن مایوس ہونے کے بجائے لوگ انہیں گھیرے رکھتے جس سے بظاہر وہ خاصے مصروف نظر آتے۔

دوسروں کے آئندہ حالات، بچوں کی پیدائش اور سیاہ بخت ہونے والوں کی صحت اور ان کے عزیزوں کی موت و زیست کی تفصیل معہ دن، تاریخ اور وقت و سن بتاتے بتاتے میجر صاحب خود اپنی زندگی کے ستّر سال آٹھ مہینے گزار چکے تھے۔ اب صرف ڈیڑھ مہینے کی زندگی کے دن سامنے تھے

ان آخری دنوں میں وہ اپنے سب بچوں کو یہاں اپنے قریب اپنی نگاہوں کے سامنے دیکھنا چاہتے تھے اسی لیے اپنے ہر بچے کو وہ بہت دنوں قبل طویل خط لکھ چکے تھے اور ہر بیٹے اور بیٹی کو معہ بال بچوں اور شوہروں کے ساتھ آ کر یہاں اس وقت تک رہنے کے لئے لکھ چکے تھے۔ مگر ابھی تک یہاں ان میں سے کوئی بھی نہیں آیا تھا اور نہ ہی کسی نے پہنچنے کے بارے میں ان کو اطلاع دی تھی۔ وہ ہر صبح اس امید سے بستر سے اٹھتے کہ آج ضرور ان کے بیٹے بیٹیاں آجائیں گے۔ دوپہر میں بیوی کو سمجھاتے ہوئے گویا خود اپنی آس بندھاتے کہ سب لوگ آج رات میں آ جائیں گے۔ مگر ہر رات بستر پہ لیٹتے ہی ان کی آس ٹوٹ چکی ہوتی۔ وہ مایوسی سے کہتے اچھا کل دیکھوں گا کہ وہ سب کب تک آنے والے ہیں؟ [illegible] اگلی صبح خود ہی کہتے ابھی کیا دیکھنا ہے آج وہ نہ آئے تو [illegible] اب کل دیکھونگا پھر تمہیں بتاؤنگا کہ وہ [illegible] کب تک آجائیں گے۔"

ان دنوں آس پاس کے تمام دوستوں اور جاننے والوں کے علاوہ دور دور رہنے والوں کے گھر بھی جا کر میجر صاحب انہیں اپنی موت کے آنے والے دن سے باخبر کرتے رہتے۔ اپنی غلطیوں کی معافی مانگتے اور گلے مل کر رخصت ہوتے اور اس درمیان ہونے والی گفتگو میں بار بار اپنی اولادوں کا ذکر کرتے ان کے ایک ایک لفظ سے ظاہر ہوتا کہ ان کے دل میں اپنے بچوں کے لیے بے پناہ محبت ہے اور زندگی کے بقیہ دن اپنی آل اولاد کے ساتھ گزارنے کی شدید ترین خواہش ہے لوگ اخلاقاً ان کا حوصلہ بڑھانے کو یقین دلاتے کہ کل پرسوں میں عید کے سب لڑکے لڑکیاں آ جائیں گے اور میجر صاحب کا گھر ان کے بچوں سے بھر جائے گا۔ یوں دھیرے دھیرے وقت گزرتا گیا مگر بچوں میں سے کوئی بھی نہیں آیا۔ اب صرف تین دن گیارہ گھنٹے دس منٹ کی زندگی [illegible] کے لئے اور باقی رہ گئی تھی لیکن ان کے بچوں میں سے

کو 101 سال اور دو ... کا عرصہ آیا۔ میجر صاحب میں اب
بڑا تغیر آ گیا تھا انہوں نے اپنی اولادوں کے تذکرے
فت بند کر دیتے تھے بیوی کے ساتھ ہنسی خوشی دن
ت گزار رہے تھے۔ جیسے شادی کے فوراً بعد نئی نویلی
ہن کے ساتھ گزار چکے تھے دو دنوں سے دوستوں ملنے جلنے
ں کا ان کے گھر پر ایک تانتا سا لگا تھا ان میں معتقدین
وم در مخیوم چہرہ لیے الگ الگ گروپ بنائے اظہار
ا کر رہے تھے۔ سب کو افسوس تھا کہ میجر صاحب کی
ری خواہش پوری نہیں ہو پائی۔ تعجب بھی تھا کہ آخر ان
لڑکے لڑکیوں میں سے کوئی آیا کیوں نہیں؟ کیا اولاد
روقت میں یوں رخ پھیر لیتی ہے۔ لوگ اظہار ہمدردی
لیے میجر صاحب کے پاس جاتے اور مسرور و شادان چہرے
میجر کی تعریف کرتے واپس لوٹ آتے۔

آخر وہ صبح آ گئی۔ میجر صاحب نے روزانہ کے سارے
مولات انجام دیے، ساڑھے دس بجے تک گھر کے اندر اور
کافی بڑی تعداد میں لوگ جمع ہو چکے تھے ہر آنے والا اس
ن سے ان کے گھر میں قدم رکھتا کہ میجر صاحب کی ہمدردی
چند الفاظ ان کی اولادوں کی نافرمانی کیلئے اس کی زبان
نکل ہی پڑتے مگر میجر صاحب اس بات پر کوئی توجہ
یں کر رہے تھے گیارہ بج چکے تھے میجر صاحب نے اٹھ کر
ما موجود لوگوں سے باری باری مصافحہ کیا اور اندر بیڈ
م میں جا کر خود ہی لیٹ گئے۔ ایک سفید چادر اپنے بدن
پھیلا کر پیروں کو ڈھک لیا۔ انکی بیوی وہیں پلنگ پر
کے پیروں کے پاس آ کر بیٹھ گئیں۔ میجر صاحب نے مسکرا
بیوی کا چہرہ دیکھا اور بولے "اجازت ہے نا"

بیوی کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے مگر میجر صاحب
یا ملکی باندھے دیکھتے رہے آخری سانسوں میں وہ
ہم سفر سے نگاہ ہٹانا نہیں چاہتے تھے

... بجکر آٹھ منٹ ہوئے تھے ٹیلیگرام کے سبھی
... میجر صاحب کا پرانا خادم ان کے
... ہوا میجر صاحب کے بدن پر سفید چادر

اور ان کی بیوی کے چہرے پر پہلا آنسو دیکھتے ہی وہ بے ساختہ
پکار اٹھا۔

"میجر صاحب ــــ؟"

"کیا ہے؟" میجر نے بڑے سکون سے پوچھا

"آہ ــــ سرکار یہ تار اور خط آئے ہیں"

"جانتا ہوں ــــ یہ میرے بچوں نے بھیجے ہیں اور پوچھا
ہے کیا ہوا؟" اور وہ خطوط میری بیٹیوں نے لکھے ہیں کہ ان
کا بوڑھا باپ اب تک چکا ہے اول فول لکھنے لگا ہے
ان کی ذاتی مجبوریاں ہیں تمہیں موجودہ نہیں آ سکیں" خاموش ہو کر
میجر صاحب نے آنکھیں بند کر لیں۔

اب بیوی کی نگاہیں ان کے چہرے پر ٹکی تھیں خطوط
اور ٹیلیگرام کے لفافے سامنے میز پر بند پڑے تھے۔ میجر
صاحب کی بیوی نے انہیں ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ دھیرے
دھیرے کمرے کے اندر دوستوں اور پڑوسیوں کا آنا جانا
شروع ہو گیا۔ میجر صاحب کی سانس باقاعدہ چل رہی تھی
اور ہلکے ہلکے خراٹے صاف سنائی پڑ رہے تھے۔ ایک گھنٹہ
گزر گیا میجر صاحب نے آنکھیں کھولیں ہنس کر بیوی کو دیکھا
اور اٹھ کر بیٹھ گئے پھر کمرے کے باہر آ گئے دوستوں اور
پڑوسیوں کا شکریہ ادا کر کے رخصت کیا اور بیوی کے
ساتھ آ بیٹھے۔

ٹیلیگرام کے لفافے کھولے الفاظ کی رد و بدل کے ساتھ
سبھی کی عبارت کا مفہوم ایک ہی تھا "کیا ہوا جلدی
اطلاع دیجئے" الگ الگ تار ... بچوں کے نام
تھے اور وہ خطوط بیچ ان کی لڑکیوں کے تھے جنہوں نے
انتہائی محبت کا اظہار کرتے ہوئے آنے سے معذوری
اور مجبوری ... اطلاع ملتے ہی آنے کو لکھا تھا
میجر صاحب سارے خط اور تار پڑھ چکنے کے بعد معصومیت
سے ہنسے اور بیوی سے بولے

"بیگم مجھے بھوک لگ رہی ہے۔ دن کا کھانا لگانے
کا انتظام کراؤ"

دو دن بعد گزر گئے میجر صاحب 101 سال کے ہو گئے

بھی ملنے جلنے لگے۔ وہ پہلے ہی کی طرح پاس پڑوس اور ملنے جلنے والوں کے یہاں آتے جاتے رہتے مگر اب ان میں نمایاں تبدیلی تھی وہ نہ تو کسی سے پہلے کی طرح لمبے لمبے مذاکروں کی باتیں کرتے اور نہ ہی ان کے خطوط کے جواب دیتے خط آتے تو بیوی بڑے شوق سے پڑھتیں اور وہی جواب دیتیں لیکن میجر صاحب کبھی نہ پوچھتے کہ کیا لکھا ہے اگر بیوی خود ہی ذکر کرتیں تو وہ بیٹھے رہتے جیسے کچھ سنا ہی نہ ہو ان کے جاننے پہچاننے والوں میں یہ بات محسوس کی گئی اور ان سے اس کی وجہ پوچھی بھی گئی جب میجر صاحب خاموش رہ کر بڑی خوبصورتی سے ٹال جاتے تو دوسری بات جو سب کو کھٹک رہی تھی وہ میجر صاحب کی اپنی موت کے بارے میں بیس برس قبل کی گئی پیشین گوئی کا غلط ثابت ہو جانا تھا جسکے لئے عام طور پر لوگ خود میجر صاحب سے گفتگو کرنا چاہتے تھے۔ مگر میجر صاحب اس کا موقع ہی نہیں دے رہے تھے۔

انہیں دنوں اڑتی اڑتی ایک اور خبر مشتہر ہوئی کہ میجر صاحب نے اپنے وکیل سے وصیت کے کاغذات واپس لے لئے ہیں اور اب انہوں نے گورنمنٹ میں درخواست دی ہے کہ انہیں لاوارث بچوں کا ایک ایسا ادارہ قائم کرنے کی اجازت دی جائے جس کی کفالت فی الحال وہ اپنی آمدنی کے ایک تہائی حصے سے کر سکیں ساتھ کا فارم باغ بغیچے اور آبائی شاندار کوٹھی تا حیات انکی بیوی کی ملکیت رہے اور بعد ان کے ساتھ ملا کر اسی ادارہ کے نام وقف کر دی جائے جس کی نگرانی کے لئے سرکاری کارکن مقرر کئے جائیں۔ اس خبر کو شروع میں کسی کو بھی یقین نہیں آیا تھا۔ لیکن تھوڑے عرصے کے بعد ایک لمبا سا بورڈ بطور ثبوت کوٹھی کے پھاٹک پر لٹک گیا۔ یوں شک شبہ بھی جانے والی خبر کی تصدیق ہونے پر میجر صاحب کے حلقہ احباب کے ساتھ ہی شہر کے معززین میں بھی خاصی بے چینی پھیلتی گئی۔ بڑا تعجب بھی تھا دراصل میجر صاحب نے سماجی اصلاح و بہبود کے کاموں کیلئے کبھی زبانی طور پر بھی کسی دلچسپی کا اظہار بھی نہیں کیا تھا

ان کی عبادت، دنیا داری اور عزیز داری کا کوئی بھی خیال نہ کر کے گیا تھا پہلے کی طرح اپنی بیوی اور بچوں تک کی خبر گیری کرنے سے ہی میجر صاحب مطمئن رہتے تھے انکے اس بدلے رویے سے متعلق بہت سے سوال میجر کے قریبی دوستوں سے نکل کر عوام تک پہنچ گئے تھے بس موقع کی تلاش تھی۔

جلد ہی وہ موقع آگیا۔ بیوہ اور بیٹے کے لمبے عرصے کے بعد واپس لوٹنے کی خوشی میں بریگیڈیر صاحب کے یہاں پارٹی تھی۔ انکی واپسی میجر صاحب کے بتائے وقت دن و تاریخ کے عین مطابق تھی اس لئے مہمانوں میں میجر صاحب خصوصی اہمیت کے ساتھ موجود تھے جیسے کہ بعض سوالوں کے ساتھ بہت سے لوگ حلقہ بنائے بیٹھے تھے گفتگو کے دوران آخر میجر صاحب کی زبان تک وہ موضوع آگیا جسے سننے کیلئے وہاں موجود سبھی مہمان ایک مدت سے منتظر تھے۔ گلا صاف کر کے میجر صاحب نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہنا شروع کیا۔

"نہیں ایسا نہیں ہوا ـــ میری پیشین گوئی کے وقت دن تاریخ اور سن کے عین مطابق میری موت ہوئی ـــ مگر اس زندگی کی تھی جسکی مدت میری عمر کے اٹھائیس سال سے ستر سال تک کی تھی چھ بچوں کا باپ اسی دن انتقال کر گیا۔ اس دنیا سے گزر گیا جسکی حدود اسکی چھ بچوں سے وابستہ خوابوں اور انکی تعبیروں تک متعین تھیں ایک گھنٹے کی نیند کے بعد آنکھیں کھلیں تو سامنے لامحدود وسعتوں کی دنیا بے شمار خوابوں اور ان کی تعبیروں سے زندگی لئے آ گئی جس کا ایک ایک قدم میں بہت سوچ سمجھ کر اٹھاتا جا رہا ہوں۔"

اپنی بات ختم کر کے میجر صاحب نے پاس بیٹھی اپنی بیوی کو دیکھ کر ایک زوردار قہقہہ لگایا اور اٹھ کھڑے ہوئے۔

پرنٹر، پبلیشر، ایڈیٹر مسعود مظہر نے ملت آفسیٹ پریس سلطان گنج، پٹنہ سے چھپوا کر دفتر ماہنامہ سہیل، ملیٹہ روڈ، گیا سے شائع کیا

فخرالدین عارفی
محمد پور، شاہ گنج، پٹنہ - ۶

منظر بہ منظر

اور پھر ایسا ہوا کہ مجھے میرے جرم کی سزا دی گئی یعنی اپنے گھر سے نکال دیا گیا، بالکل بے سر و سامانی کے عالم میں تب میں نے اس شہر میں آکر پناہ لی، جہاں آج بھی ہوں یہاں پہنچ کر مجھے ایک سکون کا احساس ہوا تھا۔ میں نے سوچا تھا شاید اب میں ایک محفوظ مقام پر پہنچ گیا ہوں، میں اگر یہ بھی کہوں تو شاید غلط نہ ہوگا کہ میں سزایاب ہو کر قدرے مطمئن بلکہ خوش بھی تھا۔ لیکن یہ میری خام خیالی ثابت ہوئی کہ میں ایک محفوظ مقام پر ہوں حقیقتاً اس کے بالکل برخلاف تھی، سورج یہاں بھی میرا تعاقب کر رہا تھا اور اس کی قہر آلود نگاہیں سائے کی طرح میرے ساتھ ساتھ تھیں۔ میں نے خوف زدہ نگاہوں سے سورج کی طرف دیکھا، اس کی سرخ سرخ آنکھوں میں جھانکا اور اس کے تیور بھانپ کر سہم گیا۔ اس کی آنکھوں میں میرے لیے اب تک نفرت تھی، غصہ تھا، اور برے ارادے تھے......

اب کیا ہوگا؟ میرے دل نے مجھ سے سوال کیا تھا، اور قبل اس کے کہ اس پہلو پر میں کچھ سوچتا، غور و فکر کرتا، سورج نے اپنی پوری گرفت کے ساتھ مجھے دبوچ لیا، ہاتھی کا سونڈ جیسا ان کا ہاتھ ہے اور مضبوط ہاتھوں نے پوری طرح سے اپنی گرفت میں لے لیا تھا اور مجھے اس وقت ایسا محسوس ہوا تھا جیسے کہ آج میرا دم گھٹ جائے گا، جان نکل جائے گی......

میں زور زور سے چیخنے چلانے لگا اور تب میری درد بھری چیخ و پکار سن کر روشنی کے شہر کے رہنے والے ایک بہت بڑی تعداد میں میرے ارد گرد جمع ہو گئے۔ سب کی نگاہوں کا مرکز تنہا میں تھا۔ میں سورج کی گرفت میں تھا اور سورج کی آگ موم کی مانند مجھے اور میرے وجود کو سیال مادے میں تبدیل کر رہی تھی۔ بےچینی تھی کہ لمحہ بہ لمحہ بڑھتی جا رہی تھی۔ لیکن ہزاروں، لاکھوں چہروں کی بھیڑ میں بھی مجھے کوئی ایسا چہرہ نظر نہیں آیا جو درحقیقت میرا ہمدرد ہوتا۔ سب بیگانے تھے، دشمن تھے۔ ان کے ہونٹوں پر میرے لیے طنزیہ مسکراہٹیں کھیل رہی تھیں۔

ماحول میں خوشیوں کے شادیانے بج رہے تھے اور ایک جشن کا عالم تھا......

میں سخت حیرت میں تھا کہ آخر یہ لوگ کتنے بے مروت ہیں جیسے پتھر کے بنے ہوں، پتھر جو بڑا پتھر ہوتا ہے کہ جس کو تراش کر خوبصورت اور دیدہ زیب تو بنایا جا سکتا ہے مگر اس میں جان نہیں پیدا کی جا سکتی......

یہ میں کہاں آگیا ہوں...... وہاں نہ جانے کب تک [illegible] مجھے اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ میں نے [illegible] سے کہا، مت ستاؤ [illegible]۔

مجھے بچا لو! مجھے بچا لو......

خدا کے لئے سب سے رحم کی درخواست کی لیکن کوئی [illegible]

میرا وجود آگے نہیں بڑھا۔
"مجھے بچاؤ مجھے بچاؤ...... سورج مجھے مار ڈالنا چاہتا ہے......"

میں زور زور سے چیخنے چلانے لگا لیکن لاحاصل... کسی پر کوئی اثر نہیں ہوا، میری درد بھری فریاد کسی کے دل میں نہیں اتر سکی پھر اچانک میں نے سنا، بھیڑ سے ایک آواز ابھری تھی۔

"کتنا بڑا نادان ہے، کہتا ہے سورج مجھے مار ڈالنا چاہتا ہے۔ بیوقوف، اگر سورج کو مارنا ہی ہوتا تو پھر پیدا کیوں کرتا؟"

پھر ایک دوسری آواز ابھرتی ہے!

"شاید پاگل ہو گیا ہے، سورج کا شکر ہے عظیم و برتر سورج کو قاتل تصور کرتا ہے.......... اب اگر یہ اپنے شور و شغب کو بند نہیں کرے تو اسے پتھر مار مار کر ہلاک کر دیا جائے......"

"ہاں اسے قتل کر دینا چاہیے......"

"اس کی سزا موت ہے......"

"اس کی سزا صرف موت ہے......"

اور آوازیں لمحہ بہ لمحہ بڑھتی ہی چلی گئیں، آوازوں کا ایک سمندر تھا جو ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔

میں سہم کر بالکل خاموش ہو گیا، فرط خوف سے میرا سارا وجود لرز رہا تھا۔ پھر بھی کئی پتھر میری جانب اچھال دیئے گئے تھے، ایک پتھر میرے سر پر لگا اور اس کی چوٹ سے میرے سر سے خون بہنے لگا تھا۔

"خون، خون...... مجھے بچاؤ، مجھے بچاؤ......"

اب میں ایک مرتبہ پھر اپنی فلک شگاف چیخ سے آسمان پھاڑ رہا تھا لیکن اس مرتبہ براہ راست سورج مخاطب تھا اور تب جیسے کسی نے مجھے اپنی گود میں اٹھا لیا اور لمبے لمبے قدموں کے ساتھ اس بھیڑ سے بہت دور نکل گیا۔

ایسا لگ رہا تھا جیسے سکون کا احساس گھیر رہا تھا۔ یہ نئی جگہ بہت خوبصورت اور پُر بہار تھی۔ چاروں طرف اونچے اونچے مکانات اور باغات تھے۔ میں حیرت سے ان کو دیکھنے لگا، ایک بہت ہی خوبصورت فلک بوس عمارت کا اندرونی منظر دیکھ کر میرا دل کسی بچے کی مانند مچل پڑا میرے ہونٹوں پر مسکراہٹوں کی لہریں موجیں مارنے لگی تھیں کہ اسی دم موسم کے تیور پھر خراب ہو گئے، بادلوں کی اوٹ سے دو خشمگیں نگاہوں نے مجھے سر سے پاؤں تک گھورا ــــ میں سہم گیا ایک انجانے خوف سے میرا سارا جسم کانپنے لگا ــــ"

"مجھے معاف کر دو، مجھ سے غلطی ہو گئی...... میں......"

لیکن قبل اس کے کہ میں اپنا جملہ مکمل کر پاتا ایک طوفانی جھکڑ نے ایک مرتبہ پھر مجھے سونڈوں میں جکڑ لیا اور ایک زوردار جھٹکے کے ساتھ مجھے فضا میں اچھال دیا ــــ میں بے ہوش ہو گیا تھا اور جب مجھے ہوش آیا تو میں نے ایک ویران پہاڑ پر خاردار جھاڑیوں میں خود کو اٹکا ہوا پایا۔

میرا سارا جسم لہولہان ہو چکا تھا اور شاید جسم میں کچھ بھی خون باقی نہ تھا۔

میں نے اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی، سورج کا کہیں دور دور تک پتہ نہ تھا ــــ

یہ کل کا دن اور آج جبکہ اس واقعہ کو ہزاروں سال گزر چکے ہیں میں اسی حالت میں ہوں۔ سچویشن آج بھی وہی ہے......

پرندے کے بازو ٹوٹ چکے ہیں......

جسم لہولہان ہے......

اور ــــ

سورج کا کہیں دور دور تک نام و نشان نہیں۔

شہیر عباس بخاری

ماتم یک شہر آرزو

بارش اس زور سے ہو رہی تھی جیسے آج کے بعد پھر کبھی نہ برسے گی۔ بجلی کڑک رہی تھی۔ پہلے بجلی کی چمک ہوتی اور چند لمحوں کے بعد گرج۔ پہلے علاقہ تیز روشنی سے چکا چوند ہو جاتا اور پھر گرج سے دہل جاتا۔ بادل آسمان کو اس طرح چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھے جیسے یہاں سے اب جانا ہی نہ ہو۔ یکایک اولے پڑنے شروع ہو گئے۔ اکرم جھک کر برآمدے سے باہر نکلا اور چند اولے اپنے ہاتھ پر رکھ کر واپس آیا اور دو تین اولوں کو دکھاتے ہوئے بولا۔ "کراچی میں اتنے بڑے بڑے اولے اگر اس سے پہلے کسی نے دیکھے ہوں تو دیکھ لے۔" ایک دفعہ جو زور سے بجلی کڑکی تو زبیر کانپ گیا جس پر اکرم نے برجستہ کہا "اس سے گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں اگر بجلی کی نظر کرم یہاں ہو گئی تو کانپنے یا جھرجھری لینے کی نوبت ہی نہیں آئے گی اور اس سے پہلے ہی کام تمام ہو چکا ہوگا۔"

"بات تو ٹھیک کہہ رہے ہو۔" زبیر نے جواب دیا۔

کچھ طلبا برآمدے میں کھڑے ہو کر بارش کا نظارہ کر رہے تھے۔ کچھ کالج کینٹین میں چائے اور اسنیکس کھا پی رہے تھے۔ کچھ طلبا دو الگ الگ ٹولیوں میں مجمع کی شکل میں جمع تھے۔ چند طالبات بھی ادھر ادھر ٹہل رہی تھیں۔ اس زمانے کا ذکر ہے جب لکشمی بلڈنگ کراچی کی سب سے خوبصورت اور بلند عمارت ہوتی تھی اور ایلفنسٹن اور کیپٹ کی آرہ کی معروف شاہراہ پر محلے کے لڑکے کرکٹ کھیلا کرتے تھے۔ طلباء کے یہ دونوں مجمعے ایک دوسرے سے قدرے فاصلے پر لگے ہوئے تھے۔ ان میں لطیفوں، غزلوں اور گانوں کا دور چل رہا تھا۔ جس مجمع میں اکرم مرکز بنا ہوا تھا اس میں طوطا مینا، چرندوں پرندوں کی بولیاں بولنے والے، لطیفہ گو، سیاسی اور مذہبی رہنماؤں کی نقلیں اتارنے والے، فٹ پاتھ کے منجن، چورن، اطریفل، پوشیدہ بیماریوں کی دوا فروخت کرنے والے مجمع باز جیسا بنا اپنا کرتب دکھا رہا تھا تو اکرم کے ایک قریبی دوست نے ایک ٹکڑا لگایا اور اکرم کو دونوں شانوں سے پکڑ کر مجمع کے درمیان میں لے جا کر کھڑا کر دیا۔ اکرم کا مجمع [illegible] ہو گیا اور لڑکوں نے زوردار تالی بجا دی۔ اکرم اس غیر متوقع حملے کے لئے بالکل تیار نہ تھا۔ اکرم [illegible] [illegible] کے آنے کے ہونے والے امتحانات میں جنرل سیکریٹری کا امیدوار تھا اور اس سال [illegible] سے متعلق خاصی پرکشش کی تھی اور اس انتخابی مہم میں بڑی دھواں دار تقریریں [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]

ہستیوں سے جو وقتی تعلق رکھتے ہیں جبکہ پیار اس قسم کے بندھنوں سے کوئی تعلق نہیں۔ رونا یا گانا تو سب کو
ہے کوئی بھی کتنا ہو گا تا ہی سنا دو۔" ایک آواز آئی جس کی تائید بہت سی آوازوں نے کی سچ ہیں
کے بعد اکرم نے ٹیک ٹیک کر گایا:

پنچھی باورا چاند سے پریت لگائے — چاند سے پریت لگائے

گانے کے ختم ہونے کے بعد ایک کونے سے آواز آئی "چاند کا نام تو بتا دو۔ اگر سب کے سامنے نہیں بتاتے
ہمارے کان میں بتا دو کہ چاند کون ہے۔" تھوڑی دیر میں الیکشن کے بعد پروفیسر جو الیکشن کمشنر بھی تھے اسٹاف
ہمارے میں آئے تو سب طلباء نے انہیں گھیر لیا اور رزلٹ کے انتظار میں خاموش کھڑے ہو گئے۔
پروفیسر صاحب نے اکرم کے کامیاب ہونے کا اعلان کیا تو اس کے حامی طلباء نے اسے کندھوں پر اٹھا
صرف اکرم ہی نہیں بلکہ اس کا پینل بھی پورا کامیاب ہو گیا تھا۔ مس فراست اسٹوڈنٹس یونین کی
اکرم جنرل سیکریٹری منتخب ہو گئے تھے۔ مخالف پینل والے منہ لٹکائے اور چھپتے چھپاتے کالج کے
سے باہر نکل گئے۔ اکرم اور فراست نے طلباء کا شکریہ ادا کرنے کی خاطر تقریریں کیں اور طلباء مفاد
جدوجہد کریں گے عزم کا اعادہ کیا۔ الیکشن کا ہنگامہ تو ختم ہوا لیکن بارش کا زور اور گرج چمک ابھی ویسے
تھا جب بارش کچھ دیر کے لئے تھمی ہوتی تو طلباء جانے لگتے کچھ ابھی یہ سوچ ہی رہے ہوتے کہ ابھی اور رکیں
تو ہیں کہ اتنی دیر میں بارش اور تیز ہو جاتی اور نہ جانے والے سوچتے رہ جاتے کہ پہلے ہی چلے جاتے تو
کالج کے پرنسپل، ایڈمنسٹریٹر، لائبریرین اور ایسے ہی دوسرے ذمہ داران کے پاس طلباء و مسائل کے
کے سلسلے میں ان دونوں کو جانا پڑتا۔ مختلف فنکشنز کا انعقاد کرنا ہوتا۔ فراست انگریزی ادب
اکرم اردو ادب میں ایم۔ اے کرنے کے متعلق سوچ رہے تھے۔ دونوں کینٹین، کامن روم یا کلاس ر
میں اکثر مشہور شاعروں مثلاً ٹینی سن، طامس مور، جان فیلڈ، چارلس باد بلیئر، ایڈگر ایلن پو
ایچ لارنس اور ٹی ایس ایلیٹ وغیرہ کی نظموں پر تبصرہ کرتے ہوئے پائے جاتے۔ ٹی ایس ایلیٹ کی
لینڈ نامی مشہور نظم کا فراست ترجمہ کر رہی تھی تاکہ کالج کے میگزین کے آئندہ شمارے میں اسے
جا سکے اور اکرم ترجمے کے اس کام میں اس کی مدد کر رہا تھا۔ طلباء قیادت اور ادبی ذوق کی ہم آ
کے سبب ان کا ہر وقت ساتھ رہنا کچھ مزید سوالات کا پیش خیمہ ثابت ہو رہا تھا۔ ایک دن فرا
کی سہیلی نوزیہ نے فراست سے کہا "آپ اور اکرم جب زیادہ وقت ایک ساتھ رہتے
باقی جو وقت رہ جاتا ہے اس میں بھی اکٹھے رہتے ہیں تو کیسا اچھا رہے" نوزیہ میں کبھی نہیں
کہہ رہی ہو۔ فراست نے جواب دیا" جو میں کہہ رہی ہوں وہ تم خوب سمجھ رہی ہو۔ اب اتنی بھولی
بنو۔ نوزیہ نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ فراست کے چہرے پر ہلکی سی لالی دوڑ گئی۔ اتنے میں چپڑا
سی کے آجانے سے بات آئی گئی ہو گئی۔

جب پنچھی اور چاند ہر وقت ساتھ ہوں اور ایسے ہی لوگ فرمائش پر الیہ گیت سنا دیا
مضمون بات نہیں۔" اکرم کے دوست سلیم نے ایک دن اکرم سے کہا۔ "اکرم میں تمہاری بات نہیں
زمانہ کی قوالی کا ایک مصرعہ تمہارے ہی جیسے لوگوں کے لئے ہے کہ سمجھ سمجھ کر بھی جو نہ سمجھے میری
میں وہ نا سمجھ ہے۔" سلیم نے جواب دیا اور مزید کہا [illegible]

ہا میں تو کیا ہی اچھا ہو" اکرم نے مزید لاعلمی کا اظہار کیا تو سلیم نے صاف صاف اکرم اور درخواست کے متعلق
ہیلو فون سے اسے آگاہ کیا۔ سلیم اول تو میری شادی کے متعلق میرے ہاتھ میں ایسی لکیر ہی نہیں اور دوسرے
ہو بھی تو میرا عقیدہ ہے کہ یہ معاملہ انسان کے عالم وجود میں آنے سے پہلے آسمانوں پر طے ہو جاتا ہے
ندا بندہ بشر اس سلسلے میں بالکل عاجز اور معذور ہے" اکرم نے نہایت خوش اسلوبی سے بات کو ٹالنے
کی کوشش کی۔" اور ہاں سلیم تمہارا اور نرگس کا فیئر اب کس مرحلے پر ہے" اکرم نے وار کو پلٹانے کی نیت
سے کہا" اب تک تو معاملہ ٹھیک ٹھاک ہے آگے کا خدا جانے" سلیم نے جواب دیا۔

اکرم صاحب پال جبریل پر سر نے جو نوٹس لکھوائے ہیں وہ آپ کے پاس ہوں تو مجھے دے دیں کیونکہ
میں کچھ دن کالج نہیں آئی۔ بی اے پارٹ I کی لڑکی نے آکر اکرم سے کہا۔ اور ٹھیک اسی وقت دوسرا پیریڈ
شروع ہو گیا اور یہ سب لوگ کلاس روم میں چلے گئے۔

گرمیوں کی چھٹیوں کے بعد جو کالج کھلا تو ایک زبردست اور حیرت ناک تبدیلی یہ ہوئی کہ نرگس اور اکرم ایک
دوسرے سے بہت منحرف تھے۔ ذاتی اور ادبی یا علمی گفتگو ودر کنار اب تو ہیلو کے کلاموں میں بھی رخنہ پڑنے لگا۔ اگر
دونوں میں سے کسی نے کچھ پوچھا بھی تو انہوں نے ٹالا پھر اکر بات ختم کر دی۔ لوگ اپنے اپنے اندازے اور قیاس
لگاتے رہے لیکن اصل بات کسی کو پتہ نہ چل سکی حتیٰ کہ دونوں کالج سے اپنی اپنی تعلیم مکمل کر کے چلے گئے اور بھید
نہ کھلنا تھا اور نہ کھلا۔

اکرم ان دنوں شہر کے ایک اوسط درجے کے ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا۔ صبح ناشتے کے ساتھ ہی بیرے نے
اکرم کی ہدایت کے مطابق آج کا اخبار بھی ناشتے کی میز پر لا کر رکھ دیا۔ اکرم سرسری خبریں پڑھ رہا تھا کہ
ایک اشتہار پر اس کی نگاہیں رک گئیں۔ ایک دن کے بعد اس کے کالج کے اولڈ سٹوڈنٹس کا کالج میں
ڈنر تھا۔ اکرم نے فوراً بیل بجائی اور بیرے کے آنے کے بعد اس سے کہا کہ آج ایک گھنٹے کے بعد ہوٹل کی کار
درکار چاہیے۔ بیرا جی اچھا کہہ کر چلا گیا۔ اخبار کے اشتہار میں اولڈ اسٹوڈنٹس کے تین مختلف فون نمبر بھی دیے
ہوئے تھے جہاں سے ڈنر کے کارڈز حاصل کیے جا سکتے تھے لیکن اکرم نے بجائے کہیں فون کرنے کے سیدھے کالج
جانے کو ترجیح دی۔ کالج پہنچ کر اکرم نے دیکھا کہ سلیم بھی موجود ہے اور دو تین اور بھی سابق طلبا اور چوہدری
ایسوسی ایشن کے انتظامات پر گفتگو کر رہے ہیں۔ اکرم کو دیکھتے ہی سلیم کھڑا ہو گیا اور پرجوش انداز میں بغل گیر
ہوا۔ کچھ دیر کی باہمی گفتگو کے بعد اکرم نے ہوٹل کے ڈرائیور کو کار واپس لے جانے کے لئے کہا کیونکہ دوپہر
کا کھانا اکرم اور سلیم، سلیم کے گھر کھائیں گے۔

تین سال پہلے کے کلاس فیلو اور دو دوست جب گھر پہنچے تو اُن ہی کی ایک تیسری کلاس فیلو نرگس
جو اب مسز سلیم تھی اپنے شوہر سلیم اور کلاس فیلو اور اسٹوڈنٹس یونین کے سابق جنرل سیکریٹری مسٹر
اکرم کا استقبال کیا۔ نرگس ابھی کچھ بولنا ہی چاہتی تھی سلیم نے الگ لے جا کر اسے کچھ کہا اور پھر تینوں باتیں
کرنے لگے۔ نرگس اکرم کو پہچان گئی تھی لیکن اکرم نرگس کو نہ پہچان سکا اور اس سسپنس کو برقرار رکھنے
کے لئے سلیم نے نرگس کو حقیقت حال بتانے سے منع کر دیا تھا۔ کچھ دیر بعد کھانے کا دور چلا اور پھر چائے اس
دوران اکرم کو کچھ شبہ ہونے لگا تھا کہ مسز سلیم کی شکل میں جو خاتون اس وقت سامنے بیٹھی ہیں یہ
وہی کالج کی نرگس ہے لیکن غیر یقینی کے سبب وہ کچھ کہہ نہیں پا رہا تھا۔ آخر اکرم نے ایک مختلف

پھر اُس نے میاں بات شروع کی اور کہا "سنو! میڈیکل کالج میں ایک لڑکی نرگس ہوتی تھی" ابھی اکرم اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ دونوں میاں بیوی زور دار قہقہہ مار کر ہنس پڑے۔ سلیم نے کہا "ہمارے پیارے سکریٹری! وہ نرگس ہوتی نہیں تھی بلکہ ہے اور آپ کے سامنے اس وقت موجود ہے۔" یہ سنتے ہی اکرم نے دونوں کو مبارکباد دی اور مٹھائی کا مطالبہ کر دیا۔ یہ سن کر نرگس نے کہا "پیارے اکرم مٹھائی تو حاضر ہے لیکن مبارکباد وصول کرنے اور مٹھائی دینے کے کا فلسفہ اور وقت بہت گزر چکا کہ اب ہم اور تم نانا اور دادا والی عمروں میں ہیں۔

اکرم نے دورانِ گفتگو بتایا کہ پڑھائی ختم کرنے کے بعد وہ میاں امریکہ چلا گیا تھا اور اپنے والدین کے انتقال کے بعد اُس نے اپنے دو چھوٹے بھائیوں کو بھی امریکہ بلا لیا تھا۔ خود وہیں ایک روشن کنیورک لڑکی سے شادی کر لی تھی۔ اُس کی بیوی اب اسسٹنٹ پروفیسر ہے۔ اُس کے چار بچے ہیں دو بیٹے اور دو بیٹیاں اور چاروں اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں اور اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں۔ اکرم نے بتایا کہ اُس کی بیوی اپنے عقیدے پر عمل کرتی ہے اور وہ اپنے عقیدے پر۔ بچوں کا حال بھی اُس سے کچھ مختلف نہیں۔ ویسے گھر کی زندگی خوشگوار ہے اور ہر طرح کی آسائش میسر ہے۔ میرے بہت ہی قریبی عزیزوں میں ایک شادی تھی جس میں شرکت کی خاطر میں پاکستان آیا ہوں یہاں میرا دس دن قیام ہے جس میں چار یوم گزر چکے ہیں۔" اکرم نے ایک سانس میں اپنی پوری داستان سنا دی۔

"ہماری زندگی تو تمہارے سامنے ہے جیسی پہلے تھی اور جو اب ہے لیکن تمہارے حوالے سے فراست کے متعلق تمہیں کچھ بتاؤں۔ نرگس نے کہا ہاں ہاں ہمارے دور کی اسٹوڈنٹس یونین کی صدر زندگی کے محاذ پر کس حال میں ہے یہ مجھے بھی بتاؤ۔ اکرم نے جواب دیا۔

نرگس نے کہنا شروع کیا، فراست کی زندگی کچھ زیادہ کامیاب نہیں رہی بلکہ ایک لحاظ سے وہ بُرے حال میں ہے اُس کی شادی ایک ائیرلائن کے فلائیٹ انجینئر سے ہوئی تھی اور اُسی انجینئر سے شادی کرنے کی لالچ میں فراست نے تم سے دھوکا کیا۔ اُس انجینئر نے چار پانچ سال تک صحیح رویہ رکھا اور اس دوران اُن کے دو بچے بھی ہوئے پھر اُس کے بعد اُس نے ایک اور شادی کر لی اور خود نئی بیوی کے ساتھ رہنے لگا جب کہ فراست کو ایک فلیٹ خرید کر دے دیا اور اب ایک عرصے سے اُسے ہر ماہ ایک مقررہ رقم بھجوا دیتا ہے۔ اور بس البتہ اب فراست کے دونوں بیٹے اچھی تعلیم پا کر شاید اچھے عہدوں پر لگ چکے ہوں گے کمانے والے ہوں لیکن فراست کو یہ فیصلہ بہت مہنگا پڑا۔ ایک تقریب میں فراست مجھے ملی تھی وہ بھی اپنے اس فیصلے پر پچھتا رہی تھی۔ اور ہاں فراست کی ایک کزن ہمارے محلے میں بطور کرایہ دار کچھ عرصے کے لئے آکر رہی تھی اُس نے مجھے بتایا کہ فراست کو تو میرج تو کرنی ہی تھی کیونکہ بزرگوں کی طے کردہ (ARRANGED MARRIAGE) فراست کے لیے ممکن نہ تھی کیونکہ اس میں کچھ کھوٹ تھا۔ "کیا کھوٹ تھا" بالکل نیا انکشاف سن کر اکرم کے کان کھڑے ہو گئے۔ اس بات کو اگر رہنے ہی دو تو زیادہ مناسب ہے۔ نرگس نے جواب دیا۔ نرگس میں تو چند دنوں میں واپس چلا جاؤں گا اور پھر میری دوبارہ واپسی اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ میرے دل میں خلش رہ جائے گی لہٰذا تم اس بات پر سے بھی پردہ اُٹھا دو۔ سلیم صاحب نے بھی نرگس سے کہا کہ وہ اب اگر اتنی بات کر ہی چکی ہے تو پھر پوری بات بتا دے۔

"بات در اصل یہ ہے کہ نرگس نے پھر کہنا شروع کیا۔ "ہمارے معاشرے میں بعض والدین اپنی لڑکیوں کو اس طرح

کھلا چھوڑ دیتے ہیں جیسے ہندوستان میں چڑھاوے کے بیل ہوتے ہیں تو اس کی بھی کچھ نہ کچھ وجہ ضرور ہوتی ہے فراست کی کزن نے مجھے بتایا تھا کہ فراست کے والدین میں سے والدہ کی یہ دوسری شادی تھی۔ فراست کی والدہ کے پہلے شوہر نے انہیں طلاق نہیں دی تھی اور صاف کہہ دیا تھا کہ میں ساری عمر طلاق نہیں دوں گا۔ والدین سبب نہ قانونی اور نہ ہی شرعی کوئی طلاق نہیں ہوئی تھی فراست کی ننھیال والے غصے میں آ گئے اور انھوں نے فراست کی والدہ کی دوسری شادی کرا دی جس سے فراست پیدا ہوا یعنی ایک نکاح کی موجودگی میں دوسرا نکاح کر دیا گیا جو بھلا فروغ پذیر ہی نہیں تھا یقیناً تم پورا مفہوم سمجھ گئے ہو گے۔" نرگس نے اپنی بات ختم کی اور اکرم نے ہلوں ہاں کر کے سر ہلایا۔

مسٹر اینڈ مسز سلیم، اکرم نے کہنا شروع کیا شاید آپ لوگوں کو یاد ہو کہ ایک دفعہ کالج کی تعطیلات کے بعد جب کالج کھلا تو ہم لوگوں میں بات چیت بند ہو چکی تھی اس کی وجہ یہی تھی کہ اس دوران میرا رشتہ فراست کے لئے گیا باوجود فراست کے ایما پر میں نے بھیجا تھا ابھی اس پر غور ہی ہو رہا تھا کہ وہ انجینئر صاحب بیچ میں کود گئے اور یہ بعد میں پتہ چلا کہ محترم نے کالج کے باہر بھی ایک عرصے سے چکر چلا رکھا ہے۔ فراست کو اپنے اس طرز عمل پر ندامت ہے یا نہیں یہ تو وہ جانے لیکن میرا مسئلہ یہ ہے کہ میں جلا وطن ہو گیا۔ میرے بیوی بچوں نے پاکستان آنے سے صاف منع کر دیا ہے۔ اس ڈر سے کہ کہیں میں ان لوگوں کو یہاں مستقلاً رہنے پر آمادہ کرنے کی کوشش نہ کروں۔ انھوں نے یہاں کا چکر لگانے سے بھی انکار کر دیا ہے۔ میں زندگی کی تمام آسائشیں ہونے کے باوجود بھی اپنے ماحول اور لوگوں کے لئے ترستا ہوں۔ مسٹر اور مسز سلیم کالج کے الیکشن کے موقع پر تمہیں یاد ہو کہ ایک گیت جو میں نے سنایا تھا جس کا مفہوم یہ تھا کہ چکور چاندنی میں چاند کو حاصل کرنے کی جدوجہد کرتا ہے اور ناکام رہتا ہے اسی طرح سب ہی اپنی اپنی آرزوؤں اور خواہشوں کو حاصل کرنا چاہتے ہیں لیکن اکثر ناکام ہی رہتے ہیں۔ شاید اسی کا نام زندگی ہے۔

پریوار کلیان ماہ

۸ر اکتوبر سے ۷ر نومبر

۸ر اکتوبر سے ۷ر نومبر تک پورے صوبے میں پریوار کلیان ماہ منایا جا رہا ہے۔
اس خاص مہم کے تحت صوبہ کے سبھی اسپتالوں، پرائمری ہیلتھ سنٹروں
اور ہیلتھ سنٹروں میں فیملی پلاننگ اور ماں بچوں کے کلیان سے
متعلق ہر طرح کی ہدایات دستیاب کرائی گئی ہیں

عوام سے اپیل ہے کہ اس خاص مہم سے زیادہ سے زیادہ
فائدہ اٹھاکر پریوار کلیان ماہ کو کامیاب بنائیں۔

راجیہ پریوار کلیان بیورو
بہار، پٹنہ

सू० ज०स० नि० 159 स (स - 141) / 85-86.

بھیمو دی پالیٹیشن

وریندر پٹواری

کل کی بات اور تھی۔ شہر والے اسکو احمق سمجھتے تھے اور والے نا سمجھ۔ مگر آج وہ ایک منفرد سیاست دان ہے وہ راتوں رات شخص سے شخصیت بن کر ایک روشن ستارے کی طرح جگمگا رہا ہے۔

جی ہاں میں بھیمو کی ہی تو بات کر رہا ہوں۔ مگر آپ؟ دیکھئے جب میں بھیمو کی بات کرتا ہوں آپ جانے کیوں کھلکھلا کر ہنس پڑتے ہیں۔ ارے صاحب آپ نے تو یہ سمجھا کہ آپ کے سینے میں ایک لوہے کی ... نہیں بلکہ گوشت کا ایک نرم دل ہے۔ آخر بھیمو ... ہے کوئی بیگانہ تو نہیں ہے۔ آپ پھر ہنس پڑے؟ —!

دراصل بھیمو کی تقدیر ہی ایسی ہے۔ وہ شاید ... شدہ ہے نا۔ کبھی کبھی اس کی احمقانہ حرکتیں دیکھ ... ہے کبھی یوں غصہ آتا ہے جیسے اس کا معصوم چہرہ انہیں ... رستی ہوئی قیمتوں کا گراف دیکھ رہا ہوں — اور کبھی جب وہ بھینگی نگاہوں سے دائیں بائیں دیکھتا ہوا (خاص طور پر الیکشن کے دنوں) کسی چوراہے پر نظر آتا ہے تو یوں محسوس ہوتا ہے گویا ایک اندھا کسی ہمدرد راہ گزر سے صحیح رستہ دکھانے کی گزارش کر رہا ہو — جانے یہ شخص کس مٹی کا بنا ہوا ہے! — (غالباً اسی مٹی کا جس سے اس ملک کی ... فیصدی آبادی بنی ہے —) آپ بھیمو کو قریب سے ... یا دہلی کے قطب مینار پر چڑھ کر دوربین سے تلاش ... وہ ہر زاویئے سے یا تو ایک مسخرہ نظر آتا ہے یا پھر کسی

اخبار میں چھپا آر کے لکشمن جی کا کارٹون۔ حالانکہ نہ تو اسکی ناک لمبی ہے اور نہ ہی وہ سرکس کا جوکر دکھائی دیتا ہے مگر پھر بھی آپ اسے پارلیمنٹ ہاؤس کی کھڑکی کھول کر دیکھیں یا اپنے گھر کے دریچوں سے جھانک کر دیکھیں بھیمو کارٹون ہی نظر آئے گا۔ بھلا ہو ان کارٹونوں کا کم از کم تفریح کا سامان تو مہیا کر دیتے ہیں۔ اس لحاظ سے بھیمو کو بھیمو دی کارٹون کہنا چاہیئے تھا مگر جب سے وہ اپنی اچھی بھلی پی ڈبلیو ڈی کی نوکری چھوڑ کر جذبات کی رو میں بہہ کر یا شاید جوش میں آ کر اور اپنے ہوش و حواس کھو کر مزدور پارٹی میں شامل ہو گیا تب سے ہر خواص و عام اسکو بھیمو دی پالیٹیشن کے نام سے پکارتے ہیں (ضمناً یہ بھی عرض کر دوں کہ پہلے پہل وہ اسی لقب سے سلگتا جاتا تھا یا پھر وہ حضرت مسیح کی طرح آہ بھر کر یوں لوگوں کو دیکھتا رہتا تھا جیسے اس کے ہاتھوں اور پیروں میں انہوں نے کیل ٹھونک دیئے ہوں اور مخالف پارٹی والوں نے سر پر کانٹوں کا تاج پہنا دیا ہو — بھگوان بخش دے ان موذیوں کو — وہ یہی بڑبڑاتا رہتا تھا۔ لیکن اپنے لقب کا زبردست امپیکٹ IMPACT دیکھ کر اس نے یہ نام بخوشی قبول کیا اور الیکشن میں اسی نام سے لڑنے کا فیصلہ کیا۔ آخر کیوں نہیں — کیوں نہیں۔ اخبار والے نے، دوکان دار نے، صفائی کرنے والے نے بچوں کی فیس مانگنے والے نے، مکان کا کرایہ مانگنے والے نے اور یہاں تک کہ بس کنڈکٹر نے جب بھیمو دی پالیٹیشن

کے نام سے آواز دی تو ظاہر ہے کہ مشہوری بیمار ہو پھیل گئی ہو
بھیو کو یقین ہے کہ وہ الیکشن جیت جائے گا اور اپنے دونوں
کی کشتی وہ جائے یا اکالی ملائے جانے سے والے کیوں ہے
کرتا ہے۔ کسی اور کو نہ سہی اپنی بیوی کو یقین دلایا ہے کہ وہ
اپنے خلوص اور صحت مند سیاست کی وجہ سے لوگوں کے دلوں
کی گہرائیوں میں اتر کر ویسی ہی جگہ پا گیا ہے جیسے سیپ
میں انمول موتی)

بھیو نوکری چھوڑ کر سیاست کے میدان میں کیوں کود
پڑا۔ یہ کہانی پھر سہی۔ (آخر کبھی نہ کبھی دن تو اس کی آٹوبیا
گرافی ضرور شائع ہوگی)۔ مگر ایک اچھے سیاست دان
کیلئے کیا ضروری ہے وہ اچھی طرح سے سمجھ گیا ہے۔ دراصل
یہی تو ہے ہمارے بیمار کی دانشوری کی پہچان۔ جی ہاں
وہ نہ صرف سارے اخبارات (ادھار پڑھتا) دنیا بھر کے جرائد
خرید کر پڑھتا رہتا ہے جیسے یہ سب اسکے سلیبس
میں شامل ہیں۔ گھر سے نکل کر بھی وہ
چلتے چلتے اخبار کا مطالعہ یوں کرتا رہتا ہے گویا امتحان کے
ہال میں داخل ہونے سے پہلے ریاضی کے چند فارمولے یاد کر
رہا ہو یا وہ بیمار ہو۔ فیشن شرٹ پتلون کی بجائے موٹی کھدر
کا کرتا پاجامہ پہن کر جب وہ سڑکوں پر گھومتا پھرتا نظر
آتا ہے تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کسی کھدر بھنڈار میں کوئی
ہوا [illegible] میں آکر دیش بھگتی کا پروپیگنڈا کر رہی ہو۔
اسکو دیکھ کر مجھے یوں لگتا ہے جیسے اس نے کرتا پاجامہ
نہیں پہن لیا ہے بلکہ کرتے اور پاجامے نے اسکو دبوچ ڈالا ہو
بالکل ویسے ہی جیسے انفلیشن (INFLATION) نے
ملک کو دبوچ لیا ہے ...)۔ اس کے علاوہ وہ
سمجھتا ہے کہ [illegible] کی ستم ظریفی پر اپنے تلخ
احساسات کا اظہار کرنے کیلئے چار مینار سگریٹ پیتے ہیں
اور جب بھی موقع ملے اپنی پارٹی اور خاص طور پر اپنے محبوب
لیڈر جناب میم سین کے حق میں قصیدے پڑھتے ہیں اور
وہ بھی ترنم میں۔ یعنی تیرے بنگلے میں اپوزیشن کا کیا کام ہے
اس کے جواب میں اسکو [illegible] یا جوتوں کی پٹائی سے دوچار

ہونا پڑتا ہے (جی ہاں ٹماٹر اور انڈے مہنگے ہیں نا اسی لئے
اس مہنگائی کے زمانے میں مخالفین بہت سمجھدار ہوگئے
ہیں۔ شکر ہے اتنی تو سوجھ بوجھ ہے کہ اپنی سکیم پر
کاربند ہو کر وار تو کر سکتے ہیں)

بھیو بیچارہ روز مار کھاتا ہے۔ اور لہولہان ہو کر
جب گھر لوٹتا ہے تب اپنی بیوی کے سوالات کے جوابات
یوں دیتا رہتا ہے گویا پریس کانفرنس دے رہا ہو۔
مثلاً بیوی نے سوال کیا کہ آخر تم کب تک جناب میم سین
کے لئے مار کھاتے رہو گے تو بھیو فوراً جواباً فرماتا ہے۔
بہت اچھا سوال کیا آپ نے محترمہ!

سیاست نئی کروٹ لے چکی ہے اور راؤ صاحب
کی حکومت سلوٹوں کے نیچے دب گئی ہے۔ دیکھنا
جناب میم سین صاحب ہی ہمارے وزیر اعلیٰ ہونگے۔
وہ صبح کبھی تو آئے گی۔ اور اسکے ساتھ ہی وہ مرحوم
ساحر کا گیت گنگنا کر یا تو رات بھر کروٹیں بدلتا رہتا ہے
یا پھر اسمبلی کے تمام ممبران کی فہرست سامنے رکھ کر یوں
چالیں چلتا ہے گویا ایک نئی حکومت کی تشکیل دے رہا
ہو۔ گویا میز پر کاغذ کے اوراق نہیں بلکہ شطرنج کی بساط
ہے۔ اس کے بعد وہ سو جاتا ہے یا بے ہوش ہو جاتا
ہے یہ کسی کو معلوم نہیں مگر اگلی صبح جب اس کی بیوی
اخبار دیتی ہے تب وہ یوں چونک پڑتا ہے گویا ریلوے
پلیٹ فارم پر سویا ہوا مسافر گاڑی کی چیخ سن کر جاگ
پڑا ہو۔ موٹی موٹی عینکیں پہن کر وہ اخبار کی سرخیاں یوں
دیکھتا رہتا ہے گویا چارلی چیپلن تیز موسیقی کی تھاپ پر
کسی سٹور کی چیزیں ہٹا ہٹا کر کھانے پینے کی چیزیں تلاش
کر رہا ہو۔ یعنی ٹوئیں۔ ٹوئیں۔ ٹوئیں۔ یا پھر چوہے کی
کٹر کٹر۔ لیکن ہاتھ پاؤں مارنے کے بعد وہ
اخبار کو دور پھینک کر یوں اپنا منہ چھپا لیتا ہے جیسے کسی
شکست خوردہ سپاہی نے بنکر میں اپنا آپ چھپا لیا ہو!
لیکن آج جب اس نے اخبار کی سرخی دیکھی [illegible] تو اس
خوشی کا غبارہ اچھل کر ایک [illegible] کی طرح [illegible]

کی بھیڑ میں چلا گیا اور وہاں جا کر وہ خلا باز راکیفس غیر ما کی طرح شہر والوں کو دیکھتا رہا۔ جہاں اسے اپنی پارٹی کا ہی جھنڈا خوبصورت نظر آ رہا ہے۔ اپوزیشن کے نیتا ہونے میں اور میرا لیڈر قلا آور ہے۔ ہوائیوں کرتے سو برسے اسکے ہاتھ میں اخبار تھمانے والا کوئی اور تھا۔ حالانکہ اپنی بیوی (اس کا چہرہ بھی تو لال پیلا ہوا کرتا تھا) کی بجائے اپنے پڑوسی اور کٹر مخالف شرارتی لال مطلبی کا چہرہ دیکھ کر گویا اس پر قہر ٹوٹ پڑا تھا۔ مگر آج شرارتی لال مطلبی کے چہرے پر خوف و ہراس کے تاثرات کی بجائے مسکراہٹ دیکھ کر وہ تذبذب میں پڑ گیا۔ غالباً اسی غیر معمولی کیفیت کے زیر اثر وہ گر کر بے ہوش ہو جاتا مگر اخبار کی سرخی دیکھ کر بھیو کو یوں محسوس ہوا جیسے سپرمین نے ایک کرین کی مدد سے اسکو ایک گہری کھائی سے نکال کر سنگھاسن پر بٹھا دیا۔ شرارتی لال مطلبی واقعی ایک فرمانبردار سیوک کی طرح اسکے سامنے کھڑا تھا اور بار بار اخبار کی سرخی پڑھ رہا تھا۔

ریاست کی سیاست میں ایک زبردست دھماکہ۔ مزدور پارٹی کے محبوب نیتا بھیو وزیر اعلیٰ۔

گویا شرارتی لال مطلبی ایک ڈھنڈورچی کی طرح آوازیں دیئے جا رہا تھا اور اس کے اردگرد لوگ جمع ہوتے جا رہے تھے۔

کمرہ تھوڑی دیر میں بھر گیا۔ لوگ تالیاں مار مار کر بھیو دی [illegible] کی کوشش کرتے رہے اور لوگوں کے ایک بھاری طوفان نے بھیو کی بیوی کو جانے کب اور کیسے منظر سے باہر دھکیل کر نکال دیا۔ ہر آواز میں یہی دو لفظ مبارک باد یوں گونج رہا تھا جیسے کسی جگراتا میں بے تالوں کے بول۔ اس آواز نے بھیو کے بچوں کی آواز کو بھی دبا ڈالا اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ مذاق اڑانے والے، بیہودگی کرنے والے، احمق کہنے والے بھی ہجوم میں شامل ہو کر جے جے کرنے لگے۔ دانشور طبقے نے بھیو کے ان بیانات (یعنی بقول انکے خرافات) کا از سر نو جائزہ لیا تو بھیو ایک سلجھے ہوئے سیاست دان کی شکل میں سامنے نظر آیا۔ یہ بات کھل کر سامنے آئی کہ بھیو جناب تلم تینی کا خاص آدمی ہے اور سیاسی زبان میں جانے پہچانے کچن کیبنٹ کا ممبر ہے۔ یعنی مشیر خاص۔ اس احساس نے ہوا کا رخ بدل دیا اور شہریوں کے علاوہ سرکاری افسر دوست، رشتے دار فیکٹری والے بھی ہجوم میں نظر آنے لگے اس کے بعد نجانے لوگوں کا ایک جھنڈ نظر آیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے شرارتی لال مطلبی خود ساختہ پرسنل سکریٹری کم پرائیویٹ سکریٹری کم قریب ترین دوست بن گیا اور اپنے چند ساتھیوں کی مدد سے (رسے کٹے جو عام طور پر بار اٹھانا کیلئے رکھے جاتے ہیں) بھیو کو یوں اٹھا کر لے گیا جیسے کہاروں نے پالکی اٹھائی ہو۔ دوسرے کمرے میں بھیو کے بچے بلک بلک کر رو رہے تھے تو کسی نے انکو باہر نکالا اور یہ کمرہ خاص ملاقاتیوں کیلئے رکھا گیا۔ کون اندر جائے گا یہ کام شرارتی لال مطلبی نے اپنے ہاتھ میں لیا۔ کافی چاہئے آپ کچن سنبھالیں۔ آپ بازار سے کچھ لائیں۔ آپ کولڈ ڈرنکس۔ آپ سگریٹ۔

گویا شرارتی لال بھی ایک اہم شخصیت بن کر نمودار ہوا۔ ظاہر ہے لوکل اخبارات کے نمائندوں نے جب شرف ملاقات حاصل کرنا چاہا تو شرارتی لال نے انکے سوالات کے جوابات دیئے۔

• جی ہاں۔ تمیم سین صاحب ایک ہوائی [illegible]
• جی ہاں وہ جانتے تھے کہ ہر ا سرکار ایک پٹھان کی طرح بکھر ریت کا ایک ڈھیر ہے۔ آندھی چلی اور ریت اڑ گیا۔
• جی ہاں۔ میرے پاس تاریخ لکھی ہوئی ہے۔ سو وہ صدا درست ہیں کوئی اور وہ بھی کسی تاثر کی مدد کے بغیر۔
• وہ ہماں منسٹر کیوں۔ جناب کیبنٹ منسٹر بن جائیں گے۔
• [illegible] صاحب۔ پریس سکریٹری کیوں۔ چونکہ [illegible] آپ کو دراصل اس عظیم مجاہد کی قربانیوں کے

ہارنے میں ذرا سی بھی علمیت نہیں ہے

"انڈوں کی بات نہیں صاحب۔ ڈنڈے کھاتے ہیں۔ گالیوں کا ذکر فضول ہے۔ گولیوں کی بات کیجئے۔ ان کا نام ٹوپ ہٹ لسٹ میں تھا۔"

"ارے بھائی اپوزیشن کی بات کر رہے ہیں آپ یا۔ راہ صاحب کی بات کر رہے ہیں آپ ۔۔۔؟۔ یہ فیصلہ ہم بہت پہلے کر چکے ہیں کہ سانپ کو بل میں پیچھے سے پہلے ہی کچلا جائے گا۔"

اور یوں مطلبی صاحب خود ساختہ پالیسی پلاننگ کے چیئرمین بن گئے، اور وہ بھیمو کے سامنے بھی یوں احساس دلاتے رہے گویا وہ فقط ہونٹ ہلاتے ہیں جبکہ پلے بیک شرارتی لال مطلبی ہی ڈالے رہے ہیں ۔۔۔ اور پھر بھیمو کو نمبر دس کی اٹھا کر دو چند اہم مذاکرات کیلئے کسی ڈاک بنگلے میں چلے گئے۔ جہاں اچانک چند اور مخالف نیتا یوں سر بگٹ ہو گئے جیسے کھانڈ کو دیکھ کر چیونٹیاں ۔۔۔۔ بے لوث خدمت اور اسپشن کتوں جیسی وفاداری کا یقین دلا کر انہوں نے فوراً مزدور پارٹی میں شامل ہونے کی درخواستیں دیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے بھیمو کو سپشن دیکھنے کیلئے ایک کمیٹی بنا لی ۔۔۔ پھر ایک ویلفیئر کمیٹی بنا ڈالی ۔ اور درخواستوں کا ایک انبار پیش کیا۔

سفر کی تیاریاں ہونے لگیں۔ فیصلہ یہ ہوا کہ حلف لینے کے بعد بھیمو کو واپس اپنے شہر میں لایا جائے گا۔ ایک جلوس کی شکل میں۔ ساتھ جانے والوں کے لسٹ یوں تیار ہونے لگے گویا باراتیوں کی فہرست بن رہی تھی اس لسٹ میں بھیمو کے بیوی بچوں کا نام نہیں تھا۔ اور دھنا ستو موچی کا نام تھا جو بھیمو کا قریب ترین ساتھی تھا۔ دس عدد کاریں۔ ایک درجن ٹیکسیاں۔ ۵ عدد بسیں [illegible] بسیں ڈاک بنگلے کے باہر تیار کھڑی تھیں ریسپشن کمیٹی کے ممبر [illegible] جب بھیمو کئی رات اپنے گھر لوٹا تو [illegible] ہوا جیسے سارے گھر پر بھاری ہو چکی تھی [illegible] کے باہر سو رہی تھی اور بچے غسل خانے میں سو رہے تھے۔

یوں تو وہ جاگ جاگ کر راتیں گزارنے کا عادی ہو چکا ہے مگر یہ رات کیسے کٹ گئی اسکو پتا نہیں چلا۔ شاید اس لئے بھی کہ وہ ان ضرورت مندوں کی لسٹیں تیار کرتا رہا جن کو اس نے بھوک سے مرتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس کے پاس ان کی درخواستیں تھیں۔ ملازمت کیلئے درخواست۔ کالجوں میں داخلوں کی درخواستیں۔ ننگے لوگوں کی درخواستیں۔ پر بھٹکتے ہوئے مزدوروں کی درخواستیں۔ راشن کیلئے درخواستیں۔ یتیموں کی درخواستیں۔ بیواؤں کی آہ و زاریاں۔ پنشنروں کی آہیں ۔۔۔ گویا پلاسٹک کے برتنوں کی طرح ایک ہی ڈیزائن میں رنگ برنگی درخواستیں۔

صبح سویرے جب حسب دستور اس کی بیوی نے اس کے ہاتھ میں اخبار تھما دیا تو اس کو یوں لگا بادِ صرصر نے اس کے سرہانے کے نیچے رکھی تمام درخواستوں کو اڑا دیا۔ ایک کارواں بکھر کر ایک ہجوم کی شکل اختیار کر گیا۔ گویا ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔

اس کا حلق سوکھ گیا اور اخبار کی سرخی کو نظر انداز کر کے اس نے ریڈیو آن کر دیا۔ تفصیلی خبریں نشر ہو چکی تھی۔ مگر اہم خبروں کا خلاصہ جاری تھا۔ ان میں ایک اہم خبر یہ بھی تھی کہ مزدور پارٹی کے نیتا جیا سین نے اس خبر کی سخت الفاظ میں تردید کی ہے کہ پارٹی سرکار سے الگ ہو گئی ہے۔

اپنے تھر تھراتے ہونٹوں پر قابو پا کر جب اس نے اخبار میں تفصیل پڑھی تو اس پر گویا بجلی گر گئی۔ بھیمو دادا کو انٹی پارٹی حرکتوں کی وجہ سے پارٹی سے خارج کیا گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ چیخ پڑتا۔ شرارتی لال مطلبی کمرے میں داخل ہو گیا۔ مگر اس سے پہلے کہ بھیمو اپنا حال دل سناتا شرارتی لال نے اپنے نوکروں کو وہ کرسیاں اور میز واپس لینے کو کہا جو پہلے اس نے صوفہ اور منشر کو آنے والے معزز مہمانوں کی تواضع کیلئے بطور تحفہ پیش کیں تھیں۔

نئی کتابوں کا تعارف

کتاب کا نام : حکم نامہ (شعری مجموعہ)
فن کار کا نام : سلطان سبحانی
مبصر : ڈاکٹر محمد مثنیٰ

حکم نامہ سلطان سبحانی کا مجموعہ کلام ہے جو انکی غزلوں اور نظموں پر مشتمل ہے۔ سلطان سبحانی ایک جانے پہچانے جدید شاعر ہیں جن کی نظمیں اور غزلیں اردو کے موقر جرائد میں شائع ہو کر ارباب نظر سے خراج تحسین وصول کر چکی ہیں۔ ان کے کلام کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے جو کچھ کہا ہے وہ اُن کے ذاتی تجربات احساسات اور تاثرات کا نتیجہ ہے۔ وہ اپنے دور کی پیچیدگیوں اور الجھنوں کا شعور رکھتے ہیں اور اپنے تجربوں کو تخلیقی اور موثر زبان میں منتقل کر دینے کا سلیقہ بھی انہیں آتا ہے۔ ان کا کلام فرسودہ اور رسمی انداز کی باتوں سے پاک ہے۔ ان کی شاعری میں تازگی اور نئے پن کا احساس پایا جاتا ہے اسی لئے وہ سنجیدہ قاری کو اپنی طرف بہت جلد متوجہ کر لیتی ہے۔ "سلام" "منظر" "اگر میں نہیں پڑوں" "محتسب" "ابدیت کی طرف" "ایک شعر" خاص طور پر قابل ذکر نظمیں ہیں۔ ان میں شاعر کی انسان دوستی کا شعور بہت بیدار ہے۔ طرز احساس میں ندرت اور شدت ہے اور پیکر سازی میں پختگی ہے۔ نظموں کی طرح ان کی غزلیں بھی فرسودگی اور رسمیت سے بڑی حد تک محفوظ ہیں اور ایک نئے انداز اور تیور کا پتہ دیتی ہیں۔ کتاب کے شروع میں ڈاکٹر وحید آغا کا مختصر مگر جامع پیش لفظ شامل ہے جس نے کتاب کی افادیت میں اضافہ کر دیا ہے۔ ہر اعتبار سے کتاب دلکش اور دیدہ زیب ہے۔ بیس روپے میں ہند پاک پبلیکیشنز ۱۹۳ - ایم ایچ - بی کالونی، مالیگاؤں سے مل سکتی ہے۔

ڈاکٹر محمد مثنیٰ رضوی

نام رسالہ : سہیل (ایک شمارہ شفیع مشہدی کے نام)
صفحات : ۱۲۰ - قیمت ۲۰ روپے
مبصر : جاوید حیات

ماہنامہ سہیل نے تقریباً ہر ماہ ایک شمارہ کسی ایک فنکار کے نام مخصوص کر کے عصری تخلیقات اور معاصر فنکاروں کی شناخت اور ان کے انفرادی مطالعہ کا جو سلسلہ شروع کیا ہے وہ بلا شبہ اپنی اہمیت و افادیت کے اعتبار سے عصری ادب کے لئے تاریخ ساز ہے۔ اس اہم سلسلے کی ایک اہم کڑی جون جولائی ۱۹۸۰ کا مشترکہ شمارہ بھی ہے جو "سہیل" کے اپنے ہی شہر گیا سے تعلق رکھنے والے مشہور و معروف تخلیقی فنکار شفیع مشہدی کی شخصیت اور ان کے فکر و فن کے مطالعہ کے لئے مخصوص ہے۔

شفیع مشہدی ایک ایسے فنکار کا نام ہے جس نے اپنے سفر کی ابتدا سے ہی اپنی ایک الگ پہچان اور منفرد شناخت قائم کی ہے۔ جس دور میں کرشن چندر، خواجہ احمد عباس، عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر، رام لعل وغیرہ جیسے مشہور تخلیق کاروں کی کہانیاں رسالوں کے صفحات میں شائع ہو کر مقبول عام ہو رہی تھیں اور کہانیوں میں ایک مخصوص مزاج و معیار کے اعتبار سے پرکھا جا رہا تھا، جو مقبول تھا اس زمانے میں شفیع مشہدی نے اس

وسیلے کے حیلے سے اپنے تخلیقی سفر کی باضابطہ ابتدا کی اور ۱۹۶۲ء میں جب ان کی ایک خوبصورت کہانی "خون جگر ہونے تک" بیسویں صدی میں شائع ہوئی تو اس نے قارئین کے حلقے میں کھلبلی مچا دی اور پھر تیر نیم کش، در نیم باز، "زخم" اور "ناخن اور آگ" جیسی کہانیوں نے ان کی انفرادیت کا سکہ منوا لیا بیسویں صدی کے مخصوص مزاج کے پیش نظر رومانیت ان کہانیوں کا خاص موضوع ہوا کرتا لیکن رومانیت کے پس منظر میں سماجی رشتوں اور دیگر معاشرتی پہلو کو بھی نہایت ہی فنکارانہ انداز میں اجاگر کیا گیا ہے جو میرے خیال میں شفیع مشہدی کے فن کا کمال ہے جن کے افسانوں میں انسان کے نفسیاتی کش مکش، الجھاؤ بکھراؤ اور تضاد دیکھنے کو ملتی ہیں۔ کرچیاں، سلوٹیں گرتی دیواریں، اور پھر درویش جیسی خوبصورت اور معیاری کہانیوں کے ذریعہ شفیع مشہدی بہت جلد اپنی منفرد شناخت قائم کر لی۔ پھر ایسا ہوا کہ بیسویں صدی ۶۰ء کے افسانوں کو اچھوت سمجھا جانے لگا اور افسانہ نگاری کے فن کو بیانیہ روایت سے الگ ہٹا کر علامتی، استعاراتی اور تجریدی رنگوں سے ہم آمیز کیا جانے لگا۔ نئے تجربات کی بنا پر نئی روایت کی تشکیل کی کوششیں کی جانے لگیں تو شفیع مشہدی نے بھی اس کی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے شونا، برف اور دشتی کی آگ جیسے افسانے لکھے لیکن اس تجرباتی دور میں بھی انہوں نے بقول ڈاکٹر مظہر محسن "کھوکھلی بیان بازیاں نہیں چھانٹیں" اور بعض دوسرے افسانہ نگاروں کی طرح افسانہ کو معمہ بنانے کی بجائے ان عصر حاضر کی تمام تر کیفیتوں کا ترجمان [illegible] طرح بنایا کہ علامتی اور استعاراتی انداز [illegible] کے باوجود افسانویت کا احساس ہوتا ہے چنانچہ اس سلسلے میں ان کے افسانے جلوس، گرد، سبز رنگ آسمان کا استغنا، عروج آدم وغیرہ قابل ذکر اس [illegible] لکھے ہیں کہ جیسے جیسے ان کا سیاسی سماجی اور

معاشی تصور بیدار ہوتا گیا حیات و کائنات دماغ اور جستجو و آرزو کا عرفان حاصل ہوتا گیا تو ان میں وسعت گہرائی اور گیرائی پیدا ہوتی گئی۔ تک کہ کسی ایک صنف کے محدود دائرے میں وسعت کو سمیٹ پانا ناممکن سا ہو گیا چنانچہ نگاری سے آگے بڑھ کر ڈرامہ، شاعری اور دیگر شعبوں میں بھی ان کے خلاقانہ جوہر کھلنے لگے افسانہ نگاری کی طرح انہوں نے بہت جلد شاعری میں بھی اپنی ایک IDENTIFY چنانچہ ان کے افسانوی مجموعہ "شاخ لہو" کے بعد ڈراموں کا انتخاب "دوپہر کے بعد" بھی منظر عام پر

ایک ایسے دور میں جب گھر گھر T.V کے چرچے ڈرامہ ہی ایک ایسی صنف ہے جو آج کی ضرورت ہم آہنگ ہے کیونکہ اب تو افسانوں کو بھی اس کو تبدیل کر کے اس کی FILM T.V. تیار کی لیکن اردو میں اس صنف کی طرف کبھی بھی خا توجہ نہیں دی گئی جو ڈرامے لکھے بھی گئے تو ا کی حیثیت سے اور اس کے عملی پہلوؤں کی کبھی بھی دھیان نہیں دیا گیا اور بہت کم ڈرا کی منزل تک پہنچ سکے۔ ایسے میں شفیع مشہدی فن کی طرف متوجہ ہونا ان کی بصارت اور ان کی فراست کا ثبوت ہے۔ گرچہ انہوں نے جو ڈرامے وہ بنیادی طور پر ریڈیائی ڈرامے ہیں جن کا تعلق اور نشریات سے ہے اسٹیج سے نہیں لیکن انہوں نے ڈرامہ نگاری کے تمام تر فنی اور تقاضوں کو کچھ اس طرح ملحوظ خاطر رکھا ہے کہ ا پر لے آنا بھی کوئی مشکل نہیں بلکہ اس [illegible] ایک ڈرامہ "مٹھی بھر خاک" ۱۹۸۸ء میں [illegible] کامیابی کے ساتھ پیش کیا جا چکا ہے

اس کے علاوہ ایک [illegible]

کے ذریعہ شہرت حاصل کر چکا ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ شفیع مشہدی محض ادبی مقالے نہیں لکھتے بلکہ فن ڈرامہ نگاری پر انہیں پوری گرفت حاصل ہے۔ اپنے افسانوں کی طرح ڈراموں میں انھوں نے معاصر زندگی کے مختلف پہلوؤں کی نقاب کشائی کی۔ ان کے ڈرامے زندگی کی متضاد کیفیتوں اور ان کی کشمکش کا بصیرت افروز ترجمانی کرتے ہیں۔

زندگی کی مختلف المیت جہتوں اور بے شمار پہلوؤں سے متعلق ان کے تجربات اور ان کی فنکارانہ بصیرت کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ ڈرامے کے حدود کو پھلانگتا ہوا جب شاعری کے حدود میں داخل ہوتا ہے تو وہاں بھی اپنی عصری حسیت، اپنی معلومیت اور اپنی انفرادیت کا سکہ جما لیتا ہے۔ اکثر فنکاروں کی بھیڑ میں ان کا فن اپنے آپ میں منفرد اور بے مثال نظر آتا ہے اس سلسلے میں خود ان کا اپنا ایک شعر ان کی شاعرانہ انفرادیت کی کچھ اس طرح ترجمانی کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے کہ ؎

چلوس نعرے لگاتے گذرتے رہے
فراز دار یہ لیکن ربی اکیلا تھا

جدیدیت کی لہر میں انسانیت کی گم شدہ شناخت اور ذات کا المیہ شفیع مشہدی کی شاعری کا بنیادی موضوع ہے جسے انھوں نے نہایت ہی خوبصورت پیکر عطا کیا ہے۔ ملاحظہ ہو چند اشعار:

نگار خانے میں بے چہرگی کا میلا تھا
میں زرق برق مناظر میں بھی اکیلا تھا

ہم اپنے قتل کا الزام کس کے سر دیتے
زمانہ بھر کی نگاہ تھا میں وہ میلا تھا

جسم کے زخم تو سب دیکھتے ہیں روح کے گھاؤ دکھائے کس کو
سب صلیب اپنے نوحہ خواں ہیں درد کی صلیب اٹھائے کون

درد کی یہ صلیب خود مشہدی نے اٹھالی ہے جس کا نتیجہ ہے کہ ان کی شخصیت بھی صلیب کے چار خانوں کی طرح فن کے چار خانوں میں تقسیم ہو کر رہ گئی ہے۔ افسانہ، ڈرامہ اور شاعری کے علاوہ بقول یوسف جمال :-

شفیع مشہدی ہنسی اور انشائیے بھی لکھتے ہیں ...... تاریخ ہند میں ایسا اجتماع ضدین صرف محمد بن تغلق کے حصے میں آیا تھا تاریخ ادب اردو میں شفیع مشہدی ان کا جواب ہیں۔ فرق یہ ہے کہ انھوں نے اپنا مقام دولت آباد نہیں عظیم آباد کو بنایا ہے۔

شفیع مشہدی کی یہ ہفت رنگ شخصیت ان کی ایک نظم برگد کے درج ذیل شعر کے مصداق ہے ؎

سلگتی دھوپ میں برگد کا یہ عظیم شجر
مسافروں کی تھکن چن رہا ہے برسوں سے

معاصر ادب میں شفیع مشہدی کی حیثیت اسی برگد کے درخت کے مانند ہے جس کی عظمت کے اعتراف کے طور پر سہیل کا یہ خصوصی شمارہ ان کے فکر کے سنگ میل کی نشاندہی کر رہا ہے۔

شفیع مشہدی کے انٹرویو، ان کے افسانے، ڈرامے اور شاعری کے نمائندہ انتخاب اور ان کے فن کے مختلف پہلوؤں پر شمس الرحمٰن فاروقی، نسیم صدیقی، کلام حیدری، ڈاکٹر قمر اعظم ہاشمی، ڈاکٹر نسیم عجبوری، ڈاکٹر علیم اللہ حالی، ڈاکٹر اعجاز علی، وہاب اشرفی، سید احمد قادری کی تنقیدی نگارشات کے علاوہ ذکیہ مشہدی، یوسف ناظم، رضا نقوی واہی، مجتبیٰ حسین اور مشتاق احمد نوری کے ذاتی تاثرات و احساسات پر مبنی شفیع مشہدی کی شخصیت کے مختلف رنگوں کو نمایاں کرتے ہوئے خاکوں پر مشتمل یہ خصوصی شمارہ شفیع مشہدی کے فن کی انفرادی شناخت کا اعتراف ہے اور عصری ادب کی تاریخ میں سہیل کی اس کارگذاری کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

٭ ٭ ٭

ہمیشہ نئی!

ہمیشہ جوان!!

مقبولِ عام - ممتاز - مستند - دیدہ زیب اور کارآمد

بخشی جنتری ۱۹۸۶ء

اپنی تمام خصوصیتوں کے ساتھ پیشِ خدمت ہے۔

براہِ راست ہم سے یا
اپنے قریب اسٹاکسٹ سے حاصل کیجئے

ایس اے بخشی کمپنی

۳۲ مولانا شوکت علی (کولوٹولہ) اسٹریٹ کلکتہ

شہرِ خیال

آپ نے ہند و پاک کے عظیم شاعر حضرت اقبال پر
مضامین شائع کئے ہیں۔ ان میں
ناچیز دستوگی کا جو قابلہ ادب مضمون بہت پسند
آیا۔ عظیم فیروز آبادی کے خطوط میں جس طرح —
انہیں شائع کیا ہے وہ اس کے مستحق بھی تھے
کہ انہوں نے ڈاکٹر مغنی کو بھی نہیں بخشا۔ واقعی یہ آپ
بہت دور اندیش، مصلحت انگیز اور دلچسپ مذاکرہ

خواجہ عبد الرزاق ۔ جمشید پور

یہیں کی خصوصی پیش کش " ایک مطالعہ شفیع مشہدی
نام " پیش نظر ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہیں
خصوصی شمارہ مشہدی کے فن کا خوبصورت اعتراف

یہ بات قطعی طور پر کہی جا سکتی ہے کہ کوئی فنکار
صرف اچھی کہانیاں ہی نہیں لکھتا — بلکہ وہ اچھی سے
اچھی اور بری سے بہت بری کہانیاں بھی لکھتا
جس طرح کوئی ماں بالکل یکساں شکل کا بچہ پیدا
نہیں کر سکتی۔ کوئی گورا، کوئی کالا، کسی کے نقوش
اچھے اور کسی کے بھدے بھی ہو سکتے ہیں — کیونکہ تخلیق
عمل اس کی شعوری کوشش نہیں ہوتی۔

اسی طرح مشہدی بھی خوبیوں اور خامیوں سے
خالی نہیں۔ میں یہ ہرگز نہیں کہوں گا کہ ان کی ساری کہانیاں
معیاری ہیں۔ بلکہ یہ ضرور کہوں گا کہ انہوں نے ایسے افسانے
لکھے ہیں جن میں تخلیقی ضرورت ہے جو سنگ میل کا درجہ رکھتے ہیں
کہ ڈاکٹر عبد القیوم نے مشہدی کی کچھ کہانیوں
کا تجزیہ کرتے ہوئے ان کی شناخت متعین کرنے کی کوشش
کی ہے۔ عنوان ہے " شفیع مشہدی کے چند افسانے " ہے۔

اب بیدی ڈاکٹر موصوف کی مرضی پر منحصر تھا کہ وہ ان کے "
افسانوں میں کن افسانوں کا انتخاب کرتے ہیں۔

ویسے بھی کسی بھی فنکار کے فن کا تجزیہ کرنے سے پہلے
اس کی دونوں قسم کی چیزوں کو سامنے رکھنا ضروری
ہے۔ تاکہ فنکار کی صحیح شناخت ہو۔

مگر موصوف نے مشہدی کی صرف ان کہانیوں کو
جس میں انہیں کچھ نہ کچھ خامی نظر آئی ہے۔ آپ نے اداریہ
لوٹ میں بھی کہانیوں کا ذکر کیا تھا مگر ڈاکٹر موصوف ان
کہانیوں کو بھی پڑھتے یا تجزیہ کرنے کی زحمت کرتے تو انہیں اپنے آرا میں تبدیلی کرنا ناگزیر ہو جاتا —

پھر بھی یہ قطعی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ موصوف کردہ
کہانیاں بھی پسند ہی کی نہیں کیونکہ وہ چوٹی کا افسانہ نگاروں
کی کہانیوں سے بھی مایوس نہیں جیسے کہ اعتراف انہوں
نے خود ہی کیا ہے۔

ہندوستان میں اردو کہانیوں کیلئے منحوس
ترین دہائی ہے۔ اس پوری دہائی میں جس کے ایک حصے
تقریباً سال اب گذرنے کو ہیں کوئی بھی ایسی شاہکار کہانی
سامنے نہیں آئی ہے ——— ؟

ایسی صورت میں بیچارے مشہدی کی کیا حیثیت
ہے کیونکہ پچھلی دہائی میں افسانہ نگار جھلک دکھاتے رہے
ہیں۔ لیکن پوری دہائی کو صرف ایک "دور" میں سمیٹنا
میری سمجھ میں نہیں آتا۔ دنیا کو کوزہ میں سمیٹنا تو تھا
مگر دہائی کو دن میں قید کرنا پہلی بار دیکھ رہا ہوں۔ دہائی تو
دہائی ہوتی ہے ——— دس سالوں پر محیط ——— ایسے ایک
دن میں کیونکر سمیٹا جا سکتا ہے ——— ؟ کیا سے منحوس
ترین دہائی نہیں کہا جا سکتا تھا ——— ؟

خیر مجھے اس سے بحث نہیں ہے کہ وہ کتنی دہائی منحوس
ترین ہے ——— یا نہیں یا صرف منحوس ہے، منحوس ترین
دہائی ماضی میں گم ہو چکی ہے ——— یہاں بات مشہدی
کے افسانے کی ہو رہی ہے۔

سب سے پہلے ڈاکٹر موصوف کو صرف افسانے تقدیر

پیش ہوکہ اس کی پیش کش اچھی ہے ــــ اور خامی یہ کہ قاری آخر آتے آتے کہانی پڑھنے والا قاری ــــ یہ رک کر سوچنے پر مجبور ہوتا ہے کہ کیا واقعی سبز پرندے نہیں آئیں گے ــــ اور پھر مطمئن ہو جاتا ہے کہ میرے ذمہ کرنے کو یہ کام نہیں ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا ہر قاری یہی محسوس کرتا ہے کہ اسے کرنے کا یہ کام نہیں ہے ــــ؟ اور کیا صرف وہی کہانی شاہکار ہو سکتی ہے جس میں قاری کے ذریعہ کرنے کے لئے کچھ کام ہو۔ باقی ساری کہانی رد ہو جائے گی؟ نہیں بھائی ایسی بات نہیں ہے۔ کوئی کہانی جیسے ہی قاری کے احساس کو جھنجھوڑتی ہے یا جذبات کو گدگداتی ہے۔ ویسے ہی اپنی کامیابی کا علم بھی گاڑ دیتی ہے۔ قاری کے کچھ کرنے کے لئے اس کا بیدار ہو جانا ہی کافی ہے۔

اور یہ بھی تو ضروری نہیں کہ سبز پرندوں کا انتظار ہی کیا جائے ــــ بلکہ یہاں سبز پرندوں کی علامت تو یہ کہتی ہے کہ اب سبز پرندے نہیں آئیں گے یہ پرندوں کا زمانہ بھی نہیں ہے ــــ اس لئے ان کا انتظار ضروری نہیں ہے بلکہ اب خود ہی کچھ کر گذرنے کا زمانہ ہے ــــ اس لئے یہیں ہی سبز پرندوں کی ذمہ داری نبھانی ہے اور سیاہ خوف سے اپنی بلند و بالا عمارت کو محفوظ رکھنے کی تدبیر سوچنی ہے ــــ تعجب ہے اتنی آسان سی بات ان کی گرفت سے کیونکر پھسل گئی ــــ؟

مشہدی نے ہمیشہ کہانی کی تعمیر سماج کے ہی کسی نہ کسی طبقے سے اٹھایا ہے۔ ٹوٹتے اقدار کی انہیں کتنی فکر ہے۔ اس کا اندازہ گرتی دیوار اور خطوط کے انتظار کیا جا سکتا ہے۔ اقدار کے بگڑنے سے بھی وہ پریشان ہیں اسکی گواہی عروج آدم سے مل جائے گی ــــ

تعلیم یافتہ کا مرکزی کردار "خلیفہ جی" زندگی بھر کفن سلائی کی اجرت نہیں لیتا ــــ اور اس نہ لینے میں ہمیشہ ایک فخر اور سکون محسوس کرتا ہے ــــ مگر حالات کے ہاتھوں وہ کس طرح مجبور ہو جاتا ہے کہ وہ اجرت لینے پر مجبور ہوتا ہے۔ اس وقت اس کے دل کی کیا حالت ہوتی ہے یہی

کا اور اعادہ تو لگتے ــــ ٹوٹے کا انگار کا ماموں ــــ کیا تھے کیا ہو گئے ــــ زمانے نے کہاں لا کر پٹکا ــــ وہ شان و شوکت کہاں ہو گئی ــــ اور وہ رکشہ چلانے پر مجبور ہو گئے ــــ "سیڑھیں" کی ہیروئن کس طرح کتنی نسلوں کی نمائندہ کرتی ہے۔ وہ کن پریشانیوں اور بے بسی کا شکار ہے اس کے درد کو بھی محسوس کیجئے ــــ

فرد ولیش کا کلو، مفلسی کی زنجیروں میں جکڑا جنسی نا آسودگی کو کس طرح جھیلتا ہے ــــ "دو بوند ایک سانپ" کا مرکزی کی آسودگی کس طرح زہر ہو جاتی ہے۔ اس کا درد اور شک کس طرح اسے ذہنی خلل میں پریشان کرتا ہے۔ "الالسیم کو پاکر" ہونے والا فنکار پھر کس طرح اپنی نا آسودگی کا شکار ہے ــــ؟ اس کی خودکشی کا ذمہ دار کون ہے ــــ اس کی زندگی میں زہر گھولنے والا راکیش بھی تو اسی سماج کا ایک فرد ہے ــــ!

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ مشہدی نے کہانی لکھتے ہمیشہ اس سوال کو سامنے رکھا ہے کہ وہ کیا لکھتے ہیں ــــ اور کیا وہ اپنے کرداروں کے ساتھ انصاف کر سکا ہے ــــ یہ سوال بھی مشہدی کے سامنے رہا۔ ان کی حالیہ کہانی "جلدی کرو" عصر حاضر کی بے حسی و بربریت کی تازہ مثال ہے۔

اب وہی بات ریڈ لائٹ ایریا کی منی بائی روم کی ــــ یا جھونپڑی میں رہ کر روزانہ کتنے لڑکیوں کے اندر جھانک کر دیکھنے کی ــــ کیا بہت ضروری ہے ــــ؟ اور کیا یہ کچھ ضروری ہے جو منٹو اور غیاث احمد گدی کر چکے ہیں وہی کیا جائے ان کی پیروی لازم و ملزوم تو نہیں ــــ؟ رہی کرداروں کی زندگی میں جھانکنے کی بات ــــ تو خلیفہ جی، عزیز ماموں اور کلو کی زندگی میں کیوں نہ جھانکا جائے ــــ؟ وہاں بھی تو زندگی کی حرارت ہے!

سیال مادہ رواں دواں ہے جو زندگی کی علامت ہے۔

ویسے ڈاکٹر ابدالی مشہدی کے فن سے مایوس ہرگز نہیں ہیں —— کیونکہ انھوں نے خود ہی اس کا اعتراف کیا ہے۔

ویسے ڈاکٹر ابدالی مشہدی کے فن سے مایوس ہرگز نہیں ہیں —— کیونکہ انھوں نے خود ہی اس کا اعتراف کیا ہے۔

ان تمام باتوں کے باوجود شفیع مشہدی کا اسلوب اپنے اندر ایک کشش رکھتا ہے ان کی ایسی بہت سی کہانیاں مجھے یاد آرہی ہیں جہاں ابھی زندگی کا سیال مادہ رواں دواں ہے —— "کاش جو کہانیاں ابدالی صاحب کو یاد آرہی تھیں ان کا تجزیہ بھی موصوف کیا ہوتا —— !

مشہدی کی ادبی شخصیت بہت سے خانوں میں بٹی ہوئی ہے۔ اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ وہ مناظر عاشق ہرگانوی کی طرح ہر فن مولا ہونا چاہتے ہیں۔

افسانہ نگاری سے ادبی آسمان پر ابھرنے والے شاعری، ڈرامہ نگاری اور طنز و مزاح پر قلم چلانے والا فنکار کہیں گرد دکھائی نہیں دیتا۔ [illegible] کی مثال ہے —— ان کے ڈرامے خود ہی چیخ چیخ کر کہہ رہے ہیں کہ ان میں عصر حاضر کے ڈرامہ نگاروں سے لوہا لینے کی صلاحیت موجود ہے۔

اور جہاں تک شاعری کا سوال ہے —— وہ اپنے ذوق کی تسکین کے لئے شاعری کی زلف کی پناہ لیتے ہیں اس کا اعتراف انھوں نے کئی جگہ کیا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ کچھ لوگ انہیں بڑا افسانہ نگار سے بڑا شاعر مانتے ہیں۔

[illegible]

ایک شمارہ شفیع مشہدی کے نام موصول ہوا۔ بہت اچھا ہے۔ دیکھ کر خوشی ہوئی میری جانب سے مبارکباد قبول فرمائیں۔ اس بات سے اور بھی خوشی ہوئی ہے کہ اب رسالے کی کتابت و طباعت پہلے کے مقابلے میں بہت بہتر ہے خوب سے خوب تر کی کوشش جاری رکھیں۔

صاحب صلاحیت فن کاروں کو ان کی زندگی میں انھیں خراج تحسین پیش کرنے اور عوام کو ان کے فن و شخصیت سے روشناس کرانے کا یہ سلسلہ مستحق اور باعث مسرت ہے۔ کیونکہ اردو سنوارنے والوں کی ادبی خدمات کا یہ ایک ٹھوس اعتراف ہے۔ اس سے جہاں صاحب صلاحیت فنکاروں کی ہمت افزائی ہوگی وہیں اچھے لکھنے والوں کا نام اردو ادب کی تاریخ میں محفوظ ہو جائے گا۔ یہ بہت بڑی بات ہے۔ اس عمل سے سب سے بڑا فائدہ تحقیق کرنے والوں کو پہنچے گا اور ان کی راہ میں آسانیاں پیدا ہوں گی۔

زیر نظر خصوصی نمبر میں "شفیع مشہدی صاحب سے ایک ادبی ملاقات" بہت کامیاب ہے۔ موصوف کے فن و شخصیت کے بارے میں ایک واضح تصویر ذہن میں ابھر آتی ہے۔

محترمہ ذکیہ مشہدی کا "دھرم سنکٹ" خاصے کی چیز ہے۔ دلچسپ بھی اور بیوی کی آنکھوں سے شوہر کی شخصیت کا ایک فنکارانہ جائزہ بھی۔ ذکیہ صاحبہ اس "دھرم سنکٹ" سے بڑی کامیابی کے ساتھ نکل گئی ہیں۔ میری طرف سے انہیں مبارکباد دیجئے گا۔ بحیثیت مجموعی یہ شمارہ بہت کامیاب ہے اور ادارے نے اس کی تکمیل میں بڑی محنت کی ہے۔ والسلام

حسن نجمی سکندرپوری

مبارکباد دینا چاہتا ہوں کہ آپ نے شفیع مشہدی نمبر نکالا۔ یقیناً بہار کے لئے یہ فخر کی بات ہے کہ آپ جیسے لوگ اب بھی یہاں موجود ہیں جو ادبی دنیا کے تقاضوں اور خلوص کے ساتھ مکمل طور پر کسی فنکار کو پوری ادبی دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں ورنہ ستم کے دور میں ایسا کون

کرتے ہیں۔ سب اپنے حصار ہی کے قیدی ہیں۔
فیصل عجیمی جدید نظم بیانیہ کے دو سٹرفوری اور یو
افرنشاہوں کے لئے بھی ایک تحریک کی طرح ابھرا ہے۔
تہذیب ہر نقش میں منتقل ہوتا ہے یہ دکھا ہے
قاسم خورشید (پٹنہ)

تازہ شمارہ (اگست) سہیل نظر نواز ہوا۔ سرسری دیکھنے سے یہ احساس ہوا کہ گویا آپ نے کوزے میں سمندر بند کرنے کی کوشش کی ہے۔ شام بارک پوری، خورشید ملک کو ان کی تخلیقات ڈارلنگ اور صلے کے لئے مبارکباد۔ انہیں افسانوں کی نظم دوسری سمت کا سفر واقعی قابل داد ہے۔ غزلیں بھی اپنی اہمیت رکھتی ہیں۔ نشتر خانقاہی، کرشن بہاری اور فضا ابن فیضی، آسی رام نگری، محمودہ نظمی، لالہ مظہری اور عالم خورشید کافی حد تک اپنی بات اور حالات کی عکاسی کرتے ہیں۔ ہاں کہیں کہیں کتابت کی خامی رہ گئی ہے۔ آئندہ شمارے میں شمارہ بہت ہی عمدہ ہو جائے گا۔
ناقد نظمی (جمشید پور)

سہیل کا اگست ۱۹۸۵ء شمارہ دیکھا۔ بیلانا حیرت صاحب نے شہر خیال میں علامہ جمیل مظہری صاحب کے بارے میں بہت سا تم دیگر دو حضرات کے مضامین کا چربہ اتر دو تحریر کیا۔ اگر حضرت حیرت صاحب جمیل مظہری صاحب کی اپنی تو بیان بیان کر دیتے تو زیادہ دلچسپ بات ہو جاتی۔ حیرت نے صرف اس میں ملا ملا کو ہونگ دیکھا حسن کو بلا کم و کاست بیان کر دیا۔ مضمون کی اہم عبارت سے یہ اچھا نہیں معاملات کی ادبی تحریروں کو زبردستی اس میں شامل کیا جاتا اور اس سے مضمون کا مجموعہ نکل جاتا ہر بات کا اپنا ایک حسن ہوا کرتا ہے۔
اختر الاسلام (رمیرٹھ)

سہیل (اگست) ملا۔ شکریہ

ڈاکٹر طوری صاحبہ کا خط کافی حد تک اصولی ذہن سے متعلق لیکن ایک بات قابل اعتراض ہے۔ وہ لکھتی ہیں۔
اسلام جیسے عظیم اور دیگر مذاہب سے بالاتر دین ——
اگر کوئی عیسائی، ہندو، سکھ، پارسی۔ اپنے مذہب یا دھرم کو اسلام سے بالاتر کہے تو انہیں دیگر مذاہب کو کمتر کہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ بہت سے غیر مسلموں کو اس سے ٹھیس پہنچ سکتی ہے۔ دوسروں کے جذبات کو مجروح کرنا کسی بھی مذہب میں جائز نہیں۔

مشتاق شبنم صاحب نے جو اعتراضات دوسروں پر کئے ہیں وہ خود اس کا شکار ہو گئے ہیں۔ فارسی سے در آمد عروض بدلنے کے ہیں کہ یہ اوزان بحور اردو زبان کے مزاج کے مطابق ہیں۔ اس سے ہم آہنگ ہیں۔ اور جو لوگ بات کرتے ہیں تو ہندی چھند اردو ہے کہ چھند خاص طور پر کو بندشوں اور پابندیوں پر اعتراض کرتے ہیں۔ اگر ہم فارسی بحور اور قوافی کو بدلنا نہیں چاہتے تو ویسے ہی ہندی کی بحر (چھند) کو بھی قبول کر لینا چاہئے یہ دوہرا اصول سمجھ میں نہیں آتے۔
بھلا سا لکھنے میں ہم نے کیا تبدیلی کر لی ہے ——
وہی چودہ مصرعے وہی قوافی کی پابندی —— اگر نظم ماتراؤں وغیرہ کی بندش نہ جانے
دوہا کی کیا ضرورت ہے۔ کے دوہوں میں دوہا نہیں ہے جو کبیر اور دوسرے کویوں کے دوہوں میں ہے
غزل کی بحور اور دوہے کی بحر کے معاملے میں شبنم صاحب خود تضاد کا شکار ہیں۔
ایک ہی صفحہ پر چار، چھ غزلیں وغیرہ رسالے کے حسن کو مجروح کرتا ہے ادھر توجہ دیجئے
سرور کمال وردنا
(امرت سر)




ENTERPRISE
PATNA 8

N. I. Regd. No. 3520/57 P. & T. Regd. No. Gay-4

47 Years of Publication Phone : 1573

The Sohail Monthly, River Side Road, Gaya—823001

Cover Printed at Sohail Printers, Shaheed Road, Gaya.

ماهنامه

Rs.


دھلائی کا
صابن
MODI
MODI SOAP
WASHING SOAP
مودی
پنجاب سوپ فیکٹری


کی مشہور دوا

ترقی پسند ادب کا ترجمان

سہیل
گیا

دسمبر ۱۹۸۵

○ مدیر موسس :- ادریس سنہاروی (مرحوم)
○ مدیر اعلیٰ :- مسعود منظر سنہاروی،
○ مدیر :- جمیل منظر سنہاروی
○ معاونین :- شکیل احمد جمالی، عبدالقیوم ابدالی،

مجلس مشاورت
○ ڈاکٹر تارا چرن رستوگی
○ ڈاکٹر قمر رئیس
○ اصغر علی انجینئر
○ ڈاکٹر برج پریمی،

○ جلد نمبر ۲۷، شمارہ نمبر ۱۲
○ بدل اشتراک فی شمارہ ۲ روپے،
○ زر سالانہ ۲۴ روپے، لائف ممبری ۲۵۱ روپے

خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ
○ ماہنامہ سہیل ریور سائیڈ روڈ گیا ۸۲۳۰۰۱

فون نمبر ۵۰۳

ہمیشہ نئی - ہمیشہ جوان

مقبولِ عام - ممتاز - مستند

دیدہ زیب اور کارآمد

بخشی جنتری

۱۹۸۶

اپنی تمام خصوصیتوں کے ساتھ پیشِ خدمت ہے

براہِ راست ہم سے یا قریبی اسٹاکسٹ سے خریدیے

ایس اے بی بخشی کمپنی ۳۲/۲ مولانا شوکت علی (کولوٹولہ) اسٹریٹ کلکتہ ۷۳

(MOHSIN ART. CAYA)

بھوپال المیہ کی پہلی برسی

۳-۲ دسمبر ۸۴ء کی رات میں بھوپال شہر میں جو بھیانک حادثہ ہوا تھا اور جس میں تقریب ۱۷ سو لوگ موت کے شکار ہوئے اور لاکھوں لوگوں کی زندگی برابر کے لئے عذابِ جان بن کر رہ گئی ہے۔ اس پر کانگریس حکومت کا رویہ عوام مخالف اور اجارہ داروں کا حامی معلوم ہوتا ہے۔

بھوپال المیہ کا خوفناک اثر اسی سے سمجھا جا سکتا ہے جب ایک سال بعد بھوپال کے عوام، سبھی سیاسی پارٹی، عوامی ادارے مرنے والوں کو خراجِ عقیدت پیش کر رہے تھے۔ اس وقت بھی اس زہریلی گیس کے اثر سے مرے ہوئے لوگوں کی ارتھیاں نکل رہی تھیں۔ پیدائش میں تو جو بچے مرے ہوئے، بیمار اور اپاہج پیدا ہو رہے ہیں انکی کہانی الگ ہے۔

المیہ کی پہلی برسی کے موقع پر عوام کے غم میں شریک ہو کر مدھیہ پردیش حکومت نے بھی سرکاری دفاتر بند کئے اور دعائیہ تقریب کا اہتمام کیا۔ لیکن ان ڈراموں سے اسکے چہرے پر لگے وہ کالے دھبے صاف نہیں ہو سکتے جو متاثرین کی مانگوں میں سستی برتنے سے لگے ہیں۔ پچھلے دنوں دسمبر کو کیمیکل و فرٹیلائزر محکمہ کے نائب وزیر مسٹر آر کے۔ جے چندر نے تو پارلیامنٹ کو بڑے یقین کے ساتھ کہا تھا کہ بھوپال المیہ کے لئے یونین کاربائیڈ سے معاوضہ کے سوال پر حکومت کوئی سمجھوتہ نہیں کریگی لیکن اگر ہم ان کی بات پر بھروسہ کر بھی لیں تو کیا یہ امید رکھ سکتے ہیں کہ اس بھیانک تباہی کے حقائق عوام کے سامنے آ پائینگے۔

مدھیہ پردیش حکومت کا رویہ ابھی تک جیسا رہا ہے اس سے یہ یقین کرنا بہت مشکل ہے۔ خود اس وزیر کے بیان کے مطابق بھی ۱۷۵۴ لوگ مرے تھے جن میں صرف ۱۳۰۹ کے خاندانوں کو ابھی تک معاوضہ کی رقم مل پائی ہے۔ حکمراں پارٹی کے پارلیامنٹ ممبر کے۔ این۔ پردھان نے یہ الزام بھی لگایا کہ صوبائی حکومت کے افسران اور یونین کاربائیڈ کی ملی بھگت سے مرنے والوں کی تعداد اور متاثرین کی تعداد گھٹا کر بتائی جا رہی ہے۔ متعلقہ وزیر نے اسے صوبائی حکومت کے دھیان میں لانے کی یقین دہانی کرائی لیکن بالکل تازہ خبروں کے مطابق صوبائی حکومت سے کوئی امید رکھنی مشکل ہی معلوم پڑتی ہے۔ مثلاً صوبائی حکومت نے معروف فلم ڈائرکٹر مظفر علی سے گیس المیہ پر فلم بنانے کا اقرار کیا تھا جسے پہلی برسی کے موقع پر دکھانا تھا۔ اس فلم پر حکومت نے ۵۰ لاکھ روپے خرچ کئے لیکن جب افسر شاہوں کی نگاہ سے وہ منظر گزرا جس میں ایک متاثر شخص بتا رہا ہے کہ اس نے اپنے بیٹے کی لاش ایک ٹرک پر دیکھا۔ جو لاشوں کو بھوپال سے باہر ندی میں پھینکنے جا رہا تھا تب اس فلم کی نمائش پر پابندی لگ گئی۔ ایسی سرکار سے کیا امید کی جا سکتی ہے کہ وہ متاثر عوام کی ضروری مدد کر سکتی ہے؟

(جمیلہ منظور، سنگھار وہت)

ڈاکٹر شعیب دراهی

حسرت کا رجحان شاعری

"A POET POLITICIAN MAULANA HASRAT MOHANI, WAS AN ENVETERATE ENEMY OF THE BRITISH AND A LOVER OF FREEDOM HIS PEOPLE"

گویا حسرت میلان طبع کے اعتبار سے شاعر بھی تھے۔ اور سیاست داں بھی۔ انہوں نے انگریزی سامراج کے خلاف اپنی شاعری کا حربہ بھی استعمال کیا۔ اور سیاست کا طریقہ بھی۔ اس جہت سے ان کی شاعری ان کی سیاست سے الگ نہیں۔

اردو کے بورژوا ناقدین نے حسرت کو ہمیشہ ایک اوسط عشقیہ شاعر کی حیثیت سے پیش کیا بحال آں کہ حسرت ایسے غزل گو ہیں جنھوں نے انگریزی سامراج کے ساتھ ساتھ سرمایہ داری پر بھی وار کیا۔ اور صدائے جمہوریت بھی بلند کی۔ حسرت کی جمہوریت، سرمایہ دارانہ جمہوریت نہیں۔ وہ ایسی جمہوریت چاہتے ہیں جس میں محنت کش طبقے کا غلبہ ہو ؎

دستور کے اصول مسلم ٹھہر چکے شاہی بھی دام غلبۂ جمہور ہو چکی

سرمایہ دار خوف سے لرزاں ہیں کیوں نہ ہوں معلوم سب کو قوتِ مزدور ہو چکی

اردوئے معلّی کی فائلیں حسرت کے سیاسی عقائد کے شاہد ہیں۔ وہ مکمل آزادی کے حامی تھے۔ اور اپنے اس مطالبے سے دستبردار ہونے کو تیار نہ تھے ؎

اے ستم گر مجھ سے گو ترکِ وفا ممکن نہیں میں کروں لیکن اگر ایسا تو کیا بے جا کروں

ہوئیں ناکامیاں، بدنامیاں رسوائیاں کیا کیا نہ چھوٹی ہم سے لیکن کوئے جاناں کی ہواداری

وہ سیاسی مسلک کے اعتبار سے کمیونسٹ تھے ؎

نہ سرمایہ داروں کی نخوت رہے گی   نہ حکام کا جورِ بالا رہے گا۔

زمانہ وہ جلد آنے والا ہے جس میں   کسی کا نہ محنت پہ دعویٰ رہیگا

انہوں نے اپنی شاعری میں، اپنے رسالہ اردوئے معلّٰی اور اپنے روزنامہ مستقبل کے ذریعہ ترقی پسند شعری رجحانات اور بائیں بازو کے سیاسی نظریات کی ترویج و اشاعت میں کوئی کسر باقی نہ چھوڑی۔

اردو تنقید نگاری پر چونکہ دائیں بازو کا غلبہ رہا (خصوصاً بہار میں ترقی پسند تنقید کا رجحان پیدا نہ ہوا) اس لئے حسرت کی انقلابی اور ترقی پسندانہ شاعری پر کم لکھا گیا۔ اور حسرت کی رومانی شاعری زیادہ اجاگر کی گئی۔ وہ حسرت کو نظر انداز نہیں کر سکتے تھے۔ مگر حسرت کو انقلابی سیاسی شاعر بھی پیش کرتے ہوئے گھبراتے تھے۔

حسرت قومی آزادی کی تحریک میں بائیں بازو میں تھے۔ ان کا کلام ان کے اس رجحان کا آئینہ دار ہے ؎

مغموم نہ ہو خاطر حسرت کہ تلک تک   پیغام وفا، باد سحر لے کے گئی ہے

تلک کے سیاسی عقائد سے سیاست کا ہر طالب علم واقف ہے ان سے حسرت کا ذہنی اور عملی اتحاد عقیدت کی حد تک تھا ؎

اے تلک! اے افتخار جذبۂ حب وطن   حق شناس و حق پسند و حق یقیں و حق سخن

ذات تیری رہ نمائے راہ آزادی ہوئی   تھے گرفتار غلامی ورنہ یارانِ وطن

تو نے خودداری کا پھونکا اے تلک ایسا فسوں   یک قلم جس سے خوشامد کی مٹی رسم کہن

وہ گاندھی جی کے عدم تشدد کے حامی نہ تھے ؎

جسے کہتے ہیں اہنسا، اک اصول خودکشی تھا   عمل اس پہ کوئی کرتا، نہ کبھی عوام کرتے

وہ انقلابی تھے۔ اہنسا وادی نہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے گاندھی کی اہنسا وادی حکمت عملی کی مخالفت کی تھی۔ وہ سیاسی کارگذاری میں کسی مصلحت کی بنا پر سمجھوتہ کرنے کو تیار نہ تھے۔ وہ سیاسی تحریک میں انقلابی جد و جہد کے ہم نوا تھے۔ وہ گاندھی کی طرف نہیں لینن کی طرف تھے ؎

گاندھی کی طرح بیٹھ کے کیوں کاتیں گے چرخے   لینن کی طرح دیں گے نہ دنیا کو ہلا ہم

تحریک حریت کو جو پایا قرین حق   ہر عہد میں معاون تحریک ہم ہوئے

لیکن یہ آزادی اور حریت، دراصل کچلے ہوئے محنت کش عوام کی آزادی اور حریت ہے۔

لینن گاندھی واد کے سلسلے میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

گاندھی واد عام مذاہب کی طرح ایک قسم کی روحانی ظلم و زبردستی ہے جو ہر جگہ کی جنتا کی گردن پہ بوجھ بنی ہوئی ہے جو دوسروں کے لئے مستقل مشقت، افلاس اور تنہائی

کے نیچے لپی جا رہی ہے۔" (علم و دانش، جنوری ۱۹۵۰ء)

استالن نے گاندھی واد کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

"مغربی سرمایہ دار، ان ملکوں کو خون کے دریا میں غرق کر دینا چاہتے ہیں اس کے لئے وہ گاندھی جیسے لوگوں سے مدد کی اپیل کرتے ہیں۔" (علم و دانش۔ جنوری ۱۹۵۰ء)

ای ایم ایس نمبودری پد ۲۲-۱۹۲۱ء اور ۱۹۱۹ کی سیاسی انقلابی تحریک کے بے پناہ طوفانی ہیجان کے خلاف ہندستانی قومی سرمایہ داروں کے غدارانہ عمل کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"FOR IT IS NOTIRIOUS THAT THE BOR-OGIOS NATIONAL LEADERSHIP UNDER MAH-ATMAGANDHI WAS MORE ANTIOUS TO RE-STRAIN THE REVOLUTIONARY MASSES AND TO KEEP THEN STRICTLY WITHIN "NON VOI-LENT" LIMITS THAN TO DEAL A POWERFUL BLOW AGAINST BRITISH IMPERIALISM AND ITS REACTIONARY INDIAN ALLIES"

(KERALA YESTERDAY, TODAY AND TOMORROW BY E.M.S. NAMBUDRIPAD, PEGE 142)

آگے چل کر نمبودری پد قومی سرمایہ داروں کے مخدوش کردار کی نقاب کشائی ان الفاظ میں کرتے ہیں:

INSTEAD OF TRYING TO LEARN THE ART OF REVOLUTIONARY RESISTANCE FROM THE PEASANTARY, THAY TRIED TO TEACH THE PEASANTS THE ART OF "NAN VOILENT" SUR-RENDER. (PAGE 143)

عبدالمغنی لکھتے ہیں:

"عدم تشدد (NON VOILENCE) کا فلسفہ ایک لایعنی چیز ہے۔ اور جو لوگ بھی اس کی تلقین کرتے ہیں۔ وہ یا تو زندگی کے حقائق سے بے خبر ہیں۔ یا محض دکھاوا (HYPOCRACY) کرتے ہیں۔ عہد حاضر میں گاندھی جی نے اس نام نہاد فلسفے کو ایک سیاسی حربہ (POLITICAL STUNT) کے طور پر انگریز حاکموں کے مقابلے میں استعمال کیا۔ صرف اس لئے

(اقبال اور عالمی ادب صفحہ ۳۰۷)

ظاہر ہے کہ ان حالات میں ہندوستان کی ہر زبان نے کم و بیش جو ادب تخلیق کیا ان میں ان سیاسی تحریکات کی دھمک
سنائی دیتی ہیں۔ ان سیاسی اثرات کے تحت جو ادب پیدا ہوا نمبودری پد اس کی توضیح انگشت نمائی ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"POLITICAL LITERATURE AND OTHER FRO-
-MS OF NEW WRITINGS ALSO BEGAIN TO TAKE
SHAPE AS PART OF THE POLITICAL MASS
MOVEMENT" (KERALA, YESTERDAY, TODAY
AND TOMORROW P. 138)

انہوں نے نمبودری پد نے کیرل کے مشہور محب وطن شاعر ویلا تھول کے نغمۂ حب الوطنی کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:

"THE POET VALLATHOL BECAME FAMOUS
IN THIS PERIOD THROUGH HIS PATRIOTIC SONGS"
(KERLA YESTERDAY TODAY AND TOMORROW
BY E.M.S. NAMBUDRIPAD, P. 138)

نمبودری پد کلام حسرت یا زبان حسرت سے واقف نہ تھے ورنہ ۲۲-۱۹۲۰ء کے ANTI - FEUDAL STR-
-UGGLE" اور GLORIOUS NATIONAL UPSURGE کے اردو ہیرو شاعر
کے بانگ انقلاب کو فراموش نہ کرتے:

ماوزے تنگ کہتے ہیں:

"OUR AIM TO ENSURE THAT REVOLETION-
-ARY LITRATURE AND ART FOLLOW THE
CORRECT PATH OF DEVELOPMENT AND PR-
-OVIDE BETTER HELP TO ATHER REVOLU-
LIONARY WORK IN FACILITATING THE OVER
THROW OF OVER NATIONAL ENEMY AND THE
ACCOMPLISHMENT OF THE TASK OF NATIONAL
LIBERATION"
(SELECTED READINGS FROM THE WORK
OF MAO. TSE TUNG PAGE 250)

لینن کہتے ہیں:

"LITERATURE MUST BECOME PART OF THE COMMON CAUSE OF THE PROLETERIAT A, COG AND A SCREW' OF ONE SINGLE GREAT SOCIAL DEMOCRATIC MECHANISM SETIN MOTION BY THE ENTIRE POLITICALLY CONCIOUS VANGUARD OF THE ENTIRE WORKING CLASS"
(COLLECTED WORKS OF LENIN P. 45; VOL X)

سکھوان جوشی اپنے مضمون " بام نبض کا اودے " میں لکھتے ہیں :

" ۲۶ دسمبر ۱۹۲۵ء کو مولانا حسرت موہانی سنگاویلو چیٹ میا اور ستیہ بھگت نے کمیونسٹ پارٹی کی تنظیم کے لئے ایک سمیلن بلانے کا فیصلہ کیا۔ سمیلن میں بائیں بازو کا رجحان رکھنے والے تمام لوگ انفرادی طور پر شامل ہوئے۔ نظریاتی طور پر کڑے اختلاف کے باوجود ایک مرکزی کمیٹی وجود میں آئی جس کے اراکین ایم جو گلیکر، ایس وی گھاٹے، آر ایس نمبکر، مظفر احمد، عبدالحمید، بیگم ہوٹنا، سی کے آئینگر وغیرہ مقرر ہوئے "

(ہندی سے ترجمہ - ہندی ہفتہ وار جریدہ دوی وار ۲۶، ۲۰ اکتوبر ۱۹۸۵ء صفحہ ۴۵)

انقلابی تحریکات کے اس تناظر میں دیکھئے تو حسرت سیاسی اور ادبی دونوں محاذوں پر بیدار اور باشعور تھے۔ ان کے کلام کے مطالعہ سے بھی ان کے طبقاتی شعور کا علم بھی ہوتا ہے۔ اس کے نزدیک اہنسا کی تحریک بورژوا سیاست تھی۔ وہ مکمل آزادی کے طرفدار تھے۔ وہ ملک کی سیاسی تحریک میں دائیں بازو کے سیاسی غلبے سے سخت کبیدہ خاطر تھے وہ انقلاب کے ذریعہ ملک کو آزاد کرانا چاہتے تھے۔ ان کے اس نقطۂ نظر کی جھلک اور گنگناہٹ ان کی اس غزل میں صاف سنائی دیتی ہے

اپنا سا شوق اوروں میں لائیں کہاں سے ہم — گھبرا گئے ہیں بے دلیٔ ہمرہاں سے ہم
معلوم سب ہے پوچھتے ہو پھر بھی مدعا — اب تم سے دل کی بات کہیں کیا زباں سے ہم
کچھ ایسی دور بھی تو نہیں منزل مراد — لیکن یہ جب کہ چھوٹ چلیں کارواں سے ہم
ہے انتہائے یاس بھی اک ابتدائے شوق — پھر آ گئے وہیں پہ چلے تھے جہاں سے ہم
حسرت پھر اور جا کے کریں کس کی بندگی — اچھا جو سر اٹھائیں بھی اس آستاں سے ہم

یہ ۱۹۲۲ء کی غزل ہے جب قومی تحریک آزادی کے بورژوا لیڈروں سے ان کے اختلافات شدید ہو چکے تھے

ایس ایم دکر نے اپنے مضمون " گاندھی ازم کی طبقاتی بنیاد " میں لکھا ہے :

" یہ تحریک آزادی کا نیا دور جس کی ابتدا اکتوبر انقلاب سے ہوئی ہندوستان میں ۱۹، ۱۹۲۲ء کی زبردست انقلابی تحریک سے شروع ہوا " (علم و دانش - جنوری ۱۹۵۰ء صفحہ ۴۶)

اس بات کا ذکر اوپر ہو چکا کہ ملک میں اشتراکی انقلابی تحریک شروع ہوئی تو حسرت نے کھل کے اپنے کمیونسٹ

ہونے کا اعلان کر دیا۔ یہ اعلان قطعی دلیرانہ ہے انہیں اس بات پر فخر ہے کہ وہ اشتراکی ہیں ؎

تیرے سرفروشوں میں ہے کون ایسا   جسے دل سے شوقِ شہادت نہیں ہے

غربت کی صبح میں بھی نہیں ہے وہ روشنی   جو روشنی کہ شامِ سوادِ وطن میں ہے

لازم ہے یہاں غلبۂ آئینِ سوویٹ   دو ایک برس میں ہو کہ دو چار برس میں

درویشی و انقلاب مسلک ہے میرا   صوفی مومن ہوں، اشتراکی مسلم

نہ سرمایہ داروں کی نخوت رہے گی   نہ حکام کا جور بالا رہے گا

حسرت کے اختلافات قطعی نظریاتی تھے۔ وہ سمجھوتے کی طرف نہیں۔ انقلاب کی طرف تھے۔ اس کا ذکر انہوں نے بار بار غزلوں میں کیا ہے ؎

اے کہ نجاتِ ہند کی دل سے ہے تجھ کو آرزو   ہمتِ سربلند سے یاس کا انسداد کر
قول کو زید و عمرو کے حد سے سوا اہم نہ جان   روشنیٔ ضمیر میں عقل سے اجتہاد کر
غیر کی جد و جہد پر تکیہ نہ کر کہ ہے گناہ   کوششِ ذاتِ خاص پر ناز کر اعتماد کر

وہ مصلحت اندیشانہ حکمتِ عملی اور مصالحانہ پالیسی کے ہمیشہ مخالف رہے۔ وہ جد و جہد سے زیادہ جہاد پر یقین رکھتے تھے۔ انہوں نے انگریزی سامراج سے سمجھوتے کی ہمیشہ مخالفت کی۔ وہ صلح و مصالحت کے ذریعہ ملی ہوئی آزادی کو بھی آزادی نہیں مانتے تھے۔ اس معاملے میں وہ کسی مصلحت کے بھی قائل نہ تھے ؎

حق سے جو عذرِ مصلحتِ وقت پہ جو کرے گریز   اس کو نہ پیشوا سمجھ اس پہ نہ اعتماد کر
لگا دو نہ آگ عذرِ مصلحت کو   کہ ہے بے زار اس شیوے سے مرا دل

غلط ہے قولِ عقلِ مصلحت کوش   نہ اس جانب کرے گا اعتنا دل

توانائے صداقت ہے تو ہرگز   نہ ہوگا پیروئے باطل مرا دل

کیوں نہ ہو خطبے میں حسرت قافلۂ احرار کا   راہزن ہوں جب وہی جو راہبر منزل کے ہیں

حسرت حصول آزادی کے لئے جان تک دینے کو تیار تھے لیکن ہندوستان کا نیشنل بورژوازی انگریزی سامراج سے سمجھوتہ کرنے پر تلا ہوا تھا۔

"THE DILEMMA OF THE INDIAN BIG BOURGEOISIE WAS REVEALED IN THE COLONIAL PERIOD ITSELF ON THE ONE HAND THE ENLIGHTENED ASPECT OF THEIR METARIAL INTERAST LED THEM TO STRUGGLE FOR THE POLITICAL REFORMS AND CONSERVATIVE ASPECT HED ALWAYS MADE THEM BERAYERS TO THE COUSE OF A REVOLUTIONARY CHANGE"

(PARTY UNITY, VOL IV No I JAN 1985.P. 6)

اس پس منظر میں حسرت کا جذبۂ جاں نثاری ملاحظہ ہو ؎

سر پہ شوریدہ بھی اک بار تھا، جس کو مری گردن
تیرے کوچہ میں آج اے فتنۂ دوراں اتار آئی

مر مٹیں گے جو غم عشق کی ایذا ہے یہی،
اک نہ اک روز ترے عشق میں ہونا ہے یہی

روح کو محو جمال رخ جاناں کر لیں
ہم اگر چاہیں تو زنداں کو گلستاں کر لیں

ہجر جاں دل قرار سے بے زار ہو چکا
جینا فراق یار میں دشوار ہو چکا

وہ جان دے کے بھی آزادی حاصل کرنا چاہتے تھے ان کا خیال تھا کہ وطن کی آزادی جان سے زیادہ قیمتی ہے ؎

قیمت مئے کہ بہ پیمانہ جاں ہے ساقی
کون کہتا ہے کہ یہ نرخ گراں ہے ساقی

حسرت کی زندگی قید و بند کا خاکہ بھی ان کے کلام میں موجود ہے۔ صعوبت زنداں نے کبھی ان کے عزم و استقلال کو کمزور نہ کیا۔ اور نہ کبھی ان کی ہمت مردانہ میں کمی آئی۔ وہ ہمیشہ باعزم، حوصلہ مند اور بے خوف رہے۔

اچھا ہوا کہ خاطر حسرت سے مٹ گئی!
ہیبت سی اک جو خطرۂ دار و رسن میں تھی

---

(۱) درس حریت عارفی۔ ص ۱۱۱، حسرت آزاد کا (۲) خاطر مرور، گو بالا، فسطو، آباد کا

شاہ جنوں نے خلقت آزادگی دیا ۔ زنداں میں ہیں خیال کے صحرا بنے ہوئے ،

قومی ہی نہیں، بین الاقوامی اور نوآبادیاتی سیاسی مسائل پر بھی حسرت نظر رکھتے تھے۔ خواہ وہ ترکی کی آزادی کا مسئلہ ہو، یا انگریزی سامراج اور جاپانی استعماریت کی ملک گیری کی دہشت انگیزی۔ اس خاص عہد کا پس منظر نمبودری پد ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں :

"SUCH AN ANTI-DEMOCRATIC LEADERSHIP WAS BOUND, AT SOME STAGE OR OTHER, TO COME INTO CLASH WITH THE MOPLAH PEASANTS THAT VERE ROUSED TO ACTIVITY IN MALABAR IN 1920-21 FOR THEY WERE UN-LIKE THE LEADERSHIP ANTI-IMPERIALIST AND ANTI-FEUDAL IN REAL AND FULL SENSE OF THE TERM, THEY WERE GENUINELY ANXIOUS NOT ONLY TO END BRITISH RULE IN INDIA AND MAKE OUR COUNTRY FREE, BUT ALSO TO END BRITISH DOMINATION IN TURKEY AND OTHER MIDDLE EASTERN COUNTRIES"

(KERALA YESTERDAY, TODAY AND TOMORROW BY E.M.S. NAMBUDARIPAD VOL 1942.43)

حسرت نے ان حقائق کو بھی اپنی غزلوں میں پیش کیا ہے :

غضب ہے کہ پابند اغیار ہو کر ۔ مسلماں رہ جائیں یوں خوار ہو کر
اٹھے ہیں یہ حق پیش گان محبت ۔ ہمارے مٹانے پہ تیار ہو کر
تقاضائے غیرت ہے یہی عزیزو ۔ کہ ہم بھی رہیں ان سے بیزار ہو کر
کہیں صلح و نرمی سے رہ جائے دیکھو ۔ نہ یہ عقیدہ جنگ دشوار ہو کر

ایک طرف یورپ کی استعماری قوت تھی دوسری طرف جاپان کی بڑھتی ہوئی سامراجی طاقت۔ حسرت نے دونوں طرف اشارہ کیا ہے

یورپ میں بھی پھیل گئی ہے وبائے حرص ۔ چلنے لگی ہے سارے جہاں میں ہوائے حرص

ہے جیش ذکو ریا کے مٹانے پہ مستعد ۔ جاپان بھی ہوا ہے مگر آشنائے حرص

ماوزے تنگ نے ان حالات کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

"JAPANES IMPERIALISM HAS BEEN DELT A HEAVY BLOW BY CHINA'S WAR OF RESISTANCE AND IS ALREADY INCAPABLE OF LAUNCHING ANY MORE LARGE-SCALE MILITARY OFFENSIVES, SO THAT THE RELATION OF FORCES BETWEN THE ENEMY AND SELVES HAS NOW REACHED THE STAGE OF STRATEGIC STALEMATE BUT THE ENEMY IS STILL HOLDING FAST TO HIS BASIC POLICY OF SUBJUGATING CHINA AND IS PURSUING IT BY SUCH MEANS AS UNDER MINING OUR ANTI-JAPANESE UNITED FRONT INTENSIFYING HIS "MOPPING-UP" COMPAIGNS IN THE REAR AREAS AND STEPPING UP HIS ECONOMIC AGGRESSION"
(SELECTED READINGS FROM THE WORK OF MAO TSETUNG P. 182)

لیکن حسرت تمام ملکوں میں پھیلتی ہوئی تحریک آزادی سے بھی واقف ہیں ؎

اچھا ہے اہل جور کئے جائیں سختیاں پھیلے گی یوں ہی شورش حب وطن تمام

"CONTINUATION OF THE DRACONION LEGISLATION OF THE COLONIA SERVIVAL OF THE COLONIAL STATE MACHINE MASS EVICTION OF PEASANT FROM LAND BLOODY SUPPRESSION OF THE POPULAR MOVEMENTS ETC WERE THE IMMEDIATE EVENTS IN THE WAKE OF INDEPENDENCE"
(PARTI UNITY VOL IV. No. I JAN 1985)

نوآبادیاتی نظام کے اس خونی تشدد کے منظر میں حسرت جذبۂ حب وطن کی شورش پھیلانا چاہتے تھے۔ کیا یہ کھلا جنگ کا اعلان نظر نہیں ہے؟ وہ تمام جمہوری طرز سے ہو کر پرستاری ڈکٹیٹرشپ کی طرف آئے تھے۔ اور بالکل بے باک ندارانہ اور مجاہدانہ بانکپن کے ساتھ اس کے ہم نوا تھے۔ انہیں اس بات کا یقین ہے کہ سامراجی طاقتیں ایک نہ ایک دن ختم ہو جائیں گی

رسم جفا کامیاب دیکھئے کب تک رہے　　　حب وطن مست خواب دیکھئے کب تک رہے

دولت ہندوستاں قبضۂ اغیار میں　　　بے عدد و بے حساب دیکھئے کب تک رہے

عبدالمغنی لکھتے ہیں:

"مغرب بالخصوص برطانوی سامراج زرپرستی ہے اور سرمایہ داری تمیز بندہ و آقا کرتی ہے جو منافی آدمیت ہے"

(اقبال اور عالمی ادب ص ۳۲۲)

یہی وجہ ہے کہ حسرت پیداواری قوتوں کو شخصی نہیں، قومی ملکیت سمجھتے تھے ؎

ملکی ہوئی جائداد شخصی　　　جائز نہ رہا مفاد شخصی

حسرت شاعر حیات ہی نہیں جیتی جاگتی متحرک اور پرقوت زندگی کے شاعر ہیں۔ زندگی کا جوش، حرارت اور والہانہ پن ان کے کلام میں نمایاں ہے یہی وجہ ہے کہ بورژوا ناقدین نے حسرت کے اس حصۂ کلام کو ہمیشہ نظر انداز کیا کیوں کہ وہ جس نظام کو قائم رکھنا چاہتے ہیں حسرت اس کے مخالف ہیں۔

حسرت کا یہ رجحان شاعری صرف ترقی پسندانہ ہی نہیں بلکہ انقلابی ہے۔ ۱۹۱۷ء کے اکتوبر انقلاب سے آج تک اردو کے تمام نمائندہ غزل نگاروں کا نئے سرے سے تنقیدی جائزہ لیا جائے تو مکتبۂ داغ سے بھی تعلق رکھنے والے شاعروں مثلاً وحشت کلکتوی، جگر مرادآبادی، جلیل مانک پوری کی غزلوں میں اپنے عہد کی سیاسی، سماجی اور انقلابی کروٹوں کی چاپ کھنکتی سنائی دے گی۔ اور خالص مارکسی، لینی فکر نے اردو غزل کو کہاں تک متاثر کیا ہے اس کے واضح نقوش بھی نمایاں ہو سکیں گے۔

پرنٹر، پبلشر، ایڈیٹر مسعود منظر نے ملت آرٹ پریس سلطان گنج پٹنہ سے چھپوا کر دفتر ماہنامہ ... سے شائع کیا۔

ڈاکٹر برج پریمی

سعادت حسن منٹو کا خاندان

اٹھارھویں صدی کے آغاز سے ہی کشمیر کی آبادی کا خاصا بڑا حصہ جاگیر شاہی کے مظالم کی تاب نہ لاکر کشمیر سے بھاگ کر ہندوستان کے مختلف علاقوں میں آباد ہونے لگا۔ فرخ سیر کے زمانے میں کشمیر کے شیخ الاسلام نے اپنے اختیار و رسوخ کا ناجائز استعمال کرکے یہاں کے ہندوؤں کو ظلم و ستم کا نشانہ بنوایا جس سے تنگ آکر بہت سے پنڈت لوگ ترک وطن پر مجبور ہوئے۔ ۱۷۴۶، ۴۷ء کے دوران کشمیر میں زبردست سیلاب آیا۔ اور اس کے فوراً بعد پلیگ کی وبا پھیلی ہزاروں جانیں تلف ہوئیں۔ اور بے شمار لوگ جان بچا کر ہندوستان کے میدانی علاقوں میں آباد ہوئے۔ افغانوں اور سکھوں نے بھی اپنی حکومت کے دوران کشمیریوں اور خاص کر مسلمانوں کو اپنے مظالم کا نشانہ بنایا۔ جس میں کشمیریوں مسلمانوں کو بڑی تعداد میں یہاں سے بھاگ جانے پر مجبور کیا۔ ان ہجرت کرنے والوں میں سے کئی ایسے لوگ بھی پیدا ہوئے جنہوں نے زندگی کے مختلف شعبوں میں نمایاں کارنامے انجام دئے۔ ان میں ہی ایسے مشاہیر کے نام نظر آتے ہیں جنھوں نے اردو شعر و ادب میں قابل قدر اضافے کئے ہیں۔ حضرت اقبال، چکبست، سرشار، مومن، علامہ کیفی، آغا حشر، آنند نرائن ملا، رامانند ساگر، وغیرہ صرف چند نام ہیں۔ اس فہرست میں سعادت حسن منٹو کا نام بھی ایک نمایاں مقام رکھتا ہے۔ انھوں نے اپنے تخلیقی شعور کی مدد سے اردو افسانے کو موضوع اور تکنیک کے اعتبار سے فنی وسعتیں عطا کیں۔

سعادت حسن منٹو کا وطن کشمیر ہے۔ ان کے بزرگ صدیوں سے وادیٔ کشمیر میں آباد تھے۔ ان کے ہم عصر مشہور افسانہ نگار کرشن چندر نے اپنے کتابچہ "سعادت حسن منٹو" میں ان کے کشمیر الاصل ہونے کی تصدیق کی ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

"منٹو، جواہر لال اور اقبال کی طرح کشمیری پنڈت ہے"

منٹو نے خود بھی اپنی خود نوشت سوانح عمری میں لکھا ہے:

"میں کشمیری ہوں، بہت عرصہ ہوا ہمارے آباد اجداد کشمیر سے ___ ہجرت کرکے پنجاب آئے"

منٹو کو کشمیر کے ساتھ جذباتی لگاؤ تھا۔ اور کشمیر کا نام سن کر وہ بے قرار ہوجاتے تھے انہوں نے اپنی تحریروں میں بار بار لکھا ہے:

"میں کاشمیر ہوں ____ ایک بار تو"

نہ صرف منٹو کو بلکہ ان کے سارے خاندان کو کشمیر سے بڑی دلچسپی تھی ۔ ان کے والد تو عشق کی حد تک کشمیر کو چاہتے تھے ۔ وہ بالکل کشمیری لگتے تھے اور ہمیشہ کشمیری وضع کی پگڑی پہنتے تھے اپنے ایک مضمون "شاعر کشمیر مہجور" میں منٹو خود لکھتے ہیں :

"میرے والد صاحب کو کشمیریوں سے عشق تھا ۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ وہ کبھی کبھی اس عشق کے زیر اثر کسی ہاتو یعنی کسی مزدور کو پکڑ کر اپنے ساتھ لے آیا کرتے تھے اور بیٹھک میں بٹھا کر بڑے فخر سے کہا کرتے تھے "میں بھی کاشر ہوں"

منٹو کو اکثر لوگ منٹو کے نام سے یاد کرتے ہیں ۔ لیکن یہ بات حقیقت سے بعید ہے کہ ان کا خاندانی نام منٹو ہے ۔ اور اس لئے کشمیری میں ذات کا لفظ مستعمل ہے ۔ منٹو نے اپنی ذات کے بارے میں ایک عجیب وغریب انکشاف کیا تھا ۔ چنانچہ ایک مضمون میں خود لکھتے ہیں :

"کشمیر کی وادیوں میں بہت سی ذاتیں ہوتی ہیں ۔ جن کو "آل" کہتے ہیں ۔ جیسے نہرو ، سپرو ، کچلو ، وغیرہ وغیرہ ، منٹ MANAT کشمیری زبان میں تولنے والے بٹے کو کہتے ہیں ہمارے آباو اجداد اتنے امیر تھے کہ اپنا سونا چاندی بٹوں میں تول تول کر رکھتے تھے ۔"

اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا خاندانی نام منٹ یعنی ڈیڑھ سیر کے بٹے سے ماخوذ ہے ۔ چونکہ خاندانی نام رفتہ رفتہ وقت کے ساتھ ساتھ لسانی تبدیلیوں سے آشنا ہو جاتے ہیں ۔ اس لئے ان کا یہ خاندانی نام یعنی منٹ بگڑتے بگڑتے منٹو ہو گیا ۔ منٹو کے گہرے دوست ابو سعید قریشی نے اس سلسلے میں منٹو سے کچھ اور سنا تھا ۔ چنانچہ انہوں نے اپنی کتاب "منٹو" میں اس کا ذکر یوں کیا ہے :

"سعادت کہا کرتا کہ منٹو کشمیری زبان میں ترازو کو کہتے ہیں ۔ کشمیر میں ہمارے آبا و اجداد کے یہاں دولت ترازو سے تلتی تھی ۔ اس رعایت سے ہم منٹو کہلائے ۔"

لیکن منٹو کی اصل کے بارے میں میری ذاتی تحقیق و تلاش نے یہ بات روشن کی ہے کہ منٹو اور من وٹی دو پرانے قسط باشی پنڈتوں[1] کی ذاتیں ہیں ۔ قسط باشی پنڈتوں میں سے جن لوگوں نے اسلام قبول کیا وہ منٹو کہلائے ۔ ظاہر ہے کہ اس خاندان نے کشمیر سے روانہ ہونے سے پہلے اسلام قبول کر لیا تھا ۔ قسط باشیوں میں سے جو لوگ مسلمان ہوئے کو منٹو کہا جانے لگا ۔ اور جو اپنے ہی دھرم پر قائم رہے یعنی پنڈت رہے ان کا نام من وٹی پڑ گیا ۔ دونوں ذاتوں کے لوگ یعنی منٹو اور من وٹی آج بھی کشمیر میں پائے جاتے ہیں ۔

محی الدین فوق کا خیال ہے کہ منٹو خاندان کے ایک بزرگ نے ایک وقت شرط باندھ کر ڈیڑھ سیر یا من وٹ چاول کھا لیا تھا ۔ اس وقت سے اس کا نام منٹو پڑ گیا ۔ من وٹی چاول کھانے والا اصلی بزرگ پنڈت تھا ۔ اس کی اولاد میں سے جو مسلمان ہوا وہ منٹو کہلایا ۔

---

[1] ۔ قسط باشی پنڈت کشمیر میں زمانہ قدیم کے اہل عرفہ لوگوں سے سرکاری ٹیکس وصول کرنے والے سرکاری کارندے

سعادت حسن منٹو حقیقت میں سارسوت یعنی سارسوتی برہمن تھے۔ وہ برہمنوں کی کتھک سمپردیا (KATHAK SUMPRADIYA) شاخ سے تعلق رکھتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ لوگ دریائے سرسوتی کے کنارے پر آباد تھے۔ منٹو کے اسلاف سکھوں کے عہد حکومت میں امرتسر گئے تھے۔ اور کشمیر سے روانہ ہونے سے پہلے اسلام قبول کر چکے تھے۔ جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ منٹو اور دمن وٹی دراصل قسطا باشی پنڈتوں کی ذاتیں ہیں۔ لہٰذا ظاہر ہے کہ یہ تقسیم کشمیر میں ہی عمل میں آئی۔

اس خاندان کے سب سے پہلے بزرگ جو پنجاب کے دارالسلطنت لاہور میں آ کر مقیم ہوئے۔ ان کا نام خواجہ رحمت اللہ تھا۔ ان کا پیشہ سوداگری تھا۔ اور وہ اہل اللہ سے گہری عقیدت رکھتے تھے۔ چنانچہ ایک ولی اللہ نے انہیں بشارت دی تھی کہ تو اسم بامسمیٰ ہے اور تیری اولاد پھلے پھولے گی۔ ان کے پوتے خواجہ جمال الدین نے اپنے آبائی کاروبار کو فروغ دیا۔ اور اسے نہ صرف لاہور اور امرتسر بلکہ بمبئی تک کے پھیلا دیا۔ اس زمانے میں پنجاب سکھوں کی عملداری میں تھا۔ امرتسر دربار صاحب کی وجہ سے مقدس مقام تھا۔ اور کافی اہمیت رکھتا تھا۔ اس لئے اکثر تجارت پیشہ لوگ لاہور کے بجائے امرتسر میں رہنا پسند کرتے تھے۔ چنانچہ خواجہ صاحب بھی لاہور چھوڑ کر امرتسر میں مستقل طور پر مقیم ہو گئے۔ ان کی وفات پر امرتسر کے ایک شاعر انور ہلال نے ذیل کی تاریخ کہی ہے

چوں جمال الدین اسیر دھر از حکم اجل	رفت خود برلبت دیں دنیائے دوں سوئے عدم
سال تاریخ وصالش خواستم از دم آہ	گفت ملہم رحمت ایزد بروحش دم بدم
	۱+۱۲۷۶ = ۱۲۷۷ھ[1]

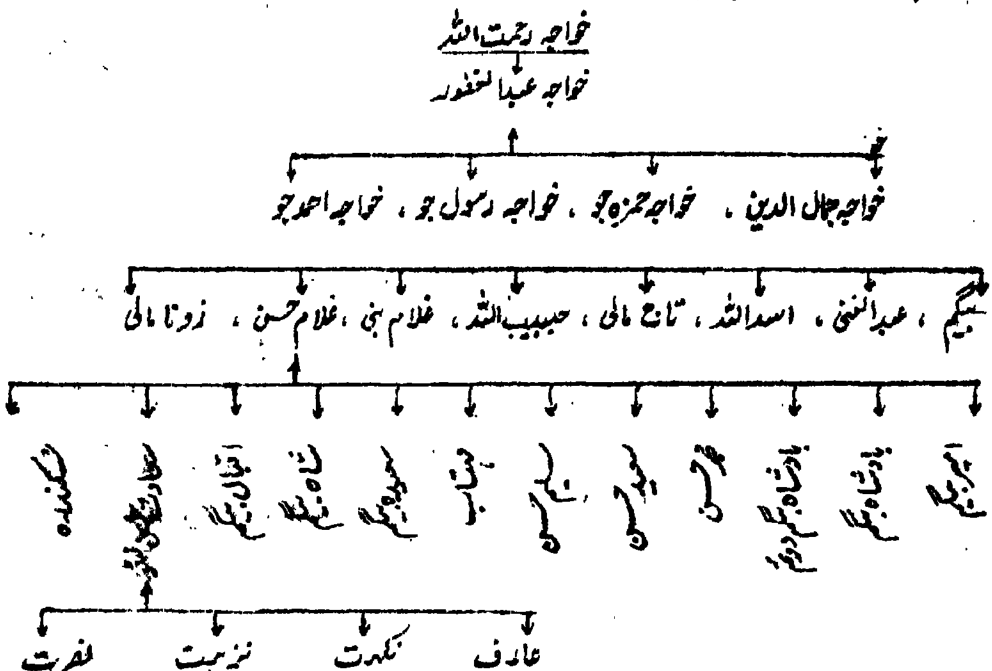
اس قطعۂ تاریخ میں اس پیشین گوئی کی طرف اشارہ ہے جس کی بشارت خواجہ رحمت اللہ کو ولی اللہ نے دی تھی انگریزی حکومت کے قیام کے بعد ہندوستانی دست کاروں کو زوال آنا شروع ہوا۔ اور پشمینہ سازی کی صنعت بھی اس کی زد میں آنے لگی۔ خواجہ جمال الدین بھی پشمینے ہی کی تجارت کرتے تھے[2]۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کو مالی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ چنانچہ انہوں نے تجارت کے پیشے کو خیر آباد کہا۔ اور قانون کی طرف متوجہ ہوئے۔ خواجہ جمال الدین کے پانچ بیٹے تھے۔ سب سے بڑے صاحبزادے کا نام خواجہ عبدالغنی تھا۔ جو اپیل نویسی کا کام کرنے لگے۔ دوسرے بیٹے خواجہ اسد اللہ وکیل ہوئے۔ تیسرے میاں حبیب اللہ تھے جو مختار رہے۔ انہوں نے ۲۷ جون ۱۹۳۱ء کو سری نگر (کشمیر) میں تقریباً ۹۰ برس کی عمر میں انتقال کیا۔ چوتھے بیٹے مولوی غلام نبی تھے۔ جو نہ صرف کتابوں کی تجارت کرتے تھے بلکہ خود بھی تصنیف اور

---

[1] ۔ راقم الحروف کے نام بیگم صفیہ منٹو کے ایک خط سے۔

[2] ۔ منٹو کے بزرگ امرتسر کے کشمیری تھے۔ اور پشمینہ سازی اور شال بافی امرتسر کے کشمیریوں کا خاص طور پر ذریعہ معاش تھا ولیم مور کرافٹ نے اپنے سفرنامے میں لکھا ہے "امرتسر میں شال کافی تعداد میں تیار کئے جاتے ہیں۔ یہ صنعت کشمیری خاندانوں کی شروع کی ہوئی معلوم ہوتی ہے" یہاں اس بات کا ذکر نا بیجا نہیں ہوگا کہ شال بافی کی صنعت کشمیر کی قدیم صنعتوں میں سے [illegible] حضرت شاہ ہمدان حضرت میر سید علی ہمدانی ایران سے تشریف لائے۔

تالیف کا کام کرتے تھے سب سے چھوٹے مولوی غلام حسن تھے۔ جو سب جج ہوئے۔ اور ۲ فروری ۱۹۳۲ء کو ۶۲ سال کی عمر میں وفات پا گئے۔ یہی مولوی غلام حسن منٹو کے والد بزرگوار تھے۔ جنہوں نے دو شادیاں کی تھیں۔ جن سے کل ملا کر ۱۲ بچے ہوئے ملاحظہ ہو خاندان منٹو کا شجرۂ نسب:



منٹو خاندان کے شجرہ نسب کا مطالعہ کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ لوگ کشمیری تھے۔ جن کہ ان کے مردوں اور عورتوں کے نام اب تک مروجہ کشمیری ناموں سے ملتے ہیں۔ حمزہ جو، رسول جو، تاج مالی، زون مالی، سکندرہ مہتاب وغیرہ وغیرہ۔

سعادت حسن منٹو سمبرالہ (ضلع لدھیانہ) میں ۱۱ مئی ۱۹۱۲ء کو پیدا ہوئے۔ ان کی والدہ مولوی غلام حسن کی دوسری بیوی تھیں۔ مولوی صاحب کی پہلی بیوی سے بہت سے بچے ہوئے تھے[۱] انہوں نے ان کی تربیت کی طرف خاص توجہ دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مولوی صاحب کے انتقال کے بعد منٹو کی والدہ کے پاس اپنے بیٹے اور بیٹی کی پرورش کے لئے کوئی سرمایہ باقی نہ رہا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ سعادت حسن نے بچپن سے ہی گھر میں افلاس اور ناداری کے سائے منڈلاتے ہوئے دیکھے اور یہ احساس ان کے شعور کا ایک حصہ بن گیا۔

سعادت حسن منٹو کی شادی بھی ایک کشمیری گھرانے میں ہوئی تھی۔ ان کی رفیقۂ حیات بیگم صفیہ منٹو افریقہ کے مشہور قومی کارکن خواجہ شمس الدین کی بھتیجی تھیں۔ وہ افریقہ کی پارلیامنٹ کے ممبر تھے۔ اور ان کے والد افریقہ ہی میں پولیس انسپکٹر تھے۔ اور وہیں کسی حبشی نے ایک جھگڑے میں ان کو قتل کر دیا تھا۔ یہ شادی منٹو کی والدہ نے خود طے کی تھی۔ اس لئے کہ وہ دونوں خاندان کشمیری تھے۔ اور یہ ان کی سب سے بڑی تمنا تھی۔ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

دیپ بندو بیٹائی

تڑپ

میں قطبِ شکستہ ہوں
صدیوں پرانا
چوس رہا ہوں کب سے
پانی کے قطرے
زمیں کی نچلی پرتوں سے
گزارتا رہا ہوں شب سے
تہذیب کی زندگی
برگِ آرزو کو تھام کر
اور ڈرتا رہا ہوں اکثر
بادِ صرصر سے
برف کے بھاری بوجھ
دھوپ کی تپش سے
لکڑہارے کی کلہاڑی سے
مگر اب
نجانے کیوں ! — ؟
لرز رہا ہوں
ٹینکوں کی پیش قدمی سے
بارود کے دھماکوں سے
طیاروں کی گڑگڑاہٹ سے
مگر ۔ مگر پھر بھی
آشا — میری آشا
اس صدی کی آشا
میرے سائے کو
تحفظ سمجھ کر
گہری نیند سو رہا ہے
جبکہ گرگٹ
برگد کے پیڑ سے لپٹ کر
نیلے آکاش میں
ایک سفید کبوتر کا
تعاقب کرتے ہوئے
باز کو دیکھ کر
تڑپ رہا ہے
اور میں
لب سی کر، نظریں جھکائے
رو رہا ہوں
صلیب پہ لٹکے ہوئے
مسیحا کی طرح —— ..

رؤف خیر

اکویریم

(آزاد مثنوی)

ایک اکویریم میں بہت پیاری مچھلی تھی
پھر جانے کیا ہو گیا
کیا دھکا لگا
گر کے ٹوٹا وہ اکویریم ۔ پانی سب بہہ گیا
قبل اس کے کہ وہ آخری سانس لے
میں نے اپنی ہتھیلی میں تھوڑا سا پانی لیے
آخری سانس لیتی ہوئی خوبصورت سی مچھلی کو
جینے کا ایک حوصلہ تو دیا
پھر تو سچ مچ ہی وہ جی اٹھی
گھر کے کونے میں چھوٹا سا جو حوض تھا
اس کے حق میں سمندر تھا
پھر یوں ہوا
حوض کا پانی گدلا گیا
میں نے سوچا کہ اس خوبصورت سی مچھلی کو
بے حوصلہ کرنے سے بہتر یہی ہے کہ
تالاب میں چھوڑ دوں
وہ صدف جیسی آنکھوں سے میری طرف دیکھتی تھی
اور میں اپنی آنکھوں میں موتی لیے
اس کی آنکھوں کی ہر التجا سے گزرتا گیا
اور پھر یوں ہوا
گھر کے پیچھے جو تالاب تھا
اس کا پانی بھی سب سڑ گیا
اور پھر — اس سے پہلے کہ وہ خوبصورت سی مچھلی
کہیں آخری سانس لے
میں نے اس کو سمندر کے حوالے کیا
وہ صدف جیسی آنکھوں سے میری طرف
دیکھتی رہ گئی
اور میں اپنی آنکھوں میں موتی لیے
اس کی ہر التجا سے گزرتا گیا

کل اچانک ملاقات ہونے پہ مچھلی نے مجھ سے کہا
اس سمندر سے بہتر وہ اکویریم تھا
جہاں کم سے کم میری پہچان قائم تھی
پھر وہ صدف جیسی آنکھوں سے میری طرف
دیکھتی رہ گئی
اور میں اپنی آنکھوں میں موتی لیے
اس کی آنکھوں سے نظریں چراتا ہوا
ٹوٹے اکویریم کی جو کرچیں تھیں
پلکوں سے چنتا رہا۔

خالد خورشید

ایجاد

چادر کی لمبائی
دیکھ کر
ہاتھ اور پیر پھیلانے والو!
تم ترقی کی راہ میں
سب سے بڑی رکاوٹ ہو

چادر کی لمبائی
پوری نہ پاکر
تم اپنے ان
ہاتھ اور پیروں کو
سمیٹ نہیں لیتے
بلکہ
کاٹ ڈالتے ہو
جنہوں نے کل
تمہارے لئے چادر بنائی تھی
اور جو آج
اس چادر کی لمبائی
بڑھا بھی سکتے تھے
مگر......
کیا تمہیں نہیں معلوم کہ
ضرورت ایجاد کی ماں ہوتی ہے۔

سمیر انجن
فردوس گیاوی (مترجم)

صبح کی مسکراہٹ

تمہاری
صبح کی مسکراہٹ
میری زندگی کی ہر شام کو
خوابیدہ گلاب کی شاخوں پر
چھوڑ دیتی ہے
اور میں!
جب صبح کو
نیند کی وادیوں سے لوٹتا ہوں
تب میری آنکھوں میں بھر آتی ہے
تمہاری کبھی نہ ختم ہونے والی مسکراہٹ
اور میں!
کھِل اٹھتا ہوں، تازہ گلاب کی مانند
مگر ہر رات
نیند آنکھوں میں بھرنے سے پہلے
تمہاری آنکھوں میں اپنی آنکھیں ڈال کر
دیتا ہوں میں اپنی حسرتوں کو زندگی
اور
رات کے دو پہر کے بعد ہو جاتا ہوں سجدہ ریز
تم اسے جھوٹ سمجھو
یا حقیقت جانو
ان دنوں میں اسی طرح
گزار رہا ہوں زندگی کے روز و شب
اگر ایسا نہ کروں!
تو شاید
میری زندگی کی صبح ہی نہ ہو۔

فضل امام ملک

آدم خور

رک جاؤ!
ادھر کہاں جا رہے ہو؟
تم وہاں تک پہنچ نہیں سکتے
جہاں تم جانا چاہتے ہو
اس گھر کے چاروں سمت
کانٹوں کی ایک باڑ ہے
اور بھیتر باہر
دیوار سے پرے
اسٹین گن رائفل اپنے ہاتھوں میں
سنبھالے
پہرہ دیتے ہوئے
کچھ لوگ ——!
جو ذائقہ لے چکے ہیں
انسانی لہو کا——!
تم آدمی ہو——!
ایک معمولی آدمی——!
کانٹوں کی باڑ پھلانگتے ہی
انکی انگلیاں ٹریگر پر
دب جاتی ہیں
اور پھر سب کچھ شانت ہو جاتا ہے
رک جاؤ——!
ادھر مت جاؤ
تم نہیں جانتے
کانٹوں کی باڑ آدم خور
بن گئی ہے۔

غزلیں

پروفیسر وحید اختر

اک خوفِ بے اماں کے شرارے ہوا میں ہیں
جوالا مکھی چھپے ہوئے ساری فضا میں ہیں

عفریت شکل پھرتے ہیں راہوں میں بے نقاب
گل چہرگان بجبر نقابِ خفا میں ہیں

عقدہ کھلے یہ کیسے نگاہوں کو فکر ہے
یہ مہر ہیں کہ ماہ جو بندِ قبا میں ہیں

انوارِ حق کے سر تو سناں پر ہیں ضو فگن
سمٹے ہوئے اندھیرے جبینِ ریا میں ہیں

خوشنودیِ جہاں میں بھی وہ لذتیں کہاں
جو برہمیِ زلفِ دغا آزما میں ہیں

ہیں دامنِ خزاں پہ بہاروں کے خون کے داغ
کچھ گل گذشتہ رُت کے چمن کی خزاں میں ہیں

سناٹے کے لبوں پہ ہیں گزرے دنوں کی چاپ
پژمردہ زرد پتیاں صحنِ فضا میں ہیں

دستک دروں پہ دیتی ہے خود آ کے قتل گاہ
خنجر کھلے ہوئے کفِ دستِ خدا میں ہیں

خوباں کے دل دھڑکتے ہیں سن کر جسے وحید
تیور رجز کے بھی اسی رنگیں نوا میں ہیں

حفیظ ادیب سنبھلی

فائدہ کیا تھا ادھر بھی اپنا
عیب ہی نکلا، ہنر بھی اپنا

ہم اسی بے صدفی پر خوش ہیں
لو سنبھالو یہ گہر بھی اپنا

میں ہوں خود موسمِ ہجرت کا ثمر
دھوپ بھی اپنی، شجر بھی اپنا

ہر قدم پہ یہ کھنڈر کیسے ہیں
تھا اسی راہ میں گھر بھی اپنا

خون کا رشتہ ہے سچا لیکن
مسئلہ الجھا ادھر بھی اپنا

یہ جو پتھر ہے بھلا کس کا
زخم تو اپنے ہیں، سر بھی اپنا

سانس بھی بیٹھ گئی صورتِ گرد
لو ہوا ختم سفر بھی اپنا

شب گزیدہ ہوں کہ ٹھہرا میں چراغ
منہ ذرا دیکھے سحر بھی اپنا

بھیڑ میں نقل نویسوں کی فنا
گم ہوا حرفِ دگر بھی اپنا

غزلیں

جوہر صدیقی

اندھیرا شعلہ بداماں ہے کیا کیا جائے
گمانِ جشنِ چراغاں ہے کیا کیا جائے

جنوں کو فرصتِ آرائش جمال نہیں
کسی کی زلفِ پریشاں پر کیا کیا جائے

نظر کے سامنے نازک سا آبگینہ ہے
شکستِ سنگ کا امکاں پر کیا کیا جائے

غضب خدا کا ہم ایمان لائے ہیں جس پر
وہ ایک دشمنِ ایماں ہے کیا کیا جائے

جہاں کوئی نہیں شائستہ شکستہ دلی
وہاں ضیافتِ مژگاں پر کیا کیا جائے

چمن میں دیدۂ نرگس کو نور دے کر بھی
نصیبِ عشق بیاباں پر کیا کیا جائے

صبا کے ساتھ میں جھنکار بھی ہے خوشبو بھی
گلوں کے سائے میں زنداں پر کیا کیا جائے

دلِ حزیں کی تب و تاب سے خدا سمجھے
ہوا کے آنے سے لرزیاں پر کیا کیا جائے

گئی انجمن کو چلے تو ہیں ہم مگر جوہر
وہاں بھی غیر کی دربان ہے کیا کیا جائے

علی عباس عزل

دبائیں دانتوں میں اب اہلِ مصلحت انگلی
ہمیں جو جھوٹ لگا سچ لگا وہ کہہ نکلے

بچا تھا کون جو زنداں کے در تک ہی آتا
ہم ہی تھے جو ترے مہر و وفا کو سہہ نکلے

سزا سمجھ کے دیا تھا یہ ریگ زارِ جہاں
ہزار چشمے مرے نقشِ پا سے بہہ نکلے

میں تیرے غم کو محض اک پرت کا سمجھا تھا
خدا کا شکر کہ غم اس سے تہہ بہ تہہ نکلے

یہ راستہ ہی طلسمات ہے کہ ہم سرخوش
جدھر سے نکلے ترے میکدے کی رہ نکلے

سیاہ رات میں جو دل جلا کے چلتے ہیں
انھیں یہ فکر کہاں زہرہ نکلے مہ نکلے

سنا تھا شہر میں اب کوئی شہریار نہیں
یہاں تو جتنے ملے سب مثالِ شہ نکلے

دلوں کی وادیاں ایسی تو سنگلاخ نہ تھیں
کہ آنسوؤں سے بھی سینچیں تو صرف کہہ نکلے

وہ بزم گرم خلا میں بکھر چکی ہے عزل
تپش سے جس کی ہزار آفتاب کہہ نکلے

سردار شفیق

کوئی کتابِ فنِ شعر میں اگر لکھنا
مرے لئے بھی ذرا حرفِ معتبر لکھنا

وہ شعر فہم بھی ہے زود رنج بھی ہے بہت
کچھ اسکو لکھنا تو خامہ سنبھال کر لکھنا

زمانہ بیت گیا ہم کو پر سمیٹے ہوئے
وہاں جب آنے لگے موسمِ سفر لکھنا

میں سب کو اپنی طرح اہلِ دل سمجھتا ہوں
مجھے ہے ننگ کسی کو بھی کم نظر لکھنا

زباں سے نکلے خلاؤں میں منتشر ہو جائے
مرا کلام ہواؤں کے دوش پر لکھنا

سمیٹ لینا اسے اپنی ذات کے اندر
تم اپنے گھر کا کوئی واقعہ اگر لکھنا

ہم اہلِ فن ہیں ہمارا یہی سلیقہ ہے
کسی طویل کہانی کو مختصر لکھنا

قلم نہ دیجئے شب زادگاں کے ہاتھوں میں
کچھ انکے بس میں نہیں صحفِ سحر لکھنا

نہیں ہے جذبوں میں گرمی تو شاعری بس کرو
کوئی کمزوری نہیں شعر عمر بھر لکھنا

جواں ہوا ہے میرا فن فضا[1] کے سائے میں
شفیق دشت میں اسکو شجر لکھنا

[1] فضا ابن فیضی

غزلیں

سیفی سرونجی

رحب محفل تمہارے نام کا لے کے چلی
استاں وہ داستاں اک سلسلہ لیکے چلی
نفا تھا آ گیا جو نام لب پر قیس کا
ب صحرا مجھے بادِ صبا لے کے چلی"
ں بھٹکتا پھر رہا تھا دشت میں تنہا مگر
ہر کی جانب مجھے بانگِ درا لے کے چلی
کا فن کس طرح لائے غزل میں یہ سفر
ساعری اک فقط نام خدا لے کے چلی
نہیں تھی جبیں کوئی گھر تو سیفی نام تھا
ا دیکھئے اس کو ہوا لے کے چلی

حبیب ستون

ظرف تیروں کا بہر حال نمو ہونا تھا
وار ایسے تھے کہ سینوں کو لہو ہونا تھا
قید سورج کی شعاعیں کہو کیسے ہوتیں
میں وہ نغمہ تھا جو آہنگ گلو ہونا تھا
سوچ کے دشت میں پھر خواب کی کونپل پھوٹی
پھر کسی شاخ کو پتوں سے رفو ہونا تھا
تیرگی شہر خرابہ میں ابھی ہے باقی
گھر کے شعلوں کو ابھی اور نمو ہونا تھا
جان بخشی کی اماں اسکے ہی سینہ میں ملی
آخرش سوز یہ احسانِ عدو ہونا تھا

محمد ابراہیم کوشش

پھولوں کی مہک لیکر کانٹوں کی چبھن لیکر
اس دور میں جیتے ہیں ہم رنگِ چمن لیکر
ہاں یہ ترے دیوانے ہاں یہ ترے شیدائی
مرنے سے نہیں ڈرتے پھرتے ہیں کفن لیکر
ہم خواب کے ماروں کی پرسوز کہانی ہے
ہر وقت سحر اٹھے آنکھوں میں جلن لیکر
کیا خوب! وہ ملتے ہیں نیرنگیٔ فطرت سے
پتھر سا جگر لے کر شیشے سا بدن لیکر
انداز میں مومن کے کہتے ہیں غزل کوشش
اس بزم سے اٹھیں گے ہم دادِ سخن لیکر

[illegible]

ہ تیری روح تک حسن کی تفسیر بھر گیا
ظلمتوں میں مجھ کو تنویر کر گیا
یں اشتمالیت کا طرفدار کیوں نہ ہوں
وطیت کے دور سے کب کا گزر گیا
نائی کے فلسفے کو رقیبوں کی ساز باز
ب آزمائشوں سے آساں گزر گیا
وہ ایک ہی تو تھا جاں بلب جس نے وقت مل
ہر کو پلایا زہر کہ میں پی کے مر گیا
قبال کے کلام کے ہو نکتہ داں حبیب
لیتے ہیں تم سے علم کا تیور سنور گیا

عائشہ سلوی

میں کچھ بھی تھا مگر تیری نظر میں تھا
تیرہ شبی کا خوف نہ میری سحر میں تھا
قصرِ بالا کے مکیں گویا سماعت سے محروم تھے
ہاں اک فقیر نے دیا کہ جو اسکے گھر میں تھا
میں ہی نہ پار کر سکا حدِ نیاز و عاجزی
کہتے ہیں لطف و کرم بہت تیرے سنگِ در میں تھا
مرا قرب سورج تو نہ تھا کہ اس کو کھا جاتا
ڈوبے دیکھا تھا جسے میں نے تو سایہ شجر میں تھا
ہم اڑ لے تھے آسمانوں کا بدن چھونے مگر
خود آسماں گرا لائیں ہر خاک کے پیکر میں تھا

غلام ناشی

بیدرد اس جہاں سے بھلا مجھ کو کیا ملا!
اپنے ہی اشکِ غم میں مجھے ڈوبنا پڑا
میں نے ستم کی گود میں کاٹی ہے زندگی
اے دل ابھی سے کیوں ہوا تو بدحواس سا
دھرتی الم کی بوجھ سے جب ہو گئی نڈھال
اٹھ کر غبارِ کرب فضاؤں پہ چھا گیا
سلگا کبھی جو سینے روح تک یاد کرن
سورج نہیں تھا گو وہ کسی آسمان کا
میرا وجود سب سمجھ لے کیوں عذاب ہے؟
ناشی سمجھ سکا نہ میں ابتک یہ ماجرا

بہار میں اقلیتوں کے مفاد میں سرکار کے ذریعہ اٹھائے گئے قدم

حکومت بہار صوبہ کے اقلیتی فرقے کے لوگوں کی ترقی اور کلیان کے لئے کمربستہ ہے۔ وزیراعظم شری راجیو گاندھی کی رہنمائی میں صوبائی حکومت ایسی کئی یوجنائیں سختی سے عمل میں لا رہی ہے جن سے ان اقلیتوں کو نیشنل مین اسٹریم سے جوڑنے میں ضروری مدد ملے گی۔ اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دینے، مدرسوں اور اردو ٹیچروں کو آسانیاں دینے، بنگلہ، زبانی وغیرہ زبانوں کی ترقی کے لئے مختلف اکاڈمیاں قائم کرنے، اردو روزناموں کے لئے ٹیلی پرنٹر لگانے کے لئے کل خرچ کی آدھی رقم مدد کی شکل میں دینے اور پٹنہ میں اردو کا میکس قائم کرنے جیسی اہم سعی کے علاوہ سرکار کے ذریعہ مندرجہ ذیل کام کئے جا رہے ہیں:

۱۔ خاص فساد مخالف پولس بل میں ۲۰ فیصد کو چھوڑ کر اقلیتی فرقے کے لوگوں سے ہی بحالی۔

۲۔ اقلیتوں کی اقتصادی ترقی کے لئے سرکار کے ذریعے ۱۰ کروڑ روپے کی حصہ پونجی سے بہار اسٹیٹ اقلیتی مالیاتی کارپوریشن کا قیام عمل میں آچکا ہے۔ یہ کارپوریشن کمرشیل انتظام کے لئے مذہبی اقلیتوں کے ایسے باشندوں کو جن کے خاندان کی سالانہ آمدنی (کھیتی سے ہونے والی آمدنی کے ساتھ) ۱۲ ہزار روپے سے زیادہ نہ ہو معاشی اور پیشہ ور کاموں کے لئے ۴۰ فیصد (زیادہ سے زیادہ ۱۰ ہزار روپے) قرض کے طور پر صرف ۵/ روپے سالانہ سیکڑہ سود کی در پر دیا جائے گا۔ یوجنا لاگت کا باقی ۶۰ فیصد قرض کی شکل میں دوسرے بینکوں سے فراہمی کا انتظام کرایا گیا ہے۔ قرض کے لئے درخواست ضلع ادھیکاری اپنے ذریعے لیں گے اور اس کی جانچ پڑتال اور اپنی سفارش کے ساتھ قرض کے لئے درخواست کو بینکوں کے افسران کو بھیجیں گے۔

صوبائی حکومت کے ذریعے انوسوچت ذات اور جن ذات لوگوں کے اقتصادی اور سماجی ترقی کے لئے ایسے کارپوریشنوں کا قیام پہلے ہی عمل میں آچکا ہے۔

وزیراعلیٰ شری بندیشوری دوبے کی خلوط قیادت میں صوبائی حکومت اقلیتوں کو پوری طرح تحفظ دینے کے لئے پرعزم ہے۔ سرکار امید کرتی ہے کہ سبھی فرقوں کے لوگ بڑی محنت سے بنائے اتحاد اور ایکتا کے ماحول کو بنائے رکھنے میں ہر ضروری مدد دیں گے۔

محکمہ تعلقات عامہ بہار

[illegible] 261-87 ([illegible]-218)/[illegible]

لمحوں کا کرب

شاہد بارکپوری
(انڈیا)

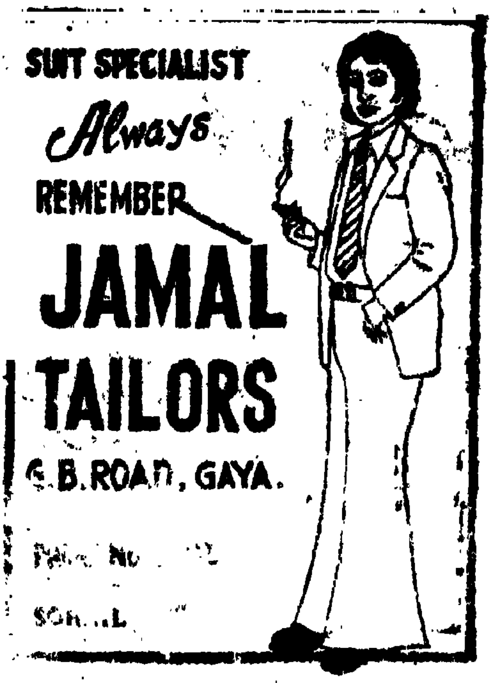
نوکری یا بیوی کسی کی قسمت میں ایک ساتھ نہیں ہوتی۔ خاور کو نوکری اچھی مل گئی، مگر جہاں تک سلسلہ ازدواج میں بندھنے کا تعلق ہے، اس میں کامیابی نصیب نہ ہوئی۔ گورنمنٹ کالج میں معاشیات کا لکچرر تھا پستہ قد ہونے کے باوجود متناسب خدوخال، گورا چٹا رنگ، نیک دل اور سادہ لوح تھا۔ چند طالبات کے ساتھ محبت کا پودا پروان چڑھا۔ دونوں طرف آگ برابر لگی ہوئی تھی۔ لڑکی خوبصورت اور خوب سیرت تھی۔ دونوں ایک دوسرے کو دل و جان سے چاہتے تھے۔ لوگوں کا خیال تھا کہ اب اس کے سہرے کا پھول کھلے گا، مگر اس کے درمیان والدین دیوار بن کر کھڑے ہو گئے۔ لڑکی کو ڈرامے کا شوق تھا۔ اس کے والدین کسی اداکارہ کو اپنی بہو بنانے کو تیار نہ تھے۔ خاور ان فرسودہ باتوں کا قائل نہ تھا مگر والدین سے احتجاج کی جرأت بھی نہ تھی، چنانچہ یہ بیل منڈھے نہ چڑھ سکی۔

دوسرا واقعہ اس وقت شروع ہوا، جب اس کے مکان میں نیا کرایہ دار آیا۔ اس کی ایک لڑکی تھی جس نے میٹرک پاس کر کے کالج میں داخلہ لیا تھا۔ لڑکی کے والد ریٹائرڈ مجسٹریٹ تھے، بلکہ ریٹائرڈ ہونے سے پہلے کرپشن کے الزام میں برطرف کر دیے گئے تھے۔ پہلے انہوں نے چھوٹا موٹا کاروبار کیا، پھر بلیک مارکیٹنگ کا دھندا شروع کیا۔ ایک پیر کے مرید بھی تھے۔ دو بڑی لڑکیوں کی شادی کر چکے تھے۔ چھوٹی لڑکی صنوبر کالج میں اور ایک لڑکا سیفی ساتویں جماعت میں زیر تعلیم تھا۔ اچانک ایک دن صنوبر اور خاور کی نظریں ملیں۔ کیوپڈ نے تیر چلایا۔ چند ہی دنوں میں سیفی کی معرفت نامہ و پیام شروع ہو گیا۔

چوری چھپے ملاقاتیں بھی ہونے لگیں۔ جب والد کاروبار کے سلسلے میں گھر پر موجود نہ ہوتے اور ماں سوشل ورک کے لیے باہر چلی جاتی تو دونوں کو ایک دوسرے سے ملنے کا موقع مل جاتا۔

دونوں پیار کے بندھن میں جکڑ چکے تھے۔ خاور نے شادی کا پیغام بھجوایا۔ اس نے اپنے والدین کو صنوبر کی تمام خوبیاں گنوا دیں۔ تصویر بھی بھیج دی۔ لڑکی کو نئی تہذیب کی ہوا نہیں لگی تھی اور ڈرامے سے کوئی شغف نہیں تھا۔ اسی لیے اس کے والدین شادی کے لیے رضامند ہو گئے۔ شادی کی تاریخ طے ہوئی تھی، صنوبر کے والد کوئی بھی کام شروع کرنے سے پہلے اپنے پیر و مرشد سے صلاح مشورہ ضرور کرتے تھے۔ پیر کے چہرے سے جاہ و جلال ٹپکتا تھا۔ گنڈے تعویذ بھی کرتے تھے۔ وہ بغیر تفتیش کیے، شادی کی اجازت نہیں دے سکتے تھے۔ ایک دن انہوں نے استخارہ کیا۔ تاکہ لڑکی کے والد کو شادی کے فیصلے سے آگاہ کر سکیں۔ خاور نے کافی دنوں تک انتظار کیا۔ پیر صاحب کا فیصلہ شادی کے حق میں نہ تھا۔ انہوں نے استخارے سے معلوم کیا کہ شادی ناکام ہو جائے گی اور لڑکی بھی سکھی نہ رہ سکے گی۔ شادی ٹوٹ گئی۔ خاور کے دل پہ چرکہ لگا۔ اس نے چپکے سے پیر صاحب کی بڑی اور چھوٹی بیوی سے ملاقات کی، مگر کوئی فائدہ نہ ہوا۔ صنوبر بے بس تھی۔ [illegible] مرشد کی مرضی کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھا سکتی تھی۔ سارا گھرانا پیر کا معتقد تھا۔ پیر صاحب کی بدولت انہیں کاروبار میں دن دونی رات چوگنی ترقی ہوئی تھی۔

خاور کے مقدر پر ظلمت کی سیاہی پھیل گئی تھی۔ پچھتاوے کا زہر اندر اندر چاٹ رہا تھا۔ [illegible]



تھا۔ اب اس کا خمیازہ بھگت رہا تھا۔ پیر صاحب کے ذریعہ
سے جو سزا ملی، وہ اس کا مستحق تھا۔ واقعی وہ کامل آدمی تھے۔
کی کرامات کا علم اسے بعد میں ہوا۔

نادر کو اتنا قلق ہوا کہ اس نے دوسرے ضلع کے گورنمنٹ
میں اپنا تبادلہ کروا لیا۔ عرصہ تک اس شہر میں آنا نہ ہوا۔ چار
سال کے بعد آفس کے کسی کام سے آنا پڑا۔ آدھی رات کو جب
ٹرین سے اترا تو اسٹیشن پر ٹوپی والوں اور داڑھی والوں کا مجمع
دیکھا۔ تھوڑے فاصلے پر منور کا چھوٹا بھائی سہیل کھڑا تھا۔
اب وہ کچھ بڑا ہو گیا تھا۔ مسیں بھیگ گئی تھیں۔ سر پر ٹوپی پہن
رکھی تھی۔ نادر نے اس کے قریب پہنچ کر پوچھا۔ تم ادھر کہاں؟

سہیل نے نادر کو دیکھ کر سلام کیا اور ہنس کر کہا: چھوٹے
دولہا بھائی حج کر کے واپس آ رہے ہیں۔

نادر نے حیرانی سے پوچھا: وہ کون؟"

اس نے جواب دیا۔ ہم لوگوں کے پیر و مرشد۔"



نسیم بن آسی (مغل سرائے)

لفڑا

سورج کا قتل ہو گیا تھا اور اُس کے چھینٹے آسمان پر بکھرے تھے۔ دن نے کہیں منھ چھپا لیا تھا۔ پرندے بین کرتے ہوئے اپنے بسیروں کو لوٹ رہے تھے۔ نندو گھر آتے آتے اکثر شام گہری ہو جاتی۔ آج بھی اُسے دیر ہو گئی تھی جب اُس کے مزدور ساتھی چلے جاتے تو وہ رک جاتا۔ اور بچے ہوئے کاموں کو کرنے لگتا جس سے مالک خوش رہے۔ کام کیا تھا۔ اور بہت دنوں تک گھر داخل ہوا۔ اندھیرے میں اُسے کوئی چیز صاف نظر نہ آئی۔ دن میں بھی اُس کے گھر میں اندھیرا ہی رہتا تھا۔ اس لئے کہ اس میں صرف دروازہ تھا۔ دروازہ سامنے کچھ اجالا رہتا۔ جب دروازہ بند ہو جاتا تو تھوڑا بہت اجالا بھی غائب ہو جاتا۔ نندو نے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔ دلاری راجو کو لئے بیٹھی تھی۔ اس کا چہرہ غمگین اور اداس تھا۔ راجو کی کراہ سن کر اس نے ماتھا کا پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔

"کیا ہو گیا؟"

"ٹرک سے دھکا لگ گیا ہے۔ سر میں کافی چوٹ آئی ہے۔ بھگوان نے جان بچا دی۔"

"کیسے دھکا لگ گیا۔" "لوگوں کا کہنا ہے، ٹرک والے کی غلطی تھی۔ وہ غلط سائڈ سے جا رہا تھا۔"

یہ ٹرک والے بے اولاد ہوتے ہیں کیا؟ اولاد ہوتی بھی ہو گی تو اُن کی نہیں۔ جب ہی تو یہ اتنے بے رحم ہوتے ہیں۔ ٹرک کے ماتھے پر لکھا ہوتا ہے بھگوان تیرا سہارا! اپنی جان کے لئے بھگوان کا سہارا۔ دوسروں کی جان کے لئے؟ شائد ان کے پاس دماغ نہیں ہے۔ آنکھیں بھی ہیں تو پتھر کی جاو ٹرک ڈرائیور اُسے کہیں مل جاتا تو وہ اُسے ضرور گولی مار دیتا۔ لیکن گولی اس کے پاس ہے کہاں؟ مزدور گولی کھا سکتا ہے، مار نہیں سکتا۔ اُسے اپنے پر رونا آگیا۔ منا کب آیا؟

وہ سسرال میں تھا۔ رخصتی کے وقت بیوی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ نندو نے کہا

"میں اسے نہیں لیا جاؤں گا۔"

لوگ ہنسنے لگے "ارے بھئی، عورتیں تو روتی ہی ہیں۔"

نندو کو اپنے دل پر پتھر باندھ کر دلاری کو رخصت کرانی پڑی تھی۔ لیکن اس کے بعد وہ سسرال اسے لینے کبھی نہیں گیا۔ یہ کام اس نے اپنے ایک دوست کے سپرد کر دیا۔ اتنے رحم دل نندو کے اندر آج یہ طوفان کیوں اٹھ رہا تھا؟ صرف اس لئے کہ بہت جھک مارنے کے بعد اُسے یہ کام ملا تھا۔ بیکاری میں اُسے بہت پاپڑ بیلنے پڑے تھے۔ اب یکایک اسے حادثے کا نظارہ آگیا!

نندو نے دلاری کی طرف دیکھا۔ جو راجو کا سر گھٹنے داب رہی تھی۔ باہر شام کا دھندلکا اندھیرے میں

تبدیل ہو رہا تھا۔ اور گھر کا دیا آخری ہچکی لینے کی کوشش کر رہا تھا۔ راجو برابر کراہے جا رہا تھا۔ اس نے سوچا' صبح اُ-
کام پر جانے کے بجائے کسی ڈاکٹر کے ہاں جانا ہوگا۔ ڈاکٹر ایس۔ ایس چکرال سب سے بڑا ڈاکٹر ہے۔ صرف زکام -
پچیس روپئے لیتا ہے! پھر اُسے اپنی جیب کا خیال آیا۔ جو تھی ہی نہیں! ابھی کل ہی اُسے حساب ملا تھا۔ اُ
نے پوری مزدوری دلاری کے ہاتھ پر رکھ دی تھی۔ اس وقت پچیس سال کی دلاری سولہ سال کی معلوم ہونے لگی
اس نے کئی سپنے بُن لئے تھے۔ یہ جانتے ہوئے کہ اس کے سپنے کبھی پورے نہیں ہوتے ——— !

اس نے سوچا وہ اپنی ایک ہفتے کی مزدوری ڈاکٹر کے حوالے کر دے گا ——— ڈاکٹر! جلد اس بچے
کو اچھا کر دو۔ میرے پاس وقت نہیں۔ اس نے سنا تھا' بڑے لوگوں کے پاس وقت نہیں ہوتا ہے۔ تو
وہ بڑا آدمی ہے ——— ——— ؟

رات کے لمبے سفر کو کاٹتی ہوئی صبح ہوئی ——— صبح سب کی ہوتی ہے۔ لیکن نندو کی صبح اور تھی ———
اس میں اندھیروں کے ان گنت تار لپٹے ہوئے تھے۔ اور صبح کام پر جاتے وقت دلاری نندو کو پوٹلی میں باند
کھانا دیتی تھی۔ جسے وہ دوپہر کو چھٹی ہونے کے بعد کھاتا تھا۔ لیکن آج ——— وہ ایک طرف چپ چاپ
بیٹھی تھی۔ من میں اندھیرا تھا۔ جس کا کوئی اور تھا نہ چھور ——— !

صبح کے نو بج چکے تھے۔ اس نے راجو کو اپنے کندھے سے لگایا۔ جب وہ گھر سے نکلا تو دلاری اُس کے پیچھے آ رہی
تھی ——— راستے بھر دونوں خاموش تھے۔ نندو سوچ رہا تھا ——— اس کے سارے ساتھی کام پر
صرف وہ غیر حاضر ہے۔ کہیں وہ کام سے ہٹا نہ دیا جائے ——— ؟ سامنے ڈاکٹر ایس۔ ایس چکرال کا نام
بورڈ دکھائی دینے لگا تھا ——— اُس پر اُس کی لمبی ڈگری بڑے بڑے حروف میں نظر آ رہی تھی۔ جو نندو
کی سمجھ سے باہر تھی ——— راجو پھر کراہ اٹھا ——— نندو سوچنے لگا ——— یہ بھی کتنے جنم کا پاپ ہے۔ اسے بچہ
وہ بھگت رہا ہے۔ اس نے راجو کو دلاری کے سپرد کر دیا۔ اُس کا کندھا اتنا کبھی نہیں دکھا تھا ——— !

ڈاکٹر چکرال اپنے چیمبر میں بیٹھا تھا۔ اور حسب معمول اُس کے پاس کوئی مریض نہ تھا۔ نندو نے کہا ———
" ڈاکٹر صاحب! اسے دیکھ لیں۔ ٹرک سے دھکا لگ گیا ہے' پیر میں زیادہ چوٹ آئی ہے ——— "
ڈاکٹر نے پیر دیکھا۔ اور کہا !
" فریکچر ہو گیا ہے۔ ایکسرے ہوگا۔ "
" کہاں ہوگا؟ "
" کبیر چورا "

نندو نے ڈاکٹر کے سائن بورڈ کو دیکھا۔ پھر اُس کی لمبی ڈگری کو۔ پھر ڈاکٹر کو۔ اب نندو کو کبیر چورا ہسپتال جانا
——— جسے کبیر داس نے ہرگز نہیں بنوایا تھا۔ اُسے شیو پرشاد گپت نے بنوایا تھا لیکن کبیر چورا پر واقع ہو-
نے کی بنا پر کبیر چورا کے نام سے مشہور ہو گیا ——— مرڈ مرڈ کی بات ہے۔ پیڑ کسی نے لگایا ——— پھل کوئی کھائے۔
نندو نے گھڑی دیکھی۔ دوپہر کے گیارہ بج رہے تھے۔ لیکن اس کے اپنے بارہ بج رہے تھے سا-
بس اسٹینڈ تھا۔ بسیں لگی تھیں نندو کراہتے ہوئے راجو کو لے کر بس پر چڑھ گیا اُس کے پیچھے
دلاری تھی۔ جس کی خواری رو رہی تھی۔ اُس نے بس میں چاروں طرف نظریں دوڑائیں اس کے پاس
جو آدمی میلے کچیلے کپڑے پہنے بیٹھے تھے۔ ان کے منہ پر بگڑی بانی تھیں۔ ان کے سامان بوریوں میں بند تھے

وہ بیڑی پی رہے تھے اور خوش گپیاں کر رہے تھے۔ کبھی کبھی ان کے بے ہنگم، ہنگم قہقہے بس میں گونج اٹھتے ـــــ نندو کو محسوس ہوا ـــــ جیسے وہ اسی پر ہنس رہے ہوں ـــــ

ـــــ نندو! اب تم پھر جھک مارو گے۔ اتنا اچھا کام تمہارے ہاتھ سے جا رہا ہے۔ دیکھو، ہم لوگ اپنے کاموں پر جا رہے ہیں ـــــ نندو نے اپنے زخم پر خود ہی مرہم لگایا ـــــ پردیس میں کمانے جا رہے ہو، گھر کا مال لٹتا ہوگا، تمہیں پتہ بھی نہ چلے گا، کچھ دنوں بعد بیوی بچہ جنکر دے دیگی اور تم ان کے باپ بن جاؤ گے

بس کے ہچکولے سے کئی بار اس آجو کو دھکا لگا وہ کراہ اٹھا ـــــ لیکن نندو کو اس کا احساس نہ ہوا اس کا جسم بس میں تھا، ذہن کہیں ـــــ وہ کبیر چورا ہسپتال کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ جو غریبوں کے لئے بنو گیا تھا ـــــ وہ اس کا مقابلہ پرائیویٹ ڈاکٹروں سے کرنے لگا ـــــ جو پبلک کی جیب کا صفایا کر دیتے ہیں ـــــ ڈاکٹر نہ ہوئے، شریف جیب کترے، شریف ڈاکو ہوئے ـــــ!

بس ایک جھٹکے کے ساتھ رک گئی ـــــ سامنے کبیر چورا ہسپتال تھا ـــــ اس نے دلاری سے کہا اٹھو کتنا سوتی ہو؟ اگر ایسا ہوتا' وہ گھر آیا' دلاری کو آواز دی ـــــ کوئی جواب نہ ملا۔ اندر دیکھا ـــــ دلاری چارپائی پر لیٹی کسی دنیا میں ہے۔ کون آیا، کون گیا، اسے پتہ نہیں۔ وہ دلاری کے اس سونے سے بہت عاجز تھا۔ لیکن دلاری کو محسوس ہوتا ـــــ وہ کچھ سوتی ہی نہیں ـــــ!

ہسپتال کے برآمدے کی سیڑھیاں چڑھنے کے بعد سامنے کئی کمرے تھے ـــــ اور ہر کمرے کے دروازے پر کئی نام کی پلیٹیں ان کی ڈگریوں کے ساتھ لگی ہوئی تھیں۔ نندو یہاں پہلی بار آیا تھا۔ اور وہ یہاں کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا ـــــ ہسپتال کے سامنے ہی کئی مردے زمین پر پڑے تھے۔ اسے محسوس ہوا جیسے وہ کسی شمشان میں آگیا ہے۔ اتنے میں کمار نظر آگیا ـــــ کمار ـــــ جو اس کے پڑوسی کا داماد تھا۔ وہ اسے دیکھ کر ہنسنے لگا ـــــ جیسے کہہ رہا ہو ـــــ آؤ ـــــ آؤ ـــــ میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا ـــــ نندو نے کہا ـــــ جانتی ہو، یہ کون ہے؟ کون؟ دلاری نے پوچھا۔ وہی رگھو ماما کا داماد۔

"ارے بھئی، یہاں کیا کرتے ہو؟"

"میں اسٹور میں ہوں۔"

"اچھا ـــــ اچھا۔"

نندو نے سوچا ـــــ جب ہی تو اتنے ٹھاٹ سے رہتا ہے ـــــ ہسپتال میں ہر طرف اتنی بھیڑ تھی پھر بھی اسے اکیلا پن محسوس ہو رہا تھا۔ ایک کمار تھا جسے وہ جانتا تھا ـــــ لیکن اب تو اس کا پتہ بھی نہ تھا وہ ایک جھلک دکھا کر جانے کہاں غائب ہو گیا۔ اس نے خود ہی پرچہ بھرا اور اسے کھڑکی پر تھما دیا

اس کے پاس سے جتنی بھی نرسیں گزریں، ان میں سے کسی نے بھی اس پر ایک نظر نہ ڈالی ـــــ سیدھے چلی گئیں ـــــ ان میں ایک بھی خوبصورت ہوتی تو وہ کہتا ہاں ـــــ! وہ کیسی جگہ آگیا تھا جہاں نظر کی محتاجی تھی ـــــ! بہت دیر بعد ـــــ ایک نرس نے اس کی طرف دیکھا ـــــ وہ بھی ذرا سا ـــــ وہ ٹھگنی سی تھی، لیکن آنکھیں بڑی بڑی اور خوبصورت تھیں ـــــ اس نے کہا ـــــ فلاں وارڈ میں فلاں جگہ ملی ہے ـــــ چلے جاؤ ـــــ اتنی دیر بعد اسے ہمدردی کے یہ چند بول سننے کو ملے تھے ـــــ لیکن اس کی آواز میں مٹھاس ذرا بھی نہ تھی! نندو کو محسوس ہوا گلاب میں کانٹے بھی ہوتے ہیں۔ اسے اپنے پور۔

پچھلے دنوں کا نقشہ ذہن میں گھوم رہے تھے۔ شام جھک آئی تھی۔ اور بجلی کے بلب روشن ہو گئے تھے لیکن اُس کا اپنا اندر بہت تاریک تھا۔ وہ اس اندھیرے سے جلد نکل بھاگنا چاہتا تھا!

دوسرے دن جب وہ ایکسرے روم کی طرف جا رہا تھا، کمار اُسے پھر مل گیا ـــــ اُس کے چہرے پر وہ والی موہنی مسکان نہ تھی۔ کم سے کم وہ روشنی نہیں رہا تھا ـــــ وہ ایک پل ٹھہرا بھی نہیں۔ سیدھے نکل گیا ـــــ یہ کیسی اجنبیت تھی ـــــ!

آج راجو کے پیر کو پلاسٹر ہونے والا تھا۔ اُس کے بعد کیا ہوگا، وہ نہیں جانتا تھا۔ یہ کیسا دلدل ہے جس میں وہ دھنستا جا رہا ہے۔ اُس نے اپنے پاس کے ایک آدمی سے پوچھا ـــــ پلاسٹر کے بعد تو اُسے چھٹی مل جائے گی، مل تو جاتی ہے نا ـــ اس میں یقین کا پہلو نہ تھا۔ پھر بھی اُسے یقین ہو چلا تھا، وہ گھر چلا جائے گا۔ اُسے یہاں کیا کرنا ہے۔ اُس کی آنکھوں میں خوشی کی چمک پیدا ہو گئی ـــــ یہ چمک اس کے گھر لوٹنے کی تھی ـــــ قفس کا دروازہ کھلنے والا تھا اور پنچھی اڑنے کے لئے بیتاب ـــــ!

کیسے گھر ہسپتال بن جاتا ہے، کیسے ہسپتال گھر۔ نندو کے لئے بھی ہسپتال گھر بن گیا ـــــ اُسے یہاں آئے سات دن ہو چکے تھے ـــــ وہ کب اپنے گاؤں لوٹے گا ـــــ! وہ جس نرس سے پوچھتا، وہ جھڑک دیتی۔ میں کیا جانوں۔ ڈاکٹر سے پوچھو۔ ڈاکٹر نے اُسے کبھی نہیں ایسے جھڑکا تھا۔ وہ اُسے کتنی نامناسب باتیں کہہ دیتا۔ دلاری کے سامنے نندو کو اپنی یہ توہین برداشت نہ ہوتی۔ پھر بھی اس نے کہا ـــــ سسٹر! لیکن وہ نرس اس کی بات سے بغیر ہی آگے بڑھ گئی ـــــ!

راجو کا پیر بہت کر ایک اسٹینڈ سے بندھا تھا۔ جس سے وہ ہل نہ سکے۔ اسی وقت ایک ڈاکٹر وارڈ میں آیا۔ انہوں نے ہنستے ہوئے پوچھا ـــــ ڈاکٹر صاحب! ابھی کتنے دن اسی طرح رہنا ہوگا" ابھی کم سے کم ایک مہینہ........ نندو کو محسوس ہوا ـــــ جیسے اس کا پیر بھی اسٹینڈ سے باندھ دیا گیا ہو ـــــ! وارڈ سے باہر شام گہری ہوتی جا رہی تھی ـــــ جب ہی کوئی خارش زدہ کتا زور زور سے بھونکنے لگا ـــــ

(تبصرہ)

چنانچہ اب عارف شفیق اس منزل پر ہے جہاں اسے چاہتوں کی بھیک نہیں مانگنی پڑے گی وہ تو اب خود داتا ہے کہ ان کی سیپیوں سے محبت کے موتی نکالنے کا فن سیکھ گیا ہے۔

عارف شفیق کی نظموں اور قطعات کا مجموعہ "اندھی سیپ میں گزرے لمحے" ۱۹۷۰ء میں اور غزلوں کا مجموعہ "سینے کے دیپ" ۱۹۷۱ء میں چھپ کر مقبول ہو چکے ہیں۔ اب ان کا تیسرا شعری مجموعہ "سر بسر ہوا" شائع ہوا ہے۔ امید ہے یہ مجموعہ بھی مقبول عام کی سند حاصل کرے گا۔

(کہانی) ہم شاگرک، دہبئی

گھوڑے سوار

لڑکی غضب کی حسین ہے مگر شادی کے لئے بیٹھی ہے۔ باپ ہفتہ پندرہ دن میں ایک آدھ بینڈورخ کو پکڑ لاتا ہے۔ اور ڈرائنگ روم میں بٹھا کر لڑکی کو سجنے کے لئے کہتا ہے۔ وہ سجتی ہے چائے اور سامان سرو کرتی ہے .... تب اس کی ناک سکیل سے ناپی جاتی ہے۔ اس کا بدن ترازو میں تولا جاتا ہے اس کی آواز کا شہد چکھا جاتا ہے۔ کبھی وہ پسند نہیں آتی کبھی باپ کی تجوری کمزور پڑ جاتی ہے۔

لڑکی غضب کی حسین ہے مگر شادی کے لئے بیٹھی ہے۔

ماں اور باپ پچھتا رہے ہیں ...... "کاش ہماری لڑکی اور دو سونے کے انڈے دے۔ ایک کی جگہ دو۔ جیسے دیش پانڈے کی کملا دیتی ہے!"

گھر کے دروازے پر کوئی دستک دے رہا ہے۔ لگتا ہے وہ تھاپ دل پر پڑ رہی ہو۔ لڑکی کچھ سمجھ پا رہی ہے کیوں کہ کچھ صاف نہیں ہے .... دھندلا ...... دھندلا .... دھول ہی دھول ...... !!

وہ سہانے سپنے بھرے بستر پر اٹھ بیٹھی ہے۔

دروازے پر کوئی دستک دے رہا ہے۔ ماں اور باپ پچھتا رہے ہیں۔

"دستک دینے والا بھیڑیا ہے۔ دیکھو اس کی پونچھ صاف نظر آ رہی ہے۔"

"نہیں بھیڑیا نہیں ہے۔ کہاں ہے پونچھ؟"

"پونچھ باہر سے دکھائی دے یہ ضروری نہیں۔"

"ذرا باہر سے دیکھو ہو وہ اندر بھی ہو یہ ضروری نہیں"

"اور یہ بھی کب ضروری ہے کہ پونچھ جیسی لگے اور پونچھ ہی ہو"

"پھر تم مجھے بھیڑیئے کو نہیں دے رہی ہو اپنی لڑکی —— جانتے ہو اس کی ماں ڈائن ہے۔ میں اپنی پھول جیسی بچی کو ڈائن کے حوالے کبھی نہیں کروں گی! اس بھیڑیئے کو اپنا داماد نہیں بناؤں گی۔"

"پہلے معلوم کر لیں کہ وہ بھیڑیا ہے یا نہیں۔"

"کیسے پتہ ہوگا۔ کون بتائے گا؟"

"پڑوسیوں کو خود کی خبر نہیں ہے"

"یہ کیا، دروازہ تو کھولنے دو" —— "نہیں بند رہنے دو۔"

"کب تک ہم لڑکی کو بنا شادی کے بٹھائیں گے۔"

"جب تک وہ گھوڑے سوار نہیں آ جاتا۔" "کب تک وہ گھوڑے سوار آ جائے گا؟"

"جب تک وہ انڈے دینا بند نہیں کر دیتی۔" "کیسے باپ ہو جی تم خود غرض۔ وہ تمہارا خون ہے" —— "تمہارا بھی تو ہے"

دیکھو جی! وہ اندھے دنیا بند کرے یا منہ کرے یہ
اس کی مرضی۔ مگر گھوڑے سوار آئیگا تو ہم اس کو خالی ہاتھ
نہیں لوٹائیں گے۔ پچھلی دفعہ لوٹا دیا تھا۔ اب نہیں لوٹائیں گے
۔۔۔ آخر کب تک لڑکی کو بنا شادی کے بٹھائیں گے
دیکھو جی ۔۔۔ وہ گھوڑے سوار جب بھی آئے۔ لڑکی اندھے
دنیا بند کرے یا جاری رکھے۔ کوئی فرق نہیں پڑنا چاہیے
گھوڑے سوار خالی ہاتھ نہیں لوٹنا چاہیے ۔۔۔

مگر دستک دینے سے پہلے ایسا لگا تھا کہ وہ آیا ہے
میں نے صاف سنی تھی گھوڑے کے ٹاپوں کی آوازیں"
۔۔۔ "لیکن گھوڑا کب ہنہنایا تھا؟" لڑکی
سپنوں سے بھرے بستر پر اٹھ بیٹھی ہے۔ اور مسلسل
گھوڑے کا ہنہنانا سن رہی ہے ۔۔۔ مگر یہ طے نہیں
کر پا رہی کہ گھوڑا دروازے کے باہر ہنہنا رہا ہے یا اس
اندر!

شادی کے لیے بیٹھی ہوئی لڑکی اٹھ کھڑی ہوتی ہے۔
سب دھندلا دھندلا سا ہے دھول ہی دھول۔ کہاں
ہے وہ لڑکا جو گھوڑے پر دکھی چال سے آتا ہے۔ کہاں
ہے وہ کہکشاں! کہاں ہے وہ لڑکا جو مانگ ستاروں
سے بھر دیتا ہے؟ کہاں ہے؟ کچھ بھی تو پتہ نہیں؟"
۔۔۔ وہ مندر میں بھگوان کے سامنے کھڑی ہے۔
بھگوان نے مندر میں اپنا دیا چھوڑا ہے۔ اور خود وہ جانے
کہاں سب ہو گیا ہے۔؟ ۔۔۔ لڑکی کی شادی شدہ سہیلی
جب اپنے بچے کے ساتھ گھر آتی ہے اور بچے کو گود میں اٹھائے
لڑکی کلک رہی ہوتی ہے تو ماں کا دکھ اور بھی بڑھ جاتا ہے۔
بوڑھا باپ اور بھی چڑچڑانے لگتا ہے ۔۔۔ وہ اب
سینچر کا ورت رکھ رہی ہے۔ سادھو کے ساتھ سوموار تو
اسمانے کے لیے ہیں۔ جیوتش نے کہا تھا ستمبر میں گھڑی
دکھتا ہے ۔۔۔ دور اندر کسی گہرے کنوئیں میں
سے ہاتھ جیسے کلبلانے لگتے ہیں۔ بدن کا کساؤ
ملبوسات کی سیون ادھیڑ ڈالے۔ اور ستمبر میں گرگر
کی دھتا ہے ۔۔۔ کب آئے گا ستمبر؟" ۔۔۔

پچھلے کئی سالوں سے تو ستمبر آ ہی نہیں رہا ہے ۔۔۔ اگست
کے بعد سیدھے اکتوبر آ جاتا ہے۔ کہاں ہے ستمبر؟
"ستمبر یہاں ہے میرے پاس گھوڑے سوار جیسے کانوں
میں بولتا ہے" ۔۔۔ "میں آ رہا ہوں۔ میں چل چکا ہوں۔
میں آ رہا ہوں" ۔۔۔ ماں باپ پچھتا رہے
ہیں۔ "کچھ بھی ہو مگر میں اسے اپنی لڑکی نہیں دوں گی ۔۔۔
سنا ہے اس کے گھر بھون سے بھی بڑا اسٹو ہے"۔
"بھون سے بھی بڑا اسٹو؟" ۔۔۔ "ہاں، بھون سے
بھی بڑا اسٹو، ہمیشہ بھر بھراتا رہتا ہے۔ پتہ نہیں کب
پھٹ جائے۔ اور ہماری لڑکی......"
"بد شگون مت بولو"
گھوڑے کے ٹاپوں کی آوازیں پورے کمرے میں بھر
گئی ہیں۔ مسلسل دستک دروازے پر ساتھ ہی
دروازے پر! ماں اور باپ گہری نیند میں خراٹے بھر رہے
ہیں ۔۔۔ "روشنی آنے دو ۔۔۔ ہوا آنے
دروازہ کھلا رہنے دو۔ پتا جی!"

باپ: "بھیڑیا آ جائے گا بیٹی۔"
ماں: "اور شیر ببر بھی آ سکتا ہے۔"
باپ: "ریچھ بھی آ سکتا ہے۔"
ماں: "اور لکڑ بھگا؟"
لڑکی: "گھوڑے سوار بھی تو آ سکتا ہے"
باپ: "مگر شیر ببر، ریچھ، بھیڑیا، لکڑ بھگا"
لڑکی: "بندوق تو ہے آپ کے پاس"

"ہاں ہے بندوق۔ مگر وقت پر چلے گی بھی یا نہیں۔ بھروسہ
کم ہے۔ اور کارتوس بھی تو ختم ہو گئے" ۔۔۔ باپ سمجھاتا ہے ۔۔۔
"اوہ! ۔۔۔ ایسا کیجئے۔ پرانے صندوق میں
ڈھونڈیئے۔ ایک آدھ کارتوس مل ہی جائے گا ۔۔۔
بندوق پہلے مجھ پر آزمائیے۔ چلتی ہے یا نہیں پتہ چل جائے
گا۔" لڑکی سمجھا رہی ہے ۔۔۔
"تم مر جاؤ گی بھلی بیٹھی۔"

مر جانے دیجیے"۔ ابھی کون سی جی رہی ہوں۔"
"اندھیرے ڈسے رہی ہو اس کا مطلب ہے جی رہی ہو
باپ اور ماں من ہی من میں سوچتے ہیں۔" انتظار کرو
بیٹی ——— وہ آئے گا گھوڑے سوار!"
لڑکی تڑپ جاتی ہے۔ کبھی نہیں آئے گا۔ وہ اس سڑک
سے گذر جائے گا۔ آنا ہوتا تو آنہ جاتا ——۔ انتظار کی بھی
حد ہوتی ہے۔!
سڑک سے سرپٹ بھاگتا گھوڑے سوار ———
چاروں طرف دھواں ہی دھواں۔!
"رک جاؤ گھوڑے سوار، گھو ——— رکے ———
سوار ——— لڑکی چیختی ہے ——— اور خود کی چیخ سن
کر جاگ جاتی ہے۔ ماں اور باپ سرہانے کھڑے
ہیں ——— "کیا ہوا؟" ——— "رکا نہیں گذر گیا"!!
پھر دروازے پر دستک ——— ساتھ ہی دل
پر ———
"بھیڑیا ہے" ——— "نہیں گھوڑے سوار"
"نہیں بھیڑیا" ——— "نہیں گھوڑے سوار"
سمجھے ——— لکڑ بھگا ——— شیر ببر ——— بھر بھراتا
اسٹو ——— بچپن سے بڑا اسٹو ——— ڈائن ——— ہاں ———
نہیں ——— ہاں ——— نہیں۔
باپ آگے بڑھا ہے ——— دروازہ کھولنے کے لئے؟ ———
ماں، باپ کے پیچھے کھڑی ہے۔ لڑکی نے ڈوپٹہ سر پر اوڑھ
لیا ہے۔ اور ایسے موقعوں پر جو کچھ بھی اوڑھا جاتا ہے۔
اس نے اوڑھ لیا ہے۔ کھٹاک سے دروازہ کھلتا ہے
——— مگر کچھ صاف نہیں ہے گہرے دھندلکے میں
دھول ہی دھول بھری ہے۔ تب ہی وقت کی دھول
کمرے میں در آئی ہے اور بالوں کو سفید بنا جاتی ہے
ہم لیٹ ہوئے دروازہ کھولنے میں۔ واقعی لیٹ ہو گئے
پتہ نہیں کیا ہوا؟ ——— لیٹ تو ہم ویسے بھی ہو گئے۔
لیٹ تو ہم ایسے کبھی ہو گئے اور ویسے بھی ہو گئے ———
لیکن وہ آیا ضرور تھا۔ ٹاپوں کی آواز سنی تھی میں نے!
آیا تھا تو کہاں گیا۔ تمہارے کان بجنے لگے تھا۔

پتہ نہیں تمہارا کیا کیا بج رہا تھا۔ میرے تو صرف کان بجے،
ہم لیٹ ہو گئے۔
ہم مشورہ کرتے رہ گئے"۔
ارے تمہارے بال۔!
کیا ہوا میرے بالوں کو
ارے تمہارے بال سفید کیسے ہو گئے۔؟
کہاں ہے آئینہ ——— ارے تمہارے چہرے پر جھریاں
ایک اور جالا!
ارے کتنا وقت بیت گیا ہم مشورہ کرتے رہ گئے۔
کہاں ہے گھڑی۔ کہاں ہے کلینڈر ——— کہاں ہے سورج ——؟
وقت بیت گیا باپ رے!!
اور آپ مشورہ کرتے رہ گئے"۔ لڑکی اٹھتی ہے۔ وہ نہیں
صرف آنکھیں انگارہ سی دمک رہی ہیں "یہ گھڑی چلتے چلتے
ہے۔ اس کلینڈر نے دھوکا دیا ہے ——— اور سورج
ہے مگر اندھیرا نہیں چھٹتا ——— اور وہ دروازہ ———
شریر ہے۔ خواہ مخواہ بجتا ہے ——— آپ کے کان
بجتے وہ دروازہ بجتا ہے۔ پھینک دو یہ گھڑی۔ پھاڑ
کلینڈر ——— دروازہ کھول دو ——— ہوا آنے دو۔!
کہیں ہے تو اسے بھی آنے دو ——— یہ سیلن ——— یہ
سے روشنی کا انتظار کرتی یہ سیلن!!"

لڑکی گھڑی دیوار سے اتار کر پھینک دیتی ہے۔
کے پرزے پرزے کر دیتی ہے۔ گھڑی فرش پر پڑا
شکل میں بکھر جاتی ہے۔ اور کیلنڈر کی تاریخیں ہو
اڑنے لگتی ہیں ———!
"کھول دو دروازہ ——— اگر روشنی کہیں ہے تو آنے دو
ماں باپ ڈر جاتے ہیں۔
کیوں رکھا ہے مجھے، کاٹ لو، ایک ہی دفعہ
سارے اندھیرے!"
لڑکی سسکنے لگتی ہے ———
دروازہ کھلا ہے، کہیں بھیڑیا آگیا تو، باپ اندیشہ ظاہر کرتا
آجانے دو ———! لڑکی نے کہا ———

فضل امام ملک

بند دروازے کے پیچھے

وہ دھیرے دھیرے چلتی ہوئی میرے پاس آئی۔ اور اپنے ہونٹوں کو میرے ہونٹوں پہ رکھ دیا۔ اور پھر تیز تیز قدموں سے لگ بھگ بھاگتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔۔

اور میں نے ان لمحوں کو اپنی مٹھیوں میں قید کرلیا میں چپ چاپ اسے کمرے سے نکلتے ہوئے دیکھتا رہا۔ میں خاموش خاموش سا بیٹھا رہا۔ ... کیسا پاک جذبہ تھا اس کے من میں..... چھل کپٹ سے ایکدم دور... میں من ہی من میں سوچ رہا تھا کہ کیسی عجب لڑکی تھی پیچھے سے آکر جھانک گئی میری زندگی میں۔ اور جس طرح دبے پاؤں آئی تھی اسی طرح میری زندگی سے نکل کر بھیڑ میں گم ہوگئی.... ۔ اور میں چاہ کر بھی اسے روک نہیں سکا... ہاں ان لمحوں کو اپنی مٹھیوں میں قید کرلیا.... انہیں اپنے اندر سمو لیا ..... کیسی پاگل لڑکی تھی .... ؟ دوسروں سے ایک دم الگ ..... مجھ سے باتیں کرتے وقت اس اس کی آنکھوں میں صرف درد ہی درد نظر آتا تھا... کتنے سیدھے سادے لفظوں میں اپنی چاہت کا اظہار کیا تھا اس نے .... میں بھول نہیں پاؤں گا ان لمحوں کو ملاقات اور پھر جدائی ..... وہ ملی بھی اور نہیں بھی ملی ..... اس نے کچھ نہیں کہا اور سب کچھ کہہ دیا

کیسے وہ کچھ پل کے لئے داخل ہوئی میری زندگی میں مجھے پتہ نہیں چلا ..... اس دن میں اپنے چیمبر میں اپنے ایک دوست کے ساتھ بیٹھا تھا کہ وہ کسی آندھی طوفان کی طرح کمرے میں داخل ہوئی ۔ ایک پل کو وہ ٹھٹھکی..... ٹھٹھکی ... مسکرائی اور پھر مجھ سے بول پڑی "ایک منٹ ذرا سنیں گے آپ"

میں کچھ چونک سا گیا۔ آپ نے کچھ مجھ سے کہا!

ہاں.... وہ پھر مسکرا اٹھی۔

میں اس کے نزدیک جیوں ہی پہنچا۔ اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ اور اپنے ساتھ گھسیٹ لے گئی۔ میں اس کے اس طرح اچانک ہاتھ تھامنے سے کچھ گھبرا سا گیا تھا... وہ پھر مسکرائی اور اس کی آنکھیں بول اٹھیں۔ تم نے مجھے پہچانا۔؟

اس کے ہاتھ پکڑنے سے میں کچھ نروس سا ہوگیا تھا۔ آ.... آ.... آپ

ہاں آپ.... آپ کیا لگا رکھا ہے، اجنبی پن کی دیوار کو اس نے توڑ ڈالی۔

تو پھر کیا کہوں؟ میری گھبراہٹ ابھی بھی بنی ہوئی تھی۔

میں سیتا ہوں .... آپ نے مجھے پہچانا؟

سامنے اپنا سوال پھر دہرایا۔

اب مجھے یاد آ گیا تھا۔ اسے پچھلے دنوں اپنے پاس کے کمرے میں دیکھا تھا۔ وہ ان کے کسی دوست کی لڑکی تھی۔

تم فضی ہو نا.....؟

لیکن آپ کو کیسے پتہ چلا۔؟ مجھے حیرت ہوئی۔

تمہاری شانی نے بتایا۔ وہ بنا جھجک بول پڑی۔

ہاں بھئی! تمہاری شانی، اس سے میں نے دوستی کر لی ہے صرف تمہارے لئے۔

میرے لئے؟

ہاں تمہارے لئے۔ اس میں چونکنے کی کیا بات ہے؟ ویسے بھی انکل تمہاری کافی تعریف کر رہے تھے۔ بتا رہے تھے کہ تم کہانیاں بہت اچھی لکھتے ہو...... مجھے نہیں سناؤ گے۔ وہ بغیر فل اسٹاپ کے بولتی چلی گئی۔ مجھے اس کا یہ انداز نہ جانے کیوں بے حد پسند آیا۔ اور پھر دھیرے دھیرے میری ساری گھبراہٹ ختم ہو گئی۔ اور اتنی دیر بعد میں پہلی بار مسکرایا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ بولتا وہ بول پڑی۔ میں کل تم سے ملنا چاہتی ہوں۔ کیا تم مل سکو گے۔؟ اور میں نے نہ جانے کیا سوچ کر اس سے ملنے کا وعدہ کر لیا تھا۔

یاد رکھنا فضی، میں کل اسی وقت آؤں گی۔ اچھا تو اب میں چلوں گی۔ بائی۔ اور وہ چلی گئی۔ میں اپنے کمرے میں لوٹ آیا۔ میں اس انجانی لڑکی سے نہ جانے کیوں متاثر ہو گیا تھا۔ یہ سوال بار بار میں نے اپنے آپ سے کیا۔

اور دوسرے دن وہ ٹھیک وقت پر آ دھمکی دروازے پر ایک پل کو ٹھٹھکی، مسکرائی۔ اور پھر میرے سامنے آ کر بیٹھ گئی۔ ہیلو فضی۔ کیسے ہو؟

ٹھیک ہوں۔ تم کیسی ہو؟

گڈ... ... کوئی بات ... ...

لگا رکھی تھی۔ اور پھر باتوں کا سلسلہ چل پڑا۔ بات کرتے کرتے ہی وہ اچانک سیریس ہو اٹھی۔ فضی، ایک بات کہوں برا مت ماننا۔

ایسی بھی کیا بات ہے سبیتا۔ میں اس کے اس اچانک سیریس ہو جانے پر تھوڑا چکرا سا گیا تھا۔

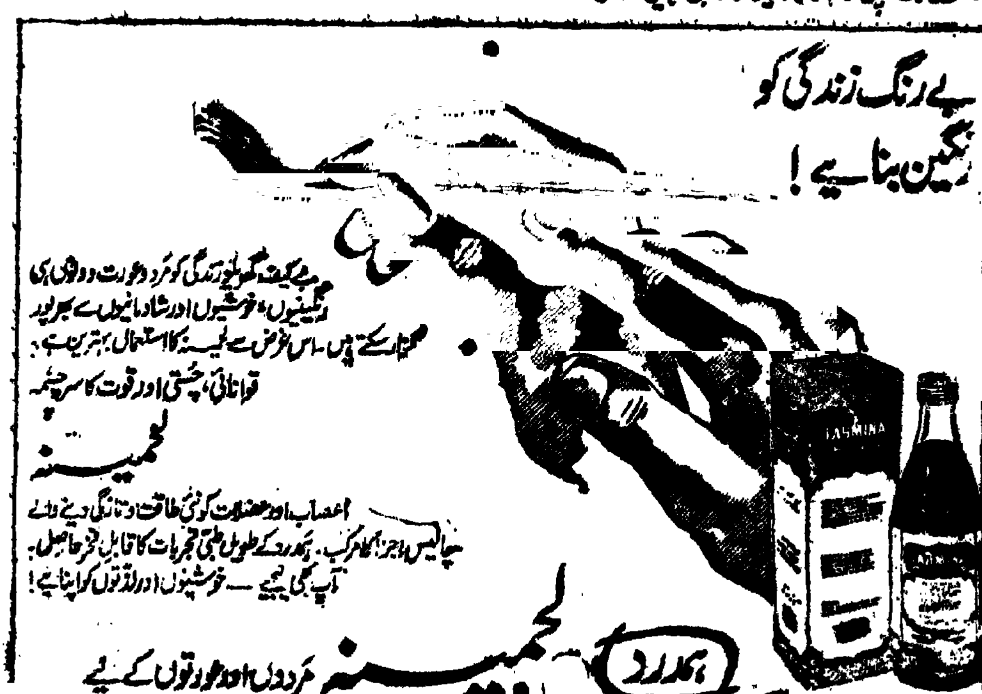
فضی، میں تم سے ایک دو بار ہی ملی ہوں۔ لیکن نہ جانے کیوں تم مجھے اچھے ——— بہت ہی اچھے لگتے ہو..... دوسروں سے بالکل الگ الگ..... خاموش خاموش سے ..... ہونٹوں پہ پھیلتی مسکراہٹ ..... میں جانتی ہوں فضی کہ میرا ایسا کچھ بھی سوچنا پاگل پن ہے۔ ایک سراب ہے۔ بس اور کچھ نہیں۔ مجھے یہ بھی پتہ ہے کہ شانی تم سے بے حد پیار کرتی ہے۔ تمہارے بنا وہ جی بھی نہیں پائے گی۔ اور اس سے الگ ہونے کا تصور تم بھی نہیں کر سکتے۔ لیکن کروں کیا فضی! تم میں میں نے اپنا آئیڈیل پا لیا ہے۔ میرا آئیڈیل ٹھیک تمہاری ہے۔ خاموش خاموش سا۔ ہر وقت مسکراتا سا۔ بچپن کے سبیتا کی شخصیت کو تمہارے ہی جیسے جیسے خاموش خاموش سے ہر وقت مسکراتے کسی لڑکے نے ٹکڑے ٹکڑے ہونے ہونے سے بچایا تھا۔ سبیتا جس کو صرف نفرت ملی تھی۔ اسے اس نے محبت کے لفظ سے آشنا کیا تھا۔ میں اس سبیتا کو تو بھول سکتی ہوں۔ لیکن بچپن کے اس سبیتا کو کبھی نہیں بھول سکتی۔۔ کبھی نہیں..... تم یہی سوچتے ہو گے کہ کیسی پاگل لڑکی ہے یہ۔ لیکن وشواس کرو فضی تمہیں کبھی نہیں بھول پاؤں گی۔ کبھی نہیں۔ اور ہو سکے تو سبیتا کو یاد رکھنا۔ اسے بھولنا مت۔ میں بت بنا اسے دیکھتا رہا۔ دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اس سے پہلے کہ وہ دھرتی پر گرتی۔ میں نے اسے آنسوؤں کو ... پونچھ ڈالا۔

وہ اٹھی۔ میرے پاس آئی اور پھر اپنے ہونٹوں کو میرے ہونٹوں پہ رکھا۔ اور پھر تیز قدموں سے لگ بھگ بھاگتی ہوئی سی وہ کمرے سے باہر نکل گئی۔ میں ان لمحوں کو اپنی مٹھیوں میں سمیٹ لیتا ہوں پھر میں کمرے سے باہر آتا ہوں، دیکھتا ہوں وہ تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی چلی جارہی تھی۔ میں ایک ٹک اسے گھورتا رہا ہوں۔ تھوڑی دیر بعد وہ لوگوں کی بھیڑ میں گم ہوجاتی ہے۔

میرے قدم واپس مڑ پڑتے ہیں۔ میں کمرے میں داخل ہوتا ہوں۔ اور میرے پیچھے دروازہ ایک زوردار آواز کے ساتھ بند ہوتا ہے۔ آواز کمرے میں گونج اٹھتی ہے اور پھر اس کے بعد ایک سناٹا چھا جاتا ہے۔ ایک گہرا سناٹا ●

بقیہ سعادت حسن منٹو کا خاندان

کہ ان کی بہو کسی کشمیری خاندان سے ہو۔ اس شادی میں منٹو کی پسند کا کوئی دخل نہیں تھا۔ حتیٰ کہ انہوں نے رخصتی کے وقت تک اپنی دلہن کو دیکھا تک بھی نہیں تھا ●



ےہ۔ خواجہ سلیم حسن مرحوم منٹو کے بڑے بھائی تھے۔ وہ ۱۹۲۱ء میں کشمیر میں آ گئے تھے۔ اور اپنے قدیم اور قریبی رشتہ داروں سے ملے تھے۔ ان کا پرتپاک استقبال کیا گیا تھا۔ ان میں سے خواجہ حسن منٹو خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ جو سری نگر کے ایک مشہور اور متمول سوداگر تھے۔ سلیم حسن صاحب ۱۶ جون ۱۹۳۳ء کو ۴۷ سال کی عمر میں انتقال کر گئے۔ وہ جرمنی میں انجینئرنگ کی اعلیٰ تعلیم حاصل کر چکے تھے۔ خواجہ الحاج محمد حسن، اور خواجہ سعید حسن دونوں بیرسٹر ایٹ لا رہے تھے۔ خواجہ الحاج محمد حسن کا انتقال ہو چکا ہے۔

نئی کتابوں کا تعارف

(تبصرہ کے لئے ہر کتب و رسائل کی دو جلدوں کا آنا ضروری ہے)

کتاب : ایک معرکہ لہو کا
مصنف : قمرالہدیٰ زیدی
قیمت : چھ روپے
تقسیم کار : الماس کتاب گھر - بکھن پور
وایا اڑ گنج - ضلع مونگیر (بہار)
تبصرہ نگار : نورالحسن نقوی

جناب قمرالہدیٰ زیدی کی ایک سو گیارہ صفحات پر مشتمل تصنیف اس طویل اور دردناک داستان کا ... ہی کا خاتمہ دریائے فرات کے کنارے ایک تشنہ لب ... لے کی بے مثال قربانی پر ہوا۔ یہ قافلہ جب راہِ خدا میں سب کچھ لٹانے کو گھر بار چھوڑ کے نکلا تھا۔ اس وقت اس کے جذبۂ سرفروشی کو نادانی کہنے والے موجود تھے۔ آج بھی موجود ہیں۔ لیکن جو خلوص نیت سے سچ کی جستجو ... ہے وہ آخرکار منزل کو پا ہی لیتا ہے۔ معرکہ ... کے بارے میں کوئی ناگوار بات سن کر ایک نوجوان ... مضطرب ہو اٹھا۔ اور یہیں سے تلاش و جستجو ... غاز ہو گیا۔ مستند ماخذ سے جتنی معلومات فراہم ... گئی وہ مصنف کی زبان میں قلم بند ہوتی رہیں۔ ... یہاں تک کہ ایک مختصر مگر مدلل کتاب "ایک معرکہ لہو کا" ... تیار ہو گئی۔

کتاب کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ مصنف کو آلِ ... اور جاں نثارانِ آلِ رسول سے بے حد عقیدت ہے۔ ... کے باوجود انھوں نے واقعات کی چھان بین میں ... غیر جانبدارانہ طریق کار اختیار کیا ہے۔ اور دلیلوں سے اپنے بیان کو مضبوط بنایا ہے۔ زیدی صاحب درس گاہ سرسید کے تعلیم یافتہ ہیں۔ اس لئے یہ یاد آنا لازمی ہے کہ کچھ ایسا ہی عالم اس وقت سرسید پر گزرا تھا جب انھوں نے ولیم میور کی تصنیف "لائف آف محمد" کا مطالعہ کیا تھا۔ میور نے اسلام پر ناروا حملے کئے تھے۔ اور رسولِ اکرم پر بے بنیاد تہمتیں لگائی تھیں۔ اس کتاب نے سرسید کا خواب و خور حرام کر دیا تھا۔ اور ان اعتراضات کا مسکت اور عالمانہ جواب دینے کے بعد ہی انھیں چین آیا تھا۔ زیدی صاحب کی یہ تالیف ایک جذبۂ بے اختیار سہی لیکن ہے اسی ادارۂ سرسید کا عطیہ۔ اور کتاب کا عالمانہ انداز بلاشبہ سرسید کی دانستہ پیروی کا نتیجہ ہے کہ سرسید اور علی گڑھ تحریک ان کا پسندیدہ موضوع ہے۔

"ایک معرکہ لہو کا" حسن ترتیب اور اعجازِ بیان کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔ زیدی صاحب ایک نوخیز ادیب ہیں۔ انھوں نے ابھی بہت کم لکھا ہے مگر کیسی خوشگوار حیرت ہوتی ہے کہ ابھی سے ان کی آواز صاف پہچانی جا رہی ہے۔ ادب کے ایک ادنیٰ طالب علم کو اگر پیشین گوئی کرنے کی اجازت دی جا سکے تو میں یہ اعلان کر دوں کہ اردو میں ایک اعلیٰ درجے کے نثر نگار کی آمد آمد ہے۔

- کتاب : بھر بھری ہوا
- مصنف : عارف خفیق
- پتہ : ماہنامہ "روپ" کراچی

مصرعہ سلطانِ دہر

عارف شفیق سے جب میری پہلی ملاقات ہوئی تو اس سے زیادہ گفتگو نہیں ہوئی۔ لیکن وہ بہت دیر بولا اور کچھ لفظ زہر بن کر اس کے اندر سے [illegible] رہے ہیں۔ پھر جب میں نے اس کے اشعار پڑھے تو سارا پس منظر میرے سامنے آ گیا۔ ایک بچہ باغی ہو گیا اور کہہ رہا ہے:

"میں جو ماں باپ کے زندہ ہوتے ہوئے بھی
یتیموں کی طرح زندگی گزار رہا ہوں
تنہا بیٹھا اس گڑیا کو دیکھ رہا ہوں
جو ننھے بچوں کے ساتھ کھیل رہی ہے
پیار سے ان کو چاٹ رہی ہے

اور میں سوچ رہا ہوں
کاش میں پلا ہی ہوتا

اس نظم کا نام "محرومی" ہے۔ وہ باغی ہی نہیں شکست خوردہ بھی ہے ؎

ماں باپ زندہ اور میں یتیموں کی طرح ہوں
محلوں میں رہ کے پھر بھی فٹ پاتھوں کی طرح ہوں
وہ تو ہیں شفیق اور میں شفقت سے ہوں محروم
میں آدم و یعقوب کے بیٹوں کی طرح سا ہوں

اس شکست خوردگی نے ہی اسے تنہائیوں کے عذاب بخشے ہیں ؎

کچھ میرے تو خوش نصیب یہ خانہ بدوش ہیں
بے گھر میں سوچتا ہوں یہ غم سے کنارے

دھوپ میں جب کوئی گھر [illegible] ہو جاتا ہے
شاخ سے اس کی سب چڑیاں اڑ جاتی ہیں

[illegible] عارف [illegible]
کچھ عرصے کے بعد [illegible] عارف سے دوسری ملاقات

بھی ہوئی میری خواہش تھی کہ اب کے عارف اپنے کرب کا زہر اگل دیگا تاکہ اس کی سوچ نکھر جائے۔ ور دوسروں سے گلہ کرنا چھوڑ دے چاہے وہ دوسرے اسکے رگ و پے میں خون بن کر کیوں نہ دوڑ رہے ہوں، وہ جن کی بے توجہی کا شکار رہا اور کہنے پر مجبور ہوا کہ ؎

جب چاہا مجھے پڑھ کے کہیں پھینک دیا ہے
ماں باپ کی نظروں میں کتابوں کی طرح ہوں

دوسری کے بعد تیسری ملاقات ہوئی تو عارف کھل کر سامنے آیا اور میں نے محسوس کیا کہ اس کے اندر ایک بچہ ابھی ہمک رہا ہے مچل رہا ہے۔ چاند کو چھونے کے لئے۔ اور چاند اس کا [illegible] دسترس سے دور نہیں لیکن ابھی [illegible] اس کی دسترس میں بھی نہیں ہے۔ اس کی فکر بڑی حد تک بدلی ہے۔ اب وہ جذبات میں وقت ضائع کرنا نہیں چاہتا وہ اپنا [illegible] چاہتا ہے۔ اب اس نے اپنے دکھ اپنا دکھ نہیں جانا [illegible] کا دکھ سمجھا ہے اور جب فن کار اپنی ذات کے خول کو توڑ کر نکل آتا ہے تب ہی وہ ایسے اشعار کہہ سکتا ہے ؎

گردشِ وقت کیوں مرے سر ہو گئی کیا مری شخصیت معتبر ہو گئی

ہو جاتے ہیں تاج محل عارف کھنڈر
بوسیدہ دیواریں جب گر جاتی ہیں

آ کر سب باتیں طبقاتی ہیں
گھر میں رہوں تو سارے مسائل ذاتی ہیں

عارف شفیق کو اپنی ذات کا عرفان ہو چلا ہے کیوں کہ اس نے صرف اپنی سوچ کے سہارے شعر نہیں کہے بلکہ اس سوچ کو تجربات کی بھٹی میں تپایا بھی ہے تبھی اس کی شاعری کو نیا لہجہ ملا ہے اور اس لہجے کو اس نے پہچان بھی لیا ہے اور کہہ دیا ہے ؎

جب زباں کو تجربوں کا ذائقہ مل جائے گا
شاعرِ خوددار کو لہجہ نیا مل جائے گا

بقیہ ۳۱

شہر خیال

برادر عزیز !

مارچ ۸۰ء کے بعد پھر اگست ۸۰ء کا سہیل موصول ہوا۔ بیچ کا یا تو نہ ملا۔ یا آپ نے نہیں بھیجا۔ بہرکیف ؛ حسرت موہانی پر ایک مضمون روانہ کر رہا ہوں

اول اول یہ مضمون بہار اردو اکیڈمی کے بورڈ ادبی ترجمان زبان و ادب کے حسرت نمبر کے لئے لکھا گیا تھا۔ مگر زبان و ادب والوں میں ایسا مضمون شائع کرنے کی جسارت نہ تھی۔ بہار اردو اکیڈمی، اردو سے زیادہ برسراقتدار مشتمل ہندوستانی کے خدمت گزاروں کا فرض انجام دے رہی ہے۔ اس کے زر خرید ادیب قومی سرمایہ داروں کی مجرمانہ گھنونی سازش میں برابر کے شریک ہیں۔ اس کی ایک مثال کلیم الدین احمد کی " اقبال ایک مطالعہ " ہے۔ اگر عبدالمغنی بروقت " اقبال اور عالمی ادب " نہ لکھتے۔ اور انگریزی سامراج کے ساجھے دار ہندوستانی قومی سرمایہ داروں اور ان کے پروردہ ادیبوں کی یہ سازش کامیاب ہو جاتی۔ اور اقبال کی اصل شناخت گمراہی کا شکار ہو کر مجروح ہو جاتی یا اقبال جو زندگی بھر برطانوی ملوکیت (BRITISH IMPESIALISM) کے خلاف لکھتے رہے، مسخ ہو جاتے۔

بہار اردو اکیڈمی کے بورڈ ادبی ترجمان زبان و ادب کا حسرت نمبر حسرت کو مسخ کرنے کی ویسی ہی ایک سازش ہے جیسے " اقبال ایک مطالعہ " اقبال کو ہیرو مقدار ثابت کرنے کا شرمناک اور برطانوی پونڈوں کے ہاتھوں بکے ہوئے حوصلہ مند قلم کا سوچا سمجھا منصوبہ۔

پریم چند کے الفاظ میں اگر " ادب سیاست کے آگے آگے چلنے والی مشعل ہے " تو اقبال اور حسرت اور خصوصیت کے ساتھ برصغیر کے سیاسی تناظر میں اردو ادب کے مشعل برداروں کی صف اول سے اس ہراول دستہ (VANGUAR) کی سپاہ ہیں۔ جس نے برطانوی ملوکیت کے نوآبادیاتی نظام کی چکی میں پسی ہوئی محکوم قوموں کی قومی آزادی کی رہنمائی کا فرض انجام دیا ہے۔

اس سیاسی بیداری کے تناظر میں اردو ادب و شاعری کا صحیح جائزہ لے کر اسے منظر عام پر لانے کے لئے پونڈاوزی کے ہاتھوں بکے ہوئے بہار اردو اکیڈمی کے اس گوکس (CAOCUS) کو بے نقاب کرنا، ترقی پسند ادیبوں کا ایک ایسا فرض ہے جو تاریخ وقت نے ان کے روبرو پیش کیا ہے اس نازک مرحلے پر بھی یہ قول دہرانے دیجئے۔

" قلم کبھی ہم لوگ بین الاقوامی مزدوروں کی جماعت کی ناقابل شکست فوج کے سپاہی ہیں "
(مارکا فیڈ میں اشتراکی کانگریس کا اعلان نامہ ۱۹۳۲ء)

چاہو تو میرا یہ مضمون حسرت کا رجحان شاعری، میرے اس خط کے ساتھ سہیل میں شائع کر دو۔

دعاگو :- شعیب راہی - (یکم نومبر ۸۰ء)

ماہنامہ سہیل

ماہنامہ سہیل گیا کی ایک اور عظیم پیش کش

ایک شمارہ — قیصر عثمانی کے نام

ہندو پاک کے چوٹی کے اہل قلم حضرات کی تخلیقات سے مزین،

جناب قیصر عثمانی سے جمیل مظفر سسناروی اور جلیل بازیدپوری کا اچھوتا اور بے باک انٹرویو

عنقریب منظر عام پر آرہا ہے ، قیمت ۶ روپے

منیجر ماہنامہ سہیل، ریور سائیڈ روڈ گیا ۸۲۳۰۰۱

جنید حزیں لاری کا پہلا شعری مجموعہ

حرف و نوا

مشاہیر کی گراں قدر رایوں کے ساتھ ، اتر پردیش اردو اکادمی کے مالی تعاون سے چھپ کر منظر عام پر آچکا ہے ۔

صفحات ۲۰۰ ۔ قیمت ۲۰ روپے

ملنے کا پتہ :- **لاری پبلی کیشنز سی کے ۱/۴۲ دالمنڈی وارانسی**

"اندھی سوچیں گونگے لفظ" اور "سیپ کے دیپ" کے شاعر
عارف شفیق کا تیسرا مجموعہ

"سر پھری ہوا"

کھلیں گے محبت کے پھول ایسے ہم و نگر میں بھی (شائع ہو گیا ہے)

لہو زمیں کو جس دن کسان دے دے گا

زیر اہتمام :- مکتبہ خاتون پاکستان R3/1 شہر نو آباد
فیڈرل بی ایریا کراچی پاکستان

مشہور افسانہ نگار محمد سلیم خاں ہمراز کے
جدید افسانوں کا پہلا مجموعہ !

ڈیڈ لائن (زیر طبع)

ناشر :-
کرن پبلی کیشنز ۵۷۳ سی فتح پور
ویلیج روڈ ، مٹیا برج ، کلکتہ ۷۰۰۰۲۳


SPECIAL
GUL
HOWRAH
AR
TRADE MARK
RAHIM KHAN & SONS
سب سے زیادہ
فروخت ہونے والا
اے-آر-چاند تارا مارکہ
گُل
(رجسٹرڈ ٹریڈ مارک)
ہمیشہ استعمال کیجیے

Regd. P. & T. Gaya R. N. I. Regd. No. [illegible]
The SOHAIL Monthly, River Side Road, Gaya - 823,001
47 years of Publication Phone : 1573

